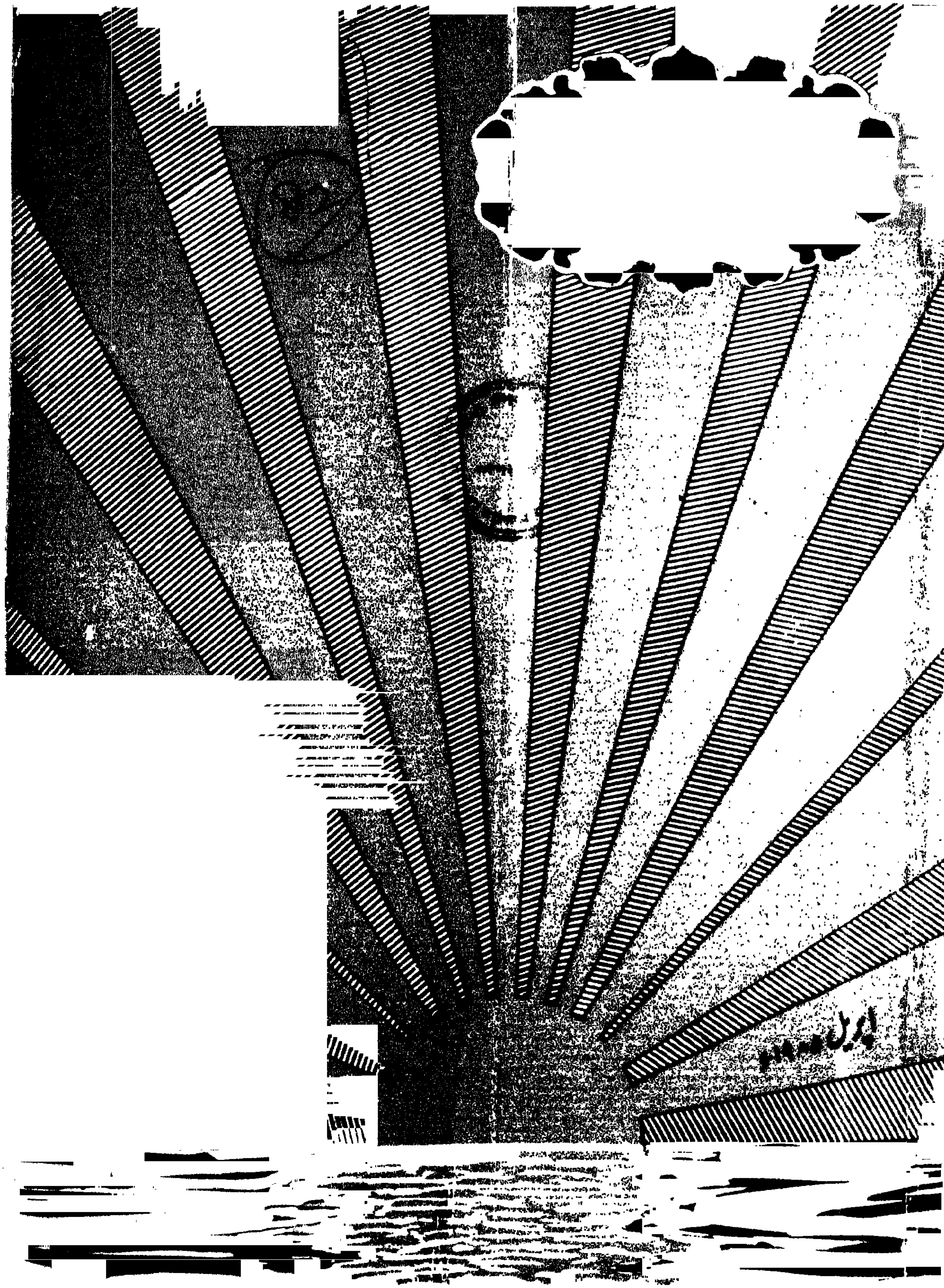

اپریل

عنوانات

جلد ۴۰ نمبر ۱

اپریل ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

فون:
ایڈیٹر: ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: ۴۷۱۰۸

پبلشر: بھوانی شنکر شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ

زرِ سالانہ: دس روپے

زرِ چندہ کا چیک: ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن، پبلک ریلیشنز، اترپردیش، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

ٹیلی گرام: ایڈیٹر نیا دور، محکمہ اطلاعات، پبلک ریلیشنز، اترپردیش، لکھنؤ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت ان سے پوری طرح متفق ہو!

اپنی بات

اُردو زبان یکے بعد دیگرے اپنے عظیم ترین شاعروں، ادیبوں اور محسنوں سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ سال ۱۹۸۴ء جاتے جاتے اردو کو گہرے زخم دے گیا۔ فیض احمد فیضؔ اور راجندر سنگھ بیدی کا انتقال اردو زبان و ادب کا نقصان عظیم ہے، جس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

فیضؔ محض ایک عظیم شاعر ہی نہیں تھے، ممتاز صحافی بھی تھے۔ اور دبے کچلے، مظلوم نیز استحصال کے شکار طبقوں کے لیے امید کی ایک کرن بھی تھے۔ فیضؔ سامراجیت اور غلام بنا کر رکھنے والی طاقتوں، نیز ظالموں کے خلاف نہ صرف یہ کہ آواز اٹھاتے رہے، بلکہ ہمیشہ نبرد آزما بھی رہے۔ آزادی کے لیے لڑنے والوں کا انھوں نے ہمیشہ ساتھ دیا اور انھیں طاقت پہنچائی۔ کراچی سے بیروت تک کی شاہراہیں ان کے اس نظریہ اور طرزِ عمل کی گواہ ہیں۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے، انھوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور تربیت بھی۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور ایک منفرد اسلوب دیا جس میں لطافت بھی ہے اور ترنم بھی۔ مہکتی وادیوں کی تازگی بھی ہے اور دردمندی کا آہنگ بھی۔ چنانچہ انھیں زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ جہاں بھی جاتے ان کے اعزاز میں شاندار جلسے منعقد کیے جاتے اور ان کے مداحوں کا ہجومِ غفیر انھیں آٹوگراف لینے کے لیے گھیر لیتا۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور اس کے عروج کے زمانے میں اُردو شاعری میں جو آوازیں اُبھریں، ان میں بہت سی آوازیں اتنی بلند آہنگ تھیں کہ وہ بالآخر خلاؤں میں گُم ہو گئیں لیکن فیضؔ کی آواز اپنی نرمی، لطافت، موسیقیت، تازگی اور دردمندی کے سبب نہ صرف یہ کہ ہمیشہ منفرد رہی، بلکہ زندہ بھی رہی اور امر ہو گئی۔ انھوں نے مقصدیت اور افادیت کو کبھی فن پر حاوی نہیں ہونے دیا نیز سیاسی اور ہنگامی موضوعات پر بھی انھوں نے لطیف اشاریت اور رمزیت سے کام لیا۔

راجندر سنگھ بیدی کا نام اردو کے افسانوی ادب کے لیے ایک ایسا نام ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ انھوں نے اردو افسانہ نگاری کو اس سطح پر پہنچا دیا جہاں وہ دنیا کی کسی بھی زبان کے افسانوی ادب سے آنکھیں چار کر سکتی ہے۔ انھوں نے بڑی کھُردری اور اُکھڑی اُکھڑی زبان میں بڑے خوبصورت افسانے لکھے اور زبان کے کھُردرے پن سے بڑا کام لیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں نہ کہیں شاعری کی اور نہ ہی انشا پردازی۔ ان کے افسانے اپنے براہ راست بیانیہ کے باوجود ایک تہہ داری لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جدید ادب کی لاشعور کو کھنگالنے کی تحریک سے بہت پہلے لاشعور کی تہوں میں جا کر اس کی کامیاب تصویر کشی کی۔ نفسیاتی پیچیدگیوں کی عکاسی انھوں نے ایسے اسلوب میں کی جس میں بلا کی سادگی ہے، ان کے افسانوں میں کہیں بھی بھرتی کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ نہ قصے میں، نہ پلاٹ میں۔ کہیں کوئی لفظ بھی بھرتی کا نہیں ملتا۔ ہر چیز یوں ملتی ہے گویا اسی طرح اس کی ضرورت تھی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے متعلق بھی یہی احساس پیدا ہوتا ہے کہ بس اتنا ہی کہنا ضروری تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔

بیدی کی زبان پر اکثر و بیشتر اعتراضات کیے گئے۔ لیکن معترضین یہ فراموش کر گئے کہ فکشن محض زبان، اس کے چٹخارے اور چاشنی کی چیز نہیں ہوتا۔ بیدی نے زبان وہی استعمال کی جو متعلقہ کرداروں اور ماحول کی تھی۔ انھوں نے غیر پڑھے لکھے، یا کم پڑھے لکھے عام لوگوں یا خالص "بنیا" لوگوں سے گاڑھی اُردو میں بات نہیں کرائی، ان کی زبان سے ادق اُردو الفاظ نہیں ادا کرائے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں زبان و بیان کا شعور بھی تھا اور فن کی پوری آگہی بھی تھی۔ اردو کے دو سب سے بڑے افسانہ نگاروں میں یقیناً ایک نام بیدی کا ہے (ایک اور نام ظاہر ہے کہ منٹو کے علاوہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔) فیضؔ اور بیدی کے انتقال سے اردو شعر و ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا احساس اس وقت اور شدید ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اب ایسے قد آور فن کار پیدا ہونے کے امکانات سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ نہ فن پر ایسی گرفت رکھنے والے اور نہ ہی فن کے تئیں اتنے مخلص لوگ اُبھر رہے ہیں۔

—— ایڈیٹر

غزلیں

نذیر بنارسی، پانڈے حویلی بنارس ۲۲۱۰۰۱

خوب صورت ہو تو الزامِ نظر لے لینا
عمر بھر کا ہے سفر، زادِ سفر لے لینا

دے کے الزام کوئی، تم مرا سر لے لینا
ویسے سودا تو یہ مہنگا ہے، مگر لے لینا

خانہ ویرانی پہ اوروں کو نہ ہنسنے دینا
نہ رہوں میں، تو مرے گھر کی خبر لے لینا

خوش رہو ہاتھ میں مہندی کے لگانے والو
رنگ کم ہو تو مرا خونِ جگر لے لینا

وہ تو مجبور ہے مانگے گا مدد تم سے ضرور
قرض دے دے کے تم اس شخص کا گھر لے لینا

سینہ حاضر ہے ہر اک وار کو سہنے کیلئے
لے کے تلوار نکلنا تو سپر لے لینا

خط کے ہر جملہ سے دو پہلو نکلتے ہیں نذیر
اُن کی باتوں کو جدھر چاہے اُدھر لے لینا

رضا ابن فیضی، مئو ناتھ بھنجن، یوپی

رنگ و نوا کی ساری بساطیں اُجڑ گئیں
منظر وہ سامنے تھا کہ آنکھیں اُجڑ گئیں

اس حادثے کا مرثیہ دیوارِ شب پہ لکھ
سورج ہوا طلوع تو صبحیں اُجڑ گئیں

یوں لے گیا وہ یادوں کے موسم سمیٹ کر
سینے کی آگ بجھ گئی، سانسیں اُجڑ گئیں

اب کیا کہوں، وہ سبز پرندے کہاں گئے
آئی مزے کی رُت تو وہ شاخیں اُجڑ گئیں

سانسوں میں کیا مہکتے ترے لمس کے گلاب
اب کے تو رُت بدلتے ہی فصلیں اُجڑ گئیں

معنی ہوں میں بتاؤ مرا کیا زیاں ہوا؟
یہ اور بات، لفظوں کی سطحیں اُجڑ گئیں

گاہک اس آگہی کا یہاں کون ہے فضا
میں دست کش ہوا، تو دکانیں اُجڑ گئیں



ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
معرفت دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

شاعرِ حسن و حیات

جنابِ محمد عثمان عارف نقشبندی

وہ انسان کتنا خوش قسمت اور بلند اقبال ہوتا ہے جس کا ورثہ، ماحول اور معاشرہ، اس کے رجحان طبع اور ذوق کے مطابق ہو۔ جناب محمد عثمان عارف نقشبندی صاحب کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ان کو ورثے میں ذوق ادب و شعور ملا۔ متاع انسانیت و شرافت ملی اور سرمایۂ اخلاق و تصوف حاصل ہوا۔ انھوں نے شاعری و شرافت اور تصوف کے آغوش میں آنکھیں کھولیں اور وہ علمی و اخلاقی اور روحانی ماحول میں پروان چڑھے۔ ان کے والد بزرگوار الحاج محمد عبداللہ بیدل مرحوم (ڈسٹرکٹ و سشن جج) حضرت بے خود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ بیخود مرحوم کو اپنے اس شاگرد کی شاعرانہ صلاحیت اور زبان دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے اعتراف و اعلان کیا کہ:

"بیدل نے میری زبان پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میرے پاس مالِ دنیا اور کچھ تو تھا نہیں، ایک زبان رکھتا تھا، وہ حضرت بیدل کی نذر ہوئی۔ ان کے بہت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، انھوں نے کمال محنت اور جاں فشانی سے، میری زبان، میرا بیان اور میرا تخیل حاصل کر لیا ہے"۔ ۵۱

یہی زبان و بیان اور تخیل، عارف صاحب کو وراثت میں ملا ہے "عروس سخن کے گیسو سنوارنے سے پہلے عارف صاحب کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ تمام صفات اور خصوصیات پیدا ہو چکی تھیں جو ایک ممتاز و منفرد شاعر کے لیے ضروری ہیں اور جن کی بدولت اس کو آفاقی حیثیت اور مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

شعر و شاعری کے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں عارف صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے موصوف کے نظریات شاعری، رجحانات، احساسات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً

"میں اپنی شاعری میں خاص طور پر یہ بھی دھیان رکھتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے شعر معائب سے پاک رہے۔ شعر میں کسی خوبی کا ہونا تو دوسری منزل ہے۔" ۵۲

حالی کے اس قول پر وہ سختی سے پابندی کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ: ———

"شعر فہمی کے لیے حالی کی بات یاد رکھنی چاہیے کہ "شعر وہ ہے کہ اس کا پہلا مصرع پڑھیں تو دوسرا مصرع ذہن یا خیال میں آ جائے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے"۔ ۵۳

"میں نے نظم و غزل دونوں ہی میں اپنے شعری لب و لہجے میں شدتِ احساس کی انتہاؤں کو چھونے کی کوشش کی ہے جو ایک حساس فن کار کی خصوصیت ہوتی ہے"۔ ۵۴

"میرے یہاں شاعری کا ڈکشن نیا نہیں ہے

لیکن میرے خیالات، جذبات و احساسات آپ کو
بھرپور انداز میں ملیں گے اور میں نے کوشش
کی ہے کہ صاف ستھری اور اچھی زبان میں اسے
پیش کروں"۔ ؎

عارف صاحب کا تعلق داغ اسکول سے ہے۔ داغ مرحوم کے اس دعوے سے آج تک کوئی انکار نہیں کرسکا ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اُردو زبان کو داغ مرحوم تمام زبانوں کا جوہر یا حسین امتزاج سمجھتے تھے، اس لیے ان کا خیال تھا کہ ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

عارف صاحب اُردو کو صرف ایک زبان ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کو شائستہ آداب محبت، دریائے لطافت، گنجینۂ اخلاق و مروت اور گہوارۂ تہذیب و شرافت سمجھتے ہیں ؎

شائستۂ آداب و محبت اُردو ہے اصل میں دریائے لطافت اُردو
گنجینۂ اخلاق و مروّت اُردو
گہوارۂ تہذیب و شرافت اُردو

اور اسی لیے وہ شعر کو لفظی و معنوی معائب سے پاک رکھنے پر زور دیتے ہیں اور خود بھی اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ آتش مرحوم نے بندشِ الفاظ کے فن کو مرصع سازی کے فن سے مثال دی ہے ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

عارف صاحب صرف حسن بندشِ الفاظ کے قائل نہیں ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ یہ تو شعر کا ایک لفظی اور ظاہری وصف ہے جس میں اظہارِ خیال کا حسن تو پایا جاتا ہے لیکن خیال کیا ہے۔؟ ہماری زندگی سے اس کا کتنا اور کیسا تعلق ہے؟ وہ زمانے کے تقاضوں، عصری رجحانات، ماحول و معاشرہ کے معاملات و مسائل کی ترجمانی کرتا ہے یا نہیں؟ اگر خیال صرف لفاظی یا خیالی ہے تو یہ لفظی فن کاری ہے۔ اصلیت، صداقت، واقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کیا کہا جائے؟ کو ہمیشہ اولیت دے یعنی مواد کو پیش نظر رکھے، اس کے بغیر شعر میں تاثیر ہو ہی نہیں سکتی، وہ جسم بے روح کی طرح ہوگا۔ درحقیقت شعر کی تعریف کم از کم یہ ہے کہ "از دل خیزد بر دل ریزد، یا جس کو کان سنیں اور دل متاثر ہو جائے یا جس کا پہلا مصرع سننے کے بعد دوسرا مصرع فوراً ذہن میں آجائے"۔ اور شاعری صفی لکھنوی کے الفاظ میں ؎

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل ہی جب بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

لیکن شاعری کے حسن و جمال کو فروغ، دل گداختہ کے بغیر نہیں ہو سکتا غالب مرحوم نے کہا تھا ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

عارف صاحب کو گداختہ دل پیدا کرنے کی زحمت نہیں ہوئی۔ وہ "تصوف کو اپنی جبلت اور خمیر کا جزو" پاتے ہیں اور صوفی کا دل سوز و گداز، خلوص و محبت، شرافت و انسانیت، طہارت و نفاست صبر و قناعت، درویشی و بے ریائی، ہمدردی و خدمتِ خلق کا گہوارہ اور سرچشمہ ہوتا ہے۔ عارف کے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر بھی۔ سخنِ عارف کا ترجمان "دلِ عارف" ہے۔

حسن حبیب، درد محبّت، غمِ جہاں
عارف جو دل میں ہے وہی شعر و سخن میں ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ کلام عارف، حسنِ حبیب، دردِ محبت اور غمِ جہاں کا پیکر جمیل ہے۔ ایک ایک شعر، ان کی دلی واردات اور ذہنی کیفیات کا ترجمان ہے۔ اور ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

کے بمصداق سخنِ عارف میں دلآویزی اور تاثیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عارف صاحب نہ صرف زبان کے رموز و نکات، اس کی سادگی و پرکاری، فصاحت و سلاست، لطافت و نزاکت

سے بخوبی واقف ہیں بلکہ اندازِ بیان، ایجاز و اختصار اس کی دلکشی
و تاثیر پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں ان کو زبان و بیان کی تمام
خصوصیات اور آدابِ فن سے آگاہی ہے۔ وہ زندگی اور زمانے
کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عصری رجحانات اور زمانے کے
تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان کو بہتر سے بہتر انداز میں بیان کرنے
کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و نظر کی رفعت و وسعت
جذبات و خیالات کی متانت و طہارت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شعری
بصیرت سے ان کا کلام ہشت پہلو نگینہ کی طرح ہے، جس کی آب و
تاب اور چمک دمک یوں تو ہر صنفِ سخن میں پائی جاتی ہے لیکن غزل
میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ غزل میں حسنِ حبیب کا بیان بڑے
والہانہ انداز میں عارف صاحب کرتے ہیں۔ گل افشانی گفتار کا
یہ انداز دوسری صنفِ سخن، رباعی، قطعہ، نظم وغیرہ میں اس لئے
کم ہے کہ اس میں موضوع کے اعتبار سے خیالات کا اظہار کرنا
پڑتا ہے۔ اور غزل میں اشاریت و رمزیت، بے ربطی و انتشار
سوز و گداز، حسن و دلکشی، درد و غم، کرب و اضطراب سے
جو کشش و رعنائی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے وہ نظم، رباعی یا
قطعہ وغیرہ میں اس حد تک نہیں ہو پاتی تاہم عارف صاحب کا
کمال یہ ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن کو اپنے سوز دروں، اپنے خلوص،
اپنی متانت و شرافت اور ہمدردی و محبت سے شاہکار بنا دیتے
ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "نذرِ وطن" نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں
زبان و بیان، ہیئت و مواد کے اعتبار سے اس امر کا ثبوت ہیں کہ
عارف صاحب کو اپنے فن پر پوری پوری دسترس حاصل ہے
اور ان کو اپنے وطن اور وطن والوں سے کتنی والہانہ محبت ہے۔
"حبِ وطن از ملکِ سلیمان خوش تر" اور "حب الوطن من الایمان" پر
ان کا عقیدہ اور عمل ہے۔ جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کے الفاظ میں:

" عارف کا دل جذبۂ حب الوطنی سے لبریز ہے وہ
سچے اور پکے ہندوستانی ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر بہت
وسیع ہے۔ ان کی نظمیں ان کے سیکولر کردار، جمہوری
ذہن اور سماج وادی مزاج کی آئینہ دار ہیں جن میں
اکثر جوش اور جذبہ سے بھرپور ہیں۔ جناب عارف
کو زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل ہے۔ ان کی
نظمیں شعریت اور شعری محاسن سے پُر ہیں۔" ۵۴

راؤ صاحب نے اُردو شاعری اور شاعروں کی قومی اور وطنی خدمات
و رہنمائی کا بھی اعتراف کیا ہے:۔

" اُردو شاعری میں قومی و وطنی شاعری کا ایک
مستقل باب ہے، اُردو کے شعرا اور ادیبوں نے
جنگِ آزادی سے اب تک بہت جاندار، حسین
اور ولولہ انگیز قومی و ملکی تاریخی لٹریچر کی تخلیق کی ہے
جو ہمارے ہندوستان کا بیش بہا ادبی و لسانی خزانہ
ہے۔ اہلِ اُردو نے ملک و قوم کا ہر مشکل میں اور
ہر منزل پر نہایت خلوص اور سچائی اور دلیری سے
ساتھ دیا ہے۔ وہ خود بھی جذبۂ حب الوطنی
سے سرشار ہیں اور اپنی تخلیقات کے جام و سبو
سے عوام و خواص کو بھی سرمست و دلشاد
کرتے رہے ہیں۔" ۵۵

سرزمین راجستھان ہمیشہ حریت پرور اور حریت نواز رہی
ہے، عارف صاحب اسی حریت بخش آب و ہوا میں پروان
چڑھے۔ ان کے دل میں وطن کی محبت کا جذبۂ صادق نہ ہوتا تو
تعجب تھا۔ وہ اپنے وطن کو ہر اعتبار سے "سارے جہاں سے
اچھا" بنانا چاہتے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کی حب الوطنی کے
متعلق میں نے لکھا ہے کہ "ہند را بچشمِ خسرو باید دید" کیوں کہ
ہندوستان اور اس کی ہر چیز کو خسرو نے تمام دنیا سے بہتر اور
اعلا بتایا ہے۔ اسی طرح عارف صاحب کا بھی شمار انھیں محبانِ
وطن کی صف میں ہے جنھوں نے وطن اور اہلِ وطن کی اصلاح و
فلاح کے لیے عمریں ختم کر دیں۔ عارف صاحب کے لیے وطن کی
صورت و زینت آنکھوں کی روشنی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کا
تاریخی کردار، اس کی روحانیت، صوفیوں اور سنتوں کی تعلیمات،
یگانۂ روزگار مشاہیر ادب، لاجواب عمارتیں، ایک ایک چیز کا ذکر

بڑے جوش و جذبے کے ساتھ کیا ہے ؎

روحانیت یہاں ہے انسانیت یہاں ہے
پاکیزہ کس قدر ہے فطرت مرے وطن کی

اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواص معانی
ہے جن کے لیے بحرِ پُرآشوب بھی پایاب

اور عارف صاحب کتنی آسان زبان میں ہندستان کے علم و فضل کا ذکر کر رہے ہیں ؎

ہے علم و فضل اتنا گہوارہ ادب ہے
دگیان گیان سے ہر شوکت مرے وطن کی

نذر وطن میں ۱۸ نظمیں ہیں، اور ہر نظم ہندستان کی عظمت اور اس کے روشن مستقبل کی ترجمان ہے۔ مادرِ وطن کو نذرِ خلوص و محبت پیش کرنے کے بعد، عارف صاحب نے حمد و نعت و منقبت کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" (۱۹۸۱ء) شائع کیا۔
تصوف عارف صاحب کی جبلت اور ان کے خمیر کا جز رہے اس لیے حمد و نعت و منقبت کی ہر نظم خلوص و محبت کا مرقع ہے وہ "باخدا دیوانہ باش با محمدؐ ہوشیار" پر عقیدہ رکھتے ہیں قومی مراتب کا خیال رکھتے ہیں۔ نعت گوئی کی سعادت "بزورِ بازو" نصیب نہیں ہوتی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے جس کو حاصل ہو جائے۔ عارف صاحب نقشبندی سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے روحانیت سے زیادہ قریب اور متاثر ہیں، اس لیے:۔

" ان کے نعتیہ کلام میں ایک والہانہ کیفیت ایک نیا آہنگ، ایک دل کش لے، ایک نئی تڑپ اور ایک نئی فضا کا احساس پایا جاتا ہے اور یقیناً یہ چیز ان کی انفرادیت کو ممیز و ممتاز کرتی ہے"۔ ۵؎

قلبِ عارف، ایک عارف و سالک، صوفی و درویش کا قلب ہے، جو حبِ رسولؐ میں سرشار رہتا ہے۔ لیکن یہ سرشاری حدِ ادب سے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتی۔ وہ رحمتِ عالم کے مقام و مرتبہ کا ہر لمحہ، ہر پل لحاظ رکھتی ہے۔ حرمین شریفین کی زیارت اور بارگاہ نبویؐ میں حاضری نے ان کے قلب کو اور زیادہ صاف اور گداز بنا دیا ہے۔ سیرتِ پاک کے مختلف پہلو اس طرح بیان کرنا کہ مبالغہ یا غلو نہ ہو، اور شاعرانہ حسن بھی قائم رہے حالی کی طرح عارف صاحب کی بھی خصوصیت ہے۔ حالی نے مسدس مد و جزر اسلام میں آسان اور عام فہم زبان میں، نعت پر جو چند بند لکھے ہیں وہ نعت گوئی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

عارف صاحب بارگاہِ نبوتؐ میں نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں:۔

انصاف و عدل وہ ہے طبیعت میں آپ کی
شاہ و گدا ہیں ایک شریعت میں آپ کی
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کو آ گئے
سینے سے بے کسوں کو لگانے کو آ گئے

حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں ایک مسدس "درسِ شہادت" لکھا ہے جس کا ہر بند اور بند کا ہر شعر سبق آموز ہے اور حق و صداقت کے لیے مرنے کی تڑپ پیدا کرنے والا ہے۔ کتنی سچی بات کہی ہے کہ امام حسینؓ نے ؎

دُنیا کو دے دیا ہے وہ آئینِ زندگی
ملتی رہے گی موت میں تسکینِ زندگی

عارف صاحب امام حسینؓ کی تعلیمات حق و صداقت، قربانی و ایثار، تسلیم و رضا، عزتِ نفس و خود داری کو (جو اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے) یاد دلا کر، ان کی پیروی کرنے پر زور دیتے

[ظا]ہری اور لفظی عقیدتوں کو اچھا نہیں سمجھتے ؎

لفظی عقیدتیں ہیں جنابِ امام سے
نسبت نہیں ہے کوئی ہمیں اُنکے کام سے

عہد حاضر میں جناب عارؔف صاحب نقش بندی نعت گو کی حیثیت سے بھی منفرد و ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ خدا کرے حبِ رسولؐ، عشقِ رسول میں بدل جائے اور نعت گوئی کا سلسلہ قائم رہے۔ تاکہ اس صدی میں بھی۔ "حسان الہند" حضرت محسن کاکوروی کے مبارک و مقدس اور پاکیزہ ادب میں اضافہ ہوتا رہے۔

نذرانۂ عقیدت کے بعد عارؔف صاحب کی بیاسّی غزلوں کا مجموعہ "قلم کی کاشت" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ غزل کو اُردو شاعری کی آبرو بھی کہا گیا ہے اور وحشی صنفِ سخن بھی، حالی نے بھی غزل کو "بے وقت کی راگنی" بتایا ہے اور جگرؔ مرادآبادی نے ۱۹۴۷ء کے المناک اور خونچکاں واقعات سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ؎

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

لیکن غزل کی محبوبیت اور مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ وہ عوام و خواص سب کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی، مصائب و آلام، قید و بند کی سختیوں، افکار و انتشار میں وہی دلوں کو سہارا دیتی رہی۔ چکّی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن جاری رکھنا غزل گو شعرا کا ایک کارنامہ ہے جس سے یہ واضح ہو گیا کہ غزل صرف بزم و نشاط عیش و عشرت میں ہی نہیں بلکہ وہ انتشار اور انقلاب اور تکلیف و مصیبت میں بھی یار غمگسار اور باعث سکون و قرار ثابت ہوئی ہے۔

غزل کی ہمہ رنگی و ہمہ جہتی نے عارؔف صاحب کو ابتدا ہی سے متاثر و مسحور کر دیا تھا، ان کے اندر یہ خداداد صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر قسم کے خیالات و جذبات و احساسات اور تاثرات کو غزل میں بیان کر سکیں "قلم کی کاشت" میں کششِ حسن بھی ہے شیوۂ عشاق بھی، تہذیب رسم عاشقی بھی ہے، ناز و عشوۂ محبوب بھی، حیاتِ انسانی کے مسائل و معاملات بھی ہیں، عصری رجحانات اور زمانے کے تقاضے بھی۔ غرض غزلیاتِ عارؔف، قدیم صالح روایات کی امین، عہد حاضر کے مسائل کی ترجمان اور روشن مستقبل کی مُبشر ہیں۔ عارؔف صاحب، عارفِ حُسن و جمال ہیں، وہ کائنات کی ہر حسین چیز سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں انسانی زندگی کے ہر مسئلے، اور ہر جذبے کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کرنے کا شعور رکھتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ کوئی جذبہ ہو، کوئی خیال ہو، کوئی تاثر ہو "رنگِ تغزل" سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کی غزل حسن و حیات کا تاج محل ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔ غالؔب نے تقریب بہر ملاقات مہ رخاں کے لیے مصوری سیکھی تھی، اور عارؔف صاحب ؎

عارؔف انھیں بھیجو یہ غزل تحفۂ الفت
سمجھو اسی تقریب سے ہم ان سے ملے ہیں

خدائے سخن میر تقی میرؔ "شوقِ رُخِ نکو" سے مجبور ہو کر تاک جھانک سے کبھی باز نہیں آئے ؎

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

عارؔف صاحب بھی شائستہ حسن دیکھنے کے لیے تاک جھانک کو ضروری سمجھتے ہیں ؎

دیکھا ہے تاک جھانک میں شائستہ حُسن کو
ظاہر میں رُخ پہ کیسا ہی پردہ دکھائی دے

کچھ اور اشعار ـــــــ

عشق کی آگ متاعِ دل و جاں ہے عارؔف
خاک رہ جائے جو یہ آگ بجھائی جائے

———

آتشِ غم سے کہو آنچ ذرا تیز کرے
تپ کے اس آگ میں کچھ اور نکھر جاؤں گا

———

اس دَورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارؔف خدا بہت ملے انسان کم ملے

کیا شکوہ بہاروں کا عارؔف کس سے یہ شکایت کرتا ہے!
غنچوں کی طلب میں شعلے ملے، پھولوں کی طلب میں خار ملے

اپنے پہ اعتماد اگر ہے تو زندگی!
اک نقشِ جاوداں ہے یہ دھوکا نہ جانیے

بے لطف ہے محروم ہے کانٹوں کی خلش سے
جو زندگی پھولوں سے ہم آغوش رہی ہے

کرو بہار کو رنگیں ، ہے خونِ دل حاضر
جلاؤ میرا نشیمن کہ روشنی کم ہے

دل کا رشتہ ٹوٹتے ہی چوٹ وہ دل پر لگی
پھول بھی پھینکا ہے اپنوں نے تو وہ پتھر لگا

عارؔف کا تصوّرِ زندگی صحت مند تصوّر ہے

ضمانت ہے حیاتِ نو بہ نو تازہ بہ تازہ کی
نئے خورشید کا ہر صبح کرنوں میں بکھر جانا

اور "قلم کی کاشت" سے بھی اُردو ادب کا باغ نو بہ نو تازہ بہ تازہ سرسبز و شاداب پودوں اور پھولوں سے سدا بہار بنا رہے گا۔

غزل کی طرح عارؔف صاحب کو رباعیات و قطعات پر بھی کمال حاصل ہے۔ "نورِ زندگی" مطبوعہ ۱۹۸۲ء میں انتیس[۲۹] رُباعیاں اور ۱۵۵ قطعات شامل ہیں۔ رُباعی اور قطعہ دونوں سنجیدہ اور فلسفیانہ علمی و اخلاقی موضوعات کے لیے مخصوص ہیں رباعی مشکل صنفِ سخن اس لیے ہے کہ اس کی بحر اور وزن محدود و مخصوص ہیں۔ صرف چار مصرعے ہوتے ہیں جس میں پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم ردیف یا ہم قافیہ ہوتا ہے، تیسرا مصرع حاصلِ رُباعی ہوتا ہے، اس میں قافیہ یا ردیف کی قید نہیں ہوتی۔ قطعہ میں یہ پابندی نہیں ہوتی، اس میں کم از کم دو شعر ہوتے ہیں۔ عارؔف صاحب کے قطعات دو اشعار پر مشتمل ہیں۔

"نورِ زندگی" پر جناب مالک رام صاحب اور پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے باکمال محققین نے تعارف اور دیباچہ لکھا ہے۔ مالک رام صاحب کو حیرت ہے کہ:

"عارؔف صاحب نے اس جوانی کے عالم میں
رُباعی اور مختصر قطعہ پر توجہ کی ہے۔ یہ امر نہ صرف
ان کی قادر الکلامی اور پختگی پر دال ہے بلکہ
ان کی خود اعتمادی کا بھی بین ثبوت ہے۔"[۹]

واقعہ بھی یہی ہے کہ رُباعی کا فن دریا کو نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔ اس کے موضوعات مذہب و اخلاق فلسفہ و تصوّف، ادب و سیاست، تمدن و معاشرت، کردار و عمل وغیرہ ہیں جو رفعتِ فکر، وسعتِ نظر، زبان و بیان پر قدرت کے بغیر حُسن و خوبی کے ساتھ ادا نہیں کیے جا سکتے۔ عارؔف صاحب میں یہ خداداد صلاحیت و صفت موجود ہے کہ وہ ہر موضوع کو ہر صنفِ سخن میں ادا کرنے کا شعور و سلیقہ رکھتے ہیں۔

آج کا ترقی پسند، خدا بیزار اور سائنس پرست انسان ایمان و یقین، سکون و اطمینان کے لیے ترستا ہے ؎

سیلاب حوادث کی فراوانی ہے
انسان کو کس درجہ پریشانی ہے
اللہ سے پھر بھی ہے بغاوت قائم
جو کام ہے انسان کا شیطانی ہے

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ باوجود کوشش کے انسان کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی کشتی کے ناخدا خود اس کو ڈبو رہے ہیں ؎

طوفان تو اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے

سیلاب تو اُمڈا ہی چلا جاتا ہے
انسان کی کشتی کو ترانے والو!
انسان تو ڈوبا ہی چلا جاتا ہے

عارف صاحب کو "لاتقنطوا من رحمۃ اللہ" پر ایمان کامل ہے۔ وہ مشکلات و مصائب سے گھبراتے نہیں، اپنی تقدیر خود بنانے کی تلقین کرتے ہیں ؎

کیوں گردشِ ایام سے گھبراتا ہے
ہر دور زمانہ کا گزر جاتا ہے
رہ فصلِ خزاں میں بھی شگفتہ خاطر
کانٹوں میں بھی گل بہار دکھلاتا ہے

کتنی پاکیزہ اور حقیقت پر مبنی مثال دی ہے۔

قطعات پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے اور وضاحت کے ساتھ۔ میں قطعاتِ عارف میں مذہبی و اخلاقی، ملکی و ملی، قومی و وطنی، سیاسی و سماجی، ادبی و تعلیمی، خودی و خود اعتمادی جیسے اہم موضوعات پر عارف صاحب کی لسانی و فنی قدرت و صلاحیت تسلیم کرتا ہوں۔ خشک، فلسفیانہ اور سنجیدہ موضوعات کو بھی دل نشیں انداز میں بیان کرنے کے فن پر انھیں عبور حاصل ہے۔ نئی زندگی کو کتنی ولولہ انگیز زندگی ثابت کیا ہے ؎

سجا کے چاند ستاروں کی رات بھر محفل
ہر ایک صبح نئے نور میں نکھرتا ہوں
ہر ایک لمحہ مرے ارتقا کی منزل ہے
نئی اُمنگ، نئی زندگی کا مژدہ ہوں

مذکورہ بالا شعری مجموعوں کے تعارف اور مختصر ذکر سے عارف صاحب کی شاعرانہ حیثیت و صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ فطری شاعر ہیں۔ شاعری کا ملکہ خداداد ہے۔ شاعری وہبی قوت ہے اور یہ قوت عارف صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسی قوت کی کرشمہ سازی ہے برکت ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن پر قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ سہل ممتنع ہے۔ دقیق سے دقیق مسئلہ یا موضوع کو وہ دل نشیں اور سلجھے ہوئے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہو جاتے ہیں۔ "نور زندگی" کے ساتھ ان کا یہ فیضِ سخن "لمحوں کی دھڑکنیں" تک پہنچ گیا ہے جس میں تقریباً ۱۳۰ غزلیات کا تحفہ لے کر وہ داخل ہوئے ہیں اور اس سازوسامان کے ساتھ کہ نئے زمانے، نئے امکانات، نئے مسائل اور نئے جہان و مکان کی بھرپور ترجمانی کریں۔ ہمارے ادبی و جمالیاتی ذوق کو سنواریں اور نکھاریں، زندگی کے مسائل، جدید خیالات و رجحانات سے آگاہ کریں۔ "لمحوں کی دھڑکنیں" ان کے اس قول کی تعبیر و تشریح ہے۔

"صلح کل میرا مشرب، خدمتِ خلق نصب العین
زندگی، اور انسانیت میرا دین و ایمان ہے"۔

اس لیے ان کا پیغام محبت، اخوت، مساوات، ایثار و قربانی، ہمدردی و انسانیت اور وہ تمام جذبات و احساسات ہیں جن سے انسانیت اور اعلیٰ اقدار کی تشکیل و تعمیر و بقا ہوتی ہے۔ کس کرب کے ساتھ کہہ رہے ہیں ؎

اُلفت نہیں، وفا نہیں، ہمدردیاں نہیں
انسانیت سے اتنا تو انساں نہ دور تھا

نتیجہ یہ ہوا کہ انسان مکر و فریب، ظلم و ستم کا خونخوار دیو بنتا جا رہا ہے۔ امن و آشتی کے نام پر ایسے ایسے ظلم ڈھاتا ہے کہ حیوانیت اور بربریت بھی پناہ مانگنے لگی ہے ؎

گاتے ہیں اخوت کے ترانے تو شب و روز
بربادیٔ عالم کو ہیں تیار ابھی تک
معصوم ہے معصوم بہت امن کی دیوی
قبضہ میں ہے خنجر خونخوار ابھی تک

زمانے سے نرالا ہے کرم صیاد و گلچیں کا!
جلا کر آشیاں کہتے ہیں اب آزاد کرتے ہیں

یہ کرم نما ستم بھی قابلِ داد ہے ؎

آپ کی طرزِ نوازش بھولنے والی نہیں   ہنستے ہنستے آپ نے دُنیا مری بر

عصرِ حاضر کے مہذب، با اقتدار اور عظیم ممالک چھوٹے ممالک کو کن کن ترکیبوں سے ختم کرنے کے درپے ہیں، ان اشعار میں ان کی طرف کتنے بلیغ اشارے پائے جاتے ہیں :۔

تسلط جن کا ہے گلزار پر ان کو مبارک ہو
ہمیں تو چار تنکوں کا نہیں ہے اختیار اب بھی

اہلِ چمن کی حرکتیں حد سے گزر گئیں
بدنام ہو رہا ہے گلستاں کا نام بھی

بنتے ہیں گر ہزار دعاؤں سے آشیاں!
گرتی ہیں بجلیاں بھی بڑے اہتمام سے

اس خوف و دہشت، تباہی و بربادی، ظلم و بربریت کے خلاف وہ آواز بلند کرنے میں مطلق نہیں جھجکتے۔ ان کو یقین کامل ہے کہ یہ دورِ استبداد، یہ امن و مساوات نما سیاست بد ایک نہ ایک دن ختم ہو کے رہے گی۔ اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

اٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

مگر عارف نقش بندی صاحب الفت کے چراغوں سے ظلم و نفرت کی تاریکی کو مٹانے کی تلقین کرتے ہیں ؎

تاریکیٔ عالم کو مٹا کیوں نہیں دیتے
اُلفت کے چراغوں کو جلا کیوں نہیں دیتے

چار تنکے کہیں رکھ لوں گا ٹھکانے کے لیے
باغباں مَیں ترے گلشن کے سہارے تو نہیں

آگ ہو، دار ہو، طوفاں ہو کہ میدان بلا
تیرے دیوانے گزر جاتے ہیں آرام کے ساتھ

موجوں کو بنا لیتا ہوں میں اپنا سفینہ   طوفاں بھی مرے سامنے طوفاں نہیں ہوتا

عارف اب آپ اپنی ہی دُنیا بنایئے
چھوڑو گزر گئی جو مصیبت گزر گئی

عارف صاحب زندگی کے رواں دواں رہنے پر یقین رکھتے ہیں۔ عزم و حوصلہ، ہمت و استقلال، حق گوئی و جواں مردی بے خوفی و بے باکی، انسانیت کے جوہر ہیں۔ اور مصائب و مشکلات تکلیف و پریشانی، جبر و ستم سے یہ جوہر نکھرتے ہیں ؎

بے رنج و مصیبت کبھی کھلتے نہیں جوہر
جینے کا مزہ آ گیا اے جانِ ستم سے

چلنا چاہے تو زمانہ مرے ہمراہ چلے!
غیر ممکن ہے چلوں میں روشِ عام کے ساتھ

جو عزم سے ہمت سے کچھ کام نہیں لیتے
دُنیا کو بدلنے کا وہ نام نہیں لیتے

حیات روز نئے رنگ میں نمایاں ہے
جو اک چراغ بجھا سیکڑوں چراغ جلے

مسافر کام لے، کچھ کام اپنے جذبۂ دل سے
نہ منزل دور ہے تجھ سے نہ تو ہے دُور منزل سے

طوفاں سے بچے سو رہے ساحل سے لپٹ کر
یہ کشمکشِ زیست کا حاصل تو نہیں ہے

ان اشعار کو دیکھیے، کتنا بھرپور طنز ہے نئے نظام پر ؎

صراحی ہے نہ مینا ہے نہ صہبا ہے نہ ساغر ہے
یہ کن ہاتھوں میں عارف میکدہ کا انتظام آیا

صاحبانِ جاہ و ثروت کو غیرت دلانے کا نیا انداز دیکھیے ؎

بے مائیگی پہ دیکھ یہ شبنم کا فیضِ عام
پھولوں پہ اور کانٹوں پہ یکساں نکھار ہے

نام نہاد ناظمانِ ملک و قوم کردار و گفتار کے آئینے میں ۵

ہوتی ہے خیالوں ہی میں تنظیم چمن کی!
کردار ہی بدلے ہیں نہ گفتار ابھی تک

جو ظلم کے خلاف لب کشائی بھی نہیں کر سکتے، ظالم کو ظالم کہنے سے ڈرتے ہیں، وہ انسان نہیں حیوان سے بھی بدتر ہیں ۵

ان ظلم کے ماروں کی گنتی ہے کہاں عارف
ڈرتے ہوئے ظالم کا جو نام نہیں لیتے

عارف کے رنگِ تغزل کی رنگینی دیکھیے ۵

کیا روگ لگا بیٹھے ہم تیری محبت میں
جب یاد تری آئی دل درد میں ڈوبا ہے

فضا مہکتی گئی ہے خرام ناز کے ساتھ
چلے وہ جیسے مہکتی ہوئی بہار چلے

روشن رہے چراغِ محبت خدا کرے
چمکے ہیں اہلِ درد محبت کے نام سے

یہ چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے بمصداق "لمحوں کی دھڑکنیں" سے پیش کر دیے گئے۔ عارف صاحب نے شاعری کو لفظی صناعی اور مبالغہ آرائی سے محفوظ رکھا، سادگی ادا، جدتِ بیان، وحدتِ فکر اور حقیقت نگاری سے مالا مال کیا۔ زبانِ عارف صاف، سادہ، آسان اور دلنشیں ہے، اور بیانِ عارف، رواں و دلاویز ہے۔ عارف کی غزل حسن و عشق، خلوص و محبت، درد و اثر، غمِ نشاط و نشاطِ غم کا مرقع ہے۔ ان کے کلام میں قنوطیت یاس و ناامیدی نہیں ہے بلکہ اس میں عارف کے سوزِ دروں اور خونِ جگر کی آمیزش ہے۔ قول و فعل کی ہم آہنگی ہے، جمال و جلال کا شکوہ ہے، عزم و حوصلہ کی بلندی ہے۔ "لمحوں کی دھڑکنیں" ذوقِ جمال و شعورِ حیات ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ـــــ

"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کا بہترین مرقع ہے۔

حواشی:

۱ "نورِ زندگی" تعارف مالک رام ص۲ — ۲، ۳، ۴، ۵ "شاعر" بمبئی، جلد ۵۵، شمارہ (۹-۱۰) صفحہ ۱۰، ۱۳، ۱۴

۶، ۷ "نذرِ وطن" پیش لفظ ص۱ — ۸ اقتباس از مقدمہ جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب (سابق نائب صدر جمہوریہ ہند)

۹ "نورِ زندگی" ص۸

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۵ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ (ڈی) کے قاعدہ ۸ کے مطابق
ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں:

(۱) مقام اشاعت — لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت — ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ — پرکاش پیکیجرس۔ گولہ گنج لکھنؤ
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ — بھوانی شنکر شکلا۔ ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش، لکھنؤ۔
(۵) ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ — امیر احمد صدیقی، ہندستانی۔ ایڈیٹر نیا دور محکمۂ اطلاعات، لکھنؤ۔
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں — نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں بھوانی شنکر شکلا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) بھوانی شنکر شکلا (پبلشر)

غزلیں

ظفر گورکھپوری
ایف ۳۲ نیو میونسپل کالونی دیوبار بستی ۲۷۳۰۰۱

شعر میں، ساز میں، سینے میں کہ سر میں رہیئے
سارے گھر آپ کے گھر ہیں، کسی گھر میں رہیئے

چہرہ گردن پہ لگا دوں، تو پلا دیجے زہر
اُس گھڑی تک تو مرے دستِ ہنر میں رہیئے

ایسی تہذیب کی سولی سے فقیری اچھّی
سویئے سُکھ سے، کسی راہ گذر میں رہیئے

کوئی بہروپ، کوئی شور، کوئی ھنگامہ
حافظہ شہر کا ناقص ہے خبر میں رہیئے

میری قسمت میں سرابوں کا سفر لکھّا ہے
کم سے کم آپ مرے دیدۂ تر میں رہیئے

اُس کو ڈھونڈا تو تجسُّس کے یہ معنی نکلے
عُمر بھر اپنے ہی جذبے کے سفر میں رہیئے

دونوں بجھ جائیں گے، آنسو بھی، تبسّم بھی ظفر
اور کچھ دیر چراغوں کے نگر میں رہیئے

خالد علوی
محمد زئی۔ شاہجہان پور

سوچتا ہوں کہ یہ جینے کی ادا کیسی ہے
لبؑ پہ ہر وقت بکھرنے کی دُعا کیسی ہے

کسی چہرے پہ خراشیں نہیں میری جیسی
شہر اچھّا ہے مگر آب و ہَوا کیسی ہے

اُس کو جتنا پڑھا میں اور اُلجھتا ہی گیا
اُس ہتھیلی پہ وہ تحریرِ حنا کیسی ہے

جس سے ٹوٹا ہے اُسی پیڑ کا سایہ ڈھونڈے
برگِ آوارہ میں یہ رسمِ وفا کیسی ہے

ٹوٹنے والا ہے کیا تارِ نفَس آج کی رات
شام ہی سے یہ گھُٹن میرے خُدا کیسی ہے

تم نے سمجھوتہ کیا وقت سے یا ھار گئے
جسم پہ آج یہ پھولوں کی قبا کیسی ہے

اِتنا خاموش کبھی تجھ کو نہ دیکھا علوی
زندگی تیری یہ بے صَوت وصَدا کیسی ہے

زرینہ خان
پروفیسر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج فار وومنز
مولانا آزاد روڈ، سری نگر کشمیر

بانگِ درا کے تیسرے حصّے کی غزلوں کا تجزیہ

بانگِ درا کے تیسرے حصّے کی پہلی غزل ملاحظہ ہو:

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمّت بچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دُور وصالِ بحر ابھی تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزّت ہے محبت کی قائم اے قیس حجابِ محمل سے
محمل جو گیا عزّت بھی گئی، غیرت بھی گئی لیلیٰ بھی گئی

کی ترک تگ و دَو قطرے نے، تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

درج بالا غزل میں اقبال نے غزل کے تمام آداب اور روایات کی پابندی کی ہے. مگر موضوع کے لحاظ سے یہ غزل، غزل کے لغوی معنی سے انحراف بلکہ بغاوت کرتی نظر آتی ہے. اس غزل میں اقبال کا وہ مخصوص پیامِ عمل و پیامِ حیات بھی دیکھا جا سکتا ہے جس سے ان کی شاعری عبارت ہے، اس پیامِ عمل کے باوجود، اقبال نے محاسنِ شعر کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس بات کی غالباً شعوری کوشش کی ہے کہ ان کے یہ اشعار محاسنِ شعری کے بھی حامل ہوں تاکہ ان کے پیغام کے سننے والوں اور متاثر ہونے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو اور وہ اپنے اشعار سے جو کام لینا چاہتے ہیں، اس میں کامیابی حاصل ہو۔

اقبال کی شاعری کے اس دَور کی اہمیت اِس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسی دَور سے ان کے یہاں روایت سے انحراف بلکہ بغاوت کا عمل شروع ہوتا ہے. مثال کے طور پر، درج ذیل اشعار پر نظر ڈالئے. یہ اشعار اگرچہ غزل کی ہیئت میں نظم ہوئے ہیں اور ان میں شعریت بھی ملتی ہے، مگر اپنے معنی و مفاہیم کے اعتبار سے یہ غزل متقدّمین، متوسّطین اور متاخرین سب کی غزلوں سے مکمّل طور پر بغاوت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

پردہ چہرے سے اُٹھا، انجمن آرائی کر
چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

نفَسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

ہو تری خاک کے ہر ذرّہ سے تعمیرِ حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

اس گلستاں میں نہیں حد سے گذرنا اچھّا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

اس دَور کی ایک اور غزل ملاحظہ ہو:

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزلخواں ہو
غنچہ ہے اگر گُل ہو، گُل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے
برہم ہو پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو
تو جنسِ محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لَے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عُریاں ہو
اے رہروِ فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

اس غزل میں بھی اقبال نے غزل کے مزاج کے مطابق ہی الفاظ و تراکیب کا انتخاب کیا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان کے اشعار غزل کے دائرے سے باہر نہ نکلنے پائیں، لیکن جہاں تک معانی و مفاہیم کا تعلق ہے، اقبال نے اِس سلسلے میں نہ کسی کی تقلید کی ہے اور نہ کسی کی بولی بولنے کی کوشش کی ہے، بلکہ اس غزل میں ایسے خیالات پیش کئے ہیں، جن کو پیش کرنے سے، ان سے پہلے کے شعراء احتراز کرتے تھے۔ ادبی تنقید کی زبان میں ہم اقبال کی درج بالا غزل کو بھی متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی غزل کی توسیع کہہ سکتے ہیں۔

اقبال کے اس دَور کی غزل کے بارے میں مرحوم سید وقار عظیم نے ایک بڑی اچھی بات لکھی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ان کا اقتباس پیش کر دیں:

"بانگِ درا کے تیسرے دَور تک پہنچتے پہنچتے اقبال کا فکر ایک خاص نہج اختیار کر چکا ہے، پہلے دَور میں مسلسل بھٹکتے رہے اور کسی منزل کے تعین کے بغیر اس کی تلاش میں انتشار اور اضطراب کی جو بے بسی تھی، وہ دوسرے دَور میں کم ہوئی اور تیسرے دَور میں آکر ختم ہو گئی، یہاں اقبال کے فکر کی ایک منزل ہے اور اس لئے ان کے شعر میں پیام کی گرمی اور لہجہ کا یقین ہر جگہ چھایا ہوا ہے، اس گرمی اور یقین نے ان کے یہاں بیان کے عناصر میں بھی پختگی پیدا کی، اور شاعر کی شخصیت میں شعریت کی جو لطیف چنگاری ہمیشہ سے چمکتی رہی ہے اس نے بھی اب راکھ کے ڈھیر میں سے نکل کر بے حجابانہ اور بے باکانہ بھڑکنا شروع کر دیا ہے۔ غزل اور تغزّل کی روایت کا جو پَرتَو اس کی شخصیت کا خمیر بن چکا ہے، وہ اب پردے میں بھی چھپا نہیں رہتا۔ تغزّل کی علامتیں دوسرے دور میں کم اور پہلے دَور میں کمتر نظر آتی ہیں۔ تیسرے دَور میں آکر زیادہ واضح ہوئی ہیں، ان کے مفہوم میں بھی وسعت پیدا ہوئی ہے اور اسطرح دنیائے محبت کے رموز و اسرار کا ذکر، اب شاعر ایک تجربہ داں اور واقف کار، دانائے راز کیطرح کرتا ہے، ان میں اب روایت کا تصنّع کم اور ذاتی احساس و تجربہ کی جھلک زیادہ ہے اور فکر کے تجربات اور عشق کے مشاہدات دونوں دِل کے پیامی نظر آتے ہیں۔"[۱۸]

وقار عظیم کے اس بیان کے بعد بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اقبال کی غزل میں جو نئے نئے موضوعات آئے ہیں، ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

عقل و عشق

اقبال کے ہاں عقل و عشق ایک بلیغ موضوع ہے اقبال عقل کے ساتھ عشق کی آمیزش کو ضروری قرار دیتے ہیں، اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال عقل کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں اقبال اس کی اہمیت کو مانتے ہیں لیکن وہ دُنیا کی رہنمائی اس کو سونپنا نہیں چاہتے، اس لئے کہ عقل صرف استدلال کی بات کرتی ہے اور عشق استدلال سے دُور کی دُنیا کو بھی جا لیتا ہے۔ عقل اختراع کی قوّت رکھتی ہے لیکن اسکی رسائی خدا تک نہیں ہو سکتی، اِس لئے عقل گمراہی کی راہ پر بھی گامزن کر سکتی ہے لیکن عشق رُوحانیت کی منزلوں کو پا لینے میں کامیاب و کامران ہے۔ اقبال عشق کے شیدائی ہیں، وہ عقل کی دراز دستیوں سے نفرت کرتے ہیں وہ عشق کو عقل کی حرارت عطا کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال اپنی نظموں اور غزلوں میں عشق کی فوقیت کا اعلان کرتے ہیں۔ اقبال نے بہت سی جگہوں پر عقل و دل کے مکالمے لکھے ہیں، جن میں عقل یہ دعویٰ کرتی ہے کہ میں ہی رہنما ہوں اور میری پہنچ، میری اُڑان بہت زیادہ ہے، اس کے مقابلے میں عشق یہ دعویٰ کرتا ہے

کہ عقل تو صرف دُنیا کے راز سے واقف ہے لیکن میں تو باطن کے رازوں سے بھی واقف ہوں اور وہاں تک پہنچ جاتا ہوں جہاں عقل کی رسائی کسی طرح بھی ممکن نہیں

اب ہم بانگِ درا کے تیسرے حصے سے ایک غزل کے اشعار پیش کرتے ہیں جس میں عقل و عشق کے موضوع سے بحث کی گئی ہے:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سُبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زنّاریٔ بت خانۂ ایّام ابھی

اقبال عشق کو عقل پر جو فوقیت دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ:

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں ؛ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اس طرح کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں، جن سے اقبال کے نظریۂ عقل و عشق پر روشنی پڑتی ہے ؂

ترا جادہ کچھ بھی تسلّیٔ دلِ ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا، وہی آہِ نیم شبی رہی

ترِ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ لبی رہی

عشقِ رسولؐ

اس دَور کی غزلوں میں ابتدائی دَور کی غزلوں کے برعکس عشقِ رسولؐ کا موضوع بھی اقبال کے یہاں پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ بلادِ اسلامیہ، حضور رسالت مآبؐ، صدّیق اور بلال میں اس جذبے کی کارفرمائی خوب ملتی ہے۔ اقبال ایک بلند مرتبہ فلسفی ہونے کے باوجود گرویدۂ اسلام اور عاشقِ رسولؐ تھے۔ اقبال کی پوری زندگی کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقبال کا ماحول، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور اُن کے مشاہدات نے اُن کے اندر عشقِ رسولؐ کی آگ بھڑکا دی۔ حضورِ اکرمؐ کی صفات نے اُن کے اندر یہ شعلہ روشن کیا۔ اقبال کی تربیت جس ماحول میں ہوئی اس میں عشقِ رسولؐ اور اسلام کی محبت کو کافی دخل تھا، اُن کے والد صوفی منش آدمی تھے۔ اُن پر مذہب کا رنگ گہرا تھا۔ غرض اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے محبت اولیائے کرام سے عقیدت کا سبق اقبال نے آباء و اجداد سے حاصل کیا۔ نیز عربی فارسی، اُردو اور قرآنِ کریم و دینیات کی تعلیم مکتبوں سے حاصل کی، ان کے یہاں عشقِ رسولؐ کا جذبہ غزل میں ڈھل گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے بچلی امّت کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

ان موضوعات کے علاوہ اقبال نے غزل کو جس نئی فضا سے آشنا کیا وہ ہمارے خصوصی مطالعے کی مستحق ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

"حالی نے اُردو غزل کو بعض نئی سمتوں سے آشنا کیا، اس کے موضوعات میں وسعت پیدا کی ہے۔ پُرانے موضوعات کو تعمیری رُخ دیا ہے، اس کی بے مقصد لے کو مقصد سے ہم آہنگ کیا ہے، پھر بھی مولانا حالی کی غزل گوئی کی نوعیت اقبال کی غزل گوئی سے بہت الگ ہے، مولانا حالی نے اُردو غزل کو صرف ایک اسلامی رجحان دیا ہے۔ اقبال نے اسے ایک خاص انقلابی موڑ بخشا ہے۔"[6]

اس دَور کی ایک اور غزل ملاحظہ ہو ؂

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوفِ کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس غزل میں جوشِ بیان، ندرتِ طرزِ ادا اور حرکت ملتی ہے۔ اور اقبال وحدتِ جذبات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انسان متاثر ہو جاتا ہے۔ اس غزل کا غنائی لہجہ بھی دلوں کو گرمانے والا ہے۔ اور ترنّم کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے وہ اگر دردمندی کی باتیں کرتے ہیں تب بھی اس سے دل مایوس نہیں ہوتا بلکہ انسان میں نئی توانائی آجاتی ہے۔ اقبال اس میں تصوّف اور فلسفہ کی اصطلاحوں کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر "حقیقتِ منتظر" اقبال خدا کو کسی مادّی صورت میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اس غزل میں غنائی اسلوب کے علاوہ الفاظ کا انتخاب بھی اہمیت رکھتا ہے، اس غزل میں جوش و ولولہ کے ساتھ اقبال انسان سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے سینے میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اس کو عام کر دو یعنی قرآن کو عام کر دو، اور عشق میں بے خطر کود جاؤ۔ اگر دل تمہارا شکستہ ہو گیا ہے تو یہ باعثِ تشویش نہیں۔ کیونکہ محبوب کی نگاہ میں اس کی زیادہ قدر ہے۔ محبوب کو شکستہ دل پسند ہیں۔ اس غزل میں نگاہِ آئینہ ساز کی ترکیب بھی خوب ہے۔ انسان گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اور اللہ ان گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اب تو عشق کا یہ حال ہے کہ اس میں صداقت تام کی کوئی چیز نہیں رہی نہ تو غزنوی میں عشق کی تڑپ ہے اور نہ ہی ایاز میں خلوص موجود ہے۔ اس کے بعد اقبال مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ عبادت کی اوّلین شرط خلوص ہے۔ دل صنم آشنا کو نماز کا حقیقی کیف و سرور حاصل نہیں ہو سکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دل صنم کے بجائے اللہ کی محبت سے معمور ہو۔

اس دَور کی غزلوں کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ اقبال مغرب اور مادّیت کے خلاف کھُل کر اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

تیرے پیمانوں کا ہے یہ لے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بےہوش ہے

ہو تری خاک کے ہر ذرّہ سے تعمیر حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

مغرب اور مادّہ پرستی کے علاوہ اس دَور کی غزلوں میں ایک اور موضوع قرآن و حدیث ہے۔ اسلام اور اس کا مقصد ہمیشہ اقبال کے پیش نظر رہا ہے اس موضوع کو اقبال نے غزل کی دُنیا میں ایسا پھیلایا کہ یہ چیز غزل کی فضا میں ڈھل گئی۔ اقبال کی شاعری کا بنیادی سرچشمہ افکار قرآن ہے اور اقبال اس کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو پرکھتے ہیں۔ اقبال قرآن پر عمل کرنے کی دعوت ہر مسلمان کو دیتے ہیں وہ دنیا کے لئے قرآن کو دستور العمل سمجھتے ہیں۔ اقبال کے خطبات، ان کی نظم، ان کی غزل، سب پر قرآن کا پرتو ملتا ہے۔ اقبال ایک جگہ کہتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ میری ساری زندگی غیر اسلامی ماحول میں گذری لیکن میں نے اپنی زبان سے ہمیشہ قرآن و حدیث کے پیغام کا کام لیا ہے۔ غزل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اقبال کو مغرب نے ایک ٹھیٹھ مسلمان بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام اور اس کے احکام سے اور زیادہ نزدیک ہو گئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اقبال کے متعلق لکھتے ہیں :-

" مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہ رہا وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔" [۳]

یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ موضوع بھی غزل کو وسعت دینے میں کامیاب رہا اور وہ کہہ اٹھے ؎

بادہ گردان عجم وہ عربی میری شراب
مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مئے آشام ابھی

یہ موضوعات جو اقبال نے پیش کئے ہیں، غزل میں پہلے کم برتے گئے تھے لیکن اقبال نے ان کو غزل کی چیز بنا دیا، یہی اقبال کا کمال ہے، اقبال نے غزل میں ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کی اور اپنی فکر کو مربوط انداز میں پیش کیا، انھوں نے اِس تصور کو غلط ثابت کیا کہ غزل صرف عشقیہ جذبات کی ترجمان ہے۔

(باقی ص۴۸ پر)

دیاشنکر سکسینہ مخمور موجی

معرفت مسٹر سُریندر جیت سنگھ، نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۹۶/۱۶ دی مال کانپور نمبر (۱)

میرے وطن کی زمیں

یہ وطن کی زمیں، مسکراتی زمیں، جس پہ قربان ہے آج بھی آسماں
اس کا ہر روپ ہے، اس کی ہر بات ہے، دھرم کی آبرو، شانتی کا نشاں
آؤ اے آنے والو سنو غور سے گیت گاتی ہیں میٹھے سُروں میں یہاں
جھومتی اور بہتی ہوئی ندیاں، چاندنی میں نہائی ہوئی گھاٹیاں
اس کا ہر ذرّہ سورج کا پرکاش ہے، جس کو دھرتی سمجھتے ہو آکاش ہے
اس میں پرگٹ ہوئے ہیں مُنی اور رِشی، اس نے پیدا کئے ہیں بہادر جواں
صاف جھیلوں کے پانی میں کھلتے کنول، جیسے پریوں کا جھرمٹ نہاتا ہوا
ہلکی ہلکی سی لہریں ہیں اتنی حسیں، جیسے گنگا نہائی ہوئی دیویاں
اپنے کاندھوں پہ رکھے ہوئے اپنے ہل صبح ہوتے ہی کھیتوں کے راجہ چلے
جھومتی مست بیلوں کی جوڑی چلی، گردنوں کی وہ بجنے لگیں گھنٹیاں
پھول اور پتّیاں تھالیوں میں لئے، مندروں میں چلے ناریوں کے پرے
کیش ہیں اُن کے ساون کی کالی گھٹا، اُن کے چہرے ہیں یا کوندتی بجلیاں
جو بھی دیکھے اُنھیں، اُس پہ جادو کریں جسکی نظریں اٹھیں اُس کا من موہ لیں
سادہ دل باسیوں کی بسائی ہوئی، جھلملاتی ہوئی خوشنما بستیاں
اس میں گنگا بھی ہے اس میں جمنا بھی ہے اسمیں پریاگ بھی ہے بنارس بھی ہے
اور بھی ملک دُنیا میں اے تجر ہیں، لیکن اُن میں کہاں ایسی رنگینیاں

☆

مناظر حسن، شاہین

گیا۔ بہار

سب کے پیشِ نظر ہے صِفر نصاب
کون پڑھتا ہے آج دل کی کتاب
خشک پھولوں پہ اشک کی تحریر
یوں بھی آیا ہے میرے خط کا جواب
ہر بشر کو ہوس ہے پانے کی
اِس جہاں کو جو وصل میں ہے سَراب
ڈوب کر عشق کی نگاہوں میں
حُسن بنتا ہے گوہرِ نایاب
میرے ساقی ترے ایاغوں میں
اشک زائد ہیں اور کم ہے شراب
اِس پہ کب تک غرور اے شاہیں
زندگی ہے مگر بہ شکلِ حباب

غزلیں

گہر خیرآبادی کالاپیادہ۔ خیرآباد ضلع سیتاپور

راس آیا دشت ہی مجھے دل ٹوٹنے کے بعد
دیکھا نہ کوئی دَر ترا دَر چھوٹنے کے بعد
سب کچھ لُٹا کے مجھ کو سکوں مل گیا مگر
پچھتا رہے ہیں وہ مرا گھر لُوٹنے کے بعد
جھوٹی تسلّیوں سے نہ بہلائیے مجھے
آئینہ جُڑ سکا ہے بھلا ٹوٹنے کے بعد
کچھ سوچتے ہیں جاتے ہوئے سوئے آشیاں
قیدِ قفس سے اہلِ چمن چھوٹنے کے بعد
پژمُردہ دل کے لب پہ تبسّم کہاں گہر
کب تک ہنسے گا شاخ سے گُل ٹوٹنے کے بعد

کاظم علی خاں
۲۰۱۔ وکٹوریہ اسٹریٹ
لکھنؤ

گذشتہ لکھنؤ کی چند جھلکیاں

ہندستان کے نقشے پر علوم و فنون، شعر و ادب اور تہذیب و معاشرت کے میدانوں میں شمالی ہند کے جن شہروں نے ملک گیر شہرت پائی ان میں لکھنؤ ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ وہ گنگا جمنی مشترکہ تہذیب جو آج ہندستان کا سرمایہ افتخار قرار دی جاتی ہے اسے سرسبز و شاداب رکھ کر قومی یکجہتی کے برگ و بار سے ہم کنار کرانے میں لکھنؤ کی زرخیز سرزمین نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے وہ ملک کی ثقافتی تاریخ میں ایک تابناک باب کا عنوان بن گیا ہے۔ علم و فن کے خارزاروں کی دشوار گذار راہوں میں خاک چھاننے والوں کی پیاس بجھانے کے لئے خاکِ لکھنؤ کے پاس علوم و فنون کے وہ سرچشمے جاری رہے ہیں جنھوں نے ہندستان کے گراں قدر علمی اور ثقافتی سرمائے کی آبیاری کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ عالمی شہرت و مقبولیت رکھنے والا علمی نصاب "درسِ نظامی" لکھنؤ کے اسی معمورۂ علم و دانش کے گہوارہ فرنگی محل میں پروان چڑھا ہے۔ اُردو اور ہندی کے درمیان لسانی کش مکش کی خلیج کو پاٹنے کی غرض سے انشاؔ نے اسی لکھنؤ کی سرزمین پر "رانی کیتکی کی کہانی" کی شکل میں ایک ایسا لسانی پل تعمیر کیا تھا جو آج بھی لسانی منافرت کو دُور کر کے دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتا ہے۔ انشاؔ کی تحریر کردہ یہ کہانی آج بھی ہندی اور اُردو کے حلقوں میں سرمایۂ عزیز کی حیثیت رکھتی ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے لکھنؤ اودھ کے اس قدیم تاریخی علاقے میں واقع ہے جسے "زرخیزی میں ہندستان کا باغ اور مردم خیزی میں ہندستان کا دماغ" ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اودھ کے شمال میں "فصیل کشور ہندستان" ہے جس کی پیشانی کو "آسمان جھک کر چومتا ہے اور چوٹی کو سورج اپنی کرنوں سے گوندھتا ہے" سرزمینِ ہندستان کے مشہور ترین دریا جن کی مست خرام روانی ہندستان کی سرسبزی اور شادابی کی ضامن و امین ہے، اودھ کے اس زرخیز علاقے کو ہزاروں سال سے اپنی جولانگاہ بنائے ہوئے ہیں۔ اودھ کے ان دریاؤں میں گنگا اور جمنا سرفہرست ہیں جن کے کناروں پر ہندستان کی تہذیب پنپی اور پھلی پھولی ہے۔ عہد حاضر میں اودھ اترپردیش کے نام سے موسوم ہے۔ اس علاقے کے پہاڑوں اور جنگلوں میں نباتات و حیوانات کی بہتات ہے جن کے بل بوتے پر یہاں خوش حالی کا دور دورہ رہا ہے۔ آب و ہوا کے اعتبار سے اس علاقے کے موسم گرمی، سردی اور برسات میں معتدل اور خوش گوار رہتے ہیں۔ ان سازگار جغرافیائی حالات نے اس علاقے کی زراعت اور صنعت و حرفت پر بھی خوش گوار اثر ڈالا ہے۔[1] اودھ کے اس پرسکون اور سازگار ماحول میں لکھنؤ اگر علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت کا اہم مرکز بنا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے جس طرح لذیذ اور اعلا درجے کے پھل شاداب باغ ہی میں پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح باصلاحیت انسان بھی مردم خیز علاقے میں

ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اودھ (یعنی موجودہ اتر پردیش) اس بات پر جتنا بھی فخر کرے وہ کم ہے کہ اس علاقے نے آزاد ہندستان کو پے درپے اور یکے بعد دیگرے ملک کی سیاسی سربراہی کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی جیسے باصلاحیت وزیر اعظم فراہم کیے جن کی بدولت آج ہندستان تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں صف اوّل کا مقام حاصل کر چکا ہے۔

لکھنؤ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کے ایک قدر شناس نے لکھا ہے کہ "لکھنؤ کو حسن و جمال میں پرستان، سپہ گری میں سیستان، علم و حکمت میں یونان، تہذیب و تمدن میں ایران، شعر و سخن میں اصفہان، اہل کمال کی کثرت میں نصف جہان" کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ سرزمین لکھنؤ کی تعمیر و تشکیل کی داستان اپنے ارتقائی سفر میں نشیب و فراز کی جن منزلوں سے گزری ہے ان کا اجمالی بیان بے محل نہ ہوگا۔

مقامی روایات کی رو سے اس شہر کے ابتدائی نقوش رام چندر جی کے بھائی لکشمن جی کے دور میں معرض وجود میں آئے تھے اور اس وقت اس شہر کا نام لکشمن پوری تھا جو رفتہ رفتہ لکھنؤ ہو گیا۔ جغرافیائی اعتبار سے ہندستان کے نقشہ پر یوں تو لکھنؤ سیکڑوں سال سے موجود ہے مگر اس شہر کی اصل ترقی جولائی ۱۷۷۵ء مطابق جمادی الاول ۱۱۸۹ھ کے بعد اس وقت ہوئی جب والی اودھ نواب آصف الدولہ نے اسے اودھ کی راجدھانی بنایا۔ عہد آصفی سے قبل برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے زمانے میں (یعنی ۱۷۲۲ء سے ۱۷۷۵ء تک) اودھ کا پایۂ تخت فیض آباد رہا تھا۔ اوائل عہد آصفی تک لکھنؤ خاصا بے رونق شہر رہا ہے۔ اوائل عہد آصفی تک لکھنؤ جس زبوں حالی سے دوچار تھا، اس کا ذکر کئی معاصرین نے کیا ہے جن میں مرزا ابوطالب خاں لندنی، میر حسن، ولیم ہوجز اور جارج فارسٹر کے نام شامل ہیں۔ ان معاصرین نے اس دور کے لکھنؤ کی بے رونقی کی جو آنکھوں دیکھی تصویریں پیش کی ہیں وہ خاصی تاریک ہیں

عہد آصفی کے مورخ ابوطالب خاں لندنی نے ۱۷۷۵ء (۱۱۸۹ھ) میں حسن و دلکشی سے محروم جس لکھنؤ کو دیکھا تھا، اس کی کیفیت یہ تھی:-

"......لکھنؤ کی زمین اونچی نیچی ہے اور بازار اور گلیاں بہت تنگ ہیں۔" [۵۳]

عہد آصفی کے مشہور مثنوی نگار میر حسن نے اپنی مثنوی "گلزار ارم" ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں مکمل کی تھی۔ اس مثنوی میں ۱۷۷۸ء کے لکھنؤ کی جو تصویر پیش کی گئی وہ ان اشعار سے ظاہر ہے [۵]

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا گھر ہوا ہے آسماں میں — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
سیہ گل سے گلی یوں ترہے ہے — بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی — کہیں پستی ہے اور گاہے بلندی
ہر اک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے — ہوا کا بھی بہ مشکل واں گزر ہے
سحر تک شام سے رہتا ہے دھڑکا — مبادا بھیڑیا لے جائے لڑکا
بھلا اس طرح سے آرام کد ہو — رہے یاں وہ جو کوئی لاولد ہو
کوئی یاں سیر کے قابل نہیں جا
کہ جا کر دیکھیے واں ٹک تماشا [۵۴]

اوائل عہد آصفی ہی کے ایک بیرونی سیاح ولیم ہوجز نے لکھنؤ کے بارے میں لکھا ہے:-

"شہر ...... بہت بری طرح آباد ہے۔ مکانات زیادہ تر .... (کچے) ہیں جن پر چھپر پڑے ہوئے ہیں .... بہت کم باشندوں کے مکانات اینٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں پیچیدہ، تنگ اور اتنی بری حالت میں ہیں کہ میں نے ہندوستان میں کسی اور مقام پر ایسی خراب حالت میں نہیں دیکھیں ...... برسات میں کیچڑ اتنی گہری ہوتی ہے کہ انسان گزر نہیں سکتا۔" [۵۵]

ایک انگریز سیاح جارج فورسٹر نے جنوری ۱۷۸۳ء میں اپنے

سفر لکھنؤ میں اس شہر کا جو حال پایا، اس کا چشم دید بیان بھی ملاحظہ ہو :۔

" لکھنؤ، بڑا اور آباد شہر ہونے کے باوجود نزاکت
اور نفاست سے بکسر عاری ایک قطعی بے تکا شہر ہے
اس کی سڑکیں تنگ، ناہموار اور ہر قسم کی غلاظت
سے پُر ہیں۔" [۵] (انگریزی سے ترجمہ)

۱۸۲۳ء کا یہی سیر گاہوں سے خالی بے رونق لکھنؤ والیانِ اودھ[۶] کے زیر سایہ عہد بہ عہد نت نئی عمارتوں، باغوں اور دل فریب سیر گاہوں سے معمور ہوتا رہا، نئے نئے محلے بسائے جانے لگے سوئے ہوئے سنسان علاقے ہجوم در ہجوم انسانوں کی چہل پہل سے جاگ اُٹھے۔ ایک انگریز سیاح ولیم نائٹن عہد نصیر الدین حیدر کے ترقی یافتہ لکھنؤ کا حال یوں بیان کرتا ہے :۔

" جب سے دہلی کا عروج مٹا ہے ..... اس
وقت سے ہندستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں
جو لکھنؤ سے تموّل اور شان و شکوہ کے لحاظ سے
دعوائے ہمسری کر سکے۔" [۷]

مرزا غالب دہلوی بہ عہد غازی الدین حیدر ۱۸۲۶ء میں جب لکھنؤ آئے تو انھوں نے ایک فارسی قصیدے میں لکھنؤ کے متعلق اپنے تاثرات یوں نظم کیے تھے [۸]

اندر آں بقعۂ معمور ز دل تنگیِ خویش
حسرت آگیں چو گنہ گار بہ زنداں رفتم
سبزہ رنگ طراوت بہ خزاں باختہ ام
خس شدم تا بہ چراگاہِ غزالاں رفتم [۹]

غالب نے ان فارسی اشعار میں اپنے ورودِ لکھنؤ کے متعلق کہا ہے کہ میں اس بھرے پُرے علاقے میں اپنی دل تنگی کے سبب حسرتیں لیے یوں آیا ہوں جیسے گنہ گار زنداں میں جائے۔ میں وہ سبزہ ہوں جو اپنی ہریالی اور اپنے رنگ و رُوپ کو خزاں کے حوالے کر چکا ہو اور اب میں اس چراگاہِ غزالاں تک بھوسا ہو جانے کے بعد پہنچا ہوں۔ ۱۸۲۶ء میں لکھنؤ کو دیکھ کر غالب کا دل برابر یہاں کی حسین یادوں سے معمور رہا۔ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کی بربادی پر غالب دہلی میں تڑپ اُٹھے اور انھوں نے اپنے کئی خطوں میں لکھنؤ کا ذکر کیا ہے۔ خطوطِ غالب کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں :۔

(الف) " لکھنؤ کا کیا کہنا ہے، وہ ہندستان کا بغداد تھا
اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی، جو بے سروپا وہاں
پہنچا امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے۔" [۱۰]

(ب) " ہائے لکھنؤ! کچھ کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا
گزری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے،
خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا۔" [۱۱]

(ج) " لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو
جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔" [۱۲]

(د) " ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان
چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے
الفاظ کو چمکا دیا......" [۱۳]

شاہی عہد کے لکھنؤ کے بارے میں ایک مغربی سیاح ولیم ہاورڈ رسل کے درج ذیل تاثرات بھی دلچسپی سے خالی نہیں :

" تابندگی اور تازگی کے ایک ساکت و ساکن سمندر
میں سے ابھرتے ہوئے محلوں، میناروں، لاجوردی
اور زریں گنبدوں اور قبوں، قطار اندر قطار ستونوں،
حسین متناسب پایوں والے طویل رو کاروں، سائبان
دار چھتوں کا ایک منظر، میلوں میل نظر دوڑائے جاؤ
یہ سمندر پھیلتا چلا جاتا ہے اور اس کے بیچ بیچ میں
اُبھرے ہوئے اس پرستانی شہر کے مینار چمکتے
دکھائی دیتے ہیں۔ سونے کے کلس دھوپ میں
دمکتے ہیں، بُرج اور گنبد یوں جھلملاتے ہیں جیسے

ستاروں کا جھرمٹ .... ہمارے سامنے ایک شہر ہے جو پیرس سے زیادہ وسیع اور خوبصورت ہے۔ کیا یہ شہر اودھ ہی میں ہے؟ کیا یہ ایک نیم وحشی قوم کا دارالسلطنت ہے جسے ایک ..... زبوں حال شاہی گھرانے نے سجایا ہے؟ مجھے اعتراف ہے کہ میں بار بار اپنی آنکھیں ملنے پر مجبور تھا۔ کیا روم، کیا ایتھنز، کیا قسطنطنیہ، بلکہ کوئی بھی شہر جو اب تک میری نظر سے گزرا ہے مجھے اتنا دلکش اور حسین نہیں محسوس ہوتا اور جتنا جتنا میں اسے دیکھتا ہوں ہوں، اس کی خوبیاں مجھ پر کھلتی جاتی ہیں"۔ ؎۱۴

اودھ کے حکمرانوں نے اس شہر کو اپنی حکومت کے خاتمے (یعنی فروری ۱۸۵۶ء) تک علم و فن اور تہذیب و معاشرت کا ایک ایسا شان دار مرکز بنا دیا تھا جہاں نفاست، نزاکت اور مذہبی رواداری کا ایسا دور دورہ تھا کہ ہر فن کے اہلِ کمال دُور دُور سے کھنچ کر یہاں جمع ہوگئے اور یہیں کے ہو گئے۔

اس طرح لکھنؤ عہد شاہی میں اہلِ کمال کا ایک زبردست مرکز بن گیا۔

★

حواشی:۔ ؎۱ لکھنؤ کے جغرافیائی حالات کے لیے محمد باقر شمس کی تالیف "تاریخِ لکھنؤ" حصہ اوّل مطبوعہ کراچی ص ، سے استفادہ کیا گیا ہے۔

؎۲ لکھنؤ کے ان ابتدائی حالات کی تفصیل کے لیے دیکھیے (۱) "تاریخ لکھنؤ" مولانا آغا مہدی. کراچی طبع ۱۹۷۶ء صفحات ۲۶ تا ۲۷، (۲) گزشتہ لکھنؤ، مولانا شرر لکھنوی، لکھنؤ طبع ۱۹۷۴ء ص ۲۰ تا ۲۸، (۳) گزیٹیر آف اودھ (جلد دوم)

؎۳ تاریخ آصفی" ص ۳۶

؎۴ "مثنویات میر حسن"، مرتبہ مولانا آسی ص ۱۵۰ تا ۱۵۳

؎۵ بہ حوالہ ڈاکٹر صفدر حسین: "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" ص ۱۶۳

؎۶ بہ حوالہ انگریزی کتاب "شجاع الدولہ" (جلد دوم)؛ ڈاکٹر اے ایل، سریواستوا ص ۳۱۴

؎۷ لکھنؤ کی تعمیر اور ترقی میں ۱۷۷۵ء سے فروری ۱۸۵۶ء تک اودھ کے جن حکمرانوں نے حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں: نواب آصف الدولہ، نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

؎۸ بہ حوالہ "رجب علی بیگ سرور"؛ ڈاکٹر نیر مسعود الہ آباد طبع ۱۹۶۷ء ص ۲۴

؎۹ "کلیات غالب" مطبع نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء ص ۳۱۰

؎۱۰ "اُردوئے معلیٰ" (حصۂ اوّل)؛ غالب۔ دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۲۹

؎۱۱ "عود ہندی"، غالب۔ میرٹھ طبع اکتوبر ۱۸۶۸ء (رجب ۱۲۸۵ھ) ص ۱۰۱

؎۱۲ ایضاً ص ۹۱

؎۱۳ "اُردوئے معلیٰ" (حصہ اوّل) ص ۱۵۴

؎۱۴ بہ حوالہ "رجب علی بیگ سرور"، ڈاکٹر نیر مسعود ص ۲۹

حامد مینائی

محلہ تارین ٹکلی متصل تاروں والا باغ۔ شاہجہان پور

سرد ہے اب گرمیِ بازار بھی
بجھ چلی ہے خواہشِ دیدار بھی

میں ہی اک تنہا نہیں ہوں دھوپ میں
دھوپ میں ہے سایۂ دیوار بھی

تیز جھونکوں میں کہاں قصرِ امید
رفتہ رفتہ مٹ گئے آثار بھی

ہم تمہارے شہر میں آ تو گئے
ہیں ہمارے ساتھ کچھ افکار بھی

کس قدر سونی ہے زنداں کی فضا
اب نہیں زنجیر کی جھنکار بھی

ہم زمانے سے جدا یوں ہو گئے
تیز تھی کچھ وقت کی رفتار بھی

اس طرف کے لوگ کیسے لوگ ہیں
دیکھ لو حامد ندی کے پار بھی

رئیس رامپوری

بے ٹنک روڈ۔ رامپور ۲۴۴۹۰۱

تیرے لب پر پیار کا پیغام ہونا چاہیئے
زندگی تیرا محبت نام ہونا چاہیئے

آرزو کافی نہیں اونچی اڑانوں کے لئے
بازوؤں میں بھی تو استحکام ہونا چاہیئے

کہہ سکیں ہم بھی کہ ہم پر بھی جوانی آئی تھی
کچھ نہ کچھ اس دور میں بدنام ہونا چاہیئے

کیوں اِدھر آئے ہو صاحب پوچھ سکتا ہے کوئی
پہلے اس کوچے میں کوئی کام ہونا چاہیئے

اس کی رحمت کی قسم ایسا مگر ہوگا نہیں
ویسے تو میرا برا انجام ہونا چاہیئے

پھر مسرت کی حقیقت بھی عیاں ہو گی رئیس
پہلے عرفانِ غم و آلام ہونا چاہیئے

نصیر ناطقی

اسکی آنکھوں نے کہیں پھر نہ چراغاں دیکھا
جس نے نزدیک سے تجھ کو شبِ ہجراں دیکھا

فصلِ گُل پر نہیں موقوف کوئی وحشتِ دل
ہم نے حالات کے ہاتھوں میں گریباں دیکھا

کر لیا غیرتِ احساس کا ماتم ہم نے
جب بھی انسان کو شرمندۂ احساں دیکھا

جن کو کچھ نقشِ قدم چھوڑ گئے راہوں میں
انہیں بکھرے ہوئے ذرّوں کو بیاباں دیکھا

کھلنے پایا نہ کبھی حلقۂ زنجیرِ نفس
یہ بھی اعجاز ترا گردشِ دوراں دیکھا

کشتیٔ عزم کو موجوں میں بہایا ہم نے
جب بھی انگڑائیاں لیتا ہوا طوفاں دیکھا

زندگی کرب کی تصویر ہے دنیا میں نصیر
ہم نے انسان کو انساں سے گریزاں دیکھا

مولانا محمد علی جوہر اور غزل

شمیم ہاشمی
ڈی۔ وی۔ سی کالج۔ بی ٹی پی ایس
بوکارو تھرمل ۸۲۹۱۰۷ گرڈیہہ
(بہار)

خیز صوت خود بہ آہنگ رجز تبدیل کن
آتشے در سینہ واری درلوا تحلیل کن

مولانا جیسی رنگا رنگ اور منفرد شخصیت کم یاب ہے۔ وہ بیک وقت ایک بلند پایہ صحافی و مفکر، مہتمم بالشان ماہر تعلیم، جلیل القدر مذہبی رہنما، مجاہدوں کے مجاہد، ہندوستان کی تحریک آزادی کے ہیرو اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز شاعر تھے۔ ٹائمز آف انڈیا کے صفحات اور خود اُن کی ادارت میں شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ "کامریڈ" (۱۹۱۱ء) اور اُردو "ہمدرد" (۱۹۱۳ء) نہ صرف ان کے صحافی ہونے کی سند ہیں بلکہ اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ جدید صحافت کے بانی مبانی اور انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں نئے فکر دانشار کے انقلابی داعی اور معمار تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام، اس کی نصاب تعلیم کی ترتیب، مولانا کے لکچرز کے سیریز، اشاعت اسلام اور فرزندانِ توحید کی بے لوث خدمت کا جذبۂ لامتناہی اور ہندوستان سے افغانستان تک گونجتے ہوئے خلافت کے ولولہ آفریں نعرے ان کی مثالی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ اس محبِ وطن کو رئیس الاحرار کے نام سے یاد کرتی ہے، وہ آزادی کے ایسے متوالے تھے کہ غلام ملک میں مرنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے اس جذبے کا اظہار کیا تھا:

"...... میں نوآبادی کا درجہ لینے نہیں آیا ہوں، میں مکمل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں، میں آج جس مقصد کے لئے آیا ہوں وہ یہ ہے کہ جب میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں غلام ملک میں لوٹ کر واپس جانا نہیں چاہتا، مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے، غربت کی موت منظور ہے، اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی......"

اور ہوا بھی یہی۔ گول میز کانفرنس کے دوران ہائڈ پارک ہوٹل لندن میں چند روز زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر مولانا نے دارِ فانی کو خیرباد کہا (۱۹۳۱ء) "زندہ دارد مرد را آثار مرد" مولانا کے کارنامے رہتی دنیا تک اُنہیں زندہ رکھیں گے، تشنگانِ علم وادب اور پرستارانِ حریت اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے رہیں گے۔

اب آئیے ان کی شاعرانہ عظمت وکمال کا جائزہ لیں ـــــ میدانِ شاعری میں بھی ان کی شخصیت منفرد ہے۔ غزل کی روح بڑی نازک اور لطیف ہے ایک طرف غزل کی نزاکت ولطافت، تغزل کا عاشقانہ لب ولہجہ اور دوسری طرف مولانا کی انقلابی اور آتشیں شخصیت، ملّی اور سیاسی سرگرمی، جہاد کی ولولہ انگیز للکار، اور برسرِ عام شعلہ فشاں تقریروں کا سلسلہ۔ غزل ایک روایت اور انقلاب ایک بغاوت۔ پھر بھی اس انقلاب کے متوالے اور میدانِ سیاست کے جیالے کا دل غزل کی نازک اندامی پر ہی مائل ہوا۔

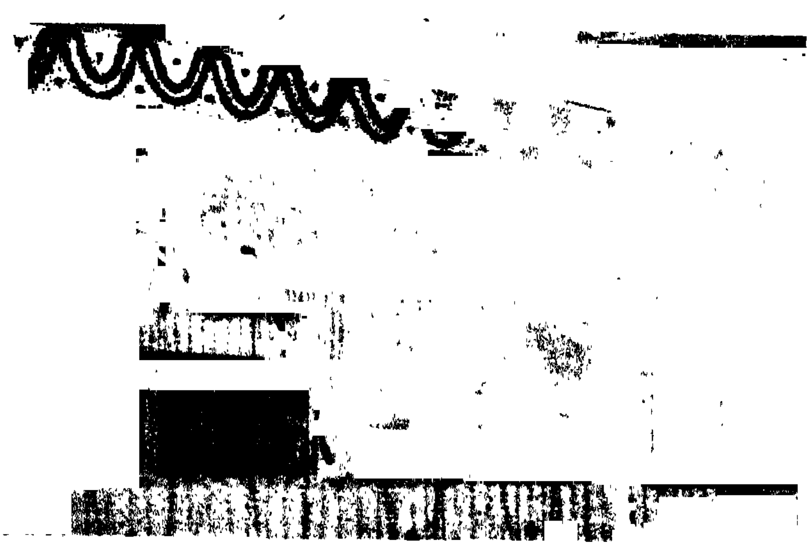
یہی مولانا کی رنگا رنگ شخصیت کا ایک رنگ ہے جو سیاست، عشق اور ایمان سے گھل مل کر اُن کی شخصیت کا اہم جزو بنا، اور انقلاب کی جوشیلی اور باغی روح کا



وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۱۲ مارچ ۸۵ء کو کریملن میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ (اور موجودہ صدر، سوویت یونین) شری میخائل گورباچوف کے ساتھ۔

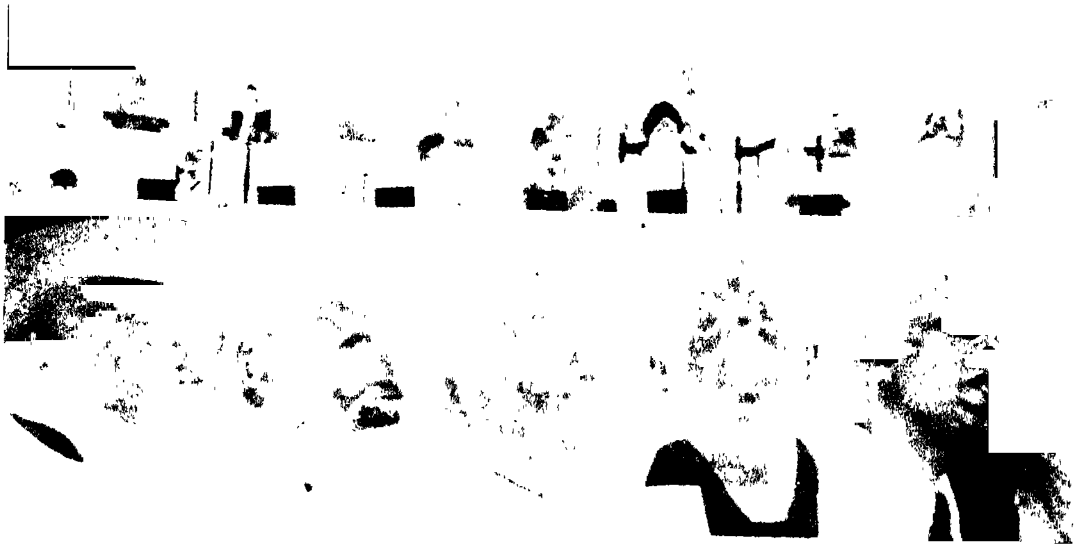
وزیر اعظم شری راجیو گاندھی، ۱۳ مارچ کو ماسکو میں صدر پاکستان جنرل ضیاالحق سے گفتگو کرتے ہوئے۔





وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۲۳ مارچ ۸۵ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے سالانہ کنووکیشن کا افتتاح کرتے ہوئے۔

صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل
ادب ایوارڈ کمیٹی (اتر پردیش) کی
(اردو) اور شری ٹھاکر پرشاد سنگھ (
اسی موقع کی ہیں - وزیر اعلا اتر پرد
اس تقریب میں مہمان خصوصی کی







اردو سماج





ہ نے اس سال ہندی اردو
ب سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ندی) کو ایوارڈ دیے۔ یہ تصاویر
شری نرائن دت تیواری
یت سے شریک ہوے۔
——— (تصویر: ست بخشی)

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۶ اپریل ۸۵ء کو لکھنؤ میں
کھادی گرام ادیوگ کمیشن کے جلسے کو خطاب کرتے ہوے۔



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری لکھنؤ میں ہندی کے ممتاز صحافی
شری مکند دیو شرما کے جسدِ خاکی پر پھول چڑھا کر انھیں خراجِ عقیدت
پیش کرتے ہوے۔

ے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک شام نئی غزل کے نام" کا ایک منظر۔





یکم اپریل کو لکھنؤ میں پاکستانی شاعر سلیم کوثر کے اعزاز میں منعقدہ ادبی جلسے کے مناظر
سلیم کوثر تصویر میں دائیں سے دوسرے نمبر پر نظر آرہے ہیں۔
—— (تصویر: نئے بخشی)

لکھنؤ میں ۱۶ مارچ کو اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک ریاستی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جسے اترپردیش کے وزیر تعلیم شری سبط رضی نے بھی خطاب کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



رشتہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ غزل کی نازک اور لطیف رُوح سے جوڑ دیا۔
خدا نے مولانا کو روحوں کو تڑپانے اور دلوں کو گرمانے کی صلاحیت ودیعت فرمائی تھی، اِسے اُنھوں نے اپنی غزلوں میں کامیابی کے ساتھ سمو دیا۔ غزل کا سوز و گداز سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:۔

"مولانا محمد علی کی شخصیت میں اُن کا سوز و گداز اور اُن کی والہانہ سپردگی اور ربودگی جاذبِ نظر تھی۔"

مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:۔

"محمد علی نے اپنی زندگی میں بیشمار دکھ جھیلے، صدمے اُٹھائے اور اُن کی عمر ہی کہنا چاہیئے کہ مجاہدات اختیاری و اضطراری کی نذر رہی۔"

یہ بیشمار دکھ اور اضطراری مجاہدے غزل کو شانِ تغزّل بخشتے ہیں ـــــ
رشید احمد صدیقی کی رائے ہے:

"محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی اُفتادِ طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے۔"

یہ آرٹ بھی مولانا کی غزلوں میں جلوہ گر ہے۔
خود مولانا اپنی شاعری کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"آپ میری شاعری کے بارے میں کیا پوچھتے ہیں، بچپن میں تو بہت سے ایسے سامان بہم ہوگئے تھے کہ میں زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا، رام پور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے ٹوٹے ہوئے ستارے رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا، تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے۔ میں اگر دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پیدا ہوا تو بیجا نہ ہوگا، مگر میرا دعویٰ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ سنئے! میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اُس کی توند پر کُودا ہوں، اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر بیٹھا ہوں، غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی جو میں نے شعر و ادب کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس کی عمر میں بہت لغو، فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ وہ کسی کو یاد نہیں، علی گڑھ میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق، اگر اصلیت تھی تو بس اتنی جتنی ایران کی شاعری کو اور سبزہ اور خط وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوٹا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ اور گرہ میں مال سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تقویٰ کی طرف مائل تھا دو برس کے قریب ہندوستان کے دھاگے ہی نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور خیال نے، مگر یہ آخری خیال باعصمت تھا۔ اور محض گرد و پیش کے حالات اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد ہندوستان واپس آئے تو زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گزشتہ چند سالوں میں ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی، البتہ پچھلے دو تین برس میں عشقِ حقیقی رنگ لایا ہے، اور تغزّل کا زور ہے، یہ اپنی تنگ آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت میں کچھ نہیں لکھ سکا، لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر طبیعت پر جب خود ہی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ نہایت مجبوری کچھ کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ علاوہ تلاوتِ قرآن پاک کے، تسکینِ قلب رہ گیا ہے۔"

مولانا کی اِس تحریر سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں ـــــ ان کی آنکھیں شاعرانہ ماحول میں کھلیں جہاں داغ، امیر، تسلیم، جلال اور عروج جیسے شعراء کے کلام کی گونج تھی، مولانا کا شاعری سے لگاؤ بچپن سے ہی تھا۔ طبیعت زہد و تقویٰ کی طرف مائل تھی، اُنھوں نے رسمی شاعری بھی کی لیکن جب عشقِ حقیقی رنگ لایا تو تغزّل کا زور غالب ہُوا، وہ کسی بیرونی تحریک کے غلبے کے تحت شعر کہتے تھے اور یہ شعر گوئی اُن کے لئے ذریعۂ تسکینِ قلب تھی۔
مولانا کی شخصیت اور شاعری کی تاریخ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ

وہ مدتوں اندر ہی اندر جذبے کی شدت کی بھٹی میں سلگتے رہے۔ خاص کر جیل کی تنہائیوں میں یہ بھٹی اور بھی شدت سے بھڑک اٹھی، اس آگ نے انہیں آدابِ عشق سکھایا، عشق نے ولولوں کو جلا بخشی، جذبے کی صداقت اور شدت، غزل کے سانچے میں ڈھل کر اور نکھر گئی ۔

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دل کی لگن کچھ اور کہتی ہے

جور گلچیں یاد رکھ، قیدِ قفس کا غم نہ کر
چین کب اے بلبلِ نالاں تجھے گلشن میں تھا

یقیناً فصلِ گُل میں پھر نکل بھاگا ہے زنداں سے
وہی شورِ سلاسل ہے، وہی دیوانہ آتا ہے

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں مُلاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

جناب غلام حسین اظہر کی رائے ہے :-

" مولانا کے اسلوب میں زبان و بیان کی خصوصیات، داغ کی شعری تربیت، کلاسیکی شاعری کے گہرے مطالعے کے اثرات شامل ہیں، نیز جذبات و احساسات، سیاسی زندگی اور مشاہدِ حقیقی اور قلبِ مطمئنہ کی واردات بھی۔"

درج ذیل اشعار بطور مثال ملاحظہ کریں :

لو وہ آ پہنچا جنوں کا قافلہ
پاؤں زخمی، خاک منہ پر، سر کھلے

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستمگر نے جہاں رکھا ہے

مجھے انکار وصلِ غیر پر کیوں کر نہ شک گزرے
زباں کچھ اور بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

غیر کا خط ہے یا دل ہے کسی دلدادہ کا
کچھ تو ہے تم نے جو مٹھی میں چھپا رکھا ہے

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی
مظلوم کی دُعا بھی کبھی بے اثر گئی

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ راہ دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

ہر رنگ میں رُاضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کی فضا دیکھ

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

آخر میں اس مردِ مجاہد کا وہ شعر پیش خدمت ہے جو برسوں سے ہمارے آپ کے ذہن و دل پر منقوش ہو کر ہر قدم پر حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے:۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مومن خان شوق
اشرف ولا ۲۲۷-۳-۱۱ ملے پلی،
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

قطعات

نذرِ فیض

محفلِ شعر و سخن نم دیدہ ہے
فیض سا ماہِ منورّ چل بسا
جس کے دم سے شہرِ غم آباد تھا
کیا کہیں کیسا سخنور چل بسا

یہ سعادت کم ہی لوگوں کو ملی
فیض سے اُردو نے پایا مرتبہ
کامیابی مرحلہ در مرحلہ
فیض تھے اردو ادب کا حوصلہ

شاہد ساگری

محترم ——— تسلیمات
آپ کی خدمت میں ایک نظم "زہریلی گیس" نیا دور کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ یہ گیس حادثے سے متعلق ہے جس سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور تقریباً دو ماہ اسپتال میں داخل رہا وہ تو آپ حضرات کی دعائیں کام آگئیں جو زندگی نے موت کو شکست دے دی۔

زہریلی گیس

یونین کاربائڈ
بھوپال کے
اَلمناک حادثہ
سے
مُتاثر
ہو کر

دو دسمبر کی شب کا وہ منظر
اب بھی آنکھوں کے سامنے اکثر
جب بھی آتا ہے کانپ جاتا ہوں
زہر ہی زہر تھا فضاؤں میں
زہر شامل کھلی ہواؤں میں
اشک جاری تھے سب کی آنکھوں سے
اور...... سینوں میں آگ روشن تھی
سانس لینا بھی سب کو دوبھر تھا
دسترس میں نہیں تھے صبر و قرار
تھے خزاں کی لپیٹ میں گلزار
ذہن و دل بھی تھے فکر سے خالی

زندگی کی تلاش میں انساں
رشتے ناطوں کی ڈور توڑ گئے
بیوی بچوں کو بھائی بہنوں کو
اپنے گھر میں ہی روتا چھوڑ گئے
زندہ درگور ہو گئے کتنے
جو مرے ...... اُن کا کچھ شمار نہیں

کیسا منظر تھا اک قیامت کا
نفسی نفسی کا ایک عالم تھا
اور خدا کے حضور میں دل سے
میرے لب پر یہی صدائیں تھیں
دل پہ قابو نہ تھا دعائیں تھیں
آہ و زاری تھی التجائیں تھیں
درگذر کر خطائیں بندوں کی
زندگی بخشدے خدائے کریم

ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی
شعبۂ اُردو
جے۔ایس۔ہندو (پی۔جی) کالج
امروہہ۔ ۲۴۴۲۲۱

معاصرِ میرؔ

سید محمدؐ زماں امروہوی

سید محمد زماں امروہہ کے اس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے جو حضرت شاہ ولایت صاحبؒ کی اولاد میں سید محمد میر عدل کی شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب چودہ پشتوں کے ذریعہ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے۔ سید محمد زماں تقریباً ۱۱۰۲ھ میں امروہہ کے ادب پرور ماحول میں پیدا ہوئے یہ دور ادب و فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے لئے انتہائی سازگار عہد ثابت ہوا ہے جسے ہر لحاظ سے عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دہلی اور گرد و نواح دہلی میں ہر طرف علم و ادب کے چرچے تھے، جا بجا شعر و ادب کی محفلیں سجی ہوئی تھیں، ایسے حسین و خوش گوار ماحول میں زماںؔ نے آنکھ کھولی اور ماحول کے مطابق عنفوان شباب ہی سے فارسی میں شعرگوئی کا آغاز کر دیا، لیکن ابھی اپنی اوائل عمر ہی تک پہنچے تھے کہ ماحول نے کروٹ لی اور فارسی کی جگہ اُردو نے قبولیت خاص و عام حاصل کی تو انھیں بھی اپنے معاصرین کے ساتھ "ریختہ" کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور حسب ضرورت اُردو میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

امروہہ کی تمام تاریخی کتب میں سید محمد زماں کا ذکر بحیثیت شاعر انتہائی احترام کے ساتھ کیا گیا ہے چنانچہ "تاریخ ساداتِ امروہہ" میں سید محمد زماں کے سلسلہ میں یہ نوٹ ملتا ہے:

" سید محمد زماں ابن سید عبدالواحد شاعر اور مشاہیر سے تھے"۔[1]

مولوی سید بشیر حسن نے "تذکرۂ سادات امروہہ" میں سید محمد زماں کے بارے میں حسب ذیل رائے پیش کی ہے:

" سید محمد زماں بلند پایہ شاعر تھے، اکثر تذکروں میں آپ کا ذکر ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام کہیں دستیاب نہیں ہوتا، ایک فارسی قصیدہ کے چودہ۱۴ شعر ملے جو حصہ اول میں لکھ دیے ہیں، اُردو کا ایک مطلع مشہور ہے[2]

عارض ہے گل کا صاف و لیکن جھلک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ نکیلی پلک نہیں"۔

اس کے علاوہ سید محمد زماں کی فن کاری اور شاعرانہ صلاحیتوں کا ذکر اُردو ادب کے ان تمام تذکروں میں بھی ملتا ہے جو اُردو شاعری میں مستند و موقر سمجھے جاتے ہیں جن میں سے یہاں صرف چند مخصوص تذکروں کے اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ قارئین کو زماںؔ کی عظمت مقام کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ سب سے پہلے مصحفی امروہوی کی وہ رائے نقل کی جا رہی ہے جو انھوں نے اپنے ہم وطن شاعر کے سلسلے میں قائم کی ہے اس لئے کہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے مختلف لوگوں سے سُن کر یا مختلف تذکروں کے مطالعے کے بعد زماںؔ کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے اور مصحفی

نے بالمشافہ ملاقات کے بعد ان کی عظمت کے مقام کو پہچانا ہے،
لہٰذا زماں کے سلسلے میں جس قدر اہم اور وقیع رائے مصحفی کی ہوسکتی
ہے اتنی مستند رائے کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی چنانچہ
"تذکرہ ہندی" میں وہ زماںؔ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :۔

" سید محمد زماں، زماںؔ تخلص از سادات عالی تبار
قصبۂ امروہہ جوان متخی و بسیار قابل و قابل دوست
بود مومی الیہ در ایامیکہ نظر بہ بے وفائی دنیا کردہ
تبدیل لباس نمودہ در باغیچۂ تنہا نشستہ می ماند۔
فقیر ہمراہ استاد خود روزے در عالم مکتب نشینی
و ابتدائے شوق موزونی بہ صحبت ایشاں رسیدہ
بود اگرچہ چنداں بخیال شعر سرکار نہ داشت اما
اگر گاہے چیزے موزوں می کرد بسیار سنجیدہ۔
چنانچہ ایں مطلعش دلیل بر ذکاوت طبع اوست

عارض ہے گل کا صاف ولیکن جھلک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ کٹیلی پلک نہیں" ۵۳

اس کے علاوہ جہاں آفتاب رائے رسواؔ کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی
مصحفی نے سید محمد زماں کا اشارتاً تذکرہ کیا ہے جس کی وضاحت
سید سخی حسن نقوی نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کی ہے :۔

" جب آفتاب رائے رسواؔ امروہہ آئے تو ایک
سیّد صاحب کے یہاں مہمان ہوئے یہ سید صاحب
جن کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے دراصل سید محمد
زماں ہی ہیں جن کی طرف انھوں نے سید صاحب
کے لفظ سے اشارہ کیا ہے۔ ان سید صاحب موصوف
نے اپنے مہمان کی بڑی خاطر مدارات کی۔ رسواؔ
شراب بہت پیتے تھے اور ایک لمحہ بغیر شراب
کے سکون و چین سے نہیں گزار سکتے تھے چنانچہ
لکھتے ہیں:" ۵۴

" میزبان روزے یک طفل را برائے آوردن
شراب بہ احمد نگر کہ محلہ بیرون شہر واقع شدہ
فرستاد چوں آمدنش دیر کشید بایشاں گفت کہ باید
تا شراب آمدن کے سیر باغ کنیم بدیہہ از زبانش
بر آمد ایں شعر !

لڑکا گیا شراب کو کاہے کی سیر ہو
ہم گزرے اس شراب سے لڑکے کی خیر ہو ۵۵

میر قطب الدین باطن مصنف "گلستانِ بے خزاں" المعروف بہ
"نغمۂ عندلیب" نے سید محمد زماں کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

" زماںؔ تخلص سید محمد زماں نام امروہا وطن دیکھنے
میں نہ آیا ان حضرت کا مجموعۂ سخن کلام ایسا فرمایا جو
لکھنے میں آیا" ۵

عارض ہے گل کا صاف ولیکن جھلک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ نکیلی پلک نہیں ۵۶

نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرورؔ نے اپنی تصنیف میں
سید محمد زماں کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے :۔

" زماںؔ تخلص سید محمد زماں از سادات والا منزلت
قصبۂ امروہہ کلامش بسیار پختہ و سنجیدہ بودہ است
کہ رحلت ازیں دار ناپائیدار نمودہ اوراست

عارض ہے گل کا صاف ولیکن جھلک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ نکیلی پلک نہیں" ۵۷

میر قدرت اللہ قاسم نے سید محمد زماں کا ذکر ان الفاظ میں کیا
ہے :۔

" تخلص دو کس می شناسم نوشتن یکے از آں
ہر دو بہ تکملہ انسب پنداشتم و دیگرے را اینجا
بنگاشتم۔ وے عزیزے بود سیر مشق در
قصبۂ امروہا از دودمان عالی نشان مسمی بہ سید محمد
زمان از چندے جہانِ فانی را خیر باد گفتہ
برحمت جاودانی حق پیوستہ ایں مطلع آن
مرحوم کہ بمن رسیدہ برشتۂ تحریر کشیدہ"

عارض ہے گل کا صاف ولیکن جھلک نہیں۔ نرگس کی چشم ہے پہ نکیلی پلک نہیں ۵۸

عبدالغفور خاں نسّاخ، زماں کے سلسلے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"زماں تخلص سید محمد زماں باشندۂ امروہہ تعلقات دنیوی کو چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی"۔

عارض ہے گل کا صاف و لیکن جھلک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ نکیلی پلک نہیں[59]

قدرت اللہ شوق سنبھلی اگرچہ زماں کو فارسی گو شاعر مانتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے زماں کی ریختہ گوئی کا بھی تذکرہ کیا ہے، چنانچہ شوق نے زماں کے بھتیجے میاں فیض علی کی زبانی ان کے جو اشعار ریختہ سنے ہیں ان میں سے ایک شعر میں فنی نقص کی نشاندہی کرتے ہوئے اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی اس طرح پیش کی ہے:

"سید محمد زماں ساکن بلدۂ امروہہ شاعرے است فارسی گو بسیار خوش فکر و خوش گفتگو بگا ہے بتقریبے یک دو فرد ریختہ ازو صادر می شود، بزبان اختر برج مروت و اخلاص، گوہر درج صداقت و اختصاص محب خفی و جلی میاں فیض علی کہ برادر زادۂ اوست چند اشعار متفرقہ بسمع رسیدہ یک مطلع ازو بہ تحریر می آید از واست

دل تجھ سے جدا ہو کر زلفوں کے پڑا بس میں
اب کیوں نہ پریشاں ہو ہر ملکے د ہر رسمے

اگرچہ دریں مطلع در قافیہ نقصان صریح است فاما چوں درست بستہ ایں سبب معاف داشتہ والعلم عنداللہ"۔[60]

متذکرہ اقتباسات کی روشنی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ سید محمد زماں زماں اپنے وقت کے ایک بلند پایہ شاعر اور ایک عظیم فن کار استاد تھے۔ اس میں شک نہیں کہ زماں نے فارسی ہی میں کثرت سے کہا ہے لیکن اُردو میں بھی دو چار اشعار کا ملنا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ انھوں نے صرف یہی دو چار شعر نہیں کہے ہیں بلکہ حسب ضرورت ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر انھوں نے کم از کم پندرہ بیس غزلیں ضرور کہی ہوں گی بلکہ اس وقت کی اصناف مروجہ میں بھی طبع آزمائی کی ہوگی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان کا کلام اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ ان کی اولاد میں سے کچھ افراد امروہہ میں بھی موجود ہیں لیکن وہ ان کے اس ادبی ترکہ سے محروم ہیں۔ کاش وہ تذکرہ نگار جنھوں نے ان کی فنی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے فہرست شعرا میں ان کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے اگر وہ تھوڑی کاوش و تلاش کے بعد ان کے مختلف و متفرق اشعار ہی بطور نمونہ نقل کر دیتے تو اس وقت کم از کم پندرہ بیس اشعار دستیاب ہو سکتے تھے، لیکن یہ بھی بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ تذکرہ نگار حضرات نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی اور ان کا صرف ایک ہی مطلع جس طرح سُنا، یا پڑھا تھا، بطور نمونہ نقل کر دیا ہے۔ کسی تذکرہ نگار نے مزید تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جبکہ ان لوگوں کو تھوڑی تلاش کے بعد خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔

البتہ شوق سنبھلی نے عام تذکرہ نگاروں کی روش سے ہٹکر زماں کا ایک نیا شعر تحریر کر کے تذکرہ نگاروں کی اس عام کوتاہی کے احساس کا ثبوت دیا ہے اور آئندہ محققین کے لئے اس اہم ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایک مقام پر انھیں بھی زبردست مغالطہ ہو گیا ہے اس لیے کہ ایک ایسا شعر جسے عام طور پر تمام تذکرہ نگاروں نے محمد زماں کی طرف منسوب کیا ہے اس شعر کو اور اس کے ساتھ اسی غزل کے دوسرے شعر کو انھوں نے خلیفہ چندا سے مخصوص کر دیا ہے جن کے بارے میں وہ اس طرح رقمطراز ہیں:-

"خلیفہ چندا ساکن بلدۂ امروہہ مردے است درویش سیرت، مسکین صورت، خوش اخلاق شعر فارسی و ہندی بطور صوفیانہ می گوید چند ابیات بزبانی فیض علی بہ سمع رسید"۔

عارض تو گل کے صاف ہیں لیکن چمک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ کٹیلی پلک نہیں

نسبت نہ دو گہر کو مرے آنسوؤں کے ساتھ
ہر چند آبدار ہے ایسی ڈھلک نہیں[61]

اس سلسلہ میں افسر صدیقی امروہوی نے جو تجزیہ کیا ہے وہ کسی قدر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، ان کا خیال ہے کہ:۔

" خلیفہ چندا کے جو اوصاف شوق نے لکھے ہیں وہی بیان مصحفی کا بھی ہے اور دونوں کے یہاں ایک شعر بھی مشترک ہے شاید خلیفہ چندا سید محمد زماں کا عرف ہو مصحفی نے ایک نام سے ذکر کیا اور قدرت اللہ نے دوسرے نام سے لکھا" ۱۵

حقیقتاً قدرت اللہ شوق کو نام کے سلسلے میں تسامح ہو گیا ہے، غالباً انھوں نے اپنے راوی میاں فیض علی سے جس طرح سنا اسے بے چوں و چرا بغیر کسی استفسار کے جوں کا توں نقل کر دیا ہے اس میں کسی تحقیق و دریافت کی ضرورت نہیں سمجھی، ورنہ وہ ایسی صریح غلطی کے مرتکب نہ ہوتے کہ زماں کا وہ مطلع جسے ہر تذکرہ نگار تواتر کے ساتھ زماں سے منسوب کرتا رہا ہے اسے بھی انھوں نے بغیر کسی تامل کے خلیفہ چندا سے متعلق کر دیا ہے۔ اگر انھوں نے اس سلسلے میں معمولی فکر سے بھی کام لیا ہوتا تو یقیناً شوق اس عظیم مغالطہ کا شکار نہیں ہو سکتے تھے۔ حقیقتاً خلیفہ چندا نامی کوئی شاعر امروہہ کی تاریخ میں کبھی نہیں گزرا۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ چندا زماں کی عرفیت ہو سکتی ہے۔ رہی ان کے خلیفہ ہونے کی بات، تو پرانے زمانے میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے جو مدارس ہوتے تھے انھیں مکتب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اس مکتب میں تعلیم دینے والے کو خلیفہ کہتے تھے۔ سید محمد زماں زماں کو بھی اوائل عمر ہی سے بچوں کو تعلیم دینے کا شوق تھا۔ ان کے خاندانی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے خاندان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھتے تھے اور اس کا انھوں نے باقاعدہ انتظام بھی کیا تھا۔ اس رعایت سے یہ اپنے دوست احباب میں خلیفہ کے لقب کے ساتھ بھی مشہور تھے۔ اس کے علاوہ پرانے زمانے میں ہر بڑے گھرانے میں چونکہ پہلوانوں کی پرورش کا بھی باقاعدہ دستور تھا اور ان پہلوانوں کے اکھاڑے کا سربراہ و سرپرست اس خاندان کا بزرگ ہوا کرتا تھا جسے پہلوانوں کی اصطلاح کے مطابق خلیفہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، لہٰذا زماں اپنے خاندان کے بزرگ ہونے کے اعتبار سے بھی خلیفہ کہلائے اور چندا چونکہ ان کی عرفیت تھی، اس لیے خلیفہ چندا کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اگرچہ شوق ایک صریح غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ زماں کے سلسلے میں دوسرے تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں شوق کو بہر طور فوقیت و اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ انھیں کے ذریعہ سید محمد زماں کے دو نئے شعر ہم تک پہنچے ہیں۔

اب تک ادبی دنیا کے پاس زماں کے اشعار کی مجموعی تعداد صرف تین تک پہونچی ہے جو انتہائی مختصر اور قلیل سرمایہ ہے لیکن مثل مشہور ہے کہ " بھری دیگ کا ایک چاول کافی ہوتا ہے" کے مطابق ایک محقق و نقاد کے لیے ان کی شاعرانہ عظمت اور فنی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے یہی تین شعر کافی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ تینوں منتشر اشعار یہاں یکجا طور پر پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ زماں کے سلسلے میں آئندہ تحقیق کی یہ اشعار بنیاد بن سکیں اور نئی تحقیقی راہیں ہموار ہو سکیں ۱۶

عارض ہے گل کا صاف و لیکن جھلک نہیں
نرگس کی چشم ہے پہ نکیلی پلک نہیں

نسبت نہ دو گہر کو مرے آنسوؤں کے ساتھ
ہر چند آبدار ہے ایسی ڈھلک نہیں

دل تجھ سے جدا ہو کر زلفوں کے پڑا بس میں
اب کیوں نہ پریشاں ہو ہر ملکے و ہر بسے

اس آخری شعر میں زماں قافیہ کے سلسلے میں ضرور تصرف بیجا کے مرتکب نظر آتے ہیں، جس پر شوق نے بھی فنی اعتراض اٹھایا ہے تاہم محاورہ کے درست استعمال کرنے کی وجہ سے انھیں قابل معافی بھی قرار دیا گیا ہے۔ تاہم یہ اعتراض آج کے عہد میں تو بالکل

صحیح ہے اس لیے کہ اس قسم کی تمام غلطیاں متروکات قرار دے دی گئی ہیں۔ لیکن شوقؔ کا یہ اعتراض زماںؔ کے عہد کے مطابق ان کے ساتھ ایک قسم کی زیادتی ہے اس لیے کہ اس زمانہ میں اس قسم کی کوتاہیاں عام طور پر اساتذہ کے یہاں ملتی ہیں جنھیں اس وقت جائز سمجھا جاتا تھا۔

زماںؔ جس غلطی کے مرتکب ہوے ہیں اس قسم کی غلطیاں ان کے ہم عصر میرؔ و سوداؔ بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ سوداؔ جن کا شمار اپنے عہد کے بلند پایہ اساتذہ میں کیا جاتا ہے اور جن کی زباں دانی دنیائے ادب میں بہرحال مسلم ہے ان کے یہاں بھی بقول مصحفیؔ ایسی کمزوریاں عام طور پر نظر آتی ہیں۔ سوداؔ کے سلسلے میں مصحفیؔ یوں رقمطراز ہیں:-

"ان کے بعض اشعار میں صریح غلطیاں
پائی جاتی ہیں"

میرؔ جن کی استادی کا آج بھی لوہا مانا جاتا ہے اور جن کی فنکارانہ عظمت کے سامنے آج بھی اساتذۂ فن کے سر تسلیم خم ہیں ان کے یہاں بھی معمولی غلطیوں کے علاوہ اسی قسم کا تصرف بیجا ایک مقام پر نظر آتا ہے، انھوں نے اپنی ایک غزل جس میں "دعا"، "وفا"، "جفا" قافیہ اور لفظ "میں" بطور ردیف استعمال کیا ہے، اس طرح تصرف کرتے ہیں ؎

کفن کیا عشق میں ہم نے ہی پہنا!
کھنچے لوہو میں بہتیروں کے جامے

حقیقتاً ان تمام تصرفات کا سبب یہی ہے کہ اس عہد میں زبان چونکہ ارتقار کی منزلوں سے گزر رہی تھی، الفاظ و محاورات اور مفاہیم و مضامین کا خزانہ انتہائی محدود و مختصر تھا، لہٰذا زبان کو وسیع سے وسیع تر بنانے کے رجحان کے پیش نظر ہر ذہن کو فکری اور لسانی ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور اس قسم کی غلطیوں کو محل نظر نہیں سمجھا گیا ہے۔

سید محمد زماںؔ بھی چونکہ اسی ماحول کے معماروں میں سے ہیں، لہٰذا ان سے بھی اس قسم کی غلطیوں سے پاک رہنے کی توقع کرنا نامناسب ہی نہیں بلکہ ناانصافی ہے۔

حواشی

۱ہ "تاریخ سادات امروہہ" مولفہ سید خصال احمد ص۳۲۳
۲ہ "تذکرہ سادات امروہہ" ص۳۳ از مولوی سید بشیر حسین صاحب
۳ہ "تذکرۂ ہندی" ص۱۱۱ از مصحفیؔ امروہوی
۴ہ "مولد مصحفی" از سنی حسن نقوی رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۹ء مرتبہ عبدالحق ص۱۱۸
۵ہ "تذکرہ ہندی" ص۱۰۰ از مصحفیؔ امروہوی
۶ہ "گلستان بے خزاں" المعروف بہ نغمۂ عندلیب ص۱۰۳
۷ہ "عمدہ منتخبہ" یعنی نغمۂ سرور ص۳۱۲
۸ہ "مجموعہ نغز" از قدرت اللہ قاسم ص۲۸۵
۹ہ "سخن شعراء" از عبدالغفور خاں نساخ ص۲۰۲
۱۰ہ "طبقات الشعرار" ص۵۶۸ از قدرت اللہ شوق سنبھلی
۱۱ہ "طبقات الشعرار". از قدرت اللہ شوق سنبھلی
۱۲ہ "مصحفی حیات اور کلام" از افسر صدیقی ص۵۳-۵۲
مکتبۂ نیا دور کراچی۔

غزلیں

اختر لکھنوی
عالمی سروس ریڈیو پاکستان کراچی

پہچان تھی بے طرہ کوئی سر نہ ہوا تھا
جب تک کہ قبیلہ مرا بے گھر نہ ہوا تھا

اس شہر کو اک اور ملا تمغۂ اعزاز
اس شہر میں ہر شخص گداگر نہ ہوا تھا

چاند آنکھوں میں تھا چاندنی رقصاں تھی جبیں پر
یہ جب تھا کہ جب چاند مسخر نہ ہوا تھا

اک پاس تھا وعدے کا جو ٹھہرے نہ کہیں ہم
ایسا نہ تھا، واہم پہ کوئی در نہ ہوا تھا

بخشی ہے ہمیں دوسری ہجرت نے یہ وسعت
دل صورتِ دریا تھا سمندر نہ ہوا تھا

ہر شخص سے ہم اپنا پتہ پوچھ رہے ہیں
حالات کا یوں لطف تو ہم پر نہ ہوا تھا

فصلوں میں مرا قتل تھا خلقت کو تماشہ
یہ واقعہ بھی شہر سے باہر نہ ہوا تھا

رئیس نعمانی
۱۹۱ اصطبل، چارباغ۔ لکھنؤ

سبزہ و گل پہ، نہ خورشید و قمر پر رکھو
راہِ ہستی میں نظر رختِ سفر پر رکھو

نہ دریچوں پہ، نہ دیوار، نہ در پر رکھو
سب یہیں پر ہیں، نظر راہگذر پر رکھو

راہ کی آبلہ پائی نہ بنے وجہِ الم
نظر اپنی اگر انجامِ سفر پر رکھو

گر دعا کرتے ہو آدابِ دعا بھی برتو
ورنہ کیا فائدہ الزام اثر پر رکھو

کوئی قیمت نہیں بازارِ سخن میں اس کی
"سچ" کی دولت ہے اگر پاس تو گھر پر رکھو

میں کہ دنیا کو فقط درسِ وفا دیتا ہوں
تم جو الزام بھی چاہو، مرے سر پر رکھو

ظلمتِ شب کا تعاقب بھی ضروری ہے رئیس
نظر اپنی مگر انوارِ سحر پر رکھو

فضیل احمد
محلہ انصار نگر، ڈاکخانہ نوادہ
ضلع نوادہ، بہار

افسانہ کا مُطالعہ کیوں؟

انیسویں صدی سے عہدِ حاضر تک' برّاعظم یورپ، انگلینڈ اور متحدہ امریکہ میں ناول اور مختصر کہانیاں، انتہائی اہم ادبی صنف کی حیثیت سے پڑھی جاتی رہی ہیں، تاریخ کے دوسرے ادوار میں مصوّری یا صنم سازی یا ڈرامہ کی اہمیت رہی ہے۔

ناول یا افسانہ کے سامنے ہمیشہ دو مقاصد رہے ہیں۔ ایک تو اس کا تفریحی پہلو ہے اور دوسرا اس کا اصلاحی پہلو ہے۔ ہم اس کے پہلے پہلو پر زیادہ دیر تک گفتگو کرنا نہیں چاہتے ہیں، لیکن اتنا یاد کرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر افسانہ میں تفریحی پہلو نہیں ہوگا تو یہ پڑھا نہیں جائے گا۔ بلاشبہ ناول یا افسانہ میں جو تفریحی پہلو ہوا کرتا ہے وہ ذاتی اور نجی قسم کی چیز ہے، ہر ایک قاری کے یہاں اس کی ایک الگ حیثیت ہوتی ہے، اگر اس نکتہ کو اپنے ذہن میں رکھیں تو اس کے دوسرے پہلو یعنی افسانے کے اصلاحی پہلو پر بحث کی جاسکتی ہے، ابتدائی بیان میں ہی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کس طرح افسانہ اصلاحی پہلو کی تشکیل میں کوشاں رہا ہے اور اس صدی کے نصف ابتدائی حصّہ میں اس کی کوشش کی کون سی راہ رہی ہے' اور اس حقیقت کی وضاحت میں یہ بات بھی نمایاں ہو جائے گی کہ کس طرح افسانے نے اس دور میں کارہائے عظیم کی پیش کش کی ہے۔

افسانے کے تفریحی پہلو کو ہم آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں خود ہمارے ملک میں' افسانے کے مطالعے میں ہر شخص دل چسپی اور تفریح کے سامان کی تلاش کرتا ہے، اس تفریح یا دل چسپی کی پیمائش کا کام آسان نہیں ہے، اگر ہم جوان ہیں تو ہم کچھ مخصوص قسم کی کتابوں میں دل چسپی لیتے ہیں' ان میں کھو جاتے ہیں، گرچہ ان کی ادبی حیثیت انتہائی پست کیوں نہ ہو، لیکن ہم جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتے ہیں تو اب ہم ان بچکانہ کہانیوں میں کوئی دل چسپی نہیں پاتے ہیں، اب ہمیں کچھ زیادہ گہری اور قیمتی باتوں کی تلاش ہوتی ہے' ہمارا مطالعہ جیسے جیسے اس میدان میں زیادہ ہوتا ہے ہماری پسندیدگی کا انداز بھی بدلتا جاتا ہے' اب ہم چیزوں پر تقابلی نظر ڈالتے ہیں' اس طرح ہمارے یہاں جمالیاتی احساس جاگنے لگتا ہے۔ اب بدلتے ہوئے رجحان کے پیش نظر ہم زندگی کی حقیقتوں کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ناولوں یا کہانیوں میں زندگی کی تمثیلی حقیقتوں کی تخلیق سے انسیت اور قربت پیدا ہونے لگتی ہے۔

تمام عظیم ادب اور خاص کر افسانے اپنے زمانے اور اپنے مقام کی سچی اور قابلِ یقین تصویر پیش کرتے ہیں' ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں' اس میں زبردست تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اگر ہم پچاس برس پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ہم کو معلوم ہوگا۔ اس دوران دو انتہائی ہولناک جنگیں لڑی گئی ہیں اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ان جنگوں نے کیسی بھیانک صورتِ حال کو جنم دیا ہے چونکہ افسانہ نگار اپنے زمانے اور اپنے ماحول کا ترجمان ہوتا ہے' وہ دوسرے افراد سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے اپنی تخلیقات میں بدلتی ہوئی دنیا اور آنے والی ہولناکی کو جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ بیشتر افسانہ نگاروں نے سیاسی اور اقتصادی انتشار اور دباؤ کی نشاندہی کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عظیم ادب پاروں میں باتیں براہِ راست نہیں پیش کی جاتی ہیں۔ اچھے افسانہ نگاروں نے مسائل کی براہِ راست نشان دہی نہیں کی ہے، یعنی ادبی تخلیق میں وعظ اور اخلاقی تعلیم کا رنگ نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ بیشتر افسانوں میں معاشرتی بدنظمیوں اور ان کی ہولناکیوں کا شعور پوشیدہ ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ حقیقت ہے کہ افسانہ نگار اس صورتحال کو پیش کرتا ہے جس کے مطالعہ کے نتیجے میں فنکار، قاری کو اس کے

اخلاقی اور اصلاحی نکتہ کی طرف مائل کرتا ہے۔

ہر عہد میں ایسے ادب پاروں کی فراوانی رہی ہے جن میں زندگی کی اوپری سطح کی پیش کش ہوتی ہے جس کا مقصد عارضی اور وقتی دل چسپی کا سامان فراہم کرنا ہے لیکن ہم اس طرح کے ادب کو فراریت پسند قسم کا ادب کہہ سکتے ہیں، اس قسم کے ادب کے متعلق ہم اظہار خیال کرنا نہیں چاہتے ہیں، ہم ایسے ادب پاروں کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں جن میں ذہنی گیرائی ہے، تخیل کی رعنائی ہے اور ادبی حسن ہے۔

ہم ایسے ادب اور فنکاروں کے متعلق بھی باتیں کرنا نہیں چاہتے ہیں جو ادب برائے ادب کی باتیں کرتے ہیں، یہ ایسے فن کار ہیں جن کی چاہت کچھ ہی دلوں میں ہے حقیقت میں عظیم ناول نگار، شعوری طور پر زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کرنا چاہتا ہے جس میں ادب برائے زندگی کا تصور کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ایسے فن کار ہیں جو زندگی کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں، مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، گو اس میں زندگی کے مسائل کا پورا حل نہ ہوتا ہو افسانہ کی کامیابی اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ افسانہ نگار جن باتوں اور جس صورتِ حال کو پیش کرے، اس کے متعلق قاری کا یہ خیال ہو کہ اس میں صداقت ہے، یہ صورتِ حال پیش آسکتی ہے، اور پھر یہ کہ فن کار نے جن باتوں کو پیش کیا ہے، ان سے انسان کے انداز فکر و نظر اس کے رجحانات، اس کے طرزِ عمل اور طور طریقوں کے سلسلے میں ہمارے علم میں اضافہ ہو۔

بہرکیف یہی وہ باتیں ہیں جن کے پیشِ نظر ہم ناول یا افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے، ان سے بھی زیادہ گہرے وجوہات ہیں جو ہمیں ناول یا افسانے کے مطالعہ کے لئے اکساتے ہیں، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان حقیقتوں سے پوری طرح آگاہ ہوئے بغیر، سطحی قسم کے جذبات کی تسکین کا سامان ان میں تلاش کرتے ہیں، اور ان کے یہاں ایسے جذبات اس قدر السیدہ ہوتے ہیں کہ وہ سطحی قسم کے ناول یا افسانہ میں دل چسپی محسوس کرتے ہیں

افسانے کے مطالعہ کا خوش گوار پہلو یہ ہے کہ ہم اس قابل ہو سکیں کہ کتاب کی سطح اور مقام کا تعین کر سکیں، یہیں سے تنقید کا وجود ابھرتا ہے یہ ایک خوش گوار ذہنی شعور ہے اور یہیں سے مختلف مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں خاص کر نوجوانوں کے لئے یہ دقت پیدا ہوتی ہے کہ کس کو وہ اچھا کہیں، نوجوان قاری اپنے ایماندارانہ مطالعہ کے فیصلہ کے تعین میں اکثر ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں، یا پھر وہ پرانی متعین قدروں اور تبصرہ نگاروں کی رائے سے ٹکراتے ہیں، ایک قاری اکثر اپنے کو اس صورتِ حال میں پاتا ہے کہ وہ کتاب جو کبھی معیاری بھی گئی، اس کو اپنی پسند اور ذوق کے مطابق نہیں پاتا ہے اور یہیں سے وہ معیاری تنقیدی قدروں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اسے کوئی ایسی معیاری قدر مل جائے جس کے پیش نظر وہ تمام ادب پاروں کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکے۔ وہ اپنی رائے اور اپنے فیصلہ پر بھروسہ کرتے ہوئے گھبراتا ہے۔ اس صورتِ حال میں قاری کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہم بلا جھجک اس بات کو کہہ سکتے ہیں کہ پرانے تنقیدی افکار و آرا ہمارے لئے کچھ زیادہ معاون نہیں۔ عظیم اور ممتاز ناقدوں نے اس موضوع پر زیادہ غور و فکر کیا ہے، ان میں سے ہم صرف ایک کا نام بطور مثال لیتے ہیں اور وہ ہیں میتھیو آرنلڈ۔ جن کا عقیدہ تھا کہ ناقد ان افکار کا ممنون ہوتا ہے کہ جن ادب پاروں کو دنیا نے تحسین کی نظر سے دیکھا ہے انھیں کو وہ معیاری قرار دیتا ہے لیکن ہر ایک قاری اس رائے سے متفق نہیں ہوگا، اور نئی ادبی تنقید جس کی پیش کش آئی۔ اے رچرڈ نے اپنی کتاب "ادبی تنقید کے اصول" میں کی ہے اس کے متعلق کہنے دیجئے کہ یہ اگرچہ انتہائی دل چسپ ہے اور اس میں ادبی تجزیہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے، تاہم یہاں بھی ہمیں متعین معیاری اصول نہیں ملتے ہیں۔

اس موضوع کو ایک نیا موڑ دیا جا سکتا ہے کہ کسی مخصوص کتاب کے متعلق کسی قاری کی کیا رائے ہے۔ یہی انداز زیادہ صحیح اور قابل قدر ہے، کہ کسی فرد کا اس کتاب سے کیا تعلق ہے، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک قاری بذاتِ خود ناقد بھی ہے۔! ایک مخصوص معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ہاں ایک قاری ناقد بھی ہے، اب اگر وہ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی ہم رائے پاتا ہے تو ایسے مطالعہ میں وہ اپنے کو زیادہ بہتر صورتِ حال میں پائے گا۔ اس کے علاوہ اس کے لئے یہ بات زیادہ معاون ہوگی کہ وہ خود اپنے سے پوچھے کہ کسی کتاب کو وہ کیوں پسند کرتا ہے اور کیوں ناپسند کرتا ہے؛ لہٰذا ممکن ہے کہ اس طرح قاری زیر مطالعہ کتاب کے مقابلے میں اپنی ذات اور اپنے شعور کو زیادہ جان سکے، اسے اپنی ذات کے مطالعے کے دوران کچھ ایسی باتیں بھی ملیں گی جو اس کو تنقید کے معیار تک پہنچائیں گی اور یہی تنقیدی معیار اسے مطالعہ میں معاون ہوگا۔ ہم اس اصول کو "اپنی ذات کی پنہائیوں کے شعور" کا نام دیں گے۔

ایک نوجوان قاری کے یہاں اس بات کا امکان ہے کہ وہ کسی واقعہ کی تشریح کے سلسلے میں اس کا مقابلہ دوسری کتاب کے پڑھے ہوئے واقعے کرے یا یہ بھی ممکن ہے کہ بزرگ اور سن رسیدہ قاری کسی ناول کے پیش کردہ واقعات کی صداقت کو اپنی زندگی کے تجربات کے پس منظر میں پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کرے۔

اس صورت حال کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ سن رسیدہ قاری میں ایک ناقد کی زیادہ صلاحیت ہوسکتی ہے۔ اس اصول میں نادر مستثنیات کے علاوہ زیادہ حقیقت ہے۔ نوجوان قاری کے یہاں زندگی کی گیرائیوں میں اتر کر یہ دیکھنے کی کم صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ بزرگ ناقدوں کا کام ہے کہ نوجوان قاری کو منقولات اور حوالات کے پیش نظر ناولوں کو پرکھنے کے بجائے اسے اس بات کے لئے اُبھارے اور دیکھے کہ وہ کسی ناول یا افسانہ کو کیوں پسند کرتا ہے اس پس منظر میں نوجوان قاری کے ذہن وفکر کا مطالعہ بھی ضروری ہے نوجوان قاری جب کسی ناول یا افسانہ کا مطالعہ کر رہا ہو تو اس سے کتابوں کے تاثرات کے متعلق تنقیدی اصطلاحوں میں بات کرنے کے بجائے واضح انداز میں یہ پوچھنا چاہیئے کہ وہ کسی فن پارہ کو کیوں پسند یا ناپسند کرتا ہے نوجوان قاری کے مطالعے کے ماحول کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ یعنی وہ کن حالات میں اور کس ماحول میں کسی ادبی فن پارہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ماحول اور حالات کا بھی قاری کے ذہن پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔

ناول یا افسانہ کے تاثرات کا معاملہ خالص ذاتی قسم کا ہوسکتا ہے اگر قاری اپنی ذات کو ناول یا افسانے کے ماحول یا کردار کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ نہیں کرسکا تو اس میں وہ دلچسپی کے عنصر کو نہیں پاسکتا ہے اگر قاری زیر مطالعہ ناول یا افسانہ کے کردار یا ماحول سے اپنے کو وابستہ کرتا ہے یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس میں خود اس کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے اور وہ خود ناول میں موجود ہے تو یقیناً ایسے قاری کے لئے ناول یا افسانہ کے مطالعہ میں گہری دلچسپی کا سامان فراہم ہوگا۔

ناول یا افسانہ کے مطالعہ کے دوران قاری کا اس فن پارہ کے ساتھ کیا رشتہ ہے، یا دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ خود مصنف اور ناول یا افسانہ کے درمیان کیا رشتہ ہے، ان سوالات کو زیر غور لانا ضروری ہے، یا یہ کہ وہ کون سے مسائل یا کوائف تھے جن کی پیش کش کے لئے مصنف مجبور ہوا ہے حقیقت میں فن پارہ اور فن کار کے درمیان کا رشتہ بڑا ہی پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے۔ اس کا آسانی سے مطالعہ نہیں کیا جاسکتا ہے، بہرکیف فن کار کی ذاتی زندگی کے حالات وکیفیات اگرچہ موجود ہوں لیکن ان سے نتائج کے اخذ کرنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ نوجوان قاری ان کو استعمال کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے اور پھر ان کے استعمال میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ہر فنکار کی اپنی ایک الگ انفرادی شخصیت ہوتی ہے ▲▲

نصیر پرواز

این ۲/۹۲-۱/ بی گووندپورا، بھوپال ۴۶۲۰۲۳ ایم پی

غزل

السائے موسم میں کچّے خواب اُتارے گا
جس دن یہ آوارہ بادل ساون ہارے گا

ریت کی کچّی دیواروں پر پتھر کی اک چھت
ٹوٹا بکھرا انساں اپنی عمر گذارے گا

وعدوں تک محدود ہے اسکی ہر چاہت ہر پیار
لفظوں سے بکھری سانسوں کا عکس نکھارے گا

جلتے شہر، سلگتے جنگل، پربت، دریا، آگ
کون مری پیاسی دھرتی کا رُوپ سنوارے گا

کوشش تو کرتا ہے لیکن خود تک ہے محدود
خود سے باہر آکر دریا مجھے اُبھارے گا

اتنے ہی کچھ نام ملیں گے آوارہ غم کو
جتنی بھی پوشاکیں اپنے تن پر دھارے گا

لکڑی کے سب تختے اس نے جلادیئے پرواز
اب شاید کاندھے پر رکھ کر پار اُتارے گا

غزلیات

سیدہ نسرین نقاش
معرفت صدائے کشمیر، جالو بلڈنگ، نیو سکریٹریٹ روڈ
سرینگر کشمیر

کیا حقیقت ہے کیا کہانی ہے
مختصر اپنی زندگانی ہے

ٹوٹ کر بہہ رہی ہیں چٹانیں
آج غم میں بڑی روانی ہے

کاش پردیس سے چلے آؤ
آج کی رُت بڑی سہانی ہے

آج تک انتظار ہے اُس کا
ایک لڑکی بڑی دِوانی ہے

آج پہچانتا نہیں مجھ کو
میں نے ہر بات جس کی مانی ہے

تجھ کو اپنا بنا کے چھوڑوں گی
اب یہی بات دل میں ٹھانی ہے

اُس کو پانے کی آس میں نسرین
ہم نے صحرا کی خاک چھانی ہے

ہرمہیندر سنگھ دیوانہ
۵۵/۱۴۳ رام نگر، کان پور روڈ
عالم باغ لکھنؤ

نیند میری بند آنکھوں ہی میں مر جاتی ہے یار
زندگی اب مجھ سے کترا کر گذر جاتی ہے یار

اک گھٹن اور ایک بے چینی ہے اور کچھ بھی نہیں
جس طرف بھی شہر میں اپنی نظر جاتی ہے یار

گلستاں کیا ہے کہ شاخوں کو نہیں ہوتی خبر
کس کے ہاتھوں سے مہک کلیوں کی مر جاتی ہے یار

سر جھکائیں کس کے در پر کس کے در پر دیں صدا
اب فقیروں کی دُعا بھی بے اثر جاتی ہے یار

دن تو کٹ جاتا ہے اپنا، ایک پرچھائیں کے ساتھ
رات تنہا اپنے کمرے میں گذر جاتی ہے یار

اوشا چکرورتی
ایل۔ آئی۔ جی۔ بی ۱۹۲
سوناگری بھوپال

تنہائی راتوں کو ملنے آتی ہے
جانے کتنے دیپ بجھا کر جاتی ہے

پھولوں نے جو کچے خواب سجائے تھے
پاگل آندھی ان کو کیوں بکھراتی ہے

کبھی چاندنی پہنی تھی اس کایا نے
اب پونم کی رات ہمیں ترساتی ہے

وقت کبھی سب کو آدرش سکھاتا تھا
بے صبری اب اس کی ہنسی اُڑاتی ہے

آنسو بھی نہ دے پاؤں گی میں اس کو
چاہت کیوں اپنی جھولی پھیلاتی ہے

افسانہ

شاہ مبارک پوری
پچھم پلیس، کھلنا (بنگلادیش)

سپنوں کی اُڑان

بہت سے دوست ایسے ہوتے ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا، بھلانے کی ہزار کوشش کی جائے لیکن بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کی شخصیت ایسی پرکشش ہوتی ہے کہ ذہن کے گوشے میں گھر کرلیتی ہے۔ حمید کی شخصیت کچھ ایسی ہی تھی جو میرے ذہن کے گلشن میں مہک رہی تھی۔

اچانک اس سے شیراٹن انٹرنیشنل کے لاؤنج میں ملاقات ہوگئی۔ ہم دونوں گلے سے لپٹ گئے۔ وہ مجھے سوئمنگ پول پر لے گیا۔ عورتیں مرد رنگ برنگے سوئمنگ ڈریس میں تیر رہے تھے جوانی اٹھکیلیاں کررہی تھی، فضا میں شراب کی مستی تھی۔

ہم دونوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"تم اکیلے کیوں؟ بھابی کہاں ہیں۔؟"

میرے پوچھنے پر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"میرے دوست۔ تمھاری بھابی مجھے چھوڑکر چلی گئی"۔ اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بھابی تم سے کنارہ کش ہوجائے! وہ نہ صرف خوبصورت بلکہ خوب سیرت بھی تھیں جس کے لئے تم نے حسین سے حسین لڑکیوں کو ٹھکرادیا، اور پھر تم میں کسی چیز کی کمی بھی نہیں"۔ میں نے حیرانی سے کہا۔ "خدا معلوم انھوں نے تمھیں چھوڑا ہے یا تم نے انھیں چھوڑ دیا۔؟"

"یہ حقیقت ہے کہ وہ مجھے چھوڑ گئی"۔ اس نے غمگین لہجے میں کہا۔ چہرے پر یاسیت چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں حزن وملال کی کیفیت۔

"بچے کہاں ہیں۔؟"

"گھر میں نوکرانی کے پاس"......

اسی وقت ویٹر آن کھڑا ہوا۔ حمید نے بیئر کا آرڈر دیا، اور میں نے چائے منگوائی۔

"اب تمھاری زندگی کیسی گزر رہی ہے۔؟" میں نے ویٹر کے جانے کے بعد پوچھا۔

"جب رات ناگن بن کر ڈستی ہے تو کوئی حسین جسم میرے پہلو میں آجاتا ہے۔ سسک سسک کر زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ ارمانوں کی سیج پر لذتوں کی خوشبو بکھیر دوں"۔

"میں ایسی زندگی پر یقین نہیں رکھتا۔ گرہستی کے بغیر کوئی گھر گھر نہیں، سہاگن کے دم سے گھر جنت ہوتا ہے اور آنگن میں بچوں کی قلقاریاں سنائی دیتی ہیں۔ بھابی جیسی سگھڑ، سلیقہ مند اور گرہستن عورت کا گھر چھوڑ کر جانا معمولی بات نہیں۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی واقعہ یا حادثہ مضمر ہے"۔! میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تمھارا اندازہ صحیح ہے"۔ اس نے اقرار کیا۔ "میری بیاہتا زندگی میں جو سیاہی پھیل گئی ہے اس کا سراسر ذمہ دار میں ہوں تم نہ صرف میرے گہرے دوست ہو بلکہ ہمراز اور غمگسار بھی ہو۔ ہم دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے میں بھی پیش پیش تھے۔ اس لئے تمھیں حقیقت بتانی ضروری ہے"۔

اس درمیان میں بیرا چائے اور بیئر لے آیا۔

اس نے بیئر کی سپ لیتے ہوئے اپنی سرگذشت شروع کی۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو، شادی کے وقت میں سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ جلد ہی ترقی کرتا ہوا بڑا افسر بن گیا، دوستوں کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ اونچی سوسائٹی کی چمک دمک سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ بڑے بڑے افسروں اور کروڑپتیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہونے لگا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ایک دن میرے ایک دوست نے ڈنر کی دعوت دی۔ میں نے سوٹ بوٹ میں ملبوس، گلشن کے علاقے میں دعوت میں شرکت کی۔ بڑے سے ہال میں دعوت کا اہتمام تھا۔ زرق برق لباس میں ملبوس مرد عورتیں قہقہے لگا رہے تھے۔ شیفون، امریکی جارجٹ اور راج شاہی سلک کی ساریاں سرسرا رہی تھیں۔ کلونج اور پرفیوم کی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی تھی، جام پر جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ ہر طرف کیف و مستی چھائی ہوئی تھی۔ بقول میرے دوست کے، آج میں وہاں تنہا مہمان تھا، آئندہ بغیر بیوی کے شرکت کی اجازت نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد میوزک کی دھن تیز ہو گئی، تمام جوڑے کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ روشنی ہلکی ہوتی گئی۔ صرف مرد اور عورت کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیویاں تبدیل ہونے لگیں۔ اس کی بیوی اس کی باہنوں میں اور اس کی بیوی اس کی باہنوں میں۔ شراب و شباب میں مدہوش جوانیاں رات کو اور بھی رنگین بنانے لگیں۔

ہر مرد دوسری عورت کو باہنوں میں لیے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک شخص نے ایک عورت کے تمام لباس اتار لیے، وہ بالکل برہنہ ہو گئی، ہانپتے ہوئے صوفے پر دراز ہو گئی۔ پھر صاحب خانہ نے لاٹری نکالی جس میں میرا نام نکلا۔ مجھے اس عورت کے ساتھ رات بسر کرنی پڑی۔ ہر شخص مدہوش تھا، سبھوں پر سحر طاری تھا شوہر اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پہلو میں دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا ـــــــ میری باتیں سن کر تمہیں تعجب ہو رہا ہو گا کہ کیا مشرقی تہذیب کے اس ملک میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ یہ تو کسی مغربی ملک کا تصور پیش کرتا ہے۔ ہماری اونچی سوسائٹی نقالی میں مغرب کو مات کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ دوسرے ہفتے پارٹی میں اپنی بیوی کو لیتا گیا۔ میری بیوی نے اسے عام سی ڈنر پارٹی سمجھا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر رہنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ میں اسے کون سی جگہ لے آیا تھا۔ اس ماحول میں اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ میں اپنی بیوی کو سمجھانے لگا مگر اس کے تیور بگڑ گئے۔ اچانک ایک عورت میرے گلے میں باہنیں ڈال کر میرے بوسے لینے لگی۔ اس کے شوہر نے میری بیوی کو اپنی آغوش میں لینا چاہا تو اس نے اسے زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور ہال سے نکل کر کار میں جا بیٹھی۔ جب تک میں پورٹیکو میں نکلتا، وہ گاڑی چلا کر واپس جا چکی تھی۔ اس نے اپنی عزت نہیں بیچی مگر مجھے دوستوں کے سامنے بے عزت ہونا پڑا۔ گھر آ کر میں نے اسے زدوکوب کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے مجھ سے متنفر ہو کر کہا "کیسے بے غیرت شوہر ہو جو اپنی شریک حیات کا جسم نیلام کرنا چاہتے ہو"!؟

دراصل اونچی سوسائٹی اور عیاش دوستوں کی صحبت نے مجھ پر افیون کا کام کیا تھا۔ میرے ذہن پر عجیب سا نشہ چھا گیا تھا۔ میری نظر میں اچھے برے کی تمیز مٹ گئی تھی۔ میں پستی کی طرف مائل بہ پرواز تھا۔ میری زندگی میں صرف شراب، جوا اور لڑکی در آئی تھی۔ میں عیش و عشرت میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میری بیوی اور دو بچے ہیں۔ ہمیشہ رات دو تین بجے گھر آتا۔ بیوی کے استفسار پر اسے مارتا پیٹتا، گالیاں دیتا۔ بچوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیتا۔ میری آنکھوں پر پردہ پڑ گیا تھا۔ یہ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں ایک ایسا بدنصیب ہوں جس کا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے مجھ سے زیادہ خوش نصیب ایک مزدور ہے جس کا ایک گھر بار ہے، بیوی بچے ہیں۔

اس درمیان میری بیوی مجھ سے ایسی بدظن ہوئی کہ اس نے مجھے وہ مقام نہیں دیا جو ایک شوہر کو ملنا چاہیے تھا۔ اکثر جب ہم دونوں میں جھگڑا ہوتا، وہ بچوں کو لے کر میکے چلی جاتی۔ ایک بار جب وہ گھر پر موجود نہ تھی، میں رات کو اپنی گرل فرینڈ کو لے آیا

تھا۔ میرے دوست بھی وہاں موجود تھے۔ اچانک وہ واپس آگئی۔ میں باتھ روم میں تھا اور وہ لڑکی بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر اپنی بیوی کو سامنے کھڑا پایا۔

"تم جیسا عیاش مرد مجھے طلاق کیا دے گا، میں خود تم سے علاحدگی اختیار کرتی ہوں، خدا کسی عورت کو تم جیسا شوہر نہ دے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے گئی۔ پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ میں بھی بے پروا ہو گیا۔ اسے اور تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں نے سوچا چلو جان چھوٹی، اب آزاد فضا میں سانس لے سکوں گا۔ خوبصورت لڑکیاں دولت اور شہرت پر جان دیتی ہیں مگر غم کا مداوا نہیں بن سکتیں۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ تمھاری بھابی نہ صرف تعلیم یافتہ بلکہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ کسی طرح بھی میری بدکرداری پسند نہیں کرتی اور نہ ہی میں اپنی خصلت بدل سکتا تھا۔ آج جب عیاشی کا خمار اترا تو پچھتاوے کے چوراہے پر کھڑا ہوں۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھ جیسا بدکردار شوہر اسے کیسے قبول ہوتا۔ اگر وہ ایک بار مجھے تلافی کا موقع دے تو میری زندگی میں پھر سے بہار آسکتی ہے۔ تم تو اس کا مکان جانتے ہو، میرا یہ پیغام اسے پہنچا سکتے ہو۔"

"اگر تم میرے جگری دوست نہ ہوتے تو واقعی مجھے بھی تم سے نفرت ہو جاتی۔ چلو یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمھیں اپنے گناہ کا احساس ہے اور نیک شوہر بن کر دوبارہ زندگی گزارنا چاہتے ہو میں بھابی سے مل کر ان کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میں وہاں سے سیدھا بھابی سے ملنے ان کے مکان پر گیا۔ ایک نوکر نے دروازہ کھولا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد بھابی کے والد تشریف لائے۔ ضعیفی نے انھیں کمزور کر دیا تھا، وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔

"تمھاری بھابی یہاں نہیں۔ وہ تین ماہ قبل اپنے بھائی کے پاس امریکہ چلی گئی ہے، وہاں نوکری کرتی ہے۔ تم جس دوست کے لیے یہاں آئے ہو وہ اس کے لیے ایک خط چھوڑ گئی ہے۔"

انھوں نے ایک لفافہ مجھے دیا۔

میں خوش خوش وہ لفافہ لے کر حمید کے پاس چلا گیا۔ اس نے بیتابی سے لفافہ چاک کیا۔ دو کاغذ ملے۔ ایک پر لکھا تھا: ——

"انسان اور حیوان میں بڑا فرق ہے۔ کبھی کبھی انسان حیوان ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال تم ہو۔!"

دوسرا خلع نامہ تھا —— !

★

غزل

قائد حسین کوثر

پیش چمن گنج، کانپور ۲۰۸۰۰۱

سحر تو آئے کہیں چاند جا کے کھو جائے
دعا یہ مانگو کہ اب رات تھک کے سو جائے

نواز دے نئی سمتیں، دھواں دھواں منظر
ہری ہو آنکھ، یہ دل اس طرح سے رو جائے

ہزار شب کی ہیں جاگی تھکی تھکی آنکھیں
اب انتظار کوئی فصلِ خواب بو جائے

مکان سارے کے سارے زمین ہو جائیں
فضا نہال ہو، گہرا غبار تو جائے

چلے تو آئے ہیں ہم سب کو چھوڑ کر یاں تک
یہ راستہ کہیں آگے کو گم نہ ہو جائے

کھُل دے ساری چٹانیں، جو راستہ روکیں
کہ پانی بہتا ہوا ریگ زار کو جائے

عارف محمود
۹۲/۱۴۰، پُروا ہیرامن، کانپور

افسانہ

پانچویں کوٹھری

اور پھر یہ ہوا کہ اس نے پانچویں کوٹھری کی تلاش شروع کر دی، کیونکہ تین کوٹھریاں تو پہلے ہی سے بھری ہوئی تھیں اور برسوں سے مقفل تھیں، چوتھی کوٹھری جس میں فی الحال اس کا قیام تھا، اس کے سامان سے ہی اس کو وحشت ہوتی تھی، اس کو ایسا لگتا تھا جیسے اب یہ سامان ہی اس کے لئے موت کا پیغام لائے گا، کوٹھری میں کہیں بھی تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، لیکن مزے کی بات یہ بھی تھی کہ بغیر اِس چوتھی کوٹھری کے تصوّر کے اس کی زندگی ہی بیکار تھی۔ بلکہ اس کا اپنا وجود ہی اسی چوتھی کوٹھری کے دم سے تھا، اب بس ایک صورت رہ گئی تھی، وہ اس سامان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دے اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُسے پانچویں کوٹھری کی تلاش تھی.

اس سلسلے میں اُس نے تمام عقلمندوں سے مشورہ کیا، سب کی متفقہ رائے تھی کہ اب کوئی گنجائش نہیں' نہ ایسا ہوا ہے اور نہ آئندہ ایسا ہوگا۔ یہ سننے کے بعد اس کو اپنی زندگی کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی، اور وہ خود ہی کوئی ترکیب سوچنے لگا کہ اَب اُسے دوسروں کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا، گھر والوں کی طرف سے وہ یوں ہی مایوس تھا کیونکہ وہ سب جان بوجھ کر اُس کو چوتھی کوٹھری میں ہی مقید رکھنا چاہتے تھے۔ بات بات پر اس کو احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ اب اس چوتھی کوٹھری کا ہی باسی ہے اور اس سے باہر نکلنے کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی.

آخر اس کو ایک حل نظر آ ہی گیا، کہ کیوں نہ پہلی کوٹھری کو خالی کر کے وہ اس میں منتقل ہو جائے اور اس کا سامان چوتھی کوٹھری میں بھر دیا جائے، یہ ترکیب اس کو بہت مناسب لگی، لہٰذا دوسری صبح سے ہی وہ اس کام پر لگ گیا.

پہلی کوٹھری کھُلی تو اندر بالکل اندھیرا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی نگاہیں ذرا عادی ہوئیں تو کوٹھری کی چیزیں صاف نظر آنے لگیں ـــ "اُف فوہ!" اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ـــ "یہ کوٹھری ہے یا کباڑ خانہ؟" ـــ اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔ اتنی زور سے ہنسا کہ سارا گھر اس کی طرف متوجّہ ہوگیا۔ اُس نے ملتجی نگاہیں سب پر ڈالیں کہ کوئی اس کوٹھری کی صفائی میں اس کا ہاتھ بٹائے لیکن سب سامنے سے ہٹ گئے اور ساتھ ہی مضحکہ خیز جملے اس کے کانوں میں اُترتے چلے گئے۔ ایسی نگاہیں بھی اس پر پڑیں کہ جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو یا ہونے کے قریب ہو' یہ احساس ہی اس کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھا، وہ واقعی نیم پاگل سا ہوگیا، اور بھاگ کر چوتھی کوٹھری سے اپنی چھڑی اُٹھا لایا "خبردار اگر کوئی قریب آیا" ایک دم سنّاٹا چھا گیا، سب منہ گھما کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔ سب کے ہٹ جانے کے بعد وہ پھر کوٹھری کی صفائی کی طرف متوجّہ ہوگیا اور خود ہی سامان باہر نکالنے لگا۔ سامنے ہی کئی ٹوٹی ہوئی بچّوں کی سائیکلیں بچّوں کی ٹین کی موٹریں اُلٹی سیدھی پڑی تھیں۔ اس نے ایک میلے کپڑے سے ان کی گرد پونچھی، اور سنبھال کر انھیں ایک طرف رکھ دیا، پھر وہ اور اندر داخل ہوا، چاروں طرف جالے ہی جالے تنے تھے، اس نے چھڑی سے جالوں کی چادر کو ہٹایا تو معًا اس کی نظریں ایک پُرانے بستہ پر ٹھہر گئیں جس کے قریب ہی ایک تختی بھی رکھی تھی۔ تختی کو صاف کیا تو ٹیڑھے میڑھے انداز سے اس کا اپنا نام لکھا ہوا تھا، اُسے دوسری طرف پلٹا تو چکنی مٹی سے پُتی ہوئی

تختی ابھی تک بالکل کوری تھی۔ بستے میں بوسیدہ اور چوہوں کی کُتری ہوئی کتابوں کا کھوسا تھا۔ ایک ربر کا گیند بھی بستہ ہی میں ملا۔ اُس نے کوٹھری کو اور کُریدا تو ٹوٹے ہوئے کھلونوں کا ڈھیر، دیمکوں کا کھایا ہوا کیرم بورڈ، چھوٹی چھوٹی کرسیاں اور میزیں، پُرانی چپلیں، جوتے، لکڑی کی کھڑاویں اور نہ جانے کیا کیا الا بلا بھری تھی وہ جلدی جلدی ہر چیز کو ہٹاتا رہا اور جھاڑ پونچھ کر ایک طرف قرینے سے رکھتا رہا۔

اب وہ ایک بڑے سے ٹرنک کو کھولے ہوئے تھا۔ یہ ٹرنک کسی زمانے میں اس کی بڑی محفوظ تجوری تھی، وہ ٹرنک کا ملغوبہ نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا چھوٹے چھوٹے بنٹے، گلی ڈنڈا، شیشے کی گولیاں، لٹو، دسہرے پر خریدے ہوئے مٹی کے ہاتھی گھوڑے، موٹے سے لالہ اور ان کی للائن، کسی کا پیر ٹوٹا ہوا تو کسی کا ہاتھ اور کسی کا سر ہی ندارد، یہ بڑا بکس اس کو بہت عزیز تھا، اپنی پسند کی ہر چیز وہ اسی بکس میں محفوظ کر دیتا تھا، چیزیں باہر نکل نکل کر ڈھیر ہوتی رہیں اور وہ بچوں کی طرح خوش ہوتا رہا۔ سارا گھر کھڑا اس کی حرکات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، وہ خود بھی کبھی کبھی کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھ لیتا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا، بکس خالی ہوتا رہا اور چیزوں کے ڈھیر لگتے رہے کہ یکبارگی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی دُور بین تھی۔ اور وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا، یہ دُور بین اس نے اپنے ایک دوست کی چوری کی تھی۔ زندگی کی پہلی اور آخری چوری۔ لیکن اس چوری کے بعد وہ اتنا پریشان ہوا تھا کہ اس نے ڈر کی وجہ سے اس کو چھپا دیا تھا اور پھر بھول گیا تھا، اور آج اتنے دنوں کے بعد یہ پھر اچانک مل گئی تو اسے اپنے دوست کا اُداس چہرہ اور ساتھ ہی اس کی ماں کی ڈانٹ پھٹکار یاد آگئی جو اس دُور بین کے غائب ہونے پر اس کے دوست پر پڑ رہی تھی اور اس وقت وہ خاموش کھڑا اپنے دوست کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ چپکے سے دُور بین لا کر کہیں رکھ دے تاکہ دوست کی ماں کا غصّہ تو ختم ہو لیکن پھر خیال آیا کہ ایسی چیز دوبارہ ہاتھ نہ آئے گی، اور آج جب یہ دُور بین اتفاقاً اس کے ہاتھ پھر لگ گئی تو اُسے سب یاد آ گیا۔ اُس نے دُور بین آنکھوں سے لگائی اور مُڑ کر گھر والوں کی طرف دیکھا، وہ سب جو اُس کے سامنے سے دُور ہٹ گئے تھے اس کو اپنے قریب دکھائی پڑے، اتنے قریب جتنا کہ وہ چاہتا تھا، دُور بین کی اس صفت پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اس کو اپنی اس پہلی اور آخری چوری پر کوئی ندامت نہیں تھی ۔۔ اب دیکھوں گا یہ سب کیسے دُور بھاگیں گے؟ اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے جب چاہوں گا سب کو اپنے قریب کھینچ لاؤں گا۔"

اُس نے دُور بین کی ڈوری صاف کر کے اپنے گلے میں اٹکالی اور پھر صفائی کے کام میں منہمک ہو گیا، حتیٰ کہ پہلی کوٹھری بالکل خالی ہو گئی، اس نے تمام سامان اتنے سلیقہ کے ساتھ سمیٹا کہ وہ صرف ایک کونے میں آ گیا اور پھر وہ دوڑ کر اپنی چوتھی کوٹھری میں گیا اور اپنا پُرانا بستر، ٹوٹی ہوئی چارپائی، حقّہ اُگالدان، دواؤں کی شیشیاں، پُرانی شیروانیاں اور وہ سب کچھ جو چوتھی کوٹھری میں تھا اُٹھا لایا اور قرینے سے پہلی کوٹھری میں رکھ دیا، پھر اطمینان سے اپنی چارپائی پر بیٹھ کر دُور بین آنکھوں سے لگالی، وہ تمام لوگ جو اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر دُور بھاگ رہے تھے، سب کے سب اس دُور بین میں قید تھے اور بالکل اس کے نزدیک نظر آ رہے تھے اتنے نزدیک کہ وہ ان کو چھو سکتا تھا، اُس نے ان میں سے ایک کو چھونے کے لئے ہاتھ بھی بڑھایا مگر ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ سب زور سے ہنس دیئے۔ اور پھر متفقہ طور پر وہ پاگل قرار دے دیا گیا۔ لیکن وہ خوش تھا کہ چوتھی کوٹھری سے اب اس کو نجات مل گئی۔

عتیق الہ آبادی
۲۲/۲۶ احمد گنج، الہ آباد ۔۳

غزل

کیا بتائیں تمہیں کس سمت کدھر جاتا ہے
آدمی مر کے خلاؤں میں بکھر جاتا ہے

درد جب ضبط کی سرحد سے گزر جاتا ہے
ایسے حالات میں احساس بھی مر جاتا ہے

آگ سازش سے ہواؤں کی ہے لگتی لیکن
سارا الزام چراغوں کے ہی سر جاتا ہے

ساتھ رہتے ہیں تو ہیں پیڑ کی صورت لیکن
شاخ سے ٹوٹ کے ہر پتّا بکھر جاتا ہے

دیکھ کر ایک جنازے کو یہ احساس ہوا
شام ہوتی ہے تو ہر آدمی گھر جاتا ہے

احمد کلیم
۱۲۶- تازی خانہ لکھنؤ

اترپردیش میں اقلیتوں کی فلاح و ترقی

اقلیتیں ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہیں. جنگِ آزادی، آرٹ، موسیقی سائنس، سماجی خدمات اور ادب، ان تمام زمروں میں اقلیتوں نے اہم رول ادا کیا ہے. عوامی بہبود کے لئے کمربستہ حکومتِ اترپردیش نے اقلیتوں کی سماجی تعلیمی اور معاشی ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات کئے ہیں اور ایسے بندوبست کئے ہیں کہ وہ بے خوف ہوکر باعزت طور سے زندگی گذار سکیں. ان کے ثقافتی ورثے کے تحفظ کے علاوہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یک جہتی کے جذبہ کو مستحکم کرنے کے لئے بھی اقدامات کئے گئے ہیں.

حکومت کا مقصد ایک ایسے سماج کی تشکیل کرنا رہا ہے جس میں تمام فرقوں کی مذہبی اقدار، تہذیبی رسم و رواج اور زبان و ادب کا مساوی احترام ہو. باہمی تعاون کے جذبہ کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کی ہمہ گیر ترقی کے لئے بھی حکومت نے موثر قدم اُٹھائے ہیں.

کسی بھی طبقے کی کسی بھی زمرے میں ترقی کے لئے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص خود کو محفوظ سمجھے اور اُسے یہی یقین ہو کہ اگر اس کی جان و مال کا کوئی نقصان ہوتا ہے تو حکومت اس کی ہر ممکن مدد کرے گی، چنانچہ اقلیتوں کی جان و مال اور ان کے مذہبی مقامات کے تحفظ کے لئے جاری کئے جانے والے احکامات کی سختی سے پابندی کرائی گئی ہے.

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے اور تشدد کے مرتکب لوگوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جارہی ہے. یہ بھی بندوبست کیا گیا ہے کہ اگر ضروری ہو تو ایسے معاملات میں قومی تحفظ قانون کا بھی استعمال کیا جائے. فرقہ وارانہ فسادات کے بعد اقلیتوں میں اعتماد کی بحالی اور تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ مجرموں کو بلا تاخیر سزا دی جائے. چنانچہ فسادات کے خصوصی معاملات میں حکومت نے ہائی کورٹ کے مشورے سے خصوصی عدالتوں کے قیام کا بندوبست کیا ہے.

اترپردیش کے ۳۶ اضلاع کو فسادات کے نقطۂ نظر سے حساس قرار دیا گیا ہے اور ان میں سے ۱۴ کو زیادہ حساس قرار دیا گیا ہے اس لئے صورتحال کے مطابق وہاں تحفظ کا خصوصی بندوبست کیا گیا ہے.

ان علاقوں میں جنھیں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے حساس اور فساد زدہ قرار دیا گیا ہے. ہدایت کی گئی کہ ضلع اور پولیس انتظامیہ کے ایسے افسران کی تقرری کی جائے جو اپنی کارکردگی، غیر جانبداری اور سیکولر اندازِ فکر کے لئے مشہور ہیں. ایسے علاقوں میں یا دیگر مقامات پر ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کا یہ اولین فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ فرقہ وارانہ تناؤ کی روک تھام کریں، اس سلسلہ میں انجام دیئے گئے ان کے کاموں کو ان کی ترقی کے وقت خصوصی اہمیت دی جائے اور بہتر کارکردگی پر ضلع اور پولیس ملازمین کو انعامات دیئے جائیں.

پولیس ملازمین کی بھرتی میں اقلیتوں کا خاص طور سے خیال رکھا جارہا ہے اس کے بندوبست کے لئے سلیکشن کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہے. مرکزی پولیس فورس میں بھرتی کے سلسلے میں مرکزی حکومت بھی اسی طرح کی کارروائی کر رہی ہے. ریلوے، قومیائے ہوئے بینکوں اور عوامی اداروں میں روزگار کے مواقع بہت بڑی تعداد میں دستیاب ہیں. ان اداروں میں بھی اس کا یقینی بندوبست کرایا جارہا ہے کہ اقلیتی فرقے کے لوگوں کی بھرتی پر خصوصی توجہ دی جائے. رسمی تعلیم کے تحت ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے جو درجات چل رہے ہیں، ان میں اقلیتی فرقے کے لوگوں کو بھی اکثریتی فرقے کے مساوی سہولتیں حاصل ہیں لیکن اقلیتی فرقے کو خصوصی

سہولتیں دینے کے مقصد سے بھی کچھ اقدامات کئے گئے ہیں۔

بہت سے زمروں میں مقابلے کے امتحانات کے ذریعہ بھرتی کی جاتی ہے، عام طور سے اقلیتی فرقے تعلیمی پس ماندگی کے سبب ان امتحانات میں مساوی شرائط پر کامیابی حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی کمیوں کو دور کرنے کے لئے اقلیتی تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کے واسطے اقدامات کئے جا رہے ہیں اور ان کی تربیت کے لئے کوچنگ درجات شروع کئے گئے ہیں تاکہ وہ امتحانات میں کامیابی حاصل کریں۔

اقلیتوں کی آبادی کی کثرت والے اضلاع میں جہاں پہلے کثیر المقاصد ادارے (پالی ٹکنیک) نہیں تھے وہاں قائم کر دیئے گئے ہیں۔ ریاست کے اندر ۶۹ صنعتی ادارے (آئی۔ ٹی۔ آئی) اور ۱۴ ریاستی صنعتی تکنیکی ادارے چل رہے ہیں، اس طرح اس وقت تقریباً ہر ضلع میں ایک تکنیکی ادارہ ہے، چاہے وہ اقلیتوں کی کثرت والا علاقہ ہو یا نہ ہو۔ نجی زمرے کے ادارے بھی ایسے سرٹی فکیٹ کورس چلا رہے ہیں لیکن ان میں نشستوں کی کمی ہے، پھر بھی ان میں گنجائش کے مطابق اقلیتی فرقے کے لوگوں کو داخلہ ملتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثریتی طبقہ کے لوگ بھی بڑے شوق سے اردو پڑھتے رہے ہیں لیکن اتر پردیش میں یہ زبان خاص طور سے اقلیتی طبقے کی ہی زبان ہے۔ اردو زبان کی تعلیم کے لئے موثر قدم اٹھائے گئے ہیں۔ اس وقت کئی ابتدائی، سکنڈری اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں اردو ایک مضمون کی شکل میں پڑھائی جا رہی ہے۔ ریاست میں ۲۱۴۲ اردو میڈیم اسکول چل رہے ہیں جن میں ۸، ۲۵، ۳ بچے مختلف درجات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ۹۳۱۲ ٹیچر انھیں پڑھا رہے ہیں۔ اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ...۵ اردو ٹیچروں کی نئی اسامیوں کی تشکیل کی گئی ہے بعض تعلیمی اداروں میں پنجابی اور اردو تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کے لئے امداد دی گئی ہے۔

اردو کی ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے نیز اردو ادیبوں کی مدد اور انعامات وغیرہ دینے کے لئے اتر پردیش اردو اکاڈمی اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی سرگرم کار ہیں۔ اردو اکاڈمی کی سالانہ گرانٹ بڑھا کر اب ۲۳ لاکھ روپے کر دینے کی منظوری ریاستی حکومت نے دے دی ہے اور فخر الدین کمیٹی کے لئے سالانہ گرانٹ کے طور پر پانچ لاکھ ۲۰ ہزار روپے کی منظوری دی گئی ہے۔ اردو اکاڈمی عوامی لائبریریوں کو بھی امداد دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں ادبی اور دیگر موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں پر بھی ہر سال انعامات دیتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اردو کی نایاب اور کمیاب کتابوں کی اشاعت کا بھی بندوبست کرتی ہے۔ اکاڈمی اب تک ۸۰ کتابیں شائع کر چکی ہے، جس میں کلاسیکی ادب، شاعری کا انتخاب، یونیورسٹی کی نصابی کتابیں، دوسری زبانوں کے تراجم، جنگِ آزادی سے متعلق ادب اور بچوں کا ادب بھی شامل ہے۔ اردو اکاڈمی مسودات کی طباعت پر امداد، ضعیف اور بیمار اردو ادیبوں کو ان کے علاج کے لئے یکمشت امداد پنشن، نیز اردو پڑھنے والے طلبا کو وظائف بھی دیتی ہے، یہ وظائف درجہ ۶ سے لے کر ریسرچ کرنے والے طلبا کو دیئے جاتے ہیں۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے اردو اکاڈمی میں ایک کافی بڑی لائبریری، کتابت اسکول، اردو ٹائپ اسکول اور اردو کوچنگ اسکول سرگرم کار ہیں۔

اردو زبان سیکھنے والے سرکاری افسروں اور ملازمین کے واسطے ہر سال ہائی اسکول کی سطح کا ایک امتحان منعقد کیا جاتا ہے۔ امتحان میں پاس ہونے والوں کو سرٹی فکیٹ کے ساتھ انعام بھی دیا جاتا ہے

اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو اپنا کاروبار وغیرہ شروع کرنے کی غرض سے مالی امداد اور قرض دینے کے مقصد کے تحت ایک اقلیتی مالیاتی کارپوریشن قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے، جس سے یقیناً اقلیتوں کو بڑی راحت ملے گی، اور ترقی کے مواقع حاصل ہوں گے۔

نیا دور "فراق نمبر" حصہ دوم کی زبردست مانگ کی بنا پر اس کی مزید دو ہزار کاپیاں طبع کی جا رہی ہیں۔ لیکن کسی ایجنٹ کو اس کی ۱۰۰ سے زیادہ کاپیاں بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔ —— ادارہ

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب: **اُجالوں کے کارواں**، شاعر: سلطان احمد ناؔدم
قیمت: بیس روپے، ملنے کے پتے: دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ
نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ

"تنہائی فنکار کو کس طرح راس آتی ہے اس کا عملی ثبوت اس وقت ملا جب جناب سلطان احمد ناؔدم کا پہلا مجموعۂ کلام "کونوں کے زاویے" منظرِ عام پر آیا۔ یہ کاوش نامہ ہر طرح لائق توجہ اور قابلِ ستائش تھا۔ ادبی حلقوں میں بجا طور پر اس کی پذیرائی کی گئی۔ دو سال کی مختصر مدت میں موصوف کا دوسرا مجموعۂ کلام "اجالوں کے کارواں" منظرِ عام پر آیا جو میرے لیے حیرت و مسرت کا سبب بنا اور متقاضی ہوا کہ اس کے متعلق اپنی بساط بھر کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خاموشی، سچی لگن اور بھرپور ریاضت کے ساتھ موصوف نے ادبی سفر طے کیا ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انہیں کے الفاظ ہیں" میں نے اپنی غزلوں میں ادب کے افادی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش ہر حال کی ہے۔ ادب برائے ادب بھی ہے اور ادب برائے زندگی بھی۔ کیونکہ دنیا کی ہر بات کا تعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر بہرصورت زندگی سے ہے، جو حسن ہے زندگی کے لیے۔ جو عشق ہے زندگی کے لیے۔ جو غم ہے زندگی کے لیے۔ جو خوشی ہے زندگی کے لیے۔ یہی وہ حقائق ہیں جن سے روزمرہ کی زندگی میں نہ الگ ہوا جا سکتا ہے اور نہ ہی فکر و خیال میں .... میں نے یہی چاہا کہ غزلوں میں عشق کے انداز، حسن کی ادائیں، زمانے کے اتفاقات، کشمکشِ حیات اور رنگینیٔ کائنات کو اپنے طرزِ فکر میں سمو کر پیش کر سکوں، میں نے وقت کے تقاضوں کے ساتھ بھی انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن قدروں کی عظمت کو برقرار رکھنا چاہا ہے جو سرمایۂ ادب ہیں لیکن ادبی قدروں کے بیچ سمجھوتہ موجود ہے اور یہ کچھ وہی جانتے ہیں جو کلاسیکی اور غیر کلاسیکی ادب کا واضح شعور رکھتے ہیں۔"

ناؔدم صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں جب "اجالوں کے کارواں" کا مطالعہ کیا تو ان کے بیان کی صداقت ورق ورق پر جگمگاتی نظر آئی۔ وہ غزل کے بنیادی مزاج و آہنگ سے باخبر ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ادب کی راہِ دشوار میں وہ تھکے نہیں ہیں بلکہ آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے۔

——— رباب رشیدی

نام کتاب: **جفائے خوباں** (شعری مجموعہ) شاعر: لکشمی نرائن رؔونق لکھنوی: مرتب: بخشی لکھنوی

زیر نظر کتاب جناب بخشی نرائن متخلص بہ رؔونق لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جس کو جناب بخشی صاحب نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ حدیثِ دل ہے اور جفائے خوباں۔ اب غزل کی وسعتوں نے خوباں کے مفہوم کو ایک ذاتِ حسین تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ غمِ دوراں بھی اس میں شامل ہے۔ رؔونق صاحب غزل کے مزاج شناس ہیں اور اس مجموعے میں ایسی غزلیں ہیں جو دل کو متاثر کرتی ہیں۔ غزل ہیئت اور خیال کا دلکش امتزاج ہے۔ یہ اہم نہیں ہے کہ کیا کہا گیا بلکہ اہم بات یہ ہے کہ کس انداز میں کہا گیا۔ غزل اسی وقت کامیاب کہی جا سکتی ہے جب اسلوب میں شعریت ہو۔ رؔونق صاحب کے کلام میں شعریت بدرجۂ اتم موجود ہے، رؔونق صاحب نے ادبی ماحول میں پرورش پائی اور جگہ جگہ پر خاندانی ادبی اثرات اُن کے کلام سے نمایاں ہیں وہ غور و فکر کے بعد شعر کہتے ہیں اور ان کی شائستہ مزاجی متوازن انداز فکر اور پرخلوص جذبات کے مظہر ہیں، وہ موجودہ دور کے تقاضوں کا عرفان رکھتے ہیں انھوں نے اپنے گردوپیش کی زندگی

کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ بھی تیز ہے، یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

دیر و کعبہ جا کے ارباب بصیرت کیا کریں
نور سے اللہ کے جب کل جہاں معمور ہے

جسے دیکھو وہ بندہ ہے غرض کا
نہ بے مطلب کسی کو یار دیکھا

——— معین الدین حسن علوی کاکوروی

نام کتاب: **سخنورانِ غزل**، مصنف: معین الدین حسن علوی کاکوروی قیمت: پچیس روپے ملنے کا پتہ: مرکز ادب اردو ۱۳۰، شاہ گنج لکھنؤ

زیر نظر کتاب معین الدین حسن صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں سات مضامین ہیں، جن میں چھ مضامین اردو کے اکابر شعرا یعنی میرؔ، جرأتؔ، موتنؔ، مصحفیؔ، آتشؔ اور غالبؔ پر ہیں۔ ایک مضمون کاکوری کے مشہور صوفی شاعر شاہ تراب علی قلندر پر ہے۔ یہ سب مضامین اچھے ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی صاحب کا مختصر پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد عرض مصنف ہے جسے فاضل مصنف نے مختصراً لکھنؤ کی پرانی محفلوں کے بارے میں اور کچھ اپنے ذوق کی پرورش کے بارے میں تاثراتی طور پر قلم بند کیا ہے۔

ان مضامین میں معین صاحب نے ان شعرا کے کلام کی خصوصیات کا تاثراتی اور وجدانی انداز میں جائزہ لیا ہے اور ہر شاعر کے ادبی اور ثقافتی ماحول سے بھی بحث کی ہے۔

معین صاحب انگریزی کے اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری اور ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں ان کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ وسیع ہے نیز ان کا طرز تحریر اگرچہ قدیم انداز کا ہے اس کے باوجود اعلیٰ علمی، ادبی اور تہذیبی قدروں کا حامل ہے، جس میں صحتِ زبان اور قدرت کلام خاص طور پر نمایاں ہے۔ "سخنورانِ غزل" کے مضامین اردو کے طلبا کے لیے خاص طور پر مفید ہیں۔

——— ذکیؔ کاکوروی

نام کتاب: "**آگے آیت**" مصنف: ضیا حسنی، قیمت: پندرہ روپے، ملنے کا پتہ: مکتبۂ دین و ادب، امین آباد لکھنؤ

ہندستان میں کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے بعد اُن کا جیسا طنز و مزاح نگار کوئی نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، اور مجتبیٰ حسین کے بعد خواجہ عبد الغفور اور عبارت چند کھنہ قسم کے طنز و مزاح نگار ابھر کر سامنے آئے۔ ضیا حسنی صاحب کو بھی اسی زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے "دفتر والی سڑک" اور "چاندی کے تار" اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ "آگے آیت" اُن کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے جو فخر الدین علی احمد کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

"آگے آیت" میں شامل مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ضیا حسنی صاحب چونکہ بے تکان لکھتے ہیں اس لیے انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انھوں نے کتنے مضامین لکھے۔ "آگے آیت" میں اُن کے سولہ[16] مضامین شامل ہیں مگر اپنے پیش لفظ میں انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ یہ مجموعہ پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ وہ زندگی بھر کھل کر نہیں ہنس سکے ہیں، اس لیے ان کی تحریریں پڑھنے والوں کو قہقہہ نہ دے سکیں گی، صرف زیر لب مسکراہٹ دے سکتی ہیں۔ ضیا حسنی صاحب کو اپنی کوشش بہر حال جاری رکھنی چاہیے

کہ خوب سے خوب تر کی جستجو بہر حال خوب ہی ہوتی ہے۔

——— شہنشاہ مرزا

نام کتاب: کانٹوں کی خوشبو شاعر: فیروز ظفر بدایونی
قیمت: پندرہ روپے، ملنے کا پتہ: ۱۳۔ فرشوری ٹولہ۔
بدایوں۔ ۲۴۳۶۰۱۔ یوپی

"کانٹوں کی خوشبو" کے تخلیق کار بدایوں کے نوجوان شاعر فیروز ظفرؔ ہیں۔ جن پر یہ قول صادق آتا ہے کہ "بزرگی بعقل است نہ بسال"۔ یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ۱۹۸۰ء میں "شہر گل" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ فیروز ظفرؔ اپنے ادبی نظریات کے بارے میں سخت رویے کے حامل ہیں اور شعر و ادب کی چہار دیواری میں وہ مانگے ہوئے اجالوں کے قائل نہیں معلوم ہوتے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

میں تو کانٹے ہی چمن سے چن کے لایا تھا مگر
میرے دامن میں ظفرؔ خوشبو کہاں سے آگئی

فیروز ظفرؔ نے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں خود اپنا تعارف بڑے دلکش انداز میں کرایا ہے جس کے چند مندرجات بڑے دلچسپ ہیں مثلاً:

مرکزِ شاعری:

مری دیوانگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہوگا
کہ بعض اوقات تیرا نام پوچھا جائے ہے مجھ سے

نظریۂ شاعری:

ادب برائے ادب

انرجی: تنہائی، شاعری اور خاموشی سے
الرجی: مشاعروں، ہنگاموں اور چاپلوسی سے
نفرت: بناوٹ، خود غرضی اور خود نمائی سے
محبت: سادگی، حسن اور سچائی سے
محرومی: دولت، عورت اور بھائی سے
دوستی: آفس، ہوٹل اور چارپائی سے
دشمنی: اپنی ذات سے
شکست: نیرنگیٔ جذبات سے
جنگ: گردشِ حالات سے
کربِ مسلسل: یادوں کی برات سے
سانحۂ حیات: سانحہ عمر کا پوچھنے آئے ہو
دیکھ لو ہم کو اک سانحہ ہم بھی ہیں

بزرگ قلم کار سید عروج زیدی نے "کانٹوں کی خوشبو" کے ابتدائی صفحات پر "پیش رس" کے عنوان سے جو تحریر قلمبند کی ہے اس کا مندرجہ ذیل حصہ قابلِ توجہ ہے۔

"فیروز ظفرؔ ترقی پسند ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے طرزِ بیان میں سوزِ حیات کی جلوہ گری اور اکثر اشعار پر رمزیہ عنصر کی چھاپ ملتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کی زندگی ابھی ادھوری ہے اور زندگی کے تقاضے ہر گھڑی درِ دل پر دستک دیتے ہیں۔"

بحیثیت مجموعی فیروز ظفرؔ کی غزلوں، نظموں اور قطعات پر مشتمل مجموعۂ کلام "کانٹوں کی خوشبو" کو ایک متوازن اور معتدل کاوش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قدیم اور جدید کی آمیزش سے ان کی شاعری نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جسے "میانہ روی" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عمدہ کتابت، طباعت اور کاغذ سے آراستہ کتاب کے سرورق پر اگر تھوڑی توجہ اور دی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔

——— ڈاکٹر سلمان عباسی

نام کتاب: پیکر آواز (ریڈیائی ڈرامے) نام مصنف: خالد عابدی، قیمت: دس روپے، ملنے کا پتہ: محمد خالد عابدی
۵۳، ہوا محل روڈ۔ بھوپال

یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر انسان اس کا ایک کردار ہے اور اس کی ساری زندگی ڈراما اور اداکاری کی نذر ہو جاتی ہے لیکن وہ اداکار جو نئے نظریات، نئی تہذیب، نئی اقدار اور نئے واقعات کے ساتھ اسٹیج پر آتا ہے اس پر ناظرین کی نگاہیں مرکوز ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ خالد عابدی کے ڈرامے جہاں زندگی کی گوناگوں تصویریں پیش کرتے ہیں وہیں ان افراد کو گلے لگانے کے لیے دل و دماغ کو تیار بھی کرتے ہیں جن کی آج کے پُر آشوب دور میں ضرورت ہے —!!

پیکر آواز کا ہر ڈراما اپنی جگہ جامع، مکمل اور اثرانگیز ہے ڈراما کے تمام عناصر ان ڈراموں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

بلاشبہ خالد عابدی اپنی جودتِ طبع کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ علامہ جمیل مظہری صاحب نے بھی خالد عابدی صاحب کی ڈراما نگاری کی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے اور موصوف کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک مکمل ڈراما حیات امروز کے کسی مسئلہ خاص پر لکھیں تاکہ انہیں ڈراما نگاری کی دنیا میں وہ مقام حاصل ہو جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ احقر کا خیال ہے کہ پیکر آواز میں شامل تمام ڈرامے حیات امروز کے کسی نہ کسی خاص مسئلہ سے متعلق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پیکر آواز کو ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔ !!

———— اکرم فاروقی

"بانگ درا" کے تیسرے حصّے کی غزلوں کا تجزیہ، صفحہ ۱۷ کا بقیہ

بقول فرمان فتح پوری:۔

"اقبال کے پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ غزل کی صنف صرف عشقیہ جذبات و منتشر خیالات کی متحمل ہو سکتی ہے، گہرے سیاسی و فلسفیانہ افکار اور آئے دن بدلتے ہوئے سماجی رجحانات کی ترجمانی کا حق اس سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے حکیمانہ موضوعات اور دقیق نظری مسائل کو غزل میں جگہ دے کر اس خیال کا بطلان کر دیا ہے۔" ؁۴

میں اس رائے سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں کہ اقبال نے غزل میں نئے افکار و خیالات کی ترجمانی کر کے غزل کو وسعت دی اور اس کے مرتبے کو بلندی پر پہنچا دیا۔ اس دور کی غزل میں اقبال اپنی رُوح کے ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بقول حمید احمد خان:۔

"دراصل ۱۹۱۰ء سے کچھ پہلے علامہ اقبال اس مقام پر پہنچ چکے تھے، جہاں مشق سخن کی ضرورت باقی نہیں رہتی ان کی عظمت ان کے سامنے تھی، اور ان کا کلام نہیں پکار پکار رہا تھا، یہ وہ مقام ہے جہاں انسان دوسروں کا ترجمہ نہیں اپنی رُوح کا ترجمان ہوتا ہے" ؁۵

اس دور کی اقبال کی غزلوں کے تفصیلی مطالعے سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس دور کی غزلوں سے اقبال کا روایت سے وہ انحراف شروع ہو جاتا ہے جو ان کی بعد کی شاعری کا خاصّہ ہے۔

حواشی

؁۱ سیّد وقار عظیم۔ اقبال کی نظموں میں رنگِ تغزّل۔ اقبال مجلّہ بزم اقبال جلد نمبر ا۔ اپریل ۱۹۵۳ء شمارہ ۴ ص ۱۱۳-۱۱۴

؁۲ فرمان فتح پوری۔ تنگنائے غزل وسعتِ بیان اور اقبال۔ صحیفہ شمارہ ۱۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۷۸ء ص ۳۸

؁۳ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ اقبال کابل۔ ص ۶۱

؁۴ فرمان فتح پوری۔ تنگنائے غزل وسعتِ بیان اور اقبال۔ صحیفہ شمارہ ۱۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۷۸ء ص ۴۴

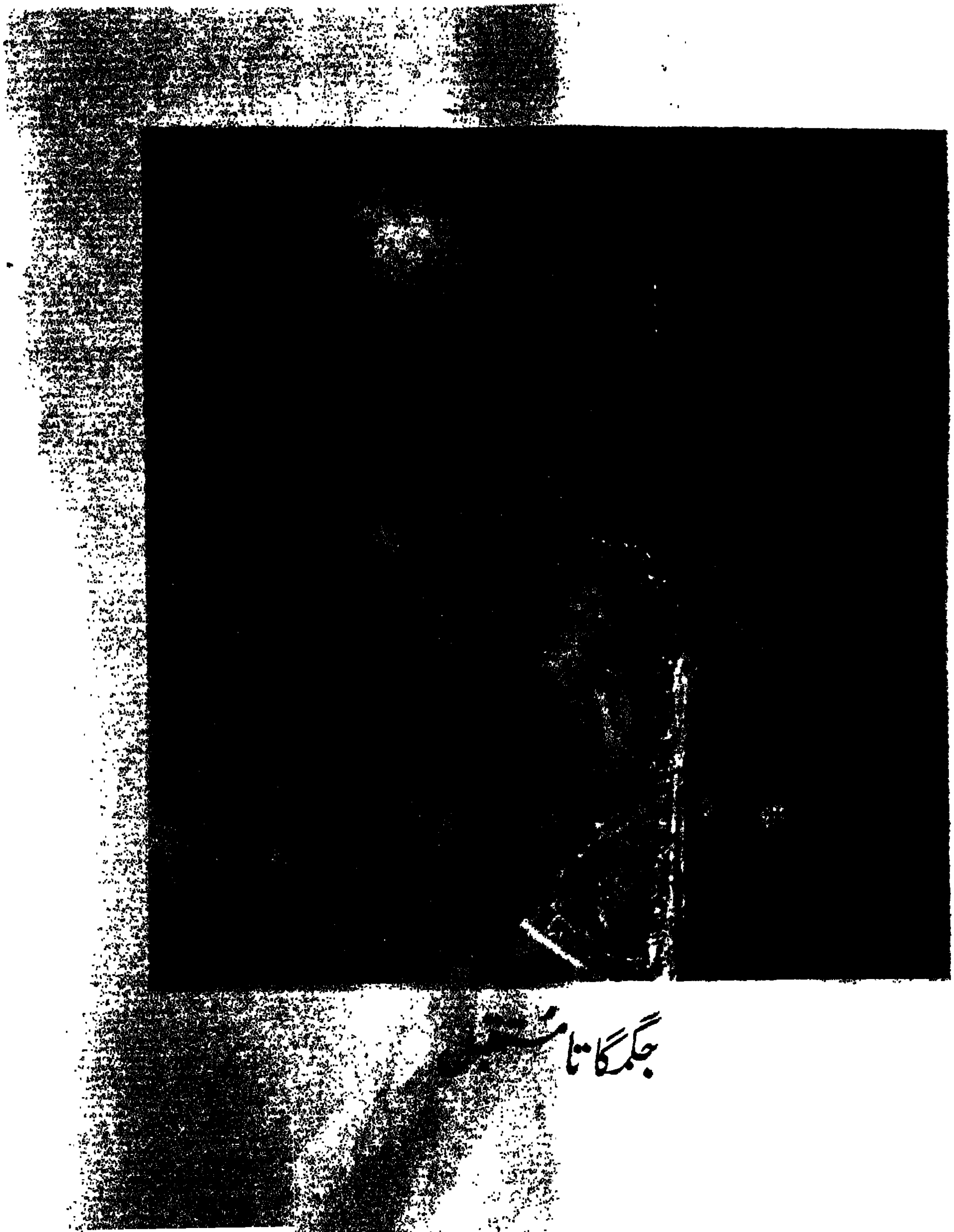
؁۵ پروفیسر حمید احمد خان۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری۔ مجموعہ مقالات۔ لاہور ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۲

APRIL, 1985
Rs. 1-00 Paisa

NAYA D

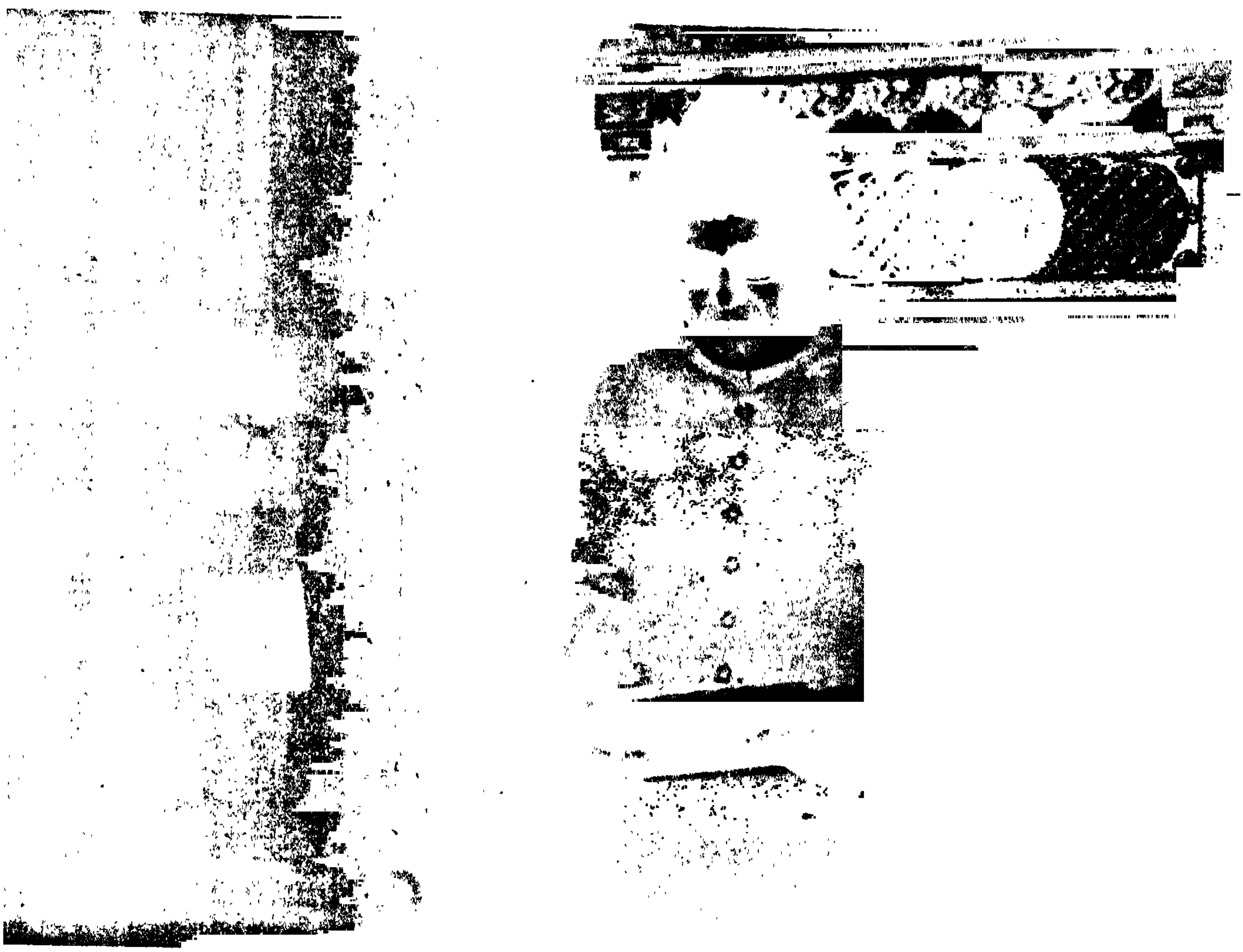
Annual Subs.
Rs. 5/-

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226 001



Printed at United Block Printers, Luckno


JAN 1986
قیمت: ایک
مئی ۱۹۸۵ء



اتر پردیش کے نئے گورنر جناب محمد عثمان عارف کو الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس
بی ایم۔ این۔ شنکرانن نے دربار ہال میں ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو ان کے
عہدے کا حلف دلاتے ہوئے

عنوانات

نیا دور
جلد ۴۰ نمبر ۲
مئی ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

فون:
ایڈیٹر: ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: ۴۷۱۰۸

پبلشر بھوانی شنکر شکلا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
زر سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: پرنٹنگ برانچ [illegible] پبلک ریلیشنز اترپردیش لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
[illegible] ایڈیٹر نیا دور [illegible] اترپردیش لکھنؤ

اپنی بات

عزت مآب جناب محمد عثمان عارف صاحب کی گورنر اتر پردیش کی حیثیت سے اتر پردیش میں تشریف آوری اس ریاست کے لیے انتہائی مسرت کی بات ہے کیونکہ جناب عثمان عارف صاحب محض ایک سیاسی، سماجی اور عوامی رہنما ہی نہیں رہے ہیں بلکہ ان کی شخصیت ادبی بھی ہے۔ وہ ایک عرصے سے اردو ادب کی خاموش اور بے لوث خدمت میں منہمک ہیں۔ آپ کی شعری تخلیقات ملک کے اہم اور مقتدر رسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ آپ نیا دور کو بھی اپنی گرانقدر شعری تخلیقات سے نوازتے رہے ہیں۔ آپ کے متعدد شعری مجموعے بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں آپ کی نعتوں کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" شائع ہوا جس کی رسم رونمائی آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے انجام دی تھی۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ "قلم کی کاشت" بھی ۱۹۸۱ء میں ہی شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ قطعات و رباعیات کا مجموعہ "نور زندگی" اور نظموں کا مجموعہ "فکر و احساس" بھی شائع ہوا۔ "نذرِ وطن" کے نام سے بھی آپ کی ایک تصنیف ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ جسے راجستھان ساہتیہ اکاڈمی نے سال کی سب سے اچھی اردو کتاب قرار دیتے ہوئے اسے انعام سے نوازا۔ آپ کی ایک تصنیف "ذکر محبوب" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ تصوف اور بیکانیر کے چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت پیر محبوب بخش کے حالات زندگی آپ کی اس تصنیف کا موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ راجستھان کے اساتذہ کی حیات و شاعری پر راجستھان نظامت تعلیم کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب "دامن باغباں" کی اشاعت آپ کے زیر نگرانی عمل میں آئی اور آپ نے پروفیسر پریم شنکر سری واستوا کی کتاب "راجستھان کے موجودہ اردو شاعر" کی اشاعت میں بھی قابل ذکر تعاون دیا۔ اس کے علاوہ آپ کی متعدد شعری و ادبی تصنیفات زیر اشاعت ہیں۔

آپ ابتدا ہی سے فرقہ وارانہ اتحاد، سیکولرازم اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور انھیں مستحکم کرنے میں منہمک رہے ہیں۔ قومی مفاد کے پروگراموں اور پالیسیوں کی ترویج کے لیے اور قومی تقریبات اور تیوہاروں کے موقع پر آپ عوامی جلسوں اور مشاعروں کا انعقاد بھی کرتے رہے ہیں۔ کانگریس پارٹی میں بھی آپ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ کل ہند انجمن ترقی اردو دہلی کی جنرل باڈی کے صدر بھی ہوئے۔ چند برسوں تک آپ ماہنامہ "شعلہ و شبنم" دہلی کے جوائنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔ راجستھان ساہتیہ اکاڈمی کے رسالہ "نخلستان" کی مشاورتی کمیٹی کے آپ رکن بھی ہیں۔ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں کو آپ نے زینت بخشی ہے۔ ۸ جون ۱۹۸۰ء سے ۱۴ جنوری ۱۹۸۲ء تک آپ مرکزی حکومت میں تعمیرات و مکانات کے نائب وزیر اور ۱۵ جنوری ۱۹۸۲ء سے ۱۴ فروری ۱۹۸۳ء تک زراعت و شہری رسد کے نائب وزیر رہے۔ ۱۵ فروری ۱۹۸۳ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء تک آپ دوبارہ تعمیرات و مکانات کے نائب وزیر رہے۔ مختلف موقعوں پر آپ متعدد غیر ملکی دوروں پر بھی گئے۔ تصوف، قومی یکجہتی، ہندستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب، پسماندہ طبقوں، اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور دیہات کے لوگوں کی ترقی، مطالعہ اور شعر گوئی آپ کی خصوصی دلچسپی کے موضوعات ہیں۔ آپ انتہائی نرم مزاج، شیریں سخن، خوش اخلاق اور ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔ گورنر اتر پردیش کے عہدہ جلیلہ پر ہم ادارہ نیا دور کی جانب سے آپ کا استقبال کرتے ہیں اور آپ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

● ماہنامہ "شمع" کے مدیر اعلیٰ جناب یوسف دہلوی کا انتقال بلاشبہ ایک بڑا سانحہ ہے۔ یوسف صاحب دہلی کی پرانی تہذیب اور پرانی قدروں کی ایک مرقع تصویر تھے۔ ماہنامہ "شمع" کی آبیاری انھوں نے اپنے خون جگر سے کی تھی۔ اور اپنی لگن، خلوص اور محنت سے اسے اس سطح پر پہنچا دیا کہ وہ تعداد اشاعت کے اعتبار سے ہندستان میں اردو کا سب سے بڑا ماہنامہ بن گیا۔ یوسف صاحب نے جو اشاعتی ادارہ قائم کیا اس کی جانب سے بعد میں بچوں کا ماہنامہ "کھلونا"، خواتین کا ماہنامہ "بانو" پھر "مجرم"، "شبستان"، "ڈائجسٹ"، "شمع" اور "شمع" (ہندی) شائع ہوئے۔ "آئینہ" کے نام سے ایک منفرد جریدہ بھی اس ادارے کی جانب سے کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ جس کے مدیر ظ۔ انصاری صاحب تھے۔ مجموعی طور پر اس ادارے نے اردو کی ترویج و توسیع کے سلسلے میں ایک اہم رول ادا کیا، جس کا سہرا بنیادی طور پر یوسف صاحب کے سر جاتا ہے۔ ادارہ نیا دور یوسف صاحب کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے گہری ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

ڈاکٹر راج کمار
ریلوے کالونی، عالم باغ
لکھنؤ

مہک رہی ہے گلابوں سے "اُس کی یاد" کی شام

پنڈت جواہر لال نہرو کو ہم سے جُدا ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر ہندستان کی دھرتی اور بین الاقوامی سطح پر آج بھی ان کے قدموں کے انمٹ نقوش موجود ہیں۔ ان کی شیروانی کا گلاب آج بھی تر و تازہ ہے جن اصولوں اور پالیسیوں پر انھوں نے جدید ہندستان کی بنیاد رکھی تھی۔ انہی بنیادوں پر کھڑے ہو کر ہندستان آج دنیا کے بڑے سے بڑے ملک سے آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوا ہے اور اسے عالمی برادری میں جو عزت و وقار حاصل ہے وہ انہی اصولوں اور پالیسیوں کی دین ہے جن کی بنیاد پر ملک کی تعمیر و ترقی اور عالمی امن کے کام کو آگے بڑھایا گیا۔ پنڈت جی نے ناوابستہ تحریک کے ذریعہ عالمی امن کے امکانات کو نہ صرف روشن کیا بلکہ استحکام بھی بخشا۔ امن عالم کے لیے انھوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں — بین الاقوامی سطح پر اتنی اہم خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے ملک کی بے مثال قیادت بھی کی۔ حصولِ آزادی سے پہلے غیر ملکی سامراج کے خلاف لڑائی میں انھوں نے طرح طرح کی صعوبتیں اٹھائیں اور مشکلات کو برداشت کیا۔ پھر آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے عزم و عمل اور کردار و دانش کی جو شمع روشن کی ملک اسی کی روشنی میں آج بھی تعمیر و ترقی کے راستے پر مسلسل گامزن ہے۔

پنڈت جی ملک کے اندر فرقہ پرستی، تنگ نظری، عصبیت، جہالت اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ وہ بذاتِ خود

ہندستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر اقدار کی ایک روشن تصویر تھے ۔ وہ سارے ملک میں اتحاد و اتفاق ہم آہنگی اور یک جہتی قائم رکھنے کے لیے تمام عمر کوشاں رہے ۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا: ”جو کوئی سائنس اور سائنس کی افادیت پر یقین رکھتا ہے اور آج کے زمانے کی روح کو سمجھتا ہے وہ فرقہ پرستی پر یقین نہیں رکھ سکتا ۔ کیونکہ فرقہ پرستی بیمار اور پسماندہ ذہنیت کی علامت ہے ۔ آج سائنس کی بدولت دنیا سکڑ رہی ہے ۔ تنگ نظری کا موجود رہنا قابلِ فہم نہیں ۔ تنگ نظری اور تعصب ہمارا راستہ ایسے زمانے میں روک رہے ہیں جب ہم نئے سماجی اور معاشی نظام کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں ۔ قومی یکجہتی کا مقصد نہ صرف یہ کہ لسانی ، صوبائی اور مذہبی تعصب اور تفریق کو ختم کرنا ہے بلکہ اس کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ایسی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے کہ ہر فرد کی ذہنی نشو و نما بچپن ہی سے صحت مند بنیادوں پر ہو ۔“

پنڈت جی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور جامع الصفات تھی ۔ وہ عہدِ حاضر کے ممتاز مفکر اور دانشور تھے اور ان کے اندازِ فکر اور نظریات کی بنیاد جذباتیت پر نہیں بلکہ جدید منطق اور سائنس پر تھی ۔ وہ ایک سائنسی ذہن رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھیں ادب اور فنونِ لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی ۔ وہ جس طرح سوچتے تھے اس پر اسی طرح عمل بھی کرتے تھے ۔ انھوں نے تہذیب و تمدن کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: ”ہندستان میں رہنے والی کوئی بھی ذات یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ ہندستان کے دل و دماغ اور اندازِ فکر پر اسی کی اجارہ داری ہے ۔ ہندستان کی تعمیر میں ہر طبقے اور فرقے نے حصہ لیا ہے ۔ اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے تو ہندستان کو کبھی نہیں سمجھ پائیں گے ۔“

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پنڈت جی کی شخصیت کا نمایاں پہلو انسان دوستی تھا ۔ ان کی نظر صرف اپنے ملک و قوم تک محدود نہیں تھی ۔ نوعِ انسان کے ساتھ کہیں بھی ناانصافی ہو یا ظلم و تشدد ہو رہا ہو ۔ وہ اس پر بے چین ہو جاتے تھے ۔ وہ دنیا کے ہر ملک کی آزادی پر یقین اور وہاں چلنے والی آزادی کی تحریکوں سے پوری ہمدردی رکھتے تھے ۔ وہ جمہوری روایتوں کے نہ صرف مقلّد بلکہ ان کے محافظ بھی تھے ۔

”ان کے انتقال کے اکیسویں سال میں بھی ہمیں ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ انھوں نے ناوابستگی ، روشن خیالی ، وسیع النظری اور سائنسی اندازِ فکر کا جو راستہ ہمیں دکھایا وہ ہمیں منزل تک لے جائے گا ۔ سیکولرزم ، سوشلزم اور جمہوریت کو ایک ساتھ لے کر چلنے کا جو تجربہ ہندوستان نے شروع کیا تھا ، وہ کامیاب رہا ۔ یہی سیکولرزم ، سوشلزم اور جمہوریت ہماری بقا ، استحکام اور ترقی کی ضمانت

ہیں۔ ان کے بغیر نہ تو ہماری آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور نہ ہی ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ ان کے اس نظریہ کی روشنی آج بھی کم نہیں ہوئی ہے اور نہ کبھی کم ہوگی۔ ان کی گلابوں جیسی یادیں ہمیں سدا ان کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن رکھیں گی۔

--

"فرقہ واریت اور دوسرے ملکوں میں پائے جانے والے فاشزم کی مختلف شکلوں میں کافی یکسانیت ہے۔ یہ حقیقت میں فاشزم کا ہندوستانی روپ ہے۔ ہم ان برائیوں کو جانتے ہیں جنھیں فاشزم جنم دیتا ہے۔ ہندوستان میں ہم ان برائیوں اور مصیبتوں سے بھی واقف ہیں جو فرقہ وارانہ تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان دونوں برائیوں کے میل سے بھیانک بحران اور خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ فرقہ واریت انسانیت کو نیچے گراتی اور بدتہذیب بناتی ہے۔ اگر ہندوستان اس خطرناک نظریے سے متاثر ہوا تو نہ صرف اس کی حدود کے اندر متواتر دنگے فساد ہوتے رہیں گے بلکہ جلد ہی اس کا تعلق باقی دنیا سے ٹوٹ جائے گا اور دنیا کے دوسرے ممالک اسے نیچی نظروں سے دیکھنے لگیں گے اس لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ ہم ہندوستان میں شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح کی فرقہ واریت کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کریں۔ فرقہ واریت کے ساتھ نہ تو کسی قسم کا سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے برداشت کیا جا سکتا ہے"

• پنڈت نہرو

شاہ مظفر علی کوکب قادری

پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد میں

سب کو دیتا تھا جو منزل کا نشاں جاتا رہا
کارواں سے اپنے میرِ کارواں جاتا رہا
روشنی تھی جس سے وہ آنکھوں کا تارا کیا ہوا
جان سے پیارا تھا جو نہرو ہمارا کیا ہوا
پاک تھا ہر اک عمل جس کا شوالے کی طرح
ہر ارادہ تھا اٹل جس کا ہمالے کی طرح
اپنی جانب پھیر سکتا تھا جو بیگانوں کے رخ
ایک پل میں موڑ دیتا تھا جو طوفانوں کے رخ
شانتی کے دوت نہرو امن کے پیغامبر
رحمتوں کے پھول برسیں تیری روحِ پاک پر
ساری دنیا کیوں نہ کرتی دل سے تیرا احترام
ساری دنیا کو دیا تھا امن کا تو نے پیام
سب کو تو محبوب تھا سب کے لیے ہر دل عزیز
ختم کر ڈالی تھی تو نے دوست دشمن کی تمیز
مشرق و مغرب میں تھا یکساں ترا سکہ رواں
کم ہے تجھ پر فخر جتنا بھی کرے ہندوستاں
پا نہیں سکتا کوئی اتہاس میں تیرا مقام
رہتی دنیا تک رہے گا اے جواہر تیرا نام

ڈاکٹر امرت لعل عشرت
پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی
بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی

فیض احمد فیض کی شاعری کا

ایک اجمالی جائزہ

۱۹۱۷ء میں انقلاب روس، سرمایہ داروں کے خلاف مزدور طبقوں کی یقینی کامیابی کی بشارت ثابت ہوا۔ سیاسی اور سماجی مفہوم میں یہ پہلا انقلاب تھا جس نے دنیا کے ایک چھٹے حصے میں محنت کشوں کو مارکس اور لینن کی تعلیمات کے زیر اثر استحصالی عناصر کے مقابلے میں مقاومت پر آمادہ کیا۔

جنگ عظیم کے اختتام پر ہندوستان نے بھی اشتراکی خیالات سے اثر قبول کرنا شروع کیا۔ تعلیم یافتہ طبقے نے مارکسی نظریات کا مطالعہ کر کے ان کو عملی طور پر آزمانے کی خواہش محسوس کی۔ محنت کشوں کو دولت کا عادلانہ اور مساویانہ تقسیم کے لیے اشتراکی نظریات کی سچائی شمع ہدایت معلوم ہونے لگی۔ ٹریڈ یونین ایکٹ منظور کر کے سامراجی حکومت نے گویا مزدوروں کی تنظیموں اور اُن کی سرمایہ داری کے خلاف جد و جہد کے وجود کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا۔

۱۹۲۶ء میں حسرت موہانی نے آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کی صدارت قبول کر کے اور خطبۂ صدارت پڑھ کے اس تحریک کے ساتھ اردو شعرا کی وابستگی ثابت کر دی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس اور اس کے اعلان نامے کی رُو سے "ہندوستانی زندگی میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار" اور "سائنسی عقلیت پسندی" کو تخلیق ادب کے لیے ایک لازمی شرط قرار دیا گیا۔ سماجی مسائل پیش کرنے کے ساتھ سماجی مسائل کے حل تلاش کرنا بھی ادیب کا فریضہ سمجھا گیا ـــ رومان نگاروں کی تاثراتی خیال آرائیوں کے برعکس اب حقیقت نگاری پر زور دیا گیا۔ سماج اور ادب کے اٹوٹ رشتے کی وضاحت فیض نے ان الفاظ میں کی ہے "ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ان مسائل میں غالباً طبقاتی کشمکش اور دنیوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہے"(۱) اسی طرح ادب کا کام "سماج میں ایسے فکری جذباتی یا عملی رجحانات پیدا کرنا ہے جن سے ان مسائل کا حل نسبتاً آسان ہو جائے"(۲)۔

پنجاب کے روایت شکن ماحول میں طبقاتی کشمکش، معاشی آزادی اور دوسرے اشتراکی مسئلوں کا ذکر سب سے پہلے اقبال نے کیا۔ "خضر راہ" کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ انقلاب روس کی قیادت میں انھوں نے ہندوستانیوں کو بھی سرمایہ و محنت کا تضاد ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ علی سردار جعفری کے الفاظ میں "پہلی بار انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے معنوں میں اقبال کی شاعری میں آیا اور مزدور اور سرمایہ دار کے تضاد کا اظہار ہوا"(۳)۔ لیکن ان سب کے باوجود اقبال کے اشتراکی اور دینی نظریات کا تضاد اُن کے کلام کی معنویت کم کر دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ سرمایہ داری کے خلاف مزدور کو پیغام انقلاب دیتے ہیں ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

اُٹھ کے اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے (۴)

اور دوسری طرف جب انقلاب کے نتیجے کے طور پر نئے نظامِ زندگی کی تشکیل کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ احیائے اسلام کی دُھن میں ماضی پرستی پر مائل نظر آتے ہیں اور ایسا نظام تجویز کرتے ہیں جو سرمایہ داری کے مصائب اور لعنتوں کو پھر سے سارے محنت کشوں پر نازل کر دے۔ ان کے خیال میں مذہبی پابندیوں کی موجودگی میں سرمایہ داری کا قیام بے ضرر ہو جاتا ہے۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں (۵)

ظاہر ہے کہ یہ نظریات اشتراکیت کے منافی ہیں۔

فیض اشتراکی شاعروں میں اس حیثیت سے بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں کہ وہ اشتراکی رجحانات کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے مقصد کا پروپیگنڈا نہیں کرتے۔ ان کی موضوعاتی نظموں کے عنوانات عام طور پر سیاسی نہیں ہیں۔ وہ پارٹی لائن کے شاعر نہیں۔ اُن کے سیاسی اور سماجی شعور میں اُن کی اپنی شاعرانہ بصیرت کی چمک ہے۔ ان کی شاعری پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اُن کے کلام میں مقصدیت علامتوں اور استعاروں کی تہ در تہہ راکھ میں خاموش چنگاریوں کی طرح خوابیدہ ہے۔ اور اگر "کبھی کبھی فیض علامتوں کی راکھ کو کُریدتا نہیں رہے گا تو اس بات کا امکان ہے کہ مقصد کے انگارے علامات کی راکھ تلے دبے دبے بجھ جائیں گے" (۶)

یہ بات ایک حد تک درست ہے اور اس کا سبب ہماری نظر میں یہی ہے کہ فیض خارجی مسائل کو بھی داخلی بنا کو پیش کرنے کے عادی ہیں لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ فیض کی مقصدیت اور اُن کے اشتراکی نظریات کی ڈھکی چھپی چیزیں کہاں ہیں جن کو اُن کی نظموں کی مرکزی وحدت کی نسبت سے تلاش کرنا مشکل ہو؟

فیض عوام کی بہبود چاہتے ہیں۔ سماج کی معاشی اور معاشرتی ناانصافیوں اور بُرائیوں پر اُن کا دل جلتا ہے۔ طبقاتی کش مکش کی چکی میں پستے ہوئے کسانوں مزدوروں اور قلاشوں کی حالتِ زار اُن کو بیتاب کر دیتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ سماج پر ایک شبِ تاریک مسلط ہے لیکن آخر کار سحر ہونے کا انھیں یقین کامل ہے اس سحر سے وہ فکر و عمل کی مکمل آزادی مُراد لیتے ہیں۔ ہند و پاک کی تقسیم کے بعد کی آزادی اُن کی نظر میں ایک "شب گزیدہ سحر" اور "داغ داغ اُجالے" کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

فیض نے اپنے انقلابی معتقدات کے لیے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھیں دار و رسن کی باتیں زیادہ عزیز ہیں۔ اپنے حبسیاتی کلام میں وہ ہمیں نوسو سال پہلے کے اپنے ہم وطن مسعود سعد سلمان لاہوری نظر آتے ہیں جو فکر و عمل کی آزادی کھو دینے کے بعد اپنے وطنِ محبوب اور محبوبِ وطن کی یاد میں اشعار کی صورت میں خون کے آنسو بہاتے رہے ہیں۔ مسعود سعد اور فیض میں قدرِ مشترک صرف حبسیات ہی نہیں بلکہ وہ دردمندی قادر الکلامی اور لطفِ سخن بھی ہے جس نے ایک کو نوسو سال زندہ رکھا ہے اور دوسرے کو نوسو سال زندہ رکھے گا۔

فیض عوام کے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری عوام کے لیے نہیں ہے بظاہر یہ بہت عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اُن کے کلام کی رمزیت کو سمجھنا عوام کے بس کی بات نہیں۔ اُن کی شاعری کے علائم و رموز کے پیچھے عام بین الاقوامی سیاست اور معاشی اور معاشرتی تصورات موجود رہتے ہیں جن کو پڑھا لکھا طبقہ ہی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایک لحاظ سے فیض کے کلام کی یہ خاص خوبی بھی ہے۔ اسی معنوی تہ داری نے ان کے کلام میں فن اور صحافت کا امتیاز قائم رکھا ہے۔ ظفر علی خان اور فیض کے مزاجِ شعری کا فرق بھی اسی سے نمایاں ہوتا ہے۔ فیض

ہی کے نفسِ مضمون کو جب زیادہ واضح انداز میں اور نسبتاً زیادہ جذباتی لہجے میں شاعرانہ بانکپن سے پیش کیا جائے تو اسے ساحر لدھیانوی کا کلام کہا جا سکتا ہے ــــ

"چند روز اور مری جان" "ملاقات" "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" "کتے" "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" "تنہائی" وغیرہ فیض کی بہترین نظمیں ہیں جن میں جمالیاتی اقدار کے ساتھ زندگی کی ٹھوس بنیادی اقدار کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔

فیض نے اپنی نظموں کی فضا تعمیر کرنے میں ایک خاص فنی اور معنوی انداز سے کام لیا ہے ۔ محبت سوزِ ماہتاب افسردگی یادِ ماضی وغیرہ کے عناصر سے وہ اپنی نظموں کا ایسا پس منظر تیار کرتے ہیں جس سے زیرِ بحث موضوعِ نظم بہت موثر ہو جاتا ہے ۔ ان کی متفکرانہ رمزیہ پردازی نظم کے مصرعوں میں ایسا جادو جگاتی ہے کہ وہ خاص حالات میں عام لوگوں کے جذبات کی ترجمانی بن جاتے ہیں ۔

غالب اور اقبال کے بعد اتنے قلیل سرمایۂ کلام میں اتنی کثرت سے ضرب الامثال کسی اور شاعر نے کم پیش کی ہیں ۔ مندرجہ ذیل مصرعے اور اشعار اب تک ہماری جدید شاعری میں مستقل رجحان اور منشور کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔

ے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

ے بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

ے وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ع چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مجموعی حیثیت سے بقول سید احتشام حسین مرحوم ۔
"فیض نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں ناانصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردِ عمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے ۔"

فیض کے کمالِ فن نے غزل کو ایک نئی سمت عطا کرنے میں جو اعجاز دکھائے ہیں اُن کا اعتراف دوست دشمن سب نے کیا ہے ۔ قدیم مینائے غزل میں معنویت کی نئی شراب بھر کر انھوں نے میخانۂ ادب میں اپنے لئے شہ نشینوں میں جگہ پیدا کرلی ہے ۔ اردو غزل کی کلاسیکی روایات، تشبیہات، استعارات اور دیگر مستقل علامات سے گہری وابستگی کو ذریعۂ اظہار بنا کر حیات و کائنات کو جس انداز سے فیض نے موضوعِ سخن بنایا ہے اس کی نظیر ان سے پہلے کسی غزل گو میں نہیں ملتی ۔ اقبال کے کلام میں نظریہ اکثر فن پر غالب آگیا ہے ۔ جوش ملسیانی صرف فن کے شاعر ہیں ۔ محروم و حفیظ اور دوسرے غزل سرا فکر و جذبہ کی امتزاجی کارکردگی اور اس سے پیدا ہونے والی معنویت کی عظمت سے دور ہیں ۔ فیض کا تغزل ہندوستان کے سربرآوردہ غزل سراؤں کی طرح ماضی کی صحت مند اقدار سے فیضیاب بھی ہے اور یکسر ایک نئے ماحول کا ترجمان بھی ۔

فیض کی غزل کی بنیاد رمزیت اور ایمائیت پر استوار ہے وہ حسن و عشق کے پردے میں زندگی اور اس کی جد و جہد کے عکاس ہیں ۔ ان کے غزلیہ اشعار کے مطالب و مفاہیم بہت گہرے اور وسیع ہیں اور ان میں دُور دُور تک روحِ عصر کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اُن کی غزل میں ـــــ

"جنون صرف جنون ہی نہیں رہ جاتا عشق کی ایک علامت بن جاتا ہے ۔ ناصح اور واعظ صرف ناصح اور واعظ ہی نہیں رہ جاتے اُن کے روپ میں ندامت پسندی اور رجعت پرستی صاف نظر آتی ہے ۔ قفس صرف قفس ہی باقی نہیں رہ جاتا، پابندیوں اور زباں بندیوں کے ایک اشارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

دستِ صیاد اور کفِ گلچیں جبر و استبداد اور
ظلم و ستم کے اشارے بن جاتے ہیں۔ ہجر کی شب
اور روزِ وصلِ صنم سے نظامِ اقدار کی طبقاتی
کشمکش کا اظہار ہوتا ہے(۸)۔"

اگلے وقتوں کے بہت سے لوگ اور جدید دور میں راقم الحروف جیسے چند لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایوانِ ادب میں جب مقصد ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے تو فن دوسرے دروازے سے رخصت ہو جاتا ہے۔ کسی خاص نظریہ کے تحت شعر کہنے والوں کا یہ حشر آئے دن دیکھا جاسکتا ہے۔ فیض اس سلسلے میں مستثنیات میں سے ہیں انھوں نے اپنی علامتی Symbolism غزل کو مقصدی بنانے کے باوجود اُسے جمالیاتی مسرتوں کا خزانہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے اور یہی وہ سبب ہے جس نے اُن کو مختلف ادوارِ ادب کی قید سے آزاد کر کے ہر دلعزیز بنا دیا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

- صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم
- وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
- اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
- ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

رومانی اور اشتراکی خیالات کا وہ امتزاج جو بعد میں تمام ترقی پسند شعرا کے کلام کا اساسی جوہر قرار پایا شروع میں فیض ہی کے کلام میں فروغ پاتا رہا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "نقشِ فریادی" اس سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو غزل میں محبوبہ کے عشق کے ساتھ "آزادیِ فکر و عمل" کو معشوق قرار دے کر اس کے فراق میں عاشق کی طرح تڑپنے کا تصور فیض کا عطا کردہ ہے۔ ترقی پسند غزل کو مستقل طور پر ایک مزاج فیض ہی نے بخشا ہے۔ فیض کی غزل میں کسی مخصوص نعرۂ انقلاب کی تکرارِ محض نہیں بلکہ اس میں جگہ جگہ شعورِ ذات، شعورِ حیات اور شعورِ کائنات سے پیدا ہونے والی مختلف کیفیات کے جلوے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی فارسی اور عربی کے خزانوں سے بھی براہِ راست ادبی جواہر مستعار لیے ہیں۔ فارسی اور عربی کی خوبصورت تراکیب اور دلنشین ٹکڑوں نے انگریزی (Romanticism) کی روح کو ان کی غزل میں بڑی رعنائی سے بے نقاب کیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے اُن کی غزل کا لہجہ رجائی ہے، لیکن اس کا موضوع ناسازگار سیاسی، معاشی اور رومانی حالات سے پیدا ہونے والا غم ہے ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی رہ پر جو تیری رہگزر بھی نہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں

فیض کی غزلوں کے تدریجی ارتقا کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ "نقشِ فریادی" تک ان کا شیریں اور مترنم لہجہ کافی حد تک رومانی احساسات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ روشن اور واضح ہے اس دور کی غزلیات اب بھی نوجوانوں کے لیے "نئے عہد نامے" کا حکم رکھتی ہیں لیکن بقول کسریٰ منہاج (۹)

"بعد کے مجموعوں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ
بعض مقامات پر لہجہ نامانوس ہوگیا ہے۔"

اس نامانوسیت بلکہ ابہام کا سبب ہماری نظر میں شاعر کے طرزِ فکر کی ہمہ جہت اور بعد کی زندگی کے مختلف النوع تجربات ہیں۔ ظرف تنگنائے غزل میں ایک بھرپور اور ہشت پہلو تجربے یا مشاہدے کو ایک ہی شعر میں سمونے کی کوشش کرنا اکثر ایسے ہی نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ یہ نتیجہ شاعر کے عجزِ بیان کی دلیل بھی ہو سکتا ہے لیکن فیض کے بارے میں

یہ مفروضہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ ان کے اس قسم کے شعر کچھ اس قبیل کے ہیں ؎

ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے
بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

فیضؔ کی بے پرواہی سے اُن کے کلام میں جگہ جگہ ایسے فنی اور ادبی اسقام بھی نظر آتے ہیں جن کی موجودگی اہلِ فن کو ناگوار گزرتی ہے گو اس سے اُن کے کلام کی ارزش واقعی پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں پڑتا تاہم اُن کی فنی اور ادبی معلومات کی کمی کا اعلان ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ فنی غلطیاں ایک مختصر سی تجدید نظر سے دور ہو سکتی تھیں ؎

خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

———

ع کوچہ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

ع میں تو ہوں میری چال ہے شیر ببر کی چال

ع میری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو

ع یہی تاریکی تو ہے غازۂ رُخسارِ سحر

مجموعی حیثیت سے فیضؔ کی غزل اُن کی بلندیٔ فکر، وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ مشاہدہ کی آئینہ دار ہے۔ روایت کا ایک عمیق شعور، فنی اور ادبی تقاضوں کا احترام کرنے کی صلاحیت اور لطفِ سخن قائم رکھنے کی خلاقانہ کوششوں نے ان کے غزلیہ اشعار کو اکثر ایسی زندگی اور تابندگی بخشی ہے کہ وہ عہدِ حاضر کے مقبول ترین شعرا کے زمرے میں شامل ہیں۔ وہ اُن خوش نصیب فنکاروں میں سے ہیں جن کے طرزِ تفکر اور اندازِ نگارش کی چھاپ عہدِ حاضر کے بہت سے مقبول و معروف شعرا کے کلام پر صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

★

---

(۱) "ادب کا ترقی پسند نظریہ" مطبوعہ میزان لاہور ۱۹۶۲ء ص ۱۶۔

(۲) " " " " " (۳) ترقی پسند ادب" ص ۱۱۷ (۴) خضرِ راہ مطبوعہ کلیاتِ اقبال ص ۳۰۱۔ (۵) کلیاتِ اقبال ص ۴۴۴۔ (۶) "گندم کے کھیت بچوں کے ہاتھ اور شاعر" از احفاظ الرحمٰن مطبوعہ افکار کراچی فیض نمبر ص ۴۹۵۔ (۷) فیضؔ کی انفرادیت" مطبوعہ افکار کراچی فیض نمبر ص ۳۱۴۔ (۸) "جدید شاعری" از ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۳۵۵۔ (۹) "سماجی شاعری اور فیضؔ" مطبوعہ "نئے قدریے" حیدرآباد (پاکستان) شاعر نمبر ۱۹۶۶ء ص ۱۱۹۔

نیا دور کا اندرا گاندھی نمبر بھی شائع ہو گیا ہے لیکن بہ یک وقت کسی بھی ایجنٹ کو اس کی ۱۰۰ سے زائد کاپیاں بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

——— ادارہ

غزلیں

غُلام ربّانی تاباںؔ
۲۲۰۔ ذاکر نگر۔ نئی دہلی

غمِ حیات کو نغموں کا پیرہن بھی ملے
میری نواؤں میں شاید سُراغِ فن بھی ملے

دُعائیں دیتے ہیں بادِ چمن کو اہلِ چمن
خدا کرے تجھے صرصر کا بانکپن بھی ملے

طلسمِ شوق نہ کہیے تو اور کیا کہیے
چلیں تو راہ میں بکھرا ہوا وطن بھی ملے

لبِ خموش کی معجز بیانیاں تسلیم
کبھی کبھی تو مگر رُخصتِ سخن بھی ملے

نہ موجِ رنگ، نہ موجِ صبا، نہ موجِ شرر
ملے تو سوگ میں ڈوبے ہوئے چمن بھی ملے

کسے خبر ہے اندھیروں کے دشت میں تاباںؔ
ہماری طرح بھٹکتی کوئی کرن بھی ملے

●●

وقارؔ خلیل
معاون مدیر سب رس "ایوان اُردو"
حیدرآباد - ۵۰۰۴۸۲

کل تھا دُعا، پر آج سزا ہے وہ آدمی
سرمایۂ جنوں کی ادا ہے وہ آدمی

کتنی ہی حسرتوں کو ملا اذنِ زندگی
گردن اُٹھا کے جب بھی چلا ہے وہ آدمی

بدلا مزاجِ وقت تو سب کچھ بدل گیا
جلتا ہوا سوال بنا ہے وہ آدمی

تاریخ کے دوراہے پہ پرچھائیں کس کی ہے
شاید وہیں کہیں پہ کھڑا ہے وہ آدمی

سُورج کی ٹھوکروں نے جسے دربدر کیا
راتوں کو آفتاب بنا ہے وہ آدمی

جب سامنا ہوا تو کوئی اور ہی لگا
اک عمر ساتھ ساتھ رہا ہے وہ آدمی

قدموں کے نقش جسم کی خوشبو ہی تو ہے
اس راستے سے ہو کے گیا ہے وہ آدمی

احباب کا خلوص کہ ذکرِ وقارؔ پر
سب نے کہا گلاب نما ہے وہ آدمی

●●

نسیم اقتدار علی
نیو بیری روڈ، لکھنؤ

فیضؔ — شخصیت اور فن

فیضؔ صاحب کا سراپا سا معصوم پیکر جس نے ادب میں نہ جانے کتنے حسین و جمیل پیکر تراشے تھے، بڑی بڑی روشن آنکھیں، جو محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ رکھتی تھیں اور جو انسانیت کے استحصال پر ذرا ذرا میں چھلک پڑتی تھیں، درخشاں پیشانی اور بھرا ہوا چہرہ جس پر غمِ دوراں کی اَن گنت لکیروں نے اپنا جال بچھا رکھا تھا، اونچی کھڑی ناک، انا، خودداری اور انفرادیت کی پاباں نیز اصولوں کی نگہبان تھی، کشادہ دہن ہونٹوں پر ہمہ وقت رقصاں نرم سی مسکراہٹ جو حساس شاعر کے قلب و ذہن پر گذرنے والے تاثرات کو بڑے سلیقے سے چھپائے رکھتی، اور اس سب پر مستزاد سرخ و سپید رنگت، انگریزی وضع کے لباس میں ملبوس درمیانہ قد اور دوہرا بدن، یہ تھے وہ جملہ عناصر جن سے مل کر فیضؔ صاحب کی انتہائی دلآویز شخصیت بنی تھی۔

شعر پڑھنے کا بڑا سادہ سا انداز تھا، کوئی ترنم تکلف اور گھن گرج نہیں، لیکن اس سادگی میں جانے کیا پُرکاری تھی کہ سامعین گوش بر آواز رہتے اور پھر سننے والوں کی داد تحسین کے جواب میں جب وہ عجز و انکسار سے ذرا خم ہو کر لپنے سینہ پر دا اپنا ہاتھ رکھتے تو ہونٹوں پر رقصاں مسکراہٹ کچھ اور شرمیلی ہو جاتی اور اس وقت فیضؔ صاحب کی شخصیت بڑی پیاری لگتی، جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے وہ اس کیفیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

آج سے تقریباً سات سال قبل جب ۱۹۳۶ء کے بعد وہ پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے تو ستمبر کی اُمس والی گرمی اور رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ وہ مہینہ جو روزہ داروں کے غیر شرعی تقریبات میں جانے کے لیے زنجیرِ پا بن جاتا ہے۔ سہ پہر کو قیصر باغ بارہ دری میں لکھنؤ کے شہریوں کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا گیا تھا، پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور حاضرین میں بیشتر سنجیدہ قسم کے لوگ تھے، فیضؔ صاحب سے ان کا پُرانا کلام فرمائش کر کے سُنا جا رہا تھا، ادھر وہ شعر پڑھنا شروع کرتے اُدھر سامعین اسے پہلے ہی زیرِ لب گنگنانے لگتے۔ اسی روز بعد مغرب ہندو کلچرل ایسوسی ایشن کی جانب سے ہوٹل کلارکس اودھ میں استقبالیہ کا اہتمام تھا، یہاں کا کشادہ بینکوئیٹ ہال ان کے پرستاروں سے بھرا تھا، جگہ نہ ملنے کی وجہ سے اکثر لوگ کھڑے تھے، ان میں نئی نسل کے نوجوانوں سے لے کر تقریباً قسم کے بزرگ غرض سب ہی شامل تھے اور "وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی" والا معاملہ تھا۔

۱۹۸۱ء میں وہ دوبارہ لکھنؤ آئے اس مرتبہ اپریل کا مہینہ تھا جسے موسمِ بہار بھی کہا جاتا ہے، حالانکہ یہاں اس مہینے میں ایسی تیز ہوائیں چلتی ہیں اور اتنی گرمی ہو جاتی ہے کہ بہار کا تصور عجب سا لگتا ہے لیکن بہرحال ان کی آمد سے شہر میں ایک دو دن تو جشنِ بہاراں رہا۔

صبح کو اردو اکیڈمی میں ان کے اعزاز میں ایک

مخصوص ادبی نشست تھی، ابھی سب بیٹھے ہی تھے کہ بجلی چلی گئی، فیض صاحب کے ماتھے پر ذرا شکن نہ آئی، پسینہ کے جھلملاتے قطروں میں وہ اسی طرح مسکراتے رہے، حاضرین جلسہ البتہ اپنی جگہ عرق عرق ہو رہے تھے، اتنے میں ایک عمر رسیدہ کمزور سی خاتون پنکھا لے کر بالکل ان کے قدموں میں جا بیٹھیں اور برابر ان پر پنکھا جھلتی رہیں، یوں تو ہم اردو والے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں لیکن ان خاتون کے بارے میں آج تک پتہ نہ چلا کہ وہ کون تھیں، اس نشست میں فیض صاحب سے کچھ سوالات بھی کیے جا رہے تھے، رام لعل نے کہا "آپ نے لاہور میں ایک جلوس کی قیادت کی جس میں اردو کے بجائے پنجابی زبان استعمال کرنے اور اسے بڑھاوا دینے پر زور تھا"

انھوں نے جواب دیا "ہاں میں اس جلوس میں شریک تھا، لیکن وہاں بات صرف پنجابی کے فروغ کی تھی، اردو کی مخالفت اور حق تلفی کا کوئی سوال نہ تھا"

بات لسانیات سے نکل کر عمر اور تجربہ پر آئی، فیض صاحب مسکرا کر بولے "اب ہم ستر سال کے ہونے آئے لیکن خود کو بوڑھا کہنے کو دل نہیں چاہتا اور لفظ بڑھاپا اچھا نہیں لگتا، کوئی جوان سا لفظ اس مفہوم کو ادا کر دیتا تو اچھا تھا"

اسی روز شام کو ہندی اردو ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے ہوٹل کلارکس اودھ میں استقبالیہ کا اہتمام تھا، ان کے شیدائیوں کے ذوق و شوق کا وہی عالم تھا، پروگرام کے اختتام پر میں ان کے پاس گئی، گئی کیا اس مقناطیسی شخصیت کی کشش مجھے کھینچ لے گئی، میں نے کہا "فیض صاحب آپ کے ہاتھ چھونے کو دل چاہتا ہے اس ذہن و ادراک تک تو ہماری رسائی ممکن نہیں جو یہ غیر فانی ادب تخلیق کر رہا ہے لیکن خونِ دل میں ڈوبی ہوئی انگلیاں جو اسے کاغذ پر ڈھالتی ہیں، ان کا لمس محسوس کرنے کو جی چاہتا ہے"
مسکرا کر انھوں نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنی آنکھوں تک لے گئے، اس لمس کی لطافت مجھے آج بھی محسوس ہوتی ہے اور ان کا یہ قطعہ بے اختیار یاد آتا ہے۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈھ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

اور انسانیت کے دل کے داغ اور نشستِ درد کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے انسانیت کا یہ مسیحا ہمارے درمیان سے اٹھ گیا،

گذشتہ کئی دہائیوں پر محیط اردو ادب کا جائزہ لینے سے شعری ادب میں چند گنے چنے نام سامنے آئے ہیں، یوں تو حدیثِ دل اور غمِ دوراں کی ترجمانی کرنے والوں کا ایک طویل سلسلہ ہے لیکن ایسے ادیب و شاعر معدودے چند ہیں جنھوں نے انسانیت کے درد کو محسوس کیا اس کی تڑپ کو جانا اور اس کی سسکیوں کو سنا، غمِ دوراں کے مسائل جن کے لیے غمِ جاناں بن گئے اور اس کی بازگشت ان کے کلام میں اس طرح گونج اٹھی۔

اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

افکارِ جہاں اور غمِ روزگار نے ان جواں سال شاعروں کو جو بانکے عاشق اور سرفروش سپاہی بھی تھے، یادِ محبوب سے بیگانہ کر دیا،

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

ترقی پسند تحریک کے ساتھ اردو شاعری کے افق پر کچھ نام ایک ساتھ ابھرے، میراجی، ن۔م۔راشد، فیض، مجاز، جذبی، سردار جعفری اور مخدوم محی الدین وغیرہ۔ لیکن ان میں سے ایک نام اردو شاعری کی آبرو اور ترقی پسند تحریک کی سب سے معتبر شناخت بن کر سامنے آیا، اور وہ تھا فیض کا نام۔

دستِ صبا اور نقشِ فریادی نے عروسِ سخن کے رخِ زیبا کو ایسی ادا سے سجایا سنوارا کہ اپنے بیگانے سب ہی اس ادا کے دیوانے ہو گئے، فیض کا نام اگر ایک طرف

نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا تو دوسری طرف ان کا کلام بزرگوں کی زیر لب گنگناہٹ میں سنا جانے لگا۔

ترقی پسندی کی جستجو اور رنگ دگر کی تلاش میں فیض نے روایت سے اپنا ناطہ نہیں توڑا، غزل کے مزاج اور اس کی کلاسیکی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے غم دوراں کی حکایات رقم کرنے کے لیے اسی رنگین و دلفریب زبان کو منتخب کیا جو "ساغر و مینا" کے بغیر "مشاہدۂ حق" کی گفتگو رقم کرنے پر تیار نہ تھی، ان کے اسلوب میں اظہار کا یہ پیرایہ، رمز و کنایہ اور اشارہ و استعارہ سے آراستہ اپنے جلو میں کعبہ و صنم خانہ، دیر و حرم، گل و بلبل، وصل و فراق، محبوب طرحدار، عاشق دلفگار، شمع و پروانہ اور جام و مینا لیے نظر آتا ہے۔ میر کی حدیث دلبری، فیض کے یہاں دو آتشہ بن گئی۔ غالب کا دیدۂ بینا فیض نے اپنے ہر قاری کو عطا کرنے کی کوشش کی اور اقبال نے اشتراکیت کا جو پہلا سبق پڑھایا۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہ فیض کا ایمان بنا، اس طرح ان کے فن اور فکر جدید کی بنیادیں پرانی اقدار پر استوار ہوئیں، رہا ترقی پسندی کا معاملہ تو بلاشبہ فیض ہر معنیٰ میں ایک ترقی پسند شاعر تھے ان کی اس تحریک سے وابستگی محض رسمی نہ تھی بلکہ اس کے پس پشت ان کے دل کی لگن خلوص نیت حتیٰ کہ سانس کی آمد و رفت شامل تھی، وہ ترقی پسندی کے نعرے لگانے کے بجائے رومان پرور نغمہ گاتے ہیں، رومان پرور میں نے اس لیے کہا کہ ان نغموں کو سن کر سنگ گراں اور تیشہ و نشتر والی یہ سرخ پوش تحریک کسی محبوب دلربا کی طرح پیاری لگتی ہے۔

فیض کی شخصیت تجربہ کی بھٹی میں تپ کر نکھری تھی، اور اس کی دمک ان کے اسلوب میں اس طرح جاری و ساری ہو کر قاری خود کو تجربات کی ان عمیق گہرائیوں میں شاعر کے ساتھ ساتھ پاتا ہے۔

انھوں نے زندگی کے ان گنت شب و روز پس دیوار زنداں بسر کیے لیکن امید کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

مزاج کی نرمی اور کلام کی شیرینی میں کہیں فرق نہیں آیا، اس تنہائی میں بھی انھوں نے اپنے دل مضطر کو بہلانے کے لیے بڑی حسین پناہ گاہیں تلاش کر لیں۔

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہیں

فیض کبھی بھی ٹوٹتے بکھرتے گرجتے یا ہار مانتے نظر نہیں آتے سخت صبر آزما لمحوں میں ان کا حوصلہ بلند اور عزم جوان رہتا ہے، قید و بند کی صعوبتیں انھیں مضمحل و مغموم نہیں کرتیں، لشکر اعدا کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے وہ اسے بڑی آن بان سے چیلنج کرتے ہیں۔

دربار میں اب تک جو مٹے کب تک جوش صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرق صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

فیض مظلوم و ستم رسیدہ افراد اور اقوام کے کرب سے واقف تھے، انسانیت کے استحصال کا انھیں شدید احساس تھا، ان کی پوری شاعری کا مرکزی خیال انسان دوستی کا پرچار اور ظلم و استبداد کے خلاف اعلان جہاد ہے اور اس اعلان جہاد میں فیض کی شاعری آفاقی حدوں کو چھو لیتی ہے، جہاں رنگ و نسل

کے تمام امتیازات باطل ہو جاتے ہیں اور وطنیت و قومیت کے سب کے سب بت ٹوٹ جاتے ہیں۔ جہاں صرف دکھے ہوئے دلوں کی دھڑکنیں ہی سنائی دیتی ہیں اور یہ دھڑکنیں جب شعر و نغمہ کے پیکر میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں تو ہر قاری انھیں اپنے دل کی دھڑکن سمجھتا ہے اور شاعر کی آواز میں آواز ملا کر عہد کرتا ہے کہ

منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
مےخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

خود ان کے الفاظ میں "حیات انسانی کی اجتماعی جد و جہد کا ادراک اور اس جد و جہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضہ ہی نہیں فن کا تقاضہ بھی ہے" فیض کی پوری زندگی اور ان کا فن اسی جد و جہد سے عبارت ہے'

آخر میں ان کا قلم فلسطینی مجاہدین آزادی کی جد و جہد کا ترجمان بن گیا تھا۔ صحافت سے ان کا رشتہ پرانا تھا اب بیروت سے شائع ہونے والی میگزین لوٹس Lotus کی ادارت ان کو سونپی گئی۔ اور اس ستم رسیدہ قوم کے لیے فیض کو پھر خون دل میں انگلیاں ڈبونا پڑیں، یہاں تک کہ دل صد پارہ کے سوتے خشک ہو گئے اور خون دل میں ڈوبی ہوئی یہ انگلیاں ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئیں۔

فیض نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے، راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ ہوئے، قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں خود کو برسوں جلا وطن رکھا، بیروت میں ہونے والی جنگ کے ہولناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، لیکن اس زندگی میں انھیں جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اپنے شیدائیوں سے جو محبت ملی وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہوگی۔ اور میں تو یہ کہوں گی کہ فیض صاحب کی عظمت دراصل اس خاکساری میں مضمر ہے جہاں فکر و فن کی انتہائی بلندیوں اور عزت و توقیر کی معراج پر پہنچ کر وہ کہتے ہیں۔ "ہمیں شکایت یہ ہے کہ جس قدر لطف و عنایت اور محبت سے اہل وطن نے اور اپنے دوستوں نے جو اپنے وطن میں نہیں ہیں ہمیں نوازا اور سرفراز کیا۔ اس کی وجہ سے ہمیں ندامت ہے کیونکہ ہم اس کے اہل نہیں تھے۔"

کسی شاعر کا یہ کہنا ہی کیا کم ہے جبکہ تمام تر شاعر داد کے طالب اور تعریف سخن فہم کا صلہ مانگتے نظر آتے ہیں۔

بہ حیثیت نثر نگار فیض سے کم لوگ واقف ہیں یا یوں کہیے کہ ان کی صاف و شگفتہ نثر جو ادبی اور عصری دونوں مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، شاعرانہ عظمتوں کی اوٹ میں آ گئی تھی۔

'مہ و سال آشنائی' ان کی نثری تحریر کا ایک طویل عکس ہے اس کتاب کی اہمیت یوں اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس میں ترقی پسند تحریک کا پورا پس منظر اور اس پس منظر میں فیض کے فکر و فن کے ارتقائی سفر کے نقوش نظر آتے ہیں۔

یہ کتاب سوویت یونین سے متعلق فیض صاحب کی یادوں کا مجموعہ اور تاثرات کا عکس ہے، لیکن ان کے فن کار ذہن پرکار قلم اور جذبۂ خلوص و محبت نے جس خوش اسلوبی سے ان یادوں کو سمیٹا ہے اس نے انھیں بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ اور قاری ان کے ساتھ ساتھ ان دلکش یادوں اور حسین مرقعوں کو دیکھ کر حسرت کا وہ شعر پڑھتا ہے جو فیض صاحب نے روس میں اپنے شاعر دوست ناظم حکمت کو سنایا تھا۔

رنگ قبا سے مل گئی خوبیٔ جسم نازنین
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

★

اندر سروپ دت نادان
بی ۳/۳۹ - پچھم وہار
نئی دہلی - ۱۱۰۰۶۳

فسادی

تھا سر پہ سورج
مگر اندھیرا
نہ جانے آکر کہاں سے میرے قریب کوندا
پھر ایک نیزہ
نگاہِ قاتل کی آگ پی کر
ہوا میں اُچھلا

صدائے قاتل کی گھن گرج نے
بھری آبروئے سکوت لوٹی

"تجھے نہ چھوڑوں گا آج زندہ -!"
__" مجھے فسادی سمجھ کے شاید ہوا ہے تیرا مزاج برہم
مگر میں مفسد نہیں ہوں بھائی ......"
مرے کلم سے درد پھوٹا

"تو کون ہو تم ___ ؟"
زبانِ قاتل سے تیر چھوٹا

"میں شہرِ محنت کا بانکپن ہوں
میں رازدۂ محفلِ سخن ہوں
میں گیت گاتا ہوں زندگی کے
بشر کی عظمت کے، روشنی کے
میں شہرِ ذلت کی ہر گلی سے گزر چکا ہوں

میں اس خدا کو بھی جانتا ہوں
جو تیرے نیزے میں جلوہ گر ہے
وہ شخص بھی ہے مری نظر میں
جو تیرے اندر
محبتوں کے چراغ لے کر
نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہے
وہ نیک انساں
جو میرے گیتوں کا دیوتا ہے ...."

ابھی ادھورا تھا گیت میرا
کہ چشمِ قاتل سے اشک ڈھلکے
ہوئے حمائل مرے گلے میں وہ دست و بازو
جو شہرِ ذلت کی آبرو تھے ......

ہزار بل کھا کے رہ گیا وہ مہیب نیزہ
خدائے وحشت نے ڈرتے ڈرتے یہ آدمیت کا جشن دیکھا
عظیم سورج کی روشنی میں ہوا اضافہ !

●●

امیر حسن
ڈائرکٹر پنچایت راج۔ اترپردیش
لکھنؤ

عالمی تہذیب پر

ہندستانی آرٹ اور کلچر کے اثرات

اس برصغیر کی تہذیب کتنی قدیم ہے اس کے بارے میں کچھ ثبوت سے کہنا مشکل ہے مگر اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ تہذیب کم از کم ۵، ۶ ہزار سال پرانی ضرور ہے۔

مختلف اوقات میں مختلف قوموں اور قبیلوں نے اپنی رنگارنگ تہذیب کو پروان چڑھانے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چاہے وادی سندھ کے باشندے ہوں یا منڈا اور کول گروپ کے قبائل یا دراوڑ نسل کے لوگ یا بعد میں آنے والے آریہ اور عرب و عجم کے مسلمان سب نے اس گلستان کی آبیاری کی ہے۔ اس لیے ہر ہندستانی کو خواہ وہ کسی نسل و مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اس مشترکہ میراث پر بجا طور پر فخر ہے۔

جہاں ہندستانی تہذیب وقتاً فوقتاً دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوتی رہی ہے وہاں یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس کا پرتو نہ صرف ان قوموں پر پڑا جنھوں نے ہندستان کو اپنا وطن بنا لیا بلکہ اس کی چھاپ دنیا کے اکثر ممالک اور قوموں پر بھی پڑتی رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں بدھ مذہب، ہندو فلسفہ اور کلچر نے خاص طور پر ایشیائی ممالک پر اپنا گہرا اثر ڈالا۔ اسلامی ممالک اور یورپ بھی ہندو فلسفہ و رہبانیت، نجوم، ریاضی، کیمیا اور آرٹ سے متاثر اور مستفید ہوئے۔ درحقیقت ہندستانی تہذیب کے دوسرے ممالک پر اثرات کے بارے میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ہندستانی آرٹ اور کلچر نے کس حد تک دوسری قوموں اور ملکوں کو متاثر کیا ہے۔

مشرق بعید

گو کہ زمانہ قدیم میں دوسرے ممالک پر ہندستانی چھاپ مہاتما بدھ اور بدھ مذہب کے ذریعہ پڑی۔ مگر جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں پر ہندو کلچر اور آرٹ کا اثر خاص طور سے نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدھ مذہب کے زوال کے بعد ان ممالک میں نہ صرف ہندو مذہب اور رسم رواج کو فروغ حاصل ہوا بلکہ ان پر ہندستان نے اپنا سیاسی تسلط بھی قائم کیا۔ اس طرح یہ ممالک مدتوں نہ صرف ہندستان کی نوآبادیوں کی شکل میں قائم رہے بلکہ ان میں ہندستانی کلچر کی یادگاریں عمارتوں، کلچرل اداروں اور روایتوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔

وسطی ایشیا اور چین

وسطی ایشیا کے صحرائے گوبی کے درمیان میں ایک اور وادی ہے جس کا نام ہے ٹنگ ہوان (TUNG HION) جہاں ہندستانی چھاپ کی سیکڑوں گپھائیں ہندستانی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں جن کی دیواروں پر مہاتما بدھ کی زندگی سے متعلق اور جاتکا دیوتاؤں کی تصویریں ہیں۔ یہ گپھائیں کیا ہیں، ہندستانی فنون لطیفہ کا گویا مخزن ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دور دراز علاقہ میں ہندستانی اثرات اتنے بڑے پیمانے پر کیسے پہنچے؟ دراصل ٹنگ ہوان ہندستان سے چین کو جانے والے تین راستوں کا مرکز تھا جو کہ

چینی سرحد کے قریب واقع تھا۔ یہاں کی خانقاہوں میں ہندستان اور چین دونوں ملکوں سے آنے والے سیاح اور اسکالر قیام کرتے تھے۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ وسطی ایشیا موریہ بادشاہوں کی حکومت میں، خاص طور سے اشوک کے عہد میں ہندستان کے ثقافتی دائرہ میں آیا بعد میں ہن یوگ اور کنشک نے اس دائرہ کو وسیع کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

جہاں تک چین اور ہندستان کے رابطہ کی بات ہے یورپین مورخوں کے مطابق یہ سلسلہ چین میں چن (CHIN) حکومت کے قیام کے بعد ہی تیسری صدی قبل عیسوی میں قائم ہو چکا تھا۔ یہ بات بھی امر مسلمہ ہے کہ بدھ مذہب دوسری صدی قبل عیسوی میں چین میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ بعد میں جنوبی ہندستان اور چین کے ساتھ بحری راستے سے تجارتی اور سفارتی تعلقات قائم ہوئے جنھیں چولا راجاؤں کے زمانے میں خاص طور سے فروغ حاصل ہوا۔

اگرچہ چین کے لئے ہندستان کی سب سے بڑی دین بدھ مذہب ہے۔ یہ سوچنا صحیح نہ ہوگا کہ ہندستانی کلچر کے دوسرے عناصر چینیوں پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ خود بدھ مذہب نے دھیرے دھیرے چینی زندگی کے غیر مذہبی شعبوں کو متاثر کیا۔ بعد میں ہندو فنون لطیفہ بھی چینی فن کاروں تک پہنچے۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ جہاں ہم چینی سیاحوں جیسے فاہیان (۴۱۱-۳۹۹ عیسوی) اور ہوانگ سانگ (HUENTSANG) (۶۴۵-۶۲۵ عیسوی) وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں وہیں ہم میں سے اکثر اس بات کی واقفیت نہیں رکھتے کہ زمانہ قدیم میں بہت سے ہندستانی اسکالروں نے چین جاکر اہم ادبی اور تہذیبی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے نہ صرف مذہبی بلکہ سنسکرت زبان کی دوسرے فنون کی کتابوں کا ترجمہ کرکے چینی عوام و خواص کو مستفید کیا۔ ان میں کشپ مٹنگا (پہلی صدی عیسوی)، کماراجیو (چوتھی صدی عیسوی)، دھرم کشا (پانچویں صدی عیسوی)، پرمارتھ (چھٹی صدی عیسوی) اور بودھی دھرم (چھٹی صدی عیسوی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چین کے فن سنگ تراشی، مجسمہ سازی، نقاشی اور مصوری پر ہندستان نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں تعمیر شدہ ین کانگ (YUN KANG) گپھاؤں پر نہ صرف بدھ اثرات بلکہ ہندو چھاپ بھی نمایاں ہے۔ کچھ گپھاؤں میں ہندو دیوتا مثلاً وشنو اور شیو کی مورتیاں بھی پائی گئی ہیں۔ دیواروں پر بنائی گئی تصویروں کے ذریعہ جن کہانیوں اور خیالات کی عکاسی کی گئی ہے ان کا منبع ہندستان ہی ہے۔

عالموں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کا چینی فن سنگ تراشی عہد گپتا کی سنگ تراشی سے متاثر تھا جیسا کہ سیانگ تان شان (HSIANG TAN SHAN) کی عبادت گاہوں اور گپھاؤں سے بخوبی ظاہر ہے۔ جنوبی مشرقی چین میں جہاں تانترک اثر زیادہ پڑا وہاں ہندو اور بدھ مورتیوں کے ساتھ ساتھ تانترک دیوتاؤں کی مورتیاں بھی تراشی گئیں۔

چین کے فن تعمیر پر ہندستانی اثر نمایاں نہیں ہے۔ ہندستان کا روایتی اسٹوپا چین میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ مگر پندرھویں صدی عیسوی میں تعمیر شدہ پیکنگ کے نواحی علاقے کے مندروں پر ہندستانی فن تعمیر کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے جو گیا کے مندروں کی مرہون منت ہے۔

نیپال اور تبت

نیپال تو کسی حد تک ہندستانی مذہبی اور تہذیبی ملکیت کا ایک حصہ ہے، مگر تبت پر بھی ہندستانی چھاپ کچھ کم نہیں ہے تبتی لوگ نہ صرف بدھ مذہب کے پیرو ہوئے بلکہ انھوں نے ہندستان کے غیر مذہبی کلچر اور روایتوں کو بھی اختیار کیا۔ تبت میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ دیوناگری رسم الخط ۷ویں صدی عیسوی میں اختیار کیا گیا۔ اور گرامر بھی ہندستان کے وزن پر تیار کی گئی ۸ویں صدی میں تبت کے طلبا کو ہندستان کے دارالعلوم جیسے نالندہ، وکرم شلا اور اودنت پوری میں تحصیل علم کے لیے بھیجنے کی پالیسی اختیار کی گئی اسی زمانہ میں ہندستانی یوگا اور ہتھ یوگا

بھی تبت میں مقبول ہوئے۔ بعد میں تانترک خیالات اور ان سے متعلق فن سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کو بھی فروغ حاصل ہوا اس طرح تبت ہندستانی تہذیب کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

اسلام اور مسلمان

گو کہ مسلمان ہندستان میں بحیثیت فاتح وحاکم داخل ہوئے تھے، پھر بھی وہ اپنے کو ہندو اثرات سے الگ نہ رکھ سکے۔ یہی نہیں ان کے ذریعہ مغربی ایشیا کے اسلامی ممالک پر بھی ہندو تہذیب کا اثر پڑا۔ مسلمانوں نے ہندستان سے نہ صرف علم نجوم، کیمیا، ریاضی وغیرہ حاصل کیے بلکہ انھیں کی بدولت یہ علوم بعد میں یورپ پہنچے دارا شکوہ نے اپنشد اور بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ مسعودی (۱۰ویں صدی عیسوی) نے اسلامی ادب پر ہندستانی اثرات کو تسلیم کیا ہے۔ داستان الف لیلیٰ کی کئی کہانیاں ہندو لوک کہانیوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

اسلامی تصوف اور خانقاہوں پر ہندو اثر صاف ظاہر ہے اسلامی تصوف، ویدانت فلسفہ سے متاثر ہے۔ یہ ہندستان ہی کا اثر ہے کہ بہت سے صوفی حضرات گیروے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ اسی طرح ان میں سماع اور موسیقی کا جو چلن ہے وہ بھی ہندستان کی دین ہے۔

بہت سے ہندستانی کھیل جو مسلمانوں نے اپنائے ان میں شطرنج بھی شامل ہے جس کو سنسکرت میں 'چتورنگا' نام دیا گیا ہے۔

یورپ

یورپ اور ہندستان کے رشتے کی کہانی حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی پرانی ہے۔ کہتے ہیں جب دارا نے یونان پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ ایک ہندستانی دستہ بھی تھا۔ سکندر اعظم کے ہندستان پر حملہ کے بعد ہندستان اور یونان کے درمیان سیدھا رابطہ قائم ہوگیا تھا۔ کنشک کے زمانے میں یونان سے تہذیبی رشتے اور مضبوط ہوئے، اس کا ثبوت گندھاری آرٹ ہے جس میں ہندستانی اور یونانی دونوں فنون کی آمیزش ملتی ہے۔

اگرچہ پہلی صلیبی جنگ سے پندرھویں صدی کے اختتام تک ہندستان اور یورپ کے درمیان سیدھا رشتہ منقطع ہوگیا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے ذریعہ ہندستانی تہذیب کے عناصر یورپ تک پہنچتے رہے۔ بعد میں واس کوڈی گاما کے بحری راستے سے کالی کٹ پہنچنے پر جو تجارتی رشتہ یورپ اور ہندستان کے درمیان قائم ہوا وہ دھیرے دھیرے حاکم ومحکوم کے رشتے میں تبدیل ہوگیا۔

یورپ پر ہندستان کے تہذیبی اثر کو کسی حد تک ضمنی (MARGINAL) کہا جا سکتا ہے۔ پرتگالیوں نے عموماً اپنے کو ہندستانی اثرات سے محفوظ رکھا۔ مگر فرانچ اور ڈچ لوگوں نے فراخ دلی سے ہندستانی تہذیب کو سمجھنے کی کوشش کی۔

برنیر اور ٹیورنیر نے ہندستان کے بارے میں جو تاثرات چھوڑے وہ فرانسیسی دل ودماغ پر کافی اثر انداز ہوئے۔ دوسرے فرانسیسی اسکالروں نے بدھ اور ہندو مذاہب کی کتابوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ مگر جس انجمن نے ہندستانی تہذیب کے متعلق انگریزوں اور دوسرے یورپی لوگوں میں گہری دلچسپی پیدا کی وہ ۱۷۸۴ء میں انگریزوں کے ذریعہ قائم کی ہوئی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال تھی۔ یورپ اور جرمنی میں سنسکرت کی ترویج ایک عجیب واقعہ کی مرہون منت ہے۔ نپولین کی لڑائیوں کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم الگزینڈر ہیملٹن پیرس میں نظر بند ہوگیا تھا اس نے وقت گزاری کے لیے ساتھی قیدیوں کو سنسکرت کی تعلیم دینا شروع کی۔ انھیں قیدیوں میں جرمن شاعر اور فلسفی کیگل (SCHEGEL) بھی تھا، اس نے ۱۸۰۸ء میں ہندستان کی زبان و علوم پر ایک اہم کتاب شائع کی۔ اس کے بعد شوپن ہار اور فان ہارٹ مان کے ذریعہ سنسکرت نے جرمن ادب پر اثر انداز ہونا شروع کیا۔ گوئٹے پر ہندستانی فلسفہ کا اتنا اثر تھا کہ وہ فراد فان اسٹائن کے ساتھ اپنے روحانی رشتہ کو اس طرح درست بتاتا تھا کہ وہ دونوں اپنے پچھلے جنم میں زن وشوہر تھے۔!

(باقی صفحہ [illegible] پر)

غزلیں

منصور سبزواری
نوح۔ ضلع گوڑگاؤں
(ہریانہ)

گرتے پتھر کی سی گنجار کہاں سے آئی
ہم نہ ٹوٹے تو یہ جھنکار کہاں سے آئی

جانے کیا سوچ کے رک رک گئے دو بڑھتے قدم
دل کے رستے میں یہ دیوار کہاں سے آئی

صفِ دشمن کی طرف میں تو بڑھا تھا یارو
پشت کو کاٹتی تلوار کہاں سے آئی

لے گیا چھین کے جھونکا کسی بوڑھی رُت کا
ہم میں اب نرمیِ گلزار کہاں سے آئی

اس کے ملبوسِ پُر اسرار کا کرتے ہوئے ذکر
دفعتاً سوچ گئے مہکار کہاں سے آئی

زینہ زینہ اک اداسی سا اترتا ہوا رنگ
زندگی ہو کے یہ بیمار کہاں سے آئی

وہ کوئی اور ہی ہوگا ترا فردوسِ نظر
میرے گھر گرمیِ بازار کہاں سے آئی

●●

رباب رشیدی

اتنی طویل رات بسر کیسے ہو گئی
ہم خواب میں نہ تھے تو سحر کیسے ہو گئی

ہونٹوں پہ ہم تو لے کے چلے تھے متاعِ شوق
یہ چشمِ تر شریکِ سفر کیسے ہو گئی

دل ہی میں تھی ہمارے ابھی روشنی کی بات
تاریکیوں کو اس کی خبر کیسے ہو گئی

روشن تھے جو چراغ وہ کس نے بجھا دیے
اک بزم تھی غبارِ نظر کیسے ہو گئی

اک آرزو کے گرد ہی ہم گھومنے لگے
وہ موج تھی اگر تو بھنور کیسے ہو گئی

کھلتے ہوئے گلاب سے چہروں کو کیا ہوا
شبنم اثر نگاہ شرر کیسے ہو گئی

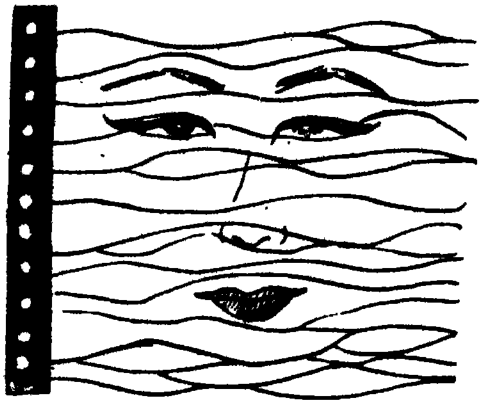
وہ خوش خیال لوگ کہاں جا کے سو گئے
افسردگی مزاجِ بشر کیسے ہو گئی

یہ تیری بے نیاز طبیعت کو کیا ہوا
میری خودی بھی دست نگر کیسے ہو گئی

خونِ جگر تو آبروئے فن ہے آج بھی
ارزاں متاعِ عرضِ ہنر کیسے ہو گئی

●●

ارجمند بانو افشاں
ریسرچ اسکالر۔
سیفیہ کالج۔ بھوپال



آنکھیں ترستیاں ہیں

قومی یکجہتی کے لیے مشعل راہ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تحریر کردہ کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" ایسی بائیس شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے جو دنیائے ادب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ مصنف سے ان کا تعلق ایسا تھا کہ :

"ان سب نے میری زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور کیا ہے۔"[1]

ان محترم شخصیتوں کے نام کچھ اس طرح ہیں: تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولوی عبدالحق، شیخ سر عبدالقادر، سروجنی نائیڈو، عبدالقادر سروری، مہندر ناتھ، سلیمان اریب، عرش ملسیانی، محمد بن تاثیر، درگا پرساد دھر۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) کرشن چندر، نثار اختر، نریش کمار شاد، حسرت موہانی، پریم ناتھ در، رشید احمد صدیقی اور ترلوک چند محروم۔

آزاد کا قلم آج سے تقریباً سینتیس سال قبل کی لافانی محبت کی داستانیں سناتا ہے۔ اور ہمیں ماضی کی اس پرکیف فضا میں لے جاتا ہے جہاں محبت و اخوت کے پھول کھلتے ہیں۔ جن کی مسحور کن خوشبو ہواؤں میں تحلیل ہوتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ وہاں سے لوٹ کر نہ آئے۔

ان کی تحریر کی سادگی، بے ساختگی، سچائی اور دیانتداری ایسی فضا پیدا کرتی ہے جو آج کے اس دور میں جب کہ ہم قومی اتحاد کے لیے مسلسل کوشاں ہیں مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس میں بیان کردہ تمام واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس وقت کے واقعات بھی بیان کیے ہیں جب تقسیم ہند کے سبب چارسُو نفرت کا ماحول تھا اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ بھلے سے بھلا آدمی بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسی فضا میں ایک پنجابی ہندو (جگن ناتھ آزاد) کا اپنے مسلمان دوستوں کو اس قدر قابل اعتبار سمجھنا کہ بلوائیوں کی دست درازیوں سے بچنے کے لیے ان کے گھروں میں قیام کرے قابل حیرت بھی ہے اور باعث مسرت بھی۔

اوّل تو وطن سے محبت اور دوستوں اور بزرگوں کی شفقت آزاد کو لاہور چھوڑنے سے بعض رکھتی تھیں۔ لیکن جب تمام پڑوسی مکان خالی کر گئے اور آزاد کو تنہائی نے ستانا شروع کیا تو وہ مہاجرین کے کیمپ میں پہنچے یہاں سے بس سے امرت سر کے لیے روانہ ہوئے۔ راہ میں صلاح الدین احمد ملاقات کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے وہ باہمی محبت کے جذبات کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ دل پر رقت طاری ہونے لگتی ہے :

"مولانا اپنے ایک دوست کے ہمراہ سڑک

کے کنارے نقش بہ دیوار بنے ہوئے کھڑے ہیں اور
لاہور سے جانے والے مہاجرین سے بھرے ٹرکوں
اور لبوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔
اچانک اُنکی نظر مجھ پر پڑی لپک کر نزدیک آگئے۔
مجھ سے انھوں نے کچھ کہنا چاہا اُنکا گلا رندھ گیا اور
آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ہے"۔

امرت سر آنے کے بعد آزاد لاہور کی یاد دل سے نہ بھلا سکے چند روز بعد پھر لاہور کے کیمپ میں لوٹ آئے۔ یہاں سے نازش رضوی کو فون پر اپنی حالت سے مطلع کیا۔ نازش انھیں اپنے گھر لے گئے۔ چند روز عبدالشکور کے یہاں بھی قیام کیا اس دوران یہ بات موضوعِ بحث رہی کہ آزاد کو یہیں ٹھہرنا چاہئے یا ہندوستان لوٹ جانا چاہیئے۔ ایک جگہ آزاد رقمطراز ہیں:

"ہم تینوں میں اس موضوع پر بات ہو رہی تھی۔
شیخ عبدالشکور نے کہا کہ آزاد تم یہیں رہو۔
کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا ہم اپنی جان
تم پر نثار کر دینگے"

ایسے جملے پڑھ کر یا سن کر کون ہے جس کی آنکھیں نہ چھلک اٹھیں۔

جہاں ایک طرف آزاد اپنے مسلمان دوستوں اور بزرگوں پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے وہاں ان کے یہ جاں نثار دوست ان کے اس اعتماد کی قدر کرتے اور ہمہ وقت ہر طرح ان کا ساتھ دینے پر تیار رہتے تھے۔ لاہور سے واپسی کے وقت مولانا صلاح الدین احمد کا رقم عنایت کرنا خود آزاد کی تحریر میں ملاحظہ کریں:

"مولانا بولے اگر یہ بات ہے تو تکلف کیسا اس
وقت گھر میں پانچ سو پینتیس روپے موجود ہیں
پانچ سو تم لے لو پینتیس ہم رکھ لیتے ہیں تم اس
روپے سے اپنا کام چلاؤ اور اگر ممکن ہو تو دہلی
پہنچ کر ہمارے بچوں کو یہ روپے دے دینا وہ
اس وقت ہمایوں کے مقبرے والے رفیوجی کیمپ
میں ہیں"۔

اسی طرح مولانا صلاح الدین احمد کے مکان پر ہندوں نے حملہ کیا تو بقول آزاد:

"وہ بہ مشکل اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان
بچا سکنے میں کامیاب ہوئے اس کے باوجود بھی
مولانا کی زبان پر کبھی ہندوں کا گلہ نہ آیا وہ
جانتے تھے کہ یہ فعل چند غنڈوں کا ہے قوم کی
قوم ایسی نہیں۔ شرفاء تو خود اپنی جان بچانے
کی فکر میں ہیں"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی مودبانہ اور عقیدت سے بھرپور تحریر ملاحظہ کریں:

"میرے آداب عرض کے جواب میں قریب رکھی
ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی اس
خواہش کو دل میں دبائے ہوئے کہ مولانا کے
حضور مجھے انکے قدموں میں فرش پر بیٹھنا چاہیئے
کرسی پر بیٹھ گیا"۔

اسی طرح آزاد اور ان کے والد تلوک چند محروم پر مولانا ابوالکلام آزاد کی عنایت کا ذکر بھی آزاد نے بڑے کھلے دل سے کیا ہے۔ اردو زبان اور اس کے ادبا و شعراء سے متعلق عقیدتمندانہ طرز تحریر ساری کتاب میں جا بجا ملتا ہے۔ یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد جو پہلا ترانۂ پاکستان ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا اس کے خالق بھی آزاد کے مطابق وہ خود تھے۔

آزاد کا قلم قومی اتحاد کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ عرش ملسیانی پر تحریر کردہ مضمون میں لائل پور کے مشاعرے کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

"مشاعرے سے قبل نثر کے سیشن میں ایک صاحب
نے ایک افسانہ پڑھا جس سے کچھ فرقہ واریت
کی بُو آتی تھی۔ اس روش کو وہاں ہر شاعر

اور ہر ادیب نے ناپسند کیا۔ حفیظ صاحب نے
مشاعرہ شروع ہوتے ہی اس کی طرف اشارہ کیا
اور ان خیالات کی مذمت کی۔ جب عرش کی باری
آئی شعر سنانے کی تو ان کی غزل میں ایک شعر تھا۔

احباب کی یہ شانِ حریفانہ سلامت
دشمن کو بھی یوں زہر اگلتے نہیں دیکھا

اس پر سامعین نے بے تحاشہ داد سے آسمان سر پر اٹھا لیا اللہ اللہ کیا زمانہ تھا کیا رواداری کا دور تھا یہ داد کا طوفان سامعین کی اکثریت کے اپنے ہی ہم مذہب کے ان خیالات کی مذمت میں تھا جو وہ اپنے افسانے میں بیان کر چکے تھے[۵]۔

یہ تمام شواہد اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ہمارا ماضی کتنا درخشاں تھا۔ مخلصانہ روابط کی زنجیر نے کس طرح ایک دوسرے کو جکڑ رکھا تھا۔ کاش محبت کا وہ ماحول پھر پیدا ہو جائے اور انسان انسان سے پیار کرنے لگے۔

حواشی

۱ "آنکھیں ترستیاں ہیں" از جگن ناتھ آزاد ص ۵
۲ " " " " " "
۳ " " " " " " ص ۳۷
۴ " " " " " " ص ۴۳
۵ " " " " " " ص ۱۲۴ تا ۱۲۵

انس مسرور انصاری
محلہ سکراول، ٹانڈہ۔ فیض آباد

میں مسیحا نہیں مگر پھر بھی.....

میں نے دیکھا ہے تجھ کو اکثر یوں
خوبصورت سی تیری آنکھوں میں
سرمئی شام کی اداسی ہے
رخ پہ گردِ ملال کی صورت
اک پریشاں خیال کی صورت
جانے کس نام کی اداسی ہے

کون سا دکھ ہے مضطرب کیوں ہے
کیا کوئی زخم بن گیا ناسور
تو کہ سر تا قدم تھی کیف و سرور
آ کہ ہر غم کو تیرے بانٹ لوں میں
اپنا ہر درد سونپ دے مجھ کو
میں مسیحا نہیں مگر پھر بھی
تیرے ہر زہرِ غم کو پی لوں گا
تجھ کو خوش دیکھ کر میں جی لوں گا

اپنا سرمایۂ نشاط و سرور
میں ترے دل میں سب کے سب رکھ دوں
تیرے زخموں پہ اپنے لب رکھ دوں

●●

محمد اسحاق صدیقی
اے۔ ۵ گوئن تالاب
لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸

پرانے سکّوں کی پُراسرار علامات

ہندستان میں چھٹی صدی قبل مسیح سے دوسری صدی قبل مسیح تک ایک خاص قسم کے سکّے رائج تھے، جن کا ہندستان کے قدیم ادب میں پرانا کے نام سے ذکر آیا ہے۔ غالباً قدامت کی بنا پر ان کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ سکّے عام طور پر چاندی کے ہوا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں تانبے کے بھی بنائے جانے لگے۔ انھیں بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ چاندی یا تانبے کو پیٹ کر ایک لمبی پٹی بنا لی جاتی تھی۔ پھر اس کے مختلف وزن اور مختلف ناپ کے مربع، مستطیل یا گول ٹکڑے کاٹ لیے جاتے تھے۔ ان ٹکڑوں پر ٹھپّوں کے ذریعہ مخصوص علامات ٹھونک کر بنائی جاتی تھیں۔ علامات بنانے کے اس خاص طریقے کے پیشِ نظر پُرانے سکّوں کے ماہرین انھیں (PUNCH MARKED COINS) یعنی ٹھپّے والے سکّے کہتے ہیں۔ ان کا یہ انگریزی نام غالباً سب سے پہلے مشہور محقق جیمس پرنسیپ (JAMES PRINSEP) نے ۱۸۳۵ء میں "جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" میں استعمال کیا تھا۔

یہ سکّے پورے ہندستان میں افغانستان سے لنکا تک رائج تھے ان کے ذخیرے جابجا کھدائی کے دوران ملے ہیں۔ اندازاً اب تک پچاس ہزار سکّے مل چکے ہیں، جو ہندستان، یورپ اور امریکہ کے مشہور عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

ہندستان کے یہ قدیم سکّے بھاری اور موٹے، ہلکے اور پتلے دو قسم کے ہوا کرتے تھے، ان کے وزن مختلف صوبوں میں مختلف ہوا کرتے تھے۔ گھِس جانے کی وجہ سے ان کے صحیح وزن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم ہزاروں سکّوں کے وزن کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ رتّی میں ان کے وزن اس طرح ہوا کرتے تھے :

بھاری ۱۰۰ ۵۰ ۲۵ ۱۲½ ۱۵ ۱۰ ۵ ۲ ۱ ½

ہلکے ۶۴ ۳۲ ۱۶ ۸ ۴ ۲ ۱ ½

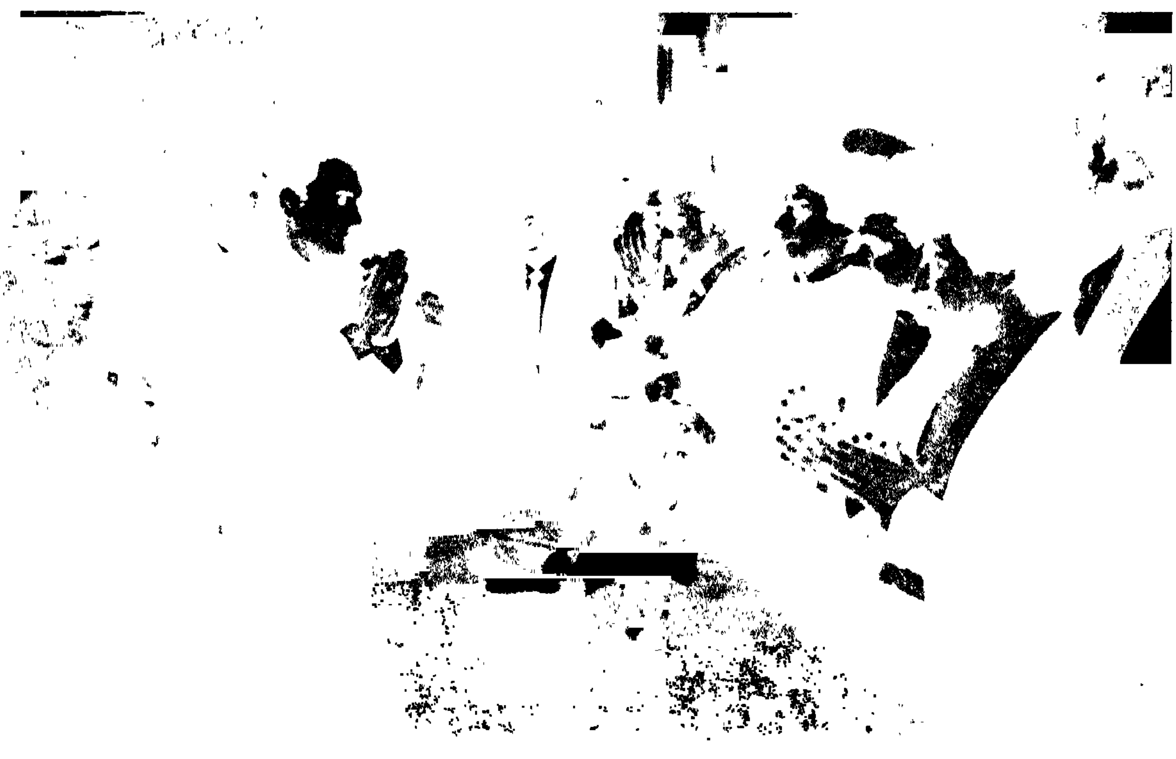
کچھ ایسے سکّے بھی ملے ہیں جن کے ایک یا دو کونے کٹے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں بنا کر تولا گیا تو وزن زیادہ نکلا۔ اس لیے ضرورت کے مطابق کچھ حصہ تراش دیا گیا۔

چھوٹے سکّوں پر صرف ایک علامت پائی جاتی ہے اور بڑے سکّوں پر متعدد، عام طور پر پانچ علامتیں پائی جاتی ہیں۔ بسا اوقات علامات تلے اوپر بنی ہوئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پُرانی علامات پر نئی علامات ٹھونک کر بنائی گئی تھیں۔ یہ خاص بات ہے کہ سامنے کے رُخ پر جو علامتیں پائی جاتی ہیں وہ پشت پر نہیں ہوتیں اور پشت کی علامتیں سامنے کے رُخ پر نہیں پائی جاتیں جو سکّے جتنے زیادہ پُرانے ہیں ان کی علامتیں اتنی ہی گھِسی ہوئی ہیں۔ آخری دور میں یہ سکّے بجائے ٹھپّے کے سانچے میں ڈھال کر بنائے جانے لگے۔ بعض مقامات پر مٹی کے وہ سانچے بھی برآمد ہوئے ہیں جن کی مدد سے یہ سکّے بنائے گئے تھے۔



وزیر اعظم شری راجیو گاندھی اور سوویت کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری شری گورباچوف ۲۲ مئی کو ماسکو میں مختلف ترقیاتی پراجکٹوں کے لیے روس کی جانب سے مالی امداد کی فراہمی اور دونوں ملکوں کے درمیان تکنیکی، سائنسی، تجارتی اور اقتصادی تعاون سے متعلق معاہدوں کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی اور شریمتی سونیا گاندھی ۲۲ مئی کو ماسکو میں ہندستانیوں سے ملاقات کرتے ہوئے۔





وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۲۹ اپریل کو لکھنؤ میں جرنلسٹس پبلیکیشنز کی جانب سے منعقدہ یوم اردو صحافت کے
موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔ —— تصویر : منے بخشی

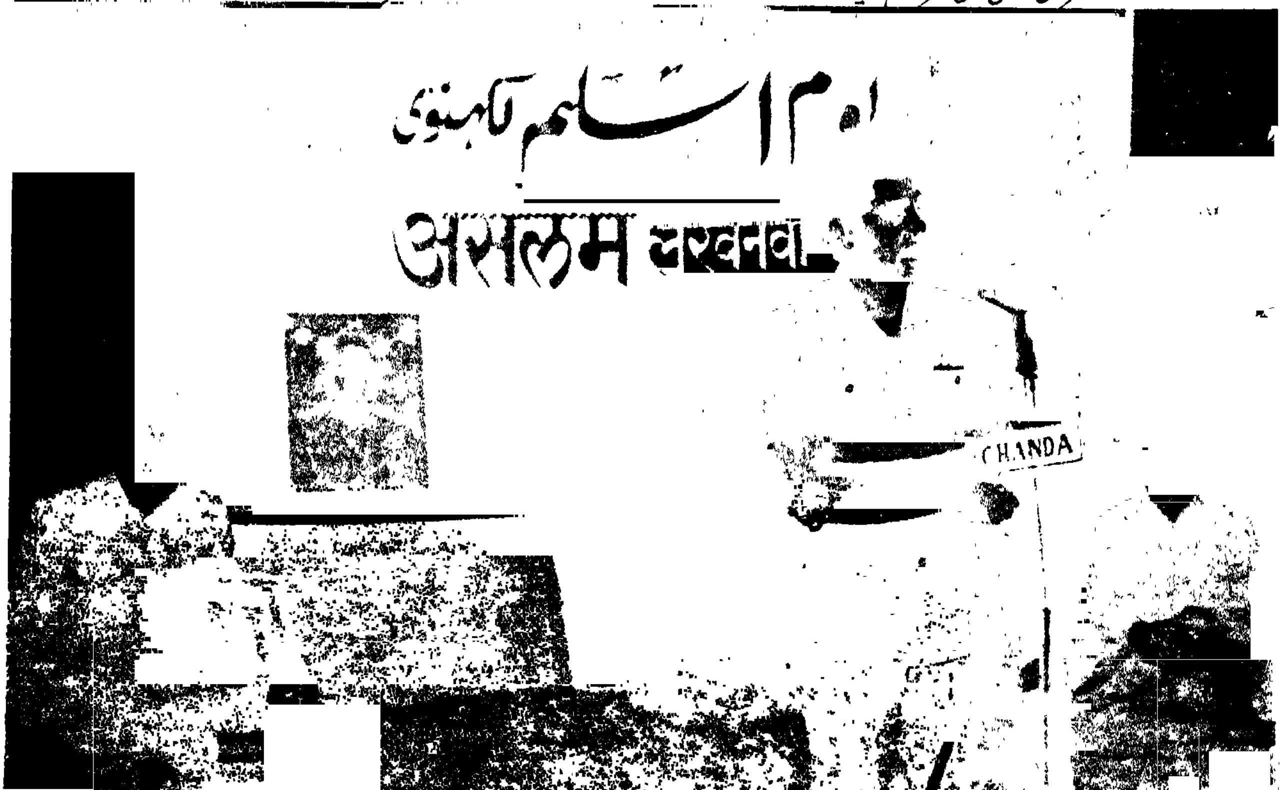
وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری اور وزیر ریاست برائے اطلاعات شری حکم سنگھ ۲۰ مئی کو سوچنا بھون لکھنؤ میں
آل انڈیا اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرس فیڈریشن کے ممبران کے ساتھ۔





وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے گذشتہ دنوں لکھنؤ میں ہاؤسنگ اینڈ ڈیولپمنٹ بورڈ کے صدر دفتر کا اچانک معائنہ کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

وزیر ریاست برائے جنگلات شری ظفر علی نقوی ۲۴ اپریل کو لکھنؤ میں مشہور شاعر اسلم لکھنوی کی برسی کے موقع پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ تصویر میں شری ہاشم رضا عابدی ایم۔ پی اور اتر پردیش کے لوک آیکت شری مرتضیٰ حسین بھی نظر آرہے ہیں۔ —— تصویر : نیر زیدی







شبینہ کلب ردولی کی جانب سے ردولی میں ۲۲ اپریل کو مجاز کی یاد میں منعقدہ مشاعرہ کے مناظر۔

ـــــ تصویر منّے بخشی

بنگلہ دیش کے اردو افسانہ نگار شام بارک پوری کے اعزاز میں ۱۰ اپریل کو لکھنؤ میں منعقدہ نشست کا ایک منظر۔

ـــــ تصویر : نیّر زیدی



ان سکوں پر پائی جانے والی علامات کے پیش نظر تاریخ ہند اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان میں سے بیشتر سکے مندرجہ ذیل حکمرانوں نے جاری کیے تھے :-

حکمراں	زمانہ قبل مسیح
بمبسار	۵۲۵ - ۴۹۳
اجات شترو	۴۹۳ - ۴۶۱
اس کے وارث	۴۶۱ - ۴۱۳
مہاپدم نند	۳۷۵ - ۳۲۱
موریہ خاندان :-	
چندر گپت	۳۲۱ - ۲۹۷
بندوسار	۲۹۷ - ۲۷۲
اشوک	۲۷۲ - ۲۳۲
شنگ خاندان :-	
پشیہ متر	۱۸۷ - ۱۵۱

یہ سکے جن ٹکسالوں میں بنائے گئے تھے وہ مگدھ، کوشل، انگ کاشی، متھرا، ٹکسلا، گاندھارا، اونتی (اُجین) وغیرہ میں واقع تھیں۔

اگرچہ ماہرین نے بڑے وثوق کے ساتھ ان سکوں کی علامات کی بنا پر جاری کرنے والے حکمرانوں اور ٹکسالوں کا تعین کیا ہے لیکن میری فہم میں ان سکوں پر کوئی بھی ایسی علامت نہیں پائی جاتی جس سے سکے کی قیمت یا وزن، جاری کرنے والے راجہ کا نام، سنہ اجراء یا ٹکسال کا پتہ چل سکے، اس لیے یہ بتانا ناممکن ہے کہ ان سکوں کو کب اور کس نے جاری کیا۔ دراصل ان سکوں پر جو علامات پائی جاتی ہیں وہ ہند قدیم کے معلوم حکمراں خاندانوں سے ہزاروں سال پہلے کی ہیں۔ ان کا تعلق دنیا کی قدیم ترین مذہبی روایات اور علم نجوم سے معلوم ہوتا ہے۔ ان علامات کو سکوں پر کیوں بنایا گیا، یہ ایک سربستہ راز ہے۔

علامات کی نئی تشریح

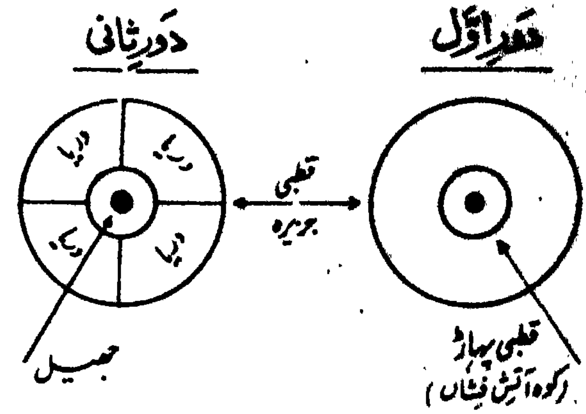
مذاہب عالم کی تاریخ اور ان کے تقابلی مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دنیا کے بیشتر مذاہب ایک ایسے مذہب کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں جس کی ابتدا، عہد قبل تاریخ میں ایک ایسے جزیرے میں ہوئی تھی جو بحر منجمد شمالی (ARCTIC OCEAN) میں اب سے ہزاروں سال پہلے موجود تھا اور بعد میں ڈوب گیا یہ جزیرہ زیر آب آتش فشانی سے پیدا ہوا تھا، یعنی سمندر کی تھاہ میں شگاف پیدا ہوا۔ زمین کے اندر کا لاوا اُبل اُبل کر باہر آیا۔ بار بار کی آتش فشانی سے لاوے کا پھیلاؤ اور بلندی بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ پانی کی سطح سے اونچا ہو کر ایک جزیرہ بن گیا۔

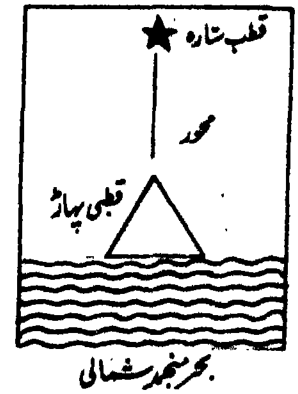
جب یہ جزیرہ ٹھنڈا ہو کر رفتہ رفتہ نباتات سے ڈھک گیا تو بحر منجمد شمالی کے کنارے آباد قبائل اس میں جا بسے۔ غالباً اس زمانے میں قطب شمالی کی آب و ہوا معتدل تھی اور برف کا نام و نشان نہ تھا۔ جب برفانی دور آیا تو ان قبائل نے وہاں سے ہجرت کی (ہو سکتا ہے کہ ہجرت کا سبب جزیرے کے وسط میں موجود جوالا مکھی پہاڑ کی آتش فشانی ہو) وہ اور ان کی اولادیں رفتہ رفتہ کرہ ارض کے مختلف حصوں میں جا بسیں۔ قطب شمالی کے یہی مہاجر دراصل مذہب کے بانی تھے۔

مذاہب عالم کے جغرافیے کے تقابلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے قطبی جزیرے کے وسط میں ایک آتش فشاں پہاڑ موجود تھا جس سے اکثر دھواں نکلا کرتا تھا۔ یہ دھواں اکثر پھیل کر ایک درخت کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس "دخانی درخت" کو بانیانِ مذہب نے کبھی شجرِ حیات کہا اور کبھی شجرِ عقل۔ ان کا کتاب پیدائش (بائبل) میں ذکر ہے۔

جب قطبی پہاڑ ٹھنڈا پڑ گیا تو اس کی چوٹی پر واقع دہانے میں پانی کے جمع ہونے سے ایک جھیل بن گئی۔ اس جھیل کا پانی نیچے بہہ کر آتا اور چار اطراف میں پھیل کر چار دریاؤں کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ میں نے یہ معلومات ہندوؤں کے مذہبی جغرافیے، خصوصاً وشنو پران سے حاصل کی ہیں۔

ان معلومات کی بنیاد پر قطبی جزیرے کا نقشہ اس طرح بنتا ہے:





ہندوؤں کے مذہبی جغرافیے میں قطبی جزیرے کو جمبو دویپ کہا گیا ہے، اس کے بیچ میں جو کوہِ آتش فشاں تھا اس کا نام میرو یا سُمیرو تھا۔ اس کی چوٹی پر جو جھیل تھی اسے مانسرور کہتے تھے۔ قطب شمالی سے ہجرت کے بعد مذہب کے بانیوں نے قطبی جزیرے کے جغرافیے کو ان ملکوں کے جغرافیے پر منطبق کرنے کی کوشش کی جہاں جا کر وہ آباد ہوئے۔ اس طرح ہندوؤں میں ہمالیہ یا کیلاش پربت نے میرو کی جگہ لے لی اور مانسرور ہمالیہ کی ایک جھیل کا نام رکھ دیا گیا۔ چونکہ میرو پہاڑ جمبو دویپ کے بیچ میں تھا، لہٰذا ہمالیہ کے پیش نظر جمبو دویپ ایشیا کا نام پڑ گیا اور اصلی جمبو دویپ یعنی قطبی جزیرے کو لوگوں نے بھلا دیا۔

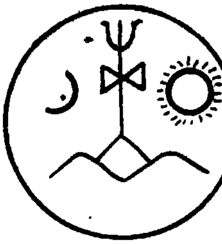
قطبی پہاڑ کو دیوتاؤں کا مسکن مانا جاتا تھا۔ اسے خداوند کا پہاڑ بھی کہتے تھے، جس کا بائبل میں ذکر ہے۔ قطب ستارا ٹھیک اس کی چوٹی پر چمکتا تھا۔ چونکہ چاند ستارے (رات میں) اور سورج (دن میں) اس کا طواف کرتے معلوم ہوتے تھے لہٰذا قطب ستارے کو معبودِ اکبر یا خدا مان لیا گیا۔ دراصل خدا کی وحدانیت کا تصور قطب ستارے سے پیدا ہوا۔

قطب ستارا اس مجموعۂ نجوم میں شامل ہے، جسے دُبِ اصغر (چھوٹا بھالو) کہتے ہیں۔ اس کے برابر دُبِ اکبر (بڑا بھالو) ہے، جسے ہندو سپت رشی (سات رشی) کہتے ہیں چونکہ یہ دونوں مجموعے سات سات ستاروں پر مشتمل ہیں، اس لیے سات کو ایک مقدس عدد مان لیا گیا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ انھیں ریچھ یا بھالو کی شکل اس لیے دی گئی کہ سفید بھالو (POLAR BEAR) دائرہ قطب شمالی کا خاص جانور ہے۔

میرو پربت

میرو کے بارے میں ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قطب شمالی پر واقع ہے۔ چاند، سورج اور ستارے اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب شمالی پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ جب دن ہوتا ہے تو زمین کی محوری گردش کی وجہ سے سورج آسمان کے مرکز کے چکر لگاتا ہوا نظر آتا ہے (جب وہاں قطبی پہاڑ موجود رہا ہوگا تو وہ اس کے چکر کاٹتے ہوئے نظر آتا ہوگا) اور جب رات ہوتی ہے تو ستارے آسمان کے مرکز یعنی قطب ستارے کے چکر لگاتے ہیں (چونکہ قطب ستارہ ٹھیک زمین کے محور کی سیدھ میں یا اس کے سرے پر واقع ہے اس لئے ایک ہی جگہ قائم نظر آتا ہے) چاندنی رات میں چاند بھی قطب ستارے کے چکر لگاتا ہے۔ اجرام سماوی کے یہ چکر ایک دن یا چوبیس گھنٹے میں پورے ہوتے ہیں کیونکہ زمین کو اپنے محور پر گھومنے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے اسی لیے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ دیوتاؤں کا ایک دن انسانوں کے ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ دیوتا میرو پربت یعنی قطب شمالی پر رہتے ہیں اور وہاں سال میں صرف ایک دن (چھ مہینے کا) اور ایک رات (چھ مہینے کی) ہوتی ہے اس سے پہلے کہ میں ہند قدیم کے سکّوں (پُرانا) کی

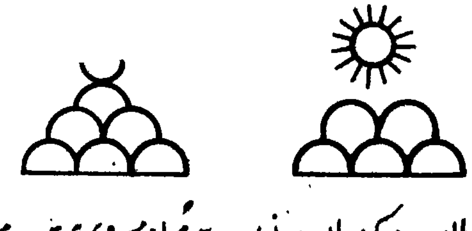
علامات کا جائزہ لیں۔ نیپال کے مروجہ سکّوں کی مندرجہ ذیل علامات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ (میں نے یہ علامات پانچ کے سکّے سے نقل کی ہیں)۔



یہاں کیلاش یا میرو پربت کے دائیں طرف سورج اور بائیں طرف چاند کو دکھایا گیا ہے (جو میرو پربت کا چکر لگاتے ہیں) پہاڑ کی مرکزی چوٹی پر قائم شیوجی کے ترشول سے مراد زمین کا محور ہے اس کے اوپری حصے میں شیوجی کے ڈمرو کو بنایا گیا ہے۔ ڈمرو کی آواز میرو پربت کی گھڑگھڑاہٹ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (یہ بتایا جا چکا ہے کہ میرو ایک کوہِ آتش فشاں تھا اس لیے اس کے آتشیں مادے میں ابال اور اندر کی گیسوں کے باہر آنے سے گاہے بگاہے آواز پیدا ہوتی ہوگی) اب پرانے سکّوں پر پائی جانے والی ان علامات پر غور کیجیے:



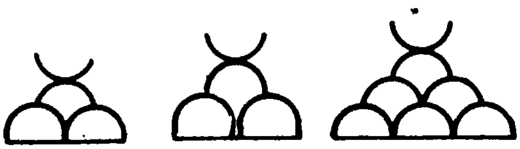
ابتدا میں محقق ان علامات کو استوپ یا چیتیہ (بدھ خانقاہ یا مٹھ) سمجھتے تھے۔ پھر بعض عالموں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان سے مراد میرو پہاڑ ہے اور اب یہی رائے مسلّم ہے، اس کی تصدیق ان علامات سے ہوتی ہے:



ظاہر ہے کہ یہاں دونوں سے مراد میرو پربت ہے۔ ایک کا تعلق دن سے ہے (جب سورج اس کے چکر لگاتا ہے) اور دوسرے کا رات سے (جب چاند اس کے چکر لگاتا ہے)۔

سوم گری

پرانے سکّوں پر پائی جانے والی مندرجہ ذیل علامات سے (جو دراصل ایک ہی علامت کی مختلف صورتیں ہیں) ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سکّے چندر گپت موریہ نے جاری کیے تھے مجھے اس خیال کی صحت میں شبہ ہے۔



والمیکی رامائن میں اس موقع پر جب بندروں کی فوجیں چاروں سمتوں میں سیتاجی کی تلاش میں روانہ ہوتی ہیں، اس زمانے کی معلوم دُنیا کا جغرافیہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ شمال میں دنیا کے سرے پر اُتر سُمدر (بحر شمالی) میں ایک پہاڑ ہے سوم گری (چاند کا پہاڑ) جہاں وشنو بھگوان کا نواس ہے۔ میرے خیال میں سوم گری اور میرو پربت ایک ہی پہاڑ (یعنی قطبی پہاڑ) کے دو نام ہیں، اس لیے مندرجہ بالا علامات کو سوم گری کہنا مناسب ہوگا۔

یہ عجیب بات ہے کہ تنزانیہ (افریقہ) میں ایک پہاڑ کا نام میرو (MERU) ہے۔ قدیم جغرافیہ نویسوں نے افریقہ میں دریائے نیل کے منبع پر ایک پہاڑ کا ہونا بیان کیا ہے جسے عرب جغرافیہ داں "جبل القمر" اور انگریز سیاح (MOUNTAIN OF THE MOON) کہتے تھے۔ پرانے سکّوں کی مندرجہ بالا علامات کے لیے یہ نام نہایت موزوں ہیں۔

بعض عالموں کی رائے ہے کہ مشہور کوہ سینا (MOUNT SINAI) کا تعلق بابلی قوم کے چاند کے دیوتا سے تھا جسے وہ سین (SIN) کہتے تھے۔ یہی سین پہاڑ کے نام سینائی کا جزو اوّل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصلی میرو یا سوم گری قطب شمالی پر تھا

اور وہاں کے مہاجرین نے نوآباد ملکوں میں مقامی پہاڑوں کے نام اس کے نام پر اپنے آبائی وطن کی یاد قائم رکھنے کے لیے رکھے تھے۔

بیل اور کلہاڑی

پُرانے سکوں پر اِن دُو علامات کا استعمال بہت عام ہے،



ان میں سے دائیں طرف والی علامت کو بُرجِ ثور کی مروجہ علامت سے مشابہت کی بنا پر برُجِ ثور کے انگریزی نام ٹارس (TAURUS) کی رعایت سے ٹورائن (TAURINE) کہا جاتا ہے۔ یہ بیل کے سر کی مختصر تصویر ہے۔



بائیں طرف والی علامت کو عام طور پر ڈمرو مانا جاتا ہے جو شیوجی سے منسوب ہے اور ان کے ہاتھ میں دکھایا جاتا ہے لیکن یہ دوہرے تبر (DOUBLE AXE) کی مختصر شکل بھی ہو سکتی ہے۔

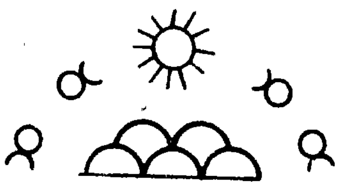


قدیم مصر میں کلہاڑی ⚐ دیوتا کی علامت تھی اور کریٹ میں دوہرا تبر ⋈ دیوی کی۔ دونوں جگہ اس سے قوت (شکتی) کا تصور وابستہ تھا۔ کریٹ اور اس کی تہذیب سے متاثر ممالک (ایشیائے کوچک، یونان، قبرص وغیرہ) میں پتھر اور دھات کے بنے چھوٹے چھوٹے تبر ملے ہیں جنھیں مندروں میں منّت ماننے والوں نے چڑھاوے کے طور پر نذر کیا تھا۔ ایسی تصویریں اور مجسمے بھی ملے ہیں جن میں بیل کے سر پر دُو سینگوں کے درمیان تبر کو کھڑے دکھایا گیا ہے۔ ۵۲

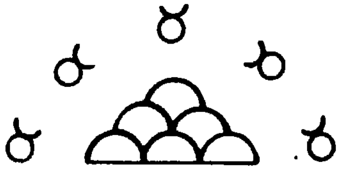




ان شواہد کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتدا میں پُرانے سکوں کی یہ علامات ♉ ⋈ بیل کے سر اور دوہرے تبر کو ظاہر کرتی تھیں۔ بعد میں ان کا مفہوم بدل گیا، جو واضح نہیں ہے بہر حال ان سے تقدس یا قوت کا تصور وابستہ تھا۔ اس سلسلے میں ہند قدیم کے سکوں کی ان علامات پر غور کیجیے:-

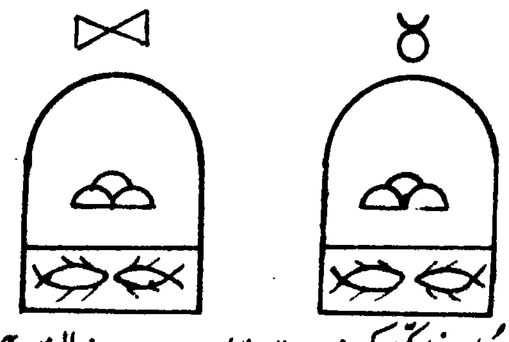


یہاں میرو پربت کے گرد جو آرائشی علامت بار بار بنائی



گئی ہے اس سے غالباً پہاڑ کے تقدس کا اظہار مقصود رہے۔

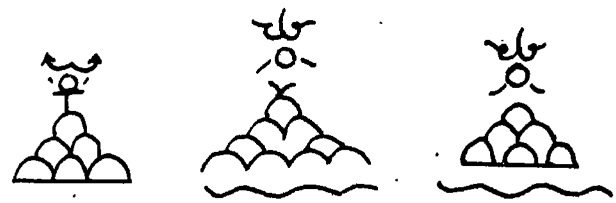
جمبودویپ



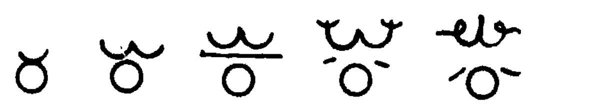
پُرانے سکوں کی مندرجہ بالا علامات سے میرے خیال میں جمبودویپ

(قطبی جزیرہ) مراد ہے۔ یہاں گنبدِ فلک کے نیچے میرو پربت کو دکھایا ہے جو جمبودویپ کے وسط میں واقع تھا۔ میرو کے نیچے بحر (منجمد) شمالی ہے۔ سمندر کو ظاہر کرنے کے بجائے پانی کی لہروں کے دو مچھلیاں بنائی ہیں۔ آسمان کے اوپر دونوں علامتوں کا مفہوم غالباً ایک ہی ہے (گویا ایک کو دوسرے سے بدلا جا سکتا ہے) یہاں ان سے قطب ستارا مراد ہو سکتا ہے جو میرو کی چوٹی پر چمکتا تھا۔

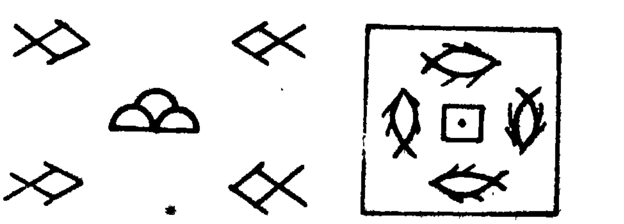
اس سلسلے میں قطبی جزیرے کی یہ علامات بھی قابلِ غور ہیں جو ہندِ قدیم کے بعض سکوں پر پائی جاتی ہیں لیکن ٹھپے والے سکوں پر نظر نہیں آتیں۔



یہاں میرو پربت کے نیچے بنی لہر کا مفہوم عام طور پر دریا لیا جاتا ہے، لیکن میرے خیال میں یہ بھی بحر (منجمد) شمالی کی علامت ہے۔ یہاں پانی یا سمندر کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے بجائے مچھلیوں کے لہر بنائی ہے۔ پہاڑ کے اوپر بنی علامت کو نندی پد (یا پار) یعنی شیوجی کے بیل کے پاؤں کا نشان مانا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ برج ثور ♉ کی علامت کی بدلی ہوئی آرائشی صورت ہے اور اسے نندی پد کہنے کے بجائے دھرم پد یا وشنو پد کہنا مناسب ہوگا، کیونکہ ان دونوں کا تعلق قطب ستارے سے تھا۔



بعض عالموں نے مندرجہ ذیل دائیں طرف والے نقش کو



تالاب کے بیچ میں بنا مندر بتایا ہے لیکن میری رائے میں یہ جمبودویپ (قطبی جزیرے) کا خاکہ ہے۔

چار مچھلیاں سمندر (بحرِ شمالی) کو ظاہر کرتی ہیں۔ بیچ میں نقطہ میرو پربت (کوہِ قطب) کی طرح ہے جیسا کہ برابر والے نقش سے ظاہر ہے۔ مربع جمبودویپ کو ظاہر کرتا ہے۔

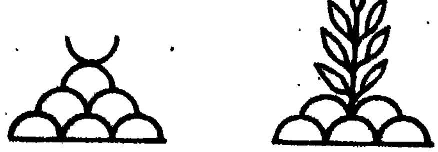


یہ علامت اوپر والے نقوش کی بدلی ہوئی صورت ہے اس میں میرو کی جگہ بیل کو بنایا گیا ہے۔ بیل قطبی پہاڑ کا حیوانی روپ ہے۔ غالباً قطبی پہاڑ (کوہِ آتش فشاں) کی آواز اور بیل کی آواز میں مشابہت کی بنا پر بیل کو قطبی پہاڑ کی علامت مان لیا گیا۔ یہ وہی بیل ہے جسے اہلِ ہنود نندی کہتے ہیں۔ اور جسے شیوجی کا واہن (سواری) مانا جاتا ہے۔



اس علامت میں نندی بیل کو میرو پربت پر کھڑے دکھایا گیا ہے۔ اس سے بعض عالموں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن سکوں پر یہ علامت پائی جاتی ہے انھیں راجہ مہاپدم نند نے جاری کیا تھا۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ دراصل اس سے مراد قطبی پہاڑ ہے۔

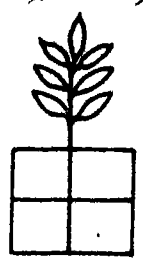
شجرِ حیات



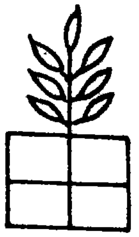
پرانے سکوں کی ان دونوں علامات کو سوم گری کہنا مناسب

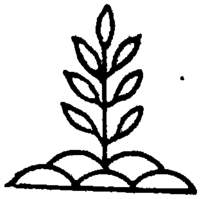
ہوگا۔ سنسکرت میں لفظ سوم کے دو معنی ہیں، چاند اور ایک نامعلوم پیڑ یا پودا، جس کا رس آریہ لوگ پیتے تھے اور جس کے پینے سے ان پر الہامی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

ہندو جغرافیے کے مطابق میرو پربت کی چوٹی پر ایک بہت بڑا جامن کا پیڑ ہے جس میں ہاتھی کے اتنے بڑے بڑے پھل لگتے ہیں، جن کا رس امرت ہے اور جو جینے پر سونا بن جاتا ہے سنسکرت میں جامن کو جمبو کہتے ہیں۔ جامن کے اسی پیڑ کے نام پر جزیرے کا نام جمبو دویپ پڑا۔ میرے خیال میں میرو کی چوٹی پر واقعی میں کوئی درخت نہ تھا بلکہ اس سے جو دھواں نکلتا تھا وہ اکثر پھیل کر درخت کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یہی مذہبی روایات کا شجرِ حیات یا شجرِ عقل ہے۔



اس نقش میں مذکورہ بالا درخت کو چار دریاؤں کے سنگم پر دکھایا گیا ہے۔ پُرانوں (خصوصاً وشنو پُران) کے مطابق جمبو دویپ میں چار دریا ہیں جو میرو پربت کی چوٹی سے نیچے اتر کر چار سمتوں میں بہتے ہیں۔ پہاڑ سے چار دریاؤں کا نکلتے دکھانا مشکل تھا اس لیے دو علامات وضع کی گئیں۔ ایک میں شجرِ حیات کو چار دریاؤں کے سنگم پر دکھایا گیا اور دوسری میں پہاڑ کی چوٹی پر۔ ان دونوں کی مطابقت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک ایسے خطۂ زمین کو ظاہر کرتی ہیں جس کے وسط میں ایک کوہِ آتش فشاں تھا اور جہاں چار دریا بہتے تھے۔





بائیں طرف کے نقش میں درخت کے نیچے کا حصہ چار دریاؤں کے ملک کو ظاہر کرتا ہے۔ چین کے قدیم تصویری رسم خط میں یہ نشان ⊞ زمین کی علامت تھا۔ اس سے ہمارا خیال باغِ عدن کی طرف جاتا ہے جس کا کتاب پیدائش (بائبل) میں ذکر ہے باغِ عدن میں چار دریا تھے اور ان کے سنگم پر (مرکز میں) ایک درخت تھا جس کے دو روپ تھے۔ کبھی اسے شجرِ حیات (TREE OF LIFE) بیان کیا جاتا اور کبھی شجرِ علم (TREE OF KNOWLEDGE)۔ آخر الذکر بدھ دھرم کا بدھ ورکش ہے، اور اوّل الذکر ہندوؤں کا جمبو ورکش یا کلپ ورکش (یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ درخت کی علامت میں سات پتیاں دکھائی گئی ہیں اور سات ایک مقدس عدد ہے)۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بائبل میں باغِ عدن کے بیان میں جن چار دریاؤں کے نام گنائے گئے ہیں وہ مقامی دریاؤں کے نام ہیں جس سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ باغِ عدن مصر اور عراق کے درمیان کہیں تھا۔ یہ خیال کہ باغِ عدن قطب شمالی پر تھا، امریکی عالم ڈاکٹر ولیم ایف وارین نے ۱۸۸۵ء میں پیش کیا تھا[۵۴] لیکن وہ یہ نہ معلوم کر سکے کہ باغِ عدن دراصل قطبِ شمالی پر واقع ایک جزیرہ تھا۔ یہ میری دریافت ہے[۵۵]

مذکورہ بالا علامات کے علاوہ پُرانے سکوں پر ایسی درجنوں علامات پائی جاتی ہیں جن کا تعلق قطب شمالی سے معلوم ہوتا ہے۔ میں ان کے بارے میں اپنی مزید تحقیقات کسی آئندہ مضمون میں پیش کروں گا۔

حواشی

۵۱ یہاں اور آگے لفظ 'پُرانے' کو ان خاص سکوں کے نام کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جن کی تشریح مضمون کے شروع میں کی گئی ہے خالی "پُرانا"

کہنے سے مفہوم واضح نہیں ہوتا، اور "پُرانا سکوں" کی ترکیب غلط ہے۔

۲ـہ PREHISTORIC MAN BY J. DE MORGAN LONDON (1924) P. 254

۳ـہ (ARCTIC OCEAN) جو اس زمانے میں منجمد نہیں تھا۔

۴ـہ PARADISE FOUND, THE CRADLE OF THE HUMAN RACE AT THE NORTH POLE BY DR. WILLIAM F. WARREN, LONDON (1885)

۵ـہ "مذاہبِ عالم کی تخلیق اور قطب شمالی" از محمد اسحاق صدیقی ماہنامہ "نگار" (لکھنؤ) اگست ۱۹۵۲ء

ماخذ: اس مضمون میں پُرانے سکّوں کی جو علامات نقل کی گئی ہیں ان کا نیز سکّوں کے بارے میں بنیادی معلومات کا ماخذ یہ کتابیں ہیں۔

THE ORIGINS OF INDIAN COINAGE BY MICHAEL MITCHINER LONDON (1973)

CATALOGUE OF THE COINS OF ANCIENT INDIA BY JOHN ALLAN, LONDON: BRITISH MUSEUM (1936)

غزل

شاکر جرولی
اونچا مکان۔ جرول
(بہرائچ)

صدی صفت تھے مگر آئے آسماں سے نہ تھے
وہ پل جو مانگے ہوئے عمرِ جاوداں سے نہ تھے

میں کیا بتاؤں کہ مجھ پر چلے کہاں سے نہ تھے
کہ تیر پھینکے ہوئے ایک ہی کماں سے نہ تھے

جلوسِ رنگِ پریدہ تری صفوں میں بھی
کچھ ایسے چہرے ملے جو دھواں دھواں سے نہ تھے

کسی نے پھیر دی پڑھ کے کتابِ دل لیکن
نظر پڑی تو کچھ اوراق درمیاں سے نہ تھے

چلے ہو لے کے سمندر تو پھر بجھانا بھی!
ابھی اُٹھے تھے جو شعلے مرے مکاں سے نہ تھے

انھیں سے پوچھ لو تھے جن کے ہاتھ میں پتھر
یہ زخم ہم نے خریدے کسی دکاں سے نہ تھے

لیے صلیب بڑھے لوگ ناگہاں شاکرؔ
ابھی تو نکلے بھی ہم کوچۂ بتاں سے نہ تھے

●●

معین الدین حسن کاکوروی
شفیع منزل
۲۶ - قندھاری لین ۔ لکھنؤ

ادبِ عالیہ

کسی ملک کا ادب اس کی ثقافتی، عمرانی، تمدنی، سیاسی، اور معاشی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک ادیب "فنا" کے دامن پر بقا کے نقش ونگار رچنے میں اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہ اپنے ماحول کی پوری زندگی کا نباض بنتا ہے۔ وہ وقت کے بدلتے ہوئے تیوروں کو سمجھتا ہے، زندگی کے ہر پہلو کو پرکھتا ہے اور اپنے خداداد ذہن رسا کو "روحِ ساعت" کے عروج، اور حقائق ہستی کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی نظر ذرۂ بے مقدار اور جہاں افروز آفتاب میں قدر مشترک کی بصیرت حاصل کر لیتی ہے اور وہ یہ راز پالیتا ہے کہ ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں

لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے حالات زندگی میں آفاقی قدروں کو اُجاگر کرتا ہے۔ وہ زیاں میں بھی سود کے پہلو ڈھونڈھتا ہے اور شر کی آندھیوں میں خیر کے چراغ کو تہ داماں کر کے اسے روشن رکھتا ہے، اس طرح کہ یاس و ناامیدی کے عالم میں جب سعی و کاوش کی پرواز سست ہونے لگتی ہے تو وہ اُمید کے دیئے جلا کر اپنے تخیلات میں تفکر وفکر کے عناصر شامل کر کے ایک پر اُمید مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔ اگر عالم عرصۂ محشر بنا ہوا ہے تو وہ اپنے خونِ جگر سے حیات انسانی کی آبیاری کرتا ہے اور چمن ہستی کو اپنے خون سے سینچ کر گل وگلزار بنا دیتا ہے۔ ادب زندگی کے منفی اور مثبت اقدار کی پُرخلوص، پُراثر اور حقیقت آمیز تصویر کشی ہے۔ وہ اپنے خیالات کی بلندی، تخیل کی رنگینی اور زورِ بیان سے حیات کے وہ گوناگوں پہلو سامنے لاتا ہے کہ حقیقت ناآشنا قلوب واقف رازِ نہاں ہو جاتے ہیں، وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ اپنے تصورات سے اپنے عہد کو متاثر بھی کرتا ہے۔ وہ وقت کی کلائی کو موڑ دیتا ہے۔ وہ وقت کے دھارے کو اگر وہ ہلاکت آفرینی کی طرف مڑ گیا ہے تو اسے صحت بخش اور حیات آفریں بنا کر صواب وفلاح کی سمت لے جاتا ہے۔

ایک ادیب جس کا دماغ روشن، جس کا دل تابندہ اور جس کا کردار خلوص وسچائی سے مملو ہوتا ہے۔ وہی ادب عالیہ کی تخلیق کر سکتا ہے۔ ایک ادیب جب فغان نیم شبی میں مشغول ہوتا ہے، جب شب کی تنہائیوں میں وہ غمگین ہوتا ہے اور جب زخموں کی ٹیس اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، جب مظلوموں کی آہیں درد وکرب سے مجروح دلوں کے نالہ ہائے دل پاش اس کے مضرابِ دل کو چھیڑتے ہیں تو اس میں وہ نغمے پیدا ہوتے ہیں جو بلبلِ رنگیں نوا کی تانوں سے کہیں زیادہ دلکش اور دلپذیر ہوتے ہیں۔ اسکی یہ نغمہ باری کلی کلی کو بیدار کر دیتی ہے۔ چمن کا بوٹا بوٹا، پتہ پتہ سازِ عالم کا محرم ہو جاتا ہے۔

ادب عالیہ وہ ہے جو جذبات کی تہذیب میں معاون ہو، انسانی فکر کو مہمیز دے اور اسے وہ صلاحیت عطا کرے کہ قاری کا دل حساس سے حساس تر ہو کر ایسی صلاحیت پا جائے کہ اسے کلی کو خار کے کانٹے پر تولنا آجائے اور قلب انسانی اتنا گداز اور نرم ہو جائے کہ گلوں کی شمیم اس کے دل میں خلش تخم پیدا کر دے

صالح ادب وہ ہے جو ہمارے شعور کو بیدار کرے، ہمارے ادراک کو عرفانِ حقیقت عطا کرے۔ اس کے شعلہ بداماں الفاظ، اس کے اندازِ بیان کا زور دلوں میں محشر برپا کر دیتا ہے۔ حسنِ خیال اور حسنِ ادا باہم گلے ملتے نظر آتے ہیں اور ادیب کی تحریر و تقریر میں وہ لذت پنہاں ہوتی ہے اور وہ طلسم ہوتا ہے کہ ہر دل چیخ اٹھتا ہے کہ یہ تو ہماری ہی آواز ہے جو ذرا بدلے ہوئے انداز میں ہے اور ہم جو کہہ نہ سکے وہ اس نے اس طرح کہہ دیا کہ یہ کہی ہوئی بات ترجمانِ عالم بن گئی۔

ادب معمولی سی بات کو بھی غیر معمولی انداز میں بیان کرنے کا نام ہے۔ آدم سے تا ایں جذباتِ انسانی یکساں ہیں۔ محبت میں پہلے بھی آنکھ نمناک، دل ویران اور گریباں تار تار ہوتے تھے۔ اب بھی ہوتے ہیں۔ پندار کا صنم کدہ ویران کر کے عشق ہمیشہ کوئے ملامت کے چکر لگاتا رہے گا۔ حسن ہمیشہ اپنی تلون مزاجی اور شانِ بے نیازی سے نیازمندانِ خاک نشیں کو خاک بسر کرتا رہے گا۔ سرمہ سے دستۂ مژگاں تیز تر ہو کر قلبِ عاشق کو سامانِ صد جراحت مہیا کرتی رہے گی۔ مرگِ عاشق پر شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوتا رہے گا۔ عاشق بادِ فنا سے ہاتھ دھونے کے بعد کسی نو بہارِ ناز کے ناخن محتاجِ حنا ہوتے رہیں گے اور ان وارداتِ قلب کا بیان موزوں الفاظ اور پُر سلیقہ انداز اور دلکش لہجہ میں کرنا ہی ادب ہے۔ اور یہ ادبِ عالیہ دامنِ عالم پر سدا بہار گل بوٹے بنا جاتا ہے کہ جو وقت کے تخت و تاراج سے بلند ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرمایۂ دل و جاں اور متاعِ بے بہا بن کر جہانِ آب و گل کی زینت اور ہستیِ گزراں کی زیبائش، رونق اور حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے ___ زندگی کو وہ ایسی فردوسی فضا میں لے جاتا ہے جہاں مشاغلِ زندگی میں حلاوت، کاروبارِ حیات میں تازگی اور انسانی تعلقات میں ایک طرفہ لذت اور چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

ادب میں یہ چیز زیادہ اہمیت کی نہیں سمجھی جاتی کہ کیا بات کہی گئی ہے۔ کوہِ طور پر صدائے ربِ ارنی ذوقِ لقا کے ہاتھوں مجبور ہو کر رہ گئی، لیکن حسنِ ازل کی طرف سے اس کا جواب لن ترانی کیوں ہوا؟ یہ محلِ قابلِ غور ہے ___ اور پاسِ ادب کچھ کہنے کے لیے ہاتھ روک رہا ہے۔ ادب میں جو بات بھی ہو سلیقہ رچاؤ اور قرینے سے کہی جاتی ہے ___ بلاغتِ کلام اور بلاغتِ متکلم لازم و ملزوم ہیں۔ ایک ادیب کا ہنر یہ ہے کہ بات وہ کہے جو دل میں تیر کی طرح ترازو ہو جائے۔ ہر سخن موقع اور ہر نکتہ مقامے دارد ہی ادبِ عالیہ کی بنیاد ہے۔ اس کو میر انیس کی زبان میں سنیئے ؎

زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اسلوبِ ادب کہ جو دل کو طاقت اور بازو کو حوصلہ دیتا ہے ایک مثال سے سمجھیے ___

نپولین اور انگریزوں کی فوج میں گھمسان لڑائی اہرامِ مصر کے قریب جاری تھی شکست کھا کر نپولین کی فوجیں پیٹھ دکھانے والی تھیں کہ نپولین اپنا مخصوص زورِ خطابت بروئے کار لا کر اہرامِ مصر کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے:

"اے سپاہیو! تم بھاگے جا رہے ہو، دیکھو ہزاروں صدیاں تم کو تحقیر کی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔"

ایک استعارے سے اور اہرامِ مصر کو صدیوں میں مجسم کر دینے سے مقصد حل ہو گیا اور اکھڑتی ہوئی فوج کے قدم پھر سے جم گئے۔ نپولین کو نصرت و کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ ایک فقرہ ادب ہے اور ادبِ عالیہ کی مثال۔

میکالے تقریباً نو برس کا بچہ تھا لیکن ملکۂ ادب فطرت میں رچا بسا تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا اپنے والدین کے ساتھ

صبح کا ناشتہ کر رہا تھا۔ اتفاق سے چائے کی کیتلی اس کے ہاتھ پر گر گئی۔ گرم چائے سے اس کا ہاتھ جل گیا اور وہ تلملا کر رونے لگا۔ ماں باپ نے دلاسہ دیا اور تھوڑی دیر میں جلن کم ہوگئی۔ باپ نے پوچھا کیا حال ہے۔ جلن کم ہے۔؟

بیکانے نے جواب دیا۔ "جی ہاں پاپا۔ درد ابھی ابھی خاموش ہوا ہے۔"

درد کی کمی کے لیے اس نے کم کے بجائے "خاموش" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ الفاظ کا یہی استعمال ادب ہے۔

ادب قلوب کو ہلا دینے والا، خفتہ ضمیر کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دینے والا اور خیالات کی رو کو نیا موڑ دینے والا اسمِ اعظم ہے۔ وہ خیال میں پاکیزگی، جذبات میں ٹھہراؤ پیدا کر دیتا ہے، اور تشکیل و تہذیبِ فطرت میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ یہ صرف ہیئت خیال نہیں بلکہ ایک فضا ہے جو دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے۔

ادب لطیف احساسات اور رفیع خیالات کا حسین امتزاج ہے۔ یہ غم ہائے دل اور حسرتِ حیات کو بھی ایسی دلآویز شکل میں پیش کرتا ہے کہ غم کو حرم کعبہ کے غلاف کا تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ مناظرِ قدرت کی دلآویزی اور سبزے کی کروٹوں پر غنچوں کا مسکرانا کسی کے تبسم کی برق پاشی، اداؤں میں دل کشی، شوخیٔ ادا اور ادائے شوخی سب ادب کے پردۂ سیمیں پر کرشمہ نواز ہو کر جذبہ کو مہمیز دیتے ہیں۔

ادیب اپنے عہد کے رجحانات کا رشتہ ماضی سے جوڑتا ہے۔ "حال" کی دم بدم تبدیلیوں کا محرمِ راز بنتا ہے، لیکن ماضی کی روایات اور ان کے حسن کا مزاج داں بھی بنتا ہے، وہ صرف کسبِ زبان و ادب تک اپنے کو محدود نہیں رکھتا بلکہ تاریخ، تمدن، سیاست اور معاشی مسائل سب کے بنیادی اصولوں سے بھی واقفیت ضروری ہوتی ہے چنانچہ وہ ان اصولوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ کہاں ادب اور ادبیت اور ادبِ عالیہ اور کہاں یہ مجذوب کی بڑ۔ یہ علمِ باطنی کا روحانی فیضان، اس کا ادب سے کیا تعلق۔؟ اگر حافظ جیسے لسان الغیب اور مولانا روم جیسے عالموں نے اپنے علم کے اکتساب میں اپنے مرشدوں کے فیضِ روحانی کا اقرار نہ کیا ہوتا تو یہ بات بے محل اور بے موقع کہی جا سکتی تھی۔ حافظ پہلے قافیہ پیمائی کیا کرتے تھے اور شاعری کے میدان میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے خواب میں اپنے فیض و کرم سے ان کو ملکۂ شاعری عطا کیا اور جس شب کو انھوں نے خواب دیکھا تھا اس کی صبح کو انھوں نے یہ غزل کہی ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

الغرض پائدار اور ذہنوں کو متاثر کرنے والا ادب وہ ہے جس میں تفکیر کا عنصر نمایاں ہو، جس سے ادیب کی قوتِ مشاہدہ اور فہم و ادراک کی پختگی ظاہر ہوتی ہو جو ہماری زندگی کو سنوار سکے اور ہم اس کے مطالعہ کے بعد ایک بدلے ہوئے انسان نظر آئیں حقائقِ حیات ہم پر روشن ہو جائیں اور ہمیں معرفتِ اقدار ہو جائے، ہمارے جذبات میں توازن آجائے۔ ایسا ادب تشکیلِ کردار کا مقدس فریضہ انجام دیتا ہے۔

بقیہ: ہندستانی آرٹ اور کلچر

انگریزی زبان میں رومانی تحریک کے بانی کولرج، ورڈس ورتھ، شیلی وغیرہ ہندستانی خیالات اور فلسفہ سے متاثر تھے شیلی کی ایڈونس (ADONIS) پر' ویدانت فلسفہ 'مایا' کا پرتو نمایاں ہے۔ خود شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں ہندستانی لوک کتھاؤں کا سہارا لیا ہے۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ہندستانی آرٹ اور کلچر کم و بیش دُنیا کے چپہ چپہ پر پہنچتا رہا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ دوسری قدیم تہذیبیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوگئیں لیکن ہندستان کی تہذیب نہ صرف ابھی قائم ہے بلکہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

شورش صدیقی
ڈی ۱۶/۱۰ پیپر مل کالونی
لکھنؤ

اجارے

تمام عیش کے لمحے تمام عیش کے جام
حسین پھول مہکتے گلاب سے چہرے

یہ جانتا ہوں کہ مخصوص کر لیے تم نے
چمن سے توڑ کے دامن میں بھر لیے تم نے

تمھارے عیش کی دُنیا کا کیا ٹھکانا ہے
زمیں پہ عیش کی جنت بنا بھی لی تم نے

غرورِ حسن و لطافت خرید سکتے ہو
نیاز و ناز کی دولت خرید سکتے ہو

مگر یہ چاند یہ تارے یہ صبح کا سورج
یہ چاندنی میں نہائی زمین میری ہے

انھیں ذرا کوئی مخصوص کر کے دکھلائے
زمینِ نیل میں تارے ہیں میں نے سجوائے

پہاڑ برف کے تودوں سے جگمگاتے ہیں
سیہ سفید جو اُڑتے ہیں بادلوں کے پرے

فضا سے نور کی بارش سمیٹ لیتا ہوں
میں ان کی چادرِ رنگیں لپیٹ لیتا ہوں

سحر کے نور سے اُگتا ہے سرخ انگارا
حسیں جمیل سویرے نظر میں بستے ہیں!

اسی کے نور کی خوشبو ہے میری سانسوں میں
چمکتی ریت کے ذرے ہیں میری راہوں میں

جب اونچی اونچی سمندر کی لہر اُٹھتی ہے
تڑپتی لہریں مرے پیر چھو کے جاتی ہیں

سفید جھاگ اچھلتا ہے میرے دامن میں
ہوائیں آ کے لپٹتی ہیں میری گردن میں

یہ بوند بوند جو پانی کی منھ پہ گرتی ہے
میں رات دن انھی نغموں میں مست رہتا ہوں

زمینِ شوق کو آسودہ کر گئی میرے
یہ سرخوشی ہی تو دل میں اُتر گئی میرے

تمھارا عیش مقید ہے بیکراں ہوں میں
تمھیں ثبات نہیں عیشِ جاوداں ہوں میں

●

علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی

"تیری باتیں ہیں کہ نغمے"

بیادِ فراق گورکھپوری

مخدوم پر مضمون لکھتے وقت ایک جگہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے لکھا تھا ـــــ "تخلیق کی عظمت میں خالق کی عظمت پوشیدہ ہے کیونکہ عملِ تخلیق کی ہر منزل پر دونوں ساتھ رہے ہیں، ایک دوسرے کا پتہ چلتا ہے" ـــــ پروفیسر موصوف کا یہ گراں قدر جملہ اور دیگر معتبر تنقیدی کتابوں کے خیالات کی تخلیق میں بہر حال خالق کی شخصیت منعکس ہوتی ہے، ہم نے زمانۂ طالب علمی سے سُنا اور یہی عقیدہ استوار رکھا کہ شاعری اور شاعر کو کبھی الگ الگ نہیں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ کبھی شاعر اپنی شاعری کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے اور کبھی شاعری شاعر کی شخصیت کی پہچان بنتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب ہم غالبؔ۔ منٹو۔ فراقؔ کسی حد تک جوشؔ و مجازؔ (اور بھی نام لئے جا سکتے ہیں) وغیرہ کی شخصیت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے اِرد گِرد کی زندگی کی ایک ایک پرت الٹتے ہیں تو ان تنقیدی اقوال میں ایک ارتعاش سا پیدا ہونے لگتا ہے، اور قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ دورِ حاضر کے بعض جدید نقاد ول نے تو اس طرح کی توجیہات پر زیادہ کان بھی نہیں دھرے، وہ شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ فراقؔ پر ہی مضمون لکھتے وقت ظ انصاری نے اپنے مضمون میں لکھا تھا:

"ازدواجی زندگی کی تلخ کامی کتنی ہی تلخ حقیقت کیوں نہ ہو تاہم وہ ان کی شخصیت کے بکھرے ہوئے جام کی تلچھٹ ہے، اس سے ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے نہ کہ شاعری کا ۔ ۔ ۔ ۔"

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فن کار کو ایسے حالات سے بے نیاز رہنا چاہیئے۔ غالبؔ زندگی بھر پریشان رہے، اپنی بیوی کی شکایت کرتے رہے لیکن مسکراہٹوں کے ساتھ، اس لئے ان کو مشکلیں آسان لگنے لگیں۔ منٹو نے تو ہنس ہنس کر جینا سیکھا تھا زندگی کی ساری تلخیاں اپنی ہنسی میں پی گیا، اور بھی ممتاز فن کار کچھ ایسے ہی جیے ہوں گے۔

یہ سچ ہے کہ فراقؔ صاحب کے اُوپر کم عمری میں ہی مصیبتیں آ گئیں سنہ ۱۹۱۸ء میں جب فراقؔ صاحب کی عمر تقریباً ۲۲ سال کی تھی، ان کے والد منشی گورکھ پرساد عبرتؔ انتقال کر گئے۔ اس حادثے نے ان کے اوپر خاصا اثر ڈالا لیکن اس سے بڑا حادثہ اس سے قبل سنہ ۱۹۱۲ء میں ہو چکا تھا جب سترہ برس کی عمر میں ایک ناپسندیدہ لڑکی کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔ اپنی شادی کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اور میرے خاندان کو دھوکا دیکر ایک صاحب نے میری شادی ایک ایسے خاندان میں ایک ایسی لڑکی سے کرا دی کہ میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت عذاب بن گئی۔ میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہ تھا لیکن معمولی سے معمولی انسان سے بھی یہ لڑکی کُند ذہن اور نااہل تھی۔ صورت میں کوئی کشش

نہ تھی بلکہ اس لئے ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا.....
تب سے آج تک میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت
تکلیف اور تنہائی کا شکار رہی۔"

(شاہکار فراق نمبر ص ۱۳۶)

کہاجاتا ہے کہ شادی کے پورے ایک سال کے بعد تک فراق صاحب کو نیند نہیں آئی اور شائد اسی ناآسودگی کی بنا پر وہ سیاست اور ادب کی طرف مڑے اور فراق بنے۔ فراق صاحب کے ساتھ جس طرح کے ابتدائی واقعات پیش آئے وہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آجاتے ہیں لیکن ہر کوئی فراق نہیں بن پاتا۔ یہیں سے ان کی انفرادیت کی راہیں شروع ہوتی ہیں۔

فراق کو اپنی ذاتی زندگی میں جو الجھنیں، معاشی پریشانیاں اور جنسی ناآسودگیاں ملیں، انھوں نے مل جل کر ابتدا میں غم، تاریکی اور مایوسی کی ایک ایسی شکل اختیار کرلی جو شاعرانہ وجدان اور جمالیاتی حس کی شناخت بن جایا کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص نفسیات کا حامل بھی بنا دیتی ہیں، اگر آپ فراق کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو ان کے یہاں نہ جانے کتنی بار غم، رات اور رات کے پچھلے پہر کا ذکر ملے گا:

(۱) میں ہوں راتوں کی کہانی مجھے کہتے ہیں فراق
مجھ سے اے انجم دمہ آنکھ نہ پھیرو دیکھو!

(۲) اُفق سے تا اُفق یہ کائنات محوِ خواب تھی
نہ پوچھ دے گئے ہیں کیا مجھے وہ ملے رات کے

(۳) تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ دردم اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

جن لوگوں نے فراق کی شاعری اور فراق صاحب دونوں کو قریب سے پڑھا اور سمجھا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ فراق دراصل کئی شخصیتوں کا ایک نام ہے، اوپر سے نیچے ظاہر سے باطن، ان کے اندر کئی قسم کے انسان بیک وقت چلتے رہتے اور اکثر متصادم بھی رہتے۔ ان کئی قسم کے چہروں میں سے ایک چہرہ معمولی سے کائستھ کا تھا جس کے بطن سے کنجوس، سوچ وچار میں سمٹاپن اور کبھی کبھی تو گھناؤنا پن سا جھلکتا نظر آتا، خیال رہے کہ یہ چہرہ فراق کا ہرگز نہیں تھا بلکہ ضلع گورکھپور کے بانس گاؤں کے ایک کائستھ کا تھا جو اپنے والد کے انتقال کے بعد پریشان اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے اور پھر جواہرلال نہرو کی اچانک عنایت سے اپنے گھر کی کفالت کرتا ہے۔ اس شخص کے اندر پیسے کی اہمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کیونکہ اس نے تکلیفیں جھیلیں تھیں اور اس کی یہی سوچ اس قدر حاوی ہوئی کہ وہ بعد میں فراق کو بھی چھو لیتی ۔ دوسرا چہرہ رگھوپتی سہائے کا تھا۔ ایک سادے سے انسان کا چہرہ جو ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کرکے ایف۔اے کی تعلیم کے لئے الٰہ آباد آتا ہے اور اچھے نمبروں سے پاس ہوکر کرسچن کالج لکھنؤ اور سناتن دھرم کالج کان پور میں بحیثیت مدرس پڑھانا شروع کرتا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی یہ ادا بھی جلد ہی فراق کو چھو لیتی ہے تیسرا یا شاید چوتھا چہرا فراق کا ہوتا تھا۔ فراق گورکھپوری کی شخصیت کا یہ چہرہ اس قدر تابناک، ذہین اور طاقت ور تھا کہ پھر نہ تو وہ کائستھ رہ جاتے اور نہ رگھوپتی سہائے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے فراق صاحب کی ایک ہی شخصیت کے اندر نہ جانے کتنی شخصیتیں پنہاں دیکھی ہیں۔ حیرت میں پڑا ہوں، خوف بھی محسوس کیا ہے اور حقارت بھی لیکن پھر اپنی ہی آنکھوں کے سامنے انھیں تبدیل ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ایک تبدیلی کا وہ منظر، ہونٹوں میں کانپتا ہوا سگریٹ، ہاتھ میں چھلکتا ہوا جام، آسمان کو چھوتی ہوئی تخیل کی لہریں اور چشم زدن میں فراق ان سب پر ایسا غالب آتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ پھر ایسے ماحول میں گل افشانی گفتار کا ایسا سلسلہ چلے گا، علم و فضل کی ایسی بجلیاں کوندیں گی کہ اربابِ علم و دانش سراپا حیرت بن جائیں گے۔ ہوش و حواس فضا میں تیرتے نظر آئیں گے۔ بس یہیں پر اسی مقام پر نہ جانے کتنی بار فراق صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر یہ احساس ہوا کہ فراق صاحب کی ذاتی شخصیت اور شاعرانہ شخصیت میں زمین آسمان کا فرق ہے جب وہ شاعر ہوتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کی ڈھلی ہوئی نفسیات، علمی چمک دمک اور تخلیقی قوت کام کرتی رہتی ہے۔ بچپن کے حالات، غیر موزوں شادی، ازدواجی زندگی کی تلخی، لیکن اس وقت وہ صرف فن کار ہوتا ہے لیکن اس سے ہٹ کر ایک معمولی انسان غور وفکر سے بے نیاز۔

فراق صاحب کے بچپن کے بارے میں پڑھا یا ان کی زبان سے سنا جوانی کے قصے وہ اکثر مزے لے لے کر خود ہی سناتے تھے۔ میں اُن سے اس وقت ملا جب انہیں اُن کی زندگی بھر کی ادبی خدمات کا صلہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ کی شکل میں مل چکا تھا جس کی خوشی میں انھوں نے

اپنے گھر پر ایک جلسہ کیا تھا اور الٰہ آباد کے انگریزی ہندی اور اردو کے ممتاز ادیب اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ بی۔ اے کا ایک حقیر طالب علم پروفیسر احتشام حسین کا سہارا لے کر اس جلسہ میں پہنچا، آج بھی وہ منظر یاد ہے۔ گھر کے چوکور آنگن میں فراق صاحب تنِ تنہا بالائے تخت جلوہ افروز تھے اور نیچے فرش پر ادیبوں اور فن کاروں کا اجتماع۔ فراق صاحب تمام سوالوں کا ترکی بترکی جواب دے رہے تھے، لطیفوں اور قہقہوں کی گونج میں سماعت اور فہم و ادراک دونوں ہی اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ ذرا بھی یاد نہیں کہ کن کن باتوں پر قہقہے بلند ہوئے اور کیا کیا سوالات اٹھے، کچھ دنوں کے بعد ایک جلسے کی صدارت کے سلسلہ میں ذاتی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے لائبریری سے کچھ کتابیں منگوائیں اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ اس طرح کم از کم دو ڈھائی سو بار انکی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر شاعری اور اس کی تفہیم کی الف۔ ب سیکھی۔ ادب کی بنیادی قدروں سے واقف ہونے کی جرأت کی۔ تبادلۂ خیال کے آداب سے آگاہ ہوا۔ بڑے بڑے ناموں کے باعث طاری ہو جانے والے خوف و ہراس کو فراق صاحب نے کم کیا اور وہ بھی روزمرّہ گفتگو، لطیفوں اور قہقہوں کے ذریعہ۔ لیکن یہ سب باتیں اس وقت ہوتی تھیں جب وہ فراق ہوتے تھے، لیکن یہ بھی اس وقت ہوتا تھا جب کوئی انھیں فراق بنانے والا پہنچ جائے، ورنہ گھر میں جب بھی داخل ہو تو وہ کچھ اور ہوتے، کسی نوکر پر غصہ کر رہے ہوتے۔ ملازمہ پر برس رہے ہوتے۔ سبزی دال کی باتیں ہو رہی ہوتیں یا زیادہ سے زیادہ ان کے خوبصورت لان میں لگے ہوئے پھول پودوں کی باتیں ہو رہی ہوتیں۔

فراق صاحب کو پھولوں کے پودے بہت پسند تھے خواہ وہ کسی قسم کے پھول ہوں۔ بس ان کا خوش رنگ ہونا کافی ہوتا۔ ایک بار مجھے لان میں لے جا کر ایک ایک پودے کے بارے میں تفصیل سے بتاتے رہے کہ کس کو کہاں سے کس طرح اور کتنی قیمت پر حاصل کیا ہے۔ کون کتنی زندگی کا حامل ہے، کون اب ختم ہونے والا ہے۔ جب ہم ختم ہونے والے پودے کے پاس پہنچے تو میرے منہ سے نکل گیا کہ حضور ان میں سے ایک پودا آپ مجھے عنایت کر دیں۔۔۔۔ میرے منہ سے ابھی یہ جملہ مکمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ بگڑ گئے، بولے ـــ "خبردار! یہ پودا۔ میری جان ہیں انھیں تم کیا جوش، مجنوں بھی مانگیں تو نہیں دے سکتا۔"

انگریزی ادب کے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ جس فن کار کی ابتدائی زندگی ناکام اور مایوس کن رہتی ہے۔ اس کے یہاں ایک مخصوص قسم کی انا اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے لکھنے پڑھنے کی ابتدا، زیادہ تر اپنے حالات سے متعلق امور سے کرتا ہے۔ انگریزی میں خود سوانحی ناول نویسی کے پیچھے اسی قسم کے جذبے اور جواز پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو فراق صاحب کے سلسلہ میں بھی یہ بات مانی جا سکتی ہے کیونکہ وہ زبردست انا پرست (EGOIST) تھے۔ غرور بھی تھا۔ جوش نے تو انھیں مجموعۂ اضداد بھی کہا۔ شاعری میں بھی آپ ملاحظہ کریں تو ان کے زیادہ تر مقطعوں میں فراق آسمان کو چھوتے نظر آئیں گے۔ اپنے سلسلے میں انھوں نے جو بھی لکھا، مبالغے کو ہمیشہ ساتھ رکھا۔ لیکن یہ سب کچھ ان کی تحریر میں ملتا ہے، گفتگو میں، میں نے بہت کم اس طرح کی باتیں کرتے دیکھا اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے فراق کو اس وقت پایا جب وہ جسمانی اعتبار سے مائل بہ زوال تھے۔ سانسوں میں تھکن کے آثار نمایاں ہو چلے تھے لیکن ذہن ہمیشہ تازہ اور جاگتا رہا، آنکھوں میں چمک اور تیزی مرتے دم تک قائم رہی۔ دماغی طور پر میں نے ہمیشہ ان کو بیدار پایا اور ایسی گل افشانیٔ گفتار کرتے دیکھتا کہ حیران رہ جاتا، ایسا لگتا تھا کہ گفتگو میں تخلیق ہو رہی ہو۔ یہ میری سراسر کمزوری ہے کہ اتنے قریب رہ کر بھی میں نے فراق کی شاعری کو کم پڑھا، ان کی نثر کو اور بھی کم۔ سنا ہے کہ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی ہے من آنم کے نام سے ـــ میں نے فراق صاحب کو جو بھی سمجھا، یا ان سے جو بھی سیکھا ہے ان کی غیر معمولی فنکارانہ گفتگو کے ذریعہ۔ جب کبھی ان کی انگلیوں میں جنبش شروع ہوتی، آنکھیں ڈوبنے لگتیں۔ پتلیوں کا رقص شروع ہوتا۔ دماغ تفکر کی سانسیں لینے لگتا، ہم سمجھ لیتے کہ تخلیق والہامی گفتگو کا وقت آگیا اور ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے دوران گفتگو میر آتے، غالب اور اقبال آتے، مومن اور امیر مینائی کا بھی ذکر آتا۔ داغ اور نوح کے چرچے ہوتے۔ گفتگو کا اتار چڑھاؤ۔ بڑے بڑے دیدوں کی اوپر نیچے گردش، یہ فیصلہ کرتی چلتی کہ وہ کس شاعر کو

کیا مقام دے رہے ہیں۔ داغ، نوح ـــــــ کا ذکر کرتے وقت ان کے حلق سے باریک قہقہہ نما آوازیں نکلتیں لیکن جلد ہی سنجیدہ ہو کر کہتے کہ اردو شاعروں کو "مخلصانہ لے" اور "استادانہ آہنگ" سے مالا مال کرنے میں جو کام ان لوگوں نے کیا وہ فراق بھی نہ کرسکا۔ اسی طرح وہ عزیز اور آرزو وغیرہ کا ذکر بھی قدر شناسی سے کرتے، پھر دورانِ گفتگو اگر فراق آ جائے تو آ جائے ورنہ انھیں فرصت کب تھی، کالی داس، تلسی داس، ورڈس ورتھ، ٹینی سن میر انیس، مومن وغیرہ سے نیچے اترنے کی۔

کسی رسالے کے لئے میں نے ایک بار اُن سے سجّاد ظہیر کے بارے میں کچھ گفتگو کی اور بات ترقی پسند تحریک کی چل پڑی، تحریک کے بارے میں انھوں نے جو نتیجہ نکالا اُسے آپ بھی سن لیجئے، بولے:

"تحریک اس لئے پھلی پھولی کہ اس کو سجّاد ظہیر لے کر چلے تھے اور سجّاد ظہیر اپنی تحریک سے زیادہ عظیم تھے، اور تحریک اُن کے مقابلے کمزور۔۔۔۔۔۔"

اُسی دن ادب، جمالیات اور وجدان پر ایسی ایسی باتیں کیں جو مجھ جیسا کم علم مُنھ پھیلا کے رہ گیا اور ایسا لگا کہ میں کہیں اور ہوں، میرا وجود زمین سے اوپر اُٹھ رہا ہے۔ گفتگو اور علمیت کے جادو سے دوچار ہونے کے ایسے موقعے اب کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہ تمام باتیں بعد میں مجھے سردار جعفری کے ایک خط میں بھی نظر آئیں، دو تین جملے پیشِ خدمت ہیں:

"میرے نزدیک ادب برائے ادب کا مفہوم داغ اور نوح کی شاعری نہیں بلکہ حافظ اور کیٹس کی شاعری ضرور برائے ادب ہے، اس فقرے میں برائے ادب کا مفہوم نہ برائے چونچلہ نگاری نہ برائے مشاعرہ بازی، نہ برائے سطحیت بلکہ برائے ادب کے معنے جمالیاتی مہک اور برائے جمالیاتی وجدان، جس کا کوئی تعلق عمل سے نہیں ہے، زندگی سے جو بغیر فنونِ لطیفہ کے مدد کے انسان میں موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

یہ وہ فراق ہیں جنھوں نے پریم چند سے بے پناہ اثر لے کر پروفیسر اعجاز حسین اور پروفیسر احمد علی وغیرہ کے ساتھ مل کر الٰہ آباد میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کا اہتمام کر کے اپنی فعالیت کا ثبوت دیا تھا ـــــ ہر ذی شعور فنکار کے تفکّرات و تخیّلات کی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک صاحبِ فکر جو کل تھا وہ آج رہے، جو آج ہے وہ کل بھی رہے۔ فراق صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

ابتدا میں وہ ذاتی الجھنوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے سیاست اور جنگ آزادی میں حصّہ لینے لگے، ترقی پسند تحریک کے زبردست حامی رہے لیکن رفتہ رفتہ جب حالات معمول پر آنے لگے تو اندر کا فنکار اُنہیں لے گیا شاعری کی اس سُرمئی فضا میں جس کے پچھلے پہر صرف معشوق کی آہٹیں ہی محسوس ہونے لگیں اور انھوں نے کہا:

یہ سُرمئی فضاؤں کی کچھ کُنمناہٹیں
ملتی ہیں مجھ کو پچھلے پہر تیری آہٹیں
اس کائناتِ غم کی فسردہ فضاؤں میں
بکھرا گئے ہیں آ کے وہ کچھ مسکراہٹیں

فراق اپنی خارجی زندگی کی تمام آزردگیوں کو سازِ جمال کی گنگناہٹ میں ضم کر دینا چاہتے تھے اور اپنے عشق کو ایک ایسے کائناتی تصوّر میں جذب کر دینا چاہتے تھے جہاں سے ایک ایسی آفاقیت جنم لیتی ہے کہ جس میں رچ بس کر وہ اپنی عشقیہ شاعری کو دو راہے پر لا کھڑا کرتے ہیں جس کی ایک سمت وہ ہے جو ہندوستانی کلچر اور لب و لہجہ کو چھوتی ہے اور جس میں میر، مومن اور امیر مینائی جیسے شعراء کی گونج سنائی دیتی ہے۔ تین شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی جیسے رام کا بن باس

رات چلی ہے جوگن بن کر، بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے، دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

خنک سیہ مہکے ہوئے سائے پھیل جائیں ہیں جل تھل پر
کن جتنوں سے میری غزلیں رات کا جوڑا کھولے ہیں

اور دوسرا راستہ ہندوستان کے اس متوسط طبقے کے گھر کے آنگن میں جاتا ہے جہاں ہندوستانی عورت یا رسوئی گھر میں ہے، شوہر کی خدمت میں مصروف ہے یا تلسی کے پودے کو سینچ رہی ہے، دو رُباعیاں ملاحظہ ہوں:

چوکے کی سہانی آگ مکھٹا روشن
ہے گھر کی لکشمی پکاتی بھوجن
دیتے ہیں گرچھلی کے چھلنے کا پتہ
سیتا کے رسوئی کے کھنکتے برتن

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری
ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ، آنکھوں میں رس، ہاتھوں میں
بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

فراق کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بھی لکھا جائے گا، اس مختصر سے مقالے میں ان کا شاعرانہ تجزیہ ہرگز مقصود نہیں ہے۔ بس ان کی ذاتی شخصیت اور شاعرانہ شخصیت سے اٹھتے ہوئے کچھ سوالات ہیں۔ میں نے ایک بار ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا آپ اب بھی شعر کہتے ہیں، کچھ جواب نہیں ملا، بس ایک مخصوص قسم کی گنگناہٹ طاری ہوئی اور ایک غزل کے چند اشعار کچھ ایسے انداز میں سنائے کہ ترنم کہا جا سکتا تھا نہ تحت۔ میں نے جلدی جلدی وہ اشعار نوٹ کر لئے یہ سوچ کر کہ تازہ ہوں گے، وہ اشعار آپ بھی سن لیجئے۔

عشق کی آغوش بس اک دلِ خانہ خراب
حسن کے پہلو میں صدہا آفتاب و ماہتاب
آدمیّت سے بھری ہے یہ بھری دنیا مگر
آدمی کو آدمی ہوتا نہیں ہے دستیاب
راس آیا عشق کو خونِ جگر سے سینچنا
چہرۂ آفاق پر کچھ آچلی ہے آب و تاب
راز کے چھپنے میں رکھا تھا مشیّت نے جسے
وہ حقائق ہوگئے میری غزل میں بے نقاب

بعد میں دیکھا تو یہ غزل گلِ نغمہ میں موجود تھی۔

یہ بالکل سچ ہے کہ فراق صاحب نے آخر عمر میں شعر کہنا تقریباً ترک کر دیا تھا، انھیں اپنے اشعار بھی زیادہ یاد نہیں رہ گئے تھے، ذاتی محفلوں میں وہ اکثر داغ، عزیز اور آرزو وغیرہ کے اشعار مزے لے لے کر سناتے، مشاعروں میں شعر کم، لطیفے یا لطیفہ نما شعر زیادہ سناتے۔

الٰہ آباد میں ان کی آخری تقریر اور تقریب فانی صدی تقریبات کی افتتاحی تقریر تھی۔ فراق صاحب کا علم، اظہارِ علم، گفتگو، شعر اور اس کی پیشکش سب اس قدر غیر معمولی اور ساحرانہ تھا کہ سامعین پر ایک کیف طاری ہو جاتا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل کی کتاب نئی علامت نگاری کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے انھوں نے جو تقریر کی یا پروفیسر احتشام حسین کے انتقال پر انھوں نے جو متعدد جذباتی تقریریں کی تھیں وہ آج بھی سننے والوں کے دل و دماغ پر نقش ہوں گی۔ ان کی تقریر سے ایک ایسا کیف و سرور طاری ہوتا کہ ہم سب تخیل و تصور کی نہ جانے کن وادیوں میں پہنچ جاتے۔ ہمارے کانوں میں نغمگی اور موسیقیت گھلنے لگتی۔

فراق جیسا شاعر اور فراق صاحب جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو کی دلنواز ادائیں، ان کی شاعرانہ و فنکارانہ کیفیتیں، ان کی آنکھوں کی گہرائی، ان کی پتلیوں کا رقص، انگلیوں میں جھولتا ہوا سگریٹ ہاتھوں میں کانپتا ہوا نارنجی گلاس۔

آج فراق صاحب ہم میں نہیں ہیں، بس یادیں ہی یادیں باقی رہ گئی ہیں، ایسی یادیں جنھیں بھلانا تو ممکن ہی نہیں جنہیں سمیٹنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ ایسی متنوع اور متضاد شخصیت کے بارے میں لکھنا ممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے۔ ظ انصاری نے ٹھیک لکھا تھا کہ "ان کی شخصیت لکھی نہیں جا سکتی بلکہ اس کے بارے میں کچھ باتیں لکھی جا سکتی ہیں"۔ میں نے بھی اسی طرح کچھ ٹوٹی پھوٹی کوشش کی ہے۔

فراق صاحب کے سامنے جب کبھی جوش، مجنوں اور نیاز وغیرہ کا ذکر کیا جاتا تو وہ نہایت جذباتی ہو کر یہ شعر پڑھتے:

اب یادِ رفتگاں کی بھی طاقت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

آج وہ اپنے دوستوں کے پاس جا چکے ہیں، ہمارے پاس ان کی شاعری ان کی گفتگو اور ان کی پرکشش شخصیت سے لبریز یادوں کے سرمائے کے ساتھ ساتھ ایک سرمایۂ افتخار یہ بھی ہے کہ ہم آنے والی نسلوں سے کہہ سکیں گے کہ ہم نے واقعی فراق صاحب کو دیکھا تھا، ان سے سیکھا تھا، ان کے قدموں میں

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

احمد کمال
۱۰۴۵ - اولڈ کٹرہ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۲

(افسانہ)

بوجھ

بابو گھنشیام داس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور اپنی بیوی شانتا سے بولے :- "بھگوان کی کرپا سے ہم بیٹیوں کے بوجھ سے ہلکے ہوگئے"۔

"ابھی کہاں ہلکے ہوئے، بیٹیوں کا بوجھ تو سر سے اُتر گیا لیکن قرض کا بوجھ جو کاندھے پر چھوڑ گیا ہے، اُس سے کب مُکتی ملے گی، بھگوان جانے۔"

"چنتا کیوں کرتی ہو وندنا کی ماں! تنخواہ سے دوسو روپیہ ماہوار کٹوا جو رہا ہوں"۔

"ارے وہ تو کٹیں گے ہی لیکن سیٹھ مدن گوپال سے جو دس ہزار روپیہ نقد سود پر لے کر وندنا کی سگائی پر لڑکے والوں کو دیئے تھے، اس کی بھی کوئی چنتا ہے"؟

"ہاں ہاں"!! کیوں نہیں، وہ بھی ادا ہو جائے گا۔ سیٹھ مدن گوپال بھلے آدمی ہیں، راستے میں رام رام ہو جاتی ہے، پر تقاضہ نہیں کرتے اور پھر تقاضا کیوں کرنے لگے، اُن کو تو سُود کے ساتھ روپیہ چاہیئے۔"

بابو گھنشیام داس یو۔پی بورڈ میں کلرک تھے، تنخواہ اتنی نہ تھی کہ ایک بڑے کنبہ کی کفالت ہو سکے تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے، بڑی ۲ لڑکیوں کو انٹرمیڈیٹ کرا کر گھر بیٹھا چھوڑا تھا، چھوٹی لڑکی ابھی نویں درجہ میں تھی بڑا لڑکا بی۔اے میں تھا اور چھوٹا لڑکا انٹر کے پہلے سال میں۔ گھر گرہستی کسی طرح سے چل رہی تھی۔ آدمی ایماندار تھے اور بھگوان پر بھروسہ کرتے تھے اور یہی عقیدہ ان کی ہر مشکل کو آسان کر دیتا تھا، البتہ جوان لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ضرور تھی۔

پہلی لڑکی کی شادی انھوں نے بڑے ارمانوں سے کی، کیونکہ یہی ان کی پہلی اولاد تھی جو انھیں بے انتہا عزیز تھی۔ اپنی اس پہلی بیٹی کے لئے اس کی ماں شانتا نے گھر گرہستی سے بچے پیسوں کو جوڑ جوڑ کر جہیز کیلئے نہ جانے کب سے سامان جمع کرنا شروع کر دیا تھا، اور پھر گھنشیام داس کے سالوں نے بھی اپنی بڑی بھانجی کی شادی میں ہر طرح سے مدد کی تھی، کیونکہ گھنشیام داس کے گھر یہ پہلا شُبھ کام تھا۔

دوسری بیٹی کی شادی نے بابو گھنشیام کو خاصہ پریشان کر دیا تھا کیونکہ لڑکے والوں کی طرف سے جہیز اور زر نقد کی فرمائش کو پورا کرنے کا اپنے آپ کو متحمّل نہ پاتے تھے جو بھی رشتہ لے کر آتا لڑکی پسند کر لیتا، لیکن معاملہ جہیز اور زر نقد پر آکر رُک جاتا، اور گھنشیام داس کو متفکّر چھوڑ کر چلا جاتا، بابو گھنشیام داس اپنی حیثیت کو دیکھتے اور بھگوان سے پرارتھنا کرتے۔

"ایشور تو ہی اِس سمسّیا کا نِدان کر، میں مجبور ہوں، تو ہی میری کشتی کا کھیون ہار ہے، تو ہی کوئی اُپائے نکال۔"

اور ایشور کا کرنا ایسا کہ مسئلہ حل ہو گیا، سگائی کے موقعہ پر زرِ نقد کے لئے انھوں نے پانچ ہزار روپیہ سوُد پر قرض لے لیا، باقی انتظامات کے لئے دفتر سے لوُن، کچھ رشتہ داروں نے بھی مدد کی، اس طرح دوسری لڑکی کی فکر سے بھی آزاد ہوگئے۔

بابو گھنشیام داس دوسری بیٹی کے بوجھ سے تو ہلکے ہو گئے لیکن قرض کے بوجھ سے دب گئے۔ تیسری اور آخری بیٹی وندنا شادی کے قابل ہو رہی تھی اب گھنشیام داس اور بھی متفکّر نظر آنے لگے تھے کیونکہ پانچ ہزار روپیہ کی یک مُشت رقم اور چھوٹے موٹے قرضوں کی بھی چنتا تھی اور اس چنتا سے ان کی صحت بھی متاثر ہو چلی تھی، ایک دن شانتا نے بابو گھنشیام داس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"تمہیں صحت کی بھی پروا ہے. گھلتے جارہے ہو"

"کیا کروں، شانتا! بیٹیوں کی چنتا نے گھلا کر رکھ دیا ہے"

"بڑے ایشور بھگت بنتے ہو تس پر اتنی چنتا، ارے بھگوان کا شکر ادا نہیں کرتے کہ اس نے کن کن مشکلوں میں ہمارا ساتھ دیا ہے، بھگوان پر بھروسہ رکھو، اس چنتا سے بھی مکت ہو جاؤ گے، ـــ ارے ہاں میں تو بتانا ہی بھول گئی کہ آج ہی گورکھپور سے رام جی کا پتر آیا ہے. رام داس جی کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے، وندنا کے منھ بولے ماما۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وندنا تو اب شادی کے یوگیہ ہو گئی ہوگی، میں نے ایک لڑکا دیکھ رکھا ہے، اچھا گھر بار ہے کھاتے پیتے لوگ ہیں، اگر مناسب سمجھو تو لکھو، میں لڑکے والوں سے بات کروں ـــ بیٹی وندنا! پتا جی کے کمرے میں میز پر چھٹی رکھی ہے ذرا اٹھا تو لانا۔"

گھنشیام داس نے چھٹی پر ایک نظر ڈالی، کیونکہ نفسِ مضمون تو شانتا بتا ہی چکی تھی. چھٹی رکھ کر خاموش ہو گئے. وندنا نے پتا جی کو جو خاموش دیکھا تو اس کے چہرے پر افسردگی کی ایک لہر دوڑ گئی. بابو گھنشیام داس نے سر اٹھایا، باپ بیٹی کی نظریں چار ہوئیں، اور وندنا خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

گورکھپور سے لڑکے والے آئے، پہلی نظر میں ان کو وندنا پسند آ گئی رام داس (جو لڑکے والوں کے ساتھ آئے تھے) نے خوش ہو کر موتی لال سے پوچھا:

"تو کیا موتی لال جی، میں یہ رشتہ منظور سمجھوں"؟

"میں نے کب کہا کہ یہ رشتہ منظور نہیں" موتی لال نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر بولے ـــ "ارے بھائی رام داس لڑکی کی فوٹو دیکھتے ہی پرکاش نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ پتا جی اب کہیں بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں، یہی لڑکی میری دھرم پتنی ہوگی"۔

"ہاں تو رام داس میں کہہ رہا تھا کہ یہ رشتہ ہمیں سولہ آنہ منظور ہے پر وہ کیا کہ: رسمِ دنیا بھی ہے ... ..."

یہ سنتے ہی بابو گھنشیام داس پر بجلی سی گر پڑی، جیسے اس کے لئے وہ پہلے سے تیار بیٹھے تھے، ان پر ایک سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ رام داس اور موتی لال بے تکلف ہو کر باتیں کر رہے تھے. بابو گھنشیام داس نے مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے "دو منٹ میں آیا" کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئے تو موتی لال نے گفتگو کا رُخ بدلا۔

"ہاں تو رام داس لین دین کی بات بھی طے ہو جانا چاہیئے تاکہ سگائی کے وقت بات نہ خراب ہو"

"موتی لال جی، ایسی آپ کو کیا کمی ہے، بھگوان کی دَیا سے آپ خوش حال ہیں، آپ سرکاری دفتر میں ہیں اور پھر اوپر کی ... ...! پرکاش بھی بھگوان کی دَیا سے دِلّی سکریٹریٹ میں ملازم ہے، ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ اٹھاتا ہے ارے میں کہتا ہوں آپ کے پریوار پر ایشور کی کِرپا ہے، پھر لین دین کی بات یہاں کہاں لے آئے؟ ایسی بات آپ کی زبان سے شوبھا نہیں دیتی موتی بابو"

"بھائی رام داس میں نے اپنی تینوں بیٹیوں کی شادی پر کتنا دان دہیج دیا، آپ شاید میری آخری بیٹی کی شادی کے موقعہ پر کہیں باہر تھے، دو بیٹیوں کی شادیاں تو آپ نے دیکھی ہونگی، لڑکے والوں کا منھ بند ہو گیا تھا"

(رام داس جانتے تھے کہ اتنے زیادہ دان دہیج کے پیچھے کیا بات تھی)

موتی لال کی باتوں کو سُن کر وہ خاموش ہو گئے. اسی اثنا میں گھنشیام داس کمرے میں داخل ہوئے، کچھ اپنی طرف سے پوچھنے کی ان میں جرأت نہ تھی، ان کی خاموشی ہی ان کا سوال تھا، گویا پوچھ رہے ہوں کیا اس کے بغیر شادی ممکن نہیں؟ موتی لال نے گھنشیام داس سے ٹرین کا وقت دریافت کرتے ہوئے ان کے سکوت کو توڑا اور گھنشیام داس گویا خواب سے بیدار ہوئے، بولے "آٹھ بجکر کچھ منٹ پر جاتی ہے"۔

موتی لال نے گھنشیام داس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اچھا شریمان جی ہم چلتے ہیں، شہر میں کچھ خریداری بھی کرنا ہے، جیسا ہوگا خط میں لکھ دینا، یہ سمجھ لینا لڑکا ہیرا ہے ہیرا، باقی تم خود سمجھدار ہو. لین دین تو دُنیا کا دستور ہی ہے، اور پھر تم کیا کسی غیر کو دے رہے ہو، یہ سمجھ لو تم جو کچھ دوگے وہ تمہاری لڑکی کے لئے فکس ڈپازٹ ہوگا. اچھا چلتے ہیں نمستے۔!"

مہمانوں کو رخصت کر کے گھنشیام داس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے بھگوان کو یاد کیا، جس نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں ان کی مدد کی تھی.

تقریباً ایک ماہ اسی غور و فکر میں گزر گئے کہ روپیوں کا بندوبست کہاں سے کیا جائے تاکہ سگائی کی رسم فوراً ادا ہو جائے. شادی کا بھگوان مالک ہے. برسرِ روزگار لڑکا ہے، کہیں ہاتھ سے نکل گیا تو اور بھی مشکل ہوگی.

بھگوان کی کِرپا سے وندنا کی ڈولی بھی رخصت ہو گئی، لیکن گھنشیام داس جی کے

کاندھوں پر قرض کا بوجھ اور زیادہ بڑھ گیا۔ لڑکیوں کی طرف سے بے فکر ضرور ہو گئے تھے لیکن ابھی پوری طرح اطمینان کے دن نہ آئے تھے۔ جو قرض لیا تھا اس کی ادائیگی باقی تھی۔ اپنے بڑے بیٹے روی کو بی۔ اے کی تکمیل کے بعد اپنے ہی دفتر میں عارضی نوکری دلادی تھی اور بیٹے کی تنخواہ کا تین چوتھائی حصّہ ہر ماہ سیٹھ مدن گوپال کی نذر ہو جایا کرتا تھا اور دفتر سے جو لون لے رکھا تھا اسے اپنی تنخواہ سے دو سو روپیہ ماہوار کے حساب سے کٹواتے تھے۔ جب قرض کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو گیا اور روی کی نوکری بھی مستقل ہو گئی تو ایک دن شانتا نے گھنشیام داس جی سے کہا:-

"بیٹے کی شادی کی بھی کچھ فکر ہے۔"

"بیٹے کی شادی کی فکر کیسی؟ فکر تو بیٹیوں کی شادی کی کی جاتی ہے، کوئی اچھا سا گھر دیکھ کر اپنے روی کے لئے سُندر سی دُلہن لے آئیں گے، اس میں فکر کی کون سی بات ہے؟"

"روی کی منگنی پر بیس ہزار روپئے سے کم پر معاملہ نہ کیجئے گا، اپنا روی بھی ہیرا ہے اور وقت کے ساتھ ہر چیز کی قیمت بھی تو بڑھ رہی ہے۔" شانتا نے ازراہِ مذاق کہا۔

"سچ شانتا" پھر سنجیدگی سے گھنشیام داس بولے:-

"دیکھو شانتا! ہمیں اپنی ہی طرح دوسروں کی مجبوری کو بھی سمجھنا چاہیئے ہم نے کن کن کٹھنائیوں سے اپنی بیٹیاں بیاہی ہیں اس کا ہمیں خوب اندازہ ہے، سماج میں ہمارے جیسے ایسے کتنے گھنشیام داس ہوں گے جو لڑکیوں کی شادی کی غرض سے لئے گئے قرضوں کے بوجھ سے دبے ہوں گے۔ بھگوان کی کرپا ہے ہماری سبھی بیٹیاں سُندر اور سوشیل تھیں ورنہ یہ بوجھ اور بھی بھاری ہو جاتا، اور بھگوان کی ہم پر یہی کیا کم کرپا تھی جو سب بیٹیاں ہم نے خوشی خوشی رخصت کیں ——— اب ہم نہیں چاہتے کہ جو بوجھ ہمارے کاندھے سے اُترا ہے وہ ہم کسی دوسرے کے کاندھے پر رکھ دیں"؟

پتی کی باتیں سُن کر شانتا خاموش ہو گئی!

ایک دن شانتا نے گھنشیام داس جی کو ایک خوشخبری سُنائی، بولی:

"میں نے روی کے لئے لڑکی دیکھ لی ہے۔ کل ایک لڑکی وندنا کی سہیلی روپا کے ساتھ آئی تھی، کرونا نام ہے اُس کا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس کے پتا رام ناتھ ہائر سکنڈری اسکول میں ٹیچر ہیں اور اپنی ہی برادری کے ہیں۔ بات چیت سے اندازہ ہوا کہ لڑکی نیک ہے، میں نے گھر کا پتہ معلوم کر لیا ہے۔ ہاؤسنگ اسکیم کے علاقے میں رہتے ہیں کیوں نہ اتوار کے دن اُن کے گھر ہو آئیں"؟

"ایک اسکول ماسٹر بھلا ہم کو بیس ہزار روپیہ کہاں سے دے پائے گا۔" گھنشیام داس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کو تو ہر وقت مذاق کی ہی سوجھتی رہتی ہے۔" شانتا بولی۔

"مذاق نہیں شانتا، تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ بیس ہزار سے کم نہ لوں گی۔"

اتوار کے دن گھنشیام داس اپنی پتنی شانتا اور بیٹے کے ساتھ رام ناتھ جی کے گھر پہنچے۔ رسمی تعارف کے بعد گھنشیام داس نے کہا:

"آپ کی بیٹی کرونا میری بیٹی وندنا کی سہیلی روپا کے ساتھ گزشتہ ہفتہ میرے گھر آئی تھی۔ میری پتنی شانتا کو کرونا بہت پسند آئی۔ آپ کی بیٹی شادی کے قابل تو ہو ہی چکی ہے۔"

گھنشیام داس کی بات سن کر رام ناتھ بُجھ سے گئے۔ اسی وقت کرونا بھی کمرے میں داخل ہوئی اور سامنے بیٹھے روی کو دیکھ کر واپس جانے ہی والی تھی کہ اُس کی ماں نے آواز دی۔

"بیٹی کرونا! یہ وندنا کی ماں ہیں۔ ابھی پچھلے ہی دنوں جن کے گھر تو گئی تھی۔"

کرونا نے واپس آکر ادب سے ان لوگوں کو نمستے کیا اور وندنا کی ماں سے معذرت کرتے ہوئے بولی ـ "معاف کیجئے! میں نے آپ کو دیکھا نہ تھا" اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

کرونا کی ماں نے کرونا سے کہا۔ جاؤ بیٹی ناشتہ اور چائے لے آؤ۔"

گھنشیام داس نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا،

"ہاں تو رام ناتھ جی، بیٹی کے لئے کہیں رشتہ تلاش کیا کہ نہیں"؟

رام ناتھ بولے ـ "کیا بتاؤں گھنشیام داس جی رشتے تو بہت سے آئے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ زمانہ کی ترقی کی رفتار کیا ہے، سائنسدانوں نے تفریح کے لئے ریڈیو اور ٹیلیویژن ایجاد کئے، تفریح کے لئے اسکوٹر اور موٹر سائکلیں بنائیں، سہولت اور وقت کی بچت کے لئے، مادّی عیش و آرام کے لئے فرج اور نہ جانے کیا کیا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ سب چیزیں دان دہیج میں دینے کے لئے بنائی گئی ہیں جس کو دیکھو وہی ان چیزوں کی فرمائش کر رہا ہے، ابھی پچھلے دنوں ایک شرما جی آئے تھے اور دہیج کی ایک لمبی فہرست لکھا گئے، اُوپر سے منگنی کی رقم الگ۔"

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

سیدہ شانِ معراج
تارین گلی، شاہجہاں پور

غزل

ہمیں تو اپنی ہی آب و ہوا نہ راس آئی
وفا پسند تھی لیکن وفا نہ راس آئی

وفا کے لفظ و معانی میں فرق تھا شاید
بہت عجیب تھی اسکی دعا نہ راس آئی

گذر گئی جو مرے سر سے بے نیازانہ
رفاقتوں کی وہ کالی گھٹا نہ راس آئی

ہم اپنی ذات کے زنداں میں سانس لینے لگے
جب اُس کے قرب کی بادِ صبا نہ راس آئی

نہ التفات کا موسم نہ بے رُخی کی فضا
ہمیں تو وقت کی کوئی ادا نہ راس آئی

●●

رفیق الزماں
معرفت بھارت ٹریڈرس
۲۷-۱۱ سی، برانہ روڈ، کانپور

غزل

میرے سر کے واسطے ایسی سزا رکھتا ہے کون
آستینوں میں کہیں خنجر چھپا رکھتا ہے کون

سبز شاخوں پر سنہری پھول سے کھلنے لگے!
لب بہ لب موسم اثر، ایسی دعا رکھتا ہے کون

یہ جو میری ذات میں بیٹھا ہوا ہے، میں نہیں
مجھ کو میرے روبرو مجھ سے جدا رکھتا ہے کون

فرشِ گل کس نے بچھایا ہے یہاں میرے لیے
میرے سر پر آسمانوں کی ردا رکھتا ہے کون

جو بھی ہے میرا عمل وہ بھی عمل میرا نہیں
پھر بھی میرے نام سے سب کچھ لکھا رکھتا ہے کون

جانے والا جا چکا منھ موڑ کے برسوں ہوئے
دل کی چوکھٹ پر مگر اب بھی دیا رکھتا ہے کون

رکھ دیا دیر و حرم میں اس کو رکھنے کو رفیق
دیکھنا! میری طرح میرا خدا رکھتا ہے کون

●●

ندیم عرشی امروہوی
معرفت ڈاکٹر شبیر احمد
منہاری اسٹریٹ فرخ آباد

غزل

قدم قدم دشواری رکھ
تھوڑی سی خودداری رکھ

سب سے ہنس ہنس کر مت مل
کہیں کہیں بیزاری رکھ

سانس نہ بوجھل ہو جائے
بس اتنی ہشیاری رکھ

سچائی سے آنکھ ملا
سپنوں سے مت یاری رکھ

بے مقصد کیوں زندہ ہے
سر پر ذمہ داری رکھ

آہستہ آہستہ چل
سانسوں میں ہمواری رکھ

خود کو تو پہچان ندیم
لہجے کو معیاری رکھ

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: **پہلا قدم** شاعر: رمیش نرائن سکسینہ گلشن بریلوی، قیمت: بیس روپے، ملنے کا پتہ: دانش محل امین آباد لکھنؤ، ۲/۱۱ علی گنج ہاؤسنگ اسکیم لکھنؤ

پہلا قدم جناب رمیش نرائن سکسینہ گلشن بریلوی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو کل ہند فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا ہے۔ گلشن بریلوی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کوی سمیلنوں میں شرکت اور ہندی کویتاؤں سے کیا تھا، مگر نہ جانے کن اسباب اور علل کی بنا پر انھوں نے ایک "بے نام سی تشنگی" برابر محسوس کی اور جب وہ بحیثیت سامع مشاعرے میں پہنچے تو جیسا کہ انھوں نے خود" اپنے بارے میں" لکھا ہے اردو کی مٹھاس، نرمی، برجستگی، بانکپن اور ردیف وقافیہ کی چمک دمک نے اور مختلف بحروں نے میرے دل و دماغ پر جادو کا سا اثر کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اردو میں شعر کہنا شروع کر دئے" اور معروف شاعر جناب کرشن بہاری نور لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء سے لے کر سال گذشتہ تک انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس کا انتخاب پہلا قدم میں شامل ہے۔

گلشن بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر ہیں اور مجموعی طور پر کاروبار شوق کے مختلف مراحل کو اپنے اشعار میں آئینہ دکھلاتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل دور حاضر میں نئے امکانات اور نئی جہتوں سے آشنا ہو چکی ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو اس نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے مگر اس کا یہ عالیشان قصر جن بنیادوں پر تعمیر ہوا ہے وہ وہی ہے جس میں محبت کی گفتگو محبت کی زبان میں کی جاتی ہے۔ گلشن بریلوی غزل کے اسی بنیادی عنصر اور عشقیہ مزاج کے وارث ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ ایک صدی دوسری صدی کو منتقل کرتی رہی ہے۔ اور جس میں وقتاً فوقتاً بصائر اور تاملات کے عنوانات بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک خوشگوار پہلو جو ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت کے ساتھ ساتھ جو اردو شعر و ادب میں فارسی کے توسط سے منتقل ہوئی ہے، ہندوستانی روایتیں اور مابعدالطبیعاتی فلسفہ کے بھی اثرات ان کے کلام میں نظر آتے ہیں ؎

اس جنم میں تو کوئی سانس گنہگار نہیں
زندگی پہلے گناہوں کی سزا ہو جیسے

شاید ہی کسی جنم میں ہو پائے میسّر
اس جنم میں جو پیار مجھے تو نے دیا ہے

جنم مرن کا یہ چکّر بھی اک انوکھا ہی چکّر ہے
سکھ دکھ سہنا، جینا مرنا کب تک آخر کب تک

آواگون اور تناسخ کا یہ فلسفہ اردو غزلوں کے لیے ایک نیا موضوع ہے جو گلشن کے استاد جناب کرشن بہاری نور کے علاوہ اور شاید کسی کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

پہلا قدم جیسا کہ نام سے ظاہر ہے گلشن صاحب کا شاہراہ ادب پر پہلا قدم ہے۔ مگر جس اعتماد اور خوش اسلوبی سے انھوں نے اپنا پہلا قدم جمایا ہے اس سے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ ان کا اگلا قدم کامیابی اور کامرانی کی منزلوں کی طرف کئی قدموں کے برابر ہوگا۔ کتاب کی طباعت، کتابت اور گرد پوش معیاری ہے، اسی لیے بڑے اعتماد سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کتاب کی قیمت مناسب اور معقول ہے۔

—— ملک زادہ منظور احمد

نام کتاب: **غبار صحرا** شاعر: مہدی حسین ناصری مرحوم مرتب: وقار ناصری قیمت: پچیس ۲۵ روپے ملنے کا پتہ: وقار ناصری، تہنیت محل، حسین آباد، لکھنؤ

لکھنؤ کا وہ دور بھی یادگار تھا جب یہاں کے شعر و ادب پر عزیز، صفی، ثاقب، یگانہ، محشر، ناطق، قتیل وغیرہ کی حکمرانی تھی۔ اساتذہ کے اس گروہ کو پیرو غالب و میر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی گروہ کے معتبر ناموں میں مہدی حسین ناصری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس گروہ کی سرگرمیوں میں اس وقت اور بھی جان پڑ گئی تھی جب بہار سے مراجعت کر کے آنے والے ایک نوجوان شاعر

یاسؔ عظیم آبادی نے خود کو آتش پرست قرار دیتے ہوئے، ان اساتذہ کی زبان دانی کو للکارا تھا اور تب لکھنؤ میں اپنے طرز کی انتہائی دلچسپ ادبی مجادلہ آرائی کی بنیاد پڑی تھی۔ مرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی نے اپنے ایک خط میں دوسرے اساتذہ کے ماسوا ناصریؔ کا بھی ذکر کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی ہے کہ ان حضرات نے انھیں گھر سے بے گھر کر دیا۔

مہدی حسین ناصریؔ اس دور کے انتہائی اہم شاعر ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی زبان دانی اور نازک خیالی کا پورا احترام کرتے ہوئے، پیرویٔ غالبؔ و میرؔ ہونے کے ناطے اپنے کلام میں تفکر کو اس طرح جگہ دی کہ ڈاکٹر اعجاز حسین جیسے ممتاز نقاد کو (جنھیں ناصریؔ مرحوم کا شاگرد رشید ہونے کا فخر بھی حاصل ہے) یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ انھوں نے "تارِ رگِ جاں کو مضراب سے چھیڑا ہے"۔

جناب مہدی حسین ناصریؔ کو پیارے صاحب رشیدؔ جیسے استاد سے تلمذ کا فخر حاصل تھا۔ ایسے ممتاز لکھنوی شاعر کا مجموعۂ کلام "نذرِ احباب" کے نام سے مدتوں پہلے شائع ہوا تھا۔ اب اُن کے ہی خانوادے کے ایک معتبر رکن جناب وقار ناصری نے "غبارِ صحرا" کے عنوان سے ان کی غزلوں کا انتخاب شائع کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ جناب ناصریؔ کا کلام تاثیر میں ڈوبی ہوئی ایسی حدیثِ دل ہے، جسے پڑھ کر بے اختیار دل سے آہ نکلتی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے کلام کی تہہ داری اپنا اثر دکھائے بنا نہیں رہتی۔ اور آج کے ماحول میں بھی یہ اشعار تڑپا دیتے ہیں ؎

آنکھوں سے خوں رواں ہوا دفتر الٹ گیا
اب اور ضبط کیا ہو، کلیجہ تو پھٹ گیا

کھلے ہیں زخمِ جگر، قلب داغ دار ہے آج
ہمارے باغ میں دیکھو عجب بہار ہے آج

کنجِ فرقت سے لحد تک کیا سماں تھا ناصریؔ
میں جہاں پہنچا، وہاں سارا جہاں خاموش تھا

اور ان کا ایک شعر تو تمام عالم کی زبان پر ہے:

ناصریؔ قبر پہ عبرت کے لیے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے

کتاب کے آخر میں سید حامد حسن بلگرامی کا مضمون "ناصریؔ مرحوم" بھی شامل کر دیا گیا ہے جنھوں نے ناصریؔ مرحوم کی شاعری پر نہایت تاثراتی انداز میں نظر ڈالی ہے۔ کتاب کی کتابت اور سرورق عمدہ ہے۔

—— شہنشاہ مرزا

نام کتاب: معلم اردو (ہندی کہانی نمبر (۱))
قیمت: ۵ روپے ملنے کا پتہ: جرنلسٹس پبلی کیشنز ۱۹/۵۰۰ راما دھین، سنگھ روڈ، لکھنؤ

'معلم اردو' کے اس 'ہندی کہانی نمبر' میں ہندی کے اچھے لکھنے والوں کی کہانیوں کا ایک اچھا انتخاب اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی کہانی طرح طرح کے تجربات سے گزر رہی ہے اور زندگی کی صحیح ترجمانی اور گرد و پیش کی عکاسی میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نظریات و تحریکات سے وابستگی کے بجائے سچائی کی تلاش اور حقیقت کی جستجو کی روح کارفرما ہے اور وہ زندگی اور سماج پر اپنی گرفت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہے۔

نمبر کے شروع میں کملیشور اور ہندی کے ممتاز افسانہ نگاروں اور ناقدوں کی قیمتی آرا بھی درج کر دی گئی ہیں جن سے نئی ہندی کہانی کے مختلف رجحانات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

رینو کی کہانی انسانی نفسیات میں سادگی اور پیچیدگی اور جدت و قدامت کی کشمکش کی آئینہ دار ہے۔

مدرا راکشس کا نام اردو والوں کے لیے نامانوس نہیں ان کی کہانی 'ہم سب نسارام' سماجی پستی، گرتی ہوئی اخلاقی سطح اور سیاست کی ابتری اور عام آدمی کی پریشانیوں اور مجبوریوں کی بہترین تصویر ہے۔

ممتا کالیا نے افسانہ 'ناشتہ' میں مڈل کلاس کے نئے رجحان اور نو دولتیوں کے مزاج کی صحیح عکاسی کی ہے۔

کمل اسل نے "اسپیڈ بریکر" میں زندگی کی یکسانیت اور بوریت کو بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر 'معلم اردو' کا یہ 'ہندی کہانی نمبر' ہر طرح کامیاب ہے اور دوسرے اردو رسالوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے ذریعہ اردو اور ہندی کو قریب لانے کی ایک پسندیدہ کاوش سامنے آئی ہے۔

—— شمس تبریز خاں

نام کتاب: ترش و شیریں (شعری مجموعہ) شاعر: اصغر لکھنوی
قیمت: اٹھارہ روپے۔ ملنے کا پتہ: مرزا اصغر حسین،
۱۳۲۔ اشرف آباد، دین دیال روڈ، لکھنؤ ۳

اصغر لکھنوی ایک مزاحیہ شاعر ہیں۔ اُن کا یہ مجموعۂ کلام ۵۲ ہزلوں، ۱۴ نظموں، ۱۹ لطیفوں، ۵ ۲ قطعوں پر مشتمل ہے۔
یوں تو ان کی زیر تبصرہ کتاب کا ہر شعر طنز و مزاح سے معمور ہے، لیکن ان کی کچھ نظمیں، بعض لطیفے اور چند قطعے اُن کی گوشہ نشین شاعری کو ادبی حلقوں میں روشناس کرانے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے اشعار میں طنز کے تیر و نشتر ضرور ہیں مگر مزاح کی شیرینی نے انھیں ذوقِ سماعت کے لیے خوشگوار بنا دیا ہے۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہزلیہ شاعری وقتی لطف اندوزی یا رکاکت و ابتذال سے معنون ہوتی ہے۔ اصغر لکھنوی کی صاف ستھری شاعری کو اس الزام کا اندیشہ نہیں ہے۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر اصلاحی ہے۔ ان کا جذبہ تعمیری ہے، تخریبی نہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کی طرح اصغر لکھنوی بھی مغربی طرزِ معاشرت سے بیزار اور مشرقی تہذیب و تمدن کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کے فن سے جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ اپنی عقیدت کا نمایاں اظہار بھی کیا ہے۔
مجموعی اعتبار سے "ترش و شیریں" ایک ادبی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ —— مصطفیٰ فطرت

نام کتاب: دس کہانیاں (بچوں کے لیے)
مصنف: ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی، قیمت: ۵ روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل امین آباد۔ لکھنؤ

دس کہانیاں میں مصنف کی طبع زاد کہانیوں کے علاوہ ایک عربی، دو انگریزی اور ایک روسی لوک کتھا کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

بچوں کے لیے کتابیں اور لٹریچر تیار کرنے کا جہاں تک تعلق ہے ملک کی تمام قومی زبانوں میں (سوائے اردو کے) تیزی سے کام ہو رہا ہے۔
اردو میں اس سمت بہت سرد مہری نظر آرہی ہے جس کے متعدد اسباب ہیں جن میں ہمارے مصنفین کی بچوں کی طرف سے بے اعتنائی بھی شامل ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کچھ لکھنا شجرِ ممنوعہ سمجھ رکھا ہے۔ جو لوگ اس سمت بڑھے بھی تو ان کا کام صرف پارٹ ٹائم کی حیثیت رکھتا ہے۔ چند لوگ ضرور ایسے ہیں جو بچوں کے لیے سنجیدگی سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی بھی ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے ذہن میں کوئی ایسی چیز بٹھانے کی کوشش نہیں کی جو عجوبہ ہو اور ان کے لیے قابل قبول نہ ہو۔
وہ بچوں کو تخیلاتی دنیا کی سیر نہیں کراتے ہیں بلکہ اسی دھرتی کے واقعات اور انسان کی روزمرہ کی زندگی سے کہانیاں چن کر ان کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں کچھ سکھاتے بھی ہیں۔
انھوں نے بچوں کو بھوت پریت اور دیو جیسے توہمات سے دور رکھا ہے۔ ان کی کوشش حقیقت پسندانہ ہے۔
بچوں کے لیے لکھنا بڑا مشکل کام ہے، بڑی ذمہ داری برتنی پڑتی ہے۔ بہت نچلی سطح پر اتر کر خود بچہ بننا پڑتا ہے۔ اس کی فکر، اس کی زبان اور اس کی عادتوں کو سامنے رکھ کر ناپ تول کر لکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی نے اس کا خیال رکھا ہے اور تمام کہانیوں میں آسان زبان اور چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کیے ہیں۔
کاش مصنف نے "سال گرہ کا تحفہ" اور "گریبی بلیک اور اس کا عجیب کیک" کہانی میں مبارکباد کے جملے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کو انگریزی میں نہ لکھا ہوتا۔ اگر لکھا بھی تھا اسے اردو رسم خط میں لکھا ہوتا اور ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی کر دیا ہوتا کیونکہ دیہی علاقوں کے اس عمر کے بچوں کے علاوہ شہر کے بھی ایک طبقے کے بچے اتنی انگریزی

نہیں پڑھ سکے ہیں۔

—— قطب اللہ

نام کتاب: فکر گل افشاں (شعری مجموعہ)
شاعر: شمیم بارہ بنکوی، قیمت: ۱۵ روپے، ملنے کا پتہ: دانش محل امین آباد لکھنؤ

"فکر گل افشاں" جناب شمیم بارہ بنکوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جس کا پیش لفظ اردو کے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے لکھا ہے۔ شمیم صاحب نے حسن و عشق کے مضامین کو سادگی، جدت اور ندرت کے ساتھ فکر انگیز سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

ان کی شاعری میں زمانے کا کرب ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں عشق کی تڑپ یاس و حرماں اور محرومیوں کا سیل رواں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں ایک حوصلہ بھی ہے جوش بھی ہے اور اس عہد کے مسائل سے مقابلہ کی طاقت بھی۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے فرار کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے نرم و گرم سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بخوبی دیکھا ہے۔ وہ اس کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کا تجزیہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنا رشتہ ماضی سے بھی جوڑے ہوئے ہیں اور حال سے بھی واقف ہیں اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان کا رنگ شاعری کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے حسب ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کس قدر تعلق ہے ہجر اور آہوں میں
کاروانِ الفت ہے غم کی شاہراہوں میں

ایک پیکرِ خاکی اور یہ کرم تیرا
ڈوب کر نہ رہ جائے آدمی گناہوں میں

ایک دن منزلِ مقصود قدم چومے گی
دوستو راہِ مساوات کو ہموار کرو

مجھے امید ہے کہ شمیم صاحب کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا اور عام قارئین کے معیار پر بھی پورا اترے گا۔

—— رضوانہ سیفی

تیری باتیں ہیں کہ نغمے .... صفحہ ۳ کا بقیہ

بیٹھنے کا شرف حاصل کیا تھا، پتہ نہیں کہ وہ اس پر فخر کریں گی لیکن سچ یہ ہے کہ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

بوجھ —— صفحہ ۴۳ کا بقیہ

اشانے گفتگو کرونا، چائے اور ناشتہ لے کر آگئی۔

روی نے کرونا کو بغور دیکھا، گویا مانگی مراد مل گئی ہو۔ شانتا نے بیٹے سے سرگوشی میں پوچھا۔ "لڑکی پسند ہے؟"

روی نے کرونا کے ہاتھوں سے چائے کا مگ لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ کرونا تو ماں بیٹوں کے اشاروں، کنایوں کو سمجھ چکی تھی، جھینپتے ہوئے اور لبوں پر تبسم بکھیرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

گھنشیام داس چائے کا خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے بولے:

"مسٹر رام ناتھ ان باتوں کو چھوڑیئے، لڑکی ہمیں پسند ہے۔ ہم آپ سے کچھ مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی فرمائش — آج سے کرونا میری بیٹی ہے۔ کیا میں رشتہ منظور سمجھوں؟"

رام ناتھ کو گھنشیام داس کی باتوں پر یقین نہ آیا چہرے پر حیرت اور استعجاب کی کئی لکیریں ابھر آئیں اور ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ انھوں نے گھنشیام داس کے پیر پکڑ لیے۔ گھنشیام داس بھی آبدیدہ ہو گئے اور انھیں اٹھا کر فرطِ مسرت سے بغل گیر ہو گئے۔

جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دونوں کے چہروں پہ مسرت و شادمانی کی سرخی نمایاں تھی ∎∎



اتر پردیش کے وزیر تعلیم جناب سبط رضی "شیعہ وکلا کانفرنس" کے زیر اہتمام
شاہ نجف لکھنؤ کے سبزہ زار پر ۲۸ اپریل کو منعقدہ جشن یادِ علیؑ کے
موقع پر تقریر کرتے ہوئے۔

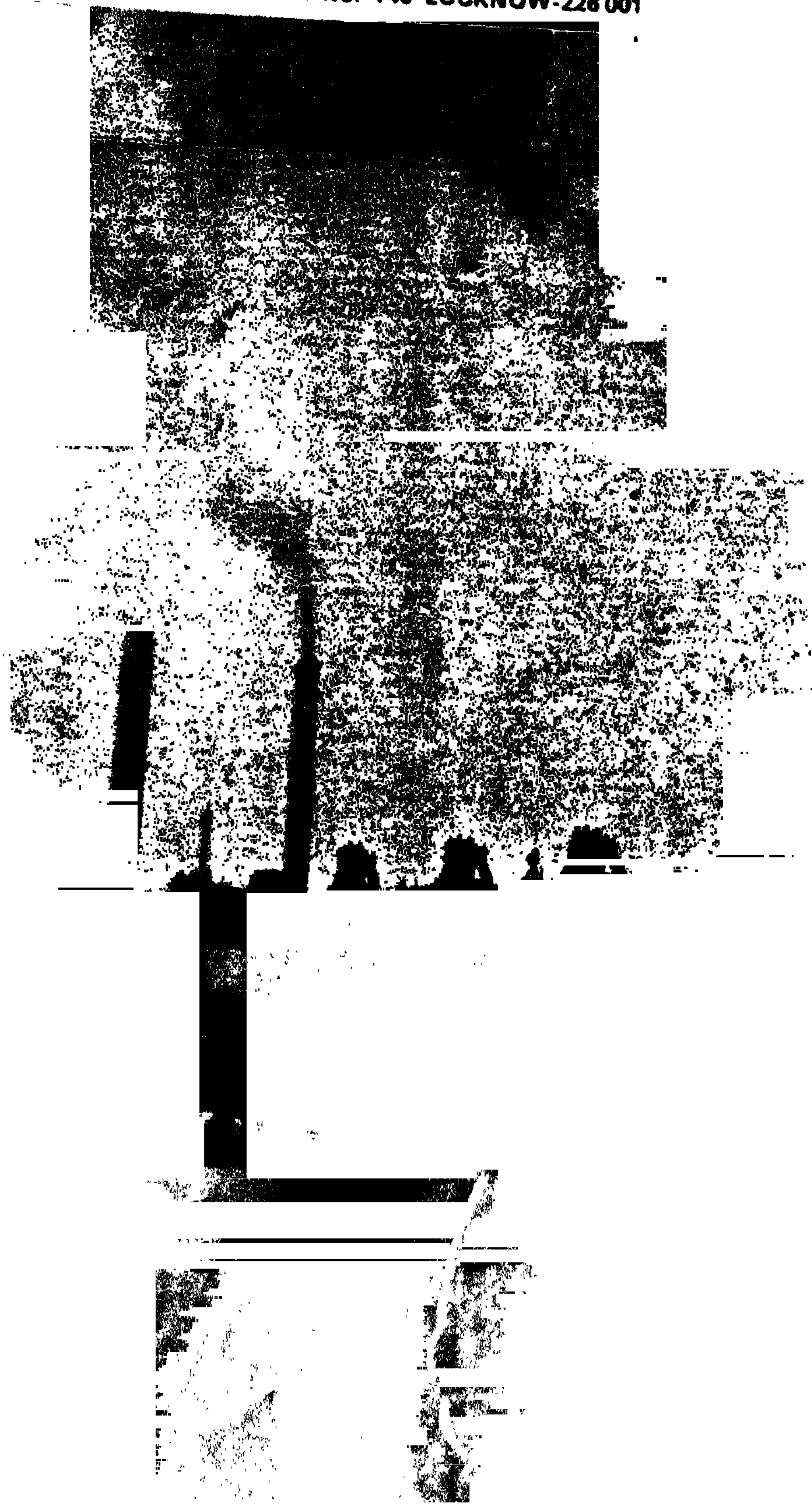
Vol. . ., No. 2
MAY, 1985
Rs. 1-00 Paisa

Urdu Monthly

REGD. No. LW/NP-444
Annual Subs.
Rs. 10/-

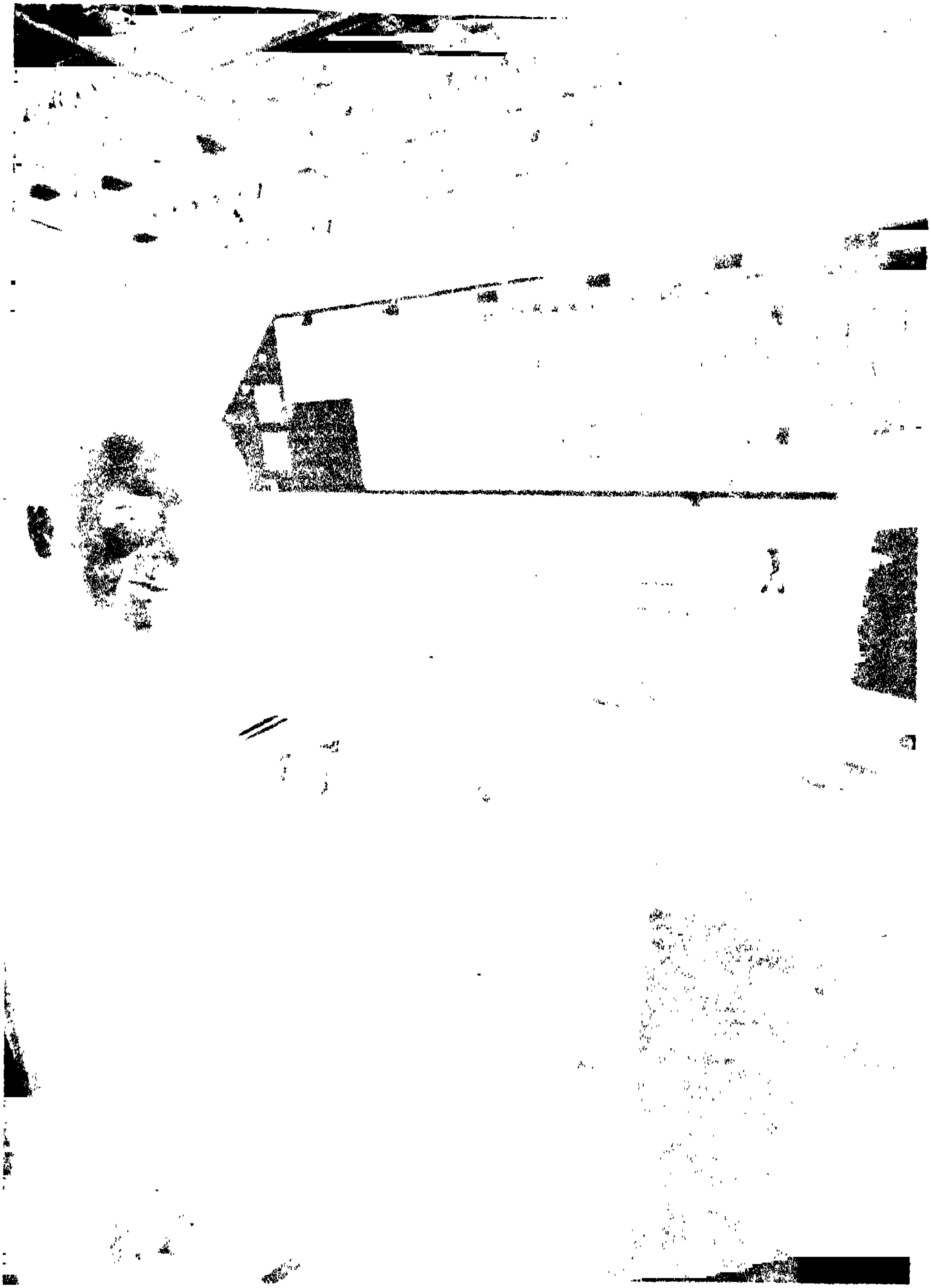
NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226 001



نیا دور

جون - جولائی ۱۹۸۵ء



وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۱۵ رجون ۱۹۸۵ء کو ہاؤسٹن (امریکہ) میں اجرام فلکی سے متعلق تربیتی ادارے میں

عنوانات

جلد ۴۰ نمبر ۵-۶

جون۔ جولائی ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

فون:
ایڈیٹر: ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: ۴۷۱۰۸

پبلشر:
پرشانت کمار مشرا

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

مطبوعہ:
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ

زرِ سالانہ: دس روپے

[illegible]

خط و کتابت کا پتہ ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۷۔ لکھنؤ

[illegible]

[illegible]

اپنی بات

اتر پردیش کا ۸۶-۱۹۸۵ کا سالانہ بجٹ ۱۲ جولائی ۸۵ کو ریاستی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس بجٹ کی چند اہم اور قابل ذکر خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

- اتر پردیش کے سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے سالانہ منصوبہ کا حجم سابقہ برس کے منصوبہ سے ۹٫۴ فیصد بڑا ہے۔ اس سال ۱۷۰۵ کروڑ روپیہ کے مصارف کی تجویز ہے جس میں پہاڑی علاقہ کی ترقی کے لیے ۱۷۰ کروڑ روپیہ مختص ہے۔
- ریاست کے ساتویں پنج سالہ منصوبہ کے لیے ۱۱۰۰۰ کروڑ روپیہ مختص کیا گیا ہے جو چھٹے پنج سالہ منصوبے کے حجم سے ۷۷٫۴ فیصد زیادہ ہے۔
- سال رواں کے دوران ۳۱٫۸ لاکھ میٹرک ٹن اناج پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔
- چاول کی پیداوار بڑھانے کے لیے ساتویں منصوبہ میں ۲۴ اضلاع کے ۱۰۲ ترقیاتی بلاکوں میں ایک پائلٹ اسکیم چلائی جائے گی۔
- دیہی علاقوں میں اس سال ۴۴٫۸۳۲ لاکھ یوم کے بقدر روزگار مہیا کیا جائے گا۔
- سال رواں کے دوران ۱۶ بڑی منڈیوں، ۸ ذیلی دیہی منڈیوں اور ۴۰ دیہی گوداموں کی تعمیر کی تجویز ہے۔
- دیہی علاقوں میں کمزور طبقے کے خاندانوں کی مالی حالت بہتر بنانے کی غرض سے ہر گاؤں میں خاندانوں کا ایک رجسٹر تیار کیا جائے گا اور رفتار ترقی کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا۔
- سال رواں کے دوران دیہی علاقوں میں رہائشی سہولتوں کی توسیع کے پروگرام کے تحت ۲۰۰۰۰ مکان تعمیر کرنے کا نشانہ ہے۔
- ساتویں منصوبہ کی مدت میں بیہڑ علاقوں کے سدھار اور انھیں قابل کاشت بنانے کے کام کو اولین ترجیح دی جائے گی۔
- ساتویں منصوبہ کے دوران مزید ۱۴ لاکھ ہیکٹیئر رقبہ کے لیے آبپاشی صلاحیت پیدا کی جائے گی۔
- ریاست کی ۱۲۵ سال سے زیادہ پرانی اپر گنگا نہر کی جدید کاری کے کام کی رفتار تیز تر کی جائے گی۔ اس پراجکٹ کی تخمینی لاگت ۱۳۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔
- ساتویں منصوبہ کے دوران ۶۰۵۰ سرکاری ٹیوب ویلوں کی تعمیر کی جائے گی اور اس سال ۱۲۰۰ ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کا نشانہ ہے۔
- اس سال ۱۳۵۵۴ ملین یونٹ بجلی پیدا کرنے کا نشانہ ہے۔
- سال ۸۶-۱۹۸۵ کے آخر تک ۶۳۳۳ مواضعات میں بجلی پہنچ جائے گی۔
- ساتویں منصوبہ کے دوران ایک لاکھ چھوٹی اور دیہی صنعتیں قائم کرنے کا نشانہ ہے۔
- اس سال علی گڑھ میں تالا نگر اور آگرہ میں چمڑا بستی قائم کی جائے گی۔ مرزاپور میں اتر پردیش براس ویئر کارپوریشن کی جانب سے ایک رولنگ مل قائم کی جائے گی۔
- ضلع ایٹہ میں ایک نئی اسپننگ مل قائم کی جائے گی۔ بلیا، جون پور اور غازی پور میں کتائی ملیں قائم کی جارہی ہیں۔
- تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو ۲۵۰۰۰ روپیہ تک کے بنک قرضے دینے کی اسکیم اس سال بھی جاری رہے گی۔
- شہری علاقوں میں چھوٹے صنعت کاروں کو ۶۵۰۰۰ روپیہ تک کے قرضے دلائے جائیں گے جن میں سود گرانٹ ریاستی حکومت دیگی۔
- اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو صنعتوں کی جانب راغب کرنے کے لیے ایک اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن قائم کیا گیا ہے۔
- فرقہ وارانہ فسادات اور ڈکیتیوں کی موثر روک تھام کے لیے پی۔ اے۔ سی کی ۲۹ بٹالینوں میں ۳۳ کمپنیاں بڑھائی گئی ہیں۔ ان کے لیے فسادات پر قابو پانے کی غرض سے جدید ساز و سامان کا بندوبست کیا جارہا ہے۔
- کرایہ پر رکشا چلانے والوں کو بنکوں کی امداد سے اپنے رکشے حاصل کرنے کی سہولت دی جائے گی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک خالص عملی بجٹ ہے جس میں کوئی بلند بانگ دعوے نہیں کیے گئے ہیں۔ اس بجٹ میں ریاست کے اپنے وسائل کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے اور ٹھوس بنیادوں پر ہی ترقیاتی پروگراموں کی تکمیل کے نشانے مقرر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں، شہری علاقوں کے چھوٹے صنعت کاروں اور اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے اور اپنی صنعت قائم کرنے کی غرض سے قرض اور مالی امداد فراہم کرنے کے واسطے خصوصی بندوبست کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ دوسروں کے رکشے کرائے پر چلانے والوں کو بھی بنکوں کے توسط سے ایسی سہولت مہیا کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے جس کے تحت وہ خود رکشوں کے مالک ہوجائیں گے۔

——— ایڈیٹر

غزلیں

وامق جونپوری

لال کوٹھی، پوسٹ کچگاؤں
جون پور

نہ اُلجھیں ظلمتوں میں شمعِ دل جلائیں سب
ہوں فتنے بند تو ہم بخش دیں خطائیں سب

جہاں سے آئے نظر صاف گلستاں کی بہار
انھیں بلندیوں پہ آشیاں بنائیں سب

یہ رات اژدہے کا بطن ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ
دکھائی دیتا نہیں راہیں چھائیں چھائیں سب

ہر ایک سانس میں بارود سا مہکتا ہے
بدل نہ جائیں کہیں شعلوں میں ہوائیں سب

ہجوم بڑھتا چلا جا رہا ہے سڑکوں پر
سلامتی ہے اسی میں کہ بائیں جائیں سب

نظر کے کانٹوں میں تلتی ہیں حسن کی قدریں
کسی بھی جسم پہ سجتی نہیں قبائیں سب

کوئی اسیروں کو پہچان لے نہ خوشبو سے
بس اک ردا کے لیے چھن گئیں ردائیں سب

جو بزمِ شعر سے اُٹھ اُٹھ کے جا رہے ہیں انھیں
غزل سناؤ اک ایسی کہ لوٹ آئیں سب

نظامِ عدل ہے وامق مثالِ کج دمِ سگ
جدید جرم پرانی مگر سزائیں سب

ڈاکٹر مدحت الاختر

نیا گودام، کامٹی - ۴۴۱۰۰۱

مجھ کو بُرا بنا کے وہ اچھا تو بن گیا
اچھا ہوا چلو کوئی بگڑا تو بن گیا

لوگوں نے مجھ کو روند دیا اس کا غم نہیں
کچھ بھیڑ کم تو ہو گئی رستا تو بن گیا

ڈھلنا مرے نصیب میں شاید لکھا نہیں
میں تیرے انتظار کا سایا تو بن گیا

اب بھی چمن سے میرے نکلنے کی بات ہے
ہر پھول میرے پاؤں کا کانٹا تو بن گیا

کیا اس کو بے وفائی کا الزام دیجیے
بنتا نہ تھا کسی کا خود اپنا تو بن گیا

اب اور کیا بنائے گی تیری خوشی مجھے
ایسا کبھی میں تھا نہیں ایسا تو بن گیا

ڈاکٹر ابو محمد سحر
۳۹ مالی نگر
بھوپال ۱۰

اردو کے قاعدے

اردو میں جدید لسانیات اور صوتیات کی باریابی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن ان علوم کی بنا پر اردو رسم الخط اور درس و تدریس کے روایتی طریقوں کی تنقید میں جو غیر متوازن اور غیر دانشمندانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے اس سے اردو کی ابتدائی تعلیم میں نئی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ بعض اہل لسانیات نے اپنے خیالات کے ذریعے سے اردو رسم الخط، حروف تہجی اور نظام املا وغیرہ کی بنیادیں اس طرح ہلا دی ہیں کہ ان کو سنبھالنا آسان نہیں۔ ایسی صورت میں شاید وہی لوگ کسی حد تک یکسوئی سے اردو کی تعلیم دے رہے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "بسم اللہ کے گنبد میں بند ہیں"۔ لیکن مجموعی حیثیت سے اس گنبد کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زبان اور علم زبان سے روایتی دلچسپی رکھنے والوں میں بھی منطقی اور اصلاحی طرز فکر وقتاً فوقتاً حد اعتدال سے گزرتا رہا ہے اور تشکیک و تذبذب اور تغیر و تبدل کی خواہش نئے نئے گل کھلاتی رہی ہے۔

آج کل اردو کے جو قاعدے آسانی سے دستیاب ہیں ان میں سے ۱۵ قاعدے میرے پیش نظر ہیں۔ ان قاعدوں میں بعض پرانے قاعدے بھی ہیں۔ سب سے پرانا قاعدہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا ہے۔ ایک کتاب ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانے کی ہے۔ ان کے علاوہ میرے سامنے تین اور قاعدے جو اب مروج نہیں ہیں چالیس پچاس سال پہلے کے ہیں۔ ان میں سے دو قاعدے تعلیم بالغاں سے متعلق ہیں۔ اردو میں قاعدے کثرت سے لکھے اور چھاپے جاتے رہے ہیں۔ ان کی تالیف و اشاعت میں تجارتی پہلو بھی رہا ہے لیکن متعدد افراد اور اداروں نے ان کی طرف علمی اور تعلیمی پہلوؤں سے بھی برابر توجہ دی ہے۔ اگر عہد بہ عہد کے قاعدوں کو جمع کر کے جائزہ لیا جائے تو اردو میں قاعدہ نویسی کے ارتقا کی مفصل کیفیت سامنے آ سکتی ہے۔ یہاں دراصل مروجہ قاعدوں پر نگاہ ڈالنا مقصود ہے کیونکہ آج کل اردو کی ابتدائی تعلیم کا انحصار انھیں پر ہے۔

اردو کے قاعدوں کو دیکھنے سے سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حروف تہجی متعین نہیں ہیں۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے تک "لام الف" کو شامل کر کے حروف با ترتیب میں انتالیس (۳۹) حرف درج کیے جاتے تھے۔ دو چشمی ہے کے بعد ایک اندراج ہائے مدورہ اور دو چشمی ہے کی مختلف ملواں شکلوں کا ہوتا تھا اور ایک ہمزہ کی دوسری شکل (ء) کا۔ اس طرح اکتالیس (۴۱) اندراج ہوتے تھے۔ موخر الذکر دونوں اندراج حروف با ترتیب میں زائد بھی تھے۔ اور غیر فطری بھی، کیونکہ یہ علاحدہ حروف تہجی نہ تھے بلکہ ہائے مدورہ اور ہمزہ کی مختلف شکلوں پر مشتمل تھے۔ لام الف کو شامل کر کے حروف تہجی کی تعداد انتالیس (۳۹) ہی تھی۔

اردو حروف تہجی میں لام الف کی شمولیت محض عربی کی تقلید تھی۔ عربی میں اس کی تشکیل کا لسانی جواز تھا، پھر اس سے انکار نہ کرنے میں ایک مذہبی پہلو بھی شامل ہو گیا۔ فرہنگ آصفیہ[1] میں "لام الف" کے ذیل میں لکھا ہے:

> "عربی کا انتیسواں حرف جو لام اور الف سے بدیں وجہ مرکب ہو کر بنایا گیا ہے کہ کلام عرب

میں چونکہ ابتدا بساکن محال ہے اور الف ہمیشہ ساکن مانا گیا ہے، علیحدہ نہیں لکھا جا سکتا تھا، پس اس کے واسطے یہ شکل مقرر کرکے لا۔ لام الف ایک حرف ہی قرار دے لیا۔ عربی حروف تہجی میں جو اوّل حرف ہے اس کو اسی واسطے عرب والے ہمزہ کہتے ہیں کیونکہ وہ بذاتہٖ متحرک ہے۔ جن لوگوں نے اس میں انکار کیا ان کو رسول مقبول نے مردود کہا۔"[1]

عربی میں لام الف کی صورت میں دو مقررہ مفرد حروف کو ملا کر ایک حرف بنایا گیا ہے ورنہ دو آوازوں سے مرکب حروف بعض زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندی میں क्ष، श्र، ज्ञ، त्र اسی قبیل کے ہیں۔ سیّد احمد دہلوی کی روایت اگر صحیح ہے تو اسے عربی حروفِ تہجی کے لیے ماننا پڑے گا۔ اردو میں اگر اور پہلے نہیں تو انیسویں صدی کے وسط میں لام الف حروف مفردہ میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ غالبؔ نے حروف کی تذکیر و تانیث کے بارے میں ۱۸۵۶ء کے ایک خط میں لکھا ہے:

"لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔"[2]

لیکن اردو کے قاعدوں میں لام الف بہت بعد تک حروف تہجی میں پابندی سے شامل کیا جاتا رہا ہے۔ صفدر آہؔ سیتاپوری نے غالباً ۱۹۳۰ء میں اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا:

"میرے نزدیک اردو حروف میں اس کو بیکار شامل کر لیا گیا۔ لؔ اور الفؔ دو علیحدہ حرف ہیں جن کو وصل کرکے ایک مستقل حرف بنانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمیشہ اصولاً حرف کو مفرد ہونا چاہیے۔ جن تحریروں کے حروف مرکب ہوتے ہیں ان کا درجہ نہایت پست ہے۔"[3]

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے قاعدے میں لام الف شامل ہے لیکن دوسرے بیشتر مروّجہ قاعدوں میں اس کا اندراج پرانے قاعدوں کے زیر اثر ہے۔ عام طور پر یہ اردو کے قاعدوں سے خارج ہو چکا ہے۔ اگر قاعدہ نویس اس تغیر پر اکتفا کرتے تو حروف تہجی کی تعداد میں یکسانیت پیدا ہو جاتی یعنی لام الف کو حذف کرنے کے بعد اڑتیس[۳۸] حروف تہجی مقرر ہو جاتے۔ لیکن بدقسمتی سے دو حرف یعنی دو چشمی ہے اور ہمزہ پریشاں خیالی کا شکار ہو گئے۔ پندرہ مروّجہ قاعدوں میں سے آٹھ قاعدوں میں یہ دونوں، حروف باترتیب میں شامل کیے گئے ہیں۔ چار قاعدوں میں دوچشمی ہے نہیں ہے تو ایک میں ہمزہ نہیں ہے۔ دو قاعدوں میں حروف باترتیب کا اندراج نہیں کیا گیا۔ مختلف گروہوں میں جو حروف یکجا لکھے گئے ہیں ان میں دوچشمی ہے اور ہمزہ دونوں نہیں ہیں۔ مروّجہ قاعدوں میں زیادہ تر رجحان دوچشمی ہے اور ہمزہ کے اندراج کا ہے لیکن سب قاعدہ نویس اس کی طرف دھیان نہیں دیتے اور اس طرح انتشار باقی رہتا ہے۔

دوچشمی ہے اور ہمزہ کی طرح تو نہیں لیکن ایک محدود حد تک ترمیم و اختراع کے رجحان کی زد میں چند دوسرے حروف بھی آئے ہیں۔ ایک مروجہ قاعدے میں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حروف تہجی میں "ژے" نہیں ہے۔ بظاہر اس کے "زے" سے ہم صوت ہونے کا غلط خیال اثر انداز ہوا ہے۔ یہ حرف فارسی نژاد ہے اور اردو تلفظ میں بھی اس کی آواز منفرد ہے۔ اس قاعدے میں نون کے بعد نون غنّہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔[4]

یے کے سلسلے میں بھی خفیف سا الجھاؤ ہے۔ اس کی سرگذشت ذرا طویل ہے۔ پرانے املا اور طرز کتابت میں یہ حرف نصف بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ہائے مدوّرہ اور دوچشمی ہے اور یائے معروف و یائے مجہول کا ادلا بدلا غلط سمجھا جانے لگا تھا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے اواخر میں نصف یے لکھنا بھی ٹھیک نہیں مانا جاتا تھا۔ امیر مینائی نے امیر اللغات کے کچھ کتابت شدہ اوراق کی غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہائے مخلوط کا دوچشمی لکھنا کیا، یائے مجہول

و معروف کے لکھنے میں بھی کہیں کہیں نقصان ہے۔ ’ے‘ ہے ’کو کہیں نصف ’یے‘ سے لکھا ہے اور کہیں معکوس ہے اور ’ے‘ کو کہیں معکوس لکھا ہے اور کہیں یوں لکھا ہے: ’ئے‘[۳۰]

یائے مجہول اور کبھی کبھی یائے معروف کو نصف لکھنے کی روش ختم نہیں ہوئی تھی کہ نصف یے کو ماقبل مفتوح یے (ایسی یائے مجہول جس سے پہلے کے حرف پر زبر ہو) کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے قاعدے میں اس کو حروف با ترتیب میں تو داخل نہیں کیا لیکن مشق ۲۳ میں اس طرح جگہ دی ہے:

آی ای اے بَ بی بے

ذَ نی نے ہَی ہی رہے

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اولین مطبوعات میں لفظ کے آخر میں نصف یے اس نئے تصور کے مطابق ملتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انجمن نے الفاظ کے درمیان کی اعرابی ’یَ‘ کو الف اور واو کی طرح حرف منفصل قرار دیا تھا اور نصف یے (ی) کو ماقبل مفتوح یے کے لیے اختیار کیا تھا مثلاً بَیر یعنی دشمنی کا املا ”بَیر“ متعین کیا تھا۔ اس کی توثیق میری کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس (ناگپور، ۱۹۴۴ء) میں کی گئی تھی۔ اس کے مطابق انجمن کی مطبوعات میں ہے کہ ’ہی‘ کے کو ملا اور بے پور کو جے پور وغیرہ لکھا جاتا تھا۔

صفدر آہ نے جس طرح اردو حروف تہجی سے ایک حرف لام الف خارج کیا تھا اسی طرح صرف ایک حرف نصف یے (ی) کا اضافہ کیا تھا۔ انھوں نے یائے معروف (ی) کے بعد نصف یے (ی) بڑھا کر حروف با ترتیب میں انتالیس[۲۹] حروف درج کیے تھے۔ آہ اور دوسرے حضرات کے اضافے میں یہ فرق تھا کہ آہ نے اسے یائے معروف کی ایک شکل کے طور پر اختیار کیا تھا اور زیر کے لیے وقف کیا تھا جبکہ دوسروں نے اسے یائے مجہول کی ایک شکل کے طور پر اپنایا تھا اور زبر کے لیے وقف کیا تھا۔ کیلن ہجا کی تمہید میں لکھتے ہیں:

”جس حرف کا میں نے اضافہ کیا ہے وہ ’ی‘ ہے۔ یہ یے اردو تحریر میں مدتوں سے رائج ہے۔ میں اسے صرف اصولی صورت میں لے آیا ہوں۔ بعض حضرات نے اس یے کو فتحہ کے لیے وقف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے (جَے، ہَے) وغیرہ اس یے سے لکھنا چاہیے (جَی، ہَی) لیکن میرے نزدیک یہ یے یائے معروف سے ماخوذ ہے جو ہمیشہ کسرہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے بھی کسرہ سے متعلق کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس اصول کی رو سے میں نے ی اور ی کو کسرہ کے لیے اور ے کو فتحہ و ضمہ کے لیے مقرر کیا ہے[۳۱]۔“

اردو حروف تہجی میں نصف یے کا اضافہ کسی بھی شکل میں زیادہ چل نہیں سکا۔ دو یے کیا کم تھیں کہ ایک اور یے کا اضافہ کیا جاتا۔ قطع نظر اس کے کہ بہت پرانی روش کے مطابق یا انجمن ترقی اردو کے املا کی تقلید میں یا جگہ کی کمی کی وجہ سے کاتب نصف یے لکھ دیتے ہیں، آج کل عام طور پر پوری یے لکھی جاتی ہے۔ پھر بھی ایک مروجہ قاعدے میں ہے کو نصف یے سے ہی لکھا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ ”یے کی نئی شکل کی طرف بچوں کی توجہ دلائیے[۳۲]۔“

حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب کے بارے میں یوں تو قاعدوں کے باہر بھی بعض تحریریں انتشار کا باعث ہوئی ہیں لیکن قاعدوں میں سب سے زیادہ خلفشار تعلیم بالغان کے ایک کسی قدر پرانے قاعدے، ”نئی اردو“ از آئی۔ بی۔ ترکمان میں برپا کیا گیا ہے۔ مؤلف نے سبق ۱۲ میں ”آسان اردو کی الف بے“ کے تحت ایک ضمنی اندراج اس طرح کیا ہے:

ا = (ع ء)

ت = (ط)

ز = (ذ۔ ض، ظ)

س = (ث ص)

(ح) ء ہ

اور اس پر یہ نوٹ دیا ہے :

" بریکٹ میں لکھے ہوئے عربی حرفوں کی آوازیں
باہر لکھے ہوئے اردو حرفوں کی طرح نکلتی ہیں ۔"

اس کے بعد ترتیب وار جو حروف درج کیے، ہیں ان میں عربی الاصل حروف شامل نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قاعدے کے اسباق میں ہمزہ کے سوا ان حروف کے الفاظ بھی نہیں آئے ہیں۔ "آسان اردو کی الف بے" میں تین اندراجات اس طرح کیے گئے ہیں :

اَو : اَورت (عورت)
اے : اینک (عینک)
ای : ایسا (عیسیٰ)

مؤلف نے یہ طریقہ سہولت کے لیے اختیار کیا ہے ورنہ "وجہ تصنیف" اور "پڑھانے کا طریقہ" میں اور آخر میں "اردو کیوں پڑھیں" میں عربی و فارسی الفاظ صحیح املا میں لکھے ہیں۔ اسباق کی پیشانی میں الف ممدوت، یائے معروف، الف معاون وغیرہ لکھا ہے ۔ لیکن اصل اسباق میں ان حروف اور ان سے بننے والے الفاظ کا اخراج یا الفاظ کے املا میں تبدیلی نہایت قابل اعتراض ہے۔ وجہِ تصنیف میں مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہے :

"۱۹۳۳ء سے غیر زبانیں بولنے والوں کو اُردو پڑھانے سے تجربہ ہوا کہ اردو رسم الخط کے مقابلہ میں رومن رسم خط سے زیادہ آسانی سے اور جلدی پڑھائی جاسکتی ہے ۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ نستعلیق میں کچھ ایسے حرف لکھے جاتے ہیں۔ جن کی آوازیں بولنے میں ہندی مخرجوں سے نکلتی ہیں ۔ ان کا ترک کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس خط میں آوازوں کے نشان ہیں لیکن ان کا استعمال نہیں کیا جاتا یا بے اصول کیا جاتا ہے ۔ لہٰذا ان کا استعمال ضروری اور ایک قاعدے کے تحت مقرر کیا۔ اس طرح مروجہ اردو تحریر سے اس میں کچھ فرق ہوگیا۔"[۹]

کیا خوب ! اگر اردو رومن رسم الخط سے آسانی سے اور جلد پڑھائی جاسکتی تھی تو اردو کے اس قاعدے میں اس کا اظہار کرکے اردو دانوں کو شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ آسانی اور جلدی سے پڑھانے کا یہ کون سے مفہوم ہے کہ مروجہ اردو رسم الخط اور زبان کے بجائے کچھ اور پڑھا دیا جائے ؟ صاف ظاہر ہے کہ مؤلف کا نقطۂ نظر نہ صرف اصلاحی ہے بلکہ حد سے تجاوز کر گیا ہے ۔ اس کا اثر کئی اور صورتوں میں بھی جلوہ گر ہوا ہے۔ مثلاً انھوں نے اردو کی حرکات اور حروف کو دیوناگری کے سوَر اور ویَنجن کے طرز پر "آوازیں" اور حروف میں منقسم کردیا ہے ۔ آوازیں حسب ذیل ہیں :

آ، اَ ۔ اِ، اِ ۔ اُ، اُ ۔ اُو، اُو ۔
اَو ۔ اِی، اِے، اَے

اور حروف یہ :

ب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ج جھ چ چھ
خ د دھ ڈ ڈھ ر ڑ ڑھ ز ژ س ش غ ف
ق ک کھ گ گھ ل م ن ں وہ ی ے

اردو حروف تہجی کا پہلا حرف "آوازیں" میں چلا گیا، آٹھ عربی الاصل حروف خارج ہوگئے، نون غنہ کا اضافہ ہوگیا اور ب کے بعد بھ، پ کے بعد پھ اور ت کے بعد تھ وغیرہ دوچشمی ہے کے گیارہ مرکبات حروف تہجی میں داخل ہوگئے اور اس طرح آسان اردو کے ایک ناقص اور بے جوڑ الف بے مرتب ہوگئی۔ حروفِ تہجی میں اتنا تشویشناک ردو بدل کسی مروجہ قاعدے میں نہیں کیا گیا ہے ۔ صرف ایک مروجہ قاعدے میں ب کے بعد بھ، پ کے بعد پھ اور ت کے بعد تھ اور اسی طرح دوچشمی ہے کی چودہ طوال شکلوں کو "حروف تہجی کی ایک اور ترتیب" کے عنوان سے متعلقہ سادہ حروف کے بعد پیوست کردیا گیا ہے۔ لیکن اردو میں یہ حروف تہجی نہیں ہیں ۔ دیوناگری میں ان میں سے دس کے لیے مفرد حروف تہجی ہیں۔ ایک مفرد حرف ڑھ حروف تہجی میں شامل نہیں ہے ۔ ڈھ کے نیچے نقطہ لگا کر تحریر کے لیے

بتایا گیا ہے۔ دَھ کے لکھنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ تھَ، تھ اور ٹھ (دھ)، کے اشتراک سے لکھے جاتے ہیں۔ اردو میں بھی ایئوں کے لکھنے کو دیوناگری میں تھَ، تھَ، اور ٹھَ کے لکھنے کے طریقے پر قیاس کرنا چاہیے۔ اس طرح نہ تو اردو حروف تہجی میں ۱۵ یا ۱۶ حروف کا اضافہ ہوگا اور نہ دو حروف کو ایک حرف سمجھنے اور لکھنے کی کھلی ہوئی غلطی چلتی رہے گی۔

مختصر یہ کہ اردو حروف تہجی کی تعداد اڑتیس[۳۸] ہے جس کے بارے میں ہر قاعدہ نویس اور اردو پڑھنے پڑھانے والے کا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ اس میں نہ کچھ روایتی اعتراضات کی بنا پر ترمیم و تنسیخ کی جا سکتی ہے اور نہ لسانیات و صوتیات کی بنا پر۔ ان میں سے بعض حروف ہم صوت ہونے کی وجہ سے صوتیے (Phoneme) نہیں ہیں یا بعض آوازیں صوتیے ہیں لیکن حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں تو ان وجوہ سے بھی ن و اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ مقررہ حروف تہجی کا تعلق عملی رسم الخط سے ہے اور اس باب میں اردو کوئی محیر العقول نمونہ نہیں پیش کر سکتی۔

کئی مروجہ قاعدوں میں پڑھانے کے لیے کچھ خاص ہدایات لکھی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض قاعدہ نویس اردو حروف تہجی کو ابتدا میں درج کرنے اور بچوں کو ان کے نام بتانے سے خائف ہیں۔ مثلاً ایک قاعدے کی تمہید میں سب سے پہلے لکھا ہے:

> "شروع میں کل ۲۷ حروف دیے گئے ہیں اور باقی حرفوں میں سے ہمزہ صفحہ ۱۷ میں اور ٹ، ح، ذ وغیرہ صفحہ ۲۸ میں پیش کیے گئے ہیں تاکہ ایک ہی آواز والے کئی حرف ایک ساتھ بچوں کے سامنے نہ آئیں[۱۰]۔"

انگریزی میں کم سے کم دو حروف ہم صوت ہیں اور کئی حروف اپنی دو دو آوازوں کی وجہ سے مختلف الفاظ میں ہم صوت ہو جاتے ہیں۔ ہندی میں کئی حروف ہم صوت ہیں۔ فارسی میں تو کئی حروف کا حال اس اعتبار سے بالکل اردو جیسا ہے۔

لیکن ان زبانوں کے قاعدوں میں حروف تہجی کو پیش کرنے یا ان کا نام بتانے میں کسی قسم کا خوف و ہراس یا تذبذب و تامل دیکھنے میں نہیں آیا۔ مذکورہ قاعدے میں ڈرتے ڈرتے ہی سہی، آخر میں حروف تہجی دے دیے گئے ہیں۔ لیکن ایک اور قاعدے میں پورے حروف تہجی ایک جگہ کہیں بھی پیش نہیں کیے گئے بلکہ انھیں نامکمل طور پر دو گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ صفحہ ۹ پر ۲۱ حروف درج ہیں اور عنوان میں لکھا ہے کہ ان کی "آوازیں پہلے پہچنوائی جا چکی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان حروف میں "ز" بھی ہے جو پہلے کہیں نہیں آیا۔ غلطی سے اس گروہ میں "ژ" کے بجائے "ز" لکھ دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۳ پر "باقی ۱۴ حروف" کے عنوان سے "ث ح خ ذ ز ژ ص ض ط ظ ع غ ف ق" لکھے ہیں۔ اس طرح دونوں گروہوں میں فی الحقیقت کل ۳۴ حروف ہیں۔ ان میں ھ ، ے اور (ز کی غلطی کی وجہ سے) ژ کا پتہ نہیں۔ یا تو ایک مروجہ قاعدے میں حروف تہجی کی تعداد بڑھ کر ۵۱ ہو گئی ہے یا اس قاعدے میں گھٹ کر ۳۴ رہ گئی ہے۔ ایک اور قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ پہلے گروہ میں اردو کے وہ حروف یکجا ہو گئے ہیں جو دیوناگری حروف تہجی کے مطابق ہیں اور دوسرے گروہ میں عربی اور فارسی کے حروف رہ گئے ہیں۔ اردو کے حروف کو اس انداز سے تقسیم کرنا مناسب نہیں خیال کیا جا سکتا۔ پہلے گروہ کے حروف کے لیے لکھا گیا ہے کہ "پہلے پہل اردو کے عام مستعمل حرفوں سے روشناس کرایا گیا ہے۔" اس گروہ میں ح، خ، ع، غ، ف، ق وغیرہ نہیں ہیں، حالانکہ ان سے شروع ہونے والے عام مستعمل الفاظ (مثلاً حلوائی، خرگوش، صندوق، عورت، غبارہ، فوارہ، قلم وغیرہ) کی وجہ سے یہ بھی عام مستعمل حروف ہیں۔

اس قاعدے میں "پہلا قدم" کے زیر عنوان سب سے پہلے یہ ہدایت ہے:

> "سارے قاعدے میں حرفوں کے نام نہ بتائے جائیں بلکہ ان کی صرف آواز بتائی جائے[۱۱]۔"

لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ حرفوں کے نام بتائے بغیر آواز کس طرح بتائی جائے گی۔ غالباً دیوناگری حروف کے طرز پر آواز بتانا مقصود ہے۔ لیکن دیوناگری حروف کے تلفظ کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ اس کے مطابق ہر حرف میں زبر کی حرکت ہے۔ مطلق آواز کسی ایک حرکت کی تابع نہیں ہوسکتی۔ اردو میں حروف کی آوازیں زبر، زیر اور پیش تینوں سے متعلق ہیں۔ اس لیے آواز کو حروف کے ناموں کے تعلق ہی سے بتایا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا یہاں بے محل ہے کہ حروف کے ناموں کے بغیر الفاظ کے ہجے نہیں کیے جاسکتے کیونکہ حروف کے ناموں کی طرح یہ قاعدہ ہجے سے سروکار ہی نہیں رکھتا۔ اس کا اصول "تصویر کی مدد سے لفظ اور لفظ کی مدد سے لفظ اور لفظ کی مدد سے حرف شناسی" ہے۔ حروف سے متعلق سارا معاملہ آنکھوں میں رکھتا ہے۔ بچہ حرف پہچان تو لے گا لیکن اس کا نام نہ بتا سکے گا۔ کوئی اگر پوچھے گا تو اس کو بھی حرف شناسی کا اسی طرح سبق پڑھائے گا جس طرح اسے پڑھایا گیا ہے۔ یہ صورت ایسی ہی ہے جیسے کسی کو کسی کی شکل پہچنوا دی جائے لیکن نام نہ بتایا جائے۔ حرفوں کی طرح اعراب کی بھی آوازیں بتائی گئی ہیں، نام نہیں۔ "پانچواں قدم" میں "باقی مسئلے" کے عنوان سے دشوار مراحل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ تشدید، نون اور نون غنہ شاید سہواً لکھ دیا گیا ہے کیونکہ اس قاعدے کا مقصد حروف تہجی اور اعراب کے ناموں کو پردۂ خفا میں رکھنا ہے۔ اساتذہ اس قاعدے کو غالباً اپنے انداز سے پڑھا دیتے ہوں گے ورنہ یہ قاعدہ طالب علم کو مکمل حروف تہجی، ان کے ناموں، ترتیب، اعراب اور ان کے ناموں اور ہجے سے بے نیاز رکھتا ہے۔ معلوم نہیں طالب علم کو یہ ضروری باتیں کب سکھائی جاتی ہیں کیونکہ اس سلسلے کی بعد کی کتابوں میں بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔

یہ قاعدہ ان چند قاعدوں میں سے ہے جن سے تعلیم کے بالواسطہ طریقے کا استعمال کیا گیا ہے۔ ابتدا میں بالواسطہ طریقے سے الفاظ اور حروف پہچنوائے گئے ہیں اور الفاظ پر اعراب نہیں لگائے گئے ہیں۔ آگے چل کر اعراب با معنی الفاظ کے ذریعہ سے سکھائے گئے ہیں۔ مشقوں میں اعراب کا استعمال خاص خاص موقعوں پر کیا گیا ہے۔ اگر ابتدا میں اعراب کو اہمیت دیے بغیر اردو پڑھائی جاسکتی ہے تو اس سے اچھی کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کیونکہ اردو بغیر اعراب کے لکھی جاتی ہے۔ لیکن بالواسطہ طریقے کا یہ مفہوم کہ ہجے سے بالکل غرض نہ رکھی جائے یا حروف کے نام نہ بتائے جائیں غور طلب ہے۔ ایک اور مروجہ قاعدے میں بھی بالواسطہ طریقہ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کے آخر میں حروف تہجی (بہ حذف ڑ، ے و اضافۂ نون غنہ) اور مروجہ اعراب مع ناموں کے دے دیے گئے ہیں اور ہجے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ "پڑھانے کا طریقہ" میں لکھا ہے:

> "حروف تہجی آخر میں دیے گئے ہیں۔ ان کو بھی یاد کرا دینا اور ہجے لگانا سکھانا ضروری ہے۔"

آج کل تعلیم کے میدان میں بالواسطہ طریقوں اور جدت آفرینیوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ مقصد ان کا بھی وہی ہوتا ہے جو براہ راست اور روایتی طریقوں کا ہوتا ہے۔ کچھ باتیں آگے پیچھے ہو جاتی ہیں۔ نئے طریقوں کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ اور وسائل درکار ہوتے ہیں اور اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ نتائج اور تجربات کے اعتبار سے ان کا جائزہ لیا جاتا رہے تاکہ محض نئے طریقوں اور جدت آفرینیوں کے نام پر تعلیم کا نقصان نہ ہو۔ ہمارے ملک میں یہ سہولتیں عام طور پر حاصل نہیں ہیں۔ تعلیمی تربیت کا تو پھر بھی انتظام ہے لیکن تعلیمی تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔ دونوں مغرب کے اکتسابات کی رہین منت ہیں اور اسی راستے پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن ہمارا ماحول اور ذرائع محدود بھی ہیں اور مختلف بھی۔ بالواسطہ طریقے کے مطابق جو چند قاعدے لکھے گئے ہیں معلوم نہیں وہ کس حد تک کامیاب ہیں کیونکہ اس کا کوئی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ صرف قاعدے کی کثرت اشاعت سے اس باب میں کوئی فیصلہ کرنا محال ہے کیونکہ اس کے کئی دوسرے اسباب بھی ہوسکتے ہیں۔ یا تو ایک زمانہ تھا

کہ اردو کے قاعدہ نویسوں کی کوششیں نئے نئے اعراب وضع کرنے میں صرف ہوتی تھیں یا بالواسطہ طریقے پر منحصر چند قاعدوں میں اعراب کی تدریس اور ہجے کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ لیکن چند مروجہ قاعدے براہِ راست اور روایتی طریقے پر مبنی ہیں ان میں اعراب اور ہجے کا خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ پڑھانے والے ان سے زیادہ کام بھی لیتے ہیں اور مانوس بھی ہیں، اس لیے ان کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

اردو رسم الخط میں اصلاً ایک تو اعراب کم ہیں، دوسرے عام طور پر استعمال نہیں کیے جاتے۔ جو حضرات اس کیفیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں وہ اعراب کے اضافوں اور ان کے استعمال پر زور دیتے رہے ہیں۔ آج بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں بلکہ ان کی تعداد پہلے سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب دیوناگری رسم الخط کا نمونہ ہے۔ دیوناگری میں اعراب نہ صرف یہ کہ زیادہ ہیں بلکہ رسم الخط کا لازمی حصہ ہیں۔ دیوناگری تحریر بغیر متعلقہ اعراب یا ماتراؤں کے لکھی نہیں جا سکتی۔ اس کے برعکس اعراب اردو رسم الخط کا لازمی حصہ نہیں ہیں۔ اس کا انداز ایسا ہے کہ اعراب کو اس کا لازمی حصہ بنایا بھی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو اعراب ہمیشہ سے موجود ہیں وہ بھی عام طور پر استعمال نہیں کیے جاتے۔ اگر نئے اعراب وضع کیے جائیں اور ان سب کو رسم الخط کا لازمی حصہ بنانے کی کوشش کی جائے تو لکھائی میں اتنی دشواری پیدا ہو جائے گی کہ کوئی اس پر عمل نہ کرے گا۔ پڑھنے کی آسانی کا لحاظ رکھنے میں لکھنے کی دشواری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ کوئی عملی رسم الخط صوتیاتی اعتبار سے کچھ بہتر بھی ہو تو تلفظ کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ دیوناگری رسم الخط میں بھی ماتراؤں کی بعض ضمنی آوازیں نہیں ہیں جس کی وجہ سے متعدد الفاظ جس طرح بولے جاتے ہیں اس طرح لکھے نہیں جا سکتے اور جس طرح لکھے جاتے ہیں اس طرح بولے نہیں جاتے۔ لفظ سے واقفیت رکھنے والے تحریر کے خلاف صحیح تلفظ کر لیتے ہیں۔ اور جو صرف تحریر کو دیکھتے ہیں وہ غلط تلفظ کرنے لگتے ہیں۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے قاعدے میں مندرجہ ذیل اعراب ملتے ہیں:

زبر، زیر، پیش، الٹا پیش، مد اور تشدید

اس قاعدے میں ساکن حروف کے لیے جزم کا استعمال نہیں کیا گیا۔ مشق ۲۶ (سہ حرفی الفاظ) کے نمبر ۶ میں نون غنہ کا ایک لفظ (بھینس)، مشق ۲۷ (سہ حرفی الفاظ کے جملے) میں ایک لفظ (منہ) اور مشق ۲۸ (دو حرفی و سہ حرفی الفاظ کے جملے) میں دو الفاظ (ٹانگ اور رنگ) آئے ہیں لیکن ان پر نون غنہ کی علامت نہیں لگائی گئی۔ جزم اور الٹا جزم کی علامتیں اس وقت تھیں لیکن ان کا استعمال نہیں کیا گیا۔ اس قاعدے کو اپنے مقصد میں ناکام نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کے ذریعے سے اتنی نسلیں اردو سیکھ چکی ہیں کہ اسے اردو کا کامیاب ترین قاعدہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قاعدے میں تمام اعراب پڑھانا ضروری نہیں اور یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ طالب علم بغیر اعراب کے کوئی لفظ پڑھ نہیں سکتا۔ لفظ کے پڑھنے کا تعلق لفظ کے جاننے سے ہے۔ اگر لفظ سے طالب علم واقف ہے یا واقف کر دیا جاتا ہے تو وہ اسے بغیر اعراب کے آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔

اردو میں نئے اعراب وضع کرنے اور اعراب استعمال کرنے کی ضرورت تھی اور اب بھی ہے لیکن اس کا تعلق لغت اور لسانیات کی کتابوں میں تلفظ کی ٹھیک ٹھیک صراحت سے ہے۔ اردو لغات میں انیسویں صدی کے آخر میں الفاظ کا عبارتی حلیہ لکھنے کے بجائے اعراب استعمال کرنے کی طرف توجہ ہو چکی تھی۔ فرہنگِ آصفیہ میں ملواں نون غنہ کے لیے الٹے جزم، پورے نون غنہ کے لیے نقطے کا حذف اور واوِ معدولہ کے نیچے چھوٹے سے خط کا استعمال قابلِ ذکر ہیں۔ جب سے اب تک کئی علامتیں بڑھائی جا چکی ہیں۔ ان میں مزید اضافے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ لغت اور لسانیات کی کتابوں کے علاوہ کسی بھی تحریر میں کسی خاص لفظ کے تلفظ کی نشاندہی میں یہ کام آ سکتی ہیں۔ لیکن قاعدوں، دوسری ابتدائی درسی کتب اور عام تحریر میں کسی خاص صورت کے سوا، ان کو داخل کرنے کی کوشش اردو

رسم الخط کی انفرادیت کے منافی اور نہایت مضر ہے۔

اردو کی درسی کتابوں میں اعراب کے استعمال کا باقاعدہ آغاز پنجاب کے محکمۂ تعلیم کی درسی کتابوں سے ہوا۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس کی طرف توجہ دی۔ صفدر آہ نے اپنے قاعدے تکمیلِ ہجا میں کئی نئے اعراب تجویز کیے اور ان کو آخری مشق تک ایک ایک لفظ میں استعمال کیا۔ قاعدوں کے باہر اس رجحان کے تحت مولوی عبدالرحمٰن خاں (پوسا، بنگال) کا ایک مضمون اردو رسم خط (۱۹۱۰ء) اور غلام رسول مہر کا کتابچہ اردو املا (۱۹۶۰ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۰ء سے اردو کی ابتدائی تعلیم پر ایک ایسا دور گزر چکا ہے جب بعض اداروں اور افراد نے ایسے قاعدے رائج کرنے کی کوشش کی تھی جن میں بکثرت اعراب استعمال کیے گئے تھے۔ دیوناگری رسم الخط کی ترویج و اشاعت سے متاثر ہو کر آج کل بہت سے اصحاب خواہ قاعدہ لکھیں، خواہ قاعدے لکھنے کا ارادہ کریں آسان قاعدے کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ اعراب کام میں لائے جائیں۔ وہ اسی اُدھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ کس طرح نئے نئے اعراب بنائے جائیں اور ان کا استعمال عام کیا جائے۔ ان کے نزدیک اردو رسم الخط کی ترقی بلکہ "نئے ماحول" میں اردو کی بقا اسی پر منحصر ہے[۱۲]۔

اردو کا نیا ماحول کیا ہے؟ ہندوستان میں ہندی اور علاقائی زبانیں اور پاکستان میں وہاں کی علاقائی زبانیں۔ یہ ماحول فی نفسہٖ نیا نہیں ہے لیکن اس کی نوعیت ضرور کچھ نئی ہے۔ زبان پر اس کے اثرات پڑ سکتے ہیں لیکن رسم الخط کے متاثر ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اصوات کے اعتبار سے اردو رسم الخط برصغیر کی زبانوں کے ضروری اثرات پہلے ہی قبول کر چکا ہے۔ اب اس کی بقا اور ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنی انفرادیت اور بنیادی کردار کو برقرار رکھے۔ خوش قسمتی سے اردو کے مروجہ قاعدے اعراب کی بھرمار کے سابقہ رجحان سے بڑی حد تک اپنی جان بچا لے گئے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ اس موقع پر ان تمام تجویزوں اور کوششوں سے بحث کی جائے جو اعراب کے سلسلے میں مختلف زمانوں میں اردو کے قاعدوں میں کی گئی ہیں۔ مستثنیات سے قطع نظر کر کے اردو کے مروجہ قاعدوں کا عام میلان یہی ہے کہ ایک طرف طالب علم کو مروجہ اعراب سے آشنا کیا جائے اور دوسری طرف اسے بغیر اعراب کے اردو پڑھنے کا اہل بنایا جائے۔

اردو کے اعراب اصلاً زبر، زیر، پیش، مد، تشدید، تنوین، جزم، کھڑا زبر (چھوٹا الف) اور کھڑا زیر تھے۔ کھڑا زبر اور کھڑے زیر کا استعمال عربی الفاظ میں خاص موقعوں تک محدود تھا۔ مثلاً ہٰذا، لہٰذا، علیٰحدہ، زکوٰۃ، بجنسہٖ، بعینہٖ، فی نفسہٖ، ان میں ضمۂ معروف کی کھنچی ہوئی آواز کے لیے الٹے پیش اور طول نون غنہ کے لیے الٹے جزم کا اضافہ ہوا۔ اردو رسم الخط کے مصلحین کا عام رجحان اعراب میں اضافے کی طرف رہا ہے لیکن جس طرح بعض حروف کو خارج کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح ایک اعراب کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا ہے۔ دیوناگری میں ہر حرف میں زبر کی حرکت شامل ہے اور زبر کے لیے کوئی حرکت نہیں ہے جس سے تحریر میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے انجمن ترقی ہند نے اسی خامی کو اپنا لیا تھا اور اردو کے حروف میں بھی زبر کو پوشیدہ مان کر اس کا استعمال متروک قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس اعراب کو عام طور پر ترک نہیں کیا گیا۔

زیر، کسرۂ مجہول اور کسرۂ معروف دونوں کی علامت تھا۔ امتیاز کی غرض سے کسرۂ معروف کے لیے حرف کے نیچے کھڑے زیر کی علامت تجویز کی گئی اور استعمال کی گئی مثلاً آدمی، کھیڑوں، اس وغیرہ[۱۳]۔ یہ علامت نہایت مناسب تھی لیکن رائج نہیں ہو سکی۔ انجمن ترقی اردو نے یہ کھڑا زیر طول یائے معروف کے نقطوں کے نیچے لگانا منظور کیا تھا (سہیل، جھیل)۔ یہ علامت (ٍ) کئی مروجہ قاعدوں میں ملتی ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ علامت یائے معروف تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جبکہ کسرۂ معروف

کے لیے اس علامت کی دوسرے حرف کے ساتھ بھی ضرورت پڑتی ہے اس کے علاوہ اعراب اس حرف پر ہونا چاہیے جس پر وہ پڑھا جاتا ہے یا تلفظ میں آتا ہے۔

یائے معروف کی طرح واؤ معروف کے لیے جو علامت (وٗ) اختیار کی گئی وہ بھی قباحت سے خالی نہیں۔ یہاں بھی اعراب حرف ماقبل پر ہونا چاہیے تھا نہ کہ واؤ پر۔ واؤ سے پہلے کے حرف پر دیگر اعراب یعنی زبر اور پیش کی طرح الٹا پیش بھی لگایا جا سکتا تھا۔ کسرۂ معروف اور ضمۂ معروف دونوں کی اپنی دو دو آوازیں ہیں۔ ایک کھینچی ہوئی اور دوسری مختصر کھینچی ہوئی۔ کھڑا زیر یائے معروف کے نیچے اور الٹا پیش واؤ معروف پر لگانے کے بجائے اگر حرف ماقبل یعنی اس حرف پر لگائے جائیں جس پر وہ پڑھے جاتے ہیں تو دوسرے حروف کے ساتھ بھی کسرۂ معروف و ضمۂ معروف کی کھینچی ہوئی مختصر اور کھینچی ہوئی دونوں آوازوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ مثلاً

شبیہ ، شبستان

چوکی ، چپ

غیر مروّج یا ناقابل قبول تجاویز سے قطع نظر کر کے اس وقت گیارہ اعراب۔ زبر، زیر، پیش، مد، تشدید، تنوین، جزم، کھڑا زبر (خاص عربی)، کھڑا زیر (خاص عربی)، الٹا پیش اور الٹا جزم۔ مروج ہیں۔ کسرۂ معروف کے لیے متحرک حرف کے نیچے کھڑے زیر (ٖ) کا اضافہ مفید مانا جائے تو کار آمد اعراب کی تعداد بارہ قرار دی جا سکتی ہے۔ قاعدوں اور ابتدائی درسی کتب میں صرف انھیں سے سروکار رکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے مد، تنوین، کھڑا زبر (عربی) اور کھڑا زبر (عربی) جزو تحریر میں یعنی لازمی طور پر لکھے جاتے ہیں۔ تشدید کبھی لکھی جاتی ہے کبھی نہیں لکھی جاتی۔ اس کو بھی لازمی طور پر لکھا جانا چاہیے دیگر اعراب صرف اعراب کی تدریس کے لیے کام میں لانا چاہیے۔ دوسرے موقعوں پر کسی خاص سبب کے بغیر انھیں استعمال نہ کرنا چاہیے۔

فرہنگ آصفیہ میں اصل لغات میں واو معدولہ کے نیچے ایک چھوٹا سا خط لگا یا گیا تھا مثلاً خوِد، خوِیش، درخوِاست۔ محکمۂ تعلیم پنجاب نے درسی کتابوں کے لیے جو علامتیں مقرر کی تھیں ان میں یہ علامت شامل تھی۔ انجمن ترقی اردو ہند نے بھی ابتدائی درسی کتب میں اسے اختیار کیا تھا۔ پیش نظر مروجہ قاعدوں میں سے صرف ایک قاعدے میں "خوش" کے واؤ کے نیچے یہ خط لگایا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے لفظ کے آخر کی ہائے مدوّرہ ملفوظ منفصل (ہ) کو عام کتابوں میں بھی شوشے یا لٹکن (ۂ) لکھنے کی روش اپنائی تھی مثلاً رہ۔ صرف ایک قاعدے میں یہ بھی موجود ہے بلکہ اسے حروف تہجی میں بھی جگہ دی گئی ہے۔ قاعدوں میں ان دونوں طریقوں سے کام لینا غیر ضروری ہے۔ واؤ معدولہ ہمیشہ خ کے بعد آتا ہے۔ قاعدے میں ایسے چند الفاظ آتے ہیں جنھیں طالب علم آسانی سے پہچان سکتا ہے اور اسے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان الفاظ میں واؤ لکھا تو جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ پوری زبان میں بھی واؤ معدولہ کے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کو صحیح پڑھ لینا اور لکھ لینا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ ہائے مدوّرہ کو حروف میں شوشے کے ساتھ (ۂ) درج کرنے سے ہائے مدوّرہ غیر ملفوظ یا ہائے مختفی خارج ہو جاتی ہے کیونکہ یہ شوشہ ہائے مدورۂ ملفوظ کی علامت ہے۔ مزید یہ کہ لفظ کے آخر کی ہائے مدورۂ ملفوظ متصل سے بھی شوشہ یا لٹکن مروجہ املا میں متروک ہو گیا ہے مثلاً اب عام طور پر وجہ، جگہ، نقرہ اور تشبیہ وغیرہ لکھا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہائے مدورۂ ملفوظ منفصل کے لیے شوشے کے اضافے کا چلنا اور بھی مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ کہہ دینا آسان ہے کہ ہائے مدّورہ (ہ) دو آوازوں یعنی ہائے ملفوظ اور ہائے مختفی کی نمائندگی کرتی ہے۔

اردو میں ایک زمانے تک ہجے کا طریقہ سیدھا سادہ اور آسان تھا۔ مثلاً ایک حرف پر اعراب اس طرح پڑھے جاتے تھے :

الف زبر اَ، الف زیر اِ، الف پیش اُ

دو حرفوں کے ہجے اس طرح کرتے تھے :

الف بے زبر اَب ' الف بے زیر اِب ' الف
بے پیش اُب

لیکن جدید قاعدہ نگاروں میں سے بعض تو ہجے کرانے ہی کے قائل نہیں اور بعض نے اسے کافی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مثلاً ایک قاعدے میں ہدایت کی گئی ہے کہ

" الف زبر اَ یا الف زیر اِ وغیرہ کے بجائے
صرف اَ ' اِ ' اُ وغیرہ کہلوائیے "

منشا یہ ہے کہ حرف اور اعراب دیکھ کر صرف رکن کی آواز ادا کر دی جائے ' نہ حرف کا نام لیا جائے اور نہ اعراب کا۔ اسی طرح لفظ کے مختلف ارکان کو الگ الگ پڑھ کر جوڑ لیا جائے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اعراب سے کبھی غرض نہ رکھی جائے بلکہ صرف حروف زبان پر لائے جائیں مثلاً

بے الف = با
تے الف تا ' لام الف لا = تالا
بے الف با ' لام یے لی = بالی

ان مثالوں میں جو اعراب آئے ہیں ان کے سوا کوئی دوسرا اعراب نہیں آسکتا۔ بَا ' تَا ' لَا ' لِی ۔ لیکن اسی قاعدے میں یہ مثال بھی دی گئی ہے :

تے واؤ تو ' تے الف تا = توتا

اس میں تے واؤ لازمی طور پر تو نہیں ہو سکتا۔ تَو اور تُو بھی ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ ہجے کا طریقہ نہیں بلکہ املا بتانے کا طریقہ ہے جیسے زحمت کا املا زے بڑی حے میم تے اور غصہ کا املا غین صواد چھوٹی ہے بتایا جائے۔

معلمین کی عنایت سے ہجے کا ایک اور طریقہ نکلا ہے۔ اس کے مطابق اَبْ کے ہجے بے زبر اَب کے بجائے الف زبر بے اب کیے جاتے ہیں۔ اس کی منطق یہ ہے کہ اَب میں زبر الف پر ہے ' اس لیے زبر الف کے بعد کہنا چاہیے نہ کہ بے کے بعد۔ یہ منطق بے جان نہیں لیکن پرانے طریقے کے مطابق جب الف بے زبر اَب کہتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ زبر الف پر ہے اور بے ساکن ہے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ زبر الف اور بے دونوں پر ہے۔

ایک قاعدہ نگار نے ضمۂ معروف کے ہجے کا طریقہ یوں بتایا ہے :

بے ماکوس بُ ' لام الف لا ' یے الف یا = بُلایا
پے ماکوس پُ لام = پُل
تے ماکوس تُ میم = تُم

ماکوس تو خیر سے اصلاح یا تسہیل ہے معکوس کی۔ بے ماکوس بُ یوں ہے جیسے بے الٹا پیش بُ کہا جائے۔ لیکن اسی میں لام الف لا اور یے الف یا بھی ہیں یعنی ایک ہی لفظ میں ہجے کے دو طریقے شامل ہیں۔

دو چشمی ہے کی ملواں شکلوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کو ایک حرف کی طرح ہجے میں لائیے یعنی گھر کے ہجے گاف دو چشمی ہے رے زبر گھر کے بجائے گھَ رے زبر گھر کیجیے۔ کرنے کو کر لیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیونکر کریں۔ اردو میں گھ (گاف دو چشمی ہے) نہ تو ایک حرف ہے اور نہ اس کا کوئی مقررہ تلفظ۔ اگر گھ کو گھَ مانیں تو اس پر تو زبر پہلے ہی ہے ' پھر گھَ رے زبر گھر کے کیا معنی ہیں ؟ اگر گھ (گاف دو چشمی ہے) میں پہلے سے کوئی حرکت نہیں ہے تو اسے "گھ رے زبر" ہی کس طرح پڑھیں۔ کیا اسے صرف دیکھتے رہیں اور " رے زبر " پڑھیں۔ اگر اس کو گاف دو چشمی ہے پڑھیں گے ' جیسا کہ وہ دراصل ہے ' تو ہجے وہی "گاف دو چشمی ہے رے زبر گھر" ہو لیں گے۔ ہجے کا یہ طریقہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ کوئی اور طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔

بالفاظ دیگر اب ہجے کا ایک طریقہ نہیں۔ تین چار طریقے ہیں۔ ستم بالائے ستم کہ ایک ہی لفظ کے ہجے میں دو طریقے داخل کیے جاتے ہیں۔ اردو کے طریقے کو سمجھنے اور ماننے کے بجائے بار بار دوسری زبانوں کے طریقوں کو اردو پر ٹھونسنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ یہ حال ہے منطق کے پرستاروں کا لیکن افسوس ہے کہ ان کی ذہنی

سکا دیتیں منطقی یا منہجی کہلانے کی بھی مستحق نہیں کیونکہ وہ غیر منطقی ترتیب یا ذہنی پر ختم ہوتی ہیں۔ بچے کے سیدھے سے طریقے کو چھوڑ کر بعض قاعدہ نگاروں نے اتنی الجھنیں پیدا کی ہیں کہ طالب علم تو کیا استاد بھی چکر میں آجائے۔

اردو رسم الخط میں ملواں یا ترکیبی حالت میں اکثر حروف کی کئی کئی شکلیں ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے حرفوں کے جوڑ ملانے میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ پرانے قاعدوں میں دو دو حرفوں کی مشقوں کے ذریعہ سے حرفوں کے جوڑ سکھائے جاتے تھے۔ ملواں حالت میں حروف کی مختلف شکلیں علیحدہ درج نہیں کی جاتی تھیں۔ لیکن بعد کے اکثر قاعدہ نگار کئی کئی دوسرے اصولوں کی طرح اس اصول پر بھی قائم نہ رہ سکے۔ انھوں نے پڑھنے والوں کی سہولت اور نفسیات کا لحاظ رکھنے کے بجائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کی طرح سوچنا شروع کیا۔ چنانچہ اکثر مروجہ قاعدوں میں حروف کی چھوٹی چھوٹی مختلف شکلیں ہر حرف کے ذیل میں ایک ساتھ درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد ان کی مثالوں میں رکن یا لفظ دیے گئے ہیں۔ ایک قاعدے میں حروف با ترتیب کے بعد ان کی کئی مشقیں بغیر مثالوں کے شامل کی گئی ہیں۔ مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حروف کی مختلف ملواں شکلیں الگ الگ ذہن نشین کرائی جائیں۔ لیکن اس طرح کام زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل حرفوں کی مختلف شکلوں اور جوڑوں کے مطالعے اور تجزیے کا میدان ہے جس میں طالب علم کو گھسیٹنا نہ صرف بے سود بلکہ مضر ہے۔ عبدالغفار مدھولی نے اس میدان میں قدم رکھ کر خود اپنے دعوے کے مطابق اردو املا کا آسان طریقہ یا گر نکالا تھا۔ انھوں نے حروف تہجی کو دو خاندانوں میں بانٹ دیا تھا، ایک بڑا خاندان اور دوسرا چھوٹا خاندان۔ بڑے خاندان میں لفظ "اردو" کے حروف اور ان سے ملتے جلتے حروف یعنی ا، ر، ز، ڑ، ژ، د، ڈ، ذ، ؤ، و، ۆ۔ اور چھوٹے خاندان میں بقیہ حروف رکھے تھے۔ پھر ان دونوں خاندانوں کی ایک دوسرے کے برعکس دو دو عادتیں بیان کی تھیں۔ بڑے خاندان میں ط و و الف چبوترے پر بیٹھا یا تھا جس سے مراد یہ تھی کہ ان کا تعلق دونوں خاندانوں سے ہے یعنی مشترک خاندان کے ہیں۔ یہ گر کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

"بڑے خاندان کے حرف ہمیشہ پورے پورے لکھے جائیں گے اور اپنے آگے کسی کو نہیں ملنے دیں گے۔

چھوٹے خاندان کے حرفوں کے سرے لکھے جائیں گے اور ملا ملا کر لکھے جائیں گے لیکن لفظ کے آخر میں آئیں تو انھیں بھی پورا لکھا جائے گا۔"

حروف کی ترکیبی صورتوں کے پیش نظر متذکرۂ بالا گروہ بندی، حروف کی نوعیت اور خصوصیات کا تجزیہ درست اور دلچسپ ہے لیکن ایک ابتدائی طالب علم ان بکھیڑوں میں کہاں پڑ سکتا ہے کہ حروف تہجی کو دو خاندانوں میں بانٹ کر یہ یاد رکھے کہ کون سا حرف کس خاندان کا ہے، پھر بڑوں اور خاندانی لوگوں کی طرح دونوں خاندانوں کی جداگانہ صفات کو سمجھے۔ اسے تو یہ سیکھنا ہے کہ تحریر میں حروف کیا کیا شکلیں اختیار کرتے ہیں اور دوسرے حروف سے کس کس طرح ترکیب پاتے ہیں۔ ان باتوں کا تعلق عملی مشق یعنی پڑھنے میں حرفوں کی مختلف شکلوں اور جوڑوں کو پہچاننے اور پھر اس کے مطابق لکھنے سے ہے۔ ان کو ارکان یا الفاظ کی مثالوں کے بغیر نہ تو آسانی سے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے اور نہ کوئی دور کی منطق یا تعبیر و توجیہہ کارگر ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ مدد مل سکتی ہے تو حروف کے صوری انداز سے کیونکہ ایک صوری انداز کے حروف دوسرے صوری انداز کے حروف سے ایک ہی طرح کے جوڑ قبول کرتے ہیں جیسے ب پ ت ٹ ث اور ج چ ح خ یا ب پ ت ٹ ث اور س ش ص ض۔ ط ظ۔ ع غ۔ ف ق ک گ۔ ل ن۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے قاعدے میں حروف کی ملواں شکلیں اور جوڑ علیحدہ پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا علم دو

دو حرفوں کی اعراب کی شقوں سے ہوتا ہے۔ دو حالیہ قاعدوں میں حروف کی شکلیں علیحدہ لکھی تو گئی ہیں لیکن ان کے سامنے مثالیں درج کر دی گئی ہیں۔ یہ ایک بہتر طریقہ ہے۔ لیکن ان میں سے ایک قاعدے میں یہ کوتاہی ہے کہ حرف کے سامنے صرف ایک ملواں شکل دی گئی ہے جبکہ مثالوں میں دوسری شکلیں بھی ہیں۔ جیسے :

"ب بہ بر بد بچ بس"

اس کے علاوہ تمام ملواں شکلوں کی مثالیں نہیں دی گئی ہیں جیسے بط، بع، بم، بہ، بی اور بے۔ دوسری طرف حرف کے ایک ہی طرح کے جوڑ کی دو مثالیں درج کر دی ہیں جیسے پے کے ذیل میں "پر" اور "پردہ"۔

حروف کی مختلف شکلوں اور جوڑوں کے مسئلے کو نہ تو بالکل نظر انداز کر دینا ٹھیک ہے اور نہ بہت بڑھا دینا۔ بہتر یہ ہے کہ مختلف شکلوں اور جوڑوں کا علیحدہ اندراج نہ کیا جائے کیونکہ ان چھوٹے چھوٹے اندراجات کو مجرد طور پر ذہن نشین کرنا زیادہ دشوار ہے۔ اس کے بجائے حرف لکھ کر اس کے سامنے ایسے ارکان یا الفاظ درج کرنا چاہیے جن میں ہر طرح کے جوڑوں کی ایک ایک مثال ضرور ہو۔ یہ مقصد ہم شکل حروف میں سے ایک حرف کا انتخاب کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ آخر میں پورے حرف کی متصل اور منفصل مثالیں بھی آجائیں جیسے بے کے ذیل میں بب اور باب۔

پیش نظر مروجہ قاعدوں میں تدریس کا ذریعہ سبھی پہلوؤں سے اردو ہے۔ ان میں حروف اور اعراب کی شناخت کے لیے کسی اور زبان کے حروف اور اعراب درج نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانے کی بعض ابتدائی کتابوں میں حروف اور اعراب کی تدریس میں جا بجا ہندی کے حروف اور ماتراؤں کا اندراج بھی کیا گیا ہے۔ کچھ مخصوص صورتوں میں ایک زبان کسی دوسری زبان کے ذریعے سے پڑھائی جا سکتی ہے۔ اردو کو ہندی، انگریزی یا کسی اور زبان کے ذریعے سے پڑھانا مقصود ہو تو پورے قاعدے میں وہ زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن جن قاعدوں یا ابتدائی کتابوں کا مقصد اردو کے ذریعہ سے اردو پڑھانا ہے ان میں حروف اور اعراب کی پہچان کے لیے کسی دوسری زبان کا سہارا لینا مناسب نہیں۔ یہ اردو کو بلاوجہ ایک ضمنی حیثیت میں ڈالنے کے برابر ہے۔ درسی نقطۂ نظر سے بھی یہ طریقہ الجھاؤ سے خالی نہیں کہ ابتدائی سطح پر ایک زبان کے طالب علم پر دوسری زبان کے حروف اور اعراب کے تقابل کا بوجھ ڈالا جائے۔ اس لحاظ سے دوسری زبانوں کے رسم الخط کے تقابل سے ان کتابوں میں بھی گریز کرنا چاہیے جن کا مقصد کسی اور زبان کے ذریعے سے اردو پڑھانا ہے۔ اردو سے اردو پڑھانے میں تو اس سے اجتناب اور بھی ضروری ہے۔ ہر زبان کے حروف اور اعراب کی شناخت آزادانہ طور پر کی اور کرائی جا سکتی ہے۔ اردو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر طالب علم کسی اور زبان سے واقف ہے تو حروف کی مماثلت اور اختلاف وغیرہ کے پہلوؤں کو اس کی اپنی فہم پر چھوڑ دینا چاہیے۔ انھیں اردو کی تدریس میں داخل نہ کرنا چاہیے۔

اردو کے مروجہ قاعدوں میں بعض بنیادی اختلافات راہ پا گئے ہیں۔ یہ کیفیت درس و تدریس کا کوئی مستحکم اور سنجیدہ تصور نہیں پیش کرتی اور اردو کی ابتدائی تعلیم میں انتشار اور افراتفری کا باعث ہے۔ اس کا تدارک وقت کا اہم ترین تقاضا ہے چنانچہ کچھ ضروری باتیں اختصار کے ساتھ پھر لکھی جاتی ہیں :

(۱) اردو حروف تہجی کل اڑتیس ہیں۔ ان کی تعداد، ترتیب اور ناموں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دو چشمی ہے (ھ) کو ہائیت کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ یہ اب ہائے مدورہ (ہ) کی محض ایک شکل نہیں ہے۔ ہمزہ حرکت کے طور پر صرف اضافت میں استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے موقعوں پر حرف ہے۔ ان دونوں کو لازمی طور پر حروف تہجی میں درج کرنا چاہیے۔ اسی طرح ڈ، ٹ، ڑ

ز، ص، ض، ط، ظ اور ع بھی درج کیے جائیں گے۔

(۳) الف ممدودہ (آ) الف کی اور نون غنہ نون کی ایک شکل ہے۔ لام الف حرف مفرد نہیں ہے۔ انھیں حروف تہجی میں درج نہ کرنا چاہیے۔ نصف یے (ی) کو اگر قبول کیا جاتا تو یہ بھی یے کی ایک شکل ہوتی۔ اس کو نہ حروف تہجی میں درج کرنا چاہیے اور نہ کسی دوسری جگہ استعمال کرنا چاہیے۔

(۴) دو چشمی ہے (ھ) کی مخلوط یا ملواں شکلیں حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں۔ یہ دو دو حرفوں کے مجموعے ہیں۔ انھیں حروف تہجی میں یا قاعدے میں کہیں اور مفرد حروف کی طرح درج نہ کرنا چاہیے۔ یہ ان کی صحیح جگہ زبر، زیر اور پیش کی شقوں میں ہے مثلاً بَ، بِ، بُ کے بعد بھَ، بھِ، بھُ وغیرہ۔ اگر ان کی تقطیع الگ قائم کی جائے تو انھیں اعراب کے ساتھ بھَ، بھِ، بھُ، پھَ، پھِ، پھُ وغیرہ لکھنا چاہیے۔ ان کے ہجے کا طریقہ بے دو چشمی ہے زبر بھَ، بے دو چشمی ہے زیر بھِ اور بے دو چشمی ہے پیش بھُ وغیرہ بتانا چاہیے۔ ان کے الفاظ کے ہجے بھی اسی طرح بتانا چاہیے مثلاً گاف دو چشمی ہے رے زبر گھر۔

(۵) قاعدے کی ابتدا میں حروف با ترتیب ضرور درج کرنا چاہیے تاکہ طالب علم حروف تہجی اور ان کے ناموں سے پوری طرح آشنا ہو جائے اور ان کو ترتیب وار یاد رکھ سکے۔

اس کے بعد تدریس کی سہولت کے خیال سے مؤلف حروف تہجی کو گروہوں میں بانٹنا چاہتا ہے تو اسے اختیار ہے لیکن یہ گروہ بندی ہندی، فارسی اور عربی حروف میں امتیاز کی بنیاد نہ ہونا چاہیے۔ اردو حروف تہجی کا ہر حرف اردو ہے۔ کچھ حروف کو آسان اور کچھ حروف کو مشکل قرار دینا بھی مناسب نہیں آسان اور مشکل الفاظ ہوتے ہیں حروف نہیں۔

(۶) قاعدے میں مروجہ اعراب پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ابتدائی شقوں میں سکھانے کے لیے یہ اعراب مد، زبر، زیر، پیش، الٹا پیش، جزم، الٹا جزم، تنوین اور تشدید ہیں۔ ان میں مد اور تنوین جزو تحریر ہیں۔ تشدید کو بھی جزو تحریر بنانا چاہیے۔ کسرۂ معروف کے لیے حرف کے نیچے کھڑے زیر (ــِـ) کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، حالانکہ بہتر یہ ہے کہ زیر کی مختلف آوازیں اسی میں مضمر بتائی جائیں اور الفاظ کے تلفظ کے ساتھ ان کے فرق سے آشنا کیا جائے۔

سکون کے لیے جزم کا استعمال کچھ موقعوں پر صرف اس اعراب کی پہچان کے لیے کرنا چاہیے۔ ملواں نون غنہ کے لیے الٹے جزم کا استعمال زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ یا دو نون غنہ کو لازمی طور پر بغیر نقطے کے لکھنا چاہیے۔ ی، ے اور و پر سکون کی صورت میں جزم کے سوا کوئی اور نشان نہ لگانا چاہیے بلکہ تلفظ کے فرق کو حرف ماقبل پر اعراب لگا کر ظاہر کرنا چاہیے۔

اعراب کے استعمال کا منشا مختلف آوازوں سے طالب علم کو آشنا کرنا اور حسب ضرورت ان کا استعمال سکھانا ہے مگر اردو پڑھانے کا اصل مقصد بغیر اعراب کے پڑھنے لکھنے کی اہلیت پیدا کرنا ہے چنانچہ اعراب کی شناخت کی شقوں کے بعد ان کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے اور آخر میں بہت خاص موقعوں کے سوا ان کو بالکل حذف کر دینا چاہیے۔

یہ بات صدق دل سے قبول کرنا چاہیے کہ عام تحریر میں اردو رسم الخط ایک غیر اعرابی رسم الخط ہے۔ اس کو اعرابی رسم الخط نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی زبان کی تحریر کو ٹھیک ٹھیک پڑھنے کے لیے الفاظ سے واقفیت اور سیاق و سباق کا لحاظ ناگزیر ہوتا ہے۔ اعراب کی کثرت استعمال سے پڑھنے میں کچھ آسانی قرین قیاس ہے لیکن لکھنے کی دشواری بہت بڑھ جائے گی۔ اردو رسم الخط

کا انداز کچھ ایسا ہے کہ تمام اعراب جزوِ تحریر نہیں بنائے جا سکتے۔ اس لیے اس میلان سے اجتناب ضروری ہے۔

(۷) ہجّے سے الفاظ کے تلفظ اور املا کو ذہن نشین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ صرف ارکان کو پہچان لینا یا حروف کو شمار کر لینا اتنا کارگر نہیں ہوتا۔ اختراع پسندی نے یا تو ہجّے کو نظر انداز کر دیا ہے یا اس کو خواہ مخواہ مشکل بنا دیا ہے۔ ہجّے کا پرانا طریقہ نہایت مفید اور آسان ہے۔ اس کو بحال کرنا چاہیئے۔

(۸) حروف کی مختلف ملواں شکلوں کو الگ درج نہ کرنا چاہیے بلکہ ہر حرف کے مقابل ایسے ارکان یا الفاظ لکھنا چاہیے جن سے مختلف شکلیں سامنے آجائیں اور طالب علم ان کے پڑھنے اور لکھنے کی مشق کر لے۔ لکھنے کی مشق میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایک موقع کے جوڑ کو دوسرے موقع کے جوڑ کی طرح نہ لکھا جائے۔ حرفوں کے جوڑ ملانا سکھانے میں بامعنی الفاظ کے ساتھ ساتھ بے معنی ارکان کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۹) اردو کے حروف اور اعراب کے سکھانے کے لیے کسی دوسری زبان کے حروف اور اعراب درج نہ کرنا چاہیئے۔

(۱۰) مروّجہ معیاری املا اور زبان پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور قاعدے کو اصلاح کا ذریعہ نہ بنانا چاہیے۔

(۱۱) قاعدے کی تمہید یا ہدایات میں کوئی ایسی بات نہ لکھنا چاہیے جس سے اردو رسم الخط اور زبان کے بارے م

میں منفی تاثرات پیدا ہوں یا پڑھنے اور پڑھانے والے کے شوق اور اعتماد کو نقصان پہنچے۔

ایم۔ کوٹھیاوی راہی
قاضی پور خورد، گورکھپور

غزل

یاد ہوا بن گئی، زخم ہرے ہو گئے، اشک لرزنے لگے
غم کا شجر جھک گیا، دل کا ثمر پک گیا، لفظ مہکنے لگے
ٹوٹی ہوئی شخصیت، ہجر زدہ باسیت، شعلے اُگلنے لگی!
کھڑکیاں کھلنے لگیں، انکھڑیاں تکنے لگیں، جسم پگھلنے لگے
نقرئی راتیں ملیں، یار کی باتیں ملیں، مجھ کو مرے خواب میں
صبح سنہری لگی، زیست رُوپہلی لگی، گیت چمکنے لگے
وصل ہو جذبوں کی موت، ہجر ہے خوابوں کی موت، مجھ کو ہے جینا ابھی
اس لیے جذبے مرے اس لیے سپنے مرے نیند سے بچنے لگے
چھوٹ گئی کوئے یار، زیرِ قدم خارزار، آنے لگا بار بار
دُور ہے فصلِ خزاں، سچ ہے مگر داستاں، برگ کھڑکنے لگے

○○

۱؎ فرہنگِ آصفیہ مرتبہ سید احمد دہلوی، جلد چہارم ص ۱۶۸۔ ۲؎ خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور، طبع دوم، ص ۵۸۴۔ ۳؎ تکمیل ہجا از ڈاکٹر محمد صفدر آہ سیتاپوری، ص ۳۔ ۴؎ دیکھیے دس دنے میں اردو از حیات اللہ انصاری، ص ۴۷۔ سنہ اشاعت ندارد۔ ۵؎ امیر مینائی از شاہ ممتاز علی آہ، ۱۹۴۱ء۔ خط مورخہ یکم دسمبر ۱۸۹۰ء بنام آہ۔ ص ۳۰۳۔ ۶؎ دیکھیے کانفرنس کی رپورٹ مرتبہ محمد ابراہیم خاں ثنا، ۱۹۴۴ء، ص ۱۲۸۔ ۷؎ تکمیل ہجا، ص ۳۔ ۸؎ ہندستانی قاعدہ از مولانا محمد یعقوب شاہجہاں پوری، ص ۲۔ اس قاعدے میں جا بجا مروجہ روش کے مطابق "ہے" بھی لکھا ہوا ہے۔ ۹؎ نئی اردو از آئی۔ بی۔ ترکمان سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، طبع دوم، ۱۹۷۷ء، ص ۳۔ ۱۰؎ ہندستانی قاعدہ، ص ۲۔ ۱۱؎ اردو کا قاعدہ، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۳۔ یہ کثیر الاشاعت قاعدہ ہے۔ اس ایڈیشن میں تعداد اشاعت دس ہزار درج ہے۔ ۱۲؎ دس دنے میں اردو۔ تعداد اشاعت درج نہیں لیکن جیسا کہ معلوم ہے یہ قاعدہ بھی کثیر الاشاعت ہے۔ ۱۳؎ پنجاب ریویو، کرم آباد (پنجاب) ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۹ تا ۱۱۔ ۱۴؎ مثال کے طور پر دیکھیے مراسلہ "آسان قاعدہ" از ابراہیم علی خاں (بھوپال)، ہماری زبان، علی گڑھ، مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۔ ۱۵؎ دیکھیے اردو رسم خط از مولوی عبدالرحمن خاں (پوسا، بنگال)، پنجاب ریویو، کرم آباد، ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۹ تا ۱۱۔ اور تکمیل ہجا از محمد صفدر آہ سیتاپوری۔

جی۔ ڈی۔ چندن

اُردو صحافت اور قومی یک جہتی

آج سے ۴۵ سال پہلے ۱۹۴۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے انڈین نیشنل کانگرس کے رام گڑھ اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ :۔

" ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ سرزمین مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی، کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی۔ اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ انھی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے یہیں بس گیا۔ یہ دُنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے دُور بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پُرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے "۔

یہ الفاظ انھوں نے ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے کہے تھے لیکن مولانا آزاد اُردو صحافت کے بھی ایک پیشوا اور ہادی تھے وہ ہندستان کے اولین اور اپنے زمانے کے سب سے زیادہ چھپنے والے سیاسی ہفت نامے " الہلال " کے بانی اور فعال ایڈیٹر تھے اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے انھی نظریات کو دوبارہ پیش کیا جس کا اظہار انھوں نے ۲۸ سال پہلے اپنے اخبار میں کیا تھا۔ اس اخبار نے قومی ورثے اور قومی اثاثے کی حفاظت کے سلسلے میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا۔

دہلی میں اُردو کی مطبوعہ صحافت کا آغاز ۱۸۳۶ء سے ہوا جس کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے سر ہے جنھوں نے اپنے دہلی اُردو اخبار کے ذریعہ اس وراثت اور قومی یک جہتی کو تاراج کرنے والے فرنگی حکمرانوں کے عزائم کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ اپنے مجاہدانہ اقدام کی پاداش میں جامِ شہادت بھی نوش کیا۔

قومی یک جہتی کے مسلک کی خدمت اُردو صحافت کی اساس

رہی ہے۔ مولوی محمد باقر نے اس بے لوث خدمت کے صلے میں جو مرتبہ پایا وہاں تک اس وقت تک کوئی صحافی نہیں پہنچا تھا۔ وہ ملک کے پہلے صحافی تھے جنھوں نے غیر ملکی اقتدار کی مخالفت اور قومی یک جہتی کی سر بلندی کے لیے اپنی جانِ عزیز قربان کر دی اس شہادت نے اُردو صحافت کو عین آغاز ہی میں ملک کی دنیائے صحافت میں ایک ممتاز مقام عطا کر دیا۔

لیکن ہماری صحافت کی تو زبان ہی قومی یک جہتی کے تصور کی زائیدہ اور پروردہ ہے۔ اُردو یہاں اپنی تہذیبی دھاروں کے ملن سے پیدا ہوئی جس کا تذکرہ اوپر مولانا آزاد کے خطبے میں آیا ہے۔

قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ جس نئے ہندستان کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اس میں اردو زبان اور اس سے وابستہ مشترک تہذیب کا بھی ہاتھ ہے۔ اس اردو زبان سے قومی دھارے کو رواں دواں کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی حصہ لیا۔ انھوں نے اُردو زبان کو اپنی ہی زبان کی حیثیت سے اپنایا۔ اور اخبار "جام جہاں نما" کی صورت میں ہری ہر دت بنگو اور منشی سدا سکھ نے اُردو صحافت کا کلکتہ سے آغاز کیا۔

اس حوالے کا مقصد کوئی ایسی جذباتی منطق پیش کرنا نہیں ہے کہ بنگال کے دو اہلِ ہنود نے یہ اخبار قومی یک جہتی کے لیے نکالا تھا۔ مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ لوگوں کے میل ملاپ سے پیدا ہونے والی اُردو زبان کو مقبول اور مضبوط بنانے کے لیے آج سے ۱۶۳ سال پہلے بھی ہندو آگے بڑھ کر اسے استعمال کر رہے تھے۔

معترضین اور الزام تراشی والے ہر دور اور ہر سطح میں ہوتے ہیں اور وہ جا بے جا سرگرم بھی رہتے ہیں، یہاں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہندستان کی زبان نہیں۔ عربی اور فارسی کی توسیع ہے جسے ترکوں، افغانوں اور دیگر اسلامی نوواردوں نے اپنے ہم مذہبوں کی آسانی اور عزائم کے لیے یہاں رائج کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں ہندستانی تہذیب کی روح نہیں ہے۔

ان عاقلوں نے اس امر پر کوئی توجہ نہ دی کہ یہ نو وارد اپنے ساتھ اُردو نام کی کوئی زبان نہیں لائے تھے اور نہ ہی وہ کسی ایسی زبان سے واقف تھے۔ ان کے کسی دور حکومت میں اسے سرکاری زبان بننا نصیب نہ ہوا۔ یہ زبان تو لوگوں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور ان لوگوں میں لشکر بھی شامل تھے۔ یہ اسی میل جول کا نتیجہ تھا کہ اس کے ذخیرے میں قریباً تین چوتھائی الفاظ ہندی زبان سے آئے جن کا ماخذ بالعموم سنسکرت تھا۔ اس کے ادبی ذخیرے میں یہاں کے مقدس گرنتھ، مختلف علاقوں کے مناظر، مشہور مقامات دریا، پہاڑ، رسم و رواج غرضیکہ ہندستانی زندگی اور عقیدے کا ہر پہلو موجود ہے۔ بقول فراق صاحب:-

"پچھلے سو سال میں ہندستان کی کسی زبان میں ویدانت کے نظریے کی ترجمانی کرنے والی ایسی شاعری نہیں مل سکتی جیسی تصوف کی اُردو شاعری میں موجود ہے۔ اس کو سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خود شنکر آچاریہ بول رہے ہیں"۔

قومی وحدت، قومی جدوجہد۔ انقلاب اور ہندستان کی آزادی کے موضوعات پر اُردو شعراء کی جتنی نظمیں خلاف قانون قرار دی گئیں اور ان کے کہنے والوں کے خلاف جتنی سخت گیریاں کی گئیں اتنی شاید ملک کی کسی اور زبان کے شعراء کے خلاف نہیں کی گئیں۔

جس طرح جام شہادت پینے والا ہندستان کا اولین صحافی اُردو سے تعلق رکھتا تھا، اسی طرح اپنے اشعار کی وجہ سے کالے پانی یعنی انڈیمان کی کال کوٹھری میں جانے والا اولین ہندستانی شاعر منیر شکوہ آبادی بھی اُردو زبان سے تعلق رکھتا تھا۔

اس زبان کے نام کی کئی تشریحیں کی گئی ہیں۔ لیکن میں یہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی تشریح کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان کا نام بھی سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ سنسکرت میں 'اُر' کے معنی ہیں دل اور 'دو' کے معنی دو یعنی دو دل۔ یعنی ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کا اشتراک۔

یہ اسی اشتراک کا ثمر تھا کہ ممتاز مسلم ادیبوں اور شاعروں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے اردو میں منثور اور منظوم ترجمے کیے۔ خواجہ دل محمد کی "گیتا" آج بھی کئی ہندو گھروں میں بڑی عقیدت اور باقاعدگی سے پڑھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ بہت سے دوسرے مذاہب کی اہم کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں مل جاتے ہیں ان کی تعداد کم از کم ۴ سو ہے۔

کوئی اجنبی زبان کسی ملک کی صحافت اور طباعت کا مستقل اور مقبول وسیلہ نہیں بن سکتی۔ مثال کے طور پر ہندستان میں عربی، فارسی، چینی، فرانسیسی، تبتی اور پرتگالی کے تقریباً دو درجن جریدے چھپ رہے ہیں لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ان کے ناموں یا مقام اشاعت تک سے واقف ہیں ؟

لہذا اردو کو اجنبی یا غیر ملکی تصور کرنا دانش مندی نہیں یہ ہماری اسی دھرتی کی پیداوار ہے جس کے بارے میں ہمارا یقین ہے کہ یہ سونا، ہیرے اور موتی اگلتی ہے۔

اردو روز اول ہی سے ایک عوامی زبان رہی ہے لہٰذا اس کی صحافت کے بانیوں نے یہ دیکھا اور بھانپا کہ غیر ملکی اقتدار کے خلاف سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے یہ بہت مفید ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس احساس نے کسی منظم تحریک کی شکل تو نہ اختیار کی لیکن کچھ بیدار مغز صحافیوں نے فرنگی راج کی چیرہ دستیوں اور بے انصافیوں کو بار بار بے نقاب کیا۔ انھوں نے فرقہ وارانہ اتحاد اور حریت کے جذبے کو بھی پروان چڑھایا۔

یہ اردو صحافت کی خوش نصیبی تھی کہ اسے اپنے زمانۂ طفلی ہی میں آزادی کی تمنا کی آبیاری کرنا پڑی۔ اس سے اس کی نشو و نما بڑی تیز رفتاری سے ہوئی۔ تین دہوں کے اندر ہی اس کی بالیدگی کا یہ عالم تھا کہ غیر ملکی حکمراں اس سے خوف کھانے لگے۔ انھیں اس کی تحریروں میں بغاوت کے شعلے نظر آنے لگے۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء میں فرنگی راج کے خلاف جب پہلے انقلاب کا آغاز ہوا تو ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ کینگ نے GAGGING ACT کے نام سے ایک قانون زبان بندی نافذ کیا جس کے تحت ہر چھاپے خانے کے لیے لائسنس لینا ضروری کر دیا گیا۔ حکومت نے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ وہ جس اخبار کو چاہے بند کر دے اور جس اخبار پر چاہے سنسر شپ لگا دے

یہ قانون ایک ہی سال نافذ رہا۔ یوں تو یہ سب زبانوں کے اخباروں کے لیے تھا لیکن حقیقتاً اس کا بیشتر نزلہ اردو اور فارسی ہی کے اخباروں پر گرا۔ مسٹر جے نٹ راجن نے "تاریخ صحافت ہند" میں لکھا ہے، ۱۸۵۷ء کا انقلاب برپا ہوتے ہی شمال مغربی صوبہ جات کے اکثر اردو اخبار بند ہو گئے۔ اس قانون کی سب سے زیادہ چوٹ دہلی کی اردو صحافت پر پڑی جو کچھ عرصے کے لیے معطل ہی ہو گئی۔

لیکن ایک ہی سال کے بعد اس صحافت کا لکھنؤ میں نیا باب کھلا اور اس کا آغاز قومی یک جہتی کے ایک باعزم مجاہد منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" کے اجرا سے کیا۔

منشی نول کشور اردو کے سچے پرستار تھے۔ اپنے اخبار کے اجرا سے پہلے انھوں نے مطبع نول کشور قائم کیا جو ان کی مستعدی اور لگن سے ایشیا کا ایک ممتاز چھاپہ خانہ بن گیا۔ اس چھاپہ خانے نے اردو زبان اور ادب کی بے حد خدمت کی۔ بقول مولانا امداد صابری منشی صاحب کی زندگی میں اس مطبع نے مختلف موضوعات پر چار ہزار سے زیادہ کتب شائع کیں۔ ۱۸۹۵ء میں منشی نول کشور کا انتقال ہو گیا لیکن ان کے خاندان نے ان کے لگائے ہوئے پودے کو سوکھنے نہیں دیا، بلکہ برابر اس کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے منشی پراگ نرائن اور پھر ان کے بعد ان کے پوتے منشی بشن نرائن نے اس مطبع کو جاری رکھا۔ اس مطبع نے اسلامی موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں شائع کیں۔

خود "اودھ اخبار" جو ۱۸۷۴ء میں روزنامہ ہو گیا تھا، تقریباً نوے سال تک جاری رہا۔ فرقہ وارانہ اتحاد کا ترجمان یہ ایک اعلا درجہ کا اخبار تھا۔ قومی یک جہتی کی اہمیت اجاگر کرنے کے علاوہ اس نے مسلمانوں کی تعلیمی اصلاحات پر مضامین شائع کیے، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے حق میں مراسلات چھاپے اور اسلامی ممالک کی سیاست پر کئی ہمدردانہ امین لکھے۔

اس اخبار کا عقیدہ یہ تھا کہ اخبارات کو دینی اور مذہبی مباحث سے الگ رہنا چاہیے اور معاشرتی اور سیاسی مسائل ہی سے تعلق رکھنا چاہیے۔ (شمارہ ۱۹ فروری ۱۸۸۰ء)

اودھ اخبار کے شعبۂ ادارت میں اس دور کے ممتاز ہندو اور مسلمان قلم کاروں نے کام کیا۔ ان میں مولوی غلام محمد خاں تپش، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی احمد حسن شوکت، عبدالحلیم شرر، سید امجد علی اشہری، مرزا حیرت دہلوی اور مولانا جالب شامل تھے۔ سر سید احمد خاں اس اخبار کے بہت مداح تھے اور کئی بار اس کی تحریریں اپنے اخبار "سائنٹیفک سوسائٹی" میں شائع کرتے تھے

سر سید احمد خاں اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے لیکن ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ انھوں نے کہا کہ،

"ہندوستان میں رہنے والے لوگ مذہب کے اعتبار سے ہندو مسلمان یا کچھ اور ہو سکتے ہیں لیکن وطن کے لحاظ سے وہ ایک قوم ہیں جس کے افراد ایک ہی دھرتی پر رہتے ہیں، وہیں پیدا ہوتے ہیں اور وہیں نذر آتش یا سپرد خاک ہوتے ہیں۔ ان کے فرقے الگ ہو سکتے ہیں لیکن ان کا ملک ایک ہے، اس لیے ان سب کو یک جہتی سے ملک کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اسی میں ان سب کی بھلائی ہے۔"

انیسویں صدی کے روزناموں میں "اودھ اخبار" نے بہت دھوم مچائی، لیکن اس صدی کے روزناموں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ علاوہ ازیں یہ سب بشمول اودھ اخبار ایک نرم سیاست کے حامی تھے۔

بیسویں صدی اودھ اخبار کی روایت سے استفادہ کرتی ہوئی اس سے بہت آگے نکل آئی۔ دراصل یہ صدی جس کا ابھی چھٹا حصہ باقی ہے، اردو کے روزناموں کے سنہری دور کی صدی ہے۔

صحافت ایک جدید علم اور فن ہے۔ اس کی پیش قدمی اور پرواز کی رفعتوں کا تعلق جدید ٹکنالوجی اور ملک کی سیاست کے درجۂ حرارت سے ہے۔

اگر انڈین نیشنل کانگریس جیسی کسی جماعت کا قیام انیسویں صدی کے اوائل میں ہو جاتا تو غالباً "دہلی اردو اخبار" اپنے تیسرے دہے میں "زمیندار" کا درجہ پا لیتا۔ اس کا ایڈیٹر مولوی محمد باقر "زمیندار" کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں سے کسی درجہ کم قادر صحافت اور مجاہد حریت نہیں تھا۔ لیکن قدرت کو ابھی ہندستان کی اردو صحافت کو تجربے اور ایثار کی بھٹی میں تپانا تھا۔

جب یہ عمل پختہ ہوا تو مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی، لالہ لاجپت رائے۔ مہاشے کرشن، منشی دیا نرائن نگم، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور لالہ دینا ناتھ جیسے صحافی منظر عام پر آئے۔ ان سب نے عوام کے دل و دماغ میں حب الوطنی اور ایکتا کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کا ولولہ پیدا کیا۔

۱۹۰۲ء میں مولانا حسرت موہانی کے "اردوئے معلیٰ" نے مکمل آزادی کا وہ دلیرانہ مطالبہ کیا جس کی آواز تک سننے کے لیے فرنگی حکمراں تیار نہ تھا۔ ۱۹۰۷ء میں جب برطانوی حکومت نے پنجاب کے عظیم مجاہد آزادی لالہ لاجپت رائے کو جلاوطن کر دیا تو مولانا حسرت موہانی نے اس دور کے ممتاز سیاسی رہنماؤں اربندو گھوش، بپن چندر پال اور بال گنگا دھر تلک کے شانہ بہ شانہ حکومت کے اقدام کی دلیرانہ مخالفت کی۔ کانگریس کے دیگر سیاسی رہنماؤں کی طرح مولانا حسرت موہانی نے بھی جہاد حریت اور قومی یک جہتی کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ اور اپنے مطالبے کے لیے جو صعوبتیں برداشت کیں وہ ہندستان کی تاریخ صحافت کا اعزاز اور افتخار ہیں۔

قومی یک جہتی اور سیاسی بیداری کو مضبوط تر بنانے والے بیسویں صدی کے ہمارے اولین صحافیوں میں لالہ دینا ناتھ ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے ۱۹۰۴ء میں لاہور سے "ہندستان" شروع کیا، پھر "دیپک" کے نام سے اس کا ایک روزانہ ایڈیشن شروع کیا، اور پھر "ویش" کے نام سے ایک اور روزنامہ شروع کیا۔ اردو کے یہ تینوں اخبار قومی اتحاد اور تحریک آزادی کے جذبات میں حرارت بھرتے

رہے۔ اپنی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے وہ ادیب ناتھ حکومت برطانیہ کے عتاب کا شکار ہوئے اور انھوں نے اپنی زندگی کے کئی عزیز سال جیل میں گزارے۔

اسی طرح اتر پردیش میں اُردو سوراجیہ جو ۱۹۰۷ء میں الٰہ آباد سے جاری ہوا اور "مدینہ" جو ۱۹۱۲ء میں بجنور سے شروع ہوا قومی یک جہتی اور جہادِ حریت کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ جس ثابت قدمی، متانت اور اعلیٰ معیار سے "مدینہ" نے قومی یک جہتی کی روایت کو تقویت دی وہ اُردو کی تاریخ صحافت کا ایک زریں باب ہے۔

۱۹۰۹ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور اردو صحافت کا وہ رنگ ڈھنگ شروع ہوا جس سے آج بھی اُردو کے کئی سرکردہ روزنامے ایک تعلق قائم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کے استحکام اور سامراجی نظام کے خاتمے پر بہت زور دیا۔ وہ نثر اور نظم دونوں پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی قومی شاعری نے تحریک آزادی کے ایک اہم عہد کے دوران عوام کے دلوں کو گرمایا اور ان کے جذبۂ حریت کو جلا دی۔ حکومت ان کی شعلہ باریوں کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے "زمیندار" پر پے در پے سختیاں کیں۔ یہ اخبار سختیاں جھیلتا رہا اور عذاب کی ہر بھٹی سے کندن بن کر نکلتا رہا۔ ۱۹۲۷ء کے بعد اس کی پالیسی بدل گئی۔

اُردو صحافت میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کا رتبہ ہادیوں کا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے مجلاتی صحافت اور مولانا ظفر علی خاں نے روزناموں کی صحافت میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ قومی یک جہتی اور حریت کی تحریکوں پر صرف کیا۔

"زمیندار" کے بعد لاہور ہی سے نکلنے والے "پرتاپ" "ملاپ" "بندے ماترم" اور "زمزم"، دہلی کے "الجمعیۃ" اور "ریاست"، حیدرآباد کے "پیام"، کلکتہ کے "ہند" جو آج "آزاد ہند" کے روپ میں موجود ہے اور بمبئی کے "اجمل" نے قومی یک جہتی اور جہدِ حریت کی تحریک کو مضبوط کیا۔ ان کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں اور بھی بہت سے اُردو اخبار تھے جو قومی یک جہتی کی اہمیت کو اجاگر کرتے رہے، لیکن یہاں ان کے نام گنوانا مقصود نہیں اور نہ ہی یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ جن کے نام لیے گئے ہیں وہ ہمیشہ دودھ کے دُھلے رہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ ملک کی تاریخ کے اہم زمانوں میں اُردو صحافت قومی یک جہتی کی روایت سے وابستہ رہی۔

یہ روایت روزناموں یا حالاتِ حاضرہ کی صحافت ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ علمی اور ادبی رسائل کی صحافت میں بھی جاری و ساری رہی۔ بلکہ بعض جرائد اور مجلات تو اس اعتبار سے نہایت عہد ساز رہے۔ ان میں بیسویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہونے والا منشی دیا نرائن نگم کا ماہ نامہ "زمانہ" سرفہرست ہے۔ اس رسالے نے اردو کی مجلاتی صحافت میں جو معیار قائم کیے وہاں آج تک کوئی دوسرا پہنچ نہیں سکا۔ اس کے قلم کاروں میں ہندو مسلمان اور دیگر فرقوں کے اہلِ فکر و نظر بھی شامل تھے۔ یوں تو "زمانہ" سے دو سال قبل شروع ہونے والے شیخ عبدالقادر کے "مخزن" نے بھی اپنے کالموں میں فرقہ وارانہ اتحاد و ہم آہنگی کا ایک نمونہ پیش کیا تھا، لیکن "مخزن" ایک ادبی اور علمی رسالہ بننے پر ہی قانع رہا۔ "زمانہ" نے اس سے دو قدم آگے بڑھ کر سماجی، معاشرتی اور قومی موضوعات پر مختلف فرقوں کے دانش وروں کو اپنے مرکز پر مجتمع کیا۔

منشی دیا نرائن نگم کے پاس ایک جامع رسالے کا واضح تصور تھا۔ اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

> "حالاتِ زمانہ پر پورے غور و فکر کے بعد نیک، محتاط اور دور اندیشانہ مشورہ دینے کے علاوہ ایک رسالہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ باہمی میل جول اور قومی اخوت و اتحاد کے اصولوں کو محبت اور صداقت کے ساتھ فروغ دے۔ روزمرہ خانہ جنگیوں کے شور و غل میں حل طلب معاملات اور مسائل پر کسی ایک فریق یا جماعت کا طرف دار بن کر نہیں بلکہ تمام

ملک اور سب قوموں کا بیچ اور منصف ہو کر ملک کو
اتفاق اور اتحاد کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے
کی ہدایت کرنے اور اپنے پاک فرائض ادا کرنے
میں ضمیر اور اپنے خدا کی خوشنودی کے سوا اور
کسی گروہ اور فرقے کی ناراضی کا خوف نہ کرے۔"
(شمارہ جولائی ۱۹۰۶ء)

یہ بات انھوں نے ایک ماہ نامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کہی تھی لیکن یہ روزنامے اور ہر وقفے کے اخباروں کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔

"زمانہ" کے قلمی معاونوں میں اس دور کے تقریباً سبھی نمائندہ دانش ور شامل تھے۔ ان اہلِ فکر و نظر نے زمانہ کے علمی اور ادبی محل میں ایک ایسا ایوانِ عام سجایا جس کے اجلاس چالیس سال تک پورے ملک کو اُردو کی دولتِ مشترکہ کے اوصاف اور شہ پاروں سے مستفید کرتے رہے۔

منشی دیا نرائن نگم نئے نئے موضوعات پر بلا تفریق مذہب و ملت اچھے قلم کاروں کی تلاش میں رہتے تھے اور اپنے حسنِ سلوک سے انھیں زمانہ کے حلقے میں شامل کرتے تھے۔

"زمانہ" کے لائق ایڈیٹر کی سوچی سمجھی پالیسی میں قومی یک جہتی کی منزلیں سر کرنے کا عزم ہے جس سے کام لینے کی آج اشد ضرورت ہے۔

قومی یک جہتی کے حامی اور متلاشی ہر اخبار کو اپنے کالموں میں ہر فرقے کے قلم کار کے خیالات پیش کرنے چاہئیں۔ اخبار اپنے قارئین کا فورم ہوتا ہے جن کی تعداد ہمیشہ بڑھتی رہنی چاہیے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج صحافت ایک تجارت ہے۔ لیکن یہ تجارت دوسری تجارتوں سے مختلف ہے۔ اس کی مسلمہ اقدار ایسی ہیں جن کا خمیر انسان دوستی اور مفادِ عامہ سے بنتا ہے۔

یہ بڑے تعجب اور دکھ کی بات ہے کہ ہندستان میں اُردو صحافت کو ہندو اور مسلم صحافت میں بانٹا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اور نامی گرامی صحافی بھی کھلے عام ان اصطلاحوں کا استعمال کرتے ہیں۔ برطانوی راج کے زمانے میں ریلوے اسٹیشنوں پر جیسے ہندو پانی اور مسلم پانی۔ ہندو روٹی اور مسلم روٹی کی آوازیں لگتی تھیں اسی طرح آج اُردو اخباروں کے کالموں میں ہندو اخبار اور مسلم اخبار کے عنوان لہرائے جاتے ہیں۔

ہم اکثر اعتراض کرتے ہیں اور بجا طور پر کرتے ہیں کہ ایک غیر ملکی زبان انگریزی کے اخبارات کو قومی پریس کیوں کہا جاتا ہے جب کہ یہ اصطلاح ملکی زبانوں کے اخبارات ہی کے لیے موزوں اور مناسب ہے لیکن ذرا سوچیے کہ جب ہم خود اپنی صورت اور سیرت کو ہندو اور مسلم پریس کے خانوں میں بانٹ لیتے ہیں تو ہم قومی پریس کی اصطلاح کو فتح کرنے میں کس طرح کامیاب ہوں گے؟

صحافت کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ علم کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ کسی وقت کوئی بات سمجھانے کے لئے یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلم ملکیت کے اخبار یا ہندو ملکیت کے اخبار لیکن اخبار کو کلمہ گو یا جنیو دھاری بنا دینا قومی یک جہتی کے مفاد کی خدمت نہیں ہے بلکہ اس کے لیے مضر ہے۔ کیا مسلم گھی کہتے ہیں یا کسی ہندو صنعت کار کے کارخانے میں بننے والے ریڈیو سیٹ کو ہم ہندو ریڈیو کہتے ہیں؟ صحافت کو خواہ آپ تجارت سمجھیں، مشن سمجھیں یا خدمت سمجھیں یہ طے ہے کہ مذہب کا جامہ پہن کر قومی یک جہتی کو فروغ نہیں دے سکتی۔

ہمارے ملک میں مذاہب کی رنگا رنگی ہے۔ لیکن ہمارا ملک سیکولرازم اور جمہوریت نواز ہے۔ یعنی کثرت میں وحدت اور اس کی بقا و ترقی میں ہر شہری کا رضاکارانہ تعاون ایک بنیادی کڑی ہے۔ سیکولرزم اور جمہوریت ہمارے آئین کی اساس ہیں۔ ہر شہری کو اختیار ہے کہ وہ اپنی خواہش اور پسند کے مذہب اور طریقۂ عبادت کی پیروی کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ دوسرے شہری کی خواہشات کا احترام کرے۔

بدقسمتی ہے ہمارے کچھ ہم وطنوں نے مذہب سے صحیح کام نہیں لیا۔ مذہب کا مقصد نیکی، راستی اور اخلاق کا فروغ ہے۔ ہر مذہب میں راستی اور شرافت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اگر مذہب کی

[illegible] تسلیم حقیقت کو انسانی کردار اور عمل کی بنیاد تسلیم کرلیا جائے تو مذہب کا بھی کوئی مذہب نہیں یعنی تمام مذاہب بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ صرف اسی کا مذہب نیکی اور شرافت کا راستہ دکھاتا ہے تو یہ اس کی غلط اندیشی اور لاف زنی ہے۔ اپنے مذہب کو کسی دوسرے مذہب سے برتر بنانے کی کوشش کرنا قومی یک جہتی سے وفاداری نہیں ہو سکتی۔

مذہب فرقہ پروری کا نام نہیں ہے۔ یہ حقیقتاً انسان دوستی ہے، دادرسی ہے، دردمندی ہے اور احترام، اخوت و محبت ہے، انسانی یک جہتی ہے۔ لہٰذا ہمارے جو صحافی ہندو پریس یا مسلم پریس کے چھاتے سے قومی یک جہتی کی مخالف ہواؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں وہ نہ تو کل اس تحریک کے خیر اندیش تھے نہ آج اس کے خیر اندیش ہوں گے۔

صحافی اچھی قدروں اور فلاح عامہ کو فروغ دیتا ہے۔ قومی یک جہتی جو ہمارے ملک کی اچھی قدروں میں سرفہرست ہے آج اس سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کے احترام اور ان کے بنیادی اوصاف کی حمایت کرے۔

بہتر تو یہ ہے کہ صحافی مذہبی معاملوں پر قلم اٹھانے سے احتراز کرے۔ لیکن چونکہ ہمارے ملک کے ہر طبقے میں مذہب سے صدیوں سے پرانی رغبت ہے لہٰذا اگر کبھی مذہبی موضوع پر قلم اٹھانا ضروری ہو تو کسی بھی مذہب کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔

ہمارے عوام مذہبی تہواروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ صحافی کو ایسے موقعوں پر ان سے نزدیک آنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ہر مذہب کے تہوار کے موقع پر نہ صرف انھیں پیغام تہنیت دینا چاہیے بلکہ اس تہوار کی اہمیت پر اچھا اور پُر احترام مواد چھاپنا چاہیے۔ قومی یک جہتی کے وفادار اخبار میں ملک کے ہر فرقے کی تاریخ، ثقافت اور فلاسفی پر مواد شائع ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ عید، دیوالی، بسنت، ہولی، بیساکھی جیسے تہواروں کو مشترکہ طور پر منانے کے رواج کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

آزادی سے پہلے کئی لوگ صرف نعرے لگا کر اور جلسے سجا کر ہی ہیرو بن جاتے تھے۔ لیکن آج آزادی جو ایک عظیم نعمت اور ایک قوم کے کردار کی پہچان ہے، اپنے ہر چاہنے والے سے مخلص اور ٹھوس عمل چاہتی ہے۔ آج قومی یک جہتی کا کام فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے جذباتی نعرے لگانے یا حسن گفتار اور زور کلام دکھانے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ ایک ایسا ذہنی رویّہ اپنانے اور نبھانے کا تقاضا کرتا ہے جس کا عملی اور کرداری اظہار زندگی کے ہر شعبے میں ہو۔

صحافی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے قارئین کو ایک ایسے ماحول میں رکھے جہاں انھیں اپنی ہر مسرت اور ہر مشکل میں ہر شہری شریک نظر آئے۔

برطانوی راج نے اپنے تسلط کو مضبوط اور طویل کرنے کے لیے اپنی نفاق پرور حکمت سے ہمارے قومی یک جہتی کے اس جذبے اور تصور کو جو صدیوں سے ہماری روایات کا حصہ تھا، متاثر کر دیا تھا۔ اس حکمت اور سیاست کو ہمارے کچھ طبقوں نے کیوں قبول کر لیا تھا، یہ ایک پرانی بحث ہے جسے آج چھیڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس بحث کے موضوع پر حتمی فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی دو قومی نظریے کا عنوان بھی ختم ہو گیا ہے۔

اب یہاں سیکولرازم پر مبنی ایک متحدہ قومیت کا عقیدہ مسلم اور مروّج ہے۔ اب یہاں کسی ایک فرقے کا راشٹر نہیں بنے گا۔

کسی بھی ملک یا قوم کا سارا ماضی خوش کن نہیں ہوتا لیکن دانا اور ترقی پسند قومیں اپنے ماضی کی تلخی سے اپنے دل و دماغ کو تلخ نہیں کرتیں بلکہ ان سے ایسے اسباق اخذ کرتی ہیں جو مستقبل کو بہتر اور مسرت بخش بنائے۔ اس سلسلے میں سب سے اچھا سبق یہ ہے کہ فرقہ واریت ایک نہایت نقصان دہ چیز ہے۔ اس سے ملک یا مذہب کا کوئی بھلا نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا چاہیے۔

لیکن بدقسمتی سے آزادی کے بعد بھی بعض سیاست داں ذاتی اور گروہی مفاد کے لیے پرانے ہی نظریے اور طریقے استعمال کر رہے ہیں لیکن حیرت اور بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے کچھ صحافی بھی سیاست

کے اس گھناؤنے کھیل میں شامل ہوجاتے ہیں اور اپنے کالم اس کے لیے پیش کردیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کی اشاعت اور دکان داری میں اضافہ ہوگا۔

کچھ لوگ یہ بھی تصور کرتے ہیں کہ فرقہ وارانہ سیاست سے ان کے فرقے کی پہچان (Identity) قائم رہے گی۔ لیکن منفی طریقوں سے نہ تو صحافت کا بھلا ہوسکتا ہے نہ کسی فرقے کا۔ ایسے طریقے عمل اور ردعمل کی مذموم گردش میں آجاتے ہیں اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی کھیتی لہلہاتی رہتی ہے۔

کچھ لوگ تحریک آزادی کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اپنے فرقے کے سینانیوں اور سورماؤں کے شمار پر زور دیتے ہیں۔ یہ جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف ہے اور ٹھوس واقعات سے جہالت اور غفلت کا اعتراف ہے۔

ایسی بدعتوں اور کوتاہیوں کے ضمن میں اُردو صحافت کو چوکس رہنا چاہیئے۔ اگر قومی یک جہتی میں ہمارا ایمان پختہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس ایمان کو کمزور کرنے والی چالوں کو نہ پہچان سکیں۔

صحافی کو اس نام نہاد لیڈر کی باتوں کے لیے اپنے کالم نہیں کھولنے چاہیئں جو مذہب کے لیے خطرے کے الارم بجاتے رہتے ہیں اور ہماری توجہ اور قوت کو غلط راہوں اور مقصدوں میں ضائع کردیتے ہیں۔

آج ہمارے پاس ہمارا آئین ہے جس کا نفاذ ملک کے ہر شہری پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ اس میں ہر شہری کی شخصی، سماجی اقتصادی، تعلیمی اور روحانی ترقی کی ضمانت دی گئی ہے۔ ہم سب کی فلاح اسی آئین کے اطلاق میں ہے۔ ہماری ساری صلاحیت اور کوشش اسے عملی اور ہمہ گیر صداقت بنانے پر صرف ہونی چاہیئے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ہر مرحلے پر ایک سیکولر انداز فکر اختیار کریں، اور ہر طرف سیکولر ماحول کی پرورش کریں۔ لوگوں کو فرقہ واریت کے خیالات سے ہٹاکر سیکولر خیالات پر مرکوز کریں۔ اگر ہماری صحافت پختگی سے سیکولرزم یعنی رواداری، وسیع القلبی و وسیع المشربی اور انسان دوستی کی راہ پر چلے تو ہم سب کے مذاہب اور فرقے تحفظ اور توانائی حاصل کریں گے۔

ہماری گنگا جمنی وراثت کی حفاظت کا کام سرکاری اداروں سے کہیں زیادہ خود عوام اور ان کی ترجمانی کرنے والی صحافت کا ہے۔ اقتدار کی جانب سے اس کے حق میں ہونے والا اعلان یا سرٹیفیکیٹ اس کی سطح اور نوعیت ہی بدل دیتا ہے۔

آج قومی یک جہتی محض فرقہ وارانہ معاملہ نہیں ہے بلکہ سماج کے ہر طبقے کی بہتری اور ترقی کا معاملہ ہے اور دراصل قومی یک جہتی کے اسی پہلو کا تعلق حکومت سے قائم ہوتا ہے۔

اس ضمن میں صحافی کا فرض یہ ہے کہ وہ ایک معروضی انداز سے حکومت کی توجہ تشنہ گوشوں کی طرف مبذول کرے اور مفاد پرست لوگوں کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرے جو ہر فساد کی تعبیر فرقہ وارانہ زاویے سے کرتے ہیں۔

> قومی یک جہتی کے نیک کام کو جذبات کی سطح سے اوپر اُٹھ کر ایک ٹھوس اور کارگر پروگرام بنانے کی ضرورت ہے خوش قسمتی سے یہ کام اُردو زبان اور اس کی صحافت کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اور وہ اس پسندیدہ کام کو خوش مزاجی خوش خیالی اور خوش دلی سے سرانجام دے سکتی ہے۔

غزلیں

ڈاکٹر نور حسن ہاشمی
[illegible] قطب پور، ڈالی گنج
لکھنؤ

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

جب تری زلفیں ترے رُخ پر پریشاں ہوگئیں
یہ گھٹائیں باعثِ حسنِ گلستاں ہوگئیں

ہمت اُس کی ہے کہ جس کو صبر کرنا آگیا
مشکلیں پڑنے نہ پائی تھیں کہ آساں ہوگئیں

جن سے تھی اپنی نظر میں تازگی دل میں سرور
صورتیں یارب وہی نظروں سے پنہاں ہوگئیں

دل میں ارمانوں امیدوں کی وہ بزم آرائیاں
دیکھتے ہی دیکھتے خوابِ پریشاں ہوگئیں

دیکھیے انساں کب پائے توہم سے نجات
ہائے وہ رسمیں جو اپنا دین و ایماں ہوگئیں

واہ کیا کہنا ترا، اے حسنِ روئے بے نقاب
دیدہ و دل میں مرے شمعیں فروزاں ہوگئیں

اب کہاں پائیں ہم ان صدیوں کے آثار و نشاں
مثلِ موجوں کے جو ساحل سے گریزاں ہوگئیں

چلتی پھرتی صورتیں جو آج ہیں کل دیکھنا
باعثِ آبادیِ گورِ غریباں ہوگئیں

جب کبھی کلیوں سے پوچھا ہم نے انجامِ بہار
منہ بنا کر مسکرائیں اور خنداں ہوگئیں

دیکھ لینا ہاشمیؔ گر ایٹمی جنگیں چھڑیں
بستیاں دنیا کی صحرا و بیاباں ہوگئیں

منوّر بستوی
جوائنٹ ایڈیٹر ماہنامہ "اجیار"
سمریاواں بازار ۔ بستی

اقبالِ جرم کر چکا بختِ سیاہ کیا
ہونے لگا ثواب میں شامل گناہ کیا

جب چھُٹ چکا ہے دامنِ اُمید ہاتھ سے
اس بے وفا کے ساتھ اب ہوگا نباہ کیا

کہتی ہے کس ادا سے تمنا حیات کی
بھولے ہوئے ہو پیار میں منزل کی راہ کیا

اب جا کے رحمتوں نے ہے کی چشمِ التفات
پہنچی ہوئی ہے تا بہ فلک میری آہ کیا

آئی ہنسی کبھی، کبھی آنسو نکل پڑے
رنگین داستانِ محبت ہے واہ کیا

جیسے جہاں میں لطفِ غمِ زندگی نہیں
کم ہوگئی ہے دل سے زمانے کی چاہ کیا

یوں ہی خرابِ حال رہے گی مری طلب
یوں ہی ہوا کرے گی تمنا تباہ کیا

اندازِ جرمِ عشق کو ثابت جو کر سکیں
ایسے ملیں گے تجھ کو منورؔ گواہ کیا

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۱۰۷ - اشفاق اشعر مارگ
لکھنؤ - ۲۲۶۰۱۸

شبلی بحیثیت انشا پرداز

انیسویں صدی عیسوی، اُردو زبان کی ترقی، توانائی، زندگی اور بقا، کا پیغام لے کر آئی۔ اسی صدی کے آغاز میں اردو نثر کو 'حیات نو' نصیب ہوئی۔ اسی صدی میں اُردو زبان کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے زباں دانی، شاعری اور نثر نگاری کے اپنے جوہر دکھائے۔ غالب، مومن، ذوق، ظفر دلّی میں۔ ناسخ، آتش، دیا شنکر نسیم، انیس و دبیر لکھنؤ میں، اپنی نغمہ سنجیوں اور سحر نگاریوں سے عوام و خواص کے قلوب کو مسخر و مسحور کر رہے تھے۔ انھیں بزرگوں اور باکمالوں کے عہد میں اردو کے عناصر خمسہ۔ سر سید احمد خاں، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے۔ جنھوں نے اپنی خداداد ذہانت اور فطری صلاحیتوں سے کام لے کر، اُردو کو تاج محل سے زیادہ حسین و دلکش، جنت نظیر کشمیر سے زیادہ پُرفضا و صحت بخش، بحرِ بے کنار سے زیادہ وسیع و کشادہ اور کوہ ہمالیہ سے زیادہ بلند و باوقار بنا دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے خونِ جگر سے چمنستانِ اردو کو سیراب کر کے اسے سدا بہار بنا دیا۔ ان کے علم و فضل و کمال نے زبان و بیان، مواد اور ہیئت کے اعتبار سے شعر و ادب کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے برابر ہو گیا۔

سر سیّد علم و عمل کے آفتاب تھے، نذیر احمد نے خاص طور پر ناول لکھنے کی طرف توجہ کی اور اُردو ادب میں پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل کیا۔ محمد حسین آزاد نے اپنی انشا پردازی کا کمال دکھایا اور اُردو کو 'آبِ حیات' عطا کیا۔ حالی نے نثر و نظم دونوں میں ادب اور زندگی کے رشتے کو استوار کرنے کے لئے، تنقید و سوانح کا نثر میں اضافہ کیا اور نیچرل اصلاحی اور جدید شاعری سے اُردو شاعری کو مالا مال کر دیا۔

شبلی ان سب سے عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود اپنی خداداد ذہانت و صلاحیت کی بدولت، ہمہ گیر علمی ادبی خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت، بے مثل ادیب و شاعر، مورخ و فلسفی، نقاد و محقق، سوانح نگار، سخن سنج اور سخن فہم تھے۔ علم و ادب انھیں فطری لگاؤ تھا، ادب پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ وہ بحر ادب کے غواص معانی تھے۔ ان کے اسلوب نگارش میں سنجیدگی اور توازن کے ساتھ ساتھ دل کشی و رعنائی اور شگفتگی بھی ہے۔ مہدی افادی کے الفاظ میں:

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اُردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو، جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے جو ایوں پر آئی ہوئی بجلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعراء سے گاڑھا اتحاد رہا، بہ اقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا لیکن یہ

باتوں کی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی ....
ا... تے میں تو بگاڑی بن جاتی ہے اب وہ
مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے۔ لیکن
سنا گیا ہے کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ
مانوس ہے اور قریب قریب انھیں کے تصرف
میں رہتی ہے۔" [illegible]

خوش اوصاف شبلی نے اُردو کو اپنے تصرف میں لے کر اس کی آبرو کو بڑھایا۔ اس کے حسن و جمال کو وہ رعنائی و زیبائی اور دلکشی عطا کی کہ ایک عالم اس کا شیدائی ہو گیا۔ اس کے انداز بیان کو وہ شیرینی و نزاکت، فصاحت و سلاست بخشی کہ ہر ایک اس کا اسیر ہو گیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گیسوئے اُردو کو سنوارنے میں شبلی نے بڑے سلیقے اور شعور، بڑی محنت اور محویت سے کام کیا۔ عروسِ اُردو کی مشاطگی میں ان کا جواب نہیں۔

علامہ شبلی نے بہت کچھ لکھا اور ہر موضوع پر لکھا۔ فلسفہ و مذہب، تاریخ و تنقید، تحقیق و سوانح وغیرہ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو، جو ان کی دسترس سے باہر ہو اور جس میں ان کی قابلیت و صلاحیت کے ساتھ ساتھ سلاست، روانی، سادگی اور شگفتگی نہ پائی جاتی ہو۔ نذیر احمد کی خوش طبعی و محاورہ بندی، آزاد کی ادبی نفاست و سحر نگاری، حالی کی سلاست و سادگی کا حسین مرقع شبلی کی نثر ہے۔

شبلی نے ترقی پسند طبیعت پائی تھی۔ ان کے دل میں قدیم اور صالح روایات کا احترام تھا۔ "وہ خود ایک دُور بین نظر اور نقد پسند طبیعت رکھتے تھے۔" [illegible]

زبان کی لطافت، خیالات کی وسعت، مذاق کی پاکیزگی، نگاہ کی بلندی اور بیان کی شگفتگی میں وہ اپنے معاصرین پر سبقت رکھتے تھے۔ وہ عروسِ ادب کے "آشنائے ازلی" تھے۔ سرسید کی صحبت فیض اثر، اور علی گڑھ کے قیام نے، ان کے ادبی اور تخلیقی ذہن کو جلا بخشی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے ادبی کارناموں میں وسعت و جامعیت اور افادیت پیدا کرنے میں مجدد ادب سرسید کی قربت و صحبت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ عصری رجحانات اور زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور زمانے کا رنگ پہچاننے اور ان سب کو دلآویز انداز میں بیان کرنے میں انھیں بڑا سلیقہ تھا۔ ہندستانی یا مشرقی ادب پر تو انھیں دسترس حاصل ہی تھی۔ مغربی علوم اور ان کے اثرات سے بھی وہ ناواقف نہ تھے۔ ہندی اور دوسری ہندستانی زبانوں کا بھی علم رکھتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اردو زبان کی زندگی اور ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ اس میں دیسی بھاشاؤں کے مروجہ مقبول الفاظ، تلمیحات، تشبیہات وغیرہ کو حسب موقع استعمال کیا جائے اور عربی و فارسی کے ایسے مشکل اور ناقابل فہم الفاظ و تراکیب جن کو عوام تو عوام، خواص بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں، کم سے کم استعمال کیے جائیں۔ اسلوب نگارش میں تصنع اور تکلف کے بجائے سادگی اور صفائی اس طرح اختیار کی جائے کہ روکھاپن نہ آنے پائے۔ ایک ماہر اور ہوشیار نگینہ ساز کی طرح وہ الفاظ کے نگینوں کو مناسب اور موزوں جگہ پر خوش سلیقگی کے ساتھ جوڑنے کا فن خوب جانتے تھے۔ ان کی ادبی نگارشات ان کے ذوقِ نظر اور حسنِ انتخاب کا ثبوت ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے معاصرین میں مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی ہر موضوع میں اپنا کمال دکھاتی ہے۔ ان کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ مولانا شبلی کو تو آزاد کی گپیں بھی وحی معلوم ہوتی تھیں :-

"اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی
معلوم ہوتی ہے۔" [illegible]

مولانا نذیر احمد نے اُردو کے دامن کو دلی کی ٹکسالی زبان، اُردو عربی اور فارسی، یہاں تک کہ انگریزی کے محاورات اور روزمرہ کے اقوال و فقرات سے مالا مال کیا، اس کو متانت آمیز ظرافت بخشی۔ ان کی اُردو کو "سو تیا نہ اردو" کہنا ادب سے کم آگہی کی دلیل ہے یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں ان کی عبارت میں محاورات و فقرات کی بہتات ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ان کی ہمہ گیر طبیعت، علمیت اور قابلیت کی وجہ سے ہے۔ ان کی خدمات اُردو زبان و ادب کے لیے

قابلِ صد فخر و ناز ہیں۔ اُردو ادب ان کے احسانات اور ادبی فتوحات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مولانا حالی کی سیدھی سادی روکھی پھیکی نثر نے اُردو ادب پر جو اثرات ڈالے اور نثر نگاروں کو لکھنے کا آسان اور سیدھا راستہ دکھایا، کوئی کافرِ ادب ہی انکار کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو نثر و نظم کو صحت بخش بنانے کا سہرا حالی ہی کے سر ہے۔ لیکن ان سب میں علامہ شبلی ایسے منفرد و شگفتہ نثر نگار ہیں کہ ان کی نگارشات وسعت و افادیت اور مقبولیت میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۵۳

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پروفیسر احتشام حسین کی رائے ہے کہ

"حالی اور آزاد کے درمیان میں ایک شگفتہ اور دل نشین انداز نکال کر علامہ شبلی نثر نویسی کی اس نئی راہ پر چل پڑے جو بیک وقت سادہ اور پُرکار ہے۔" ۵۴

شبلی نثر میں حسن و کشش پیدا کرنے کا گُر خوب جانتے تھے۔ فصاحت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ۔

"ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لیے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ ان کی لطافت شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لَے میں ان کے مناسب ہوں"۔ ۵۵

ایک اہم نکتہ یہ بھی بتایا ہے کہ جملہ یا شعر میں اگر سب الفاظ فصیح ہوں لیکن ان کی ترکیب ایسی ہو کہ گرد و پیش کے الفاظ لَے میں مناسب نہ ہوں تو اس شعر میں شیرینی و روانی باقی نہیں رہے گی، اور اس میں ثقالت اور بھدا پن پیدا ہو جائے گا۔ جیسے

ع زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے (مرزا دبیر)

"اس میں جتنے الفاظ ہیں سب فصیح ہیں لیکن ان کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوا ہے وہ اس قدر بھدا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی"۔ ۵۶

یہ باتیں صرف نظم یا شعر کے لیے ہی ضروری نہیں ہے۔ نثر میں بھی ان کی ضرورت ہے۔ اگر نثر میں گرد و پیش کے الفاظ میں توازن و تناسب، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی نہ ہو اور موقع اور موضوع کے اعتبار سے ان کو استعمال نہ کیا جائے تو اس میں سلاست و روانی، سادگی و شگفتگی قائم نہیں رہے گی۔ علامہ شبلی اس راز سے واقف تھے۔ ان کے اندر ادبی محاسن و خصوصیات کے تمام امکانات بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ان کا اندازِ تحریر دلکش و دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح و سلیس ہے۔ وہ بڑے سے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ، خشک اور اہم موضوع کو اس آسانی اور روانی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے ۵۷

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شبلی کی تحریر میں یہی لذت اور تاثیر ہے۔ وہ دل کی بات زبان سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سننے والا یا پڑھنے والا متاثر و مسحور ہو جاتا ہے۔ ان کا مبلغِ علم، ان کی وسیع النظری، ان کی رنگا رنگ طبیعت، حسن پسند فطرت، ان کی ہمہ دانی و جدت پسندی، ان کی سادگی و پُرکاری، ان کے ذوقِ ادب کا معیار الفاظ کے پیکر میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ رنگین نگاہوں کے اثر سے ان کے جذبات کی دنیا رنگین ہو جاتی ہے اور اس کا اظہار رنگین الفاظ میں اس انداز سے کرتے ہیں کہ متانت وجد کرنے لگتی ہے۔ وہ اُردو کے پہلے نہ سہی لیکن ممتاز بلند پایہ مصنف، سحر نگار ادیب اور منفرد انشا پرداز ہیں انھوں نے مغرب کے اسلوبِ نگارش سے مستفیض ہو کر مشرقی ادب (اردو) کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیے۔ سر سید کا فیضِ صحبت بیت العلوم سے قربت، سر سید کی تعلیمی تحریک میں شرکت نے

ان کے ذوقِ ادب کو سرآتش بنا دیا، لطافت و نفاست عطا کی۔ جدید علوم و فنون کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر اردو کے اسالیب میں دلآویزی و ہمہ گیری، وسعت و رفعت، جدت و ندرت پیدا کی۔ یہ اسلوب بیان شبلی کا خاص عطیہ ہے۔ غالب کے خطوط کی طرح شبلی کی نثر بھی آپ اپنا جواب ہے۔

شبلی کی انشاء پردازی کی نمایاں اور بنیادی خصوصیت، نفاست و سلاست، سادگی و شگفتگی، دلکشی و رعنائی، لطافت و نزاکت ہے۔ ان کی عبارت میں نہ تو بے ربطی ہے نہ پھیکا پن اور خشکی بلکہ اس میں ایک لطیف آہنگ، بلیغ موسیقیت اور دلآویز ترنم پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ترتیب الفاظ اور ندرت تراکیب سے اردو زبان کے مروجہ معیار کو وسیع و رفیع بنا دیا۔ ان کی تخلیقات۔ ادب، تاریخ، مذہب، فلسفہ، تصوف، سیرت و سوانح، تنقید و تحقیق سب میں ان کا مخصوص اور سحر آفریں اسلوب نگارش موجود ہے۔ قاری ان کو پڑھ کر شبلی کی زبردست قادر الکلامی اور ہمہ دانی کا قائل ہو جاتا ہے اور ان کی علمی و ادبی، تنقیدی و تحقیقی، لسانی و تاریخی بصیرت کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شبلی نے آنے والی نسلوں کو ادب کی ایک ایسی نئی، وسیع اور دلکش شاہراہ دکھائی جس پر چل کر وہ دنیائے ادب میں کامرانی و شادمانی کی منزل تک پہنچ سکتی ہیں۔ علامہ شبلی نے ہر موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ ان کا ذخیرۂ ادب پچاس ساٹھ ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ ذخیرۂ ادب اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ مہدی افادی کے الفاظ میں:۔

"یہ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں 'مقدلتِ عالیہ' (ہائر کریٹی سزم) کہتے ہیں۔ شبلی میں ایک خاص درجہ کا مادہ اختراعی تھا..... وہ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجہ کے مورخ، اعلیٰ درجہ کے ناشر، اعلیٰ درجہ کے شاعر، غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصنافِ سخن کے پورے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح ان کا معیار تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے کہ سیکڑوں برس بعد بھی ان کی تصنیفات ٹکسال باہر نہیں ہوں گی۔ ایسا جامع حیثیات مصنف غالباً اب پیدا نہیں ہوگا۔" ۵۷

ممکن ہے کہ مہدی افادی کی اس تعریف و توصیف کو مبالغہ سمجھا جائے اور نگارشاتِ شبلی کا معیار ادب العالیہ کے مساوی تسلیم کرنے میں بعض حضرات کو تامل ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ

"شبلی اسلوب بیان کی باریکیوں، لطافتوں اور نزاکتوں کے محرم راز تھے۔" ان کے "سارے ضخیم دفتر میں جہاں سے جس نوشتہ کو بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے، مصنف کے اونچے معیار سے گرا ہوا آپ نہ پائیں گے اور مصنف کی زبان حال یہی صدا لگاتی ہوئی سنائی دے گی

ع ہے قلم میرا تیغ جوہر دار" ۵۸

مہدی افادی کی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی بھی معترف و معتقد تھے کہ:۔

"شبلی کو یکتائی فن تصنیف میں حاصل تھی۔ رزم ہو یا بزم، دونوں کا سماں صحیح کھینچنے میں طاق، موزوں لفظ، مناسب فقرے، متناسب ترکیبیں لانے میں مشاق، کوئی استدلال کریں گے تو ایسا معقول کہ پہلے ہلے میں تو آپ کا دماغ ان کے ساتھ کھنچ ہی جائے گا۔ رنج کا نقشہ کھینچیں گے تو ایسا کہ آپ پر بھی جذبۂ غم طاری ہوئے بغیر نہ رہے۔ مقام مسرت کی مصوری کریں گے تو ایسی کہ آپ کے دل کا کنول آن کی آن میں کھل ہی جائے۔ کسی شعر کی گرہ کھولیں گے تو ایسی کہ آپ کا وجدان جھوم جھوم اٹھے۔ معرکۂ حرب و ضرب کی تصویر دکھائیں گے تو ایسی کہ خود آپ کی رگِ شجاعت جوش میں آ جائے قلم پر یہ قدرت وہ بھی ایسی ہمہ گیری، اس جامعیت کے ساتھ اکثر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آتی ہے پڑھنے والے گویا موم کی گڑیا ہیں کہ لکھنے والے نے جب اور جدھر چاہا ان کی ناک موڑ دی اور ا نھیں

پتہ بھی چلنے نہ پایا۔" ۹

یہ حقیقت ہے کہ شبلی کا مرتبہ ادب میں نہایت بلند ہے انھوں نے جو کچھ لکھا، سوچ سمجھ کر، اور فہم و بصیرت کے ساتھ لکھا۔ ان کی تحریر میں سچائی، سادگی، اصلیت، جوش اور افادیت بدرجہ اتم موجود ہے ـــــ ادق سے ادق، علمی و فلسفیانہ مسائل کو سلیس فصیح اور بلیغ انداز میں بیان کر دینا علامہ شبلی کی انشا پردازی کی تمام خصوصیت ہے۔

انشا پردازی میں فصاحت و بلاغت دو اہم خصوصیات ہوتی ہیں۔ فصاحت کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہوتا ہے اور بلاغت کا معانی سے۔ فصاحت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ نہایت شستہ ہوں اور ان کا استعمال حسب موقع کیا جائے۔ بلاغت فصاحتِ الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی فصاحتِ معانی بھی ہو۔ علامہ شبلی نے فصاحت و بلاغت کی بحث، موازنہ انیس و دبیر میں مفصل و مدلل کی ہے یہاں ان کا اعادہ مقصود نہیں ہے۔ الفاظ کی صفائی، سلاست، روانی اور شستگی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ ان کو زبان آسانی کے ساتھ ادا کر سکے۔ الفاظ کے بولنے میں حلق کا آپریشن کرانے، اور چہرہ، ہونٹ، زبان، دانت، تالو کے مختلف زاویے بنانے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ بلا کسی تکلف و تکلیف اور تصنع کے آسانی کے ساتھ الفاظ ادا کیے جا سکیں۔ الفاظ ایسے ہوں کہ کان سنیں، اور دل قبول کر لے۔ روزمرہ، محاورہ، تشبیہ و استعارہ وغیرہ کا استعمال برمحل ہو، عبارت نہ اتنی طویل ہو کہ قلب پلٹنے لگے اور نہ اتنی مختصر کہ سمجھنے میں دشواری ہو۔ الفاظ سلیس اور عام فہم ہوں، ان میں رکاکت اور عامیانہ پن نہ ہو۔ ان سب خصوصیات میں علامہ شبلی کی عبارت، انشا پردازی کا بہترین مرقع ہے۔

حامد حسن قادری تحریر فرماتے ہیں:۔

" موقع و مقام اور موضوع و بیان کے مطابق اسلوب اختیار کرنے کے لیے صرف وجدان و ذوق کی رہنمائی شرط ہے۔ قواعد صرف و نحو اور اصول معانی و بیان بھی بغیر ذوق سلیم اور ذہن متوازن کے کام نہیں دیتے

علامہ شبلی ایسا ہی مذاق صحیح اور طبع لطیف رکھتے تھے۔ ہر موقع و محل کے لیے اسی کے مناسب طرز تحریر اختیار کیا، لطیف و نازک استعارہ و تشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر بھی الفاظ کے انتخاب، مرکبات اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حسن تناسب ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کی عبارت میں نہایت دل کشی و دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ لطافت خیال، دقتِ نظر، وسعتِ تحقیق، قوتِ استدلال سے مضمون میں ندرت و جدت اور تاثیر و دلفریبی پیدا کر دیتے ہیں۔ عظمت و اہتمام کے موقع پر شان دار الفاظ اور موزوں ترکیبوں سے شان و شوکت دکھاتے ہیں۔ دلائل اور مثالوں کے انتخاب و ترتیب میں ان کا حسنِ نظر اور ذوق سلیم نمایاں ہے جس موقع پر دوسرے مصنف معمولی سامنے کی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں وہاں علامہ شبلی نادر و عجیب مثالیں تلاش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کے متعلق سر سید دیباچہ 'المامون' میں لکھتے ہیں:

" ایسی صاف اور شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی رشک آتا ہوگا۔" ۱۰

والمامون، تصانیف شبلی میں بہترین کتاب نہیں ہے لیکن اس کتاب سے" سیرت نگاری کا جو نیا اسلوب جو زور، رنگینی اور شگفتگی ہے وہ اردو نثر میں نئی چیز تھی اور ہے۔" ۱۱

اس سلسلے میں پروفیسر سید احتشام حسین نے شبلی کا یہ اقتباس پیش کیا ہے:۔

" مامون خود سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا، یاران مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعرا کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزم عیش آراستہ

تھی۔ بادہ و جام کا دور تھا۔ بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس پہنے گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زریں زنار، ہاتھوں میں گلدستے لیے ہوئے بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا۔ بے ساختہ چند اشعار زبان سے نکلے اور احمد بن صدقہ ایک مغنی کو بلا کر شعروں کے گانے کی فرمائش کی۔ احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنے کھڑی ہو گئیں ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے۔ وہ بالکل سرشار ہو گیا اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے قدموں پر تین ہزار اشرفیاں نثار کی جائیں۔" ۱۲؎

شعر و شاعری پر بحث مولانا حالی نے بھی کی ہے۔ ان کا مقدمہ شعر و شاعری صحیفہ تنقید ہے۔ انھوں نے جس گہرائی اور گیرائی سے مشرقی شاعری اور اردو شاعری کا جائزہ لیا۔ شعر، شاعر اور شاعری کی جس طرح تشریح و توضیح کی اس سے اردو دنیا قریب قریب بے خبر تھی۔ اس لیے حالی کی اولیت و اہمیت کو سب نے تسلیم کیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی عبارت میں وہ زور اور کشش نہیں ہے جو اسی موضوع پر شبلی کے اسلوبِ نگارش میں ہے۔ مثلاً شاعری کی تدریجی ترقی اور اس کے زوال پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"شاعری کی یہی حالت ہے۔ ابتدا میں سیدھے سادے، صاف صاف اور بے تکلف خیالات ہوتے ہیں، تشبیہات اور استعارے کہیں کہیں آجاتے ہیں الفاظ میں تراش خراش نہیں ہوتی، جس مضمون کو بیان کرنا چاہتے ہیں بغیر کسی اینچ پینچ کے بے تکلف، ادا کرتے ہیں، اس سے آگے قدم بڑھتا ہے تو خیالات کی بلندی شروع ہوتی ہے، استعارے رنگین ہو جاتے ہیں، تشبیہوں میں نزاکت آجاتی ہے مبالغہ کا زور پیدا ہو جاتا ہے، الفاظ میں تراش خراش شروع ہو جاتی ہے، جس مضمون کو ادا کرتے ہیں استعاروں کے رنگ میں ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد دقت آفرینی اور باریک بینی شروع ہوتی ہے۔ مبالغے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں، بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ استعارہ میں استعارہ پیدا کرتے ہیں، محسوسات سے گزر کر صرف خیالی چیزوں پر مدار رہ جاتا ہے۔ یہ ترقی کی آخری منزل ہے جو تنزل سے ہمدوش اور ہم آغوش ہے۔" ۱۳؎

اس میں جو لطافت و روانی، سادگی اور صفائی ہے وہ مولانا حالی کے حقیقت نگار قلم کی عبارت میں اس خوبی و دلکشی کے ساتھ نہیں ہے۔

علامہ شبلی کے قلم نے ہر موضوع، فلسفہ، تاریخ، تنقید وغیرہ میں انشاء پردازی کے جوہر دکھلائے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:۔

"کوئی سا بھی علمی مضمون ہو، شبلی کے ہاں عبارت میں کہیں سے بھی جھول نہ ملے گا اور نہ کہیں سے اناڑی پن کھلنے پائے گا اور یہ شرف معمولی نہیں غیر معمولی ہے..... شبلی اس حیثیت سے اپنی بس آپ ہی نظیر گزرے ہیں۔" ۱۴؎

علامہ شبلی کی رنگین و پرکیف انشاء پردازی کا مرقع خطوط شبلی ہیں۔ خصوصاً وہ خطوط جو انھوں نے عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام لکھے ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ حسن و جمال، دلکشی و رعنائی کا پیکر ہے۔ حسن سادہ میں جو دلآویزی و زیبائی جو محبوبیت اور جاذبیت ہوتی ہے وہی ان خطوط میں موجود ہے۔ ان خطوں میں مکتوب نگار کا دل دھڑکتا ہے۔ پاسبانِ عقل کا دُور دُور تک پتہ نہیں، دل پر محبت و محویت کا غلبہ ہے وہ اپنے جذبات و احساسات کو بے ساختہ زبان قلم سے ادا کرتا ہے۔ خلوص و محبت، الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر، قیامت نامہ بن گئی ہے۔ ان قیامت ناموں

یا محبت ناموں کے چند جملے پیش ہیں :-

" تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگا لیا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا "

" میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے، اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے بھیجتا ہوں. وہ میری قائم مقامی کرے گی "

عطیہ کے خطوط کی تعریف میں رطب اللسان ہیں :-

" اب تو تمہارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں پائیکس کے متعلق تمہارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے الہ آباد اور حیدر آباد بھیجے۔ ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں' وانا اوّل العابدین ' اور میں پہلا پوجنے والا ہوں گا "

" عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے. میرا ہر رونگٹا [redacted] ہوئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے "

ان خطوں کے علاوہ مولانا کی انشاء پردازی کے کمال سے سیکڑوں مقالات بھرے پڑے ہیں یہ مقالات آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان میں ہر موضوع پر مضامین ہیں جن سے مولانا شبلی کے تبحر علمی اور دقتِ نظر اور وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو کس قدر خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرنے کا ملکہ رکھتے تھے اگر ان کی ہر تصنیف سے انشاء پردازی کا ایک ایک مختصر نمونہ ہی پیش کیا جائے تو وہ خود ایک ضخیم کتاب ہو جائے ۔ اس مضمون میں گنجائش کہاں . ؟ مولانا شبلی کی انشاء پردازی کے یہ چند اقتباسات ہی ان کے منفرد و باکمال انشاء پرداز ہونے کا ثبوت ہیں لیکن ان کی انشاء پردازی کے جیسے اور جتنے شاہکار حق و صداقت کی ترجمانی کرنے میں موجود ہیں، دوسرے موضوعات میں کم ہیں.

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے

" مذہبیت مولانا کی تصنیفی زندگی پر چھائی ہوئی تھی شعر ہو، ادب ہو، تاریخ ہو، سوانح عمری ہو، کچھ ہو مولانا متکلم سب سے پہلے تھے اور کچھ اور بعد کو ــــــ شعر العجم ایک خالص علمی و ادبی کتاب ہے... اس کو مذہب سے کیا واسطہ ؟ لیکن نہیں ذرا ملاحظہ ہو کہ گریز سے قبل اس قصیدہ منیمہ کی تشبیب میں مولانا کا قلم کس رنگ کے موتی پروتا ہے :

" اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا. جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی ۔ جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا ۔ ترک شجاع تھے شجاع تر ہو گئے ۔ ایرانی ہمیشہ سے تہذیب معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے ۔ اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا "

ہم مولانا کی انشاء پردازی کا بہترین شاہکار سیرۃ النبی صلعم سے اقتباس پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ۔ مولانا نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کو جس والہانہ انداز میں لکھا ہے اس کی مثال اُردو ادب میں مشکل سے ملے گی ۔

" چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں ۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں ۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے ۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے ۔ چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا ۔ کارکنانِ قضا و قدر کی

بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاسِ پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جاں نوازیِ مسیح، سب اسلیے تھے کہ یہ متاعِ گراں ارزشہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے..... آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔"

شبلی کی طرح ان کی اعلیٰ انشاء پردازی کا خاتمہ بالخیر بھی سیرۃ النبیؐ پر ہوا. وہ سیرۃ النبیؐ کو اپنی آخری تصنیف بنانا چاہتے تھے اللہ پاک نے ان کی یہ آرزو پوری کی ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

کون انکار کرسکتا ہے کہ ان کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوا؟ اور وہ اپنی سیرت و شخصیت اور تصنیف میں یگانہ روزگار نہیں تھے؟ مولانا حالی نے سچ کہا ہے ؎

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

حواشی

۱؎ افادات مہدی صفحہ ۸۰ - ۹۷،

۲؎ اردو کے بہترین انشا پرداز۔ سعید انصاری صفحہ ۸

۳؎ مکاتیب شبلی مرتبہ سید سلیمان ندوی و شبلی خطوط کے آئینہ میں' شاہ معین الدین

۴؎ شبلی نقادوں کی نظر میں مرتبہ محمد واصل عثمانی

۵؎ انتخابات شبلی۔ سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۱۷

۶؎ موازنہ انیس و دبیر۔ شبلی

۷؎ افادات مہدی صفحہ ۲۷

۸؎، ۹؎ شبلی۔ انسان، مصنف، مصنف گر۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بحوالہ شبلی نقادوں کی نظر میں۔ صفحہ ۲۲-۲۱

۱۰؎ داستان تاریخ اردو صفحہ ۶۳۱-۶۳۰

۱۱؎ تراشے۔ پروفیسر احتشام حسین

۱۲؎ المامون۔ شبلی

۱۳؎ مقالات شبلی۔ شبلی

۱۴؎ شبلی نقادوں کی نظر میں۔ مرتبہ محمد واصل عثمانی صفحہ ۲۴

محمد عارف فرید ایوبی
ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

شبلی کی ذوق آفرینی

نامور ادیب و عالم اور مشہور فلسفی اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ استاد الناقدین و محققین، بیک وقت ان تمام خوبیوں کا مالک ایک شخص ـــ دنیا جسے علامہ شبلی نعمانی کے نام سے جانتی ہے۔ جس کی شخصیت میں تنوع اور تخلیقات میں لطافت اور رنگینی ہے، اگر علامہ شبلی کی تخلیقات کا ایک جائزہ لیجئے تو اس میں اہم مسائل اور عالمانہ بحثیں ملیں گی، طرز بیان سادہ مگر عالمانہ، دل کش مگر ادیبانہ تمام موضوعات سے گہری دل چسپی و تاثر آفرینی بھی دکھائی دیتی ہے۔

تاثر آفرینی کا تعلق ادراک اور فکر سے، اور ادراک یا اس کے نتائج دو قسم کے وسائل سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنے اور سننے سے یعنی حواس اور محسوسات سے، یا پھر پیدا ہوتے ہیں براہِ راست وجدان اور فکر کی راہوں سے جو کہ اس کے ذریعے حاصل شدہ ادراک، خالص فکری اور وجدانی ادراک سے قطعی مختلف ہوتا ہے، یعنی حس اور ادراک میں لذت اور الم کی شدت پائی جاتی ہے۔ جب کہ وجدانی ادراک سے حاصل شدہ، قبض، بست، نشاط، انفعال، نفسیاتی اور ذہنی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس میں ایک کا اثر مسکراہٹ، قہقہہ، چہرے کا دمکنا یا آنسو اور گریہ وزاری وغیرہ، اور دوسرے کا اثر نشاط، سرور، پژمردگی اور سکوت ہے۔ حسی ادراکات جب ظاہر ہوتے ہیں تو وہ دوسروں کو جلدی متاثر کرتے ہیں، اور فکری تاثر کا دائرہ اگرچہ عام اور وسیع ہوتا ہے پھر بھی وہ دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے کسی مدد کا محتاج ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادیب و فلسفی کی صف بندی کی جاتی ہے۔ ایک گروہ اہل فکر کہلاتا ہے اور دوسرا اہل فن، لیکن یہ راستے تو دو ضرور ہیں مسافر بھی دو ہیں، لیکن ان کا آغاز راہ، منزل اور مقصود ایک ہی ہے۔

ہر شخص حسن مقصد، لذت جستجو، آسودگی اور حصول تمنا میں کام کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے شریک راہ ہوں۔ مفکر اور فلسفی حقیقت کو حقیقتوں کے لیے سمجھتا ہے۔ اور ایک ادیب حقیقت کو مجاز کے ذریعے سمجھانے کا قائل ہے۔ ایک کے نزدیک حقیقت اتنی بلند و بالا چیز ہے کہ اسے براہِ راست حاصل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ایک کار مقدس ہے۔ یہ شخص اصول قاعدوں اور منطقی حدود میں رہ کر بات کرتا ہے، جب کہ دوسرا کہتا ہے

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شراب مدام ما

لیکن اس شعر کے خیال میں حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کی دقیق اصطلاح اور مشکل بندش کا سہارا لیا گیا ہے، اور راقم السطور کی رائے میں اگر ادراک حقیقت کو عام کرنا ہے تو لہجہ نرم، عام فہم اصطلاحات ساتھ ساتھ بیان میں بھی کیف ہو۔ مثال کے طور پر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہاں سے گفتگو میں ایک موڑ آتا ہے، اور وہ موڑ ہے ذوق

کا۔ یعنی فکر و فہم کا لطیف امتزاج، معلومات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ وسعتِ ذہن بھی ہونا چاہیے۔ بات کو سمجھنے اور سمجھانے کے علاوہ ایک ہی بات کو مختلف انداز میں بیان کرنے پر بھی قادر ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر فکر و فن کو خالص ادب کا پیرایہ نہیں مل سکتا۔

ایک جگہ پر ڈاکٹر عبداللہ صاحب فرماتے ہیں:

"شبلی کی بات سرسید کی بات سے زیادہ مختلف نہیں تھی، مضمون کا فرق کم ہے، لب و لہجہ کا فرق زیادہ ہے، شبلی کی نظر اور طرزِ بیان عالمانہ اور ادیبانہ ہے، وہی بات سرسید کی زبان سے ادا ہو کر مخاطبوں کو متوحش کرتی ہے، جب شبلی کی زبان سے نکلتی ہے نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا ذمہ دار زیادہ تر شبلی کا طرزِ تحریر اور لب و لہجہ ہے۔"[1]

ڈاکٹر عبداللہ صاحب سرسید احمد خاں کی تصنیفات کے اچھے نقاد اور عالم شمار کیے جاتے رہے ہیں، اور موصوف نے سرسید کو اکثر موضوعِ بحث بنایا ہے اور بہت سے وقیع فیصلے بھی کیے ہیں۔ آپ کے نزدیک سرسید احمد خاں صاحب، صاحبِ اسلوب بھی ہیں اور داعیِ اصلاح و مجدد بھی، دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر عبداللہ صاحب کے نزدیک سرسید احمد خاں صاحب ایک فلسفی مبلغ ہیں اور علامہ شبلی ادیب و مبلغ، ڈاکٹر صاحب ایک جگہ پر فرماتے ہیں:

"سرسید کے نزدیک یقین یا ایمان حاصل کرنے کا وسیلہ بھی عقل ہی ہے اور ورائے عقل کوئی اور طریقہ نہیں جس سے صورت یا کیفیت روح تبدیل ہو جائے"[2]

اس کے بعد علامہ اقبال کی نثر نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شبلی کی فلسفیانہ نثر اور اقبال کی حکیمانہ نثر میں یہ فرق ہے کہ شبلی کی تحریروں کا جھکاؤ کسی حد تک سرسید کے دبستانِ نثر کی خصوصیات کی طرف ہے، یعنی وہ عبارتوں کے علمی شان کو قائم رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھتے ہیں کہ محاورہ کی بے تکلفی قائم رہے"[3]

اس سلسلے میں جہاں تک خیال ہے کہ علامہ شبلی نے اظہار و ابلاغ کے بہتیرے ہی کامیاب تجربے کیے ہیں جس میں ان کا ایک تجربہ علم کلام، الکلام، الغزالی، اور سوانح مولانا روم ہے۔ اور دوسرا تجربہ شعر العجم اور سیرت النبیؐ ہے اور اس کے علاوہ بے شمار مقالات، مضامین، کتابیں، خطوط اور اشعار ہیں۔ الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی اور سیرۃ النبیؐ کا مؤلف شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر بھی لکھتا ہے، اور ساتھ ہی علم الکلام کے ساتھ تصوف کے دقیق مباحثوں سے بھی دلچسپی ہے۔ گویا کہ شبلی کا احساسات اور افکار سے یکساں تعلق ہے۔ دونوں پر ایک ہی جیسی قدرت ہے۔ ان کی نفسیات میں تاثر کی قوت توانا ہے۔ شعر و عقیدہ، فلسفہ و تاریخ، فقہ اور مناظرہ جیسے مختلف مباحثوں کو سینۂ قرطاس پر اتارنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے، بلکہ ایک ابرِ سیاہ ہے جو مسلسل برستا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ ہر بات کو پوری طرح سے سمجھتے ہیں جس کو تاثر یا انفعال کہا جاتا ہے۔ وہ شبلی ہوں یا کوئی اور مصنف، جب اس کیفیت سے لگاتار متصف ہوتا رہتا ہے تو ایک ذہن اتنے رنگا رنگ تاثرات سے بھاری ہو جاتا ہے۔ اسے پڑھنے میں لطف اور سوچنے میں ایک قسم کی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ خود تو سمجھتا ہے، لیکن دوسروں کو سمجھانے کی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ یہ شخص عرفِ عام میں عالم ہے اور اس کا ذوق بھی علمی ہے، اس کی فکر بھی فلسفیانہ ہے اس کی تلاش بھی خوب سے خوب تر کی ہے، وہ کوشش

تو کر سکتا ہے لیکن اچھی بات کہہ پانا مشکل ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو علمی مباحثوں سے دماغی قوتوں کو روشنی نہیں بلکہ ایک قسم کی آگ بخشتا ہے۔ کیونکہ روشنی کو صرف ہر چیز کو صاف دکھلانے کی قدرت ہے جب کہ آگ میں روشنی بھی ہے۔ حرارت بھی ہے اور حرکت بھی ہے، اور حرارت و حرکت اس کے اندر ایک قوت پیدا کرتی ہے جس کا نام ہے "ابلاغ" یعنی صرف "فہم" سے "ذوق" اور متحرک فہم و تاثر سے "ابلاغ" ابھرتا ہے جو ذہن نقطہ فہم اور سمجھنے کی طاقت سے مالا مال ہے۔ وہ صاحب ذوق ہے۔ اور جو شخص فکر و فہم کے ساتھ ساتھ "ابلاغ" میں بھی کمال رکھتا ہے اس کا نام ذوق آفرینی ہے۔

ذوق عربی کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی "جس قوت سے کھانوں کا مزہ معلوم کیا جائے" اور اصطلاحاً ہمارے نزدیک اس کی تعریف اس طرح سے ہے ذوق فکر و فن کی جمالیاتی حس کو کہتے ہیں۔"

ذوق کی بنیاد فکر و فہم، معلومات اور ماحول پر قائم ہوتی ہے اور اس کی ایک انتہا لذت اندوز ہونے اور اس کی طلب کا پورا ہو جانا ہے، اور دوسری انتہا لذت آفرینی اور خود نمائی ہے، دوسروں کو اپنے تاثرات دینا اور دوسروں کو لذت آشنا کرنا ہے۔

ہر زندہ دل انسان خوبصورت چیز، خوشنما گلشن دیکھنے اور دل کش شعر پڑھنے اور سننے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ فردوس مناظر، حسین نغمے، لہکتے چمن، جھومتے گلشن، لہراتا سمندر، انگڑائیاں لیتی ندیاں اور گداز لمس۔ اگر وجدان کی پیاس اور جمالیاتی حس کو آسودگی اور لذت بخشیں تو آرام و سکون محسوس ہوتا ہے، ورنہ تکلیف، ایک کا نام لذت و سرور ہے اور دوسرے کو کرب و نفرت کہتے ہیں، پھر ان کیفیتوں یعنی مسرت اور نفرت

محسوس کرنے والا اگر خاموش ہو جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ قوت ابلاغ سے خالی ہے۔ اگر بار بار اظہار کرے اور اپنے تاثرات کو مجسّم کرے تو "فن کار" یا ذوق آفریں۔ اس کی مثال جگنو اور شمع دی جا سکتی ہے۔ جگنو خود چمکتا ہے لیکن دوسرے کو چمکا نہیں سکتا، شمع خود روشن ہوتی ہے اور دوسرے کو حرارت کے ساتھ روشنی بھی دیتی ہے، جگنو سے چراغ نہیں جل سکتا، شمع سے محفل بھی روشن ہوتی ہے اور شمع بھی جلائی جا سکتی ہے۔

یہ باتیں شبلی خوب طور پر جانتے تھے۔ جس کا شعر العجم میں اس طرح اظہار کرتے ہیں:

> "جب حقیقت پرستی کا "ذوق" دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو ہر چیز میں حقیقت کی تلاش ہوتی ہے۔ اور وہی چیزیں محبوب معلوم ہوتی ہیں جو حقیقی ہیں۔ مثلاً حسن، لذت اور مسرت انسان کے اصلی مطلوب ہیں۔ انسان جن چیزوں پر جان دیتا ہے، جن چیزوں کے لیے جد و جہد کرتا ہے، جن چیزوں کا شیفتہ ہوتا ہے کہ ان میں حسن لذت یا مسرت ہے، لیکن ان چیزوں میں بھی حقیقت اور مجاز کے مراتب ہیں، بچہ کھیل تماشہ، جھوٹی اور مصنوعی چیزوں کو پسند کرتا ہے جب ذرا بڑا ہوتا ہے اور اس کا مذاق کسی قدر صحیح ہونے لگتا ہے تو پسند کا معیار بھی ترقی کر جاتا ہے۔"

حقیقت و مجاز، استعارہ و کنایہ، زمان و مکان، اور عمر و شعور کے باریک مسئلوں سے لے کر نفسیاتی اور ادب کے باریک مسائل تک شبلی کی رسائی ہے۔ شبلی کی معلومات اور دوسرے مختلف ادیبوں کی معلومات ہو سکتا ہے کہ یکساں ہوں اور ذوق کی پختگی بھی ان کے اعتبار سے کامل ہو، لیکن اسے کیا کہیے کہ اظہار و ابلاغ کا جو پیرایہ علامہ شبلی کو عطا ہوا، دوسروں کو وہ نہیں مل سکا اور اگر ملا بھی ہے

بہت کم لوگوں کو اور جن لوگوں کو یہ ملکہ حاصل ہوا وہ اسے پیش نظر رکھ سکے۔ شبلی کا حال سب سے جدا ہے، وہ اپنے تاثرات اور ذوق کو چھپا ہی نہیں پاتے۔ بعض اوقات ایک ہی شعر پر دو دو صفحے لکھ جاتے ہیں، اور ساتھ ساتھ فکر و فن کے گوشے اجاگر کرتے جاتے ہیں اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر کا ذہن زیادہ شفاف ہے یا کہ علامہ شبلی کی نظر زیادہ گہری ہے۔ اور یہی حال تاریخ و سوانح کا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شبلی نے بعض چیزیں صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لیے لکھی ہیں۔ جیسے شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر، اسی وجہ سے یہ دونوں کتابیں فارسی و اردو ادب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ راقم السطور کی رائے میں اردو ادب کا مطالعہ نامکمل رہ جائے گا جب تک یہ کتابیں نہ پڑھی جائیں۔ تشنگانِ علم کو شعر سمجھنے اور اسے پڑھنے کا ڈھنگ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد آتا ہے، ان کی کتابوں سے آگہی اور نشاط حاصل ہوتا ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ علامہ شبلی روایت کے زبردست حامی ہیں لہٰذا ان کی تنقید ماضیِ بعید سے عبارت ہے، وہ طبعاً مدح خواں اور قصیدہ گو ہیں۔ یہ تعریف کرنے اور خوبیاں بیان کرنے کا انداز جانتے ہیں گویا وہ حالی کی ضد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شبلی مشرقی تنقیدی ادب کے اصولوں میں کوئی اضافہ نہ کر سکے، مغربی اصولوں کو بروئے کار نہیں لائے، ظاہر ہے کہ شبلی مشرق میں پیدا ہوئے پلے بڑھے، ایک مکمل عالم اور مفکر ہوئے، ایک مزاج کے ترجمان بنے، تو وہ مزاج کیسے بدل جائے گا، وہ مزاج اور وہ علوم مشرقی ہی رہیں گے۔ آخر ہم اور آپ میں سے بھی تو کوئی مغرب میں نہیں بستا اور جب مغرب کو مشرق نہیں بنایا جا سکتا ہے، تو مشرق کو مغرب کیسے بنائیں گے؟ ہمارا تاریخی پس منظر ہمارا ورثہ اور ہمارا فن مغرب سے کسی بھی طرح سے کم نہیں ہے۔

شبلی نے مشرقی ادب کو ذوق گفتار دیا، اور اہل مغرب کو یہ بتایا کہ ہمارا فن، ہمارا علم، ہماری طاقت تم سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ہمیں اپنے لہجے میں بات کرتے ہوئے شرم نہیں محسوس کرتے۔ ہمارے علم کو پڑھو اور سمجھو اور ہمارے خیالات سے آگاہی حاصل کرو تب معلوم ہوگا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔

شبلی نے کلام و مناظرہ کی ہی طرح اردو فارسی ادب کو بھی اپنے زاویے سے دیکھا شاعری کو اس کے سیاق و سباق میں پرکھا اس کے نتائج کو سپرد قلم کیا، اور پوری محنت و جانفشانی کے ساتھ شعوری طور پر باضابطہ ان مشاہیر پر کام کیا جو شبلی کے زمانے میں مشہور عام تھے، مفصل بحث و مباحثے اور جرح کے بعد ان مشاہیر کے فن اور ہمارے ذوق میں جو مماثلت تھی اس سے متعارف کروایا۔ فردوسی پر شبلی کا کام اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ ان کا ذہن کس قدر وسیع اور معلومات کس قدر حیرت انگیز ہیں۔ فن تجزیے اور تحلیل میں انھوں نے خشک منطق، خشک اصول اور بے تکی تحریریں نہیں لکھیں بلکہ شبلی نے فن اور فن کار، ماحول اور زمان و مکان کی روشنی میں تصورات اور خیالات کو دیکھا، خود بھی متاثر ہوئے اور اپنے تاثرات دوسروں کو بھی دیے۔ اظہار اسی کرشمہ کا نام ہے۔

مضمون آفرینی، جدتِ ادا، تخیل بندی، محاورہ، پیرایہ، تشبیہ، استعارہ، حسنِ تعلیل، واردات، اخلاق، خوش نوائی، شوخی و ظرافت، معاشرت و سیاست غرض کہ بہت سے نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اشعار کو پرکھا، اور اس کی خوبیوں و خرابیوں کو جانچنے کے عملی نمونے پیش کیے۔

علامہ شبلی حسن دوست، لذت پسند اور مسرت کے متلاشی ہیں۔ ان چیزوں سے ان کے ذوق کو جہاں نشاط اور آسودگی ملی، وہاں انھوں نے اس مقام سے دوسرے کو آگاہی بھی بخشی ہے ان کا کہنا ہے کہ جو چیز خود حسین ہوگی وہ موثر بھی ہوگی۔

"راگ کے دل کش اور موثر ہونے کا گُر یہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو، ان میں نہایت

تناسب و توازن ہو، الفاظ بھی چوں کہ ایک قسم
کی صورت اور سر ہیں اس لیے ان کی لطافت،
شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے
جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی متنے "میں ان
کے مناسب ہوں[5]"۔

اور اسی بات کو سمجھانے کا انداز ملاحظہ ہو:

"الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبرؑ کی اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں ؎

تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسولؐ میں

وہی مضمون ہے، وہی الفاظ ہیں، لیکن ترتیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا[6]"۔

شعرالعجم میں ظاہر و باطن سے معنی و مطالب سے، اشاروں سے نکات سے، ذوق آفرینی اور وجد کی حالت پیدا کرتے ہوئے ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

"ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان الفاظ میں باہم فرق ہوتا ہے۔ یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی مثلاً خدا کو فارسی میں خدا، پروردگار، داور، ایزد، آفریدگار سب کہتے ہیں۔ بظاہر ان سب الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں، لیکن درحقیقت ہر لفظ میں ایک خاص بات اور ایک خاص اثر ہے......

اسی لیے شاعر کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کے لیے خاص جو لفظ موزوں اور موثر ہے، وہی لفظ استعمال کیا جائے، ورنہ شعر میں وہ اثر نہ پیدا ہوگا۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے اور بغیر اس کے کہ ایک مثال میں ایک ایک لفظ بحث کر کے نہ سمجھایا جائے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ فیضی کا شعر ہے ؎

بانگ قلم دریں شب تار   بس معنی خفتہ کرد بیدار

شعر کا اصل مضمون یہ ہے کہ "شاعری میں میں نے بہت سے نئے مضامین پیدا کیے" اس کو استعارے کے پیرائے میں یوں ادا کیا ہے کہ "میرے قلم کی آواز نے بہت سے سوتے ہوئے مضمونوں کو جگا دیا"، اب اس کے ایک ایک لفظ پر خیال کرو۔

بانگ خاص آواز کو کہتے ہیں، جس میں بلندی اور فخامت ہو، جو جگانے کے لیے موزوں ہے، بانگ، آواز، صریر ہم معنی ہیں، اس لیے "بانگ قلم" کے بجائے "آواز قلم" اور "صریر قلم" بھی کہہ سکتے ہیں، اس موقع کے لیے صرف بانگ موزوں ہے۔

اسی انداز میں شبلی فن پارے، شعر یا کسی علمی نکتے سے بحث کرتے ہوئے اس کی لطافتوں سے فکر و نظر، ذوق و وجدان کو مسرت اور معنی رسی تک پہنچاتے ہیں۔ سلیقے اور اسلوب کا یہ طریق کار اور اس کے نتائج ہمارے نزدیک "علامہ شبلی نعمانی کی ذوق آفرینی" ہے۔

حواشی:

۱۔	میر امن سے عبدالحق تک	ڈاکٹر عبداللہ	صفحہ ۶۹
۲۔	" " "	" "	۱۰۵
۳۔	" " "	" "	۲۵۲
۴۔	شعرالعجم جلد پنجم	علامہ شبلی نعمانی	۱۲۶
۵۔	موازنہ انیس و دبیر	" "	۵۴
۶۔	شعرالعجم جلد چہارم	" "	۶۳

فاخر جلال پوری
جلال پور، ضلع فیض آباد

ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے

ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج
مری طرح سے تم اپنا قدم جماؤ تو
تم اپنے جسم پہ موسم کی چوٹ کھاؤ تو
اندھیری شب میں سحر بن کے مسکراؤ تو
مری گپھاؤں میں کوئی دیا جلاؤ تو
وطن پہ ایک کٹھن وقت آ پڑا ہے آج
ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج

یہ وقت ہے کہ قدم سے قدم ملا کے چلو
چلو تو پرچم امن و وفا اٹھا کے چلو
جو غیر آئے تو اپنا اسے بنا کے چلو
اندھیری راہ میں شمع وفا جلا کے چلو
وطن عجیب سے ماحول میں گھرا ہے آج
ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج

یہ دیوتاؤں کی نگری، یہ صوفیوں کی زمیں
یہ اپسراؤں کا مسکن، جواب خلد بریں
یہاں کے فرش پہ جھکتی ہے آسماں کی جبیں
یہاں کے گنگ و جمن کی کوئی مثال نہیں
کہ جس کی موج محبت کا آئینہ ہے آج
ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج

جیو تو ایسے کہ اک دوسرے کے کام آؤ
رہو تو ایسے کہ بس شانتی کے گن گاؤ
اٹھو تو ایسے کہ طوفان بن کے چھا جاؤ
مرو تو یوں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤ
تمہارے نام کا محتاج ایشیا ہے آج
ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج

کہاں سے آئے کنھیا کی بانسری کی صدا
کہاں سے چشتی و نانک کی پائے کوئی ادا
کہاں سے مریم و سیتا کی آئے شرم و حیا
قبول کس طرح کیسے ہو اب کسی کی دعا
ہر ایک شخص کا کردار کھوکھلا ہے آج
ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج

نہ ہونے پائے کسی کا کسی سے استحصال
جو ہیں بلند عزائم تو کیا عروج و زوال
جہاں میں بن کے رہو اپنی آپ ایک مثال
رہے ہمیشہ ترنگے کی آبرو کا خیال
وطن کی خاک کا ہر ذرہ دیوتا ہے آج
ہمالیہ ہمیں آواز دے رہا ہے آج

●●

غزلیں

رفعت لکھنوی

رسولپور سادات۔ ڈاکخانہ چنہٹ
ضلع لکھنؤ

بڑے پارسا دیکھے بڑے محترم دیکھے!
کدورت نہ ہو جن میں وہ دل ہم نے کم دیکھے

عجب رازِ ہستی ہے عجب رنگِ دنیا ہے
جھکے جو پئے طاعت وہی سر قلم دیکھے

رواں ہے ہر اک راہی ضرورت کے جادے پر
کسے اتنی فرصت جو حدودِ قدم دیکھے

مری چشمِ گریاں پر کوئی طنز ہے بے جا
ذرا عشرتِ دنیا مرے دل کے غم دیکھے

چمن میں یہ شبنم سے کہا پیاسی کرنوں نے
سحر کو کوئی آکر وجود و عدم دیکھے

ابھی ماہ و انجم کو کہاں تابِ نظارہ
ابھی کہکشاں میرے نقوشِ قدم دیکھے

کوئی معرکہ ہی تھا جو کل ایک منزل میں
کچھ اہلِ ستم دیکھے کچھ اہلِ کرم دیکھے

فضائے تکلم تو رہی شکلِ ہنگامہ
سکوتِ مسلسل میں بڑے زیر و بم دیکھے

زمانے میں اے رفعت جو تھے ظرفِ خودداری
شکستہ شکستہ سے وہی جامِ جم دیکھے

●●

حیات وارثی

باغ انوار۔ لکھنؤ ۳

فضائے میکدہ برہم ہے آفتاب نہ توڑ
بہکنے والے سنبھل، ساغرِ شراب نہ توڑ

اُجالا نیند میں ہے رات آنکھیں ملتی ہے
ملن کا وقت ہے تو شاخ سے گلاب نہ توڑ

یقینِ وعدۂ فردا کو مت گماں میں بدل
جھنجھوڑ کر مرے شانے اُدھورے خواب نہ توڑ

نگار خانۂ ہستی کا عکس ہے اس میں
تو بے نیازی سے آئینۂ حباب نہ توڑ

سحر کی آس جلاتی ہے تیرگی میں چراغ
بجھا نہ پیاس مگر رشتۂ سراب نہ توڑ

یہ موجِ تشنہ لبی تو گزر ہی جائے گی
نہ چھوڑ ضبط کو، پیمانۂ حجاب نہ توڑ

●●

غزلیں

صلاح الدین نیر
۳-۶-۳۴۴ بازار ردپ لال
حیدرآباد - ۵۰۰۲۶۵

ضمیر کہتا ہے میں نے ہی دل دُکھایا ہے
کئی دنوں سے تمھارا اُداس چہرہ ہے

اُبھر کے آئے ہیں پھر ذہن و دل پہ تازہ نقوش
نئی ہے چوٹ مگر سلسلہ پُرانا ہے

وہ ایک چاند کہ ٹھنڈک ہے جس کا سارا وجود
کسے خبر تھی مرے گھر اُترنے والا ہے

جہاں بھی جائے گا دل لے کے مجھ کو جاؤں گا
کوئی بھی در سہی مجھ کو تو سر جُھکانا ہے

وفا شناس، شگفتہ سی زندگی کی طرح
میں آئینہ ہوں مجھے بھی تو ٹوٹ جانا ہے

بہ ایں شکستگی جاؤ گے تم کہاں نیر
بس اک قدم پہ ہی میرا غریب خانہ ہے

●●

بشیر فاروقی
۵۱۵ - مراد علی لین، لکھنؤ

کوئی دن ایسا نہیں ان کا خیال آتا نہ ہو
آنکھ نم ہوتی نہ ہو اور دل تڑپ جاتا نہ ہو

حادثہ یہ ہے کہ میری پیاس نے باندھی ہے آس
ایسے بادل سے برسنا ہی جسے آتا نہ ہو

دل میں ارماں لے کے چلتا ہو تو ممکن ہی نہیں
آدمی شیشے سے یا پتھر سے ٹکراتا نہ ہو

اے محبت وہ قدم تو میں نے دیکھا ہی نہیں
جو تری راہوں میں اُٹھے اور تھرّاتا نہ ہو

یادِ جاناں آ لپٹ جا میری باہوں سے مگر
اک نظر میں دیکھ لوں کوئی اِدھر آتا نہ ہو

اُن کی عادت ہے وہ ملتے ہیں اسی سے اے بشیر
ایک پل جو آدمی مجھ کو کبھی بھاتا نہ ہو

○○

عبدالمغنی

امیر خُسرو کی نظم نگاری

عصرِ حاضر کی اردو تنقید کی سب سے بڑی اور بنیادی خامی یہ ہے کہ ادبی ہیئت کے ہر تجربے کی اصلیت کا سراغ لگانے کے لیے یہ مغرب بالخصوص انگریزی کی طرف رجوع کرتی ہے اور قارئین کو یورپ کے کمالات کے حوالے سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس لیے کہ یہ مغرب زدہ تنقید درحقیقت مشرق کی عظیم ادبی روایات سے بڑی حد تک نابلد ہے اور اپنی نااہلی کے سبب مغرب کی معمولی معمولی باتوں سے بھی مرعوب و مسحور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مغرب زدہ نقاد نے موضوعاتی نظم گوئی کو اردو میں مفقود تصور کر کے فارسی و عربی میں بھی ناپید سمجھ لیا ہے اور اسے فقط انگریزی سے ماخوذ فرض کر کے اپنے گمان میں وہ اس کی تنقید خالص مغربی معیار سے فرمانے لگے۔ لیکن کوئی بھی ذہین شخص غور کر سکتا ہے کہ عربی قصائد اور فارسی مثنویات اعلیٰ درجے کی طویل نظمیں ہیں جن کے مختلف اجزا میں متعدد موضوعات پر مسلسل اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اسی طرح رباعیات برابر کسی نہ کسی موضوع ہی پر کہی گئی ہیں اور نہایت حسین، پُراثر اور فکر انگیز نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ قطعات میں بھی بعض موضوعات پر تسلسل کے ساتھ مرتب قسم کی شاعری کی جاتی ہے۔ مخمس اور مسدس وغیرہ کی ہیئتیں ظاہر ہے کہ نظم نگاری ہی کے لیے ہیں اور انیس کے مراثی سے حالی کے مسدس تک انیسویں صدی یا اس کے آس پاس کی اردو شاعری میں نظم نگاری کے نہایت وقیع نمونے پائے جاتے ہیں۔ دراصل عربی، فارسی اور اردو شاعری کے یہی وہ بیش رو نمونے ہیں جن کے اسالیب کا جدید موضوعات کے لیے استعمال کر کے اقبال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دنیا کی بہترین اور عظیم ترین شاعری کے کمالات پیش کیے۔

اردو شاعری کا راست پیش رو نمونہ فارسی شاعری ہے اور آج اردو ادب کا جو کچھ حُسن ہے اس کا سرچشمہ لسانی و تاریخی طور پر فارسی ہی ہے۔ چنانچہ فارسی کے اس سرچشمے سے اردو کا جو ادیب، شاعر یا ناقد جتنا دور یا بیگانہ ہے اس کے کاموں میں ادبی حُسن بھی اتنی ہی کمی ہے، خاص کر ہمارے عصرِ حاضر کے وہ نقاد جو عبدالحق کے بعد اُبھرے ہیں فارسی ادب سے بہت ہی کم واقف ہیں اور خاص اسی عیب کی وجہ سے ان کی اکثر تنقیدیں بے وزن و بے اثر یا ادب کی تخلیق کے لیے مہلک اور فن کاروں کے لیے گمراہ کن ہیں۔ چنانچہ بیشتر جدید شاعروں اور نثاروں کی نااہلی کا سبب ان کی فارسی سے عدم واقفیت اور موجودہ اردو تنقید کی فارسی ناشناسی ہے۔

عصرِ حاضر کی اردو تنقید کی حقائق سے چشم پوشی کی بہترین مثال امیر خسرو کی نظم نگاری سے اس کا صرفِ نظر ہے، حالانکہ شبلی جیسے عظیم نقاد نے بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف شعر العجم حصۂ دوم میں یہ تاریخی انکشاف کر دیا تھا:

"ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں، مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میوے اور

پھولوں وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے امیر خسرو نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا ہے، انھوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں اور اس کتاب سے ان کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا ۔ (صفحہ ۳۶-۱۳۵)

امیر خسرو اس قسم کی موضوعاتی نظم نگاری کی ایجاد کا دعویٰ خود ہی قران السعدین میں اس طرح کرتے ہیں :

بود در اندیشۂ من چندگاہ　　　کز دلِ دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم　　　جمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشِ نو دہم　　　سکۂ ایں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فنِ اندیشہ زاے　　　تانہ نشانم نہ نشینم ز پاے
وصف نہ زاں گونہ شد از دل بروں　　　کاں دگرے را بدل آید کہ چوں

’طرزِ سخن‘ کی اس ’روشِ نو‘ کی متعدد عمدہ مثالیں محولہ بالا مثنوی میں پائی جاتی ہیں، خاص کر کاغذ اور کشتی کی توصیف میں جو نظمیں ہیں ان کے متعدد اشعار شبلی نے شعر العجم میں نقل کیے ہیں۔ ان میں سے صرف چند اشعار مشتے نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں :

کاغذِ شامی شب و صبح دام　　　آنکہ شد آرایشِ صبحش ز شام
سادہ حریرے ولے اصلش ز خویش　　　با قصب و خز شدہ پیوند خویش
تا لے حریر آمدہ اندر نورد　　　طرفہ حریرے کہ تواں جزو کرد
آمدہ اجزاش فراہم ز آب　　　لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبشِ بسیار پست　　　پشت دوتا گردش از یک شکست

یہ اشعار صدیوں پہلے اُس وقت رقم کیے گئے جب کاغذ ہندستان میں شام سے آتا ہوگا اور اس کی ساخت کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب تھیں، پھر بھی خسرو نے کاغذ سازی کے اسی طریقے کی نشاندہی کی ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں بھی رائج تھا۔ یہ گویا ایک اپنے وقت کے جدید موضوع پر ہمارے ایک قدیم فارسی شاعر کا اظہارِ خیال تھا، جو حقیقت پسندانہ ہونے کے ساتھ پُر لطف بھی ہے اور مربوط طریقے پر ایک ترتیب کے ساتھ ہے۔ اسی طرح کشتی جیسے ایک قدیم موضوع پر یہ اشعار ملتے ہیں :

ساختہ از حکمتِ کار آگہاں　　　خانۂ گردندہ بہ گردِ جہاں
نادرۂ حکم خدائے حکیم　　　خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہلِ سفر را ہمہ بر وے گذر　　　ہمرہِ او ساکن و او در سفر
جاریۂ ہند زبانش سلیم　　　حاملِ چندیں بچہ، لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پرد، در کشاد　　　بیشتر از باد رود، روزِ باد
رفتہ دو منزل بہ دمے، بل دو چند　　　بارسن و سلسلہ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سرفراز　　　پر چو حواصل ز دو سو کردہ باز
ہر طرفش رہ بہ شتابِ دگر　　　ہر قدمش بر سرِ آب دگر

موضوع کی قدامت کے باوجود اظہارِ خیال میں تازگی، عمدگی اور برجستگی ہے۔ اس کے علاوہ اشعار معنوی طور سے باہم دگر پیوستہ ہیں۔ تشبیہات و استعارات برمحل ہیں۔ مشاہدے کی باریکی اور تخیل کی تیزی بھی ہے۔ چند ہی اشعار میں کشتی کی ہیئت اور رفتار کا ایک نقشہ مرتب ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذہنی طور پر کشتی میں بیٹھے ہوئے تیزی سے سطح آب پر رواں ہیں۔ اس طرح ایک خارجی مرقع نگاری میں شاعر کی اپنی حیات بھی شامل و داخل ہیں۔ چنانچہ کشتی محض ایک خشک و معروضی وجود نہیں رہ جاتی، بلکہ ایک زندہ ذاتی تجربہ بن جاتی ہے۔ یہ کمال شاعری کا ایک کرشمہ ہے۔

خسرو بقول شبلی اس قسم کی شاعری کو ’وصف نگاری‘ کہتے ہیں، جو شبلی کے بقول ایک ’نہایت موزوں نام ہے‘، لیکن خسرو کی اس وصف نگاری کے متعلق شبلی کی یہ رائے صحیح نہیں :

’ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھا یا ہے ‘

(شعر العجم، حصہ دوم، صفحہ ۱۳۶)

اوّل تو خسرو کے اشعار میں روانی ہے، دوسرے ان کی تصویر کشی تصنع سے خالی ہے، رہا کاغذ اور کشتی جیسے بعض استعارات کا مطالعہ

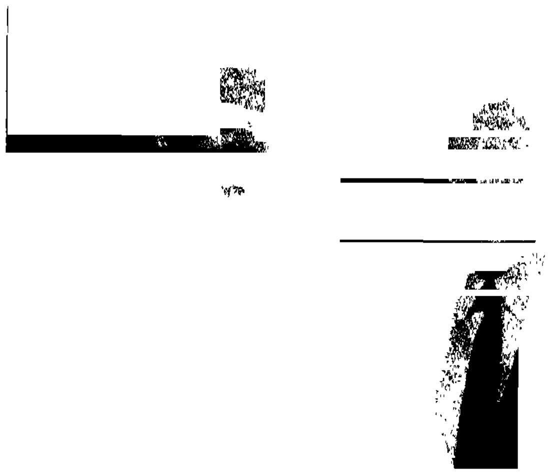


وزیر اعظم شری راجیو گاندھی، [illegible] کو قاہرہ میں مصر کے صدر جناب حسنی مبارک سے گفتگو کرتے ہوئے۔ اس موقع پر مصر کے وزیر اعظم جناب کمال حسن علی، ہندوستان کے وزیر مملکت برائے خارجہ جناب خورشید عالم خان اور مصر کے وزیر خارجہ جناب عصمت عبدالمجید بھی موجود ہیں۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۱۰ جون ۱۹۸۵ء کو الجزائر میں صدر الجیریا جناب شاذلی بن جدید سے گفتگو کرتے ہوئے ←



وزیر اعظم شری راجیو گاندھی
۶ر جون ۱۹۸۵ء کو فرانس
کے صدر شری فرینکوائس
متراں کے ساتھ ۔



وزیر اعظم شری راجیو گاندھی
اور شریمتی سونیا گاندھی
پیرس میں
فرانس کے وزیر اعظم شری
لارین فابیکو اور
ان کی اہلیہ کے ساتھ





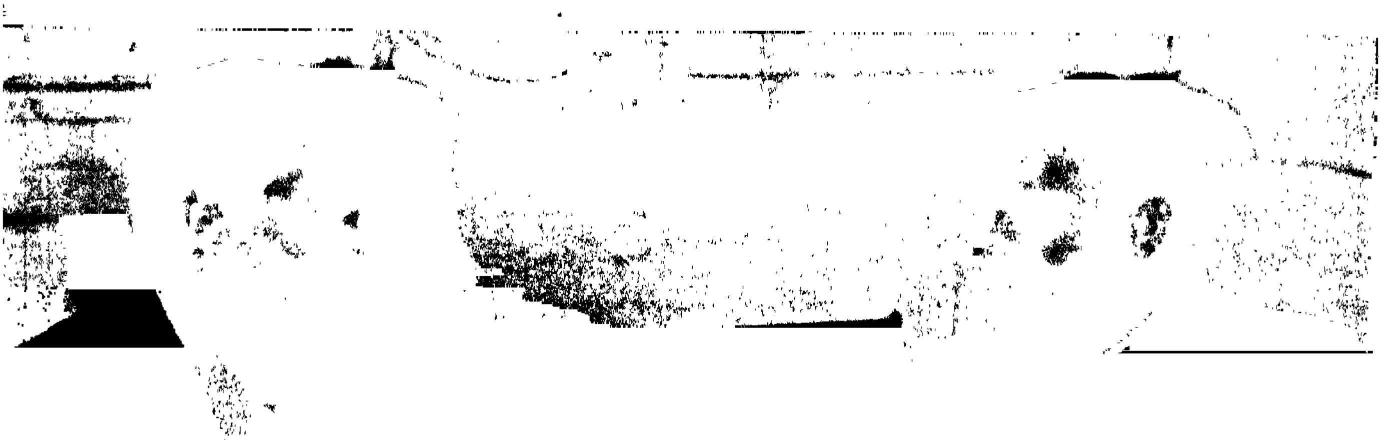


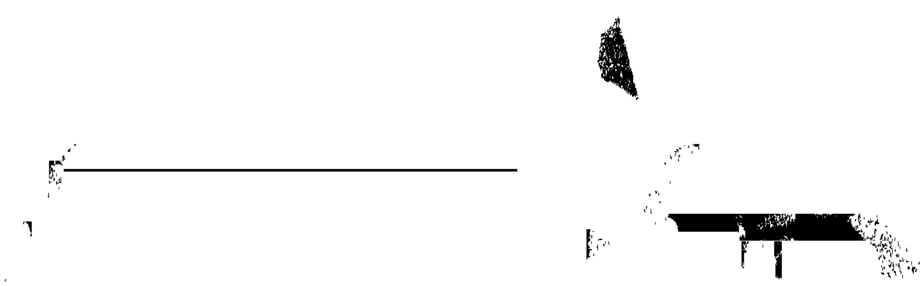
وزیر اعظم
شری راجیو گاندھی
۸ جون ۱۹۸۵ء کو
پیرس میں
ہوائی مظاہرہ
دیکھتے ہوئے
ان کے بائیں جانب
فرانس
کے وزیر اعظم
شری لارین فابکو
بھی نظر آرہے ہیں۔



پیرس میں
وزیر اعظم شری راجیو گاندھی
کو ایک
شہری استقبالیہ بھی دیا گیا
یہ تصویر
اسی موقع کی ہے جس میں
پیرس کے میئر شری ژاک شیراک
شری راجیو گاندھی
سے گفت گو کرتے ہوئے
نظر آرہے ہیں













وزیراعظم شری راجیو گاندھی ۱۸ رجون کو غیر ملکی دورے سے واپس آئے تو دہلی ہوائی اڈے پر ان کے کابینی رفقاء وزرائے اعلا اور دیگر لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں وزیراعلا اتر پردیش شری نرائن دت تیواری بھی نظر آرہے ہیں۔



راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں ۵ راور ۶ رجولائی ۱۹۸۵ء کو گورنروں کی کانفرنس منعقد ہوئی یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ وزیراعظم شری راجیو گاندھی اور اتر پردیش کے گورنر جناب محمد عثمان عارف بھی نظر آرہے ہیں



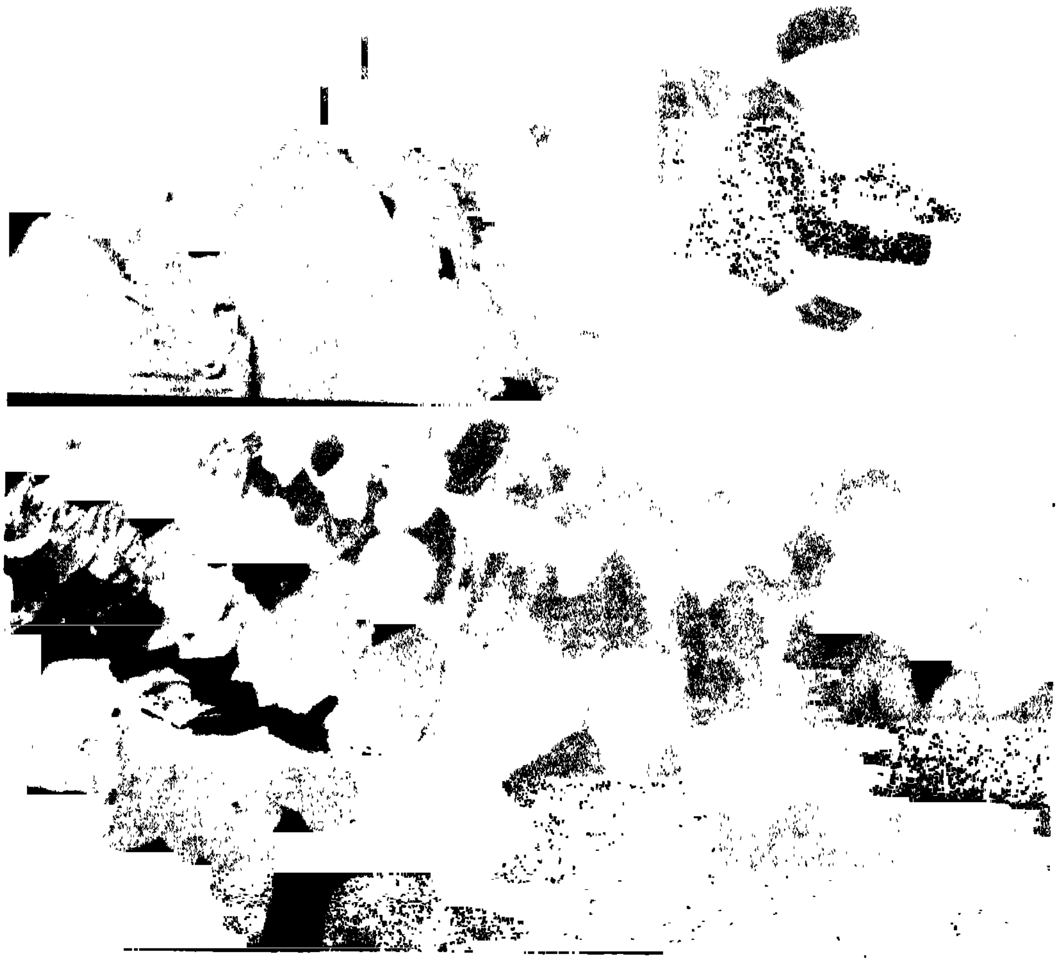


یہ تصویریں یونیٹی پبلیکیشنز سہکاری سمیتی کے ہندی ماہنامہ "ایکتا گونجے" اور اُردو ماہنامہ "ایکتا اور اقلیت" کی رسم اجراء کی تقریب کی ہیں۔

اس جلسہ کی صدارت عزّت مآب گورنر اترپردیش جناب محمد عثمان عارف نے کی۔

رسم اجراء وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے انجام دی۔

نیچے کی تصویر میں گورنر اور وزیر اعلا کے ساتھ اترپردیش کے سابق وزیر ڈاکٹر عمار رضوی بھی نظر آرہے ہیں۔



مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
یوم ابوالکلام آزاد کے موقع پر
منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے
ہوئے
تصویر میں مرکزی وزیر جناب
ضیاء الرحمٰن انصاری
اتر پردیش کے وزیر تعلیم
جناب سبط رضی
سابق وزیر جناب اصطفےٰ حسین
انصاری اور انور جلال پوری
بھی نظر آرہے ہیں



وزیر اعلا
شری نرائن دت تیواری
یو، پی
گلائی کولس
لیٹڈ
کا سنگِ بنیاد
رکھتے
ہوئے

فطرت کی بجائے مصنوعات سے ماخوذ ہوتا، تو یہ بھی ایک فطری امر ہے، اس لیے کاغذ اور کشتی دونوں بجائے خود مصنوعات ہیں۔ اس کے باوجود منفرد پیکر جو خسرو نے ان مصنوعات کی نقاشی میں استعمال کیے ہیں فطرت سے ماخوذ ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ شاعر نے جہاں ممکن ہوا فطرت کے تناظر میں اظہار خیال کیا ہے، جیسے کشتی کے سلسلے میں دریا ہی کا منظر نامہ ارضیہ کا کام کرتا ہے۔

بہر حال دیگر مثنویوں میں بھی خسرو نے نظم نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ 'لیلیٰ مجنوں' میں دھوپ اور تپش کی منظر نگاری نہایت موثر ہے۔ یہ فطرت ہی کے ایک مظہر کی مرقع نگاری ہے اور اس میں قدرتی مناظر کے حوالے ہیں، 'ابر' 'مرغانِ چمن' 'چرندگان'، 'ریگ' اور 'کوہ و کان' کے پیکروں پر گرمی کے اثرات کا ذکر ہے۔ صرف 'ریگہا ے گرداں' کی ایک تصویر دیکھیے:

از گرمی ریگ ہائے گرداں
پُر آبلہ پائے رہ نورداں

اسی طرح مثنوی 'ہشت بہشت' میں واقعہ نگاری اور جزئیات کی تصویر کشی کا کمال پایا جاتا ہے جو منظر رقم ہوا ہے۔ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے منقش و منور ہے۔ اگرچہ اس طرح کی منظر نگاری یا مرقع کشی میں باضابطہ کوئی عنوان یا موضوع مقرر نہیں کیا گیا ہے، مگر جو کچھ اظہارِ خیال ہے وہ تسلسل و ترتیب کے ساتھ ایک مخصوص موضوع پر ہی ہے اور اس لحاظ سے مربوط نظم نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی خسرو کے قصائد میں ہے، کہیں عید کی تصویر ہے، کہیں بہار کا سماں، کہیں برسات کا نقشہ، کہیں صبح و شام کا مرقع۔

مختلف موضوعات پر متنوع انداز کی اس مربوط و مرتب نظم نگاری میں ایک قابل ذکر بات طبیعت کا وفور اور تخیل کی فراوانی ہے۔ بوقلموں خیالات کی نقش آرائی کے لیے تازہ بہ تازہ استعارات و تشبیہات نئے نئے اسالیب سے بہ کثرت پیش کیے گئے ہیں، فن کاری کا ایک سیل ہے جو فوارے کی طرح موجزن اور آبشار کی طرح رواں ہے۔ اس سیل فن میں اشعار لہروں کی طرح پے بہ پے امنڈتے ہیں اور سطح آب کی مانند پھیلتے نظر آتے ہیں، ان میں ہم رنگی بھی ہے اور ہم آہنگی بھی۔ ایک باغ کی تصویر ملاحظہ ہو:

نو بہار امسال مارا روزہ فرماید ہمی
گل پخاں تر دامنِ از ے لب نیالاید ہمی
بر دہانِ غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم
کاں بشکر لب جز بہ بوسہ روزہ نکشاید ہمی
باد در کہسار جامِ لالہ را بر سنگ زد
گل بہ خندہ گفت، آرے ایں چنیں باید ہمی
نرگسِ رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا
گوئیا میخوارہ ماہ عید را پاید ہمی

خسرو کی ایک شاعرانہ خصوصیت غزلِ مسلسل بھی ہے، جس میں وہ عشق و محبت کے معاملات کا تفصیلی بیان تسلسل کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم اسے ایک قسم کی غنائیہ نظم نگاری کہہ سکتے ہیں۔ جس کا بنیادی جذبہ بہر حال تغزل ہے، مگر اس کے اظہار میں عام غزلیات کی پریشاں خیالی نہیں ہے۔ سعید نفیسی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہونے والے دیوان کامل امیر خسرو دہلوی مطبوعہ تہران سے بلا انتخاب حسب ذیل مطلعوں کی غزلیں بطور مثال پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ دمے نبود کہ آں غمزہ جہانے خوں نمی سازد
دلے دعویٰ چوں اشکم بہ رُخ ہیچو نمی سازد

۲۔ باز عشق آمد و دیوانگیم پیش آمد
بر دلم از مژہٴ غمزہ زنے نیش آمد

۳۔ اے باد باز بر سرِ کوے کہ میروی
بوئے کہ رہبرت شد و سُوے کہ می دوی

۴۔ مرا دوش گوئی بخواب آمدی
بکف کردہ جامِ شراب آمدی

(باقی [illegible] پر)

غزل

ہمسر قادری لکھنوی
۵۔ گنگا پرشاد روڈ، مولوی گنج
لکھنؤ

بلا سے شہر میں طوفانِ سنگ و سر ہے بہت
پناہ لینے کی خاطر خدا کا گھر ہے بہت

فقیرِ شہر کے بارے میں کچھ کہا نہ کرو
تمھیں خبر نہیں لیکن وہ باخبر ہے بہت

وہ چُپ ہی رہتا ہے اکثر نہ جانے بات ہے کیا
جو آدمی لب و لہجے میں معتبر ہے بہت

تمھاری قوتِ ایماں بھی خوب ہے یارو
خدا کا خوف نہیں ہے قضا کا ڈر ہے بہت

سند ملی تھی جسے کل نگاہ داری کی
سُنا ہے آج کہ وہ شخص کم نظر ہے بہت

سوال یہ ہے کہ ہم کیسے ہر جگہ پہنچیں
جواب یہ ہے کہ دشواریِ سفر ہے بہت

تمھارے گاؤں کا موسم تمھیں مُبارک ہو
ہمارے شہر میں گرمی شباب پر ہے بہت

مخالفت میں کروں دُشمنی کی کیا ہمسر
کہ دوستی ہی مرے حق میں دردِ سر ہے بہت

غزل

کشفی لکھنوی
شاہی مسجد، نزد راج بھون
لکھنؤ

لالہ و گل کی نہ یہ بادِ صبا کی بات ہے
خونِ دل کا ذکر ہے رنگِ حنا کی بات ہے

یہ جو دیوانوں کے لب پر دلرُبا کی بات ہے
اس کو کیا سمجھے گی دُنیا یہ وفا کی بات ہے

میرے مالک تیری دُنیا میں یہ کیا ہونے لگا
ہر طرف ظلم و ستم جور و جفا کی بات ہے

کیوں نہ اب تقدیر چمکے رہروانِ شوق کی
جس طرف دیکھو انھیں کے نقشِ پا کی بات ہے

میری دُنیا لوٹ لی جس بے وفا نے دوستو!
کیا کروں لب پر اسی کافر ادا کی بات ہے

جس نے اپنے سازِ ہستی پر سُنائی تھی غزل
ان کی محفل میں اسی نغمہ سرا کی بات ہے

چشمِ ساقی کا اشارہ پا کے توبہ توڑ دی
یہ تو کشفی آپ جیسے باوفا کی بات ہے

●●

ڈاکٹر علیم اللہ حالی
فخر الدین ہاؤس، لنگر ٹولی
پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴

میر کی شاعری میں فارسی و ریختہ کی مماثلت

میر تقی میر کی فارسی شاعری پر وہ توجہ نہیں دی گئی ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ بالعموم اسے ان کی اردو شاعری کے مقابلہ میں کمتر سمجھا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر نے اردو میں اپنی شاعری کا جو خزانہ پیش کیا ہے وہ مقدار کے لحاظ سے خاصا وسیع ہے۔ مگر اس انبار سے گوہر آبدار کا انتخاب کارے دارد۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب عرق ریزی اور دیدہ وری کے ساتھ میر تقی میر کے اردو دواوین سے معیاری اشعار منتخب کر لیے جائیں تو بلاشبہ یہ منتخب روزگار نظر آتے ہیں اور میر کا کہنا حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

بایں ہمہ بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست والی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی میں میر کا کلام اگر تعداد و مقدار میں نسبتاً کم ہے تو معیار کے لحاظ سے زیادہ محتاط ہے۔

اتنی بات تو طے ہے کہ میر کی فارسی دانی کے سبھی قائل ہیں، سبھوں کو اس کا اعتراف ہے کہ میر فارسی میں غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کے حامل تھے، اس کا کھلا ثبوت تو ان کا "تذکرہ نکات الشعراء" ہے، جس کی سلیس مگر دلکش عبارت کے سبھی معترف ہیں۔ اس کے علاوہ "ذکر میر"۔ "فیض میر" اور "دریائے عشق" کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں میر نے جو فارسی لکھی ہے وہ انھیں اہل زبان کا درجہ دلانے کے لیے کافی ہے۔ میر کی فارسی کہیں آراستہ و پیراستہ ہے اور کہیں حد درجہ سادہ و سلیس کہیں قافیہ و ردیف اور رعایت و مسجع سے عبارت کی آرائش کی گئی ہے اور کہیں عام بول چال کے لہجہ میں سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان دونوں خوبیوں کی وجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر کو زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل تھی اور فارسی میں بھی وہ مشکل سے مشکل مسائل و مباحث کو رواں دواں زبان میں بیان کر سکتے تھے۔ "فیض میر" میں انھوں نے اخلاقی صوفیانہ اور عارفانہ مسائل بیان کیے ہیں مگر چونکہ یہ رسالہ اپنے صاحبزادے فیض علی کے لیے لکھ رہے تھے اس لیے ان پیچیدہ و دشوار مسائل کو بھی میر نے غایت سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میر کی فارسی دانی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی اردو مثنوی 'دریائے عشق' کی تخلیق سے پہلے اس قصہ کو فارسی نثر میں لکھا تھا اور اس کا نام بھی 'دریائے عشق' تھا۔ 'ذکر میر' ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے، اس میں اس عہد کے سیاسی و تہذیبی احوال و حالات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ان حقائق سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ میر کو فارسی کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ انھوں نے اپنی فارسی شاعری اور نثر میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میر نے اپنی فارسی دانی کے سلسلے میں کبھی لاف و گزاف سے کام نہیں لیا، ان کی بے ریا اور انکسار پسند طبیعت نے خود نمائی گوارا نہ کی۔ انھوں نے فارسی شاعری و نثر میں جس عرض ہنر سے کام لیا ہے اس سے وہ چھپنے کے باوجود نمایاں ہوتے جاتے ہیں'

بر دور میں اہلِ نظر نے میر کی فارسی شاعری اور ان کی فارسی نثر کو بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے۔ میر حسین نے میر کی نثر کی خوب خوب تعریفیں کی ہیں۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے میر کی فارسی شاعری کا ذکر یوں کیا ہے :-

" ہر چند میر دیوان مختصر دارد اما غزلیات
دردمندانہ و عاشقانہ می گوید"۔

——— (مجمع النفائس از سراج الدین علی خاں آرزو)

مصحفی نے ایک جگہ لکھا ہے :-

" دعوی شعر فارسی نہ دارد مگر فارسیش ہم
کم از ریختہ نیست"۔ ——— (عقد ثریا۔ از مصحفی)

مولوی عبد الحق نے میر کی فارسی کی تعریف کی ہے اور اسے 'سادہ و شیریں' بتایا ہے۔

میر کی فارسی شاعری میں جذبہ کی وہی گھلاوٹ اور احساس کی وہی گزیدگی ہے جو ان کی اردو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس سادہ، بے تکلف اور غیر مصنوعی لب و لہجہ نے اردو میں تو میر کو اس کا صحیح حق دے دیا۔ لیکن فارسی شاعری میں ان صفات کے باوجود انھیں وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا۔ میر اگر 'خدائے سخن' تھے تو پھر عام طور پر لوگ یہ کیوں فراموش کر گئے کہ اس خدائے سخن کی جلوہ گری فارسی زبان کی مملکت میں بھی موجود ہے۔ دراصل فارسی شاعری کے سلسلہ میں میر کی طرف اس کم نگہی کی وجہ خود فارسی زبان کا تکلف و تصنع ہے۔ فارسی شاعری کی روایت میں پیچیدہ بیانی، رمزیت زبان کی آرائش و زیبائش، الفاظ کی رعایت و صنعت تلمیحات و اشارات کی کثرت اور خیال آرائی و فلسفیانہ نکتہ دری کی شروع سے خصوصی اہمیت رہی ہے۔

اس تکلف نے سادگی و سادہ بیانی کو ایرانی شاعری سے دور کر دیا۔ ایک عجیب اتفاق کی بات یہ ہے کہ میر کی اردو و فارسی غزلوں میں متعدد اشعار ایسے ہیں جو ہم مضمون ہیں۔ ان مضامین میں بیشتر وہ ہیں جن میں میر نے کہیں اپنی شکستہ پائی کا ذکر کیا ہے کہیں کثرتِ گریہ کا نظارہ پیش کیا ہے، کہیں محبوب کا انتظار پیہم ہے تو کہیں بیماریِ دل کا شکوہ ہے۔ کہیں بے ثباتیِ عالم ہے، کہیں بے خودی و سرمستی، کہیں درویشی و بے نیازی۔ غرض ان ہم مضمون اشعار میں وہ تمام موضوعات و محسوسات موجود ہیں جو میر کی امتیازی خصوصیات ہیں، ان میں لب و لہجہ کی وہ شیرینی و سادگی بھی ہے جس سے میر شاعروں کے ہجوم میں بھی پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود اردو شاعری کے مقابلہ میں میر کا فارسی حلقۂ سخن میں نسبتاً کم مقبول ہونا یقیناً فارسی زبان کے ان خصائص سے تعلق رکھتا ہے جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے ——— درآں حالانکہ فارسی میں زبان کی ساخت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہی جا سکتی ہے۔ میر نے بھی فارسی کی اس لسانی خوبی سے فائدہ اٹھایا ہے اور الفاظ کے چھوٹے چھوٹے اجزا کو ملا کر ایسے الفاظ وضع کر لیے ہیں جو اپنی جگہ پر کئی لفظوں کا بدل ہیں۔ مندرجہ ذیل ہم مضمون اشعار کے مطالعہ سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ میر نے اپنے فارسی اشعار میں ان خصوصیات کو کس حد تک قائم رکھا ہے جو اردو میں ان کی انفرادیت اور اہمیت کی ضامن ہیں ؎

فارسی :—
گل و آئینہ و مہ و خورشید
ہر کسے رو بسوئے تو دارد

اردو :—
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رُو تھا

یہاں میر کے اردو شعر میں " رُو بسوئے تو دارد" والی بات پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اسی ٹکڑے نے فارسی شعر کو عمومیت سے بچا لیا ہے۔ اردو کے شعر میں یہ بات ایک عام تشبیہہ سے آگے نہیں بڑھی۔

فارسی :—
دلے کہ در سینۂ من قطرۂ خونے بودہ است
چوں بچشم آید از و شیوۂ طوفاں دیدم

اردو :
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

اردو شعر میں تعقید پیدا ہوگئی ہے، فارسی شعر میں 'شیوۂ طوفاں' کی ترکیب نے حسن پیدا کردیا ہے۔ مجموعی تاثر کے لحاظ سے فارسی کا شعر آگے نکل جاتا ہے۔

فارسی:
ہر چند گفتہ اند کہ اے میر روزِ حشر
دیدار عام می شود اما نہ می شود

اردو:
موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وہ نہیں
کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

اردو شعر کے دوسرے مصرع نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ لیکن فارسی شعر کے دوسرے مصرع میں 'می شود' کی تکرار اور پہلے مصرع کی اس خوبی نے کہ اسے تکمیل معنی کے لیے دوسرے مصرع کا سہارا لینا پڑتا ہے، ایک خاص خوبی و دلکشی پیدا کردی ہے۔

فارسی:
ہم چو ما میر از زدہ حالے دیر پیدا می شود
مغتنم دانید روزے چند ایں دیندار را

اردو:
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اردو شعر نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی ہے اور ذہن و ذوق کو ایسا مطبوع ہوگیا ہے کہ لفظ 'پھرتا' کا صوتی تنافر بھی ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔

فارسی:
طرزِ گفتار میر را دیدم
بے دماغانہ گفتگوئے داشت

اردو:
مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

اردو کا پہلا مصرع بہت مشہور ہے لیکن دوسرے مصرع کی ترکیب 'بادِ فروشِ چمن' نادر ہونے کے باوجود پہلے مصرع کے مفہوم کو آگے بڑھا کر تکمیل تک نہیں پہنچاتی۔ فارسی میں مختصر بحر میں وہی بات زیادہ موثر طور پر ظاہر ہوتی ہے

فارسی:
نہ دیدم میر را در کوئے او لیک
غبار ناتوانے باصبا بود

اردو:
نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن!
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

اردو کا یہ مشہور شعر فارسی سے آگے نکل گیا ہے۔ "غبار اک ناتواں سا" سے جو بات پیدا ہوتی ہے وہ "غبار ناتوانے باصبا" سے ظاہر نہیں ہوتی۔ 'باصبا' سے تنہائی و بے یاری کا احساس بھی زائل ہوجاتا ہے۔

فارسی:
دوش بر شعر ترے در رقصِ آمد جانِ ما
چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما

اردو:
جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

دونوں اشعار قریب قریب ہم پلہ ہیں۔ لیکن اتنا ہے کہ 'رقص آمد جانِ ما' کے ٹکڑے سے شاعر کی خود فراموشی کا جو مفہوم مترشح ہوتا ہے وہ اردو شعر میں نہیں ہے۔

فارسی:
من چہ دانم رسم و راہ خانقاہ
عمر من در خدمتِ مے خانہ رفت

اردو:
سر نشینِ رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

'سر نشینِ رہِ میخانہ' کی ترکیب نے اردو شعر میں جان ڈال دی ہے۔ ویسے کلی تاثر مصرعوں کے ربط اور لہجہ کے بے ساختہ پن میں فارسی کا شعر زیادہ اثر کرتا ہے۔

فارسی:
میر جائے کہ بہ نیرانِ محبت می سوخت
صبح دیدیم بہ جا ماندہ کفِ خاک آنجا

اردو:
آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں میر سے شب کو
واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

اردو کے شعر میں روانی اور برجستگی ہے، اس کی ہلکی سی رمزیت اسے فارسی شعر سے اونچا کردیتی ہے۔ 'نیرانِ محبت می سوخت' کے مقابلہ میں آہوں کے شعلے اٹھنا زیادہ بہتر شعری اظہار ہے۔

فارسی:
بر سر ما بہ دمِ نزع رسیدی بہ عبث
ما کجائیم تو تصدیع کشیدی بہ عبث

اُردو: آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفس بازپسیں تھا

اُردو شعر میں نفس بازپسیں، اگرچہ نامانوس سا لگتا ہے لیکن پھر بھی اپنے اندر ایک کیفیت سی رکھتا ہے۔ دوسری طرف 'آیا تو سہی' شعر کے موضوع کی شدت کم کردیتا ہے۔ 'آیا تو سہی' سے شکوہ کے مقابلہ میں شکرانہ کا اندازہ ہوتا ہے جو شعر کے نفس مضمون کے منافی ہے۔ فارسی شعر میں 'ماکجائیم' کا لفظ معنوی وسعت بڑھا رہا ہے اس کے علاوہ 'عبث' کی ردیف نے شعر کے اثر کو دوبالا کردیا ہے۔

فارسی: دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد
شوریست در سرِ من شاید بہار آمد

اُردو: اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

اُردو کے شعر میں بڑی بے ساختگی ہے، دونوں شعروں میں موسم بہار میں جنون کی شدت کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ اُردو شعر میں 'موج ہوا پیچاں' اور 'زنجیر' کی مشابہت حسن بڑھاتی ہے تو فارسی شعر میں 'ہنگام کار' کا ٹکڑا معنی میں گہرائی پیدا کر رہا ہے

فارسی: سحر گہ بر سرِ پروانہ رفتم
کف خاکستر گرے بہ جا بود

اُردو: پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب!
شمع تک تو میں نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

اُردو شعر ہر لحاظ سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ محبت میں تباہی کا جو بھرپور نقشہ اپنے تمام تر تاثر کے ساتھ اُردو شعر میں اُبھرتا ہے فارسی میں وہ موجود نہیں ہے۔

فارسی: رفتہ شوق شود دیر و حرم را بگزار
طوف کن میر بہر در بسجود آمدہ را

اُردو: ہر راہ سے گزر کر دل کی طرف چلا ہوں
کیا ہو جو تیرے گھر کی یہ راہ بھی نہ کھلے

اُردو شعر میں 'کیا ہو' سے جو استعجاب اور خوف کی لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ فارسی شعر کو نصیب نہیں۔ "طوف کن میر بہر در" اور "دل کی طرف چلا ہوں" سے دونوں اشعار میں الگ الگ معنوی فضا پیدا ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا ہم مضمون اشعار تو وہ ہیں جہاں میر نے مماثلت کی متعدد جہتیں پیدا کی ہیں۔ یہ مضمون تاثر لب و لہجہ اور الفاظ و تراکیب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ بسا اوقات ایک شعر دوسرے شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے یا ان پر ترجمہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی اُردو غزلوں میں جو اختصاص ہے وہی فارسی غزلوں میں بھی ہے۔ میر کی منفرد آواز دونوں جگہ یکساں سُنائی دیتی ہے۔ وہی گستگی و افتادگی، وہی محرومی و ناکامی، وہی استغنا اور بے نیازی، مہجوری و دلگدازی جو میر کے اردو کلام میں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے ان کے فارسی کلام میں بھی موجود ہے۔ میر کی حدیثِ دل اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی عظمت و رفعت کی ضامن ہے۔ میر کے مندرجہ ذیل فارسی اشعار کے کلی تاثر سے جو فضا قائم ہوتی ہے اسے ہم ان کی اُردو شاعری میں بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ مماثلت کی اس جہت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان احساسات کے حامل اشعار میر کے اُردو دیوان میں جگہ جگہ ملیں گے ؎

اے آنکہ از دیارِ غریباں رسیدہ ای
بارے مگو کہ میر در آں چہ حال داشت

تا کجا شد میر خاک افتادہ از کوئے تو آہ!
خشت بالیں ہست وا و در سایۂ دیوار نیست

آگہ از آمدنِ میر دریں شہر نیم!
ایں قدر ہست کہ در کوئے تو غوغائے ہست

میر گویند در فراق نہ مرد
تا چساں بے تو زندگانی کرد

ایں بے کسی نگر کہ کسے چشم تر نہ کرد
یک ابر ہم بہ خاک غریباں گذر نہ کرد

زیں آمدن چہ لطف کہ آں بادہ خوار ناز
از حال مے کشانِ وفا بے خبر گذشت

از ما حکایت غم دل می تواں شنید
ما خوب می کنیم بیاں ایں مقالہ را

شور نو عندلیب جگر چاک می کند
آموختی ز میرؔ مگر طرز نالہ را

کوچہ او را چمن کردیم چوں رخصت شدیم
ریخت رنگ تازہ صد جا دیدۂ خوں بار ما

تا چہ پیش آمد فلاں میرؔ را در راہِ عشق
روزگار شد کہ حالِ آں جواں معلوم نیست

معلوم شد کہ منزل ما نیست ایں چمن
بر ہر کسے کہ چشم فتاد اضطراب داشت

شد رہِ آشیاں فراموشم
طائرِ نو پریدہ را مانم

خواب امشب ہم بہ یاراں شد حرام
قصۂ غم میرؔ باز آغاز کرد

امیر خسرو کی نظم نگاری : (صفحہ ۴۵ کا بقیہ)

ان غزلوں میں ایک ہی کیفیت کا بیان اس طرح ہوا ہے کہ ایک خاص فضا بن جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ کسی خاص موضوع کی تشریح بلا عنوان کی جا رہی ہے۔ گرچہ انداز تغزل کا ہے مگر سلسلۂ بیان وہ تنظیم پیدا کرتا ہے جو عام طور پر موضوعاتی یا عنوان بند نظموں سے منسوب کی جاتی ہے۔

مہدی حسین ناصری نے صنادید عجم مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۵ء میں مثنوی میں خسرو کی موضوعاتی نظم نگاری پر بہت ہی فکر انگیز تبصرہ کیا ہے، جو درج ذیل ہے:

'ایک خوبی ان کی مثنویوں میں یہ بھی ہے کہ خاص چیزوں پر بھی نظمیں تیار کی ہیں، مثلاً کاغذ کی تعریف، میوؤں کا حال، شراب، دریا، کشتی، شمع وغیرہ کا مستقل ذکر کیا ہے، حالاں کہ اب یہ رنگ یورپ کے لیے مخصوص ہو گیا ہے اور ایشیا میں تقلیدِ محض کی صورت میں جاری ہے۔' (صفحہ ۲۸۳)

خسرو کی ایجاد کردہ موضوعاتی نظم نگاری کی یورپ کے لیے تخصیص اور ایشیا میں اس کی تقلیدِ محض کا بیان گرچہ آزاد، حالی اور اقبال وغیرہ کے وقیع و عظیم تجربات کے بعد صحیح نہیں معلوم ہوتا مگر عصرِ حاضر کی مغرب زدہ اردو تنقید کے لیے اس میں عبرت کا بڑا سامان ہے۔ بہرحال، جیسا مہدی حسین ناصری کے ایک دوسرے بیان سے واضح ہے: 'امیر خسرو کی موضوعاتی نظم نگاری کی روایت کا سراغ متاخرین میں ابو طالب کلیم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس نے انگوٹھی، قلم دان، کشتی اور بندوق جیسے موضوعات پر باضابطہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ فارسی میں اقبال کی بے مثال نظم نگاری کے سرچشمے خود متوسط و متاخر فارسی شاعری کے خسرو اور کلیم جیسے اساتذۂ سخن کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اس سلسلے میں خسرو کا تاریخی تقدم اہلِ مغرب کے مقابلے میں بھی بالکل نمایاں ہے۔

عبدالمتین نیاز
صوفیہ ہاؤس، مہتیا پارک
بھوپال

غزل

پُرامن اہلِ زر کا یہ کردار دیکھنا
رونق پہ اسلحوں کے ہیں بازار دیکھنا

تارِ قبا ہے تن پہ، نہ روٹی شکم میں ہے
یارو ہماری زیست کا معیار دیکھنا

ہاتھوں میں گُل لیے ہیں نمائش کے واسطے
پوشیدہ اس قبا میں ہی تلوار دیکھنا

آؤ ہم ان کے تازہ عزائم کو مات دیں
دھرتی جو چاہتے نہیں گلزار دیکھنا

دعویٰ تو جاں نثاری کا دنیا کو ہے مگر
آتا ہے کون کون سرِ دار دیکھنا

پھر چل رہے ہیں رُخ پہ ہوا کے شریف لوگ
پھر بند ہو گئے لبِ اظہار دیکھنا

کیا غم کریں نیازؔ کہ عادت ہی بن گیا
ہر آرزو کو نقش بہ دیوار دیکھنا

●●

دیناناتھ مست
جی-۲/۱۶-۱۸، مالویہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

افواجِ ہند

ہندوستاں کی فوج کا دُنیا میں کیا جواب
یہ فوجِ ظفر موج ہے ہر طرح لاجواب
کرتی ہے اپنے دیش پہ قرباں جوانیاں!
اس کی شجاعتوں کی ہیں لاکھوں کہانیاں

جنگوں میں اس نے سِکّہ جمایا ہے ہر کہیں
طاقت کا اپنی غلبہ جمایا ہے ہر کہیں
بھٹی میں تپ کے نکلے ہیں یہ آہنی بدن
تیر و تفنگ موڑ دیں فولادی جسم و تن

آنکھوں میں بھری ہیں وہ عدو سوز بجلیاں
نظریں ہیں اگنی بان جگر دوز بجلیاں
ہو بحر و بر پہ جنگ کہ ہو آسماں پہ جنگ
دُشمن کی ہر مقام پہ کرتی ہے جان تنگ

ہر مورچے پہ فتح و ظفر چومتی ہے پاؤں
پڑتی ہے دُور دُور تک اس کی صفوں کی چھاؤں
ہندوستاں کا رکھے گی پرچم سدا بلند
پہنچا سکے گا اس کو نہ کوئی کبھی گزند!

یہ امن کی نقیب بھی ہے جنگ جو بھی ہے
ہے دوستوں کی دوست عدو کی عدو بھی ہے
لے گا جو لوہا کوئی ہماری سپاہ سے
زندہ نہ جا سکے گا کبھی رزم گاہ سے

نامِ قشونِ ہند سے زُہرہ ہو آب آب!
ٹکرائے گا جو اس سے وہ ہوگا شکست یاب
ضامن ہے امنِ دہر کی ہندوستاں کی فوج
دشمن ہے جنگ بازوں کی امن و اماں کی فوج

رام لعل
مکانی تکمیل ۲۹۰۰ بلاک ڈی
اندرا نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

عطا حسین عطا لکھنوی

اُردو کے ممتاز صاحبِ طرز ادیب اور ادبی دنیا لاہور کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم) نے طنز و مزاح پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ سطور قلم بند کی تھیں:

"عرب کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ النحو فی الکلام کالملح فی الطعام یعنی کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو نصیب ہے۔ غور کیجئے تو یہ مقولہ نہ صرف ایک ادبی صداقت کا اظہار کرتا ہے بلکہ اُس عنصرِ لطیف کا پیمانہ بھی مقرر کر دیتا ہے جس کی آمیزش سے ادب کے چشمۂ صافی میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھتی ہیں ذوقِ سلیم کے لبوں پر موجہ ہائے تبسم میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی زبان کی لطافت اور کسی قوم کی ذہنی پختگی کا اندازہ کرنے کے لئے اس زبان کی ادبی ظرافت اور اس قوم کا احساسِ مزاح ہی سب سے عمدہ معیار ہے اور یہ بھی ایک مانی ہوئی بات ہے کہ کسی ادب میں ظرافت عالیہ اُسی وقت نمو میں آتی ہے جب اُس ادب کا قوام پختہ ہو کر اپنے وسائلِ اظہار کے لیے ایک معیاری لطافت حاصل کر لیتا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس معیار کے اعتبار سے ہماری زبان دنیا کی پختہ تر زبانوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے"

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ادب کے ایک بڑے نباض نے ظرافت نگاری کو بھی ایک ادبی صداقت کا درجہ عطا کیا تھا۔ دوسری اہم بات انھوں نے یہ کہی تھی کہ کسی ادب میں ظرافت عالیہ اُسی وقت نمو میں آتی ہے جب اُس ادب کا قوام پختہ ہو کر اپنے وسائلِ اظہار کے لیے ایک معیاری لطافت پیدا کر لیتا ہے۔ یہ اشارے ہماری اردو زبان ہی کے ادب کے بارے میں کیے گئے ہیں۔ جو ان کے نزدیک دنیا کی پختہ تر زبانوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے۔ لسانی طور پر اُردو زبان کا تجزیہ کیا جائے تو اس حقیقت سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے کہ اس کی رگوں میں اصلاً عربی و ایرانی خون دوڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس کے مزاج کے جملہ اوصاف کی تلاش و جستجو کے لیے محققین اور نقادوں کو انہی دو زبانوں کے ماضی کی طرف پلٹنا پڑتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا خیال ہے کہ "السنۂ مشرقیہ میں فنِ تنقید نے جیسا کچھ بھی وہ تھا ہمارے کلاسی ادب سے ایسی بے رُخی کی کہ اُسے اپنا مستقل وجود تسلیم کرانے کے لیے بیسویں صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ اس صورتِ حال کا ایک سبب شاید یہ تھا کہ اسلامی تمدن نے جس خاص قسم کی ثقافت کو فروغ دیا وہ مضحک کیفیات کو کم از کم علمی حیثیت سے خاطر میں نہ لاتی تھی"

انھوں نے عالمی سطح پر قدیم ادب میں اس قسم کی صنف کے بارے میں واضح طور پر نشاندہی کی ہے۔ "یونان و روما

اور ما بعد احیائے علوم کا یوروپ، بلکہ خود گپتا عہد کا بھارت سب کے سب اپنا طربیہ ناٹک رکھتے تھے۔ چنانچہ ان ممالک میں تنقیدی تصورات خود بخود ایک زندہ طربیہ روایات سے دوچار ہوئے۔ عربی فارسی اور اردو کی دنیا میں یہ حالات صحیفہ تک پیدا ہو سکے۔"

اردو شاعری میں طنز و مزاح کے اوّلین دَور میں واعظ، محتسب اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ اور شگفتگی، رندی و بے باکی کی کیفیت موجود تھی۔ ہمارے موجودہ دَور تک آتے آتے شاعری میں طنز و مزاح کے مضامین کس کس طرح سے بدلے اور اب اس کا نشانہ ہماری سماجی زندگی، سماج کے رویے، افراد اور سیاسی لیڈر کس طرح بن رہے ہیں اس موضوع پر آنے سے قبل میں واعظ، محتسب اور زاہد کو طنز و مزاح کا ہدف بنانے کے تاریخی حقائق کے بارے میں دو اہم محققین کے قول پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" میں مولوی عبدالسلام ندوی کا یہ قول شعرالہند جلد اول از عبدالسلام ندوی صفحہ ۴۰۸ سے پیش کرتے ہیں:

"فارسی غزل گوئی میں یہ مضامین (زاہدوں اور واعظوں کی پردہ دری) تاریخی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ یعنی قدیم زمانے میں جب اسلامی سلطنت قائم تھی اس وقت محکمۂ احتساب بھی قائم تھا جس کا کام تمام مذہبی اور اخلاقی جرائم پر دار و گیر کرنا تھا۔ اس لیے جب آوارہ مزاج لوگوں پر اس محکمہ کے افسروں کی طرف سے جو زیادہ تر مذہبی لوگ ہوتے تھے دار و گیر ہوتی تھی۔ تو ان لوگوں میں جو شاعر ہوتے تھے وہ اشعار کے ذریعے اُن کا انتقام لیتے تھے۔ اردو شاعری میں اس قسم کے رندانہ خیالات محض فارسی شاعری کی نقل و تقلید سے آئے۔"

اور لکھتے ہیں: "ہجو کی طرح زاہد سے چھیڑ چھاڑ کا تصور بھی فارسی سے منتقل ہے۔" لیکن وہ مولوی عبدالسلام ندوی کے اس تصور پر حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ "یہ چھیڑ چھاڑ محض شاعر کی آوارہ مزاجی اور جذبۂ انتقام کا نتیجہ تھی۔" وہ آگے رقمطراز ہیں: "اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم ایران نے اسلامی یلغار کو پسند نہ کیا اور ایرانی جذبہ جس کا بہترین اظہار شاعری کے پیرائے میں ہوا اُس یلغار اور اس کی عائد کردہ مذہبی پابندیوں سے مشتعل ہو کر ردِ عمل پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن اگر غور کریں تو اس طویل عرصے میں زاہد اور محتسب سے چھیڑ چھاڑ آزاد منش کا وہ ردِّ عمل تھا جو اس نے سماج کی طرف سے عائد کردہ اخلاقی اور سماجی بندشوں کے خلاف ہمیشہ قائم کیا ہے۔ اور جس کی مدد سے اُس نے ان پابندیوں کو اوّل توڑ پھوڑ دینے ورنہ کم از کم اُن کا مضحکہ اڑانے کی ضرور کوشش کی۔ چنانچہ ان اشعار کی نفسیاتی وجہ محض شگفتگیٔ طبع یا جذبۂ انتقام کا مظاہرہ نہیں بلکہ یہ زندگی کے بعض سنگلاخ قوانین اور جذباتیت سے سینچی ہوئی بعض اخلاقی قدروں کے خلاف آزاد منش آدم کے ایک نمایاں ردِ عمل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مگر ان اشعار کی ایک اہم خصوصیت یہ ضرور ہے کہ یہاں شدت اور سنجیدگی کے بجائے ظرافت اور خوش طبعی کے عناصر کی فراوانی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس لیے یہ قابلِ برداشت بھی ثابت ہوتے ہیں۔"

اردو شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر کے دَر آنے سے متعلق تاریخی حقائق کے حوالے اس سے زیادہ پیش کرنا میرے خیال میں اب محض تضیع اوقات ہو گا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اب ایک لمبی چھلانگ لگا کر "اودھ پنچ" کے ارتقائی دَور میں آجائیں جب ہندوستان میں طنز و مزاح آب و تاب کے اس جدید دَور کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اودھ پنچ کے دَور سے پہلے کے کم و بیش ڈیڑھ سو سال کے عرصے کو ٹھہراؤ، یکسانیت اور شکست کا دَور قرار دیا ہے کیونکہ اس دور میں انگریزوں کی لوٹ مار، مرہٹوں کی یلغار اور

پٹھانوں کے حملے جاری تھے۔ اور یہ ایسے حادثات تھے جو ملک کے باشندوں کو سیاسی یا سماجی طور پر بیدار کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ جس کی بڑی وجہ وہ شکست خوردہ ذہنیت تھی جو قومی کردار پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس زمانے کے شعری اظہار میں قنوطیت کے علاوہ زاہد سے چھیڑ چھاڑ، ہجو اور معاصرانہ چشمکوں کے علاوہ ریختی کا رجحان بھی شامل ہو گیا تھا۔

اودھ پنچ کے دور میں ولی، حالی، اقبال، ریاض وغیرہ نے سیاسی و سماجی مسائل پر براہِ راست نکتہ چینی کے بجائے مقاومتِ کمترین (LEAST RESISTANCE) کا رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ ان کے جذبات کا تند و تیز بہاؤ زاہد اور محتسب کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ جدید دور میں بھی زاہد اور محتسب طنز و مزاح کا نشانہ بنتے رہے لیکن ان کا استعمال علامتی بھی بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے ؎

ترے ابرو کی پہنچے گر خبر مسجد میں زاہد کو
تماشا دیکھنے آوے ترا، محراب سے اُٹھ کر (ولی)

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا (میر)

تقویٰ کا اس کے موسمِ گُل نے کیا یہ رنگ
زاہد کو خانقاہ سے مے خانہ لے گیا (سودا)

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے (غالب)

اقبالؔ بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی تو یہ بنا کردار کا غازی بن نہ سکا (اقبال)

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے (غالب)

اسی دور میں نظیرؔ، شہبازؔ، اکبرؔ الہ آبادی وغیرہ بھی آتے ہیں۔

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے پھیلا کیا ہے (اکبر)

برگد کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے
مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے (اکبر)

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی (اکبر)

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں (شبلی نعمانی)

سب سے پہلے اُن کو جس دوڑ کے گھر جانا پڑا
شیخ بدھو نام تھا اور تھا...... قوم کا (ظریف)

زاہد رہِ معرفت دکھا دے مجھ کو
یہ کس نے کہا کہ سزا دے مجھ کو
کافر ہوں! ہوئی یہ تو مرض کی تشخیص
اب اس کا علاج بھی بتا دے مجھ کو (جوش)

یہ ساری مثالیں اُردو ادب کی اِس صنف کی ارتقائی منازل کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی ہوں گی جن نے سنجیدہ نثری و شعری ادب کے شانہ بشانہ اپنے مخصوص رنگ اور مزاج کی طنزیہ و مزاحیہ کی محفلیں برپا کیں اور ملک کو آزادی سے پہلے ایک صحت مند اور انقلابی لب و لہجہ بنانے میں مدد دی اور آزادی کے بعد کی ہمارے جمہوری نظام کی سیاسی و سماجی ناہمواریوں سے بڑی شگفتگی سے آشنا کرایا ہے۔ عطا حسین عطاؔ لکھنوی اکبرؔ الہ آبادی کے ہم عصر تھے۔ ان کی پرورش اور ذہنی تربیت لکھنؤ کے اس ماحول نے کی جس میں منشی سجاد حسین، اکبرؔ الہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، احمد علی

شوقؔ قدوائی، مرزا محمد بیگ ستم ظریف، احمد علی کاملؔ، منشی سجاد حسین، انجم کسمنڈوی، برقؔ، ہجرؔ، لاابالی اور ان کے بعد ظریف لکھنوی کے چرچے عام تھے۔ اُس زمانے کی ایک جھلک احمد جمال پاشا کی زبانی سنیے :-

" آیئے آج آپ کو دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے کے لکھنؤ کی ایک تہذیبی جھلک دکھا دوں۔ دیوان خانے میں شطرنج کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ والد مرحوم، مولانا صفیؔ، حضرت ظریفؔ، علامہ عبدالباری آسیؔ، ناطقؔ لکھنوی وغیرہ کھیل میں محو ہیں۔ جالبؔ دہلوی، شوکتؔ تھانوی اور عطا حسین عطاؔ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دو ایک نوجوان بھی واں حاضر ہیں کہ کسی شطرنج کے کھلاڑی سے کوئی بہت ہی ضروری کام ہے یا گھر والوں نے خیریت لینے بھیجا ہے۔ حقہ، پان کے دَور چل رہے ہیں۔ پیچوان گردش میں ہے۔ گُڑگُڑی سے غور و فکر میں مدد لی جا رہی ہے۔ اکثر ایک ایک گھنٹے تک سوائے سانس یا ہوں! کے کوئی آواز نہیں سُنائی دیتی ..... کبھی جوشؔ ملیح آبادی اور قاضی خورشید احمد اچانک نازل ہو کر بساط الٹ دیتے "

آگے لکھتے ہیں :-

" سید عطا حسین عطاؔ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ بساطِ ادب پر اُس وقت " اودھ پنچ " اور اس کے ظریفوں کا طوطی بول رہا تھا۔ غرض شباب اودھ نہ سہی " اودھ پنچ " میں انھوں نے آنکھیں کھولیں "

عطا حسین عطاؔ کس کے شاگرد تھے یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے کوئی خود نوشت بھی نہیں چھوڑی اور میرے سامنے ان کے ایسے خطوط بھی نہیں ہیں جو انھوں نے دوسروں کو لکھے ہوں اور جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے شعوری طور پر اپنے پیش رووں یا اپنے ہم عصروں میں سے کسی کو کا اثر قبول کیا تھا۔ احمد جمال پاشا ان کی گہری قربت ظریفؔ لکھنوی سے بتاتے ہیں۔ لیکن عطاؔ کو ان کا شاگرد نہیں بتاتے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یا تو ان سے (ظریفؔ سے) مشورۂ سخن کیا یا اُن کی قربت کا گہرا اثر قبول کیا جس سے انھیں بہت فائدہ ہوا۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر وہ (عطا حسین عطاؔ) اکبرؔ الہ آبادی کے نزدیک جاتے یا ان کا اثر قبول کرتے تو برباد ہو جاتے کیونکہ اکبرؔ کا کینوس بہت وسیع تھا۔ اور ان کا اسلوب ناقابلِ تقلید تھا۔ دوسرے اکبرؔ کے زمانے کے تقاضے اور انداز بدل چکے تھے۔ پھر یہ کہ دونوں کے مزاجوں میں وہی فرق تھا جو زمین اور آسمان میں ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اکبرؔ الہ آبادی کے اثرات سے بچ نکلنا کسی بھی طنزیہ و مزاحیہ شاعر کے لیے ممکن نہیں نظر آتا۔ لیکن اکبرؔ کی ذہنی اڑان مغرب کو نشانۂ طنز بنانے اور مشرق کو ایک مقام بلند پر دکھانے کے بجائے ان دونوں میں توازن پیدا کرنے کا درس دینے میں صرف ہوتی رہی۔ بقول محمد احسن فاروقی " اکبرؔ محض بدلتی ہوئی قدروں کے ترجمان سے آگے بڑھ کر دائمی قدروں کے طرفدار دکھائی دیتے ہیں مگر ڈاکٹر وزیر آغا اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ دائمی اقدار والا نظریہ کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں " اکبرؔ الہ آبادی کے زمانے کے حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ سر سیّد کی طرح وہ بھی قومی ترقی پر اپنی توجہ مبذول کرتے اور اپنی قوم کو مغرب کے بعض ترقی پسند رجحانات سے قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوتے۔ لیکن ہوا یہ کہ " یارانِ تیز گام " تو برق رفتاری سے اس راستے پر گامزن ہو گئے اور اکبرؔ اپنی زنجیروں ہی میں جکڑے رہ گئے " اکبرؔ کی اس ناکامی کو وہ ایک " مجروح شخصیت " قرار دیتے ہیں۔

اگر احمد جمال پاشا عطاؔ لکھنوی کے ضمن میں اکبرؔ الہ آبادی کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ میں نہ کرتے تو شاید مجھے بھی اکبرؔ کی " مجروح شخصیت " کو واضح کرنے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے نتائج کا سہارا نہ لینا پڑتا۔ لیکن جب بات اس نہج پر آ ہی گئی ہے تو اکبرؔ کے بارے میں اردو ادب کے مؤرخ کے یہ الفاظ بھی نقل کرنے کی

اجازت دیجئے " اکبر مرحوم نے بعض اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش کی "

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا

طفل سے بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

باپ ماں سے، شیخ سے، اللہ سے کیا کام ان کو
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

ان سے اور ایسے بیشمار اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کے پیشِ نظر بدلہ سنجی کے حربے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی ساری فکر اپنے زمانے کے کینوس میں قید تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ ان کا ایک انفرادی لب و لہجہ اور اسلوب تھا اس لیے بہت بعد کے بدلے ہوئے حالات میں پیدا ہوئے کسی شاعر کا ان کا اثر قبول کرنا اور برباد ہو جانا بھی قابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔ عطا حسین عطاؔ نے اپنے عہد کی بیکاری کی اس شعر میں جس طرح عکاسی کی ہے وہ اکبر کے دور میں کسی طرح بھی ممکن نہیں تھی ؎

گریجویٹ کو میسّر ہی نوکری نہ ہوئی
نکاح جیسے ہوا اور رخصتی نہ ہوئی

فریب زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
میسّر ڈالڈا ہوتا ہے گھی محسوس کرتا ہوں

وہاں سے پیٹر بکس تک اٹھ گیا ہے
جہاں سن بیالیس میں تھا ڈاکخانہ

دورِ حاضر کی سیاست کا اسیری کا انجام
فکر دانے کی جو ہوتی ہے تو دام آتا ہے

یہ انقلاب کا عالم یہ دورِ آزادی
ہوا ہے زاغ ہما آشیاں کہیں نہ کہیں

اس شرط سے حاضر ہے مرا دم ہر دم
جب آپ منسٹر ہوں اخلاق بدل جائے

وزارتوں کی دھاچوکڑی معاذ اللہ
ہر ایک رہتا ہے رستہ کناں کہیں نہ کہیں

یہ حکم جنگ بندی کا بالکل فضول ہے
ہے امن جس کا نام وہ گولر کا پھول ہے

قیمتیں بھی بڑھ گئیں روپیہ بھی دُبلا ہو گیا
سست پڑتا جا رہا ہے کاروبارِ زندگی

ہے یہ بیکار جو اخبار میں نام آتا ہے
وہ ہے انسان جو انسان کے کام آتا ہے

ہے آساں جان دے دینا کفن ملنا مصیبت ہے
ہے سستی موت اور کپڑا گراں معلوم ہوتا ہے

ہوا ہے اتحادِ باہمی شیخ و برہمن میں
کتھا وہ کر رہے ہیں، ان کے گھر میلاد ہوتا ہے

فی زمانہ اس سے بڑھ کر اور کوئی پیشہ نہیں
خدمتِ قومی کرو بن جاؤ کھدر پوش بھی

زور جاپانیوں کا حد سے بڑھا
ہم سمجھے تھے زم چارے ہیں

شادیوں طے گا مگر کر کے بزم رقص وسرود
وصول کیجئے چندہ یتیم خانہ کا

انھیں کے سوٹ بنے اور نام چیک ڈیزائن ہے
جو تہمدیں کبھی آئی تھیں چار خانے کی

مدفن کہاں ہو اس کو بتاتا نہیں کوئی
جس کو خلا میں موت کا پیغام آگیا

کچھ مصلحت وقت کا تابع ہے ایڈیٹر
اخبار میں ہوتی ہے خبر ۳/۵
کیا حزب مخالف کے ہیں دو جز
سرکار میں رہتی ہے کسر ۳/۵

آموت آ بجا مجھے مالک مزار کا
مانگے کی زندگی ہے کرایہ کا گھر بھی ہے

ان اشعار میں وہ عصری حکایات جنھیں عطا حسین عطاؔ نے اپنے تجربات کا حصہ بنایا ہے۔ ان کا تصور اکبرؔ کے عہد میں کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ عطاؔ نے شیخ اور حسن وعشق کے معاملات کو بھی اپنی فکر کی طنز پہ کسوٹی پر پرکھا اور پیش کیا ہے اور بعض

اوقات ان کے یہاں طنز ومزاح سے ہٹ کر سنجیدہ لب ولہجے میں بھی غزل کے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جنھیں پڑھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ اگر وہ طنز نگاری ومزاح نگاری کی طرف مائل نہ ہوتے تو اردو ادب کو کیا باکمال شاعر نصیب ہوجاتا ـــ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

یہ رسم عشق کی بھی افسونِ محبت ہے
جب شمع بجھے جل کر پروانہ بھی جل جائے

پیری میں پڑ گئیں رُخِ روشن پہ جھریاں
چلمن میں اک چراغ ہے گویا دھرا ہوا

صیاد نے پر کتر کے اُڑے لے کے قفس ہم
شاید یہ نہ سمجھا تھا نکل آئیں گے پر اور

پھر میکدے میں شیخ خوش انجام آگیا
بھولا جو صبح کا تھا سرِ شام آگیا

ہے میکدہ سنبھل کے قدم رکھیے شیخ جی
اندھے ہوئے ہیں آپ کو کچھ سوجھتا نہیں

لامکاں بن کے بھی ہر جا پہ مکاں ہوتا ہے
یہ مذاق آپ کا اللہ میاں ہوتا ہے

میکدہ میں وہی پیرِ مغاں ہوتا ہے
جس کی پیشانی پہ سجدہ کا نشاں ہوتا ہے

میرے دل کے ارمان سب بجھ چکے ہیں
فقط راکھ ہی راکھ ہے اب چلم پر

بزم میں وہ جلوہ آرا ہیں مگر چپ سادھ لی
موم بتی ہے کہ جو روشن بھی ہے اور خاموش بھی

ہیں میخانے میں شیخ ورند لیکن فرق اتنا ہے
کوئی بدنام ہوتا ہے کوئی بدنام رہتا ہے

وہی تم ہو وہی ہم ہیں مگر کیا چیز حائل ہے
حماقت کا ہی پردہ درمیاں معلوم ہوتا ہے

پریشاں صیاد اب ہے کہ قیدی
قفس کو سمجھنے لگے آشیانہ

عطا حسین عطاؔ اگرچہ رسول پور میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تمام تر پرورش و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوتی رہی۔ قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد نفسیات میں ایم اے کرنے کے لیے داخلہ لے چکے تھے کہ وکالت شروع کر دی۔ اس سے پہلے کئی دفتروں میں ملازمت بھی کر چکے تھے۔ کچہری کے ماحول میں بھی شاعر ہونے کی وجہ سے خاصے مقبول و ہر دلعزیز رہے۔ بار کونسل کی رونق انہی کے دم سے تھی۔ جہاں قانونی گفتگو کم اور سیاسی، سماجی اور خالص لکھنوی طرز کی بات چیت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں طنز و مزاح کی چھاپ زیادہ اٹھتی رہی۔ ہزل، تضمین، تحریف، صنعت لفظی، رعایت لفظی، تصرف، محاورہ، بذلہ سنجی وغیرہ ان کے کلام کے مختلف اوصاف ہیں جن کا انتقادی تجزیہ کوئی مستند نقاد ہی کر سکتا ہے۔ میں نے ان کے کلام کے مسودے کے علاوہ ان کے بارے میں ایک درجن کے قریب مضامین بھی دیکھے ہیں جو مختلف اوقات میں اردو ہندی کے اخبارات و رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں ان کے اشعار کا جو انتخاب ملتا ہے وہ عام طور پر یکساں ہے جن میں سے کچھ اشعار میں نے بھی اوپر دیدیے ہیں۔ لیکن ان کے کئی اشعار میں نے لکھنؤ کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے بھی سنے ہیں جو وہ اپنی بات میں وزن یا اثر پیدا کرنے کے لیے موقع بے موقع بے ساختہ سنا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو تو صرف ایک ایک مصرع ہی یاد رہ گیا ہے۔ مثلاً ع

کچہری بند، دفتر میں میاں اتوار بیٹھے ہیں

ان کے کچہری کے بارے میں کہے ہوئے اشعار کا تھوڑا سا انتخاب احمد جمال پاشا نے بھی کیا ہے۔ چند ایک اشعار اس میں سے بھی ملاحظہ فرما لیجیے:

الٰہی خیر ہو انصاف میں رخنہ نہ پڑ جائے
بھری برسات ہے اور منصفی کی چھت ٹپکتی ہے

ہے وکالت میں یہ بھی اک آرام جھک کے کر لیتی ہے ججی بھی سلام

ختم ہو کر ججی وکالت پھر آم کے آم گٹھلیوں کے دام

ادھر بحثیں ادھر تجویز کی فکر وکالت اور ججی میں فرق ہے یہ

مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے ذاتی طور پر کبھی نہ مل سکا۔ انھیں کسی نہ کسی مشاعرے میں سنا ضرور تھا۔ اُن کا انتقال ۲۶ نومبر ۱۹۷۸ء کو بس اسٹیشن قیصر باغ کے چوراہے پر ایک کھڑکھڑے سے ٹکرا جانے سے ہو گیا تھا۔ اب اس دردناک حادثے کے سات برس بعد جب مجھے ان کے کلام پر اظہار خیال کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے تو یہ سوچ کر ایک حسرت یہ ہوتی ہے کہ میں نے ان کے نیاز حاصل کیے ہوتے تو لکھنؤ کے آزادی سے پہلے دور کے کتنے اوراق میں نے ان کی آنکھوں سے ہی پڑھ لیے ہوتے۔ پھر بھی میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ ان کے بیشتر اشعار ہمارے اردو ادب کے طنز و مزاح کی تاریخ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد کوئی ریسرچ اسکالر آزادی کے بعد کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر کام کرے گا تو عطا حسین عطاؔ لکھنوی کو اس لیے نظر انداز نہیں کر سکے گا کہ وہ ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی تاریخ اودھ پنچ اور حالیہ دور کی ایک اہم درمیانی کڑی ہیں۔

★ ---

ایم اے بیگ چمن سیمابی
چمن منزل چوپٹہ۔ اٹاوہ

ابوالکلام آزاد

جس کو قدرت نے عطا کی تھی عجب عقلِ سلیم
تھی ملی فرعونیت کو جو چمن ضربِ کلیم
جس کا تھا کردار اعلیٰ، جس کی شخصیت عظیم
جس نے دکھلائی زمانے کو صراطِ مستقیم
ملک سے جس نے مٹایا ظلم و استبداد کو
کس طرح بھولے گی دنیا حضرتِ آزاد کو

جس کی ہر تحریر میں مضمر ہزاروں انقلاب
رہبرِ منزل ہے جس کی آج بھی ہر اک کتاب
جس کا ہر اک لفظ ہے گویا درخشاں آفتاب
جس نے اُلٹا ہے ہر اک چہرے سے باطل کا نقاب
جس نے پگھلایا ہے اپنے عزم سے فولاد کو
کس طرح بھولے گی دنیا حضرتِ آزاد کو

جس کے ممنونِ کرم ہندی ہی کیا اہلِ عرب
جس کے دم سے آج بھی روشن ہے قندیلِ ادب
سینۂ باطل پہ جس نے کر دیا جھنڈا نصب
ایشیا سے اہلِ مغرب کا مٹا شور و شغب
شاد جس نے کر دیا ہر اک دلِ ناشاد کو
کس طرح بھولے گی دنیا حضرتِ آزاد کو

منکشف جس نے کیا دنیا کے ہر اک راز کو
واقعی سمجھا ہے جس نے عیسوی اعجاز کو
نغمہ زن جس نے کیا ہے زندگی کے ساز کو
جس نے اونچا کر دیا انسان کی پرواز کو
کر دیا غارت جہاں سے ہر ستم ایجاد کو
کس طرح بھولے گی دنیا حضرتِ آزاد کو

●●

علی احمد دانش
۱۲۳/۳۲۰ میر انیس ہاؤس
چوک لکھنؤ ۳

اعتراف

(فیض کے مجموعہ دست صبا سے متاثر ہو کر)

دولتِ دستِ صبا
وجہ تسکینِ ہنر
رونقِ دیدۂ تر
موجِ خوں
جس کے لیے قلب و جگر
راہگذر

دولتِ دستِ صبا
شامِ رفتہ کے اسیروں کے لیے
نیلگوں دامنِ مشرق کو
زر افشانی سے
مرکزِ جلوۂ انوار بنا دیتی ہے
سوز و ساز
اور
تپشِ سینۂ آدم دے کر
دیکھتے دیکھتے
اک غنچۂ خورشید کھلا دیتی ہے

دولتِ دستِ صبا
لالہ و گل کے صحیفوں پہ بکھر کر ہر صبح
کچھ نئے رنگ نئے حرف سجا دیتی ہے

●●

ڈاکٹر صابرہ حبیب
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

عصری اردو شاعری: رجحانات و خصوصیات

بیشتر زبانوں کی طرح اردو شاعری بھی مسلسل تغیر پذیر رہی ہے۔ اس ضمن میں جو پہلا سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ عصری اردو شاعری کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے۔ لیکن یہاں بھی کسی مخصوص تاریخ کا تعین یا کسی ایسے مخصوص شاعر کا نام لے سکنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے جہاں سے یا جس سے ان خصوصیات کی ابتدا ہوئی جو عصری شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہ مسئلہ خود اپنی جگہ نہایت دشوار ہے کیونکہ ثقافت سے تعلق رکھنے والی ہر بات میں ایک تسلسل ہوتا ہے نیز ایسے معاملوں میں ہم ماضی سے ناطہ نہیں توڑ سکتے اور اردو کی عصری شاعری کے لیے بھی اپنے ورثہ اور روایات کو خواہ وہ کیسی ہی چھن چھنا کر لطیف اور بذل چکی ہوں قائم رکھنا ضروری ہے اس لیے اس کی ابتدا ہمیں اس زمانہ سے ہی کرنا چاہیے جس نے اسے ایک ورثہ عطا کیا۔

اس امر پر بالعموم اتفاق ہے کہ اردو میں نئے رجحانات حالی اور اقبال سے شروع ہوئے حالانکہ خود ان کی اپنی اپنی خصوصیات اور ان کے تبصرہ نگاروں کے درمیان بھی بڑے وسیع اختلافات ہیں۔ حالی پہلا اردو شاعر ہے جس نے اپنے زمانہ کی اردو شاعری سے متعلق مختلف مسائل کو مربوط تنقیدی اصول عطا کیے۔ ان کی مشہور تنقیدی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" نے اردو کے غزل گو شعرا کی روایتی غنائی شاعری کی اس حتمی تنزلی کی نشاندہی کی جس کا مستقبل بالکل موہوم بن چکا تھا۔ اس کی تخیلی لطافت تو مفقود ہو ہی چکی تھی جو کچھ تخیل آفرینی باقی تھی اس کی دو مخصوص خامیاں تھیں۔ اول تو وہ غیر فطری تھی اور دوسرے وقت کے اہم تقاضوں سے اس کا کوئی رابطہ باقی نہ رہا تھا۔

چنانچہ حالی نے اردو شاعری کو نیچرل بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ نیچرل سے ان کی مراد انسانی فطرت کے اصولوں اور تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنا تھی۔ دوسرا نکتہ جس پر انھوں نے زور دیا وہ یہ تھا کہ زندگی جس طرح گزاری جاتی ہے اس کے حقائق اور مسائل کو شاعری کا موضوع بنانا تھا۔ آپ تخیل میں تو آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہیں لیکن اگر یہ تارے زندگی کی ان بے شمار تاریک گلیوں اور کوچوں کو جن میں آپ کے ساتھی بھٹکتے پھر رہے ہیں کچھ روشنی مستعار نہیں دے سکتے تو وہ آتشدان سے بکھری ہوئی چنگاریوں سے بھی بدتر ہیں۔

حالی کے زمانہ میں صنف کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا۔ شاعری کا وسیلہ "بیت" تھی اور بیت کی ترکیب بحر اور وزن کی بنیاد پر تھی نیز بحر اور وزن کے قواعد باقاعدہ مرتب اور مستند مانے جاتے تھے۔ خود شاعری کی شکل کیا ہو یہ بات موضوع بحث ہو سکتی تھی۔ غزل کی طرح الگ الگ اشعار ہوں یا مسلسل نظم جس میں ایک ہی موضوع کی تفصیل شعر در شعر ہوتی چلی جاتی یہاں تک کہ پوری نظم ایک مربوط اور متحد ترکیب کی شکل اختیار کر لیتی۔ دونوں کی ہی اپنی منفرد منطق تھی یعنی تخیل کی منطق اور معقولیت کی منطق۔ یہ

جانا غیر ضروری ہے کہ حالی نے آخر الذکر کی حمایت اور سفارش کی۔ چنانچہ جس ورثہ کو حالی نے آنے والی نسلوں تک پہنچایا وہ تین باتوں پر مبنی تھا۔ اول، فطرت انسانی کے قوانین اور مطالبوں سے اردو شاعری کی مطابقت کی ضرورت۔ دوم، شاعری کا رشتہ زندگی کے حقیقی مسائل سے جوڑنے کی ضرورت، نہ کہ خیالی محبت اور رغبت کے مسائل کا ذکر۔ اور تیسرے، غزل کے جدا جدا موضوع و معنی کے اشعار پر مسلسل نظم کو ترجیح۔

اس ورثہ کو اردو کی عصری شاعری نے کیا روپ دیا اسے ہم جلد ہی دیکھیں گے لیکن فی الوقت آئیے اردو شاعری کی اس میراث کو دیکھیں جو اقبال کی عطا کردہ ہے اور جس کا حالی کے ترکہ سے مختلف ہونا دونوں شاعروں کے پس منظر کے اختلاف کی بنا پر لازمی تھا۔ اگر حالی خالص مشرق کی علمی روایات کی پیداوار تھے تو اقبال نہ صرف اپنے وقت کے بلکہ آج بھی اردو شعرا میں مشرقی روایات نیز مغربی علم و دانش دونوں ہی کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔ ان کے علمی تبحر کی تفصیل میں جائے بغیر ہمارے مطلب کے لیے اس ترکہ کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے میں جو ان کا حصہ رہا ہے صرف وہی بتا دینا کافی ہوگا۔ اقبال نے اردو شاعری کی میراث میں جن باتوں کا اضافہ کیا وہ یہ ہیں:۔

(۱) اسلامی فلسفہ کا عنصر جس کا اقبال کے یہاں ماخذ تقلید پسندانہ دینی نظریے بھی ہیں اور مذہبی تحقیق میں آزادیٔ فکر بھی جو صوفی فلسفہ کے نام سے جانی گئی اور جو دنیا کے تمام مذاہب میں موجود باطنیت (صوفیت) کی ایک مخصوص شکل ہے۔

(۲) غور و فکر اور اظہار خیال کے ایسے الہیاتی (ما فوق الطبیعاتی) انداز جن کا طرۂ امتیاز گہری فکر اور عمیق جذبات دونوں کا باہمی اختلاط ہی نہیں مکمل امتزاج ہے۔

(۳) یہی دونوں باتیں شاعری کے اسلوب میں گہرائی پیدا کرنے کی متقاضی ہوئیں۔

بسا اوقات لوگ یہ سوچنے پر مائل ہوتے ہیں کہ ایک شاعر جس کا کلام فصیح و بلیغ عالمانہ الفاظ سے لبریز ہو وہ ان مشکل الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال جان بوجھ کر کرتا ہے۔ چنانچہ اردو شاعری میں "مشکل پسندی" کی اصطلاح رائج ہو گئی گویا شاعر اپنے اسلوب کو بالارادہ دقیق بناتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ بالعموم ایک مخصوص موقع پر ہمارا انداز بیان یا تو عقل سے متاثر ہوتا ہے یا جذبات سے اور جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں متعلقہ قوت کے تحت ہی ہوتے ہیں۔ لیکن جب جذبہ اور عقل دونوں ہی بیک وقت حاوی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں تو تحت الشعور میں معانی کی چنگاریاں شعور کو کچھ اس طرح چوندھیا دیتی ہیں کہ مافی الضمیر کا واضح، سادہ اور عام فہم زبان میں اظہار کر سکنا ناممکن ہو جاتا ہے اور جسے ہم مشکل پسندی کہتے ہیں وہ شاعر کے لیے اختیاری نہ ہو کر جبری بن جاتی ہے۔

اقبال کے اسلوب بیان میں ایک اور دشواری اسلام کی فلسفیانہ روایات ہیں جن کے لیے روزمرہ میں کوئی اصطلاحات نہیں پائی جاتیں۔ اقبال اسلام کے قرون وسطیٰ کے مفکرین کی روایات سے ربط و تسلسل قائم رکھنا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے ان مفکرین کے رنگ و آہنگ سے مطابقت قائم رکھنی لازمی تھی۔

اس طرح اقبال نے اسلام کی فلسفیانہ روایات کو الہیاتی طرز عطا کیا جو ایک مشکل طرز اور انداز بیان تھا اور جو اگرچہ ارادی محسوس ہو سکتا ہے مگر فی الحقیقت پہلے دو نکتوں کا لازمی نتیجہ ہے۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ بعد کے شعرا نے ان دونوں ورثوں کا کیا کیا جو اس صدی کے اولین دور سے جاری ہونے والے علم و فیض کے ان دو سرچشموں سے انھیں حاصل ہوئے تھے۔

حالی کی وہ تنبیہ جو انھوں نے تخیل کی اس قسم کے بے مصرف ہونے کے بارے میں کی تھی جس نے شاعری کی صنف غزل کو

حقیقی نقوش نہ دے کر صرف زعمِ باطل عطا کیا تھا غالباً اس کے غیر تحقیق شدہ امکانات کے ناکافی ادراک کا نتیجہ تھی۔ آتش، ناسخ، داغ اور امیر مینائی کے ہاتھوں میں غزل اپنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچی ہوئی تو محسوس کی جا سکتی تھی مگر حالی نے جن دیو پیکر ستونوں کا تصور کیا تھا وہ عالمِ ادراک میں حرفِ آخر نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ البتہ وہ ایک وسیع پھاٹک کے ایسے کھمبے کہے جا سکتے ہیں جن سے ہو کر وہ راستے کھلتے تھے اور جن کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالی کی بصیرت کی آخری حدود سے ماورا غزل کے روحانی سرور بخشنے والے اَرضی میدانوں میں بہت سے نامعلوم اور غیر مفتوحہ علاقے چھپے ہوئے تھے اور جو سورج اُس وقت ڈوبتا نظر آرہا تھا نئی آب و تاب سے دوبارہ طلوع ہونے والا تھا۔ چنانچہ موجودہ صدی کی دوسری، تیسری اور چوتھی دہائیوں میں صنعتِ غزل کے پیرووں میں اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، نوح ناروی، شاد آں رامپوری، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی اور بے شمار ایسے غواص ابھرے جنھوں نے نہ صرف بحرِ غزل کی گہرائیوں میں ڈوب کر بیش بہا موتی نکالے، بلکہ اس کی تہہ میں چھپے قیمتی معدنی اجزا کے ایسے نئے نئے اور بھرپور سونے بھی ڈھونڈھ نکالے جو زندگی کو نئی توانائی عطا کرنے والے اور نئے اعتماد سے مسلح کرنے والے تھے۔

اردو کے روایتی غزل گو شعرا اور حالی کے بعد دوسری اور چوتھی دہائی کے اردو شعرا کی نئی نسل کے درمیان ایک نہایت اہم فرق ان جدید شعرا میں انہماکی لگن کی زیادتی کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے کے شعرا میں انہماکی جذبہ مفقود تھا کیونکہ انہماکی جذبہ کے بغیر شاعری ہی ممکن نہ ہوتی بلکہ قدیم شعرا کا انہماکی جذبہ ایک کاریگر کا جذبہ تھا جبکہ تیسری اور چوتھی دہائی کے شعرا کا جذبہ فنکار کا جذبہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جستجو میں مستانہ وار یہ شعر گنگناتا نظر آتا ہے ؎

غواص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی
ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی

اور جن گوہروں کی انھیں تلاش تھی وہ گہرے سے گہرے معانی و مطالب کے موتی تھے، صرف قدما کے افکار کو نیا جامہ پہنانے کے لیے الفاظ اور بندشوں کے ہی موتی نہیں۔

قدیم غزل کے خلاف حالی کی آگاہی میں ایک بنیادی تعصب (بے جا طرفداری) کی جانب توجہ مبذول کرائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ غزل زندگی کے حقائق سے بہت دُور خود پسندی کے واہمہ میں الجھی ہوئی ہو یہ بھی مانا کہ جہاں زندگی کے خاکی مسائل سے سروکار ہو وہاں اس کی افادیت صفر ہے۔ مگر افادی اہمیت ہی تو سب کچھ نہیں اور لازمی نہیں کہ زندگی کی ہر شے کا رابطہ دنیاوی، مادی حقایق سے قائم رکھا جائے۔ کنول کے پھول کا تنا عمارتی یا فرنیچر کی لکڑی مہیا نہیں کر سکتا پھر بھی ہم کنول کو دنیا سے نیست و نابود تو نہیں کر دیتے۔ سوسن کا پودا خشک زمین پر نہیں پنپ سکتا لیکن ہم اُسے اُگانے کے لیے دل لگا کر اور خوشی خوشی تالاب اور جھیلیں بناتے ہیں۔ جمالیاتی قدر، افادی قدر سے کہیں زیادہ بلند ہوتی ہے اور غزل کی جمالیاتی قدر سے انکار نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ روایتی طرز ہی کی ہو۔ کچھ اور نہیں تو یہ ہمیں عقل و دانش اور فکری پرواز کے بلند خطیوں کے واحد وارث ہونے کا تو یقین دلاتی ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حالی غزل کے میدان میں ہونے والی فکر و تخیل کی نئی تخلیقوں کو دیکھتے تو اس شاعری کے غلط بیان اور بے مصرف ہونے سے متعلق اپنی رائے بدل دیتے یا اس میں ترمیم ضرور کرتے جس میں گویا خود انسان کی روح گاتی محسوس ہوتی ہے۔ اصغر نے جو نئی افقیں تلاش کیں اور جگر کی اپنے فن کے لیے مکمل انہماکیت اور خود سپردگی انھیں تبدیلیِ رائے پر مجبور کر دیتی۔ خصوصاً جگر اپنی غزلوں میں ایسا کیف بھر دیتے ہیں جس کی تاب بڑے سے بڑا ہوشمند

بھی نہیں لا سکتا۔ ان کی شاعری موج در موج بن کر اسس خالص ہوش و خرد کے ساحل سے ٹکریں لیتی ہے جو ایک عام احساس رکھنے والے قاری اور اس عریاں حقیقت کے درمیان بلور دیوار کھڑا ہے جس کا مشاہدہ اس نے اپنی خردمندی کی بنا پر اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔

یقینی طور پر اصغر اور جگر کے یہاں روایت سے رشتہ توڑ لیا گیا، وہ روایت جو فن کے مقابلہ میں 'ہنر' کو اور تخیل پر واہمہ کو ترجیح دیتی تھی۔ اردو شاعری نے ایک نیا موڑ لیا اور یہ نیا موڑ پڑھنے کے انداز میں بھی اتنا واضح ہے جتنا کہ تخیلی تخلیقات اور ان کے اظہار و بیان کے نئے طریقوں میں۔ حالی کے زمانے تک اشعار تحت اللفظ میں پڑھے جاتے تھے یعنی بحر اور اوزان کی تقطیع سے مطابقت پر زور دیتے ہوئے۔ طرزِ ادا میں ترنم کے مقابلہ میں خطابت زیادہ ہوتی تھی۔ جگر اور ان کے ہمعصر ساغر جیسے شعراء کے یہاں شعر پڑھنے کا انداز خطابت کے مقابلہ میں غنائی اصولوں سے زیادہ ہمکنار ہو گیا اور یہ کوئی الگ سے عائد کیا ہوا پہلو نہ تھا بلکہ اس تاثر کا براہِ راست نتیجہ ہوتا جس کے تحت اس نسل کے شعرا شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعری ان کی روح کا نغمہ تھی۔ چنانچہ نغمگی میں ڈھلے بغیر سامعین تک اس کی ترسیل ممکن نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ساغر اپنے اشعار عروض کے اوزان و بحر کے بجائے اپنے کسی مخصوص پسندیدہ آلۂ موسیقی پر ڈھال کر کہتے تھے۔ دنیا کے اعلاترین نظریوں کے مطابق شاعری کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ سبق دینا اور محظوظ کرنا۔ سبق دینے کے لیے اسے اپنے آپ کو خطابت کے اصولوں سے جوڑنا لازمی ہے اور محظوظ کرنے کے لیے غنائیت کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہے۔ غنائیت کو خطیبانہ بنانا اور خطابت میں غنائیت پیدا کرنا جب ہی ممکن ہوگا جب ترسیل کا کوئی ایسا نیا وسیلہ ڈھونڈھا جائے جو شاعری کے لیے اس وقت پوری طرح مناسب ہو جب وہ پڑھی نہ جائے بلکہ سنی جائے۔ ان شعرا کو ایسے ہی وسیلہ کی تلاش تھی۔ یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ شاعری کی غنائیت خود موسیقی کی غنائیت سے کچھ مختلف ہی ہوگی۔

اس نسل کے دو شاعر (اگر انھیں اس کے بعد آنے والی نسل میں نہ شمار کیا جائے)، جن کا الگ تذکرہ ضروری ہے فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی ہیں جن میں سے آخر الذکر تقسیم ہندوستان کے کافی عرصہ بعد پاکستان ہجرت کر گئے اگرچہ اس ملک کو کبھی بھول نہ سکے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ میں نے ان کی نسل کے دوسرے شعرا میں سے انھیں کا تذکرہ اس لیے مناسب سمجھا کہ انھوں نے اپنی ذات میں صنفِ غزل کے اس ورثہ کو جس پر اصغر اور جگر نے نئی جلا دی تھی مسلسل نظمیہ شاعری سے ملو کر دیا جس کی سفارش حالی نے کی تھی اور جسے اقبال نے نمونہ بنا کر پیش کر دیا تھا۔ ان دو شاعروں کے ساتھ شاید مجھے ایک اور شاعر کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہیے جس کا نام ہی ہر لکھنوی کو پیارا ہے یعنی اسرار الحق مجاز جنھوں نے غزل اور نظم دونوں ہی صنفوں میں جولانی دکھانے کے علاوہ خود اپنی قیامت خیز جذباتیت کو اردو شاعری میں ابھرنے والے اس نئے رجحان سے جوڑ دیا جو پامال، مظلوم درستائے ہوئے [illegible]

"اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو"

یا

آج بھی خونِ دل مرا قشقۂ جبینِ ناز کا
آج بھی خاکِ دل مری سرمۂ چشمِ دلبراں

ان کی جذبہ آفرینی کی مثال ہیں جبکہ "آوارہ" جیسی نظم، مظلوم و محروم اور مصیبت زدہ لوگوں کے دلوں میں ابلتے اور پیچ و تاب کھاتے جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔

اس سلسلے کے دو اور شاعروں کا ذکر بھی ضروری ہے جو خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں۔ کیفی اعظمی اور علی سردار جعفری۔ ان کی انفرادی خوبیوں کے بجائے ان کے اس سیاسی پس منظر کا ذکر کر دینا زیادہ وضاحت کا سبب بنے گا جس نے ان کی

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

غزلیں

ید رونق رضا
اڑین گلی۔ شاہجہاں پور

وہ رات ڈھل بھی چکی دل پہ بار باقی ہے
پروں میں پچھلے سفر کا غبار باقی ہے

میں جیت آیا ہوں ہر جنگ جسم کے باہر
مگر ابھی مرے اندر کی ہار باقی ہے

بلندیوں سے بچھڑ کر بھی جانے کیوں مجھ میں
عجیب طرح کا اک اِفتخار باقی ہے

شکست وہ تو ہوا میں مگر نہیں جیتا
وہ جانتا ہے ابھی میرا وار باقی ہے

ابھی قیام وفا ہے فریب کی صورت
ابھی بہ فیضِ جنوں اعتبار باقی ہے

●●

وقار سہسوانی
دیپا سرائے، سنبھل
مراد آباد

شکستہ سنسان اک حویلی میں لمحہ لمحہ بکھر رہا ہوں
میں اپنے اجداد کی وراثت کے بوجھ سے دب کے مر رہا ہوں

اُداس لمحوں کا زہر سارا مری رگوں میں اُتر چکا ہے
وجود شل ہو رہا ہے میرا، میں جاں کنی سے گزر رہا ہوں

میں رت جگوں کی تھا اک علامت کبھی پلٹ کر نہ تم نے دیکھا
اب آج کیا ڈھونڈتے ہو مجھ میں کہ باقی بس اک کھنڈر رہا ہوں

سلگتی تنہائی کا گلہ کیا، اکیلے پن کا ہراس کیسا
میں سُونی سُونی اجاڑ راتوں کی مدتوں رہ گزر رہا ہوں

نہ جانے کب آشیں پرندے پھر ان فضاؤں میں لوٹ آئیں
پناہ گاہیں تو سوکھی شاخوں پہ ابھی تعمیر کر رہا ہوں

تم اپنے ماضی کی ہر علامت میرے فسانے میں ڈھونڈ لینا
میں ذات میں اپنی اک مکمل ثقافتوں کا سفر کر رہا ہوں

سفر کا آغاز کب ہوا تھا، وقار رہتا بھی یاد کیسے؟
کہ اپنے باطن کی کش مکش سے ہمیشہ زیر و زبر رہا ہوں

●●

افسانہ

ستیش بترا
۳۳۰ - سیکٹر ۱۹ اے
فریدآباد - ۱۲۱۰۰۲

خالی پن کا بوجھ

ابھی دادی ماں کمر سیدھی کرنے کے لیے اندر گئی ہی نہیں کہ داداجی نے پکارنا شروع کر دیا ہے۔

"رمیش کی ماں! رمیش کی ماں!" جب ان کے پکارنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تو ان کی آواز تیکھی اور بلند ہونے لگی ہے، جیسے ابھی ہانڈی میں اُبال آجائے گا ـــــ شاید انھیں پیشاب کی حاجت پھر ہوئی ہے۔

مجھے امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ میں بے دلی سے کتاب رکھ دیتا ہوں۔ میں کروں بھی تو کیا۔ میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔ داداجی کی بینائی تو ہے نہیں۔ اس پر وہ اتنے بے ہمت اور کمزور ہیں کہ ان کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ انھیں سنبھالنا بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ داداجی اپنا سارا بوجھ آپ پر اس طرح لاد دیتے ہیں کہ انھیں سنبھالنا تو درکنار خود بھی سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

داداجی پھر "رمیش کی ماں" کی رٹ شروع کر دیتے ہیں۔ میں ان کی بینائی کو دیکھتے ہوئے پکار اُٹھتا ہوں۔

"دادی ماں! دادی ماں!"

ایک ہاتھ جھکی پیٹھ پر رکھے، دوسرے سے آنکھیں ملتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آتی ہیں۔ "کیا ہے رے مدن! ایک منٹ بھی تو چین نہیں! ابھی ابھی تو لیٹی تھی۔!"

"دادی ماں! میں نہیں داداجی بُلا رہے تھے۔!"

وہ داداجی کا نام سنتے ہی گھسٹتے پاؤں سے ان کے پاس آکھڑی ہوتی ہیں۔

"کیا ہے جی۔!" ان کی آواز میں جھنجھلاہٹ کے ساتھ نمرتا بھی پنہاں ہے۔ "ابھی تو آپ کے پاس سے اُٹھ کر گئی تھی"۔

داداجی ازاربند کی گرہ کھولنے میں لگے ہیں۔ دیکھ کر وہ پوچھ اُٹھتی ہیں "باتھ روم جانا ہے کیا۔؟ ابھی ابھی تو لے کر گئی تھی۔!"

داداجی نادم ہو کر ڈرے بچے کی طرح دبے لفظوں میں بول اُٹھتے ہیں۔ "ہاں۔!" جیسے وہ کہہ رہے ہوں تم تو میری مجبوری سمجھتی ہو!

داداجی کو کبھی کبھی تو ہر پانچ منٹ میں پیشاب آنے لگتا ہے اور کبھی کبھار وہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا وقفہ بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر انھیں کوئی پیشاب کی بیماری بتاتے ہیں جس کا علاج صرف آپریشن ہے۔ لیکن دادا اتنے کمزور اور نحیف ہو چکے ہیں کہ ڈاکٹروں کو شک ہے کہ کہیں یہ آپریشن جان لیوا نہ بن جائے۔ میری نظر میں تو بڑھاپا ویسے ہی جان لیوا ہوتا ہے۔

داداجی کے مقابلے میں دادی ماں کی صحت قدرے بہتر ہے اگرچہ وہ بھی اسّی کے پیٹے میں داخل ہو چکی ہیں۔ وہ اب بھی اپنے آپ گھوم پھر سکتی ہیں گو بینائی اب انھیں دھوکا دینے لگی ہے پھر بھی عمر کے لحاظ سے ان کی توانائی بہت کچھ قائم ہے۔ یہ انھی کا دم ہے کہ وہ داداجی کو پچھلے بیس سال سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ داداجی نے تو آنکھوں سے معذور ہوتے ہی اپنے آپ کو

مکمل طور سے دادی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

"اُٹھیے۔!" اور دادا جی کرسی کی ہتھی کو ٹٹولتے ہوئے اس کا سہارا لیتے، ذرا جھولتے ہوئے، ذرا لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دادی ماں کی مضبوط بانہوں کو ان کے ہاتھوں نے تھام لیا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے چھڑی کا سہارا لیے ہیں اور دوسرا بازو دادی ماں کے سپرد کر دیا ہے۔ دادی ماں دادا جی کا ہاتھ پکڑے ان کے آگے آگے دولہا بنی اس طرح سے چلتی ہیں جیسے وہی زندگی کی اہم ترین ذمہ داریوں کو نبھانے کی اہلیت رکھتی ہوں۔

منہ سے گو کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن گھر کے سبھی لوگ، میری ماں، پتا جی، دادا جی کی اس حالت سے بیزار ہیں۔ ماں تو دادا جی کو دیکھتے ہی اپنی ناک پر ڈوپٹہ رکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔ شاید کوئی اسے ماں کا گھونگھٹ نکالنا سمجھتا ہو لیکن مجھے ساری حقیقت معلوم ہے۔ ماں کہتی ہیں انھیں دادا جی کو دیکھ کر متلی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ویسے ماں دل کی بہت اچھی ہیں۔ پتا جی تو دن بھر دفتر میں رہتے ہیں۔ البتہ شام سویرے وہ ضرور دادی ماں اور دادا جی کے پاس بیٹھتے ہیں، ان کا حال پوچھتے ہیں، اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن آخر ہر بات کی تان دوائیوں اور ان کے بڑھتے ہوئے خرچ پر ٹوٹتی ہے اور پتا جی روز، اگلے دن دوائیاں لانے کا وعدہ کر کے اٹھ جاتے ہیں۔ کبھی یہ دوائیاں آ بھی جاتی ہیں اور کبھی نہیں بھی۔ ماں تو ان دوائیوں کی مہنگائی کا رونا روز ہی لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آخر گھر کا خرچہ چلے بھی تو کیسے؟ یا دال روٹی کھا لو یا دوائیاں! گھر میں ہر کسی کو یہ بھی احساس ہے کہ بوڑھے بزرگوں کو باہر پھینکا بھی تو نہیں جا سکتا۔!

دادا جی اب کئی باتیں بھولنے لگے ہیں۔ انھیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس دن تو مجھے بہت ہنسی آئی۔ دادا کرسی پر بیٹھے تھے میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "مجھے بٹھا دو۔" اب میں انھیں کہاں بٹھاتا۔! میں نے دادی ماں کو آواز دے کر دادا جی کی فرمائش کا ذکر کیا۔ ماں منہ پھیر کر ہنسنے لگیں۔ دادی ماں پاس آکر کہنے لگیں۔ "کرسی پر تو بیٹھے ہی ہیں آپ! اب آپ کو بٹھانے کے لیے کون سا راج سنگھاسن لاؤں۔؟"

جب میں چھوٹا تھا تو دادا جی مجھے بڑی مزے دار کہانیاں سُناتے تھے۔ پریوں کی، جنوں کی! ویسے اب بھی وہ کبھی کبھی بڑی مزے دار باتیں کرتے ہیں۔ میری چھوٹی بہن ششی جس نے ابھی اسکول جانا شروع کیا ہے، جب کبھی اسکول سے لوٹتی ہے تو وہ سیدھے دادا جی کے پاس ہی آتی ہے۔ وہ ان کی چھڑی کو اٹھائے کبھی گھوڑا بنا کر کھیلنے لگتی ہے اور کبھی چھڑی کا سہارا لیے بوڑھے بابا کا سوانگ رچاتی ہے۔ جونہی دادا جی کو چھڑی اٹھانے کی آہٹ ملتی ہے وہ پکار اُٹھتے ہیں۔

"اری ششی گڑیا! تو آگئی۔!"

ششی کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ چھڑی پکڑ کر اس کے سہارے بوڑھا بننے کی کوشش کرتی ہے جبکہ دادا جی پر بچپن سوار ہوتا ہے۔! انسان بھی کتنا عجیب ہے۔ وہ ہمیشہ اسی کی کھوج میں لگا رہتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتا۔!

ویسے تو دادا جی بہت اچھے ہیں لیکن کبھی کبھار ان کے شوق بہت ناگوار گزرتے ہیں۔ دن بھر وہ اونگھا کرتے ہیں اور ان کی گود میں پڑا ٹرانزسٹر کچے پکے گانے، قوالی، غزل، دادرا وغیرہ الاپتا رہتا ہے۔ کرکٹ، فٹ بال کی کمنٹری آ رہی ہو تو بھی کوئی بات نہیں۔ پتہ نہیں وہ سنتے بھی ہیں کہ نہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کوئی نہ کوئی آواز ان کے کانوں میں ہر وقت پڑتی رہے بس! اب چاہے کسی کا امتحان ہو، کوئی بیمار ہو، کسی کا موڈ آف ہو، انھیں تو ریڈیو کی آواز والی ورزش سے مطلب ہے۔ کئی بار جی میں آتا ہے ان سے کہوں کہ وہ دوسروں کی ضرورت کا بھی کبھی دھیان کر لیا کریں لیکن پھر ترس آ جاتا ہے۔ وہ اپنی تنہائی کا غم غلط کرنے کے لیے اس کے سوا کریں بھی تو کیا۔؟

مگر آج کل تو آنکھوں سے لاچار لوگ بھی بہت کچھ کر لیتے ہیں، گا بجا لیتے ہیں، ٹائپ کر لیتے ہیں اور نہیں تو ہاتھوں سے کچھ دیکھ بناتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے انھیں میکر ... میں

جیتے جی کام کرتے دیکھا ہے۔ دادو رہنا پڑتی ہے ان کی محنت ہمت اور لگن کی۔ وہ تو آنکھ والوں کو بھی کئی بار پیچھے چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن دادی ماں کی محبت اور سیوا نے انھیں کہیں کا نہ رکھا دادا جی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سب چیز حاضر! دادا جی کو اور کیا چاہیے۔ جہاں کھڑے ہونے کی جگہ نہ ہو وہ بیٹھ جاتے ہیں اور جہاں بیٹھنے کی جگہ نہ ہو انھیں پاؤں پسارنے کو مل جاتے ہیں۔ دادی ماں نے تو ان کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اب اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہیں۔ اور دادا جی ہیں کہ بنا سوچے سمجھے حکم چلاتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی سوچتے ہی نہیں کہ اب دادی بھی کمزور اور لاچار ہوتی جا رہی ہیں، ان کا تو خیال یہ ہے کہ اب دادی پر جوانی پھوٹ رہی ہے۔

دادا جی نے اپنے لیے کوئی شوق پالا ہی نہیں۔ کسی زمانے میں پڑھنے کا شوق ضرور تھا لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ وہ اندھوں کی زبان — کیا کہتے ہیں — بریل (BRAILLE) — وہ جس سے اُبھرے ہوئے لفظوں پر انگلیاں رکھ کر پڑھا جاتا ہے۔! وہی سیکھ لیتے۔ اب بہت سے آنکھوں سے لاچار لوگوں نے یہ زبان سیکھ کر بی۔ اے۔ ایم، اے کیا اور ڈاکٹریٹ کی سندیں حاصل کی ہیں۔ اب دادا جی سے تو کوئی بی۔ اے، ایم۔ اے کرنے کی امید نہیں رکھتا۔ کم از کم ان کا اپنا وقت ہی آسانی سے کٹ جاتا!

میں نے تو ایک بار ڈرتے ڈرتے انھیں یہ زبان سیکھنے کے لیے کہا تھا لیکن انھوں نے کہہ دیا۔ "اب یہ بوڑھا طوطا کہاں پڑھے گا۔!" دراصل دادا جی کچھ کرنے کے حق میں ہی نہیں ہیں۔

میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد انھیں EAR PHONE (ایئر فون) لا دیے تاکہ ان کے ٹرانزسٹر سننے سے میری پڑھائی کا ہرج نہ ہو۔ لیکن انھیں اس کا استعمال کرنا بھی ایک آفت معلوم ہوتا ہے۔ اب اس چھوٹے سے گھر میں میرے لیے ایک الگ کمرہ کہاں سے آئے۔! دادی ماں کہتی ہیں کہ میں پڑھنے کے لیے پارک چلا جایا کروں۔ اب میں ان سے کہتے ہوئے ہچکچاتا ہوں کہ وہ دادا جی کو پارک میں گھما لایا کریں! ایک دو بار ماں بھی میری خاطر الجھ گئی تھیں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! میرا کیا۔ میں امتحان میں فیل ہو جاؤں گا۔! اس کے لیے تو گویا سب لوگ تیار بیٹھے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر! آخر میں خبر تو میری ہی لی جائے گی۔

اور پھر اب تو دادا جی کی حالت خراب ہونے لگی ہے۔ پہلے تو انجانے میں کبھی کبھی پیشاب نکل جاتا تھا۔ اب تو اکثر ان کے پاجامے دُھلنے لگے ہیں۔ بستر پر اب باقاعدہ موم جامہ بچھنے لگا ہے۔ دادی الگ پریشان ہیں۔ ان کے لیے تو آفت ہی ہے۔ دن میں دو تین بار تو دادا کا پاجامہ دُھلنا معمول ہو گیا ہے۔ میں کیا گھر کے سبھی لوگ سوچنے لگے ہیں۔ ایسی زندگی سے کیا فائدہ! دادی ماں بھی بہت پریشان رہتی ہیں، گو وہ منھ سے کچھ نہیں بولتیں۔

اور پھر اچانک رات کو دادا جی کے سینے میں درد اُٹھا۔ بہت دیر تک ان کے کمرے سے کراہنے کی آوازیں آتی رہیں۔ دادی ماں نے گھبرا کر گھر کے سبھی لوگوں کو اٹھا دیا۔ دادا جی کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ پتا جی نے مجھے اٹھا کر پڑوس سے ڈاکٹر انکل کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔ لیکن ڈاکٹر انکل کے آتے آتے، دادا جی پرلوک سدھار گئے۔

کچھ دن گھر میں لوگوں کا آنا جانا رہا۔ پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ شاید دادی ماں کے علاوہ گھر میں سب لوگ انھیں بھول گئے تھے — ماں اور پتا جی بھی۔ البتہ کبھی کبھی دادا جی کے بارے میں پوچھتی، ان کی چھڑی کو ڈھونڈتی اور دادی ماں کی آنکھیں ذرا ذرا سی بات پر چھلک پڑتیں۔ وہ دن بھر ادھر ادھر رہتیں، پھر مجھے آکر کوستیں۔

"لے۔ اب جتنا چاہے پڑھ! اب کوئی ٹرانزسٹر تیرے پڑھنے میں بادھا نہیں ڈالے گا —!" اور پھر وہ اپنے آپ رونے لگتیں۔ ماں اور پتا جی انھیں دلاسا دیتے — وہ ایک طرف اپنے کھٹولے پر پڑی رہتیں۔ جیسے کسی نے ان کا محبوب کھلونا چھین لیا ہو۔

شاید وہ مجھ کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراتی تھیں، یا شاید وہ

اپنا غم کسی اور سے اتنا کھُل کر نہیں کہہ سکتی تھیں۔
" تیرے دادا ہی کے لیے تو میں سارے گھر میں اِدھر ادھر گھومتی پھرتی تھی ! اب مجھے بتا۔ میں کیا کروں۔؟!

وہ خالی ذہن، خالی دل اور خالی جھولی لیے اپنی تمام تر بے بسی کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

**

عصری اردو شاعری: خصوصیات و رجحانات

(صفحہ ۶۴ کا بقیہ)

شاعری کو آب و رنگ بخشتا۔ یہ روس کے انقلابی نظریہ کا تاثر تھا۔ ہندستان کو آزادی ضرور مل گئی تھی لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے اس سے جنت زمین پر تو نہیں اتر آئی۔ کچھ لوگوں کے خیال میں ہندستان نے صرف غلامی کی زنجیریں توڑی تھیں۔ لیکن دوسری زنجیریں جیسے افلاس، سماجی ناانصافی، بد دیانتی اور انسانی حقوق میں دست اندازی ابھی باقی تھیں۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور جو کچھ حاصل کرنا باقی ہے۔ وہ عوام الناس کے دلوں میں اس ناانصافی کا عالمگیر شعور پیدا کرائے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ جسے جھیلتے رہنے پر انھیں مجبور رکھا جاتا ہے۔ یہ کام شاعر کا ہے کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی خوابیدہ دلوں میں بیداری نہیں پیدا کر سکتا۔ مجاز اب زندہ نہیں۔ کیفی اور جعفری ہم میں ابھی موجود ہیں اور خدا کرے وہ ہم کو روشنی دکھانے کے لیے ابھی زندہ رہیں تاکہ ہم اپنی جدوجہد میں ان سپاہیوں کی طرح نہ ہو جائیں جو گھُپ اندھیرے میں جنگ کرتے ہوئے ہر دوست دشمن پر یکساں وار کر رہے ہوں۔ جدوجہد جاری ہے اور جاری رہے گی کیونکہ انسانیت اپنی بہشت تک کبھی نہیں پہنچے گی جیسا کہ اسٹیونسن نے کہا ہے " مجھے دور سامنے دیکھنے کے لیے ہمیشہ نئے افق ابھرتے رہیں گے "

میں یقیناً غلط سمجھی جاؤں گی اگر یہ تاثر دوں کہ عصری شاعری کی بس ایک دُھن یہ ہے کہ سماجی انصاف اور عمل پر مبنی معاشرہ کی تعمیر کی جائے۔ ہمارے اردو شعراء میں یہ شعور پوری طرح موجود ہے۔ اور ایسا ہونا اچھا بھی ہے لیکن اردو شاعری کا عصری منظر ایک رنگا رنگ اور مخلوط منظر ہے۔ اس میں ایک طرف سامعین اور قارئین کو اپنی شاعری سے محظوظ کرنے والے رنگینیت پسند شاعر ہیں تو دوسری طرف ان کے شانہ بہ شانہ عروضی فلسفہ کو بطور شوق استعمال کرنے والے شاعروں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو سرخ یا کم سے کم گلابی لبادے میں پیش کرنا پسند کرتے ہیں۔

میں اپنے اس مضمون کو تین عناصر کی نشاندہی کیے بغیر ختم نہیں کر سکتی جو اردو کی عصری شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں اور آج بھی اسے متاثر کر رہے ہیں یعنی مغربی اثرات، موجودہ برقی وسائل اور فلم اور شاعری میں صنف کا مسئلہ۔

--

منیر الزماں منیر
وقف کمشنر آفس
سکریٹریٹ بلڈنگ۔ حیدرآباد

جنید حزیں لاری
معرفت سرفراز احمد پیپر مرچنٹ
دال منڈی۔ وارانسی

پیام فتحپوری
پتہ مہاپالیکا کالونی نسیم آباد۔ جیسن گنج، کانپور

غزلیں

قریب دل جو تھے، برسوں کا رشتہ توڑ گئے
اک اجنبی کی طرح راستے میں چھوڑ گئے

وفا کی راہوں میں جن کے بھی پاؤں زخمی تھے
وہ ہر مقام پہ اپنے نشان چھوڑ گئے

رہِ وفا میں وہی حاصلِ سفر نکلا!
غبارِ راہ سمجھ کر جسے وہ چھوڑ گئے

بجھے ہوئے سے چراغوں سے ہم کو کیا لینا
ہمارا ساتھ کئی آفتاب چھوڑ گئے

اک ایسا باب بھی تاریخِ میکدہ میں ہے
کہ رند جاتے ہوئے ٹوٹے جام چھوڑ گئے

قفس میں جب پر پرواز کٹ رہے تھے منیر
دیارِ غیر میں احباب مجھ کو چھوڑ گئے

••

اس انجمن میں نہ تفریقِ خاص و عام کرو
یہ میکدہ ہے یہاں سب کا احترام کرو

خلوص کے ہے منافی یہ زندگی کی روش
وفا شعار بنو، خوش دلی کو عام کرو

کرو جو صبحِ بنارس کے جلوہ زاروں میں
اودھ کی مہکی فضاؤں میں اپنی شام کرو

ہے ذرہ ذرہ یہاں حسنِ گلستاں کا امیں
گلوں کے ساتھ ہی کانٹوں کا احترام کرو

یہ تشنگی کہ ہے سوزِ دروں کا سرچشمہ
جو حوصلہ ہو تو اس کو نہ رہنِ جام کرو

نئی جہت سے اٹھو حوصلے نئے لے کر
زمانہ یاد کرے کوئی ایسا کام کرو

مسابقت کا ہے جذبہ تو آؤ ہم نفسو!
مرے بلند عزائم کو زیرِ دام کرو

ہمارے کام کی عظمت اس سے کم ہوگی
ہزار تہمتِ بے جا ہمارے نام کرو

عجب نہیں کہ حزیں حرفِ حق بیاں کر کے
صلیب و دار کا پھر کوئی اہتمام کرو

ہر نفس سلسلۂ نقد و نظر رکھتا ہوں
میں ہوں شاعر میں دو عالم کی خبر رکھتا ہوں

یہ نہ سمجھو کہ ہے مجھ کو کسی منزل کی تلاش
خود میں منزل ہوں مگر ذوقِ سفر رکھتا ہوں

رہبرِ راہِ محبت کی ہے منزل ہی جدا
میں زمانے سے الگ راہ گزر رکھتا ہوں

خونِ دل ہے مری دولت، مرا سرمایۂ غم
اپنی پلکوں پہ بہت لعل و گہر رکھتا ہوں

شعلۂ عشق ہوں دنیا کو جلا سکتا ہوں
دل میں اک سلسلۂ برق و شرر رکھتا ہوں

شعر میں خونِ جگر سے مرے رنگینی ہے
شاعری کیلئے میں خونِ جگر رکھتا ہوں

ہر نفس جلوۂ صد رنگ کا عالم ہے پیام
جلوۂ حسن بعنوانِ دگر رکھتا ہوں

••

افسانہ

اسعد ابراہیم علوی
۳- ہیلیٹ اسکوائر، لکھنؤ

ایسے ویسے کیسے کیسے

دو سال ہوئے رضیہ نے سائیکالوجی میں ایم اے کیا ہے مگر رہی گودڑی کی گودڑی ـــــ نہ کوئی سلیقہ نہ تمیز۔

وہ اس طرح ہر شام دفتر سے بھاگ کر بس کی کیو Queue میں کھڑی ہو جاتی ہے جیسے کوئی مرکھنی گائے رسّی تڑا کر بھاگ نکلی ہو۔

بڑھتی ہوئی عمر اور تجربہ آدمی کو بہت کچھ سکھا دیا کرتا ہے۔ مزاج شناسی تھوڑی بہت تو ہر ایک کو آجاتی ہے مگر رضیہ کو آج تک چہروں کا پڑھنا نہیں آیا۔ جب میں بہت عجلت میں ہوں گا، بیچ سڑک پر چیخ کر آواز دے کر بلا لے گی ـــــ پاس جاؤ ـــــ اس عجلت اور گھبراہٹ کی وجہ پوچھو تو ایسی گم صم جیسے اس نے آواز نہ دی ہو اور میں غلطی سے اس تک پہنچ گیا ہوں اور بس کی کیو (Queue) میں میرے آگے یا پیچھے گھنٹوں کھڑی رہے گی، بات بھی نہ کرے گی۔ پوچھو ـــــ "آج جلدی چلی آئیں ـــ؟"

جواب دے گی "ہوں"

"کیا کم کام ہے آج کل۔؟"

"ہوں"

"جب دفتر سے جلدی اٹھتی ہو تب بھی سیدھی گھر ہی جاتی ہو۔؟"

"ہوں"

"ہوں ـــ ہوں ـــ ہوں" ـــ احمق لڑکی ـــــ !

چہروں کو تو پڑھ نہیں پاتی ـــــ کیسے ایم اے کر لیا اس گدھی لڑکی نے۔!

وہ اکثر اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ مدتوں کہیں نظر نہیں آتی۔ دفتر فون کرو، جواب ملتا ہے "سیٹ پر نہیں ہیں ابھی ابھی کینٹین گئی ہیں" پھر فون کرو، جواب ملتا ہے "شاید باتھ روم گئی ہیں" جھنجھلا کر ریسیور رکھ دینا پڑتا ہے۔ پھر مدتوں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

بس کی کیو روز لگتی ہے، بگڑتی ہے، ٹوٹتی ہے۔ دھواں دھواں شام کو کاروں اور بھاری موٹر گاڑیوں کی سرچ لائٹ، دھند کو پھاڑ کر رات کا بگل بجاتی ہے مگر وہ کہیں نہیں ملتی۔

مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔ ایک مرتبہ اس نے چائے پر بلایا تھا ـــــ دفتر میں اس کی سیٹ میری دیکھی ہوئی ہے۔ مگر میں نہ اس کے گھر جاتا ہوں اور نہ دفتر ـــــ مجھے کیا پڑی ہے جو اس کی فکر کروں۔ میں اس سے پہلے نہیں ملا تھا، وہ خود ہی آکر مجھ سے ملی تھی۔ شرمائی شرمائی سی، ہلکی ہلکی نظروں کے ساتھ اس نے میرے آفس کی چق اٹھا کر انگریزی میں اندر آنے کی اجازت لی تھی۔ میں نے حسب معمول نظر اٹھائے بغیر ہی اس کو اندر آنے کی اجازت دی تھی ـــــ وہ آئی تو بس اخلاقاً میں نے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا تھا ـــــ وہ مجھ سے ملنے کیلئے آنے والی کوئی پہلی لڑکی تھوڑی تھی۔ صبح سے شام تک ایک سے ایک حسین لڑکیاں مجھ سے ملنے آیا کرتی ہیں ـــــ اس میں کوئی

خاص بات نہ تھی۔

وہ کچھ ڈرتی جھجکتی ہوئی کرسی کے کونے پر بیٹھ سی گئی۔ آمد کا سبب دریافت کرنے پر ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے زیرِ لب مسکرائی بولی ــــ غزل ہے میگزین کے لیے۔"

جی میں آیا کہ جل کر کہوں۔" یہاں یہی تو لوگ دینے آتے ہیں کوئی نوٹ دینے تھوڑی آتے ہیں"۔ مگر کچھ سمجھ کر میں نے کہا کچھ نہیں۔ میں نے لفافہ چاک کرکے غزل نکالی۔ ایڈیٹر کے نام ایک عدد خط کے ساتھ غزل منسلک تھی۔

"غنیمت ہے"۔ میں نے سرسری سی نظر میں دیکھ کر اندازہ لگایا۔ پھر اس کو لفافے میں رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" یہ آپ میگزین ایڈیٹر کو دے دیں، میرا تعلق تو نیوز سے ہے ــــ خبر ہو تو مجھ کو دیجیے۔"

"میگزین ایڈیٹر کہاں ملیں گے۔؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اس کو راستہ دکھانے کے واسطے چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ مجھے روکتے ہوئے بولی:۔

"سنیے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہی اس کو انھیں دے دیں ــــ بات یہ ہے کہ میں ان کو جانتی نہیں ہوں۔"

آپ ان کو جانتی نہیں ہیں، تو کیا مجھ کو جانتی ہیں ــ؟"

میں نے طنزاً پوچھا۔

اس نے بغیر جھجکے یا شرمائے برجستہ کہا۔" جی ہاں! ایسی ہی بات ہے۔ آپ جو روز بس کی کیو میں نظر آتے ہیں نا۔"

"اچھا اچھا۔ تو ٹھیک ہے۔ شائع ہو جائے گی۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اخلاقاً چائے کو بھی نہیں پوچھا ــ بس وہ یونہی سی لڑکی تھی۔ اس نے کوئی تاثر نہ چھوڑا۔ اندھیرے یا اجالے میں کبھی بھی اس کی شبیہ ابھر کر سامنے نہ آئی۔ وہ بس یونہی سی لڑکی تھی ــــ بس سُو سُو۔ اس کی غزل شائع ہو گئی۔ میں سمجھا بات ختم ہو گئی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ بات یہیں سے شروع ہو گی۔

اس نے مجھے شکریے کا خط لکھا۔ گھر پر چائے کی دعوت دی ــــ میں نے سب کچھ رسمی سا سمجھ کر ٹال دیا ــــ وہ بس کی کیو میں ملی اور روز ملتی رہی ــــ ایک دن وہ مجھ سے آگے تھی۔ اس نے میرا بھی ٹکٹ خرید لیا۔ اور اس طرح میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

اس نے چائے کا خاصا انتظام کر رکھا تھا ــــ شاید پہلے ہی سے مجھے اس ترکیب سے گھر لانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے بڑی طول طویل گفتگو کی۔ بغیر دریافت کیے ہی اپنی تمام ہسٹری اور جغرافیہ سُنا ڈالا۔ جس میں بعض باتوں سے یا زیادہ تر باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مثلاً کن حالات میں اس نے ایم اے کیا، پھر ایم اے کرتے ہوئے ریسرچ لیبارٹری میں سب انچارج کی نوکری کرنا منظور کیا۔ اس نے یہ سب باتیں بغیر پوچھے بتائیں مگر باوجود اصرار کے اپنی کوئی غزل نہیں سنائی۔ میں نے جب بھی غزل کے لیے اصرار کیا اس نے ماں کی موجودگی کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اماں شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں یہ کیا کہ طوائفوں کی طرح غیر مردوں کے سامنے گا رہے ہیں۔ ان کو لاکھ سمجھاؤ یہ ایٹی کیٹ اور کلچر کی بات ہے۔ مگر وہ تو وہی ڈھاک کے تین پات۔"

پھر میں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس نے خود ہی کسی دن اپنے دفتر کی کینٹین میں بیٹھ کر کچھ سُنانے کا وعدہ کیا، اور اس کے لیے مجھے اپنے دفتر آنے کی بڑے اصرار سے دعوت دی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی ــــ دفتر کی کینٹین میں جہاں ہر طرف چاؤں چاؤں اور چیخ پکار ہو گی وہ کیسے غزل سنا سکے گی۔ مگر اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہاں یہ سب کچھ نہیں ہے۔

اس نے کہا۔" میرے دفتر کی کینٹین عام کینٹینوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ بہت صاف ستھری ایر کنڈیشنڈ ہے۔ بڑے بڑے نرم نرم صوفے ہیں اور کسی قسم کا ڈسٹربنس (Disturbance) وہاں نہیں ہوتا ہے۔ بیرے چائے کی ٹرے بھی بڑی آہستگی سے میز پر رکھتے ہیں۔ چمچوں اور پیالیوں کی کھنک بھی نہیں

ہونے پاتی۔

مجھے اس کی غزل سننے سے زیادہ اس کے آفس کی کینٹین دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ میرا اشتیاق مجھے وہاں لے بھی گیا۔ ایک روز قبل وہ مجھ سے دفتر کے کینٹین میں ملنے کا وعدہ لے چکی تھی پھر بھی دفتر سے چلتے وقت میں نے احتیاطاً فون کر لیا تھا۔ اس لیے وہ مجھے مجسم انتظار ملی —— اس کے دفتر کی کینٹین اس کے قول کے مطابق ہی شان دار اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنے کی معقول جگہ نکلی۔ وہاں کسی محبوبہ کے روبرو پیمان وفا باندھنے کے ساتھ ساتھ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر آٹے دال کی فکر بھی کی جا سکتی تھی ۔ واقعی آئیڈیل جگہ تھی وہ۔

اناناس کی خوش ذائقہ پیسٹری اور مہکتی ہوئی تازہ کافی سے اس نے میری خاطر تواضع کی۔ میرے اصرار پر اس نے اپنی تازہ غزل بھی سنائی۔ میں نے محسوس کیا کہ غزل تو نہیں ہاں اس کا ترنم کافی لطیف تھا۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ غزل بغیر ترنم کے سُنا نہیں سکتی جیسے اُسے خود بھی احساس ہو۔ بس ترنم ہی سب کچھ ہے۔ غزل تو بس یونہی سی ہے۔

اس دن میں نے اس سے رخصت ہوتے ہوئے پہلی بار کہا۔ "آج آپ سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ آج ہی آپ سے پوری طرح ملاقات ہو سکی۔"

اس نے جواب میں بغیر جھجک کے معانقہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ کو اب ہر ملاقات کے بعد یہی احساس ہوگا۔"

میں اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ذرا جھجکا۔ مگر اس نے اسمارٹ بنتے ہوئے اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "Shake Hand oh Never Mind it" شیک ہینڈ۔ اوہ نیور مائنڈ اِٹ۔"

میں نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ گرم گرم گداز ہتھیلیاں بڑا عجیب کیف بخش رہی تھیں —— وہ بھی عجیب لذت محسوس کر رہی تھی تب ہی تو کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بولی۔ "میں جب بھی کسی سے ملتی ہوں کھلے دل و دماغ سے ملتی ہوں۔ مجھے ان لڑکیوں سے بڑی نفرت ہے جو مردوں کے درمیان اٹھتی بیٹھتی کھاتی پیتی تو ہیں مگر ذرا الگ الگ (it is all nonsense) اِٹ از آل نان سنس! اچھی چھی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

"کتنی عجیب چیز ہے یہ بھی۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس سے بھرپور ملاقات کا یہی تاثر تھا جو میں ساتھ لے کر لوٹا

دن برستے ہوئے پانی کی طرح گزرتے رہے، اور وہ ساون کی جھڑی کی مانند میرے آگے پیچھے لگی رہی۔ پہلے دفتر سے واپسی پر ملتی تھی، پھر دفتر جاتے وقت بھی ملنے لگی —— گفتگو کا انداز ہمیشہ استفہامیہ ہوتا —— "آپ وہ نازک لکھنوی کو تو جانتے ہی ہوں گے۔" میں اس کو بخوبی جانتے ہوئے بھی انتہائی ناگواری سے کہتا —— "کون۔ ؟ کون نازک لکھنوی —— میں نہیں جانتا"

"ارے واہ —— ابھی کل ہی تو آپ ان سے گفتگو کر رہے تھے۔"

"اچھا اچھا —— وہ چمڑے والا۔" میں اس حقارت سے کہتا گویا اس سے بڑھ کر حقارت کی کوئی اور بات نہ ہو، کہ کوئی شاعر چمڑے کا کاروبار کرتا ہو۔ —— وہ تنک کر کہتی ——

"چمڑے والا —— اس کی اتنی بڑی ٹینری ہے —— اچھا شاعر ہے۔"

"ہاں آں ٹھیک ہے —— تو اس کو کیا ہوا؟" —— میں معاملہ رفع دفع کر دیتا تو وہ کچھ بُرا سا منھ بنا کر کہتی ——

"وہ عجیب آدمی ہے۔"

"کیا ہوا۔ ؟"

"کل مشاعرے سے میں ان کے کہنے اور بہت اصرار کرنے پر واپسی میں ان کی کار پر ان کے ساتھ ہو لی۔"

"تو پھر۔ ؟"

"اس نے مجھ سے بڑی غلط باتیں کہیں۔"

"اچھا ـــــ کیا کہا۔؟" میں نے مزہ لیتے ہوئے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"کہنے لگا ـــــ "عمر گزری جا رہی ہے وہی ایک جاہل سی عورت کے ساتھ جس کو ماں باپ نے پلّے باندھ دیا تھا۔ نہ وہ مرتی ہے نہ کوئی دوسری ملتی ہے" ـــــ میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا مگر وہ کہتا ہی چلا گیا ـــــ "اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اس سے نجات حاصل کر دوں اور کوئی پڑھی لکھی قرینے کی بیوی لاؤں" ـــــ میں پھر بھی کچھ نہ بولی تو وہ خاموش ہوگیا۔ مگر پھر اس نے بڑی بے تکی بات کہی"۔

"کیا" میرا اشتیاق کچھ اور بڑھا۔

"بس کیا کہوں" اس نے کہا۔ پھر تھوڑا توقف کر کے بولی ـــــ "پوچھنے لگا" مس رضیہ! آپ شادی کیوں نہیں کرتیں" اس کی بات پر تن بدن میں آگ سی لگ گئی، اور میں نے اس سے کہا ـــــ مسٹر نازک! میں اس قسم کی بیہودہ باتیں پسند نہیں کرتی ـــــ بس وہ گڑگڑانے لگا ـــــ چھی چھی ـــــ یہ مرد کیسے ہوتے ہیں ـــــ بس پا جائیں کسی لڑکی کو اکیلا"

اس پر میں نے لال پیلے ہوتے ہوئے لہجہ بدل کر پوچھا "کیا۔!؟"

وہ سٹپٹا گئی ـــــ "اوہ۔ سوری سوری ـــــ میرا مطلب آپ سے تھوڑی ہے" اس کے بعد وہ بہت عجلت میں ہونے کا بہانہ کر کے کھسک لی کہ اسی میں خیریت تھی۔

اس کے متعلق میرا تاثر پھر بھی وہی رہا ـــــ "کتنی عجیب چیز ہے"

بس کی لمبی کیو (Q) میں لال، پیلے، کالے چہروں کے ہجوم میں وہ عرصے تک گم رہی۔ میں بس کی بتدریج کم ہوتی ہوئی کیو (Q) میں چہروں کو پڑھنے کے عمل پر قائم رہا۔ اس عمل کے دوران جب کبھی آئینے پر نظر پڑتی اور اپنا چہرہ نظر آتا تو اس کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتا ـــــ میں نے اپنے چہرے کو پڑھتے ہوئے محسوس کیا کہ اس پر دھیرے دھیرے گرد کی دبیز چادر تننے لگی ہے۔

میں ہزاروں چہروں میں اسے نمایاں اور الگ تھلگ رکھنے کی کوشش میں زندگی کے فٹ بورڈ تک پہنچتے پہنچتے مشتعل ہجوم کے ریلے سے بہت پیچھے بالکل آخری سرے پر پہنچ گیا ہوں ـــــ میرے چہرے پر عیاں فکر و تردد نے مجھے یہی تاثر دیا ـــــ تبھی میں سنجیدگی سے رضیہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایسے ہی میں ایک دن مسئلہ بڑا گمبھیر ہوگیا۔

ایک دن جب میں زمانے کی دھول کی چادر میں اپنے چہرے کی رہی سہی رمق کو بھی مٹتے محسوس کر رہا تھا اور آئینہ مجھے منھ چڑا رہا تھا۔ گھڑی ٹک ٹک کر کے تیز بھاگنے کا اشارہ دے رہی تھی، دھول کے جھونکوں کے ساتھ سیکڑوں سوکھے پتوں کے درمیان رضیہ میرے کمرے میں دندناتی ہوئی چلی آئی ـــــ کئی سوال بیک وقت ذہن نے کر ڈالے ـــــ یہ کیسے آگئی۔ میرا گھر کیسے معلوم ہوا ـــــ پھر بغیر اجازت۔ بے جھجک۔ بغیر سلام دُعا کے۔ لیکن اس نے کسی بات کی فکر نہ کی ـــــ وہ صوفے میں دھنس گئی اور آنکھیں موند لیں جیسے اسے عرفان حاصل ہو رہا ہو۔

"اچانک کیسے۔ خیریت تو ہے۔؟" میرا ذہن اس سے سوال کر ہی بیٹھا۔

"آپ اپنی خیریت بتایئے"۔

"میں۔ میں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں"

"نہیں۔ ٹھیک نہیں ہیں"

"کیوں ـــــ کیا ہوا مجھے۔؟" اپنے بارے میں عجیب انکشاف ہوا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ بیمار ہیں" اس نے بڑے اطمینان سے صوفے میں دھنسے اور آنکھیں بند کیے کہا۔

مجھے اس عجیب انکشاف سے بڑی حیرت ہوئی۔

"تو کیا بیمار ہوں میں۔؟" میں نے اپنے ہی بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"اب یہ مجھے تھوڑی معلوم ہے ـــــ مجھے تو آپ کے آفس

ہے بس اتنا ہی معلوم ہوا ہے۔" اس نے کہا اور میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ یا تو اس نے مجھے فون کر کے میرے بارے میں معلوم کیا ہوگا یا پھر خود آفس گئی ہوگی، اور چونکہ دفتر سے میں میڈیکل لیو (Medical Leave) پر چل رہا ہوں اسی لیے دفتر سے یہ جواب ملا کہ میں بیمار ہوں ۔۔۔ مگر اس کو میرا گھر کیسے معلوم ہوا یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی قائم تھا۔

وہ شاید میری الجھن سمجھ گئی ۔۔۔" میں نے دفتر فون کر کے آپ کا پتہ معلوم کیا تھا، کیونکہ آپ بیمار ہیں نا، اس لیے دیکھنے تو آنا ہی تھا۔" اس نے اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے بڑے عجیب انداز سے کہا۔

" مگر اب تو ٹھیک ہوں۔ آج تو دفتر جانے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں ۔ بس حال چال لینے۔" قبل اس کے کہ میں اس کو یہ جواب دیتا، اس نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا

" اس کمرے کے علاوہ اس گھر میں کچھ ہے۔"

" بس ایک برآمدہ نما راہداری، چھوٹا سا صحن، کچن، اٹیچڈ باتھ روم اور سیل (CELL) سب ضروری چیزیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے پھر ایک سوال جڑ دیا۔

" یہاں کوئی اور نہیں رہتا؟"

" اور کون رہے گا۔" میں نے کہا۔

" کوئی بھی اور ۔۔۔ ماں ۔۔۔ بہن، بھائی ۔۔۔ بیوی تو خیر آپ کی ہے ہی نہیں ۔۔۔ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔؟"

" ہاں۔ کر لوں گا۔"

" کب ۔۔؟" اس نے آنکھیں کھول کر صوفے پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

" بس کر لوں گا۔"

" لو میرج !۔" (LOVE MARRIABE) اس نے اپنے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کے ساتھ پوچھا۔

" چاہیں تو لو (Love) ہی سمجھ لیں۔" میں نے جوتے کا تسمہ باندھتے ہوئے کہا۔

وہ مجھ کو چلنے کے لیے تیار دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا سوال کرے۔ ویسے شاید اس کے پاس اب کوئی سوال نہیں تھا۔ میں نے اس کی مشکل حل کر دی۔

" بات یہ ہے مس رضیہ ۔۔ میں کمیٹڈ (Committed) ہوں ۔۔۔ میری ماں نے دم توڑتے وقت میرے خاندان کی ایک غریب لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا۔ بیٹا! میری آخری خواہش ہے کہ تو اس کو اپنی دلہن بنا لے ۔۔۔ اس نے میری بڑی خدمت کی ہے ۔۔۔ میں اس کو اس سے بڑا کوئی انعام نہیں دے سکتی۔" ۔۔ اس لیے مجھے ہر حال میں اپنی ماں کی آخری خواہش کا احترام کرنا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

" تو پھر اس سے شادی کر ہی لیجئے۔"

رضیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور جیسے آئی تھی ویسے ہی آندھی طوفان کی طرح واپس ہو گئی۔

غزلیں

حکمت شاد

ملا خیل، مسجد حرا
شاہجہاں پور

ہوا بھی کہ گزرتے رہے سرابوں سے
ملا نہ کوئی بھی منظر ہمارے خوابوں سے

ہم اپنی ذات کے قیدی بنے رہیں کب تک
ہمارا نام مٹا دو سبھی کتابوں سے

ہنسے تھے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر اک بار
ملی نجات نہ اب تک ہمیں عذابوں سے

گھٹا اٹھی بھی نہ تھی جسم نم ہوا بھی نہ تھا
بچا رہا تھا مجھے کون التہابوں سے

مری ہی طرح تھی پاگل وہ خوشنما تتلی
جو ہمکلام رہی دیر تک گلابوں سے

سوال اس کے غلط فہمیوں پہ مبنی تھے
وہ مطمئن نہ کبھی ہو سکا جوابوں سے

مری نگاہ میں صدیوں کا کرب ہے اے شاد
ہر ایک عہد میں گزرا ہوں میں خرابوں سے

●●

سراج تنویر

۱۰۰ - دریگران، جھانسی

بھیگی تھی کبھی کچے مکانات کی مٹی
مہکی تھی ترے جسم سی دیہات کی مٹی

ہم کو نہ خیال آیا کبھی دل کی تہوں کا
ہم کرتے رہے صاف فقط ہاتھ کی مٹی

اس دور کا درویش کہو مجھ کو بھی لوگو
مٹھی میں بھرے ہوں میں کرامات کی مٹی

یہ خوں نہیں مانگے گی پسینہ ہی بہت ہے
زرخیز بہت ہوتی ہے دیہات کی مٹی

اک اور بھرے گھر کے بکھرنے کی خبر ہے
ہم صاف بھی کر پائے نہیں ہاتھ کی مٹی

تنویر بہانے ہیں سبھی کوششیں اپنی
حالات ہی کر دیتے ہیں حالات کی مٹی

●●

علی باقر زیدی

"ادبستان" دین دیال روڈ
لکھنؤ

خواب میں بھی کبھی سوچا نہ تھا ایسا ہوگا
اجنبی جس کو سمجھتے تھے وہ اپنا ہوگا

اس خرابات میں کیا پاؤ گے وحشت کے سوا
اس سے ہر ایک مکاں شہر میں اچھا ہوگا

جس ملاقات کو ہم کہتے تھے رسمِ دُنیا
کیا خبر تھی کہ وہی درد کا رشتہ ہوگا

رازِ دل تم سے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
تم نے ٹوٹا ہوا پیمانہ تو دیکھا ہوگا

چل سکیں ساتھ تمہارے تمھیں اپنا کہہ کر
تم ہی بتلاؤ کہ وہ کون سا رستہ ہوگا

●●

سید محمد ازہر شاہ قیصر
شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند

جگر مراد آبادی

اچھا انسان، بلند پایہ شاعر

دیوبند میں ایک دفعہ جگر صاحب سے بات ہو رہی تھی میں نے کہا کہ جگر صاحب آپ کا یہ نظریہ کہ ایک بُرا انسان اچھا شاعر نہیں ہو سکتا اور ایک اچھا انسان بُرا شاعر نہیں ہو سکتا میرا تجربہ تو اس کے خلاف ہے۔ میں نے بارہا یہ دیکھا ہے کہ لوگ نہایت اکھڑ، بداخلاق، اور بدکردار ہوتے ہیں مگر ان کی شاعری میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور وہ اونچے درجہ کے شعر کہتے ہیں اس کے برخلاف بعض لوگوں کو بہت شریف پایا مگر ان کی شاعری میں جان نہیں پائی ان کی شاعری بس گفتن برائے گفتن نظر آئی۔ جگر صاحب نے جواب دیا مولانا! یہ مضمون الگ ہے شاعری دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو صرف الفاظ کی کاریگری، وزن و بحر کے مطابق شعر کہہ دینے کی مہارت اور ہجر و فراق کے مضامین کو ایک جگہ جمع کر دینے کی صلاحیت، یہ شاعری شاعری نہیں بلکہ شاعری کا جسم ہے۔ ایک شاعری ہے جس میں شاعر کی اپنی روح، اپنی زندگی، اپنے اخلاق، اور اپنے اخلاق و کردار کی بلندی ہوتی ہے اس شاعری میں ایک جذبہ ہوتا ہے، ایک روح ہوتی ہے ایک عمق ہوتا ہے اور ایک تاثر ہوتا ہے یہ دوسری شاعری کسی بداخلاق اور بدکردار آدمی کے بس کی بات نہیں۔ جگر صاحب نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ عربی، فارسی اور ہندی اردو میں لاکھوں شاعر ہوئے ہوں گے مگر صفحۂ ہستی پر کلام ان ہی لوگوں کا باقی رہا جو خود انسان تھے اور جن میں انسانیت تھی، مسدس حالی کے جواب میں اپنے وقت میں بیسیوں نظمیں کہی گئیں مگر سب طاقِ نسیاں بن گئیں۔ مسدس حالی چونکہ ایک جذبہ کی چیز تھی اس کا لکھنے والا قومی دردمندی کا ایک نہایت گہرا جذبہ اپنے پاس رکھتا تھا اس لیے ذہن انسانی نے اگر یاد رکھا تو صرف مسدس حالی کو، اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کے مقابلہ میں بھی بہت سی نظمیں کہی گئی تھیں مگر سب وقت کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ اقبال نے درد دل کے ساتھ جو کچھ کہا تھا وہ باقی ہے اور قومی شاعری کا ایک شہکار سمجھا جاتا ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خود جگر صاحب اپنے مزاج، طبیعت، اخلاق، اور شرافت کے لحاظ سے ایک مثالی انسان تھے۔ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر شرافت بھری ہوئی تھی۔ اپنے نفع کی خاطر دوسروں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا جیسا کہ خود کہا ہے ؎

اس نفع و ضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
اپنا تو زیاں منظور مجھے اوروں کا زیاں منظور نہیں

جگر صاحب ایک انسان تھے۔ ان کے ماحول اور آس پاس کی زندگی میں خوشی کی لہریں اٹھتی تھیں تو وہ ان سے اثر لیتے تھے اور غم کی فضائیں جب چاروں طرف پھیلتی تھیں تو وہ ان سے بھی متاثر ہوتے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بدترین دور میں انھوں نے کہا تھا ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
سازِ حیات سازِ شکستہ ہے ان دنوں

بزمِ خیال جنت ویراں ہے آج کل
آنکھیں تمام شہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنج شہیداں ہے آج کل
جس کا ہے نام زیست وہ مشکل ہے ان دنوں
کہتے ہیں جس کو موت وہ ارزاں ہے آج کل
دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
دہلی، دوہیرہ، دون، نواکھالی و بہار
انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آج کل

بنگال کے قحط کے زمانہ میں جب انگریزوں کی ڈپلومیسی نے پورے بنگال میں بھک مری پیدا کر دی تھی، لاکھوں آدمی ایک ایک دانۂ گندم کو ترس رہے تھے جگر صاحب نے کہا کہ ـــ

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں
اس خطۂ زرخیز میں یہ قحط یہ ادبار
غیروں کی سیاست کا اثر دیکھ رہا ہوں
انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
خاموش لگا ہوں جب امنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں
بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بینائیٔ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

جگر صاحب ایک مکمل انسان تھے، راستبازی، نیک شعاری، ہمدردی اور دوسروں کی مصیبتوں میں کام آنا ان کا معمول زندگی تھا۔ عام طریقہ پر کسی دھڑے کے شاعر نہیں تھے بلکہ شاعری کے میدان میں جو ان کا اپنا ایک دھڑا تھا جس میں شرافت کا ایک مقام تھا اور انسانیت کی ایک جگہ تھی۔ مجروح سلطانپوری، خمار بارہ بنکوی، شکیل بدایونی، شمیم جے پوری، مسعود اختر جمال، اصغر شعری بھوپالی، قمر مرادآبادی، ناز مرادآبادی، اختر شیرانی، تابش دہلوی، ساحر عباسی، اور ہاشمی کانپوری جیسے بہت سے نوجوان تھے جو جگر صاحب کی شاعری اور ان کی زندگی سے متاثر تھے۔ سب اخلاقی طور پر ایک اپنا مقام رکھتے تھے اور سب کے کلام میں ان کے دل کی دھڑکنیں پیوست ہوتی تھیں۔ ان میں سے بہت سے رند بادہ خوار تو تھے مگر دوسروں کو دھوکہ دینے والا اور اپنے نفع کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے والا کوئی نہیں تھا، ان کی ظاہری تباہ حالی کے باوجود ان کے اندر انسان ہی بیٹھا نظر آتا تھا۔

جگر صاحب شاعرِ حسن و عشق تھے۔ حسن و عشق ہی ان کی اصل زندگی تھی مگر عفت و پاکبازی کا یہ عالم تھا کہ مجمع میں کسی پیکرِ حسن و جمال کی طرف ان کا نظر اٹھانا ممکن نہیں تھا۔ سنا ہے کہ کراچی کے کسی مشاعرے میں اس وقت کی مقبول شاعرہ زہرہ نگار موجود تھیں، جگر صاحب کی غزل پڑھنے کی باری آئی تو انھوں نے اپنی معرکتہ الآرا غزل

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے
جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے
کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے
مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جرأتِ شوق
کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گزرے
کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے
جنوں میں سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ
حسیں حسیں نظر آئے جواں جواں گزرے
مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس

میرے قریب سے جو کہ وہ ناگہاں گزرے
ہجوم جلوہ میں پرواز شوق کیا کہنا
کہ جیسے روح ستاروں کے درمیاں گزرے
میری نظر سے تیری جستجو کے صدقے ہیں
کہ اک جہاں نہیں سینکڑوں جہاں گزرے

تو جگر صاحب نے صرف اس خیال سے کہ زہرہ نگار کوئی جھجک یا حجاب محسوس نہ کریں کہ اس غزل کا شعر اول اس ترمیم کے ساتھ پڑھا کہ

اگر نہ ماہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

اب دیکھ لیجئے "زہرہ" کا لفظ ہٹا دینے سے شعر کے حسن اور تاثر میں بڑا فرق آگیا مگر جگر صاحب نے اس کمی کو برداشت کیا مگر زہرہ نگار کو کسی غلط فہمی میں پڑنے سے بچانا ضروری سمجھا۔ جگر صاحب عام گفتگو میں نہایت سلیقہ مند اور خوش گفتار انسان تھے۔ سطحی گفتگو ان کی مجلس میں نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کوئی لطیفہ بیان کرتے یا ہنسی مذاق کی کوئی بات کرتے تو اس میں بھی ان کے شریفانہ اوصاف پوری طرح موجود ہوتے تھے۔ خوب کماتے تھے، مشاعروں میں بڑی بڑی رقمیں انھیں پیش کی جاتی تھیں مگر ساری رقم یا اپنے قائم کردہ جگر میموریل ائی اسکول میں صرف کرتے تھے یا دوستوں اور ضرورتمندوں کی خبر گیری میں۔ مولانا سید ابوالحسن علی الندوی مرض الموت میں جگر صاحب کی مزاج پرسی کو گونڈہ گئے۔ جگر صاحب نے نوٹوں کی ایک بڑی سی گڈی مولانا کو دی کہ یہ ندوۃ العلماء کے لیے ہے۔ مولانا نے دوسرے وقت نوٹ گنے تو کئی ہزار کی رقم تھی۔ مشاعروں کے مجمع میں ان کی چوریاں ہو جاتیں اور جیب سے رقمیں نکال لی جاتی تھیں مگر جگر صاحب نہ اس کا چرچا کرتے تھے اور نہ ملول ہوتے تھے جو بات جہاں ہوتی تھی۔ وہیں ختم کر دیتے تھے۔

علماء، صلحا اور بزرگوں سے انھیں خاص مناسبت تھی اکثر اپنے مرشد یعنی قاضی عبدالغنی منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے اور مزار پر حاضر ہوتے تھے۔ دیوبند جب کبھی جاتے تو نہایت عقیدتمندانہ جذبات کے ساتھ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہم اللہ کا پورا پورا احترام کرتے اور دونوں کی مجلس میں استفادے کے لیے بیٹھتے تھے۔ خواجہ عزیزالحسن مجذوب کے ذریعہ مولانا اشرف علی تھانوی سے بھی ان کا تعلق خاص تھا۔ کئی دفعہ تھانہ بھون گئے اور حضرت مولانا کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے۔ وعدے کے سچے، بات کے پکے، قول کے دھنی، اخلاق کے بلند اور نرم خو انسان تھے۔ اوقات کے پابند بالکل نہیں تھے، رات کو ۲ بجے سوئے ہیں تو صبح نو بجے اٹھ رہے ہیں، کبھی کبھی بڑی پابندی سے نماز پڑھتے تھے کبھی ناغہ بھی کر جاتے تھے۔ دوستوں سے مراسم و تعلقات نبھانے کا پورا سلیقہ تھا۔ کسی دوست کے گھر جاتے تو اس کے بچوں کے ہاتھ پر مٹھائی کے لیے کچھ رقم ضرور رکھتے تھے، مطالعہ کے عادی بالکل نہیں تھے ابتدائی زندگی میں فارسی اردو اور انگریزی کی جو کچھ تعلیم حاصل کی تھی وہی ان کا سرمایہ تھا۔ فارسی اور اردو شعراء کے کلام پر اچھی نظر رکھتے تھے اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے اور معمولی تغیر سے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔

جناب اصغر گونڈوی کو شاعری میں نہ صرف اپنا استاد مانتے تھے بلکہ ان کے حسن اخلاق، ان کے کلام سے غایت درجہ متاثر اور ان کے عقیدتمند تھے۔

حریم حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہو کر جو اٹھو باخبر ہو کر

حالانکہ اکثر سفر میں رہتے لیکن جب اپنی جائے قیام گونڈہ پہنچتے تو ساری ڈاک میں سب سے پہلے دوستوں کے خطوط پڑھتے اور بڑی پابندی کے ساتھ ان کے جوابات لکھتے۔ اپنے معاصرین سے کوئی چشمک نہیں تھی۔ جوش ملیح آبادی، نوح ناروی،

(باقی ص ۸۹ پر)

غزلیں

آسی زیدی سکندرپوری
۲۸۸ - بیگم گنج - بارہ بنکی

ہوش کی باتیں کرے ہیں بے خودیِ دل سے لوگ
اُب ہی جائیں گے اپنی سعیِ لاحاصل سے لوگ

مٹھیوں میں بند اُمیدیں لیے آئے تھے کل
آج خالی ہاتھ رخصت ہو گئے منزل سے لوگ

کل وہی مونس تھے، یاور تھے بڑے ہمدرد تھے
آج جو ہنس ہنس کے ملتے ہیں مرے قاتل سے لوگ

رقص میں آنکھیں تھیں سب کی کون دل میں جھانکتا
تھک گئی پایل تو ہنس کر چل دیے محفل سے لوگ

سسکیاں لیتی رہیں موجیں لیے آغوش میں
اور یہ منظر مرا دیکھا کیے ساحل سے لوگ

کھیت سے کھلیان کا گو فاصلہ کچھ بھی نہیں
اس مسافت کو مگر کرتے ہیں طے مشکل سے لوگ

آسؔی یہ دورِ ترقی ہے کہ قیدِ روزگار!!
گھر سے دفتر تک بندھے رہتے ہیں بس فائل سے لوگ

●●

حسن کاظمی کانپوری
۳۳/۴۴ ہمایوں باغ کانپور

نگاہِ ناز آفت ہو رہی ہے
جہاں وہ ہیں قیامت ہو رہی ہے

خریدے جا رہے ہیں جھوٹے آنسو
غموں کی بھی تجارت ہو رہی ہے

عمل سے دور ہے کردارِ انساں
مگر بدنام قسمت ہو رہی ہے

نہیں یونہی لبوں پر مسکراہٹ
ترے غم کی حفاظت ہو رہی ہے

نہ آہیں روک پائے ہم نہ آنسو
ندامت پر ندامت ہو رہی ہے

تمہارا تذکرہ سنتی ہے دنیا!
مری غزلوں کی شہرت ہو رہی ہے

کوئی شکوہ تو آیا ان کے لب پر
حسنؔ کتنی مسرت ہو رہی ہے

●●

غزل

منظر زیدی
۱۶۸ - اسمٰعیل نگر
میرٹھ

یاس کے گلشن میں کانٹوں کو سجائے گھر چلو
جاگتی آنکھوں میں خوابوں کو بسائے گھر چلو

پیاس کی شدت سے سورج بھی ہوا جاتا ہے زرد
کتنے لمبے ہو گئے پیڑوں کے سائے گھر چلو

رات گہری ہو گئی اور تھم گیا آبِ رواں
چاند بھی راہوں میں تھک کر سو نہ جائے گھر چلو

دور سورج جھک رہا ہے آسماں کے ساتھ ساتھ
لوٹ کر پنچھی بھی اب شاخوں پہ آئے گھر چلو

موت پیچھا کر رہی ہے ایک مدت سے مرا
اس سے کچھ پہلے وہ میرے پاس آئے گھر چلو!

کون فرصت میں ہے منظرؔ جو سنے رودادِ غم
آنسوؤں کو اپنی پلکوں پہ سجائے گھر چلو

سید شفیق احمد اشرفی
کچھوچھہ شریف، فیض آباد

فیض کی عشقیہ شاعری

جس عہد میں فیض کے ادبی شعور نے آنکھیں کھولیں اس میں اقبال کی قومی شاعری کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی کی گیت نما نظموں کا چرچا تھا۔ اس عہد کے نوجوان شعراء کے لیے ایک طرف "شاعرِ اسلام" اور دوسری طرف "شاعرِ رومان" کی صورت میں دو محرک شخصیتیں موجود تھیں۔ "شاعرِ رومان" اختر شیرانی کی سطحی رومانیت کی کشش نے فیض کو اپنی طرف کھینچا اور وہ رومانیت کی طرف بہہ گئے جیسا کہ نقشِ فریادی کی غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں فیض نے خود کو غزل کے عام موضوعات تک محدود رکھا ہے ؎

شورشِ دردِ دل کسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز

؎ عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

؎ عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبورِ انتظار نہیں

؎ اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

؎ تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

اس انداز کے اشعار کافی تعداد میں فیض کے یہاں مل جاتے ہیں۔ ان میں چند اشعار سے قطع نظر فیض ایک روایتی غزل گو کی مانند معاملاتِ حسن و عشق اور وارداتِ قلب کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں جو چیز ابتدا سے کھٹکتی ہے وہ ان کی روح کی تنہائی ہے۔ خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ اس کو پڑھتے ہوئے قاری ان کی روح کی تنہائی کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی لیے فیض کی شاعری میں ایسا حزن و ملال، ایسا دردِ دائم اور ایسی غم انگیزی ہے جس میں قنوطیت کی خشکی نہیں بلکہ جو حسین ہے، پُر اسرار ہے، جمالیاتی لذت سے چور ہے۔ فیض کی آنکھیں فکرمند بھی ہیں۔ لیکن جس چیز کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھیں منتظر بھی ہیں یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا اور اس سے ان کی تنہائی ہر لحظہ بوجھل ہوتی جاتی ہے۔ وہ جس کی یادوں کو اپنے دل میں بسائے ہیں وہ ان کی سننے والا نہیں، وہ جس کے انتظار میں ہیں وہ کبھی ملنے والا نہیں، مثلاً ؎

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس طرح فیض کی ابتدائی شاعری کا مرکز اور محرک، تنہائی اور انتظار ہے۔ ایک نظم سے دوسری نظم تک یہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ لیکن طوق و دار کے موسم میں بھی انتظار کا رنگ شامل ہے۔ جیسے اس طرح وہ اندیشے کے عالم میں

خود حفاظتی گر بھی جانتے ہیں۔ فیض کی رومانی شاعری ان کے پُر شباب تخیل کے چمن گُل ریز کوچوں سے گزرتی ہے وہاں حسن و رنگ، خوشبو اور طرب کے نازک موڑ ہیں ؎

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے

فیض رومانیت کی داخلی ضرورت کے ساتھ اس کے خارجی عوامل پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کی رومانیت میں بھی بڑی تمکنت اور نکھار ہے ؎

بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر کبھی شام

تمھارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریِ عروسِ سخن

فیض کو اپنی محبت پر اعتماد ہے اور محبوب پر بھی یوں ابتدائی شاعری کے نمونوں میں بھی ایک داخلی رومانی کیفیت ہے۔ ان میں دل کا درد اور فکری آہنگ الگ الگ بھی نظر آتا ہے اور کہیں کہیں خلط ملط بھی ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدائی کی خاموش تڑپ ہے اس کے علاوہ روایتی محبت کے کچھ پہلو بھی ملتے ہیں ؎

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کی آغوش میں سو رہے ہیں
تمھارے ستم اور میری وفائیں

کسی کو پانے کی تمنا میں پہاڑ جیسی راتوں کو آنکھوں میں کاٹ کر اس کے آستاں تک رسائی حاصل کرنا اور پھر کھو دینا ایسی کیفیات ہیں جنھیں ایک دل گداختہ ہی محسوس کر سکتا ہے ؎

جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے
لٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز
کاش وہ اس طرف نظر کر دے

فیض کی ابتدائی شاعری کی بنیادی خصوصیت انفعال اور تنہائی ہے۔ یہ انفعال اس قندیل کے مانند ہے جو آخری لمحہ میں مدھم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بجھ جاتی ہے۔ فیض محبت کی اہمیت اور اپنے محبوب کے حسن کی عظمت کا خیال کرتے ہوئے بھی زندگی کی دوسری مانگوں کو زیادہ اور پُر اثر محسوس کرتے ہیں۔ ان کی نگاہیں بے کس اور مظلوم لوگوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

رومانیت ان کی شاعری کا بڑا اہم وصف ہے۔ ان کے فکر و فن دونوں میں رومانیت کی جلوہ گری اور کارفرمائی شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ جو لطافت ان کے کلام میں نظر آتی ہے اس کی مثال ان کے ہم عصروں میں کم ملتی ہے عشق و محبت بھی زندگی کے مستقل موضوعات ہیں اور عمر کی کسی منزل میں بھی انھیں کفر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ان کی عشقیہ شاعری میں ایسا گداز ہے جو ان کے لہجے اور آہنگ کے ساتھ مل کر ایک لطیف مسرت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ وہ کم سے کم لفظوں میں ذہنی کیفیات کی تصویریں کھینچ دینے پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔

●●

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات۔ مصنفہ: ڈاکٹر عبیدہ بیگم، قیمت: ۶۰ روپے، ملنے کا پتہ، نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

فورٹ ولیم کالج تاریخ نثر اردو کا ایک عظیم باب ہے صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندستان کی دوسری زبانیں بھی فورٹ ولیم کالج کی ادبی اور لسانی خدمات کے لیے اس کی احسان مند ہیں۔ ہندستان کی بیشتر مشہور زبانوں کی قواعد اور لغت سب سے پہلے کالج میں لکھی گئیں یہ کالج سنہ ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا۔ اور کسی نہ کسی حال میں ۱۸۵۴ء تک باقی رہا۔ 'آب حیات' سے لے کر اب تک اردو زبان و ادب کی جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان سب میں فورٹ ولیم کی ادبی خدمات کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ وقت جوں جوں گزرتا جا رہا ہے۔ اس کی اہمیت اور واضح ہوتی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اس موضوع پر مستقل کتابوں کے لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اب تک اس موضوع پر مستقل کئی ایک مفید اور کارآمد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تصنیف 'فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو نفس موضوع کو جامعیت اور تکمیل کی طرف لے جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے فاضل مقالہ نگار نے بڑی دیدہ ریزی سے اس کا جائزہ لیا ہے اور تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پوری طرح اس کو پرکھا ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں کالج کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد سے بحث کی گئی ہے اور اس کے عروج و زوال کی تاریخ بیان کر دی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں کالج کے انتظام کاروں کارپردازوں اور منشیوں کے سوانحی حالات اور تصنیفات و تالیفات کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ کالج سے منسلک ہونے والے معروف و غیر معروف ۳۸ منشیوں کے حالات زندگی مختلف ماخذوں سے فراہم کیے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی نثر کے اسلوب سے بحث کی گئی ہے اور پانچویں اور آخری باب میں بتایا گیا ہے کہ اس نثر نے زمانۂ مابعد کی نثر پر کیا اثرات مرتب کیے۔

اسلوب کا تعین براہ راست زبان کے مزاج اور اس کی لطافت کے عرفان سے ہوتا ہے۔ یہ عرفان اگر نصیب نہ ہو تو تنقیدی شعور ادھورا رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی ذات میں زبان اور اس کی لطافت کا عرفان ارتقا پذیر نظر آتا ہے جو ایک بامعنی مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

'فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جو مزید تحقیق کے لیے دروازے کھول دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی یہ تحقیقی کاوش یقیناً قابل ستائش ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف (کلکتہ یونیورسٹی)

نام: 'پُرسے پھینسے' مصنف: عبدالمجیب سہالوی
قیمت: ۱۰ روپے، ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، دانش محل امین آباد، لکھنؤ

مزاح نگاری میں عبدالمجیب سہالوی نہ صرف جانا پہچانا بلکہ ایک معروف اور معتبر نام ہے۔ ان کا طرز نگارش نہ صرف سیدھا سادا بلکہ ایسا دل پسند ہے کہ بسا اوقات یہ گمان گزرتا ہے کہ ان کی غیبت میں اُن کی تحریر نہیں پڑھ رہے بلکہ وہ سامنے بیٹھے خود باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی سادگی میں بڑی پُرکاری ہے۔ وہ اپنے موضوعات کے لیے ایک عام متوسط طبقے کے انسان کے مسائل اور اس کو پیش آنے والے مصائب ہی کو منتخب کرتے ہیں اور پھر انھیں کو مزا لے کر اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ قاری یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری ہی بیتی بیان کی جا رہی ہے۔ منی بس میں کیسے سفر ہوتا ہے، بجلی بند اور نل خاموش ہو کر کیا صورتِ حال پیش کرتے ہیں، گرانی گھریلو زندگی پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے' راشن کے حصول میں کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں' مہمانوں کی غیر متوقع آمد کیا رنگ دکھاتی ہے' رشوت سے کیا نہیں ہو سکتا؟ فیشن پرستی پرانی قدروں کو کیسے بدل رہی ہے وغیرہ وغیرہ یہ موضوعات بظاہر بہت پیش پا افتادہ ہیں' اور ان پر کبھی نہ کبھی ہر کوئی غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے — لیکن ان تلخیوں کو میٹھے لہجے میں بیان کرنا مجیب صاحب ہی کا حق ہے۔ وہ عام انسان کی روز مرہ

کی زندگی کی دشواریوں پر توجہ تو مرکوز کرتے ہیں لیکن زندگی سے جی نہیں چراتے۔ الٹی پیشین گوئی میں فرماتے ہیں:۔

"شاعر نے سچ کہا تھا ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

چنانچہ محکمۂ موسمیات نے شاعر کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر خشک موسم کی پیشین گوئی شروع کر دی تاکہ اُلٹا اثر ہو اور پانی برسنے لگے...... خوشی کی بات یہ ہے کہ اُن کی الٹی پیشین گوئی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور کالے بادل اگر جھوم جھوم کر نہیں تو ٹھہر ٹھہر کر خوب برسے۔"

ہماری گلی کے متعلق فرماتے ہیں:

"جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے اس کا ہونا ہماری گلی میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ جوتے کی ایک دکان نہ ہونے کے باوجود اسے جوتے والی گلی کہا جاتا ہے ...... یہاں اگرچہ جوتے نہ بکتے ہیں نہ بنتے ہیں لیکن چلتے ضرور ہیں"

مجیب صاحب اس گُر کو بخوبی جانتے، سمجھتے اور برتتے ہیں کہ مزاح کی جان اختصار ہوتا ہے چنانچہ ۱۶۱ صفحات کی اس کتاب میں انھوں نے ۱۵ موضوعات کو اپنا ہدف بنایا ہے، لہٰذا کتاب میں اس بوقلمونی اور فراوانی سے ایک تازگی اور کشادگی پیدا ہوگئی ہے اور قاری کہیں بھی یہ نہیں کہنے پاتا کہ "برے پھنسے"۔

مزاح کے انداز اور معیار، لوگوں کے مذاق کے مطابق جداگانہ اور مختلف ہوتے ہیں۔ نکاح کی طرح مزاح میں مزاح نگار اور قاری کے درمیان بھی ایجاب اور قبول کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور جب تک از دل خیزد بر دل ریزد کی کیفیت نہیں پیدا ہو جاتی بات نہیں بنتی۔ یہ ایک نازک اور طویل بحث ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ مجیب صاحب نے اس منزل کو کامیابی سے سر کیا ہے۔

"بڑے پھنسے" ہر لحاظ سے لائق مطالعہ ہے۔ یہ صرف مزاحیہ ادب نہیں بلکہ متوسط طبقے کی موجودہ زمانے کی شہری زندگی کی ایک حیثیت سے تاریخ بھی ہے۔

——— وجاہت علی سندیلوی

نام کتاب: صاعقۂ طور، مصنف: تاج پیامی، قیمت ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد۔۳

اسے اردو شعر و ادب کی شوئی مقسوم کہیے یا مجبوری دور کی علامت کہ گزشتہ پچاس سال کے عرصۂ طویل میں منجملہ تمام شدید اور ناساعد احوال و کوائف کے، ایک ایسا طبقۂ ناقدین عالم وجود میں آیا جو مغربی زبان و ادب سے واقفیت کے باوصف ایسا مرعوب ذہن بھی لایا جس نے اپنے زبان و ادب کے جملہ خصوصیات، روایات اور ابعاد ثلاثہ کو پس پشت ڈال کر وہ تحقیر آمیز فضا پیدا کی کہ اردو شعر و ادب کے بارے میں اکثر لوگ تشکیک و تذبذب میں مبتلا ہو گئے اور ہرچند مغربی ادب کی افادیت سے انکار نہیں۔ مگر یہ ہرزہ سرائی خوش آئند نتائج برآمد نہ کر سکی۔ یہ لوگ جدید انتقادیات کی عجوبگی سے آراستہ تو تھے مگر اس مستعار روشنی نے ان میں اصلیت کا جوہر پیدا نہیں کیا۔ ان میں کوئی بھی گوئٹے، آسکر وائلڈ، کولرج میتھیو آرنالڈ، کروچے، ایلیٹ اور لیوس کا مقابل نہ ہو سکا۔ یہ سب مغربی ناقدینِ ادب کے ریزہ چیں ہی رہے۔

اٹھا کے لائے شبستانِ زندگی کے لیے
دیارِ غیر سے اندیشۂ سحر کی خاک

اس گروپ کے سرخیل جناب پروفیسر کلیم الدین احمد تھے جن کے ہوا خواہ انھیں بت شکن کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ کلیم الدین نے صرف اردو کے اکابر شعرا کی تحقیر ہی نہیں کی بلکہ اردو اصناف سخن کو بھی متہم کیا۔ وہ ہر ادب پارہ کو مغربی ادب کے تناظر میں دیکھنے کی سعی نامشکور کرتے رہے۔

جناب تاج پیامی صاحب نے ان تمام الزامات کا مدلل جواب اپنی کتاب "صاعقۂ طور" میں انگریزی ادب کی وساطت سے دیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے کلیم الدین احمد کے مختلف الزامات کے تجزیہ کے لیے ۱۳ ابواب متعین کیے ہیں اور موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مثلاً کلیم الدین نے جو اردو شاعری پر فارسی کی کورانہ تقلید
الزام عائد کیا ہے اس کی تردید تاج نے انگریزی زبان و ادب کی
تخلیقی اور تاریخی تعامل کے حوالوں سے نہایت خوبصورتی سے کی ہے۔
انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی شعر و ادب، اس کے مصطلحات
مختلف زبانوں یعنی رومن، گریک، لاطینی اور فرانسیسی سے مشتق
مستعار ہیں اور لسانیات کے ماہرین اس تخلیقی تعامل کو بہ ہر وجوہ
غیر فطری تسلیم نہیں کرتے۔

کلیم الدین نے "جاوید نامہ" پر بحث کرتے ہوئے اقبال کو
دانتے سے فروتر بتایا ہے۔ تاج نے ڈانٹے کی عصبیت جاہلیہ اور
فنی اور علمی کمزوریوں کو مستحضر کر کے اقبال کے تفوق کی توثیق کر دی
ہے۔ دراصل یہ بات اب متحقق ہو چکی ہے کہ ڈانٹے کی تخلیق "ڈوائن
کومیڈی" کا مرکزی تصور مستعار ہے ابن العرب کی کتاب "فتوحات
مکیہ" اور ابوالعلاء معری کی "الغفران" سے

بہرحال جناب تاج نے بڑی مغز شناسی اور دقتِ نظر کے
ساتھ ارسطو، ہومر، ملٹن اور شیکسپیر سے لے کر یوس اور ازراپاؤنڈ
تک معتد بہ تعداد میں شواہد فراہم کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ
ہمارے شعر و ادب کا معیار مغربی معیار سخن سے یکسر بلند و برتر ہے۔

"صاعقۂ طور" کی ان تمام خصوصیات کے باوجود چند
باتیں محلِ نظر بھی ہیں جن کی توضیح و تنقیح ناگزیر ہے۔

اولین چیز اس کتاب کے موضوع کی محدودیت ہے جس نے
افکار و اظہار کی جولانیوں کو وسعت عطا نہیں کی۔ اگر تاج نے پروفیسر
کلیم الدین احمد کے صرف چند اعتراضات ہی کو موضوع بحث نہ بنا کر
جملہ تصانیف سے تعارض کیا ہوتا تو یہ ساعی جمیلہ شاہکار بن جاتی
اور صرف ان کے قبائح ہی سامنے نہ آتے بلکہ محاسن بھی معرض بحث
میں آجاتے (جو ایک دیانتدار ناقد کے فرائض میں سے ہے)
اور تاج صاحب کو یہ نہ لکھنا پڑتا کہ یہ کتاب کلیم الدین کی مخالفت
میں تصنیف نہیں کی گئی ہے۔

کلیم الدین نے بعض باتیں بہت معیاری اور مناسب بھی
کہی ہیں جن سے اغماض ممکن نہیں۔ وہ لاکھ مخالفتوں کے باوجود
جوش کی آواز کو اقبال کی صدائے بازگشت کہتے ہیں یہی نہیں وہ
ان کی بلند آہنگی اور خطابیت میں شعریت کا فقدان بھی پاتے ہیں
جو اقبال کی گہرائی اور گیرائی اور سوز و گداز کے علی الرغم ہے وہ اقبال
کی کتاب "زبورِ عجم" کی نظم "از خواب گراں خواب گراں خواب گراں
خیز" اور جوش کی نظم "بیدار ہو، بیدار ہو بیدار ہو بیدار" کے تقابل سے
اپنے مقدمات کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔ مگر تاج صاحب نے اسے
نظر انداز کر دیا ہے۔

تاج صاحب انتخاب اشعار میں بھی محتاط نہیں ہیں انھوں
نے وہ اشعار بھی جوشِ عقیدت میں منتخب کر لیے ہیں جو کبھی ہمارے
ادب عالیہ کا حصہ نہیں بن سکتے ؎

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

قاتل ہو کہ رہزن ہو ستمگر ہو کہ دشمن
ہم اہلِ غزل سب کو صنم کہتے رہیں گے

جہاں ہمارا شعری ادب مغربی ادب سے اعلیٰ تر ہے وہاں اس
اعتساب سے گریز نہیں کرنا چاہیے کہ مغربی ناقدین کی تحریریں مجموعی
طور پر انتقادیات عالیہ کا حصہ ہیں اور ابھی تک ہمارے مجمع ناقدین
میں کوئی آسکر وائلڈ، میتھیو آرنالڈ اور کروچے پیدا نہیں ہوا ہے۔

بہرحال "صاعقۂ طور" مجموعی طور پر ایک اچھی کوشش
ہے اور ادب کے ہر طالب علم کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔

—— احسان نانپاروی

نام کتاب: سرمایۂ جاں، شاعر: حامد حسن خاں حامد میاں
قیمت: بیس روپے، ملنے کا پتہ: محلہ تارین مکلی متصل
تاروں والا باغ۔ شاہ جہاں پور۔

شاعری یا ادب کی دوسری اصناف اکتسابی چیزیں نہیں
ہیں، ان کے لیے دلِ گداختہ، ذہنِ رسا اور دیدۂ بینا کی ضرورت
ہوتی ہے، ایک شاعر جس ماحول و معاشرہ میں آنکھ کھولتا ہے
وہاں رونما ہونے والے واقعات و حادثات صرف اسی کیلئے نہیں
ہوتے لیکن وہ ان داخلی و خارجی حوادث سے کچھ اس طرح متاثر ہوتا
ہے کہ ان کی بازگشت اس کے کلام میں صاف سنائی دیتی ہے۔

شاعری کو خود کلامی بھی کہا جا سکتا ہے یعنی شاعر جس ذہنی کشمکش سے گزرتا ہے اور اس کا دماغ جن اندیشہ ہائے دور دراز کی آماجگاہ ہوتا ہے اگر وہ اندیشہ ہائے دور دراز اور کشمکش حیات نوک قلم سے ٹپک کر کاغذ پر نہ آجائیں تو ان کا کرب اور تناؤ اس کی قوت برداشت کے لیے ایک چیلنج ہو جائے۔

بہترین شاعری وہ ہے جہاں قاری خود کلامی کے اس عمل میں شاعر کے ساتھ ساتھ ہو اور وہ اسے خود کلامی کے بجائے ہم کلامی سمجھے۔

حامد حسن خاں حامد مینائی کی شاعری اس خود کلامی اور ہم کلامی کا اچھا امتزاج پیش کرتی ہے نیز اس میں ان افکار و حوادث کی جھلکیاں بھی ہیں جن سے آج کا فرد دوچار ہے۔ مثلاً

جہاں اٹھتے ہوئے دیکھا ہے بستی سے دھواں ہم نے
تو فوراً بند کر لیں اپنے گھر کی کھڑکیاں ہم نے
یہ کوئی سحر ہے اس دور کا اعجاز نہیں
زندگی چیخ رہی ہے مگر آواز نہیں
یہ مانا ہر طرف جشنِ بہاراں ہے گلستاں میں
کچھ ایسے گھر ہیں جو اب بھی ہیں ویرانوں سے وابستہ

حامد مینائی کی شاعری کا ... مجموعی طور پر روایتی ہے لیکن اس میں وصل و فراق کی داستانیں، بے وفائی محبوب کے شکوے احباب کی بے اعتنائیوں کے گلے بڑے سلیقے سے ستھرے انداز میں ملتے ہیں، لیکن کہیں رومانیت کی دھنک ان کی غزلوں کو مرصع کر دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

کلیوں سے کوئی جھونکا جو پُر کیف ہوا کا
آہستہ سے ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
گلشن میں جو چھونے سے کوئی شاخِ گلِ تر
لچکے کبھی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

بعض اشعار سادگی و پُرکاری کی اچھی مثالیں ہیں ؎

لکھا تو ہے ہمارا نام حامد — نہ جانے خط یہ آیا ہے کہاں سے
زباں پر قیامت کا نام آگیا ہے — ذرا تم اٹھا کر نظر دیکھ لینا

——— نسیم اقتدار علی

نام کتاب: کرشنا چوڑا کے سائے میں (ناول)
مصنف: شام بارک پوری، قیمت: بیس روپے
ملنے کے پتے: بنگلہ دیش۔ عارف بک ڈپو، نور جہاں روڈ، محمد پور، ڈھاکہ پکچر پیلس، کھلنا۔
پاکستان۔ اختر وقار عظیم۔ ۷/ ای بلاک سی، سمن آباد، لاہور۔ عشرت بارک پوری، ۳ ایچ ۱۱/۱۴ ناظم آباد ۳ کراچی ۱۸
ہندستان: ماہنامہ سہیل، باری روڈ، گیا، اردو گھر، انجمن ترقی اردو ۔ کے۔ اے اثر۔ ۱، ۵۔ گارڈن ریچ روڈ۔ مٹیابرج کلکتہ۔

شام بارک پوری بنگلہ دیش کے ان چند ادیبوں میں ہیں جو آج بھی کسی نہ کسی طرح اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کے کتنے ہی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "کرشنا چوڑا کے سائے میں" شام بارک پوری کا تازہ ترین ناول ہے۔ ناول کا موضوع محبت ہے جس کی علامت "کرشنا چوڑا" اور اس کے سرخ پھول ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس ناول میں جبر و استحصال، معاشی اور سماجی اذیتوں اور سیاسی منظر ناموں کی بھی پرچھائیاں موجود ہیں۔

ناول کا ہیرو تنویر اگر عام آدمی کا کردار ہوتا تو جو کچھ اس ناول میں ہے وہ اس کے لیے کافی تھا۔ لیکن شام بارک پوری نے اسے آدرش وادی لبادہ اڑھا دیا ہے۔ سچائی اور اصول پرستی کے اس ڈھانچے یعنی تنویر کو لغزشوں سے دور رکھنے کی کوشش میں شام بارک پوری نے اسے قدم قدم پر ٹھوکریں ہی ٹھوکریں دی ہیں۔ محبت کے معاملات میں بھی وہ پرخلوص نہیں ہے۔ شہلا سے رومانس لڑاتے لڑاتے وہ شبنم کی طرف جھک جاتا ہے۔ شبنم سے دور ہوتے ہی وہ نزہت کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔ حالات چاہے کچھ بھی رہے ہوں لیکن آدرشوں پر چلنے والے لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ وہ وقت کے دھارے میں نہیں بہتے بلکہ ان کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کی زندگی میں کوئی شہلا آجاتی ہے تو پھر وہ نہ کسی شبنم کو دیکھتے ہیں نہ کسی نزہت کو۔ وہ ایک محبت کی ناکامی پر دوسری محبت نہیں تلاش کرتے اور پھر آدرش وادی کے لیے اپنی محبت کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ تو سارے معاشرے کو بدلنے کی دھن میں اتنا کھو جاتا ہے کہ اسے محبت کرنا

بھی یاد نہیں رہتا۔

جس طرح تنویر محبت کے آئینے میں دھندلا ہے اسی طرح سیاسی اور سماجی پہلو سے بھی اس کا عکس ایک بے چہرہ آدمی کا عکس ہے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں میں انقلاب کی تنظیم تو لگا سکتا ہے لیکن ان کے شانہ بہ شانہ چل نہیں سکتا۔ وہ کالج اور ہاسٹل میں سیاست پر گفتگو تو کر سکتا ہے لیکن اس جلوس میں کہیں نہیں دکھائی دیتا جس پر گولیوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ وہ اس ہجوم میں کہیں نہیں ہے جس پر کسی انقلاب کی مکمل اساس ہوتی ہے اور نہ وہ کچلے ہوئے عوام کے ساتھ تانا شاہی کے خلاف کہیں نبرد آزما نظر آتا ہے۔ وہ موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں کیوں موجود نہیں ہے یہ تو صرف شام بارک پوری یا ان کا ہیرو تنویر ہی جان سکتا ہے۔ ہم نہیں۔

بنگلہ دیش کے خوبصورت مناظر ڈھاکہ، چاٹگام، کرنا فلی اور کاسس بازار کی دلکش رعنائیوں کی تصویر کشی نے اس ناول میں بہر حال ایک حسن پیدا کیا ہے۔

—— وقار ناصری

نام کتاب: **افسانے**، مرتبہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی
قیمت: دس روپے، ملنے کا پتہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی
۱۷- سندری موہن ایونیو کلکتہ - ۱۴

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے آغا حشر، پریم چند، حسرت موہانی اور وحشت کلکتوی صدی تقریبات کے موقع پر ۱۹۸۱ء میں ۶ فروری کو شب افسانہ کا انعقاد کیا تھا۔ اس میں پڑھے گئے افسانوں کو اس مختصر کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی لائق ستائش ہے کہ وہ شب افسانہ جیسی کامیاب محفلیں کرتی ہے اور ان کو یادوں کے خزینے میں محفوظ کر دینے کے لیے پڑھے گئے افسانوں کو یکجا کر کے زیور اشاعت سے مرصع کرتی ہے ورنہ ملک کی زیادہ تر اردو اکاڈمیاں صرف مشاعرے کرتی ہیں۔

"افسانے" کی اشاعت مستحسن اقدام اس لیے بھی ہے کہ اس کو سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔ پہلے سکریٹری اکاڈمی جناب محمد فخرالدین نے وجہ تسمیہ بیان کی ہے پھر علقمہ شبلی نے نپے تلے انداز میں افسانے کی کہانی تحریر کی ہے جس میں انھوں نے ان افسانہ نگاروں کی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے جو کہ شریک محفل تھے۔ جن کے افسانے کتاب میں شامل ہیں ان میں عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار، رام لعل، محمد اسرائیل، انیس رفیع اور فیروز عابد کے افسانے اور ان کا مختصر تعارف مع تصاویر موجود ہے۔ یہ افسانے یقیناً ہمارے نمایندہ افسانے ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ جھوٹی تھالی ایک تازہ مسئلے پر سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے جبکہ نئے افسانہ نگاروں میں فیروز عابد کا افسانہ "اندھی گلی میں صبح"، اور انیس رفیع کا افسانہ بوجھ اچھی امیدیں وابستہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

ویسے تو یہ ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن اس سے آج کے اردو افسانے کی سمت اور رفتار کا اندازہ لگانے میں بڑی مدد ملے گی۔

—— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: **ایک آنکھ والا ہرن**، مصنف: اوم پرکاش راحت
قیمت: پندرہ روپے، ملنے کا پتہ: ادبی سنگم
۱۵۲/۷، فرید آباد (ٹاؤن شپ)

"فسادات کا جو ذکر آپ نے کیا ہے وہ یقیناً ایک بربریت کا ننگا ناچ ہے اور میری ہمدردی ان تمام بے گناہوں کے ساتھ ہے جو بلا وجہ صرف اپنے مذہب کی بنا پر مارے جا رہے ہیں۔ آپ کا یہ عزم کہ آپ ان سب مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ڈٹے رہیں گے۔ قابل صد ستائش ہے!!"

مندرجہ بالا جملے پنڈت جواہر لعل نہرو کے تحریر کردہ اس خط سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے موقع پر عبدالشکور کو ارسال کیا تھا اور اسے فاضل افسانہ نگار شری اوم پرکاش راحت نے اپنی کہانی "تیسرا گھر" میں اس خوبصورتی کے ساتھ شامل کیا ہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو کا پورا خط کتاب کی روح بن کر ہی سامنے نہیں آتا بلکہ آج کے ماحول میں پنڈت جی کی شخصیت ایک بار پھر نقیب امن کی حیثیت سے نگاہوں کے سامنے ابھر آتی ہے—!!

"ایک آنکھ والا ہرن" شری اوم پرکاش راحت کے ایسے ہی دلکش اور اچھوتے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں روایتی عشقیہ افسانے نہیں ہیں۔ دراصل آج کے خلائی عہد میں حسن و عشق کی روایتی کہانیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف و احساس فاضل افسانہ نگار نے بھی کیا ہے۔

اوم پرکاش راحت "پھر اپنی بات" کے زیر عنوان رقمطراز ہیں کہ "ہر تخلیق کار کی ذاتی طبع موضوع ادب کی بھی خالق ہوتی ہے۔ میری فطرت میں صبر نام کی کوئی چیز نہیں اور اسی لیے غزل کو سینے سے لگائے رکھا کیونکہ اس میں بہت جلد ہیجان قلب یا بپھرے ہوئے جذبات کو سکون مل جاتا ہے جبکہ کہانی کے لیے صبر ایوب

کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہیجانِ قلب اور صبر ایوب دو متضاد باتیں ہیں لیکن اوم پرکاش راحت کی کہانیوں میں دونوں کا خوبصورت امتزاج موجود ہے۔

زیر نظر کتاب میں شامل کہانیاں طویل ضرور ہیں لیکن ان کی طوالت بارِ خاطر نہیں ہوتی۔ زبان و بیان دلکش اور اسلوب نگارش موثر ہے۔ نیز ہر کہانی میں پھولوں کی سی شگفتگی بھی ہے۔

—— اکرم فاروقی

نام کتاب: آم کے آم (انشائیے)، **مصنف**: رام لعل نابھوی
قیمت: ۳۰ روپیہ، **ملنے کے پتے**: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، روز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر دہلی - ۱۱۰۰۲۵

'آم کے آم' جناب رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے شروع میں انشائیے پر ایک مضمون سے اس مجموعہ کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ بقول مصنف اردو کی بہت سی اصناف غیر زبانوں سے آئی ہیں۔ انشائیہ ان میں سے ایک ہے۔ اردو انشائیہ کی اقدار کا تعین کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں۔ کیونکہ اس کے موجودہ قوانین و ضوابط براہِ راست مغرب سے آئے ہیں۔ اگرچہ اس مضمون کی ابتدا میں انشائیہ پر مغربی مصنفین کے خیالات رقم کیے گئے ہیں لیکن اس صنف پر ہند و پاک کے ادیبوں کے خیالات نقل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا ہے۔ اختصار، بیان کی سادگی اور بے تکلفی رام لعل نابھوی کے انشائیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے انشائیے پانی کے شیریں چشمے کی طرح رواں دواں ہیں اور ان میں ایک شعریت بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار ان کے انشائیہ 'انتظار' کے اس اقتباس سے ہوتا ہے — "انتظار شعلے کی طرح لپک کر ختم ہو جائے تو آپ مسکرا اٹھتے ہیں۔ انتظار گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگے تو آپ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔"

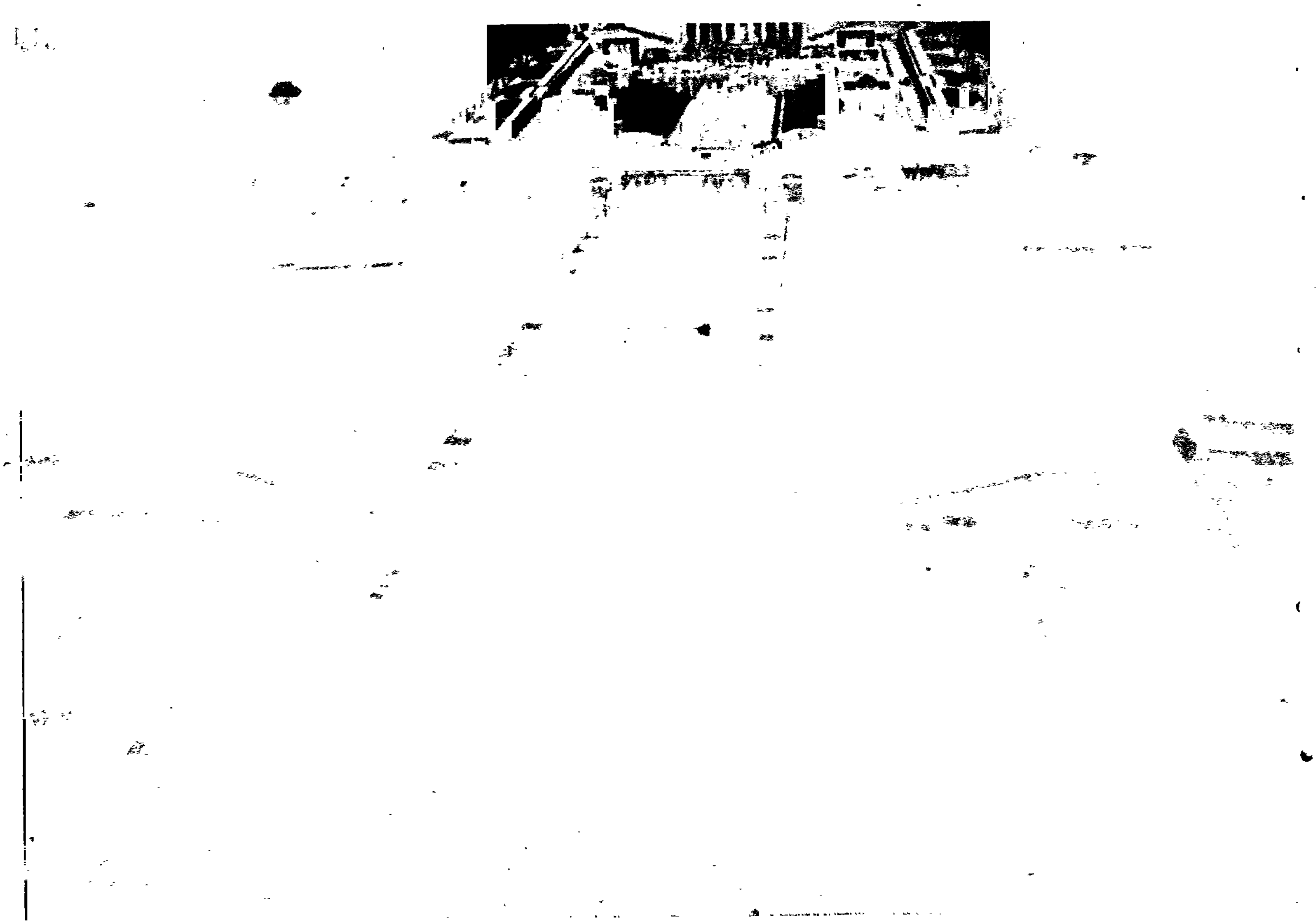
—— شبانہ عثمانی

جگر مرادآبادی : صفحہ ۷۹ کا بقیہ

سیماب اکبرآبادی، نواب سائل دہلوی، مرزا یگانہ چنگیزی وغیرہ سب کے لیے ان کے دل میں عزت اور اپنائیت تھی۔

غرض جگر صاحب شاعر اور انسان کی حیثیت سے ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے جن لوگوں کا ان سے کچھ بھی واسطہ رہا وہ انھیں کبھی نہیں بھلا پائیں گے۔ بقول خود —

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے



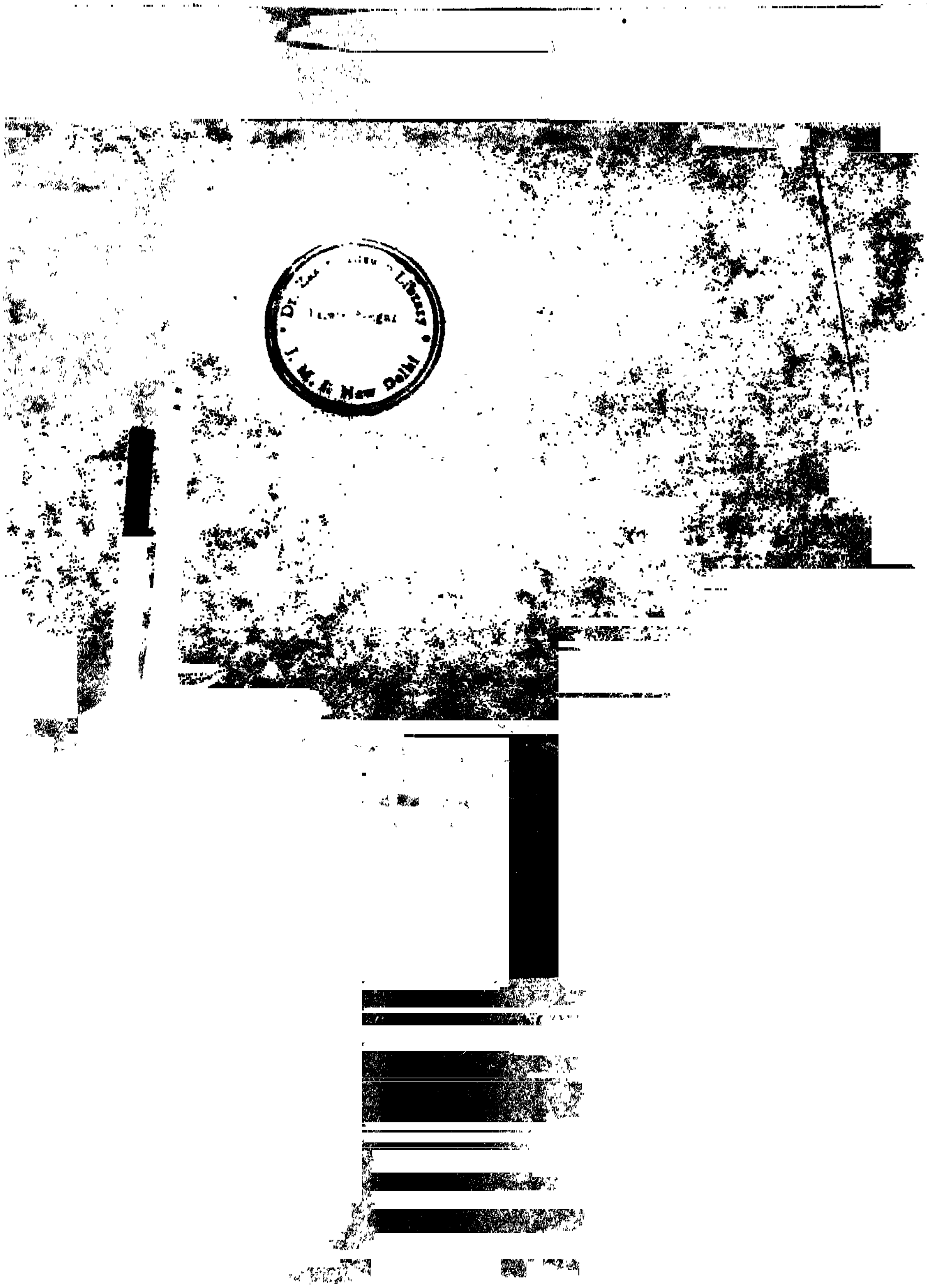
پیرس میں منعقدہ جشنِ ہند کا ایک ہوائی منظر

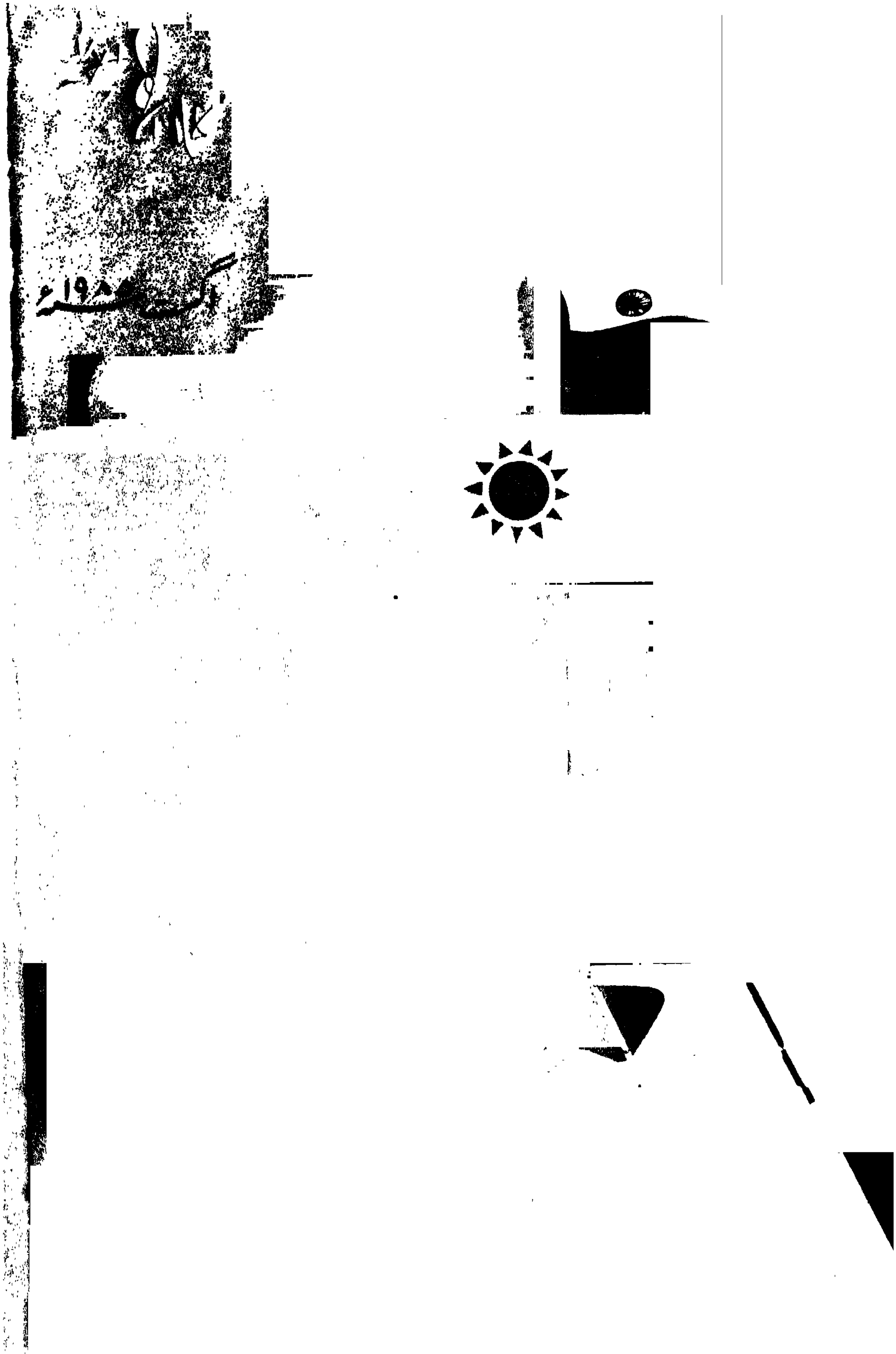
Vol. 40, No. 3 & 4
JUNE & JULY, 1985
Rs. 2-00 Paisa

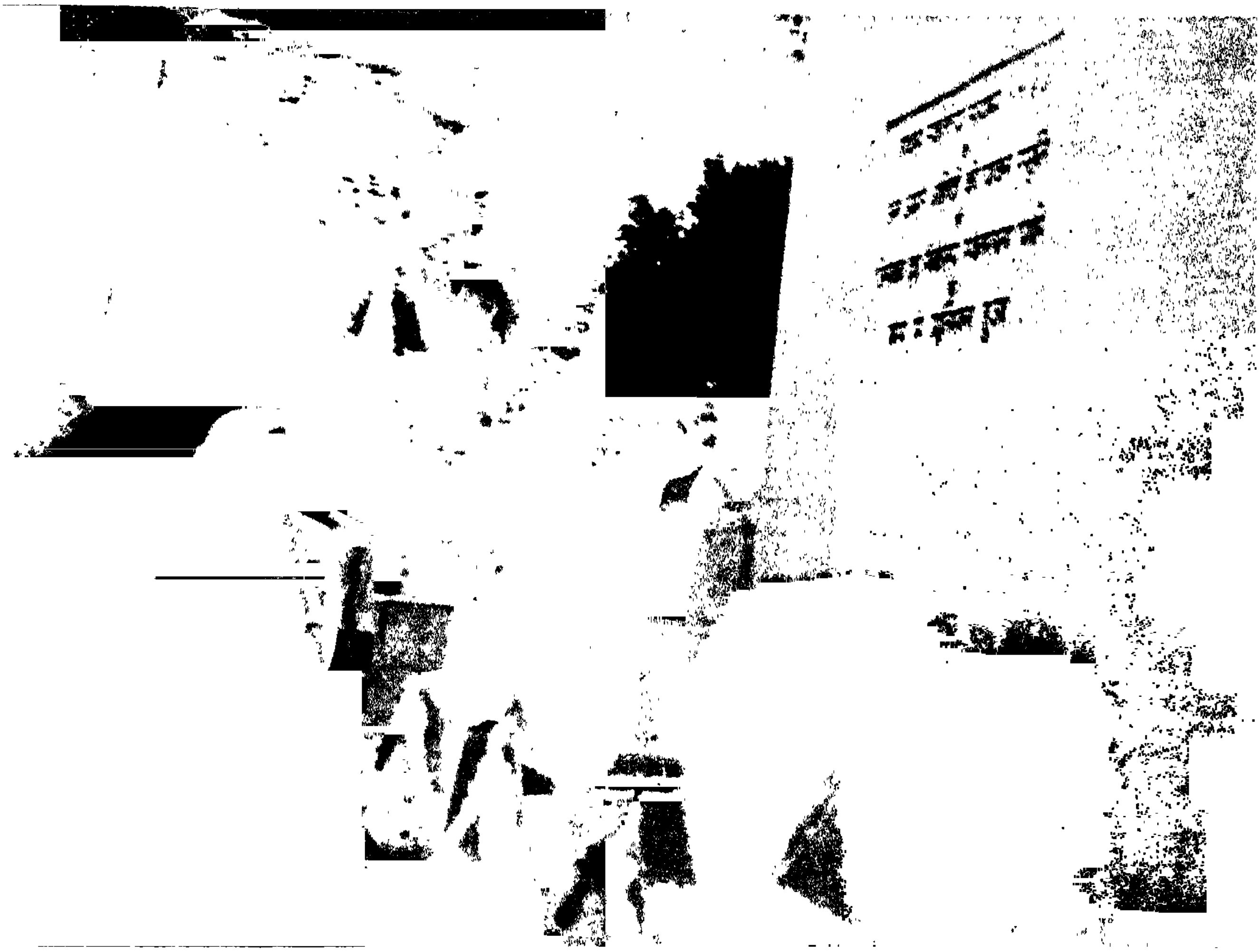
Annual Subs.
Rs. 10/-

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001







گورنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف نے ۲۳ اگست ۱۹۸۵ء کو میرٹھ میں شہید اسمارک
پر ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۰ | نمبر ۵

اگست سنہ ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر : ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : ——— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : ——— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر : ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر پرشانت کمار مشرا
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

اپنی بات

یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کی حیثیت ہمارے ملک میں تیوہاروں کی سی ہوگئی ہے اور یہ تیوہار قومی اہمیت کے حامل بھی ہیں۔ تیوہار زیادہ تر مذہبی بنیادوں پر منائے جاتے ہیں۔ لیکن یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے قومی تیوہار بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے سبھی لوگ مناتے ہیں اور اس کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر محض جشن منا لینا اور خوشیوں کا اظہار ہی کافی نہیں ہوتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان قومی تیوہاروں کا جو پس منظر ہے، ان میں جو جذبہ پنہاں ہے ہم اس پر بھی دھیان دیں۔

ہمارے عظیم رہنماؤں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے جس طرح انگریز حکومت کی لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں، جو عظیم قربانیاں دیں اور قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حاصل ہونے والی ہماری آزادی بلاشبہ اسی کی دین ہے۔ اس ملک کے عوام بھی آزادی کی لڑائی میں بلا تفریق مذہب و ملت ایک دھاگے میں بندھ گئے تھے اور شانے سے شانہ ملاکر جد و جہد آزادی کی راہ پر آگے بڑھتے گئے تھے اور پھر بابائے قوم مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تشدد کے سہارے دنیا کے سب سے بڑے سامراج کو شکست دی۔ اس طرح ایک طویل لڑائی کے بعد ہم نے آزادی کی بیش بہا نعمت حاصل کی۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہماری نئی نسل ان صعوبتوں اور قربانیوں کو فراموش کرتی جا رہی ہے جن کا مظاہرہ ہماری آزادی کی طویل جد و جہد میں ہوا۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نئی نسل کو ان سے اچھی طرح واقف کرائیں اور اس لڑائی کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا وہ بھی اس کے ذہن نشین کریں تاکہ ہماری نئی نسل اپنے ملک کی ترقیاتی سرگرمیوں میں اسی جذبے سے حصہ لے سکے اور اس ملک کو ترقی اور خوشحالی کی منزل تک پہنچانے کے سلسلے میں اپنا کردار پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر سکے۔

وفیات

اردو زبان و ادب کے بے لوث خادم یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے اسے پر کرنے والی شخصیتیں نہیں ابھر رہی ہیں۔ شاذ تمکنت، علامہ انور صابری اور زیب غوری بھی اردو زبان اور شعر و ادب کے عظیم خادم تھے۔ چنانچہ ان کا انتقال بھی ہماری زبان اور ادب کا بلاشبہ ناقابل تلافی نقصان ہے۔

● شاذ تمکنت حسن و رعنائی کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں سرمئی شاموں کی سی لطافت اور شائستگی ملتی ہے۔ آہنگ کے اعتبار سے وہ بڑے نکھرے اور گنگنانے رومانوی لہجے کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فکر و خیال کو مستقل جذبہ بنا دیا تھا۔ اور اپنی انھیں خصوصیات کی بنا پر وہ شعرا کی بھیڑ میں ممتاز و منفرد مقام کے حامل ہو گئے تھے۔

علامہ انور صابری ایک انتہائی زود گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد آزادی بھی تھے۔ انھوں نے ہندستان کی جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا اور اس کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ لیکن ایک خصوصیت ان کی ہمیشہ قائم رہی۔ وہ تھی ان کی آزاد منشی، بے نیازی اور قلندری۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے چکی کی مشقت بھی جاری رکھی اور مشق سخن بھی۔ ایک زمانے میں وہ ہمارے مشاعروں کی جان تھے۔ لہک لہک کر بلند آہنگی کے ساتھ بڑی مترنم آواز میں وہ اپنا کلام سناتے تھے اور مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔

● زیب غوری جدید غزل کے ایک انتہائی اہم شاعر تھے۔ صنعتی اور تجارتی معاشرے کے دیے ہوئے کرب اور اداسی کے دھندلکوں نے ان کی شاعری میں ایک عجیب سی کسک پیدا کر دی تھی۔ ان کی شاعری میں ایک ایسے فرد کی تصویر ڈوبتی ابھرتی محسوس ہوتی ہے جو دنیا اور اس کے مظاہر کو حیران آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور بڑی دھیمی آواز میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ دھیمی آواز کی تہذیب ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ وہ جذبے کو فکر بنا دینے پر پوری طرح قادر تھے۔ ان کے آخری ایام کی شاعری اپنے فکری اور محسوساتی آہنگ کی بنا پر خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ جدید غزل کو ان سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن جتنا شعری سرمایہ انھوں نے چھوڑا ہے وہی ہماری شاعری میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی جواں مرگی ہم سب کے لیے ایک صدمۂ جانکاہ ہے۔ ادارۂ نیا دور ان عظیم فن کاروں کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

لوک گیت اور پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

اظہر علی فاروقی
۸/۴۸، دریاباد
الہ آباد-۳

لوک گیت کاروں نے جس طرح اپنے وقت کے معاشرتی اور معاشی حالات وکوائف کی ترجمانی کی ہے، بالکل اسی طرح تاریخی واقعات اور حادثات کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ باتیں بہت پرانی ہوگئی ہیں اور ذہنوں سے اوجھل ہوتی جارہی ہیں۔ پھر بھی مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی دکنی مہمات آج بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ سماج کے لیے یہ ایک حادثہ تھا، اس لیے کہ شمالی ہندوستان کے فوجی جوان دکن بھیجے جاتے رہے۔ تاریخ ہند بول رہی ہے پھر بھی ان عورتوں کے دکھ بھرے جذبات اور المناک احساسات کی جانب سے تاریخ بالکل خاموش ہے جن کے شوہر دکن کی مہم پر بھیج دیے گئے ہیں، مگر لوک گیت اس طرح بول رہے ہیں:

دلی سہر سہاؤنا پھن برسے نیر
سب کے کنتھ بٹور کے لے گئے عالمگیر

اور ایسی جوان عورتیں انتظارِ واپسی کرتے کرتے چیخ پڑتی ہیں، اور رو پڑتی ہیں۔ یہ گریہ و زاری آپ کو لوک گیت کا رہی سنتے اور متاثر ہوتے دکھائی دیں گے، جو ایسی عورتوں کے ترجمان بن جاتے ہیں ؎

چھپر ہوگئے پرانے گرن لاگے بانس
آؤن آؤن کہہ گئے بیت گئے بارہ مانس

اور پھر ایک ہمدرد عورت اپنی سہیلیوں کو اس طرح سمجھاتی ہے:

بیٹھی رہو کرار سے من موں راکھو دھیر
اب کے بچھڑے تب ملیں جب بہوریں عالمگیر
بنتی کرو اس سائیں کی، کہ بہوریں عالمگیر

تو پھر بھلا اتنے بڑے تاریخی حادثے ۱۸۵۷ء کے حالات و کوائف کی ترجمانی سے کس طرح منھ موڑ سکتے تھے۔ انھوں نے بہت کچھ کہا۔ آنکھوں دیکھا اور سُنا سنایا بھی۔ بڑی دردمندی اور بڑے خلوص سے ...

ایسے گیت، جن میں کسی جنگ یا تاریخی واقعہ کا بیان ہوتا ہے، انھیں مختلف برادریوں نے الگ الگ نام دیے ہیں، روہیل کھنڈ کی عوامی اصطلاح میں ان کو ساکھا کہا جاتا ہے اور ایسے گیت تہواروں، میلوں اور فصل کٹنے کے وقت فخریہ طور پر رزمیہ انداز میں گائے جاتے رہے ہیں۔ اگرچہ اب ان کا رواج نہ صرف کم ہوتا جارہا ہے بلکہ ختم ہی سمجھیے۔ ساکھا محض تک بندی نہیں ہوا کرتے ہیں، بلکہ ان کی ہیئت عام طور پر مثنوی جیسی ہوتی ہے وزن اور قافیے کی پابندی بھی ہے۔ حالات اور واقعات بیان کرنے میں ترتیب اور تسلسل بھی۔ زبان اور لب ولہجہ البتہ مقامی ہوتا ہے۔ اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم ساکھاؤں کو عوامی رزمیہ کا اچھا خاصا نام دے سکتے ہیں۔ ایک بڑی اچھی بات یہ ہے کہ لوک گیت کاروں کے پیش نظر آزاد خیالی اور قومی یک جہتی کا جذبہ ہر جگہ رہا ہے۔ محمود نیازی صاحب کا ترتیب کردہ ساکھا نجو خاں کے بول

پڑھیے ؎

اوّل نام کھدا کا لیجے، دوجے نبی رسُول
تیجے نام "پرہی" کا لیجے بات نہ جاؤں بھول
کنٹھ سرسوتی میّا، کنٹھ بیٹھ جائے میرے
بجو خاں کا ساکھا کیتا سرن جاؤں میں رے

لوک گیت کار کس عقیدت مندانہ خلوص سے دُعا کرتا ہے کہ سرسوتی میّا کے گلے کی شیرینی اس کے گلے کو مِل جائے اور وہ بجو خاں کا ساکھا کہتے ہوئے سرسوتی ماتا کے شرنڑ (پناہ) میں جانا چاہتا ہے۔

دھوبیوں نے ایسے گیتوں کو کھنڈ کا نام دیا ہے۔ یوں تو کھنڈ دوگانہ ہوا کرتے ہیں جن میں ایک گوّیا اپنے مدمقابل گوّیے کی کہی ہوئی بات کا کھنڈن یا تردید کرتا ہے۔ مگر کچھ کھنڈ ایسے بھی ہیں جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے اور جو چھکڑے کی تیز لے میں فخریہ انداز میں گائے جاتے ہیں۔ قصائیوں نے ایسے گیتوں کو پچرا کا نام دیا ہے۔ بندیل کھنڈی علاقے اور بہار میں ایسے گیتوں کو 'پنوارا' کہا جاتا ہے۔ بلیا، سارن، چمپارن وغیرہ کے علاقے میں اس کی ایک شکل جھومر کے روپ میں نکلتی ہے جس کا انداز مزاحیہ ہوتا ہے۔ ڈھولا مارو کو بھی آپ اسی ضمن میں رکھیے۔

۱۸۵۷ء کا حادثہ جس کو انگریز مورخوں کی دیکھا دیکھی ہندستانی مورخوں نے بھی غدر کا نام دیا ہے۔ اگر ہم اس حادثے کے پس منظر کو اپنے سامنے رکھیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ اتنے زبردست حادثے کو غدر کہا جائے یا فوجی بغاوت یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے جبر و ستم اور مظالم سے نجات پانے اور ملک کو آزاد کرانے کی پہلی جنگ، جو زیادہ صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے۔

اس ضمن میں ہم آپ کے سامنے دو بلند پایہ انگریز شخصیتوں کے طویل بیانات کا خلاصہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ حادثہ ۱۸۵۷ء جبر و ستم اور مظالم سے نجات پانے کی پہلی جنگ تھی۔

مسٹر بولٹن (۱۷۴۰ - ۱۸۰۸ء) کی کتاب ——— CONSIDERATION OVER INDIAN AFFAIRS (ہندستانی معاملات پر ایک نظر) سے یہ اقتباس پڑھیے:-

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کے بارے میں یہ بات باوثوق طور پر کہی جا سکتی ہے کہ حب الوطنی کا جذبہ ان میں مشکل ہی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے سامنے صرف ذاتی مفاد رہے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مقبوضہ علاقہ برطانیہ کے بے بس اور قابل رحم باشندوں کو لوٹ کر خود اپنی جیبوں میں کتنے لاکھ بھر سکتے ہیں ...... ہندوستان کے لاکھوں آدمی چند ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر ہیں جو عوام کو لوٹ کھسوٹ کر مال غنیمت آپس میں بانٹ لیتے ہیں"......

اسی طرح ولیم کیری جو ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے برسوں ہندستان میں رہے ہیں، انھوں نے بھی کمپنی کے ملازمین کی سماجی زندگی اخلاقی پستی اور تنگ ذہنیتوں کی مذمت کی ہے۔ گھوڑ دوڑ، قمار بازی، شراب نوشی، آوارہ گردی کے یہ یورپی نواب لوگ کتنے دلدادہ اور شائق تھے، اس کا اندازہ ملکی اخبار کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے، بلکہ جب کمپنی کا اقتدار ختم ہو گیا اور ہندستان ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے ظلّ عاطفت کے تحت آگیا، اس وقت بھی ملازمین سرکار کی زیادتیوں سے لوگ پریشان تھے۔ انگریز تو انگریز خود ہندستانی ملازمین جبر و تشدّد کے خوگر بن چکے تھے جس کی طرف پنچ اخباروں نے اشارے کیے ہیں۔ ایک تحصیلدار صاحب کسی قصبے میں تشریف لاتے ہیں دیکھیے زمیندار طبقہ انھیں کیا سمجھ رہا ہے ؎

یہ تشریف لائے ہیں تحصیلدار — مجسّم ہوا یا کہ قحط آشکار
زمینداروں پر یک مصیبت یہ ہے — جو سچ پوچھیے تو قیامت یہ ہے

کہ لیں وہ اسامی سے یا کچھ دلیں   غرض کیا ہے، سرکار کو قسط دیں
بہت اس سے دل تنگ ہیں خاص و عام
الٰہی ہو جلد اس کا قصہ تمام

جب ملکہ وکٹوریہ کے عدل و انصاف کے دور کا یہ حال رہا ہو کہ خاص و عام سرکاری ملازمین سے تنگ دل اور برگشتہ خاطر ہیں تو پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جبر و استبداد اور ظلم و ستم سے کس درجہ عاجز اور پریشان رہے ہوں گے اور ۱۸۵۷ء میں جو سانحہ پیش آیا اور جو قدم انھوں نے اٹھایا وہ صرف اس لیے کہ

الٰہی ہو جلد اس کا قصہ تمام

لوک گیتوں میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بارے میں ساکھا کے مثل مسلسل اور مرتب کوئی گیت نہیں ملتا۔ البتہ ہمارے ایک ہم جماعت نے (کلاس فیلو نہیں اس لیے کہ ہم دونوں عربی کے طالب علم تھے) بتایا کہ جھانسی میں رانی جھانسی کے فوجی افسر رجب خاں کے بارے میں کچھ گیت گائے جاتے ہیں۔ لیکن للت پور، باندہ، اترا، مئو وغیرہ گھومتے پھرتے رہنے کے بعد بھی نتیجہ صفر نکلا۔ بس "گھومنے پھرنے" کو آپ ریلوے کے فرسٹ کلاس یا بس کا سفر نہ سمجھ لیں۔ سائیکل وہ بھی پرانی اور پیدل۔ لوگ ہنستے زیادہ، کام کی بات کم کرتے۔ مسٹر پی سی جوشی نے انگریزی سے اُردو میں اس سلسلے میں جو ترجمہ کیا ہے اس سے یہ گیت ملا ہے، جو ساکھا نہیں محض گیت ہے۔

رانی جھانسی کے توپچی غلام غوث خاں کے ایک مخلص دوست رفیق داد خاں کے مرتے دم کے الفاظ کا ترجمان ایک گیت ہے وہ

بھائی! ہمیں ایک دن تو مرنا ہی ہے
میں آج کے دن کا انتخاب کرتا ہوں
اپنی رانی کے لیے اپنی جان قربان کروں گا
میں اپنی تلوار سے فرنگی کے ٹکڑے ٹکڑے کروں گا
اور دنیا مجھے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

وطنی محبت، آزادی کی طلب اور اس سے زیادہ وفاداری اور قومی یکجہتی کی تابناک تصویر اور مرحوم کی تمنا کہ "دنیا مجھے ہمیشہ یاد رکھے گی" کتنے افسوس کی بات ہے کہ "یاد رکھنا" تو درکنار کوئی نام تک نہیں جانتا۔ اسی طرح کا ایک اور گیت ہے جس کی تقلید کہہ لیجیے یا اسی پیرائے میں شری بھی سبھدرا کماری چوہان نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی:

ہر بولے بندیلوں سے ہم نے سنی کہانی تھی
خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

ہاں تو اس ضمن میں ہمیں چند باتیں نہ بھولنا چاہئیں

(۱) لوک گیت کاروں کے ذہن جن جن حادثات سے ذاتی طور پر تاثر قبول کرتے ہیں وہ انھیں تاثرات کا ترجمان بنتا ہے۔

(۲) جس علاقے میں جو جو حادثات پیش آئے، وہ انھیں کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی علاقہ کے گیت کاروں نے گیت کا روپ دیا۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ لوک گیتوں میں چند ایسے مقامات اور ایسے لوگوں کے نام آجاتے ہیں جن کی شخصیتیں غیر معروف سی ہیں۔

(۴) مسٹر ایلن نے ہسٹری آف میوٹنی میں ایسے محبان وطن کے ناموں میں صرف تین نام سرفہرست رکھے ہیں۔ بھوج پور کے کنور سنگھ، تانتیا ٹوپے (کان پور) اور مولانا احمد اللہ شاہ، جن کو انگریز مولوی فیض آبادی کہتے تھے۔ ان میں سے صرف کنور سنگھ اور ان کے بھائی امر سنگھ کے بارے میں ان کی جواں مردی دلیری، شجاعت، عزم راسخ اور ثابت قدمی کے بارے میں بھوج پوری، میتھلی دونوں بولیوں میں گیت ملتے ہیں۔ گیت بٹورنے کے سلسلے میں ۱۹۵۹ء میں گنگا ندی کے کنارے بسے ہوئے ایک گاؤں اُجیار گھاٹ پہنچے۔ یہ گاؤں ضلع بلیا میں ہے مگر بکسر ہو کر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کچھ دلچسپ لوگ مل گئے جو میتھلی میں گیت گانے لگے۔ یہ بکسر کے جنگی میدان کی بات ہے ہم کچھ سمجھے مگر زیادہ تر سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن جب "آئر بھاگ گئے لا بکسر یا کے میدانوں" تو معلوم ہو گیا کہ جنرل آئر کے زیر کمان فوج بکسر کے میدانوں میں کنور سنگھ کی فوج سے شکست کھا گئی باقی لوگوں کے نام بنام جھانسی کی رانی کے علاوہ کسی پر گیت نہیں

ہیں۔ مولانا احمد اللہ شاہ شہید اور سپہ سالار عظیم اللہ خاں وغیرہ کا تو کوئی نام تک نہیں لیتا۔ غلام غوث توپچی، رفیق خاں داد جنھوں نے مرتے وقت کہا تھا " اور دنیا یاد رکھے گی مجھے ہمیشہ " کا تو کوئی نام تک نہیں لیتا۔

(۵) مسٹر ایلفن، مسٹر فاریسٹ، مسٹر ولیم کرک وغیرہ کی بدولت کچھ نام ہم تک پہنچ سکے ہیں۔

اب آیئے اس پس منظر کے بعد اصل موضوع کی طرف!

یہ حادثہ کیوں وجود میں آیا۔ پہلا سبب تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جبر و ستم اور مظالم سے نجات پانا کرع

الٰہی ہو جلد اس کا قصہ تمام

دوسرا سبب جس سے فوجیوں میں بدظنی پیدا ہوئی اور جس کو مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے، لوک گیت کی زبانی سنیے۔ یہ گیت گویا تا آب رامپور (یوپی) کے پیارے دھوبی سے ملا ہے بیئت کنڈلی کی ہے ٹیک ہے:

چار ٹکے پر نوکر رکھ کے دین ایمان مٹا دیں

دانتوں سے کرتوس تڑوا دیں	چربی سور گائے کھلا دیں
بھوسا گھاس بیچ بیچ کے	بن گئے شاہ فرنگی
بن گئے شاہ فرنگی	دیکھو وقت کی بلیہاری
محلوں کی رہنے والی	پھریں بزار بچاری
پھریں بزار بچاری	چار ٹکے سے بن گئے پنچ ہزاری
گورے بندر تن تن کے	شہزادوں کو ناچ نچا دیں

چار ٹکے پر نوکر رکھ کے

دین ایمان مٹا دیں

اس کنڈلی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فرنگی بھوسا، گھاس، بانس وغیرہ جیسی معمولی چیزوں کی تجارت کر کے بادشاہ بن گئے۔ اس طرح ان کا بادشاہ بن جانا بھی ہندستانی خواص تو خواص عوام کے لیے بھی خلش پیدا کر رہا تھا۔

یہی جذبہ ایک دوسرے گیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو ایک بھوج پوری ہنوارے کے انگریزی ترجمے سے لیا گیا ہے جب کنور سنگھ نے اپنے ایک حولدار کو خط لکھا کہ

انگریزوں کے لچھن برے ہیں
وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم
ان کے ساتھ مل کر کھائیں پئیں
وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم کارتوسوں کو
اپنے دانتوں سے کاٹیں!

حولدار خط پڑھ کر جگدیش پور چھاؤنی پہنچتا ہے اور قسم کھاتا ہے کہ

اور بابو! میری سوگند سنو، جو میں نے کھائی ہے
کارتوس کبھی اپنے دانتوں سے نہیں کاٹوں گا
ان کا پانی کبھی نہ پیوں گا
برہمن ہوں یا راجپوت
شیخ ہوں یا سیّد
مغل ہوں یا پٹھان
کارتوس کبھی اپنے دانتوں سے نہیں کاٹوں گا
نہ میں اور نہ وہ۔

غیر معروف جنگی مقام اور غیر معروف شخصیتوں کے بارے میں مُہیّا ضلع شاہ جہاں پور کا لکھا ہوا ایک جھگڑا اونچی اڑان اور تیز لے میں گایا جاتا ہے۔ ٹیک کی اڑان ہے:

"ہم تو چلے چھپر تلا میدان"
کیوں۔؟
اس لیے کہ۔۔۔۔

دھوتو دھوتو بگلا باجے	روڑ دوڑ تلنگن ساجے
تو رُوہی کی آواز سنو	گوری اب تو ہم کو نا روکو

وہاں رن پڑا گھمسان
ہم تو چلے چھپر تلا میدان

اس جھگڑے میں چھپر تلا میدان اور آگے چل کر جہاں خاں اور صلابت اللہ کے دو نام اور آئے ہیں اور تینوں غیر معروف اور غیر تاریخی ہیں۔ چھپر تلا ایک گاؤں، سیتاپور، شاہ جہاں پور روڈ

پر واقع ہے۔ سیتاپور میں فوجی چھاؤنی رہی ہے اور آج بھی ہے وہاں نصب شدہ پتھر سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی فوج سے ایک جھڑپ ضرور ہوئی تھی، جو وہاں کے باشندوں کے لئے غیر معمولی رہی ہوگی۔

اسی طرح جہاں خاں اور صلابت اللہ غیر تاریخی ہیں۔ ممکن ہے اس وقت اس جوار کے کوئی بلند مرتبہ انسان ہوں۔

جہان خاں نے ہونکار لگائی
جن (زن) بیچے جن کی دیں ایں دہائی
انھیں سے سب نے آس لگائی
جمع ہوئے سب جوان
ہم تو چلے چپر تلا میدان

یہی اندازہ صلابت اللہ کے بارے میں ہوتا ہے:

ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں گرجیں
کڑ کڑ تڑ تڑ کریں تلوار
میدان میں کودے صلابت اللہ
اور فرنگی بھئے پریشان
ہم تو چلے چپر تلا میدان

ایک اور غیر تاریخی شخصیت لوک گیتوں میں دیکھئے۔ اوریا ضلع ہردوئی تحصیل بلگرام میں ایک دیہات ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کا زمیندار راجا کہا جاتا ہوگا جیسا کہ گیت سے معلوم ہوتا ہے:

جب سب راجا بھئے پدوڑے
نکال لی میان سے تلوار
بتائی سب کو للکار
اور دیا دھتکار
وہ تھا اوریا راجا جس نے بھری ہونکار
جس نے بھری ہونکار بھیا میرے
اک ہونکار پہ اس کی
دوڑے جودھا جو آن بھئے تیار

اس طرح اس نے ملیح آباد پہنچنے کا ارادہ کیا، جہاں کے پٹھانوں نے انگریزوں کے خلاف پہلا اقدام کیا تھا کہ بیچ میں سندیلہ پڑ گیا جہاں الیگزنڈر ہیڈلے اس طرف بڑھ رہا تھا کہ اوریا کے راجا سے مڈبھیڑ ہوئی۔

لوک گیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد تو مرد عورتوں کی نفرت اور حصول آزادی کا جذبہ اس درجہ تیز ہو رہا تھا کہ وہ مردوں سے اس جنگ آزادی میں حصہ لینے سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی تھیں۔

کان پور میں جنرل ہیولاک (Havelock) کے زیر کمان تھا اور وہاں بے پناہ قتل و غارت گری ہوئی۔ کسی جوان غیرت مند عورت کو بھائی کی شہادت کی خبر ملتی ہے:۔

خبر کان پور کی سن کے میا ہوئیں دوانی
نئی نویلی بھابی کو ہوئی بڑی حیرانی
گلی گلی میں گھوڑے دوڑیں جن پہ ناگ سوار
میں باوری جی کی پوڑھی ہاتھ میں لی تلوار
کالے ناگ کچل دیے اور بھگا دیے شیطان
لڑکی جان کے مجھ کو موئے ہوئے حیران
بیرن تیری لاش پہ بہنا ہو جاتی قربان
ٹیکا جھمکا کنگن پہونچی سب کو ہے دھتکار
خود جو ہوتا سر پہ میرے ہاتھ میں جو ہوتی تلوار
گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور پہنچتی سیر کٹھ بازار
داؤں دکھاتی ایسے بیرن سب رہ جاتے حیران
بیرن تیری لاش پہ بہنا ہو جاتی قربان

بعض گیت ایسے بھی ملے ہیں جو تاریخی حقیقتوں کے عین مطابق ہیں۔ آپ تاریخ سے ایک بیان پڑھیے:۔

......انقلابی لہریں بڑی تیزی سے قرب و جوار کے اضلاع تک پھیلنے لگیں اور ہندوستانی مجاہدین فیض آباد میں تیار ہو گئے اور مولانا احمد اللہ شاہؒ کے زیر کمان لکھنؤ کی طرف کوچ کر دیا۔ ۲۹ جون ۱۸۵۷ء کو سر ہنری لارنس نے سر جان انگلس

(JOHN INGLIS) کی معیت میں ان کے مقابلے کے لیے کوچ کیا۔ جب تک مجاہدین چنہٹ تک پہنچ گئے، ابھی لکھنؤ نہ پہنچنے پائے تھے کہ اسماعیل گنج میں انگریزی فوج کو شدید مقابلہ کرنا پڑا، گورکھا، سکھ اور کچھ انگریزوں پر مشتمل تھی اور تعداد صرف نو سو تھی۔ انگریزی فوج کو پسپا ہو کر واپس جانا پڑا اور فیض آبادی جنگجو آئرن برج (جس کو عوام بندریا پل کہا کرتے تھے) تک پہنچ گئے جہاں دوسرا بڑا مورچہ پڑا اور آخرکار ریزیڈنسی تک پہنچ گئے......"

اب یہ گیت پڑھئے: —

فیض آباد سے چلے مولانا
جن کے ساتھی ویر جودھا بڑے مردانا
اور پرٹ سے بڑھے پاٹھنواں
ملیح آباد میں پڑا مورچہ آگے بڑھے افغنواں
اور مور بھیا اور سنو کہانی
چنہٹ پر پڑے رن گھمنواں
انگریز افسر ہوا ہدوڑا
پیچھے ہٹائی فوج بھگا چھوڑ میدنواں

اس حادثے کے دوران جو کچھ ہوا، اس کے بیانات بھی مقامی اثرات کے تحت لوک گیتوں میں پائے جاتے ہیں۔ دلی اور اس کے گرد و نواح میں کمپنی فوجیوں نے جو قتل و غارت گری کی تھی وہ کتنی المناک اور انسانیت سوز رہی ہے۔ کمپنی کی فوجوں میں گورکھے، سکھ اور کچھ گورے تھے:-

تال تلیاں پٹ پٹ گئیں　　بھر گئیں چیلاں کی کوئیاں
لال فرنگی کرچ دکھادیں کھونگٹ والی　　ہنوڑی پرڑیں پئیاں

بظاہر اس میں مبالغہ سا نظر آتا ہے لیکن اس کی تائید ظہیر دہلوی کے اس بیان سے ہوتی ہے جو "نقوش" (لاہور) کے آپ بیتی نمبر میں شائع ہوا تھا:-

"جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے، ان میں کئی باکمال فرد روزگار مارے گئے۔ عورتوں کا یہ حال تھا کہ گھروں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلے کے کوچے کے تمام کنوئیں لاشوں سے بھر گئے۔ آگے میرا قلم نہیں چلتا اور نہ مجھے تحریر کی تاب ہے جو کچھ سنا گیا......"

جبر و ستم اور بے رحمی کی ایک ہیبت ناک تصویر دیکھئے۔ یہ بھی چھکرا سروں میں کول نے میں گایا جاتا ہے:———

میر مرزا بڑے نمازی اللہ سے لگائے دھیان
بیچ مصلے بیٹھے تھے کہ گھسے حویلی میں شیطان
مہریں اور اشرفی مانگیں گورے تب وہ ہوئے بڑے حیران
گوروں نے جب کچھ نا پایا تان دی بندوق
مرزا کے گر آب لگا انسن لاگے شیطان
لاش پڑی تھی بیچ مصلے ہاتھ میں تسبیح تھامے
اللہ کے گھر وہ سدھارے پہنے جوڑا جامے
ربا میرے بخش دے ان کو نام تیرا رحمان
میر مرزا بڑے نمازی اللہ سے لگائے دھیان

میرٹھ کا بازار لٹ رہا ہے، اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ بھی دیکھیے:-

میرٹھ کا بازار لٹا　　صدر بازار لٹا
لٹا صرافہ اور بزازہ　　لاشوں کا بنا جنازہ
یہی بیچ پہنچ گئے اپنے اسوار　　میانوں سے نکل پڑیں تلوار
لال فرنگی بڑھ کے آئے　　وہ دیکھو وہ بھاگے پھر بھاگے
ایک مرا دوجا مرا　　تیجا گھائل ہو کے گرا
ادھر دیکھو بھاگے لال فرنگی　　آگے بڑھ گئے اپنے جودھا جنگی
وہ دیکھو دوسری ٹکڑی آئی　　اب گوروں کی شامت آئی
چھین لیا سب گہنا پاتا
چاندی سونا اور روپیا

لوک گیتوں کے سروں پر ہندوستانی جنگجو اشخاص کی جوانمردی دلیری اور شجاعت، عزم راسخ اور پائیداری کے وہ راگ ملتے ہیں جن

کو سن کر حیرت ہوتی ہے اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شکست ہوئی تو کیوں ہوئی۔؟ کھنڈوں، پچھڑوں، پنواروں، جھومروں وغیرہ میں زیادہ زور عیش پرستی پر دیا گیا کہ راجا، زمیندار وغیرہ بے پناہ سہل پسند اور عیش پرستی کے دلدادہ بن گئے تھے۔

ہمرا بلم جی کے چار کِسم رنڈی چاہے
موٹی ابرو، چھوٹی ابرو، پتلی ابرو جراجادہ چاہی

جوا، شراب خوری، چانڈو، مدک، افیون اور حقّے کے ساتھ گانجا پینے کی بُری لتیں۔

ہمرا بلم جی کے چار کِسم بیڑا چاہی
لونگ الائچی جرداکیام جرا جادا چاہی
چانڈو، اپھیم ادھکا گانجا جراجادہ چاہی

نجو خاں کے ساکھا میں البتہ اس بات پر زور دیا گیا ہے جس کی طرف ہم اشارہ کرنے والے ہیں۔ بات یہ ہوئی کہ جب نجو خاں اپنا جری لشکر لے کر آگے بڑھا تو شہر بریلی کانپ اٹھا۔ جعل فریب کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی، چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا اور بریلی کا صوبے دار شمبھوناتھ پانچ ہزار کی فوج لے کر انگریزوں کی مدد کو پہنچ گیا۔

نکلا بریلی صوبا دار ڈیرا تاں ہے
کوس بھرے پے پہرے رکھے من میں بہت ڈرائے
جب میں بھروں ارادا پہلی چوٹ اڑاؤں
کیا مگدور روہیلوں کا جو سنمکھ لے ایں لڑائی

اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ایک روہیلا سردار اشرفیوں کے لالچ میں آکر ۵ ہزار کی فوج لے کر بھاگ نکلا۔

جنگ پلاسی کے میر جعفر اور چوتھی جنگ میسور کے میر قاسم کے نام سے تو واقف ہوں گے۔ کیا غداری کی اس سے بدترین مثال مل سکتی ہے۔

اور اس جنگ آزادی میں جا بجا یہی ہوا۔ جان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ آغا میر نے کیا کیا اور سپہ سالار عظیم اللہ کے ساتھ حکیم احسن اللہ نے کیا کیا۔ اس کی بدنما تصویریں بھی کچھ لوک گیتوں میں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔

ہندستانیوں کو شکست ہوئی اور اس کے نتیجہ میں جور و ظلم، جبر و استبداد کا وہ وحشیانہ دور شروع ہوا کہ اللہ کی پناہ! بادشاہ کے سامنے اس کے بیٹے اور داماد قتل کئے جاتے ہیں، جہاں کسی شخص پر شبہ ہوا اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ جائدادیں ضبط ہوگئیں، قرق ہوئیں۔ دارو گیر کا ایک بھیانک رقص رہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس قسم کے ہمیں کوئی گیت نہ مل سکے، جن میں ان کا ذکر ہوتا البتہ عوام کی اقتصادی بدحالی اور فاقہ کشی پر بہتیرے گیت ملتے ہیں۔ یہاں ایک گیت دیکھیے۔

پیسے سیر کی دال بکانی آنے سیر
یہ دیکھو اندھیر
بھوکے پیاسے بچے روئیں، مائیں پیٹیں چھاتی
گھروں میں گھس گھس گورے آویں جیسے ہوئیں براتی
یہ دیکھو اندھیر
شال دوشالے جو اوڑھیں تھے
ان کو کپڑا نہیں میسر مرت لگائیں گھاتی
یہ دیکھو اندھیر
پیسے سیر کی دال بکانی آنے سیر

ہمیں بڑی معذرت اور افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہم نے لوک گیتوں کی طرف صرف مقامی زبان ہونے اور لب و لہجہ کی مغایرت کی بنا پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ہم آپ کو توجہ دلاتے ہیں کہ اگر کوئی ادیب صرف دو ہوں، شہید لال وغیرہ کے اکٹھا کرنے میں لگ جائے اور صرف دو ہفتے فیلڈ ورک کی زحمت اٹھالے تو وہ ذخیرہ مضامین کے لحاظ سے مرثیوں سے کم نہ ہوگا۔ اس طرف اب تک کچھ تو اس خاکسار نے اور کچھ بنارس کے ڈاکٹر عبدل بسم اللہ صاحب نے ہندی میں مضامین لکھے ہیں، اور یہ گزارش محض اس لئے کر رہا ہوں کہ لوک گیت کسی قوم کی ایسی قدیم روایات ہیں جو باقاعدہ کسی تحریری دستاویز میں محفوظ نہیں ہیں لیکن جن کو ذہن نشین کئے بغیر بنی نوع انسان کی مختلف برادریوں کی متفرق شاخوں اور جماعتوں کے موجودہ اور آئندہ رشتوں کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہی حال تاریخی

عالم فتحپوری
اختر منزل کشمیری بازار۔ آگرہ

غزلیں

مرے لبوں کو وہ اندازِ نے نوائی دے
کہ جس میں روح کی آواز بھی سنائی دے

ہر آنکھ سامنے کی چیز دیکھ لیتی ہے
وہ آنکھ دے کہ پسِ پردہ بھی دکھائی دے

نوازے تو مرے جذبۂ محبت کو
خفا ہو جن سے انھیں زعمِ پارسائی دے

مزید اذنِ سفر وہ بھی خارزاروں میں
الٰہی اتنی نہ دادِ شکستہ پائی دے

جو لوحِ وقت پہ لکھ دوں وہ حشر تک چمکے
قلم دیا ہے تو پھر ایسی روشنائی دے

خلل پڑے نہ کہیں ان کی بزمِ خلوت میں
دعا یہ ہے مرے نالوں کو نارسائی دے

بشر ہوں مجھ میں بھی ہے انتقام کا جذبہ
کبھی کبھی مجھے توفیقِ بے وفائی دے

نثار و اخضر و سیماب سب گئے عالم
اب آگرہ میں اندھیرا ہے کیا دکھائی دے

میں خطا کار مرے دیدۂ نم اپنی جگہ
تو خطا پوش، تری چشمِ کرم اپنی جگہ

میرے غم، تیرے ستم، کوئی نہیں کم لیکن
میرے غم اپنی جگہ تیرے ستم اپنی جگہ

دلفریبی میں بہت خوب ہے محرابِ حرم
لیکن اس زلفِ گرہ گیر کا خم اپنی جگہ

مہِ کامل ہے چمکدار، طرحدار و حسین
پھر بھی اے دوست ترا نقشِ قدم اپنی جگہ

دولتِ عشق سے بڑھ کر نہیں دولت کوئی
سیم و زر اپنی جگہ۔ جاہ و حشم اپنی جگہ

یوں تو اس دور میں فن کار بہت ہیں عالم
تیری شہرت، تری عظمت، ترا دم اپنی جگہ

محمد محسن جواد
مکان نمبر ۱/۴۹-۶-۱۶
عثمان پورہ - حیدرآباد ۲۴

دکن کا مجاہد

نواب مبارز الدولہ بہادر

جنگِ آزادی کے ابتدائی دور میں جن وطن پرستوں نے سرفروشی کی روایت عام کی اور دار و رسن کو بڑھ کر گلے لگایا ان میں نواب مبارز الدولہ بہادر کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی سیاسی سرگرمیاں حیدرآباد تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان کا دائرہ عمل مدراس، بمبئی، کرنول اور بھوپال سے لے کر لاہور اور سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک طرف "وہابی تحریک" کے ذریعہ حیدرآباد کے باہر کے مسلمانوں کو منظم و متحد کیا تو دوسری طرف مختلف ریاستوں کے ہندو اور مسلمان رئیسوں اور حکمرانوں سے رابطہ قائم کرکے انگریزوں کے خلاف ایک ہندوستان گیر بغاوت کا منصوبہ تیار کیا، تاکہ انگریز حکومت کا تختہ الٹا جا سکے۔ انھیں اگرچہ اپنے منصوبوں میں پوری طرح کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور زندگی کا بڑا حصہ قید میں گزارنا پڑا، لیکن بغاوت کی جو مشعل انھوں نے روشن کی تھی وہ ہزاروں وطن پرستوں کے سینوں میں روشن رہی جس کو کوئی طاقت بجھا نہ سکی۔

تحریک شہیدین کے حیدرآبادی رفقاء میں اور جنگ آزادی ہند کے اولین سورماؤں میں نواب مبارز الدولہ بہادر کو جو اہم مقام حاصل تھا اس بات کا اعتراف "THE FREEDOM STRUGGLE IN HYD." کے مرتبین نے اس طرح کیا ہے کہ نواب مبارز الدولہ بہادر کی شخصیت و خدمات کے سلسلے میں دو باب اور ۲۱۷ صفحات میں سے ۴۰ صفحات مختص کیے ہیں (یہ کتاب "تاریخ جدوجہد آزادی" (HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT IN HYD.) مرتب کرنے کے سلسلے میں قائم کردہ حیدرآباد اسٹیٹ کمیٹی کی جانب سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی جو آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز سے دستیاب ہو سکتی ہے۔)

نواب مبارز الدولہ بہادر کا نام میر گوہر علی خاں تھا اور یہ نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ ثالث کے چھوٹے فرزند اور ناصر الدولہ کے بھائی تھے۔ موصوف سنہ ۱۸۰۱ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت نہایت معقول طریقے پر ہوئی۔ وہ فارسی، عربی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے تھے، اس کے علاوہ مذہبی تعلیم بھی مستند طور پر ہوئی لیکن موصوف کا بچپن دوسرے آصف جاہی شہزادوں کے بالکل برعکس تھا۔ انگریز دشمنی کا جذبہ انھیں اپنے باپ نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ ثالث سے ورثے میں ملا تھا، جس نے کم عمری ہی میں جارحانہ صورت اختیار کرلی۔ اسی جذبۂ حریت و آزادی نے انھیں کبھی بھی انگریزوں سے مرعوب نہ ہونے دیا۔

موصوف کے بچپن کے دو ایک واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شروع سے کتنے دلیر اور بہادر تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۱۵ء میں ان کے ایک ملازم کا ریذیڈنسی بازار کے ایک درزی سے جھگڑا ہو گیا۔ مبارز الدولہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس جھگڑے کی وجہ سے

ان کے ملازم کی جان خطرے میں ہے تو انھوں نے حکم دیا اور درزی گرفتار کر لیا گیا۔ درزی بھی معمولی حیثیت کا نہ تھا اسی وجہ سے ریزیڈنٹ نے اس معاملہ میں ذاتی طور سے دلچسپی لی اور ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ (جس کے ساتھ توپیں تھیں) طلب کر کے مبارز الدولہ کے محل کے محاصرہ کا حکم دیا۔ ان کے محل پر متعین محافظین اور ریزیڈنٹ فوج کے درمیان سخت لڑائی ہوئی اور ریزیڈنٹ کی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی، اور کہا جاتا ہے کہ نواب مبارز الدولہ کے تیر سے ایک انگریز فوجی افسر کی ہلاکت واقع ہوئی۔ اس واقعہ پر انگریز سپاہیوں میں افراتفری پھیل گئی۔ ہزیمت کے بعد ریزیڈنٹ بہادر برافروختہ ہو گئے اور انھوں نے سکندر آباد چھاؤنی سے آٹھ سو لڑاکا سپاہیوں کا مضبوط دستہ مبارز الدّولہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، لیکن مہاراجہ چندو لال نے (جو اس وقت کے دیوان تھے) معاملہ کو رفع دفع اور حکمت و رشوت سے ریزیڈنٹ کو خاموش کر دیا۔ لیکن مبارز الدولہ بہادر کو ان کے برادر نسبتی ممتاز الدّولہ اور صمصام الدّولہ کے ساتھ پانچ سال کے لیے قلعہ گول کنڈہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ سلطنت آصفیہ کے دور میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ انگریز دشمنی کی وجہ سے ایک شہزادہ کو اپنے حکمراں باپ کے احکامات پر نظر بند کیا گیا۔

قید و بند کی مصیبتوں سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ رہائی کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں، بہت جلد انھوں نے عربوں اور افغانوں کی ایک بھاری تعداد اپنے گرد جمع کر لی، اور پھر اس فوجی جمعیت کو مدافعت کے نقطۂ نظر سے مستحکم کرنے کے بعد بغاوت کر دی۔ لیکن کرنل اسٹیورٹ کے زیر کمان ایک برطانوی دستہ نے اس فوجی جمعیت کو پسپا کر کے نواب مبارز الدّولہ کو دوبارہ ۹ر اپریل ۱۸۴۰ء کو گرفتار کر کے قلعہ گول کنڈہ میں نظر بند کر دیا۔

گولکنڈہ میں نظر بندی کے زمانے میں بھی وہ چین سے نہیں بیٹھے اور قلعہ میں واقع نظام کے خزانہ پر (جس میں سوا لاکھ سے زیادہ رقم تھی) قبضہ کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی فوج تیار کی۔ لیکن بگرام گڑھ سے فوجی دستے وہاں پہنچ گئے اور یہ دستے بڑی مشکل سے ان کے اس منصوبے کو ناکام بنا پائے۔

اس سے قبل نواب مبارز الدولہ نے اپنے والد نواب سکندر جاہ بہادر کے انتقال کے بعد ناصر الدولہ کی جانشینی سے ناراض ہو کر ۱۸۲۹ء میں بھی بغاوت کی تھی، اس پر بھی انگریز ان سے ناراض تھے۔ کچھ عرصے کے بعد مبارز الدولہ نے حالات سازگار نہ پاکر اپنے بھائی ناصر الدولہ سے صلح کر لی اور اپنے محل میں رہنے لگے۔ کرنل میڈوز ٹیلر نے اپنی سوانح حیات "THE HISTORY OF MY LIFE" میں تفصیل سے مذکورہ واقعات پر روشنی ڈالی ہے بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مبارز الدولہ نے اپنے بھائی سے جو صلح کی تھی وہ ایک مصلحت تھی تاکہ مزید منصوبہ بندی کے ذریعہ انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر سکیں۔

گولکنڈہ میں قید کے دوران نواب مبارز الدولہ کے روابط سیّد احمد شہید کے نمائندوں سے (جو دکن بھیجے گئے تھے) قائم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ خود سید احمد شہید نے بھی سکندر جاہ آصف جاہ ثالث سے خط و کتابت کی تھی۔ کرنل میڈوز ٹیلر نے اپنی مذکورہ بالا کتاب "THE HISTORY OF MY LIFE" میں سید احمد بریلوی کے ایک خط کا خلاصہ پیش کیا ہے جس میں سید احمد بریلوی نے ہندستان سے انگریزی اقتدار کے خاتمہ کی جدو جہد میں انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس خط میں انھوں نے آصف جاہ ثالث کو ان کی خاندانی روایات کو یاد دلاتے ہوئے زور دیا تھا کہ وہ ملک سے بے دین لوگوں کے اقتدار کے خاتمہ میں ان کی مدد کریں۔

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقامی علماء کے زیر اثر نظام الملک آصف جاہ ثالث نے اس تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔

۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی شہید ہوئے لیکن تحریک شہیدین کا زور نہیں ٹوٹا بلکہ اس کے بعد کے واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے پیرووں نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور اپنا مرکز شمال سے جنوب منتقل کر دیا۔ ۱۸۳۸ء

میں مولوی ولایت علی اور مولوی سلیم الدین (جو تحریک کے سرکردہ قائدین میں سے تھے) حیدرآباد آئے۔ مبارزالدولہ کے گھر میں مقیم رہے اور انھوں نے دیگر ساتھیوں کو مبارزالدولہ کا مخبر اور قاصد بنا کر انھیں مدراس، بنگلور، کرنول، جودھپور، بمبئی، بھوپال، لاہور سندھ اور دوسرے شہروں اور ریاستوں کو روانہ کیا۔ چنانچہ ان علاقوں میں تحریک کے حق میں زوردار سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ مختلف مقامات پر بھیجے گئے قاصد فقیروں کے بھیس میں بیانات اور خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے اور عوام میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا کرتے تھے۔ انہی کے ذریعہ نواب مبارزالدولہ مختلف ریاستوں کے حکمرانوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور منظم طریقوں سے بغاوت کے منصوبے کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اولاً انھوں نے اپنے حامیوں کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور کسی موزوں وقت پر مناسب اقدام کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اس سلسلے میں مبارزالدولہ اور کرنول کے نواب کی خط و کتابت سے پتہ چلتا ہے کہ کافی ہوشمندی سے اقدامات کی تیاری کی جارہی تھی۔

مہاراجہ جودھپور، مہاراجہ پٹیالہ، نواب آف بھوپال، نواب باندہ، نواب کرنول اور مبارزالدولہ نے ہندستان گیر بغاوت کا جو منصوبہ تیار کیا تھا وہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ جوں ہی روسی ہندستان پہنچیں (جس کی افواہیں عام تھیں) اپنی اپنی ریاستوں میں بغاوت کردی جائے۔ اس دوران اس وقت کے انگریز ریزیڈنٹ جنرل فریزر کو مبارزالدولہ اور نواب کرنول کی خفیہ مراسلت اور ان کے منصوبوں کا پتہ چل گیا۔ نواب کرنول غلام رسول خاں نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا تو ان کی سرکوبی کے لیے ۱۸۳۹ء میں کرنول پر فوج کشی کی گئی۔ نواب غلام رسول خاں کرنول نے انتہائی مختصر لیکن شدید مقاومت کے بعد ہتھیار ڈال دیے اور ان کو گرفتار کرلیا گیا۔ دوسری طرف مبارزالدولہ اور مولوی سلیم وغیرہ کو گرفتار کرکے ان کے خلاف ایک تحقیقاتی کمیشن ریزیڈنٹ کی جانب سے مبینہ سازش کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن کے تین اراکین انگریز تھے اور تین نظام سرکار کے نامزد کردہ تھے۔ کمیشن کے اجلاس جون ۱۸۳۹ء سے اپریل ۱۸۴۰ء تک ہوئے۔ بالآخر اس نے اپنا فیصلہ صادر کردیا کہ نواب مبارزالدولہ اور ان کے ساتھی وہابی تحریک کی حمایت میں تمام ہندستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف اور نظام حکومت کی مخالفت میں منظم طریقے سے سازش کرتے پائے گئے۔ مولوی سلیم اور ان کے ساتھیوں پر مقدمات چلائے گئے۔ مولوی سلیم کو چودہ سال کی قید اور ان کے ساتھیوں کو مختلف معیاد کی قید کی سزائیں دی گئیں۔ اور مبارزالدولہ کو گولکنڈہ کے قلعہ میں تیسری بار نظربند کردیا گیا اور وہیں ۱۸۵۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یہ کمیشن بالکل غیر قانونی اور اس کی کارروائی غیر آئینی تھی۔ "حیدرآباد افیرس" اور "دی انگلش مین" جیسے اخبارات نے بھی اس پر نکتہ چینی کی اور کمیشن کی قانونی حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے لکھا کہ، "وہابی سازش کیس کے ملزموں کے ساتھ جو ناانصافی روا رکھی گئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔" ان اخبارات نے یہ بھی لکھا تھا کہ کمیشن کے دو انگریز عہدیدار پولیس کے عہدے دار ہیں اور انہی کے بیانات اور دستاویزات پر مقدمہ تیار کیا گیا ہے اس لیے ان کی حیثیت فریق کی ہوئی اور کسی فریق کو کمیشن میں جگہ دینے کا قانونی جواز نہیں ہے۔ نظام کے نامزد کردہ اراکین کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا تھا کہ ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ انگریز اراکین کی رائے سے اختلاف کریں گے۔ جس طرح یہ کمیشن تشکیل دیا گیا تھا اس کی بنا پر اس سے انصاف کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

مقدمہ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کمیشن یا کسی دوسری عدالت نے ملزموں کو سزائیں نہیں سنائیں اس کے باوجود جھوٹی رپورٹ پیش کرکے فرنگیوں نے مجاہدین کو برسوں جیلوں میں مقید رکھا۔

مبارزالدولہ کے انتقال پر اس وقت کا ریزیڈنٹ جی اے بشبی ۲۶ جون ۱۸۵۴ء کو بڑی مسرت کے ساتھ معتمد امور خارجہ حکومت ہند کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"یہ شخص سابق نظام سکندر جاہ کا تیسرا ناجائز (ILLEGITIMATE) بیٹا اور موجودہ نظام ناصر الدولہ کا بھائی تھا، اس کو سرکاری قیدی کے طور پر ۱۸۴۰ء میں قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند رکھا گیا تھا کیونکہ وہاں وہابیوں کی مدد سے برطانوی حکومت اور سرکار نظام کا تختہ الٹنے کے منصوبے پر عمل درآمد کر رہا تھا۔"

مذکورہ خط میں مبارز الدولہ بہادر کو "ناجائز بیٹا" لکھا گیا ہے۔ جس سے انگریز ریزیڈنٹ کی کمینگی اور بغض و حسد ظاہر ہوتے ہیں۔ انگریز ریزیڈنٹ کا یہ خاصا تھا کہ جب کسی کو نظروں سے گرانا مقصود ہوتا تھا تو اس کے خلاف مذکورہ گالی باضابطہ طور سے سرکاری کاغذات میں درج ہونے لگتی تھی۔

حیدرآباد کی وہابی تحریک کو جنگ آزادی کی جدوجہد میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے جہاں مبارز الدولہ بہادر نے مسلمانوں کو منظم و متحد کرنے اور انگریزی فوج میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی وہیں ہندو رشیوں اور حکمرانوں سے رابطہ پیدا کر کے اس تحریک میں وسعت پیدا کی اور حیدرآباد کی انگریز دشمن طاقتوں کا رشتہ حیدرآباد کے باہر کی طاقتوں سے قائم کر کے پہلی بار وطن پرستوں کے ایک وسیع متحدہ محاذ کی بنیاد رکھی۔ ان کی شخصیت حیدرآباد ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے ہندستان کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

حواشی: ۱؎ حیدرآباد سے منسلک نیا شہر جو حیدرآباد کا حصہ ہے۔
۲؎ شہر سے چند کلومیٹر کی دوری پر واقع فوجی کیمپ۔

پروفیسر حفیظ بنارسی
صدر شعبۂ انگریزی، مہاراجہ کالج
آرہ

رباعیات

تسکینِ دل و جاں ہے نگارِ فطرت
ہر درد کا درماں ہے نگارِ فطرت
آغوشِ محبت لیے اک ماں کی طرح
ہر سمت نمایاں ہے نگارِ فطرت

ہے کتنی دلآویز زبانِ فطرت
سمجھے ہے اسے مرتبہ دانِ فطرت
کرنے لگا وہ سب سے محبت کا سلوک
جس دل پہ کھلا رازِ نہانِ فطرت

بلبل کی صدا اور یہ پھولوں کا شباب
یہ جامِ گل و لالہ یہ شبنم کی شراب
ہر لفظ میں ہے ایک جہانِ معنیٰ
اے کاش کہ پڑھتا کوئی فطرت کی کتاب

گلشن کی ادا مست بناتی ہے ہمیں
آئینۂ صد رنگ دکھاتی ہے ہمیں
اس طرح لچکتی ہے ہر اک شاخِ چمن
گویا کہ محبت سے بلاتی ہے ہمیں

اک سلکِ گہربار ہے یا ابرِ رواں
اک گیسوئے خمدار ہے یا ابرِ رواں
انداز وہی شوخی و مستی بھی وہی!
اک زلفِ طرحدار ہے یا ابرِ رواں

صہبائے زر و سیم سے مخمور ہیں ہم
کچھ بھی نہیں جس چیز پہ مغرور ہیں ہم
مغموم ہیں اس واسطے ہم آج حفیظ
فطرت کی بہاروں سے بہت دور ہیں ہم

سید غلام سمنانی
شعبۂ انگریزی، ڈاکٹر ذاکر حسین ایوننگ کالج
(دہلی یونیورسٹی)
اجمیری گیٹ، دہلی

محمد عثمان عارف نقشبندی
شخصیت و شاعری



یہ بات ۲ اگست ۱۹۷۷ء کی ہے۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں اس کو سمجھنے کے لیے میں ان سطور کے قارئین کو مزید تین سال پیچھے کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔ ہوا یوں کہ اواخر ستمبر ۱۹۷۶ء میں ہندستان کے اردو اخبارات میں ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی کہ حکومت اسپین نے مسجد قرطبہ مسلمانوں کو واپس کردی۔ اس میں اذان دی گئی اور جمعۃ الوداع کی نماز ادا کی گئی۔ بظاہر یہ تھی تو بہت معمولی سی خبر اور کسی نے اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی، لیکن اس خبر کے وسیع و عمیق مضمرات سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جو سرزمین یورپ پر ہسپانیہ میں مسلمانوں کے سات سو سالہ دور حکومت کا مطالعہ کرچکے ہیں۔ اور ان عظیم تمدنی، ثقافتی اور علمی احسانات کا پورا شعور رکھتے ہیں جو یورپ پر اسلام اور مسلمانوں نے کیے تھے۔ میرے دل و دماغ کو اس خبر نے شدید طور پر متاثر کیا۔ میری نگاہوں کے سامنے تاریخ نے ۷۱۱ء سے لے کر ۱۴۹۲ء تک کے اس عظیم و جلیل کارہائے نمایاں کا ایک ایک ورق الٹنا شروع کردیا۔ اقبال کی نادرالوجود نظم "مسجد قرطبہ" یاد آگئی اور اس کا یہ مصرعہ

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

ذہن میں گونجنے لگا۔ خیال یہ آیا کہ اگر اقبال زندہ ہوتے تو وہ محوسرت کی بے کرانیوں میں کھو جاتے اور یقیناً ان کی زبان قلم سے ان کا اظہار ایک دوسری عہد آفریں اور تاریخ ساز نظم کی شکل میں ہوتا۔ جذبہ و خیال کی یہ ایک رو تھی، جو آئی اور نکل گئی۔ لیکن اب جب میں سوچتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ فی الحقیقت ایسا نہیں تھا۔ میرے لاشعور نے اپنا عمل شروع کردیا تھا، جس کا نتیجہ میری نظم "مسجد قرطبہ کی واپسی" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نظم اسی زمانے میں روزنامہ "دعوت" دہلی اور مجلہ "معارف" اعظم گڑھ بابت ماہ نومبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ ارباب علم و فضل کے حلقہ میں اس نظم کی پذیرائی ہوئی اور اس کی تعریف و توصیف کا سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۷ء آگیا۔ اس زمانہ میں مرکزی وزارت اوقاف میں جناب حسن الدین احمد صاحب آئی۔ اے۔ ایس آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی تھے۔ موصوف نے میرے پاس ایک خط لکھا۔ نظم کی توصیف و تعریف کی اور مجھے اپنے در دولت پر آنے کی دعوت دی۔ اور صرف میری زبان سے اس نظم کے سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ موصوف کستوربا گاندھی مارگ (کرزن روڈ) پر قیام پذیر تھے۔ میں متعینہ وقت پر پہنچا۔ اس نشست میں میرے علاوہ جو دیگر صاحبان تھے ان میں جناب محمد عثمان عارف نقشبندی صاحب بھی تھے۔ ان کا کلام اردو کے جرائد و رسائل میں برابر

شائع ہوتا رہتا ہے۔ یہ ملاقات میرے لیے بہت ہی مسرت انگیز ثابت ہوئی۔ عارف صاحب ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ اس دور میں ان دونوں خصوصیات کا کسی فردِ واحد میں جمع ہو جانا ایک مشکل امر ہے۔ دراصل بات اس ماحول اور اس فضا کی ہوتی ہے جس میں انسان آنکھیں کھولتا ہے یہ باتیں مکتب کی کرامت نہیں بلکہ فیضانِ نظر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک عارف صاحب سے میرے تعلقات ایک نہج پر چلے آ رہے ہیں بلکہ ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

میری پہلی ملاقات عارف صاحب سے اس وقت ہوئی، جب وہ صرف راجیہ سبھا (ایوانِ بالا) کے رکن تھے اور اس وقت بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جب وہ مرکز میں نائب وزیر کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ مدارج کے اس فرق نے ان کی شخصیت کو متاثر نہیں کیا۔ ہوتا یوں ہے کہ عہدہ اور منصب کی کشش انسان کو بدل دیا کرتی ہے، اس کے معیار بدل جاتے ہیں۔ اندازِ فکر میں تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ عادات و اطوار میں فرق آ جاتا ہے اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نظریات میں بنیادی تبدیلی آ جاتی ہے۔ ان حالات میں انسان عجب تمکنت کا شکار ہو جاتا ہے، خود غرضی اور مفاد پرستی اس کا وطیرہ بن جاتا ہے۔ ہمدردی و دلسوزی کی دولت سے وہ محروم ہو جاتا ہے اور رواداری و محبت کی قدریں اس کا ساتھ چھوڑ کر اس کو اخلاقی طور پر مفلس بنا دیتی ہیں۔ لیکن عارف صاحب مستثنیات میں ہیں، جنھوں نے اپنے دامنِ حیات کو اس طرح کے گرد و غبار سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ان میں آج بھی وہی تواضع اور انکسار ہے جو پہلے تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ منصب کی بلندی نے ان قدروں میں اضافہ کر دیا۔ یہ ان کی عالی ظرفی، بلند حوصلگی، فراخدلی اور دل و دماغ کی وسعت کی دلیل ہے۔

میں اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو ہے تو بالکل ذاتی نوعیت کا لیکن وہ عارف صاحب کے کردار کے اس رُخ پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے اور میرے مدعا کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔ تین روز ہوئے کہ میرے وطن جونپور سے بذریعۂ ٹیلیفون یہ خبرِ وحشت اثر موصول ہوئی کہ میری ہمشیرہ محترمہ نے دو روز کی علالت میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ میرے اوپر تو بس ایک قیامت گزر گئی۔ ۱۹۷۷ء میں جب محترمہ والدہ صاحبہ نے داغِ مفارقت دیا تو ہم نے ہمشیرہ محترمہ ہی کو ان کا بدل سمجھا تھا، اور وہ بھی ہم سے اس قدر جلد جُدا ہو گئیں اور ہم ان کی شفقتوں سے محروم ہو گئے۔ الغرض میں اس سانحہ ناجعہ کی اطلاع پاتے ہی بچّوں کو لے کر فوراً جونپور کے لیے روانہ ہو گیا، چند دنوں کے بعد واپس آیا۔ اس زمانہ میں میرا قیام مغربی دلّی کے ایک علاقے کیرتی نگر میں تھا۔ ایک روز شام کو گھنٹی بجی، میں نے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ عارف صاحب تشریف لائے ہیں۔ عارف صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع میرے دوست و کرم فرما سردار سرجیت سنگھ لانبہ نے دی تھی جو میرے پڑوسی تھے اور جن کی آمد میرے یہاں اقبال و اسلامیات کے رشتہ سے برابر رہا کرتی تھی۔ جونپور سے میری واپسی کی اطلاع بھی عارف صاحب کو لانبہ صاحب ہی نے دی تھی۔ عارف صاحب میرے پاس میری دلجوئی اور تسلّی کے لیے تشریف لائے تھے۔ موصوف کچھ دیر تک بیٹھے رہے، تعزیت کی اور چلے گئے۔ لیکن میرے دل پر اپنی بزرگ منشی، تواضع اور حسنِ خلق کا ایک گہرا نقش چھوڑ گئے۔ آپ خود خیال فرمائیں کہ اخلاقی قدروں کی شکست اور محبت کے اس نامسزا بحرانی دور میں کس کو اتنی فرصت ہے کہ وہ کسی کی دلداری و غم گساری کرے۔ عارف صاحب جیسے لوگ مغتنماتِ روزگار میں سے ہیں جن کا کردار زبانِ حال سے یہ انتباہ کرتا رہتا ہے۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

عارف صاحب کی شخصیت کی تعمیر و پرداخت میں سیاست نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ موصوف ہندستانی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کے رکن رہے۔ مرکزی وزارت تعمیرات میں نائب وزیر رہے۔ یہاں میں موجودہ سیاست اور سیاستدانوں کے بارے میں اپنے افکار و خیالات کی بھی وضاحت کر دینا ضروری

سمجھتا ہوں۔ میں نہ تو موجودہ سیاست سے مطمئن ہوں نہ سیاست دانوں سے۔ میرے خیال میں سیاست کو بھی ایک ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا چاہئے۔ اس دور میں سارا انتشار، ساری توڑ پھوڑ اور ساری افراتفری سیاست کے بے لگام ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہاں ہر باطل حق ہوتا ہے، ہر جھوٹ سچ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں سیاست دانوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ عارف صاحب سے میری قربت کا سبب ان کی وہ بنیادی شرافتِ نفس ہے جو ان کی سیاسی سرگرمیوں کے باوجود پاک اور غیر آلودہ رہی۔ اس ضمن میں میں نے عارف صاحب اور ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم کے درمیان بڑی مناسبتیں اور مماثلتیں پائیں۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات سے کون ناواقف ہے۔ وہ احمد نگر جیل میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھیوں میں تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ وطن کی آزادی کے بعد بہار کی ریاستی کابینہ میں وزیر ترقیات و تعلیم رہے۔ مرکزی حکومت میں وزارت خارجہ سے متعلق رہے اور پھر راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ ان تمام بلندیوں اور رفعتوں کے باوجود مرحوم کی منکسر المزاجی اور وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ مجھے مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہی مدارات و تواضع، وہی شفقت و محبّت، وہی دلنوازی و ہمدردی وہی سادگی و سادہ دلی، وہی خرد نوازی و بزرگ منشی میں عارف صاحب میں بھی پاتا ہوں جو مجھے ڈاکٹر محمود صاحب میں نظر آتی تھی۔ یا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم کو قریب سے دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوا تھا کہ ہمارے سیاست دانوں میں ایسے بھی شریف النفس، کریم و خلیق افراد ہیں یا پھر آج عارف صاحب کو دیکھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے ایسے ہی افراد کے لیے کہا ہے اور بالکل صحیح کہا ہے کہ ؎

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

عارف صاحب سے میری قربت کا سب سے بڑا سبب ذوقِ شعر و ادب کی قدرِ مشترک ہے۔ موصوف سے پہلی بار شرفِ نیاز جن حالات میں حاصل ہوا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ شعر و سخن کی پیدا کردہ قربتوں نے عارف صاحب کو سمجھنے کے اور بھی مواقع فراہم کیے، اور میں نے محسوس کیا کہ عارف صاحب کی شخصیت و شاعری باہم دگر مربوط تھا۔ میرا معاملہ یہ رہا ہے کہ میں شعر کو شاعر کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اگر شاعر اپنی زندگی اور کردار میں بھی وہی کچھ ہے جو وہ اپنے شعر میں نظر آتا ہے تو وہ میرے نزدیک قابلِ عزّت و سزاوارِ احترام ہے۔ بصورتِ دیگر وہ منافق ہے اور اس کی پوری شاعری منافقت، وہ جھوٹا اور اس کی شاعری جھوٹی۔ میں نے ایسے شاعروں کو دیکھا ہے جن کا شعر کنگورہ عرش سے ٹکراتا ہے اور جن کے اشعار کی خوبی و زیبائی پر فلک، عقد ثریا نثار کرتا ہے لیکن جب زندگی و کردار کا معاملہ آتا ہے تو وہ وہاں ذرہ خاک سے بھی پست دکھائی دیتے ہیں۔ اب آپ خود انصاف کریں کہ ایسا شاعر تہذیب و ثقافت کی قیادت کیسے کر سکتا ہے اور ایسے اشعار تمدن و معاشرت کی اصلاح و ترقی میں کیونکر ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے شاعر کو یونہی "دیدہ بینائے قوم" نہیں کہہ دیا ہے۔ عرب شاعر سے جس شخص نے اپنی زبان میں مدحیہ قصیدہ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اس کا جو جواب اس نے دیا تھا اس کا مطلب یہی تو تھا کہ تم اپنے اندر اچھے اوصاف پیدا کرو تاکہ میں ان کا اظہار اپنے اشعار میں کروں۔ یعنی وہ شاعر سچی باتیں کہنا چاہتا تھا۔ ہمارے شاعروں کا یہ المیہ رہا ہے کہ وہ خود تو سچّے ہونے پر قادر نہیں ہوتے لیکن سچّی باتیں کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کردار کے پس منظر میں وہ سچی باتیں بھی جھوٹی ہو جاتی ہیں۔

شیخ الرئیس بو علی سینا کے متعلق اس وقت کے مستند صوفی اور عارف باللہ حضرت ابوسعید ابوالخیر کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے کہ آپ کی مجلس میں ایک روز بو علی سینا کی بات چلی تو آپ نے فرمایا کہ "اخلاق ندارد"۔ یہ بات بو علی تک پہنچی، اس نے بزعمِ علم، قلم برداشتہ اخلاق کے موضوع پر ایک رسالہ لکھ کر حضرت ابوسعید ابوالخیر کے پاس بھجوا دیا۔ آپ نے جب وہ رسالہ دیکھا تو فرمایا کہ میں نے یہ تو کہا نہیں تھا کہ "اخلاق نداند"۔ میں نے تو

اخلاق ندارد" کہا تھا۔ ہمارے شعرا اور فن کاروں کا بھی معاملہ یہی ہے کہ اخلاق ندارد۔ بہرحال یہ بحث تو بہت طویل ہے۔ میں آپ کو زیادہ دیر اس میں الجھانا نہیں چاہتا۔ میں فہم شعر کے لیے یہی طریقہ اور اصول اپناتا ہوں اور یہاں بھی میں نے اسی کو اپنایا ہے کیونکہ میں گمرہی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔ میں نے عارف صاحب کے اشعار کو سمجھنے کے لیے ان کے کردار کو وسیلہ بنایا ہے۔ اوپر ایک انسان کی حیثیت سے میں ان کے اخلاق و شمائل کا ذکر کر چکا ہوں۔ آپ خود تھوڑی دیر بعد عارف صاحب کے اشعار پڑھ کر میرے اس دعوے کی تائید کریں گے کہ وہ جتنے اچھے انسان ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔ عارف صاحب کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ موصوف کے والد محترم حضرت بیدل ایک خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے اور ان کی نسبت شاعری داغ دہلوی تک پہنچتی ہے۔ ضرورت ہے کہ حضرت بیدل کا کلام بھی شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو۔ عارف صاحب نے مختلف و متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کی نعتوں، نظموں، قومی نظموں اور رباعیات و قطعات کے مجموعے منظر عام پر آکر ارباب علم و فضل سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔

عارف صاحب مرکزی وزارت تعمیرات سے صرف وابستہ ہی نہیں رہے بلکہ انھوں نے اپنے حسین و جمیل اشعار کا ایک شہر بھی تعمیر کیا ہے۔ دیکھیے وہ اس کے کنگورے اور بلند و بالا مینار دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ ان کے "لمحوں کی دھڑکنوں کے شہر" میں داخل ہوں گے۔ اس کے قصر و ایوان آپ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے، اس کے نقش و نگار آپ کے لیے فردوس نگاہ ہوں گے۔ اس کے مرغزار و باغ آپ کے دامنِ دل کو کھینچیں گے، اور اس کے نغمہ آفریں شاخسار آپ کے لیے جنت گوش بن جائیں گے۔ (لمحوں کی دھڑکنیں" عارف صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے)۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ غزل صرف اردو اور فارسی زبان کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ اس صنف سخن نے جب فارسی سے اردو کی طرف سفر کیا تو اس دیار میں اپنے جملہ خدم و حشم کے ساتھ داخل ہوئی۔ اور اس نے اپنے دامن میں روایات و علامات اور تلمیحات و استعارات کے وہ پھول بھی سمیٹ لیے جو ہندستانی تہذیب و ثقافت کا عطیہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی رنگا رنگی اور بوقلمونی میں چار چاند لگ گئے۔ اور اب تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہندستان کی دوسری زبانوں بالخصوص ہندی نے بھی اس کو اپنا سرمایۂ افتخار بنالیا ہے۔ اس پر کچھ ایسے وقت بھی آئے کہ کبھی اس کو گل و بلبل کی داستان کہہ کر مسترد کر دیا گیا، کبھی اس کو نیم وحشی صنف بھی قرار دیا گیا اور کبھی اس پر تنگ دامنی اور ابہام کا الزام لگایا گیا۔ لیکن یہ صنف سخن اپنی نزاکتوں کے باوجود ان دشوار مراحل سے بھی فاتحانہ نکلتی گئی۔ اور اب اس کے سر کوئی بھی سنگین الزام نہیں ہے۔ آپ خود اندازہ کریں کہ برصغیر ہند و پاک میں اس کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔

غزل کہنا اتنا آسان بھی نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے، مخصوص علامتیں ہوتی ہیں اور اس کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ غزل کبھی بھی راست اندازی کو گوارا نہیں کرتی۔ اس میں جذبات و افکار کا اظہار رمز و ایما کے وسیلہ سے ہوتا ہے کیونکہ ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست
حدیث خلوتیان جز بہ رمز و ایما نیست

غزل کے حسن و کشش کا سارا راز اس کی ایمائی کیفیت اور سادگی میں مضمر ہے۔ یہ بھی حدیث خلوتیاں ہے لیکن یہ شرط یا پابندی اس کے امکانات کو محدود نہیں کرتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد و مختلف مسائل و معاملات، افکار و خیالات اور تجربات و واردات غزل کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہمیں متقدمین کے یہاں بھی ملتی ہیں اور متوسطین و متاخرین کے یہاں بھی۔ اور اس دور میں تو ظرف تنگنائے غزل" میں بحر بیکراں کی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ "لمحوں کی دھڑکنیں" میں عارف صاحب کی جو غزلیں آپ کے زیر مطالعہ آئیں گی ان میں آپ کو رمز و ایما اور سادگی کے

ساتھ ساتھ مضامین و موضوعات کا تنوع بھی ملے گا۔ تصوف و معرفت، حسن و عشق، حوصلہ و ہمت، تدبیرِ منزل، سرمستی و سرشاری، سیاسی اسرار و رموز، حقائق و معارف، خودداری و عزتِ نفس، اتحاد و یک جہتی اور عصری شعور ۔ یہ ساری باتیں بھی عارف صاحب کی غزلوں میں ملتی ہیں ۔

سرسری طور پر میرے انتخاب میں جو اشعار آتے ہیں انھیں میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرتا ہوں اور ان سے میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے ۔ آپ بھی محظوظ ہوں ؎

احترامِ حسن کہیے یا اسے رعبِ جمال
ان کا پردے سے نکلنا تھا کہ میں بیہوش تھا

تلاشِ یار میں کھو جائیں، یہ بھی ایک منزل ہے
نہیں یہ غم نہ پہنچے ہم سرِ منزل تو کیا ہوگا

خدا شاہد ہے عارف ہم نے طوفانِ محبت میں
کبھی موجیں نہیں دیکھیں کبھی ساحل نہیں دیکھا

نہ پوچھو سحر کاری جلوہ ہائے بزمِ دُنیا کی
مجھی پر چھائے جاتے ہیں مرا حسنِ نظر ہو کر

سرور ہے بہاروں کے مرے خون کا سہرا
آلودہ لہو سے ہیں گل و خار ابھی تک

اس چشمِ فتنہ گر کی سیاست تو دیکھئے
مائل بہ التفات نہیں، بے رُخی نہیں

نوازا ہے جب سے تمھاری نظر نے
میں ہوں آپ اپنے تماشائیوں میں

دو گھونٹ مے عیش پہ ملتے ہیں جہاں کے
ہم نے انھیں پیمانوں میں آنسو بھی پیے ہیں

جگا دے محبت کی دُنیا جگا دے
نظر ڈال دے دل کی گہرائیوں میں

دل مانتا نہیں کہ کوئی جلوہ گر نہیں
رنگینیٔ بہار فریبِ نظر نہیں

تھا میں ہی میں نقاب اُٹھانے سے پیشتر
اب تم ہی تم ہو اور مجھے کچھ خبر نہیں

جھنکار میں جام و مینا کی آواز ملا کر پیتا ہوں
وہ کیفِ ترنم ملتا ہے میں وجد میں آکر پیتا ہوں

یہ ظرف ہے عارف پینے کا یہ فیض ہے میرے پینے کا
مخمورِ زمانہ ہوتا ہے دنیا کو پلا کر پیتا ہوں

عیش و نشاطِ زیست تو دھندلا سا خواب ہے
آنا پڑا ہمیں ترے غم کی پناہ میں

کانٹوں پہ چل رہا ہوں محبت کی راہ میں
کس حُسن کی بہار ہے میری نگاہ میں

تمھارا عکس ہوں لیکن جہان پر!
حقیقت بن کے چھاتا جا رہا ہوں!

گریزاں ہو رہا ہوں ماسوا سے
خودی کو آزماتا جا رہا ہوں!

تمہاری نظر کے اشارے نئے ہیں
بڑے نئے زندگی میں سہارے ملے ہیں

اس کی تو ملے داد کبھی جانِ تمنا!
ہم تیری نگاہوں کے اشاروں پہ جیئے ہیں

طبیعت وہیں خود بخود مل گئی ہے
جہاں بھی کہیں غم کے مارے ملے ہیں

آدابِ محبت سے بڑے کام لیے ہیں
اے دامنِ ہستی ترے ... چاک سیئے ہیں

طوفانِ محبت میں ڈبویا ہی نہیں ہے
ہم کو تری نظروں نے سہارے بھی دیے ہیں

سمجھے تو باغباں یہ نشیمن نہیں جلا
اک داغ لگ گیا ہے چمن کی بہار میں

ہوتی ہے خیالوں ہی میں تنظیم چمن کی
کردار ہی بدلے ہیں نہ گفتار ابھی تک

مے کدہ کا حال کچھ ہو چشمِ ساقی کچھ کہے
ہے نظرِ عارف صراحی تک کسی کی جام تک

اہلِ چمن کی حرکتیں حد سے گزر گئیں
بدنام ہو رہا ہے بہاروں کا نام بھی

یہی کچھ دُور چل کر ایک ہی منزل پہ پہنچیں گے
لڑیں شیخ و برہمن کیوں عداوت درمیاں کیوں ہو

کنارا ڈھونڈنے والے کنارے ہی پہ مرتے ہیں
کبھی وہ لطفِ اندوزِ تلاطم ہو نہیں سکتے

آنکھیں تو ملا دیکھ ادھر گردشِ دوراں
جینے کا مزہ حوصلہ والوں کے لیے ہے

کچھ اُمنگیں نہ ترنگیں نہ تلاطم نہ خروش
موت ہے موت سفینہ لبِ دریا ہونا

ڈوبنے والے اُبھرنے کا سلیقہ ہے بھی
ڈوب جا غم میں کسی کو مگر آواز نہ دے

جُدا مینا و مے، پیمانہ و خُم ہو نہیں سکتے
جہاں ہم ہو نہیں سکتے وہاں تم ہو نہیں سکتے

خلوصِ دل سے ہوتا ہے خلوصِ باہمی پیدا
وفا جب تک ہے ہم میں بے وفا تم ہو نہیں سکتے

اُلفت نہیں، وفا نہیں، ہمدردیاں نہیں
انسانیت سے اتنا تو انساں نہ دُور تھا

کچھ سوز ہو کچھ درد ہو کچھ نور ہو دل میں
بس خاک کا پُتلا ہی تو انساں نہیں ہوتا

انسان جو ہیں آج وہ ماضی میں کیا نہ تھے
بدنام اس قدر تو وہ نامِ خدا نہ تھے

انسانیت کے نام پہ کچھ درد کچھ خلوص
توفیق ہو تو میرے پیالے میں ڈالیے

(... ...)

غزلیں

شمیم جے پوری
بنی سرائے۔ میرٹھ

یہ سوچتا ہوں یہی طرز اختیار کروں
کہ دوستوں سے بچوں دشمنوں سے پیار کروں

کہاں کے اپنے پرائے کہ اس زمانے میں
یہی بہت ہے کہ میں اپنا اعتبار کروں

خدا کرے تری قربت کبھی نصیب نہ ہو
تمام عمر یونہی تیرا انتظار کروں

مرا مقابلہ اب میرے دوستوں سے ہے
کوئی بتائے میں کس دل سے ان پہ وار کروں

حیات روٹھنے والی ہے لوٹ آ ورنہ
اب اتنا وقت نہیں ہے کہ انتظار کروں

جنوں سے پہلے ہی سب کچھ لٹائے بیٹھا ہوں
لباس ہی نہیں رکھتا جو تار تار کروں

اگر شمیم وطن کی زمیں لہو مانگے
تو خود میں اپنا لہو دے کے لالہ زار کروں

●

ڈاکٹر ساغر اعظمی
بارہ بنکی (یو۔پی)

●

لوگ کہتے ہیں محبت جسے کیا ہوتی ہے؟
یہ وہ نعمت ہے جو مشکل سے عطا ہوتی ہے

سچ تو ہے حق نہ ہوا ہم سے ادا تیرا اگر
اپنے بچوں سے کہیں ماں بھی خفا ہوتی ہے

قتل جو شخص ہوا اس کا کہیں ذکر نہیں
اور قاتل کے لیے روز دعا ہوتی ہے

آدمی پیار میں ایثار مجسم ہو اگر
جسم اور روح کی تب جا کے جلا ہوتی ہے

کیسے ان جلتے چراغوں کی حفاظت کی جائے
اب گھروں میں بھی بہت تیز ہوا ہوتی ہے

زندگی راہگذر ہے کوئی منزل تو نہیں
رہگذر کوئی ہو اک روز جدا ہوتی ہے

کتنے معصوم ہیں ساغر یہ مرے عہد کے لوگ
جس کو انعام سمجھتے ہیں سزا ہوتی ہے

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی
صدر شعبۂ اردو۔ مہاتما گاندھی کالج
سنبھل

سنبھل کے چند مجاہدینِ آزادی

روہیل کھنڈ جہادِ آزادی کی تاریخ میں منفرد و ممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اسی تاریخ ساز خطے کے ضلع مراد آباد کا قدیم ترین اور نامور قصبہ سنبھل، جو اب مراد آباد کمشنری میں شامل ہے، ماضی بعید میں اپنی تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور علم و دانش کے باعث فخرِ روزگار رہا ہے اور ناموسِ وطن، حریت و آزادی اور اتحاد و یک جہتی کی خاطر بھی ہمیشہ سرگرمِ عمل رہا ہے۔

مادرِ وطن کو غلامی کے شکنجے سے نجات دلانے، آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھنے والے سپوتوں کی یہاں کمی نہیں رہی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریکِ آزادی میں یہاں کے جیالوں نے نہ صرف تن من دھن کی قربانیاں دیں بلکہ اگلی منازل طے کرنے میں بھی پیچھے نہ رہے۔ آزادی کی خاطر سر پیش پیش رہنے والے مجاہدین کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے ملک و قوم کی آن کی خاطر عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ بیشتر مجاہدینِ آزادی کے حیات و کارنامے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ جو نام ہمارے لیے مشعلِ راہ ہو سکتے تھے آج ہم ان سے واقف بھی نہیں۔ لالہ چندولال، چودھری ریاست علی خاں، لالہ چیتن سروپ، مولوی عبدالوحید، مولانا محمد اسمٰعیل، منشی معین الدین انصاری، لالہ باسدیو، مولوی عبدالحق، مولوی سلطان احمد، لالہ روپ کشور اور نہ جانے کتنے سرفروشانِ وطن سنبھل کی سرزمین کو لالہ زار کرتے رہے اور بے مثال قربانیاں دینے کے بعد پیوندِ زمین ہو گئے۔ اس قافلے کے افراد نے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں، بے پناہ ظلم و ستم بھی برداشت کیے، دربدر کی خاک بھی چھانی، گھر بار بھی لٹایا اور دار و رسن کو بھی لبیک کہا، اور ابتلا و آزمائش سے بھی دوچار ہوئے۔ لیکن حق گوئی و بے باکی کی اس راہ پر چلتے رہے جو ملک و قوم کی خاطر انھوں نے خود پسند کی تھی۔ ہر آزمائش ان کے حوصلے بڑھاتی رہی، ہر امتحان ان کے عزائم مستحکم کرتا رہا، اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ڈٹے رہے، لڑتے رہے اور کامیابی حاصل کر کے ہی دم لیا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان مجاہدینِ آزادی کی حیات اور کارناموں کے کوائف منظرِ عام پر لانے کی کوشش کریں، اور ملک و قوم کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے مجاہدوں کی تاریخ مرتب کریں تاکہ نئی نسل ان کی خدمات سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کر کے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تحریک حاصل کرے۔

اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر راقم السطور نے سنبھل کے گمنام و غیر معروف مجاہدینِ آزادی کے کوائف قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل، منشی معین الدین انصاری کے سوانحی حالات 'نیا دور' میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں چودھری ریاست علی خاں، مولوی عبدالحق اور مولوی سلطان احمد کے حالاتِ زندگی پیش کیے جا رہے ہیں۔ دیگر مجاہدینِ آزادی کے

بارے میں ان شاء اللہ آئندہ لکھا جائے گا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مرحومین کے سوانحی حالات ان کے قریبی اعزّا سے حاصل کیے گئے ہیں۔

چودھری ریاست علی خاں

سنبھل کے جانباز سپوتوں و سرفروشوں میں چودھری محمد ریاست علی خاں کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا تعلق چودھری سرائے کے ایک معزز و ذی حیثیت خاندان سے ہے ان کے والد ماجد چودھری ممتاز علی خاں مسلم راجپوت تھے، اور عمائدین شہر میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں ان کے گھر میں ایک ایسے لڑکے نے جنم لیا جو بعد میں چودھری محمد ریاست علی خاں کے نام سے مشہور و ممتاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولنے کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔ عیش و عشرت کے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود بچپن ہی سے وطن پرستانہ جذبات موجزن ہونے لگے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ نشۂ حبِ قومی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب ان کی عمر بیس سال بھی نہیں ہوئی تھی، وہ میدانِ کارزار میں کود پڑے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سنبھل میں تحریکِ آزادی عہد طفلی سے عہد شباب میں داخل ہو رہی تھی۔ لالہ روپ کشور، لالہ چندولال، مولانا محمد اسماعیل، مولوی عبدالقیوم برطانی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں پیش پیش تھے اور یہاں کا گھر گھر متاثر ہو رہا تھا۔ برطانوی سامراج کے درندہ صفت نمائندے شمع آزادی کے پروانوں پر مظالم ڈھا رہے تھے، سنبھل کے سرفروشانِ وطن بھی ان کی نگاہ میں بُری طرح کھٹک رہے تھے۔ ایک طرف جیالے سپوت مادرِ وطن کو برطانوی شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے تو دوسری طرف انگریز آقا انھیں تہہ تیغ کرنے کی گھات میں تھے۔

سنبھل کے مجاہدین آزادی بھی نشانہ بنے اور انھیں ان کے ارادوں سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جانے لگی، ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ بھی توڑے گئے، عیاری و مکاری سے بھی کام لیا گیا اور ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جو ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکتا تھا لیکن ہر کوشش ناکام ہوئی اور ہر حربہ بیکار گیا۔ مجاہدین آزادی کے پائے استقامت ڈگمگائے نہیں۔ وہ نئی توانائی اور نئے عزائم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ خلافت تحریک نے تحریکِ آزادی میں نئی رُوح پھونکی۔ وہ تحریک جو چند سرفروشوں کی رہینِ منت تھی، خلافت تحریک کے اثر سے عوامی تحریک بن گئی۔ انگریز سے نفرت اور تحریک آزادی میں شمولیت کا جذبہ عام ہونے لگا۔ انگریز آقاؤں نے جیل خانہ کا دروازہ کھول دیا۔

دوسرے مجاہدین آزادی کے ساتھ چودھری محمد ریاست علی خاں بھی سرگرم عمل تھے۔ کبھی چھپ کر اور کبھی اعلانیہ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دینے میں مصروف تھے کہ دستور ہند کی دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیے گئے اور مراد آباد جیل میں قید کر دیے گئے۔

۸ اپریل ۱۹۲۲ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد وہ پھر اپنے مشن میں لگ گئے۔ تحریک آزادی کو منظم کرنے، انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور عوام میں آزادی بیدار کرنے کرنے کا کام جاری ہی تھا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی۔ اور دو سال قید بامشقت کی سزا ملی۔ جیل میں بان بٹنے اور چکی پیسنے کا کام سپرد کیا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں جیل سے رہا ہونے کے بعد چودھری ریاست علی خاں نے زمینداری سے کنارہ کشی اختیار کر کے فقیری لے لی، اور زندگی کے آخری سانس تک قومی خدمات میں لگے رہے۔

۱۹۶۹ء کی ۱۵ مارچ کو ۷۵ سال کی عمر میں شمع آزادی کا یہ پروانہ ابدی نیند سو گیا اور آبائی قبرستان میں اپنے دادا بہار الدین کے پہلو میں سپرد خاک ہوا۔ چودھری سرائے میں واقع قبر پر تاریخ وفات کندہ ہے۔

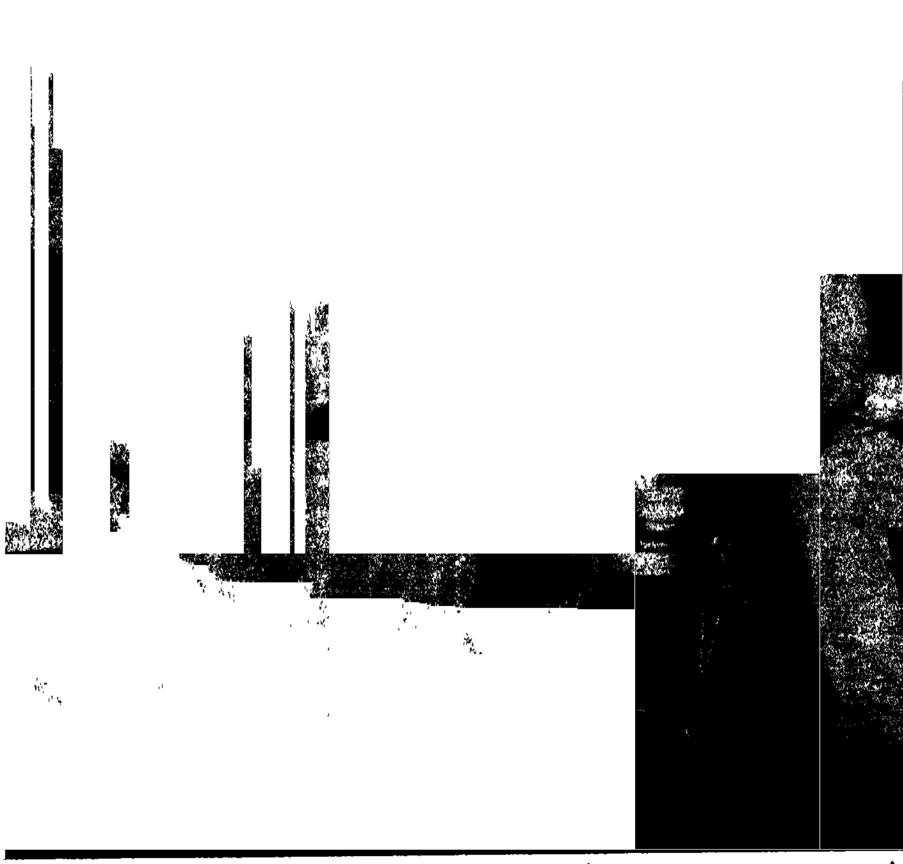
چودھری ریاست علی خاں کی تین اولادیں ہوئیں۔ محمد ابوبکر خاں، محمد عمر خاں اور بلقیس بیگم۔ بڑے صاحبزادے محمد ابوبکر خاں

سنبھل میں مقیم ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے اور صاحبزادی پاکستان میں ہیں۔

قاری عبدالحق

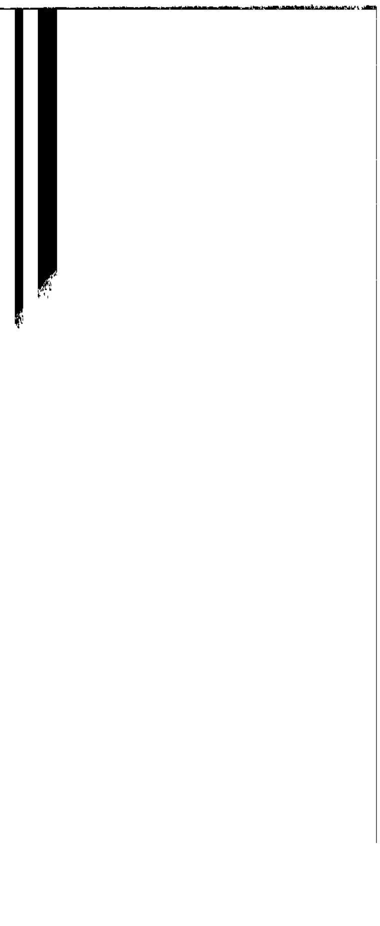
سرگرم مجاہد آزادی قاری عبدالحق نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کی روشن مثال تھے۔ کردار کے غازی، عمل کے مجاہد، انسانیت کے پرستار، مذہب کے شیدائی، حق و صداقت کے پیکر قاری عبدالحق مرحوم مادر وطن کے ان جیالے سپوتوں میں سے ایک تھے جن کی پوری زندگی قربانی و ایثار سے عبارت ہے۔ وہ ۱۸۸۰ء میں سرائے ترین کے ایک ذی عزت گھرانے میں پیدا ہوئے۔
قاری صاحب کے والد الحاج عبداللہ بہترین امانت دار اور ممتاز تاجر تھے، ان کا انتقال مکہ معظمہ میں ہوا۔ ان کے وصال کی خبر ایک درویش نے دی تھی جو ان کے دروازے پر جذب کی حالت میں پڑا رہتا تھا۔ قاری صاحب کی والدہ حافظ محمد رفیق کی صاحبزادی تھیں اور خود بھی حافظ تھیں۔ حافظ محمد رفیق اپنے وقت کے جید عالم تھے، ان کے شاگرد دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ قاری صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند چلے گئے جہاں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے ایک قریبی ساتھی مولوی حبیب اللہ شاہجہانپوری کے ہمراہ قیام کرنے کا موقع ملا، وہاں قرآن پاک حفظ کیا۔ بعد ازاں قاری حمید اللہ سنبھلی اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے استاد قاری عبداللہ مراد آبادی سے استفادہ کیا۔ مراد آباد کے قیام کے دوران حافظ عبدالرحمٰن مراد آبادی سے قربت بڑھی جو عقیدت کا روپ اختیار کر گئی۔ حافظ عبدالرحمٰن حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی کے خلیفہ تھے۔ سائیں توکل شاہ حاجی امداد مہاجر مکی کے خلیفہ تھے۔ قاری صاحب کا حافظ عبدالرحمٰن سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ سرائے ترین سنبھل سے مراد آباد تک اکثر و بیشتر پیدل اور کبھی کبھی سائیکل سے ملاقات کرنے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں قاری صاحب کے دل میں حج کا شوق پیدا ہوا۔ سفر کیلئے کچھ پاس نہ تھا، صرف ایک پیسہ جیب میں پڑا ہوا تھا لیکن جذبہ شوق زیارت اتنا بڑھا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی اجازت لے کر چل پڑے۔ حافظ جی نے اپنے پیر حاجی محب الدین مکی کو تعارفی رقعہ لکھ کر دیا جو قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مکہ معظمہ میں خلیفہ تھے، وہاں ایک سال قیام کیا۔ قیام کے دوران قاری عبدالحق نے دعائے حزب النجر کا عمل حاصل کیا اور عامل کامل بن کر واپس آئے۔

حافظ عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد قاری عبدالحق نے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کی اور یہیں سے ان کی زندگی میں انقلاب آیا۔ روحانیت و مذہبیت کے علمبردار سیاست و وطنیت کی طرف راغب ہوئے۔ مولانا مدنی کی فعال و متحرک شخصیت سے وہ اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ تحریک آزادی کے سرگرم و بے لوث مجاہد بن کر ابھرے۔ مولانا مدنی کی رہنمائی و سرپرستی میں کانگریس اور جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے خدمت وطن میں جی جان سے لگ گئے۔ سول نافرمانیوں کی تحریک میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور انھوں نے ۹ ماہ کی قید بامشقت کاٹی۔ رہا ہونے کے بعد حصول آزادی تک وہ اسی جذبہ سے متاثر رہے۔ مصائب و آلام کا سامنا کیا۔ ایثار و قربانی سے کام لیتے رہے۔ پریشانیوں اور تکلیفوں کو دعوت دیتے رہے لیکن جو قدم اٹھ چکے تھے، پیچھے نہیں ہٹائے۔
ہندستان آزاد ہونے کے بعد قاری عبدالحق نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مذہبی کاموں میں مصروف ہو گئے پہلے مدرسی و معلمی کا فریضہ انجام دیا پھر خدمت خلق کی خاطر تعویذ و عملیات کا سلسلہ شروع کیا جو تا دم آخر جاری رہا۔
قاری عبدالحق مرحوم کی خدمات کے صلے میں ریاستی حکومت نے انھیں تامر پتر سے بھی نوازا، اور مرکزی و ریاستی حکومت کی جانب سے پنشن بھی دی گئی جو تا حیات جاری رہی۔
یکم ستمبر ۱۹۸۴ء کو مادر وطن کا یہ سرگرم مجاہد ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ اتوار ۲ ستمبر کو صبح ۹ بجے آبائی قبرستان میں



رنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف ۲۱ جولائی ۱۹۸۵ء کو راج بھون میں مشہور و ممتاز ہندی ادیب شری امرت لال ناگر سے گفتگو کرتے ہوئے۔

رنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف ۱۲ اگست ۸۵ء کو راج بھون میں تنزانیہ ہائی کورٹ کے جسٹس شری دیو کپور سے محو گفتگو ہیں۔





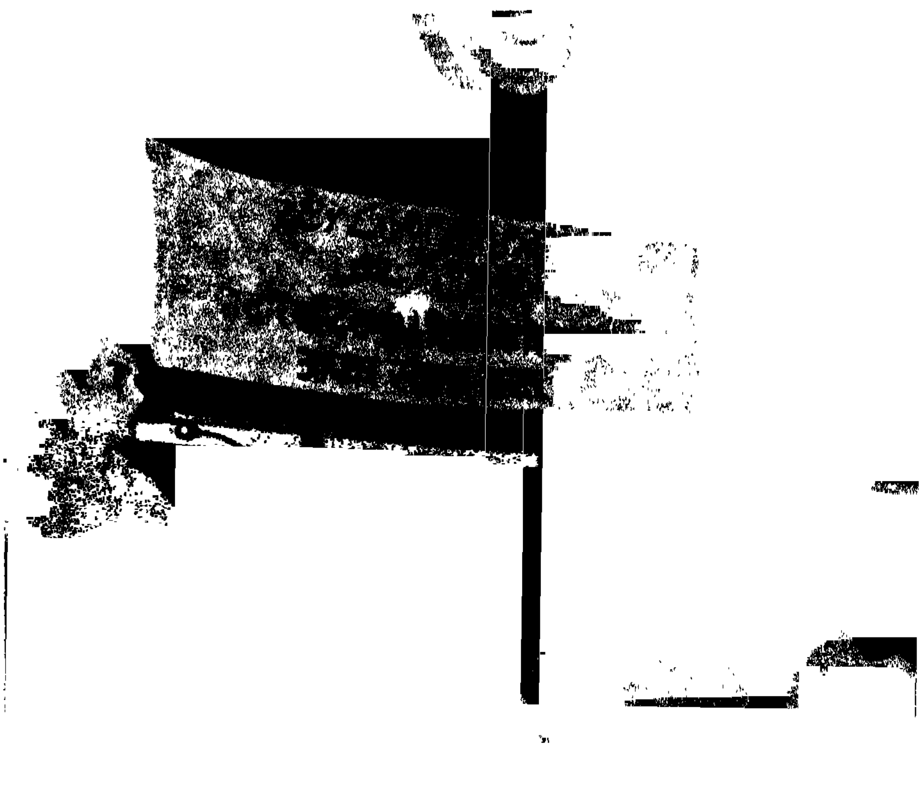
وزیر اعلا اترپردیش شری نرائن دت تیواری نے ۶ راگست کو لکھنؤ میں نیا دور کے اندرا گاندھی نمبر کی رسم اجرا ادا کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے، جس میں ایڈیٹر نیا دور انھیں نمبر کی ایک جلد پیش کر رہے ہیں۔ وزیر ریاست برائے اطلاعات شری حکم سنگھ اور وزیر ریاست برائے مال شری گوری شنکر بھی تصویر میں نظر آرہے ہیں۔

رسم اجرا کے موقع پر حاضرین کا ایک منظر



مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری وی۔ این گیڈگل کو نیا دور کے اندرا گاندھی نمبر کی ایک جلد ایڈیٹر نیا دور نے ۲۲ اگست ۱۹۸۵ء کو دہلی میں پیش کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔ جس میں دہلی کے ریذیڈنٹ ڈائرکٹر (یوپی) شری کے۔ کے بھال بھی نظر آ رہے ہیں۔

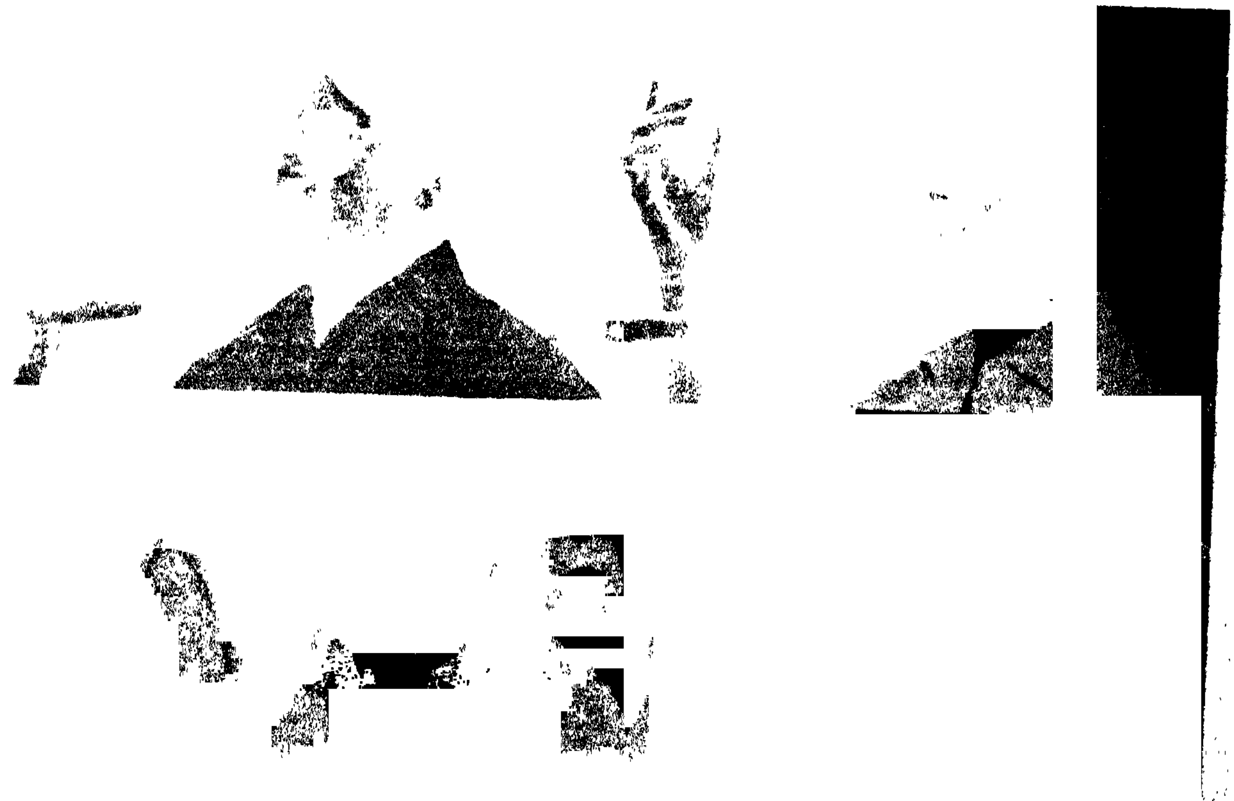
ڈائرکٹر اطلاعات (یوپی) شری پرشانت کمار مشرا نیا دور کے اندرا گاندھی نمبر کی رسم اجرا کے موقع پر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔





وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری منطقائی ترقیاتی کارپوریشن نینی تال کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے۔

بزمِ ثاقب (لکھنؤ) کی جانب سے کے۔ کے ہائیر سکنڈری اسکول (بھدیواں) میں ۱۵ اگست ۸۵ء کو مشہور و ممتاز شاعر
جناب حسن کمال اور جناب ظفر گورکھپوری کے اعزاز میں منعقدہ خصوصی شعری نشست کا ایک منظر



تدفین ہوئی ۔

قاری عبدالحق مرحوم نے چار شادیاں کیں اور چودہ اولادیں ہوئیں۔ ایک صاحبزادے عبدالخالق اور ایک صاحبزادی مسماۃ اللہ دی بیگم حیات ہیں۔ مرحوم کو نثر نگاری میں بھی ملکہ حاصل تھا اور نظم نگاری میں بھی۔ ایک منظوم تصنیف "مسدس حق" مرحوم کی یادگار ہے۔

مولوی سُلطان احمد

مولوی سلطان احمد ان مجاہدین آزادی میں تھے جنھوں نے ساری عمر ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کیے بغیر ملک وقوم کی خدمت کی اور گوشۂ گمنامی میں جا پڑے۔ انھوں نے اس عہد کو زندگی کی آخری سانس تک نبھایا جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے کیا تھا۔

مولوی سلطان احمد کا تعلق قدیم ترک برادری سے تھا۔ وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں محلہ دیپا سرائے کے ایک ذی حیثیت خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام جمیل احمد تھا۔ ابتدائی تعلیم سنبھل ہی میں حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی قومی تحریک میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند نے شاردا بل کے خلاف امروہہ میں زبردست جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت مولانا معین الدین اجمیری نے کی۔ اس جلسہ کے بعد جس میں سنبھل کے چند نوجوان شریک تھے سنبھل میں کانگریس کا جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا گیا جس میں ایک بندر کو سوٹ پہنا کر ایک آدمی کی گود میں بٹھانے اور دونوں کو گدھے پر سوار کرکے شہر میں گھمانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گدھے پر ایک بورڈ لٹکانے اور اس پر وائسرائے کا آخری انجام لکھنے کی اسکیم تیار ہوئی۔

جلوس کی تیاری زور و شور سے کی گئی۔ بزرگوں نے سخت مزاحمت کی، لیکن تقریباً ساٹھ کم عمر نوجوانوں نے یہ مشکل کام انجام دیا۔ قلمی اشتہار لکھے گئے۔ ایک پرچہ میونسپل بورڈ کے چیرمین کے ہاتھ لگ گیا۔ انھوں نے جلوس رکوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔

جلوس کوتوالی کے سامنے سے ہوتا ہوا شہر کے بازاروں سے گزرا۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا اور تحریک میں نئی جان پڑ گئی۔ اس وقت تقریباً سو افراد گرفتار کر لیے گئے جن میں مولوی سلطان احمد بھی شامل تھے۔ انھوں نے پولیس کی مار بھی کھائی اور ہاتھا پائی کی وجہ سے سخت زخمی بھی ہوئے۔ چوٹ کے نشان آخر دم تک انگریز کے جور وظلم کی یاد دلاتے رہے۔ بعد ازاں انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی اور جمعیۃ علماء کے دفتر میں فتویٰ نویسی اور مسجد [illegible] بہا میں قرآن کا درس دینے لگے۔ اسی زمانے میں جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی میں حکومت وقت کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اور مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شامل ہونے کی ترغیب دینا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔

جون ۱۹۳۳ء میں چیف کمشنر دہلی نے انھیں دہلی بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ پولیس نے انھیں شام کو ایک گاڑی میں بٹھا کر بارہ میل دور ایک ویران اور تاریک مقام پر چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ وطن واپس آگئے اور دیہی و قصباتی علاقوں میں یہی فریضہ انجام دینے لگے اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔

وہ ۱۹۳۷ء میں شہر کانگریس کمیٹی سنبھل کے صدر چنے گئے۔ اپنے دور صدارت میں انھوں نے متعدد عوامی جلسوں کا اہتمام کیا، جس سے مسلمانوں میں کانگریس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ انھوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندو مسلم اتحاد کی [illegible] کوششیں کیں اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ ان کی مساعی جمیلہ سے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی جوق در جوق تحریک آزادی میں نمایاں طور سے حصہ لینے لگے۔

حصول آزادی کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور قرآن پاک کی تعلیم اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے جس کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔ تقریباً نصف صدی تک قوم و ملک کی بے مثال خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳ اگست ۱۹۸۴ء کو راہی ملک عدم ہوئے اور آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ **

معجز سنبھلی
دیپا سرائے سنبھل
ضلع مرادآباد

ہندوستان والو!

مل کر خوشی مناؤ ہندوستان والو
نغمے خوشی کے گاؤ ہندوستان والو
دل سے دوئی بھلاؤ ہندوستان والو
ہر اک سے دل ملاؤ ہندوستان والو
ہندوستان والو!
ہندوستان والو!

اب اپنا گلستاں ہے اب اپنا باغباں ہے
اپنے ہیں راز سارے اپنا ہی رازداں ہے
اپنی ہی سرزمیں ہے اپنا ہی آسماں ہے
دنیا کو یہ بتا دو ہر حوصلہ جواں ہے
ہندوستان والو!
ہندوستان والو!

آزادیٔ وطن کی رکھنا ہے لاج تم کو
اب اپنے اس چمن کی رکھنا ہے لاج تم کو
عظمت کی بانکپن کی رکھنا ہے لاج تم کو
ہر ایک انجمن کی رکھنا ہے لاج تم کو
ہندوستان والو!
ہندوستان والو!

آزادیٔ وطن کا دن اس طرح مناؤ
ہر گوشۂ وطن کو اخلاق سے سجاؤ
دشمن کی بدنظر سے اپنا وطن بچاؤ
معجز کی یہ تمنا ہر ایک کو سناؤ
ہندوستان والو!
ہندوستان والو!

ظفر مرزاپوری
گلی میدان۔ ولیسلی گنج
مرزاپور۔ ۲۳۱۰۰۱

بھارتی بچّے

پھولوں سے بھی ہیں کومل معصوم بھولے بھالے
ان کی ادا ہے پیاری گورے ہوں یا ہوں کالے
ان کی ہنسی پہ قرباں ہیں بھور کے اُجالے
چھل جانتے نہیں ہیں الفت کے ہیں شوالے
بچے ہیں گھر کی زینت ہر شے سے ہیں نرالے
جو چاہے پیار دے کر اپنا انھیں بنالے

دل کا قرار کہیئے آنکھوں کے ہیں ستارے
مفلس کے بھی ہیں پیارے زردار کے ہیں پیارے
غمگیں سی زندگی میں خوشیوں کے ہیں منارے
آنکھوں کو بخشتے ہیں آشاؤں کے نظارے
اک دن جوان ہو کے بچے یہی ہمارے
کام آئیں گے وطن کے ہوں گے یہی سہارے

نہرو یہی بنیں گے گاندھی یہی بنیں گے
اکبر، ظفر اور ٹیپو کی زندگی بنیں گے
چشتی سے نور لے کر یہ روشنی بنیں گے
تلسی سے گیان لے کر یہ آدمی بنیں گے
مذہب ہو کوئی لیکن یہ بھارتی بنیں گے
یہ مادرِ وطن کی خاطر خوشی بنیں گے

یہ شانتی کی لَو کو ہونے نہ دیں گے مدھم!
گنگ و جمن ہیں پیارے، پیارا ہے آبِ جہلم
بھارت میں سب ہیں اپنے سب کے بنیں گے ہمدم
زخمی دلوں کی خاطر ہو جائیں گے یہ مرہم
ہونے نہ دیں گے اپنی ماں کا مزاج برہم
بھارت کی ایکتا کا اونچا کریں گے پرچم



ہماری آزادی اور ترقی کا بڑھتا ہوا کارواں

محمد زمان عارف
بیکانیر (راجستھان)

آج سے ۳۸ سال قبل آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعہ پر ترنگا پرچم لہرایا تھا۔ انھوں نے ملک کو ایک نئی زندگی اور رہنمائی دی تھی۔ اسی ترنگے پرچم کے سائے میں ہمارے وطن کے لوگوں نے آزادی کی لڑائی لڑی اور اس کے وقار کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ آج کے دن ہمیں بے ساختہ اپنے ان شہیدوں کی یاد آتی ہے جن کی قربانیوں کے نتیجے میں ہمارا ملک آزاد ہوا۔ اس موقع پر میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

یوم آزادی خوشی اور امنگوں کا دن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی خود احتسابی کا دن بھی ہے اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے عزم کرنے کا دن بھی ہے۔ شہیدوں کو محض رسمی طور پر یاد کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ہمیں ان کے خوابوں کے مضبوط اور خوشحال ملک کی تعمیر کرنا ہے۔ اس لیے ہمیں وطن پرستی قربانی اور ملک کی خدمت کے جذبے کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اتارنا ہوگا۔

ہمیں اپنی آزادی کی بھاری قیمت چکانا پڑی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم آزادی کی قیمت کو سمجھیں اور ہر حال میں اس کی حفاظت کے لیے تیار رہیں۔ اس کے لیے ہمیں ان خطروں کو پہچاننا ہوگا جن سے ہماری آزادی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ہمیں بیرونی اور اندرونی دونوں قسم کے خطرات سے چوکس رہنا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ملک کے اندر علاحدگی پسند، فرقہ پرست دہشت پسند، توڑ پھوڑ کرنے والی طاقتیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے اور ہر قیمت پر نظم و ضبط نیز اتحاد برقرار رکھنا ہے۔ ہمیں یہ بات خاص طور سے یاد رکھنا ہے کہ تاریخ کے طویل دور میں جب بھی ہم میں اتحاد اور نظم و ضبط کم ہوا ہم کمزور ہوئے اور جب ہم میں اتحاد رہا، نظم و ضبط برقرار رہا، ہم مضبوط ہوئے ہیں اور ملک آگے بڑھا ہے۔ ہمارے محبوب رہنما اور فعال وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے پنجاب اور آسام کے پرانے مسئلے کو بات چیت کے ذریعہ قومی مفاد میں جس کامیابی کے ساتھ حل کیا ہے اس کے لیے پورا ملک ان کا احسان مند ہے۔ ہم سب کو ان کی قیادت پر ناز ہے۔

آزادی کے بعد کے برسوں میں ہمارے ملک نے متعدد میدانوں میں ایسی کامیابی حاصل کی ہے جس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔ کسان بیدار ہوئے ہیں۔ ان کی محنت و مشقت سے زرعی پیداوار بڑھی ہے۔ دوسری جانب مزدوروں کی محنت سے ملک کی معاشی اور صنعتی بنیاد مستحکم ہوئی۔ سائنس کے میدان میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ ہم نے آسمان کے رازہائے سربستہ کو پا لیا ہے۔ پر امن مقاصد کے لیے کامیاب ایٹمی تجربہ بھی کیا ہو۔ مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے ہیں۔ اور قطب جنوبی میں ہماری مہم جو ٹیمیں گئیں اور وہاں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی جب سرحدوں پر خطرہ پیدا ہوا ہماری فوج کے بہادر جوانوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کے حوصلے پست کر دیے۔

ملک کو مضبوط بنانے اور آگے بڑھانے کا سہرا ملک کے اولین وزیراعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی ان بنیادی پالیسیوں کے سر جاتا ہے جنھیں آنجہانی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بھی اپنایا اور آگے بڑھایا اور اب ہمارے محبوب وزیراعظم شری راجیو گاندھی کی قیادت میں بھی ملک اسی راستے پر گامزن ہے۔ اس سے ملک کو ترقی کی منزلوں کی جانب آگے بڑھانے اور ملک کے عوام کو خوشحال بنانے میں یقیناً مدد ملے گی۔

اسپیشل کمپوننٹ پلان کے تحت ۵۰۔۵ لاکھ خاندانوں کو مستفید کیا گیا ہے۔ ریاست میں قبائل درج فہرست کی ہمہ گیر ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ایک علاحدہ قبائلی ترقیاتی نظامت قائم کی گئی ہے۔ قبائل کی تہذیب کو برقرار رکھتے ہوئے انھیں قومی ترقی میں حصہ دار بنانے کے سلسلے میں ۳۱۵۵ قبائلی خاندانوں کو خط افلاس سے اوپر اٹھانے کے لیے دیگر نوعیت کی امداد کے ساتھ ہی انھیں مالی امداد بھی مہیا کی گئی۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ ملک اور ریاستوں کی تیز رفتار ترقی اور سماج کے کمزور طبقوں نیز دبے کچلے لوگوں کو سماجی معاشی انصاف دلانے کی راہ میں ہمیں ابھی لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اور تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہے۔ ہمارا ملک مختلف اقسام کے پھولوں سے سجے ہوئے ایک خوبصورت گلدستے کی طرح ہے۔ اس کے مسائل بھی مختلف ہیں۔ انھیں محض حکومت اور اس کا عملہ ہی حل نہیں کر سکتا۔ مسائل کو حل کرنے اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سبھی طبقوں کا باہمی تعاون ضروری ہوتا ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں ہاتھ بٹانے کے لیے سماج کے سبھی طبقوں کو مل جل کر کام کرنا ہے۔

نوجوانوں کے بین اقوامی سال کے موقع پر ہمیں ایسے شہریوں اور نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں وطنیت اور انسانیت کا جذبہ ہو جو علاقائیت، اونچ نیچ اور ذات پات کے محدود دائروں سے بالاتر ہوں، جو سماجی برائیوں کو دور کرنے میں پہل کریں، جن میں ملک کے لیے کچھ کر گذرنے کی للک ہو۔ اگر ہمیں ایسے شہری تیار کرنے ہیں تو اپنے معیارِ تعلیم کو ہمیں بہتر بنانا ہوگا۔ اس کے علاوہ والدین کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کردار سازی پر توجہ مرکوز رکھیں اور انھیں اعلا کردار بنائیں۔

ہمیں ایک ایسا ہندستان تعمیر کرنا ہے جو ہر لحاظ سے مضبوط اور طاقتور ہو، جس کی پاکیزہ دھرتی کی جانب کوئی دشمن ناپاک ارادے سے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ایک ایسا ہندستان جس کی ترقی کا کارواں مسلسل آگے ہی بڑھتا رہے، جو تمام عالم کی انسانیت کی خدمت کر سکے۔ اس موقع پر ہمیں اپنی آزادی اور ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے اتحاد اور نظم و ضبط قائم رکھنے اور ایک نئے ہندستان کی تعمیر کے لیے شانہ سے شانہ ملا کر محنت کرنے کے عہد کو دہرانا ہے۔ سماجی اور معاشی مسائل حل کرنے میں ہمارا کردار کیا رہا ہے اس کا تجزیہ آئندہ نسلیں کریں گی۔ ہمیں اس سلسلے میں کھرا اترنا ہے۔ وقت انسانی کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے کردار و عمل سے ہندستان کو موجودہ اور آئندہ وقتوں کے لیے بہتر اور مضبوط تر بنانا ہے۔

جمال کیف
بی. ڈی. کالج کالونی
روڈ ۸، کوارٹر ۳
پٹنہ ۔ ۱۴

فرقہ وارانہ ہم آہنگی

ایک ہو کر
غلامی کی زنجیریں توڑ دینے والی
سرفراز قوم کے نام پر
داغ ہیں وہ
بدنما داغ
جو دلوں میں
کدورت کے بیج بوتے ہیں
ان کا وجود
اک بوجھ ہے، بھاری بوجھ
ارضِ گیتی کے لیے
ان کی ہر نفس
زہریلی پھنکار
ان کی اٹھائی ہوئی
یہ نفرت کی دیوار
ایک چیلنج ہے ہر ایک دل کے لیے
کس سے کہیں، ہم کس کو بتائیں
کوئی بھی پھول
نہ ہندو ہوتا ہے اور نہ مسلمان
نہ سکھ نہ عیسائی
پھر کیوں نہ ہم بن کے رہیں
ہر پھول کی رعنائی

وہ زمین ہی کیا
جو ہموار نہیں ہے
وہ آدمی ہی کیا
جو صاحبِ کردار نہیں ہے
دوستو!
وہ زندگی ہی کیا
جس میں پیار نہیں ہے

کوئی بھی دھرم کوئی بھی مسلک
کب سکھاتا ہے دشمنی کا چلن
بوئے گل کے لیے
کہاں مخصوص ہے کوئی چمن
یہی محبت یہی ہم آہنگی
آبروئے چمن ہے دوستو!
اسی پر منحصر
شانِ وطن ہے دوستو!

خون جب ایک ہے تو ایک نہ کیوں ہو کے رہیں
بدنما داغ جو ماتھے پہ ہے وہ دھو کے رہیں

●●

ناجی انصاری
۹۵ پریڈ کانپور
۲۰۸۰۰۱

حسرت موہانی۔ شخص اور شاعر

دنیائے شعروادب کا یہ واقعہ بڑا عجیب وغریب ہو کہ مولانا حسرت موہانی کی شخصیت اور شاعری کے ڈانڈے ہزار غور کرنے پر بھی ایک دوسرے سے ملتے نظر نہیں آتے۔ شخصیت کے اعتبار سے مولانا ایک جری، بیباک، راست گفتار، دیانتدار، کھرے اور سچے سیاستداں تھے جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں اپنا تن من دھن سب نچھاور کر دیا۔ ابتلا اور آزمائشوں کی بھٹی سے تپ کر کندن کی طرح باہر نکلے۔ بے لوثی اور بے جگری کی ایسی مثال قائم کر دی کہ دوست اور مخالف سبھی ان کے معترف ہو گئے مگر جب ان کی شاعری کی طرف نگاہ جاتی ہے تو اس میں شبنم کی ٹھنڈک، آبشاروں کا ترنم اور پھولوں کی مہک نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان کی عملی اور شاعرانہ زندگی ان دونوں خانوں میں اپنی نمود کے جلوے اس طرح دکھاتی تھی کہ ایک کا شائبہ بھی دوسرے پر نہ پڑتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جب رئیس الاحرار ہوتے تھے تو رئیس المتغزلین کی حیثیت سو جاتی تھی اور جب رئیس المتغزلین ہوتے تھے تو رئیس الاحرار کی حیثیت فراموش ہو جاتی تھی۔ حسرت کی طبیعت کی یہ طرفگی قابل غور ہے کہ وہ بہ یک وقت مشق سخن بھی کرتے تھے اور چکی کی مشقت بھی اٹھاتے تھے۔ "مشاہدات زنداں" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برہنہ تن، لنگوٹ پہن کر اپنے جوڑی دار کے ساتھ، بھاری پاٹ کی پتھر کی چکی میں صبح تڑکے سے لے کر سہ پہر تک ہر روز پختہ ایک من (۴۰ سیر) آٹا پیستے تھے۔ اگر اس مقدار میں کسی دن معمولی سی بھی کمی رہ جاتی تھی تو جیلر کے سامنے پیشی ہو جاتی تھی اور سزا ملتی تھی)

حسرت موہانی کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کی مغائرت اس لیے اور بھی حیرت انگیز ہوتی ہے کہ دور اول سے لے کر اب تک کا کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس کی عملی زندگی اور شاعری میں اتنا تفاوت ہو جتنا حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری میں ہے۔ میر تقی میر، سودا، میر درد، نظیر، غالب، مومن، ذوق، داغ، امیر، آتش و ناسخ، اصغر، فانی، جگر، یگانہ، اقبال، فیض، اختر شیرانی، مجاز، غرض کسی کے بارے میں غور کر لیجئے (ریاض خیرآبادی کے علاوہ) ہر ایک کی زندگی اور شاعری میں ایک ہم آہنگی اور اندرونی و بیرونی ربط نظر آتا ہے۔ ان شعراء کا جو مزاج اور کردار تھا، جیسی ان کی عملی زندگی تھی، ان کی شخصیات میں جو نمایاں عنصر تھے، ان کا عکس ان کی شاعری میں بھی صاف صاف اور نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ادب کا معمولی طالب علم بھی، جس نے ان شعرا کا مطالعہ ان کی شخصیات کی روشنی میں کیا ہے، ان امور سے واقف ہوگا۔ پھر حسرت موہانی میں کیا بات تھی کہ انھوں نے اپنی شاعرانہ تخلیق کو اپنی عملی زندگی سے بچائے رکھا اور وہ زندگی بھر اس اصول پر کاربند رہے کہ ان کا تغزل شعریت کے علاوہ کسی دیگر خارجی اثر سے آلودہ نہ ہونے پائے۔ یوں کہنے کو انھوں نے سیاسی خیالات اور نظریات کو بھی شعر کا جامہ پہنایا ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات میں جلبلے

کی آنچ اور دل کی گرمی شامل نہیں ہے۔ یہ صرف دو اور دو چار قسم کی شاعری ہے جس میں نہ کوئی حسن ہے نہ طرزِ ادا کی جدت ہے، نہ کوئی رچاؤ ہے، نہ دل کو چھو لینے والی بات ہے۔ محض سطحی تک بندی ہے، مثال کے لیے حسرت کے یہ اشعار دیکھیے جن میں سیاسی خیالات کی بازگشت ہے:۔

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جورِ بیجا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

کچھ شک نہیں اس میں کہ ترقی ہے وطن کی
ہم رشتگیٔ سبحہ و زنار پہ موقوف

تحریکِ حریت کو جو پایا قرینِ حق
ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے

کس درجہ فریب سے ہے مملو
تجویز رفارم ماننٹیگو

یورپ میں ایسی پھیل گئی ہے ہوائے حرص
چلنے لگی ہے سارے جہاں میں ہوائے حرص
ہے چین دکوریا کو مٹانے پہ مستعد
جاپان بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص

غالباً اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ حسرت کے یہ اشعار "نہر پر چل رہی ہے پن چکی" قسم کی شاعری کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس حسرت کے اشعار نہیں معلوم ہوتے جس نے اردو غزل کو اس کے انحطاطی دور میں ایک لطیف پیکر عطا کیا اور حسن و عشق کے ارضی تصور کی اس طرح آبیاری کی کہ حسرت کی آواز اردو غزل کے اعتبار کی سند بن گئی۔ ضمناً حسرت کے سیاسی نظریات پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیئے جو اگرچہ موضوعِ زیرِ بحث سے براہِ راست متعلق نہیں ہے مگر اس سے حسرت کے مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

حسرت کے سیاسی کردار میں ان کی تلون مزاجی ایک نمایاں عنصر کی حیثیت رکھتی ہے مگر یہ تلون مزاجی منفی رجحانات کی نمائندہ نہیں ہے بلکہ حسرت کی دلی بے چینی اور نتائج کو جلد سے جلد دیکھنے کی آرزو کی مظہر ہے۔ ضبط و نظم سے زیادہ، اندیشۂ فردا نے نہ ان کو کسی مقام پر ٹھہرنے دیا اور نہ ایک کارواں کے ساتھ چلنے دیا۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب قافلے نے ان کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دیا تو مڑ کر دیکھنے اور انتظار کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے قافلے کی ہمراہی قبول کر لی۔ جب وہ بھی سست گام ہوا تو حسرت تیسرے قافلے میں شامل ہو گئے۔ آخر کار جب منزلِ مقصود سامنے آئی تو اس کے اجڑے، ہوئے وجود اور بھیانک پن کو دیکھ کر حسرت سب سے بیزار ہو گئے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ نئے سرے سے اپنے قافلے کو ترتیب دینے اور ہمالیہ کی چوٹی کو دوبارہ سر کرنے کی کوشش کرتے۔ حسرت موہانی پہلے کانگرس میں رہے پھر احرار پارٹی میں گئے۔ مسلم لیگ میں شامل ہوئے، کمیونسٹ بنے۔ تصوف اور روحانیت کی وادیاں طے کیں، اسلام کو اشتراکیت سے ملایا، سوشلزم اور مسلم لیگ میں ہم آہنگی کا اشغلہ چھوڑا، دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا، سات مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اٹلی کے حسینوں کی کہانی رنگینی دنیا کی زبانی سنی، خوبانِ لندن کے انس کی کسک سے قرارِ دلِ بیقرار کھوتے رہے۔ مگر ان کی نظر سیماب وش کہیں قرار نہ پکڑ سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کے سینے میں قدرت نے دل کی جگہ پارہ رکھ دیا تھا جس نے ان کو ساری زندگی آتش زیر پا رکھا۔ پرنسپل عبدالشکور نے اپنی کتاب "حسرت موہانی" میں حسرت

کے سیاسی منتشر ذہن و اضطراب کے بارے میں سید سلیمان ندوی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"مولانا ہندوستانی تحریک کے رہبر تھے۔ کانگریس میں جہاں گاندھی جب ڈومینین اسٹیٹس قبول کرنے پر آمادہ تھے تو حسرت مکمل آزادی کا نعرہ سر کرتے تھے۔ مسلم لیگ نے جب کامن ویلتھ میں شریک ہونے پر آمادگی ظاہر کی تو حسرت پھر تنہا نظر آنے لگے۔ لیکن ہر سیاسی کیمپ کچھ جماعتی اغراض و مقاصد بھی رکھتا ہے۔ وہاں انفرادی آزادی اور حق پرستی سے زیادہ جماعتی معاملہ فہمی کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ حسرت اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے یارانِ طریق کے گوں کے آدمی نہ تھے اس لئے ہر دور میں ہر مقام پر ہمیشہ تنہا رہے۔ وہ معاشی پریشانیوں میں ہمیشہ مبتلا رہے لیکن ان کی غیرت ان کی حق نوائی اور اٹل قوتِ فیصلہ نے ان کو ہمیشہ جادۂ صواب پر قائم رکھا اور وہ بلاخوف، سماج اور مذہب کی مخلصانہ خدمتیں کرتے رہے۔"

(حسرت موہانی از عبدالشکور۔ انوار بکڈپو لکھنؤ ص ۱۲۵-۱۲۴)

مولانا کی سیاسی زندگی اور معتقدات میں جو تضادات تھے ان کی توجیہہ کرنا مشکل ہے۔ وہ بیک وقت کمیونسٹ بھی تھے اور نظام حیدرآباد کے بڑے سرگرم اور مخلص مددگار بھی۔ وہ تلک اور اربندو گھوش کے عاشق تھے اور مدتوں یہ سمجھتے رہے کہ وہ (اربندو گھوش) پانڈیچری کے حجرے سے برآمد ہوں گے اور ہندوستان کی قیادت سنبھالیں گے۔ یہی خیال ان کا آخری عمر میں سبھاش چندر بوس کے متعلق بھی تھا اور وہ تادم آخر ان کے ورود کے منتظر رہے۔ انھوں نے اپنے ایک خواب کی بنا پر پیر علی محمد راشدی سے پاکستان بننے سے کئی سال قبل اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ وہ سرکارِ دو عالمؐ کے مخلص ترین شیدائیوں میں تھے مگر سری کرشن جی کو بھی پیغمبر کا درجہ دیتے تھے اور متواتر ہر سال ان کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ انھوں نے کانپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور بلااعلان فرمایا کہ ادب کو انقلابی ہونا چاہیے بلکہ اسے اشتراکی نظریات کی تلقین کرنا چاہیے مگر خود تصوف کے کوچے میں سرگرداں اور آستانۂ رزاقیہ کی جاروب کشی میں مصروف رہے۔ اس ثقاہت، سنجیدگی اور قلندری کے باوجود انھوں نے ادب میں عریانیت اور فحاشی کا دفاع کیا اور حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کل ہند کانفرنس میں عریانیت اور فحاشی کے خلاف انجمن کی سرکاری تجویز منظور نہیں ہونے دی۔ خود ان کی شاعری میں افسانہ ہائے حرص و ہوس کے باوجود ایک قسم کی طہارت اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ حسرت موہانی کی زندگی اسی قسم کے تضادات سے عبارت ہے اور شاید انھیں تضادات نے ان کی شخصیت میں وہ رعنائی اور کشش بھی پیدا کر دی کہ وہ زندگی بھر خاص و عام سب کی نگاہوں میں محبوب رہے۔ ان کے سیاسی مخالفین بہت تھے مگر ان کا دشمن کوئی نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مخالفت بہتوں کی کی مگر نقصان کسی کو نہیں پہنچایا۔ مولانا سے گھبراتے سب تھے مگر ڈرتا کوئی نہ تھا کیونکہ وہ سورج کی کرنوں کی طرح صاف و شفاف اور پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح بے ضرر تھے۔ ان کی زندگی بلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹی میں تپ کر اپنی ساری کثافت کھو چکی تھی اور اب اس میں جو کچھ تھا وہ کھرا، صاف اور بے میل تھا جس سے کسی کو ضرر پہنچنا ممکن ہی نہ تھا۔

(۲)

حسرت کی زندگی مزاج اور افتاد طبع کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ان کی شاعری پر نظر ڈالیے تو ایک دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے ان کی شاعری میں جو رعنائی، لطافت حسن اور دلکشی ہے وہ خود ان کی زندگی کی اندرونی ہنوز کا نمود حسن ہے جو سیاسی زندگی کی ہماہمی سے گرد آلود نہیں ہونے پایا۔ بقول مجنوں گورکھپوری "دوسری ان کی نجی زندگی تھی جو ان

کی سیاسی زندگی سے زیادہ حسین و رنگین و زریں تھی اور ان کی غزلوں میں یہی زندگی بہتی ہے اور زور و شور سے بہتی ہے اور اسی نے ان کی غزلوں میں جان ڈال دی ہے ؎

گذاری عمر شغل عاشقی میں، مرحبا حسرتؔ
نہ پاس آنے دیا غم ہائے بے پایانِ دنیا کو"

ان کی شاعرانہ دلکشی کا راز اس میں نہیں ہے کہ طبع حسرتؔ نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے یا ان کا سلسلۂ تلمّذ نسیمؔ دہلوی کے توسط سے مومنؔ تک پہنچا ہے، یا انھوں نے زبانِ لکھنوی میں رنگِ دہلی کی نمود پیدا کی ہے، بلکہ ان کے جذبات کے خلوص عشق کی گرمی اور دیدہ و دل کی توانائی نے ان کی شاعری کو ایسی جِلا بخشی ہے جس نے اہلِ نظر کو گرویدہ کر لیا اور فضل الحسن کو رئیس المتغزلین بنا دیا۔ حسرتؔ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تہذیبِ رسمِ عاشقی کو پھر سے زندہ کیا، غزل کو بوالہوسی اور سوقیانہ جذبات سے پاک کر کے اس میں لطافت اور نکھار پیدا کیا حسن کے ارضی تصور سے سجایا، زرتار آنچل کی جگہ ارغوانی اور سبز دوپٹے کی بہار دکھائی۔ انھوں نے غزل کی روایت سے بغاوت نہیں کی مگر کلاسیکی رچاؤ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک نئی فضا تعمیر کی جس میں داخلی جذبات اور خارجی حسن کے امتزاج سے ایسے شعری پیکر وجود میں آئے جن کی رعنائی اور دل کشی اب بھی تازہ ہے ؎

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

ہے نرالی سبز کی بھی روئے روشن پر بہار
اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی

رفتارِ قیامت یوں ہی کیا کم تھی کہ اس پر
اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

ہم بھی دیکھیں جو ترے حسنِ دل آرا کی بہار
اس میں نقصان ترا اے گلِ رعنا کیا ہو

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا

کچھ یوں ہی اپنے حسن پہ مغرور تھا وہ شوخ
کچھ لے اڑی ہے اور بھی اس کو ہوائے ناز

حسرتؔ حسنِ یار سے جتنا مخمور ہو جاتے ہیں اتنا دلِ پُرخوں کی گلابی سے مخمور نہیں ہوتے۔ حسن کی ہر ادا ان کے تخیل کو مہمیز کرتی ہے۔ وہ محبوب کے سراپا میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ بعض اوقات انھیں خود اپنا سراپا بھی یاد نہیں رہتا۔ جذباتِ عشق کے رمز شناس تو بہت پیدا ہوئے ہیں مگر ادائے حسن کی رمز شناسی میں کم شاعر حسرتؔ کے درجے تک پہنچ پائیں گے۔ داغؔ بھی حسن کے ادا شناس تھے اور لکھنؤ اسکول کے بہت سے دوسرے شعرا بھی۔ مگر ان کی دلچسپی جسم و جمالِ محبوب سے کم تھی اور عورت کے جنسی تصور سے زیادہ۔ حسرتؔ کی حسن پرستی بھی جنسی جذبات سے الگ نہیں ہے مگر اس میں انھوں نے ایسا ترفع پیدا کر دیا ہے کہ سخت گیر سے سخت گیر نقاد بھی حسرتؔ کی حسن پرستی پر حرف نہیں رکھ سکتا ؎

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرتؔ کا
وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاک باز اس کا

حسن کی ادا شناسی کا دعویٰ فراقؔ گورکھپوری کو بھی ہے۔ جسم و جمالِ محبوب پر ان کی رباعیاں اردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں مگر وہ بے حجاب معصومیت جو حسرتؔ کے اشعار میں نظر آتی ہے کچھ اور ہی شے ہے۔ حسرتؔ نے حسن کو ہر عالم میں دیکھا ہے اور ہر عالم میں اس کی مصوری کی ہے۔ کہیں ان کے نقوش شوخ ہیں کہیں مدھم، مگر ان کی گرفت کمزور کبھی نہیں ہونے پاتی۔ الفاظ کو ان کے محسوسات کی بوقلمونی کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔ دوسری طرف حسرتؔ کے عشقیہ جذبات میں نہ وہ شدت اور گداختگی ہے

جو میر کے یہاں ہے، نہ وہ تہہ داری اور ماورائے سخن نکتہ سنجی ہے جو غالب کے یہاں ہے۔ عشقیہ جذبات کے اظہار میں وہ مومن کے دور ہے تک بھی نہیں پہنچتے کیونکہ وہ فراق سے زیادہ وصال کے شاعر ہیں۔ دوری اور مجبوری ان کو اتنا مضطرب نہیں کرتی کہ ان کے اشعار آنسو بن کر ٹپکنے لگیں۔ ان کے عشق میں ایک ضبط کی کیفیت ہے، ایک ایسا دھیماپن اور اعتدال ہے جو تہذیب رسم عاشقی کا پروردہ ہے۔ یہی احتیاط عشق ان کو نالہ و فریاد کی سرحد میں دور تک جانے سے باز رکھتی ہے اور وہ دل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بجائے نگاہوں کے چمن زار میں جینے لگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے دل پر کبھی چوٹ ہی نہیں پڑتی یا وہ حسن کی کج ادائیوں سے آزردہ ہی نہیں ہوتے یا وہ فراق یار کی صعوبتوں سے یکسر ناآشنا ہیں۔ کلیات حسرت میں ایسے اشعار بہت ہیں جو حسرت کے عشقیہ جذبات کے آئینہ دار ہیں مگر ان میں ایک ایسا ٹھہراؤ اور توازن ہے جو حسرت کو سراپا گداز نہیں ہونے دیتا ہے

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبار تمنا نہ چاہیے

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی
اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

مایوس بھی تو کرتے نہیں تم زراہ ناز
تنگ آ گئے ہیں کشمکش امتحاں سے ہم

شورش عاشقی کہاں اور مری سادگی کہاں
حسن کو ان کے کیا کہوں، اپنی نظر کو کیا کروں

بہ قول ڈاکٹر یوسف حسین "حسرت نے اپنی محبت کو تجرید کے الجھاؤ میں کبھی نہیں پھنسایا۔ یہ تجرید عقلی، اخلاقی اور افادی ہو سکتی ہے جس سے خارجی زندگی کے احوال میں اصلاح و بہتری کی صورتیں پیدا ہوں۔ ان کا تغزل داخلی ہے جس سے جذبے کی اندرونی دنیا میں جنبش اور حرکت پیدا کرنا مقصود ہے۔ وہ خارجی دنیا کو اس کے اندر سمو لینا چاہتے ہیں اور وجدانی طور سے ہمارا رشتہ کائنات سے متحد کر دیتے ہیں۔"

(حسرت کی شاعری۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔ صفحہ ۱۱)

حسرت کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ زندگی کے گوناگوں تجربات اور حکیمانہ نکات کو غزل کے رموز و علائم میں بیان کرتے یا اسرار کائنات کو اپنے داخلی تجربوں میں حل کر کے کچھ نئے گوشوں پر روشنی ڈالتے مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے معنوی استاد مومن کی طرح معاملات حسن و عشق کے محدود میدان ہی میں بوقلمونی دکھانے کو ترجیح دی اور حیات و کائنات کے مسائل کو ٹاٹ باہر کر دیا ہے

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس شعر میں جو گہری معنویت اور طنز آمیز کیفیت ہے اس سے ان کے تیرہ دیوان تقریباً خالی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ انھوں نے آغاز کار ہی میں اساتذہ سلف کے دیوان کا گہرا اور بلا استیعاب مطالعہ کر لیا تھا اور ان کے انتخابات بھی کیے تھے۔ اس لیے وہی رنگ غیر شعوری طور پر ان کے شاعرانہ مزاج پر حاوی ہو گیا ہو اور انھوں نے غزلیہ شاعری کو خالص رکھنے کی کوشش میں اپنے پر پرواز کو محدود کر لیا ہو۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے حسرت کی زندگی اور شاعری کے مابین تضاد کی توجیہ ان الفاظ میں کی ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ حسرت کے عشق پاکباز کی شیفتگی اور فریفتگی ہی میں ان کے جذبے کی صداقت کو تلاش کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری میں تضاد نظر آئیں۔ یہ تضاد بجائے خود جمالیاتی تخلیق کے محرک بن جاتے ہیں۔"

(حسرت کی شاعری۔ صفحہ ۷)

حسرت کی زندگی اور شاعری کا تضاد صرف ممکنات میں سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے مگر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا یہ خیال بھی قابلِ غور ہے کہ یہ تضاد بجائے خود جمالیاتی تخلیق کے محرک بن جاتے ہیں اس لیے کہ آدمی جب خارجی دباؤ کا شکار ہوتا ہے تو اپنے ذہن کی اندرونی دنیا میں پناہ لیتا ہے، جو نشاط آمیز، رنگا رنگ اور پُرسرور ہوتی ہے اور اس کے احساسِ نارسائی کی تسکین بن جاتی ہے۔ بہرحال حسرت کی زندگی کی سیاسی ہماہمی اور ان کی تہذیبِ رسمِ عاشقی کو باہم ضرب دینے سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ حسرت موہانی دوہری زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک ان کی خارجی زندگی جس میں وہ جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی اور سیاست کے مردِ میدان تھے، دوسری ان کی داخلی زندگی جس میں وہ ایک وارفتہ مزاج، عاشق، حُسن کی اداؤں کے رمز شناس اور کاروبارِ دلبری و دلداری کے رسیا تھے۔ انھوں نے ان دونوں دائروں میں ہمیشہ فاصلہ قائم رکھا اور ایک کو دوسرے سے متعارض نہیں ہونے دیا۔ حسرت کا یہ ذاتی فیصلہ تھا اس لئے ہمیں اس پر معترض نہیں ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی خارجی اور داخلی زندگی میں اتنی مغائرت کیوں روا رکھی اور ایک کو دوسرے میں مدغم کیوں نہیں ہو جانے دیا۔ ان کی شاعری میں یہ جو حکیمانہ ژرف نگاہی، فلسفیانہ گہرائی اور زندگی کی سنگین حقیقتوں سے ٹکرانے کے رجحانات کی کمی ہے وہ ان کے اسی رویّے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو انھوں نے اپنی خارجی اور داخلی زندگی کے مابین اختیار کر رکھا تھا، مگر اس سے ان کے شاعرانہ کمال پر حرف نہیں آتا۔ حسرت جو کچھ تھے اور جیسے بھی تھے، کھرے، بے لاگ اور بے کم و کاست تھے۔ ان کی جیسی زندگی بسر کرنے کا دعویٰ اس دَور میں کون کر سکتا ہے۔

●●●

اختر عمر
۱۴۸/۳۲۵، محمود نگر
لکھنؤ

غزل

کس قدر تیز دل کی دھڑکن ہے
انقلابِ صفات روشن ہے

مر کے بھی میں تو مر نہیں پاتا
جی رہا ہوں کہ یہ بھی ایک فن ہے

ایک مدھم سی لَو تھرکتی ہوئی
زندگی کا چراغِ روشن ہے

پھول جو گندھ گیا حقیقت سے
آخرش اس کا ایک مدفن ہے

چاک دامانیوں سے خوف اختر
اور دامن بھی اپنا دامن ہے

بقیہ: عارف نقشبندی ـ شخصیت و شاعری

اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ ان اشعار میں کیا نہیں؟ ان اشعار کی روشنی میں اس دعوے کی صداقت کہاں تک قابلِ قبول ہے کہ غزل گو شاعر اپنی شخصیت کے خول میں بند رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ باہر کی فضا کا بھی اتنا ہی شعور رکھتا ہے جتنی آگاہی اس کو اپنے بطون کی ہوتی ہے۔ میں نے "لمحوں کی دھڑکنیں" کے مسودے کا مطالعہ بالاستیعاب بائے بسم اللہ سے تائے تحت تک کیا ہے، اشعار جہاں تہاں سے منتخب کر لیے ہیں۔ مسودہ ایسے وقت میں ملا جب اس کی کاپیاں پریس جا رہی تھیں۔ اگر کچھ اور موقع ملتا تو عارف صاحب کی غزلوں پر اظہارِ خیال کی کافی گنجائش ہے۔ انشاء اللہ پھر کبھی۔ یار زندہ صحبت باقی ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں؛
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

غزلیں

ظفر گورکھپوری

ایف ۲/۳ نیو میونسپل کالونی
دیونار۔ بمبئی ۸۸

میں آگ تو دبا لوں دلِ ناتواں ضرور
سلگے گی کوئی شے تو اُٹھے گا دُھواں ضرور

کانٹوں کے ہونٹ اتنے ملائم نہ تھے کبھی
پیوست ہوں گے میرے لبوں کے نشاں ضرور

میں اپنی دُھوپ سے بھی گیا اس فریب میں
دیوار ہے تو چھاؤں بھی ہوگی وہاں ضرور

آیا نہ رات دل کے دھڑکنے کا اعتبار
ہاں اُن کی آہٹوں کا ہوا تھا گماں ضرور

میں بھی بھُلا چکا ہوں انھیں بھی نہیں خیال
کچھ طے ہوا تھا ان کے مرے درمیاں ضرور

ایسا نہیں ہے دوست کہ بے گھر ہوں آج تک
کاغذ پہ اک بنایا تھا میں نے مکاں ضرور

گہرے سمندروں کا سفر پُرخطر سہی
کھولوں گا ایک روز مگر بادباں ضرور

تم لاکھ اس کے ناز اُٹھاؤ ظفر میاں
اک دن دغا کرے گی یہ عمرِ رواں ضرور

شجاع خاور

پانا جی۔ گوا

اس کا خیال آ گیا ذکرِ عدو کے بعد
ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں گرم لُو کے بعد

ظاہر ہوا دیوانے سے یہ گفتگو کے بعد
کچھ اور ہو گیا ہے گریباں رفو کے بعد

وہ آبرو ہی کیا جو گئی پہلے جان سے
وہ جان کیا ہوئی جو گئی آبرو کے بعد

وہ دل نہ وہ دماغ وہ فطرت نہ وہ مزاج
دُنیا ہی مختلف ہے تری آرزو کے بعد

آخر عزیز کیوں نہ ہوں ناکامیاں ہمیں
حاصل ہوئی ہیں یہ بھی بڑی جستجو کے بعد

اس قافیہ پہ مقطع بہت ٹھیک ہے شجاع
کچھ بھی نہیں ہے نعرۂ اللہ ہُو کے بعد

افسانہ

وِش کنیا

بلقیس شبیہ
معرفت ایم۔ جی۔ رحمان پیڈیمیٹ
ڈھنڈہ بیس، آکولہ
مہاراشٹر

سلیمن بوا اور بھابی کی ساز باز سے بے چاری زینی کا رشتہ ۵۰ سالہ بڑے نواب برکت اللہ خاں سے طے ہوگیا۔

شادی شاہانہ طریقے سے ہوئی۔ ہر معاملے میں سلیمن بوا پیش پیش رہیں۔ بھابی کا تو بول بالا تھا۔

مگر دُلہن کی ماں ایک کونے میں سہمی دبکی بیٹھی رہیں ویسے بھی وہ اپنے بیٹے بہو کے کسی معاملے میں دخل انداز نہ ہوتی تھیں۔ دُلہن کی چھوٹی بہن بھی چپ چپ سی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی بہن کی اس شادی پر وہ خوشی منائے یا غم کرے۔ وداع کے وقت وہ اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی، اور دُلہن سے لپٹ کر رو پڑی۔

"یہ آنسو میری جدائی کے غم میں بہا رہی ہو یا میری بدقسمتی کا ماتم کر رہی ہو۔؟" دلہن کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔

"دو... نو.. ں کے لیے...." وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"سُن! میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس کا انجام ہے.... شکست یا فتح۔" زینی پرعزم لہجہ میں بولی۔ "شکست میری موت ہوگی۔ یا حویلی سے کامیاب واپسی میری فتح.... اس دوزخ سے چھٹکارا...... تو فکر نہ کر..... بس اماں کا خیال رکھنا... جس طرح میں آج تک ان کے لئے سپر بنی رہی، تو بھی بھابی کا ہر وار اپنے اوپر سہہ کر اماں کی دل جوئی کرنا۔ میری کامیابی کے لیے دُعا کرنا....... اور میری موت پر افسوس نہ کرنا۔" ــــــ اس کی آواز بھرا گئی۔ لیکن بڑی جلد اس نے اپنے اوپر قابو پالیا اور نفرت سے بولی۔ "نواب صاحب کی ارضی جنت سے مجھے عقبیٰ کی دوزخ قبول ہے۔"

رہائش گاہ سے دُور "کوپ" کو شبِ عروسی کے لیے سجایا گیا تھا۔ یہ ایک قدیم مگر مضبوط، پرشکوہ عمارت تھی۔ آبادی سے دُور ــــ پہاڑ کے انتہائی دامن میں درّہ نما ــــ لیکن چند فرلانگ سرنگ نما راستے سے گزر کر یہی درّہ ایک قلعہ نما عمارت میں تبدیل ہو جاتا تھا، جسے بڑی ہنرمندی سے بنایا گیا تھا۔ ممکن ہے کسی زمانے میں دشمنوں سے بچنے کے لیے یہ ایک مضبوط گڑھ رہا ہو۔

نواب برکت اللہ خاں کے پاس اپنے شان دار عہدِ رفتہ کی بس یہی ایک یادگار باقی رہ گئی تھی۔ زمین جائیداد توکب کی افراتفری کا شکار ہو گئی تھی۔ نواب صاحب عقل مند اور زمانہ شناس تھے گرنے سے پہلے ہی سنبھل گئے۔ ایک ایسا بزنس شروع کر دیا کہ پھر وارے نیارے ہوگئے۔ اب ان کے پاس پھر دولت کی ریل پیل تھی۔ سامانِ عیش و عشرت، راحت و کامرانیاں ان کے چاروں طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔

قلعہ نما حویلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ بڑے ہال میں رنگ برنگے فانوس روشن تھے۔ پتہ نہیں کتنی مدت بعد آج یہاں یہ جشنِ طرب منایا جا رہا تھا۔ آرائشی سامان انتہائی قدیم طرز کا تھا۔ جیسے کسی کہانی میں ایک صدی پرانا ماحول اجاگر کیا گیا ہو۔

وسیع، کشادہ چھت، خوبصورت جگمگاتے جھاڑ فانوس، در و بام تک پر رنگ برنگی شعاعوں پھولوں اور خوشبوؤں کی یورش منقش دیواروں پر دیدہ زیب آرٹس کے لاجواب نمونے، فرش پر نفیس گداز قالین۔ کمرے کے ایک گوشے میں بھس بھرا ہوا چیتا اس مہارت سے کھڑا کیا گیا تھا کہ دیکھنے والا پہلی نظر میں اصل کا گمان کرکے ٹھٹھک جاتا تھا۔

زیبی کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ یہ سب کچھ پردۂ اسکرین پر دیکھ رہی ہو۔ آجکل یہ ساری چیزیں پردۂ اسکرین پر ہی باآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اک لمحہ کے لیے یہ خیال اس کے لیے بڑا حیات آفریں بن گیا کہ اب یہ سب کچھ اس کی اپنی ملکیت ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک عیاش گرگ باراں دیدہ کی شبیہہ اس کے تصوّر میں ابھری اور اس کے رگ و پے میں نفرت کا زہر بھر گئی۔

وہ نفیس پھولوں سے ڈھکے ایک مرصع چھپر کھٹ پر بٹھا دی گئی۔ پتہ نہیں اس پر کتنے حسن و شباب کی خوشہ چینیاں ہوئی ہوں گی۔

ابھرتے قدموں کی چاپ دبیز قالین پر سرگوشیاں کرنے لگی زیبی کا دل دھڑک اٹھا، غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اس کٹار پر چلا گیا جو دداع کے وقت ڈیوڑھی کے دروازے سے نکلتے ہوئے سلیمن بوا نے اس کے بائیں ہاتھ میں یہ کہہ کر تھمائی تھی،

"کھلے آسمان تلے اللہ رسول کا نام لے کے اس کو پکڑا دی۔" گویا لڑکی کو زیورات اور ہتھیار سے مسلح کرکے ازدواجی جنگ لڑنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

قدموں کی چاپ نزدیک تر ہوتی گئی..... زیبی نے جھکی جھکی نظروں سے دیکھا۔

سلیم شاہی جوتوں میں چھپے ہوئے دو پاؤں .....

پھر ــــ سفید چست پاجامے میں روپوش قدرے ڈگمگاتی دو ٹانگیں .....

پھر ــــ سیاہ شیروانی پر جھولتے ہوئے جھریوں بھرے دو ہاتھ .....

انگلیوں میں ہیرے یاقوت کی انگوٹھیاں ..... گلے میں سچے موتیوں کا ہار.....

پھر..... اس سے اوپر اسے دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"حسن کی سرکار میں یہ عاشق صادق آداب بجالاتا ہے"۔ نواب صاحب زیبی کے آگے جھکتے ہوئے بولے۔

زیبی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

"ملکۂ حسن! کیا اس خادم کو بارگاہ عالی میں باریابی کی اجازت ہے۔؟"

"جی نہیں۔!" ایک جھٹکے سے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا۔

نواب صاحب زیبی کے حسن و شباب کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ شعری ذوق ورثے میں ملا تھا لہٰذا بڑے شاعرانہ انداز میں بولے ؎

اے دیدہ ورد، اے خوش نظرو ذرا دیکھو تو اس کافر کو
کیا تیور ہیں، کیا سج دھج ہے کیا حسن ہے کیا زیبائی ہو

"الفاظ کے یہ بن مہک پھول سوکھ گئے ہیں نواب صاحب آپ کے سراپے کی طرح۔!" زیبی بڑے طنز سے بولی۔

نواب صاحب پھولوں کی لڑیاں ہٹا کر اس کے قریب آئے اور ایک پھول اٹھا کر زیبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ؎

چمن کیا جواب اس چمن وش کا دے گا
بہت فرق ہے گل میں اور گلبدن میں!

"چمن وش نہیں دشس کنیا کہیے نواب صاحب!" زیبی بے حد تلخی سے بولی۔ "پرانے قصے کہانیوں میں آپ نے وش کنیا کے بارے میں تو ضرور پڑھا ہوگا، آج ہم بھی وش کنیا بن کر آئے ہیں۔ آپ نے ہمیں ہاتھ لگایا اور بس! وہیں ڈھیر ہو گئے۔"

"بھئی واہ!" نواب صاحب کھِل اُٹھے۔ "ایسے ڈائیلاگ تو ہم نے بس آغا حشر کے اسٹیج ڈراموں میں سُنے تھے یا آج سُن رہے ہیں۔ مزہ آگیا" وہ دُلہن کے پہلو میں آبیٹھے۔ زیبی اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔ بہت پی رکھی تھی۔ نیم دراز ہوگئے۔ اور سرشاری کے عالم میں بولے۔

"بس اب ہمیں اور نہ تڑپایئے....... اپنے حسن و شباب کی بہاروں سے ..... ہمیں لطف اندوز....."

زیبی کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔

"بند کیجئے یہ بیہودہ بکواس"! زیبی زور سے دہاڑی۔ "اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کرسکتی"

نواب صاحب زیبی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"آج تک آپ عورت کو ایک کھلونا سمجھ کر اسے خریدتے اور ٹھکراتے رہے ـــــ لیکن میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جنھوں نے اپنی جوانی بھینٹ کردی۔ زندگی مالک کائنات کی عنایت کردہ ایک عظیم نعمت ہے۔ میں اس نعمت کو آپ کی ہوس کا نشانہ نہ بننے دوں گی" زیبی نے ہال میں چاروں طرف اُنگلی گھماتے ہوئے کہا۔ "اس خوبصورت قبر میں لمحہ لمحہ مرنے سے بہتر ہے آپ کو ختم کرکے پھانسی کے تختہ پر چڑھ جاؤں" ـــــ اس نے اپنا کٹار والا ہاتھ بلند کیا۔

نواب صاحب کا سارا نشہ فوراً کافور ہوگیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے زیبی کو دیکھنے لگے۔ دل نے کہا، یہ خوبصورت عورت نہیں بلکہ ملک الموت ہے۔ وہ اپنی شوخی، شرارت، چوچلے سب بھلا بیٹھے۔ مسہری کے پرے سرک گئے اور سراسیمگی سے بولے۔

"آپ ہم پر کیوں برہم ہوتی ہیں۔ ہم تو آپ کو باقاعدہ شرعی طور پر اپنی شریکِ حیات بنا کر لائے ہیں۔ ہمارے ساتھ آپ کو شادی منظور نہ تھی تو انکار کر دیا ہوتا۔"

"نواب صاحب!" زیبی غصے سے بولی "آپ کے اس معاشرے میں بے چاری بے بس لڑکی کو یہ اختیار کہاں۔ اسے تو سامان فروخت کی طرح اٹھا کر کسی کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے"

"معاشرے کی زیادتیوں کی شکایت آپ ہم سے کیوں کررہی ہیں۔؟ اگر آپ ہمارے ساتھ ازدواجی تعلقات نہیں رکھنا چاہتیں تو......" اچانک نواب صاحب کی نظر زیبی کے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر گئی، جس میں کٹار چمک رہی تھی۔ پھر انھوں نے دروازے کی طرف دیکھا جسے وہ اپنے ہاتھوں سے بند کر آئے تھے۔ زیبی اس وقت بھوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

نواب صاحب اپنی جان کی خیر مناتے ہوئے جلدی سے بولے:

"ہم آپ کو اپنی نکاح کی قید سے آزاد کرتے ہیں"

"مردوں کے لیے شادی اور طلاق محض ایک کھیل ہے نواب صاحب۔ لیکن عورت کے لیے زندگی اور موت کا سوال۔ .....سماج میں ایک مطلقہ عورت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔؟"

"آپ کا مہر تو ہم نے نقد ادا کر دیا ہے"

"صرف پچیس ہزار روپے دے کر چھٹکارا نہیں پاسکتے آپ۔ ہماری جواں بہار آرزوؤں کا گلا گھونٹا ہے آپ نے اس کا خوں بہا بھی دینا ہوگا آپ کو"

"ک..... ک..... کیا؟!" نواب صاحب بوکھلا گئے۔

"جی ہاں!" زیبی کٹار لہراتے ہوئے بولی۔

"ت.... ت..... تو..... رہنے کے لیے یہ جگہ پسند ہے آپ کو۔؟"

"جی نہیں! مجھے آثار قدیمہ سے کوئی دل چسپی نہیں۔ اس تہ خانے میں آپ کے آباؤ اجداد کی خبیث رُوحوں کا بسیرا ہے۔ بستی سے دُور۔ تنہائی کے دلدل میں گلِ بکاولی بن کر مجھے جینا نہیں ہے۔ مجھے تو بس اک گھر چاہیے۔ روزمرہ کے ضروری ساز و سامان کے ساتھ۔ جدید طرز کا۔ سامان عیش و عشرت سے مزین۔ آرام دہ"

"تو پھر ہمارا اقبال مینشن آپ کے لیے ٹھیک رہے گا۔ یہ شہر میں چھوٹی سی گنبد نما کوٹھی ہے۔ چھ کمرے، کشادہ باغ اور سوئمنگ پول۔ تین چار سرونٹ کوارٹرس.... وسیع و بلند ٹیرس.."

" بس! ٹھیک رہے گا۔ لیکن خادمہ اور ملازمین۔۔؟"
" کیا ۔۔ وہ بھی ۔۔۔۔" نواب صاحب کی نظر پھر کٹار پر گئی۔ گھبرا کر بولے " ہاں ہاں۔ خادمہ اور ملازمین بھی۔۔۔۔؟"
وہ دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔
" خادمہ اور ملازمین کی تنخواہ کہاں سے آئے گی"؟ زیبی نے بارعب آواز میں کہا۔
نواب صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ کہنا ہی پڑا۔ " ہم دیں گے"۔
" او، ہم سب کھائیں گے کیا ۔۔؟ کیا ان سنگین اور پرشکوہ عمارتوں کو یاجوج ماجوج کی طرح چبا کریں گے۔؟"
" ہم آپ کے ساتھ نکاح کے دو بول پڑھانے کے گنہگار ہیں لیکن پھر بھی ۔۔۔۔" ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی اور بدقت تمام بولے ۔ " ہم آپ کو دو ہزار ۔۔۔۔ روپے ۔۔۔ ماہانہ"۔۔
" بس ۔!" زیبی ان کی بات کاٹ کر حقارت سے بولی۔
" صرف دو ہزار روپے۔ بس اتنی ہی اوقات ہے آپ کی ۔۔ بہت کم بولی لگائی ہے آپ نے اپنی زندگی کی"۔ اس نے تضحیک آمیز قہقہہ لگایا۔
" تو ۔۔۔ تو ۔۔۔ ا ۔۔۔ اب اسے پھینک دیجئے"۔ نواب صاحب دودھاری تیز کٹار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
" ابھی نہیں! ہم نے سنا ہے آپ حافظے کے بہت کمزور ہیں۔ اپنی بیویوں کی تعداد اور اپنے بچوں کے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہتے آپ کو۔ لہٰذا آپ کے اور میرے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اسے فوراً کاغذ پر لکھ کر دے دیجئے"۔
نواب صاحب زیبی پر بہت جھلائے۔ اسے دل ہی دل میں بے شمار گالیاں دے ڈالیں۔ چاہا کہ جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کٹار چھین لیں اور پھر اسے ننگی کا ناچ نچائیں۔ لیکن اچانک "دلہن" کے بجائے "قاتلہ" سے مڈبھیڑ ہو جانے کی وجہ سے وہ بالکل حواس باختہ ہو گئے تھے۔
ہر انسان موت کو اتنے قریب پا کر دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے، انھوں نے بھی زیبی کی ساری شرائط بے چوں و چرا قلم بند کیں اور اپنے دستخط کے ساتھ کاغذ اس کے حوالے کر دیا۔
" ہماری بدولت یہ پہلا نیک کام سرزد ہوا ہے آپ سے"۔ زیبی کاغذ لیتے ہوئے بڑی رعونت سے بولی۔
" م ۔ م ۔۔۔ میں دل کا مریض ۔۔۔" نواب صاحب بستر پر ڈھیر ہو گئے۔
" اوہ! آپ سچ مچ قابل رحم ہیں۔ ہاتھی کا سا ڈیل ڈول۔ اور چڑیا کا سا دل!" اس نے مضحکہ خیز قہقہہ لگایا۔ " سلیمن بوا تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کے بڑھاپے پر ہزاروں جوانیاں قربان۔ آپ بیسیوں نوجوانوں کو پچھاڑ سکتے ہیں۔ مگر آپ تو اپنی نئی نویلی کا ایک وار بھی نہ سہہ سکے۔ چت ہو گئے ۔۔۔ ہاہاہا ۔۔۔"۔ اس نے کٹار دور پھینک دی، جو بھس بھرے چیتے کی کھال میں جا کر پیوست ہو گئی۔
" اپنی حیاتِ نو کے لیے دوگانہ ادا کیجئے نواب صاحب! ورنہ کٹار کی اصل جگہ وہ نہیں"۔ اس نے چیتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ " بلکہ آپ کا سینہ تھا"۔
نواب صاحب کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ زیبی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی " گاڑی بھی ہمارے ساتھ جائے گی"۔ اس نے دروازہ کھولا پھر نواب صاحب سے مخاطب ہوئی۔
" زندگی تھی جو آج آپ بچ گئے۔ ورنہ ہم تو گھر سے عروسی جوڑا نہیں، کفن باندھ کر نکلے تھے۔ ہم جلد سے جلد اپنی نئی رہائش گاہ کو رونق بخشنا چاہتے ہیں۔ ملازمین بھی ہماری رہائش گاہ پر جلد بھیج دیے جائیں"۔
" اور ہاں"۔ جاتے جاتے وہ پھر پلٹی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ " دوسری دلہن کی تلاش میں مشاطہ کے بجائے ناچیز کو خدمت کا موقع دیجئے گا"۔ وہ قدرے جھکتے ہوئے انکساری سے بولی۔
" نہیں نہیں"۔۔۔۔ نواب صاحب دونوں ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے بولے" میں شادی سے باز آیا"۔
" شاباش! بہت سمجھ دار ہیں آپ"۔ زیبی نے قہقہہ لگایا۔•

فاروق شفق
جی ۱۸۵، دھان کھیتی
گارڈن ریچ، کلکتہ

غزل

کچھ نہ بدلا کہیں آنکھ اُکتا گئی
دھوپ آنگن سے دیوار پر آ گئی

جاتی رُت اب کے منظر وہ دکھلا گئی
ہر طرف بھیگی چادر سی پھیلا گئی

گھر کی چوکھٹ پہ جلتا دیا دیکھ کر
شام خود ہی ہنسی خود ہی شرما گئی

سامنے گھر کی دیوار جب سے اٹھی
روشنی میرے حصے کی بھی کھا گئی

تجربہ اوروں سے مختلف ہے مرا
بھیگی چھت اور بھی آگ برسا گئی

ہے گھٹن اور پسینہ مقدر شفق
آج بارش مگر دل کو بہلا گئی

ظفر اقبال
۱۲۰، خیلدار، [illegible]
([illegible])

رات کی تنہائیوں میں جاگنے والا نہ تھا
رحمتوں کا در کھلا تھا مانگنے والا نہ تھا

ہمسفر گو تھے ہزاروں زندگی کی راہ میں
کوئی بھی زخمِ جگر کا دیکھنے والا نہ تھا

دیکھتے تھے اور کترا کر نکل جاتے تھے لوگ
آئینے کا درد کوئی بانٹنے والا نہ تھا

زندگی سہمی ہوئی، اُلجھی ہوئی، بکھری ہوئی
تیرگی میں ہاتھ کوئی تھامنے والا نہ تھا

بعد مرنے کے ہوا سب کی نظر میں وہ عزیز
زندگی میں جس کا کوئی چاہنے والا نہ تھا

سرد ہو کر رہ گیا تھا اے ظفر سوزِ دروں
آنسوؤں کو موتیوں میں ڈھالنے والا نہ تھا

آفاق احمد
[illegible]

غزل

غرقِ سیلابِ تمنا کر دیا
دشتِ دل کو اس نے دریا کر دیا

جرم ہے اس دور میں معصومیت
اس نے مجھ کو اور رسوا کر دیا

منزلیں ذوقِ طلب کی موت ہیں!
منزلوں کو ہم نے رستا کر دیا

کون ہوگا مجھ سا وحشت آشنا
میں نے ہر ذرّے کو صحرا کر دیا

حسن خود بیں اور اتنا مضطرب!
اے غمِ دل تو نے یہ کیا کر دیا

ہے عجب آفاق یہ پندارِ عشق
مجھ سے میرے قد کو اونچا کر دیا

رضوان سیف

اتر پردیش تیز رفتار ترقی کی راہ پر گامزن

اتر پردیش کی معاشی ترقی کی رفتار تیز تر ہونے کا رجحان کافی نمایاں نظر آتا ہے، کیونکہ غریبی ختم کرنے کے پروگراموں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ترقیاتی پروگراموں کو مقررہ وقت پر نافذ کرنے پر زور دیا گیا۔ ساتویں منصوبے کو حتمی شکل دی گئی۔ چھٹے منصوبے کے دوران ریاست کی اوسط شرح نمو چھ فیصد رہی۔

ساتویں منصوبے کے لیے بھی چھ فیصد شرح نمو مقرر کی گئی ہے قومی منصوبے کے لیے مقررہ شرح نمو سے یہ ایک فیصد زیادہ ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن نے ریاست کے لیے ساتویں منصوبے میں گیارہ ہزار کروڑ روپے کی منظوری دی ہے۔

● زرعی پیداوار میں اضافہ کے رجحان کو نہ صرف برقرار رکھا گیا ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ کو یقینی بنایا گیا ہے۔ سابقہ پانچ برسوں میں ریاست میں اناج کی پیداوار میں ۲۲٫۱ فیصد اضافہ ہوا۔

سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۴۰۳٫۱۵ لاکھ میٹرک ٹن اناج کی پیداوار ہوئی جو اس سال کے مقررہ نشانہ سے زیادہ رہی۔ سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۹۱٫۹۹ لاکھ میٹرک ٹن اناج پیدا ہوا تھا۔ سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں ریاستی حکومت کی خصوصی کوششوں کے نتیجہ میں چاول کی پیداوار ۹۰٫۶۷ لاکھ میٹرک ٹن۔ مکّا کی ۱۷٫۸۱ لاکھ میٹرک ٹن باجرہ کی ۵۵٫۱۰ لاکھ میٹرک ٹن ہوئی۔

یہ اضافہ کاشت کاروں کو اس سال بروقت زرعی ساز و سامان فراہم کرنے اور انھیں وقتاً فوقتاً تکنیکی معلومات فراہم کرنے کے نتیجہ میں ہی ممکن ہو سکا۔ اس سال کاشت کاروں کو ۵٫۶۲ لاکھ کوئنٹل بیج، ۱۶٫۱۳ لاکھ میٹرک ٹن کیمیاوی کھاد، ۱۶۷۱۴ میٹرک ٹن جراثیم کش دوائیں اور ۳۰۰۰ لاکھ روپے کا فصلی قرض تقسیم کیا گیا۔

پہلے دھان اور بعد میں گیہوں فصل بیمہ اسکیم اس سال نافذ کی گئی۔ اس کے تحت ۹۲ تحصیلوں میں دھان کا ۱۲۸٫۴۴۶ لاکھ روپے اور ۲۲۲ تحصیلوں میں گیہوں کا ۳۱۷۴٫۰۴ لاکھ روپے کا بیمہ ہو چکا ہے

● ۸۵-۱۹۸۴ء میں شہری علاقوں کے کمزور طبقے کے افراد کی اپنا روزگار شروع کرنے کے لیے ۱۲۶۹۰۲ درخواستیں بینکوں کو قرض کی منظوری کے لیے بھیجی گئیں جن میں سے ۴۹۸۴۶ درخواستیں منظور کی گئیں۔ مالیاتی سالِ رواں کے دوران ایک لاکھ افراد کو مستفید کرنے کا نشانہ ہے۔

اتر پردیش مالیاتی کارپوریشن کے ذریعہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۴۵۰۰ لاکھ روپیہ اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۵۴۱۶ لاکھ روپے کا قرض تقسیم کیا گیا۔

● گزشتہ سال ریاست میں ۴۰۰۰ مناسب شرح کی نئی دکانیں کھولنے کا نشانہ رکھا گیا تھا جس کے مقابلہ میں ۴۱۱۹ دکانیں کھولی گئیں۔ ریاست کی یہ کامیابی پورے ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ ساتویں پنج سالہ منصوبہ کے آخر تک دکانوں کی تعداد پچاس ہزار کرنے کا نشانہ ہے۔ اس وقت ریاست میں ۲۹۸۰۵ مناسب شرح کی دکانیں چلا

کھلے بازار میں شکر کی قیمت میں اضافہ روکنے کی غرض سے صارفین کو ریاست میں درآمد شدہ نان لیوی شکر فراہم کی جارہی ہے جس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۵.۹۰ روپیہ فی کیلوگرام رکھی گئی ہے۔ ہند غذائی کارپوریشن کی جانب سے ریاستی حکومت کو ۹۰۰۰ ٹن شکر فراہم کی گئی ہے۔

● ریاست میں امن و قانون برقرار رکھنے میں محکمۂ پولیس نے بڑی چستی اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ عوام کے تعاون سے ریاست میں امن و امان کی صورت حال گزشتہ سال کے مقابلے میں بہتر رہی۔

سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان ۱۵۶۴ موقعوں پر مڈبھیڑوں میں ۱۶۱۳ ڈاکو مارے گئے اور ۵۷۴۴ گرفتار کیے گئے۔

پولیس کی سرگرمیوں میں تیزی لانے کی غرض سے پرانی گاڑیوں کی جگہ نئی گاڑیوں کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ اضلاع کے صدر مقامات سے ریاستی صدر مقام کا ہاٹ لائن کے ذریعہ رابطہ بہتر بنایا جارہا ہے۔

شہروں میں ٹریفک حادثات کی روک تھام کے لیے ٹریفک پولیس کو مستحکم کیا جارہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ڈکیتیوں کی موثر روک تھام کے لیے پی۔ اے۔ سی کی ۲۹ بٹالینوں میں ۳۳ کمپنیوں کا اضافہ کیا گیا اور ان کے ذریعے فسادات کی روک تھام کی غرض سے جدید آلات کا بندوبست کیا جارہا ہے۔

● بجلی کی پیداوار میں اضافہ اور اس کی باقاعدگی سے سپلائی یقینی بنانے کی غرض سے اترپردیش ریاستی بجلی بورڈ کی تشکیل نو کی گئی ہے۔ پیداوار اور اصل ترسیل کا کام ایک ممبر کو اور تقسیم و محصول کا دوسرے ممبر کو سونپا گیا ہے۔ اسی طرح علاقائی افسروں کو مختلف سطحوں پر پوری طرح ذمہ دار قرار دیا گیا ہے امید ہے کہ اس بندوبست سے صارفین سروس میں مناسب سدھار ہوگا۔

جون ۱۹۸۵ء کے آخر تک بجلی سپلائی میں کافی سدھار ہوا۔ اوسطاً تقریباً پیداوار جو جون کے پہلے ہفتہ میں تقریباً ۱۸ ملین یونٹ تھی، بڑھ کر تقریباً ۲۲ ملین یونٹ یومیہ ہوگئی۔ بارش شروع ہونے سے بجلی کی پیداوار ۱۱ ملین یونٹ سے بڑھ کر ۱۳ ملین یونٹ یومیہ ہوگئی۔ اس بڑھی ہوئی بجلی سپلائی کے نتیجہ میں شہری علاقوں اور صنعتوں پر عائد بجلی کٹوتیوں میں کمی کی گئی۔

● سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں کانپور، الہ آباد، وارانسی آگرہ، لکھنؤ اور غازی آباد کی سڑکوں کو مستحکم کرنے، ان کی نو تعمیر ہاٹ مکس پلانٹ مشینوں سے جدید تکنیک کے ذریعہ کرانے کے لیے ۵۴ کروڑ روپیہ کی رقم منظور ہوئی تھی۔ اس سے ان شہروں میں ۲۸۶.۴۴ کیلومیٹر لمبی سڑکوں کو مستحکم کیا گیا۔

سال ۱۹۸۵ء میں محکمہ تعمیرات عامہ نے ریاست کے پہاڑی اور میدانی علاقوں کے لیے تقریباً ۲۱۸.۰۹ کروڑ روپیہ صرف کیا۔ اس سے ۱۵۳۹ کیلومیٹر نئی پختہ سڑکیں، ۷۹۲ کیلومیٹر کچی سڑکیں اور ۳.۴۲ کیلومیٹر کھڑنجہ سطح تک سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ ۱۲۸۰ کیلومیٹر موجودہ سڑکوں کی نو تعمیر کی گئی اور انھیں مستحکم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۱۸ نئے پل تعمیر کیے گئے۔

بقیہ: وش کنیا

دروازے کے باہر نکل گئی اور دروازے کے پٹوں کو زور سے بند کردیا۔

دونوں پٹ ایک دوسرے سے ٹکرائے، اور زور کی آواز ہوئی۔ نواب صاحب بستر پر اچھل کر بیٹھ گئے۔

زینے کے جاتے قدموں کی آواز دور ہوتی جارہی تھی۔ پھر موٹر کے ہارن کی آواز ڈوبتے ہی سناٹا چھا گیا۔

نواب صاحب نے جھلا کر چھپر کھٹ کی پھولوں کی لڑیوں کو نوچ پھینکا۔

"کمینی! ذلیل! دھوکے باز۔۔!" وہ تکیوں پر زور زور سے مکے مارنے لگے۔

"ارے یہ لڑکی تھی یا ڈاکو...... ہائے ہائے کمبخت نے کہیں کا نہ رکھا۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑا؟!!"

۵ر اگست سنہ ۱۹۸۵ء

RAJ BHAVAN
LUCKNOW

GOVERNOR
UTTAR PRADESH

پیغام

یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اُتر پردیش کے اُردو ماہنامہ "نیا دور" نے آنجہانی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک خصوصی یادگار شمارہ شائع کیا ہے۔

اِس خصوصی شمارہ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے مسز گاندھی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے دریا کو کوزہ میں بھر دیا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں جو انتھک کوشش کی گئی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

آپ کا مخلص

(محمد عثمان عارف)

جناب امیر احمد صدیقی
مدیر
ماہنامہ "نیا دور"
نظامت اطلاعات و رابطۂ عامہ
اتر پردیش
لکھنؤ

[عزت مآب گورنر اتر پردیش کا یہ پیغام "نیا دور" کے اندرا گاندھی نمبر کی رسم اجرا کے موقع پر موصول ہوا تھا]

فراق نمبر حصہ دوم : تاثرات کے آئینے میں

پروفیسر آل احمد سرور، سری نگر، کشمیر

'نیا دور' فراق نمبر کا دوسرا حصہ ملا۔ واقعی آپ نے اس کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ کچھ مضامین پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ یہ نمبر پہلے نمبر سے بہتر ہی ہے۔ اس میں کئی مضامین قابلِ قدر ہیں۔ نریش چندر نے جس طرح فراق کی ہندوستانیت کا تجزیہ کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اطہر فاروقی کا مضمون بھی بہت اہم ہے، اگرچہ بعض جگہ وہ تنقید کے جوش میں اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ نذیر بنارسی کا مضمون میرے لیے حیرت انگیز ثابت ہوا۔ فراق صاحب کی بہت سی کمزوریوں کا مجھے علم تھا، مگر وہ اپنے ایک ساتھی اور عزیز کی ایک طرف اس طرح تذلیل کر سکتے تھے اور دوسری طرف اسی کی خوشامد کر سکتے تھے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ بہرحال فراق شخص کی حیثیت سے جیسے کچھ بھی تھے، لیکن شاعری ان کی زندگی تھی اور شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند ہے، اگرچہ وہ خود اپنے کو جو سمجھتے تھے اور اپنے متعلق جو کہتے تھے وہ ان کی خود پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت کے سوا کچھ نہیں۔ آپ نے بہرحال فراق کی تصویر کے دونوں رُخ دکھا کر ایک قابلِ قدر کام کیا ہے۔

اطہر علی فاروقی۔ ۴۲۸۔ دریاباد۔ الہ آباد ۳

باکمال شخصیتوں کی عظمت کے اعتراف میں خصوصی نمبر شائع کرنے کی جو روایت بن چکی ہے۔ ایڈیٹر نیا دور نے اس روایت کو وہ تابانی اور درخشانی بخشی ہے جس کی مثال اب تک نظر نہیں آتی۔

آپ نے ان شخصیتوں کی اشاعتی اور صحافتی خدمات کو یاد رکھتے ہوئے منشی نولکشور اور منشی دیا نرائن نگم پر شاندار نمبر شائع کر کے دوبارہ زندگی بخشی جن کی خدمات ذہنوں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں اور پھر شری رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری پر ایسے دو شاندار خصوصی نمبر شائع کئے جو صوری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے بے نظیر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اور ہر طرح سے معیاری اور مستند۔

یہ فراق نمبر صحیح معنوں میں نہ صرف لائبریریوں کی زینت بننے کے لائق ہیں بلکہ تعلیمی نصاب میں بھی داخل کیے جانے کا حق رکھتے ہیں۔

فضا ابن فیضی، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

فراق کی دلچسپ اور رنگارنگ شخصیت اور فکر و فن پر آپ نے اس نمبر کے ذریعے سے اتنا مواد فراہم کر دیا ہے۔ جو بلا شبہ متعلقہ شخصیت پر ایک تاریخی و ادبی دستاویز ہے۔ فراق پر کام کرنے والوں کے لیے یہ نمبر بڑا مفید ثابت ہوگا۔ آپ نے اس پر کتنی محنت کی ہوگی، مجھ جیسوں کے لیے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ مبارک ہو۔

ملک زادہ منظور احمد، ریڈر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

فراق سے متعلق "نیا دور" کے دونوں خصوصی شمارے اردو رسائل اور جرائد کی تاریخ میں ایک "خوشگوار اضافے" سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ ہماری "روایتی شرافتِ نفس" ابھی تک مرحومین کے مناقب و فضائل کے سلسلے میں رطب اللسان ہوتی رہی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء و ادبا کی زندگی کے بہت سے پہلو آج تک ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ آپ نے جس بیباکی اور جرأت کے ساتھ فراق کی زندگی اور اکتسابات کے محاسن اور معائب کو مختلف ادباء سے پیش کروا کر شائع کیا ہے، وہ شعر و ادب کے طالبعلم

اور محققین کے سامنے فکر و نظر کے کچھ ایسے پہلو کھولتا ہے کہ "فراق فہمی" کے لیے نہ صرف آسانیاں فراہم ہوتی ہیں بلکہ ان کی قدر و قیمت کا تعین بھی متوازن ہوجاتا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔

سید نجم الدین نقوی، راجہ جی پورم لکھنؤ

فراق نمبر حصہ دوم ملا۔ میری رائے میں نقش اول سے نقش ثانی بہت اچھا ہے۔ اس کی اشاعت میں بھی بڑی کاوش اور عرق ریزی کو دخل دیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ قارئین اس دستاویز کو بھی حوالہ جاتی رسالوں کے طور پر محفوظ رکھیں گے۔

(پروفیسر ڈاکٹر) مدحت الاختر شعبۂ اردو و فارسی، ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور

فراق نمبر (حصہ دوم) اور اس کے بعد (حصہ اول) کا بغور مطالعہ کیا۔ دونوں نمبر آپ کی محنتِ شاقہ اور ذوقِ سلیم کے شاہد ہیں۔ یوں بھی نیا دور اپنی نثری و شعری تخلیقات کی بنا پر اردو کے موقر ادبی جرائد میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اور امید ہے آپ کی ادارت میں اس کا یہ مقام محفوظ رہے گا۔

نسیم اقتدار علی ۲۱۔ نیو بیری روڈ لکھنؤ

فراق نمبر کا دوسرا حصہ ایک خوبصورت شعر کے اس مصرعۂ ثانی کی مانند ہے جو شعر کو پر تاثیر بنا کر مزید رعنائی عطا کرتا ہے، فراق کے فن اور شخصیت پر برصغیر ہند و پاک کے تمام مشاہیر ادبا اور شعرا کے مضامین حاصل کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ آپ لوگوں نے جس محنت سے یہ مضامین جمع کیے اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

مضامین کی ترتیب، تنوع اور سرورق کے حسن نے اس شاہکار نمبر میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ فراق کی پورے صفحہ والی تین تصویریں جو سرورق کے پیچھے اور بعد والے صفحات پر دی گئی ہیں، ان کی پوری زندگی اور اس میں ہونے والے چڑھاؤ اتار کی بھرپور ترجمان ہیں۔

وامن راؤ جاگیردار، سون پیٹھ، پربھنی

"نیا دور" کا فراق نمبر حصہ دوم موصول ہوا۔ اس بہترین نمبر کے لیے آپ کو دلی مبارکباد۔ یہ خاص نمبر آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اردو داں طبقہ آپ کی اس محنت کے لیے ہمیشہ آپ کا ممنون رہے گا۔

محمد احمد ادیب، لکھنؤ

فراق نمبر حصہ دوم موصول ہوا۔ میری رائے میں وہ شخص بھی فن کار سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہوتا جو فن کار کو منظر عام پر لاتا ہے۔ اس نمبر کے ذریعہ آپ اور آپ کے معاون شاہنواز صاحب کی کاوشیں، عرق ریزی اور اعلا صلاحیتیں فراق صاحب کی شہرت میں مزید اضافے کا سبب بن گئی ہیں۔

آپ لوگوں نے فراق صاحب پر اتنا مواد فراہم کر دیا ہے کہ ان پر تحقیق کرنے والے آسانی سے اپنا کام انجام دے سکتے ہیں۔

محمد مصباح اللہ، پلاورم، مدراس

طویل اور شدید انتظار کے بعد نیا دور لکھنؤ کا فراق نمبر حصہ دوم ملا۔ ایک ہی شخص کے متعلق دو ضخیم شمارے مختلف مکتبۂ خیال کے ادیبوں اور شاعروں سے اور پھر وہ بھی اندرونِ ملک کے علاوہ بیرونی ملک کے بسنے والوں سے حاصل کر کے دو ایک سال کے قلیل عرصہ میں شائع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، ان کی لاجواب اشاعت سے آپ کی ہمت، حوصلہ اور اعلیٰ قابلیتیں اور صلاحیتیں اظہر من الشمس ہیں۔

فراق کی شخصیت اور فن کے متعلق "تصویر کے دو رخ (روشن اور تاریک پہلو)" دکھانے کی جو سعی آپ نے کی ہے وہ زبان و ادب کی عظمت کے لیے نیک فال ہے۔ خدا کرے کہ دیگر جرائد و رسائل کے مدیر اس سلسلے میں آپ کی تقلید کریں۔ نیا دور کے فراق نمبر حصہ اول و دوم کو "MINI ENCYCLOPEDIA ON FIRAQ" سے تعبیر کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: گیتان جلی، ترجمہ: سید ظہیر عباس، قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ: رنگ محل پبلی کیشنز ۶/۱۵۵
انصاری روڈ۔ مظفر نگر (یو۔پی)

بین الاقوامی شہرت کے مالک نوبل انعام یافتہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے لافانی شعری نقش "گیتا نجلی" کے اردو میں کئی ترجمے پہلے بھی ہو چکے ہیں جن میں نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے نثری ترجموں اور عبدالعزیز خالد کے منظوم ترجمے کو خاصی داد اور شہرت مل چکی ہے۔ اب سید ظہیر عباس نے اس کا ایک منظوم ترجمہ کیا ہے جو ایک خوبصورت کتاب کی صورت میں چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔

ظہیر صاحب نے "گیتا نجلی" کا ترجمہ کرنے میں بلاشبہ کافی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور ترجمے کو تخلیق کی شان عطا کر دی ہے۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس ترجمے میں "گیتا نجلی" کو اردو زبان اور اردو شاعری کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا ہے، اور اس لحاظ سے ان کا یہ ترجمہ بڑی قدر و اہمیت کا حامل ہے۔

سید ظہیر عباس کے اس ترجمے کے کچھ کمزور پہلو بھی ہیں۔ اس کی جو کمزوری سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ٹیگوریت نہیں ابھر سکی ہے۔ ٹیگوریت جن خصوصیات سے عبارت ہے ان میں کھلی دھرتی اور کھلے آسمان کی فضا کا احساس ایک بہت ہی اہم خصوصیت ہے، اور یہ احساس ظہیر صاحب کے ترجمے میں اجاگر نہیں ہوتا۔ اس کے اسباب پر غور کیا جائے تو سب سے بڑا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ موصوف نے اس میں جو زبان استعمال کی ہے وہ مکمل طور پر مجلسی زبان ہے اور مجلسی زبان کھلی فضا کے احساس کو نہیں ابھار سکتی۔ اس ترجمے کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس میں "ہندوستانیت" کا وہ تاثر مفقود ہے جو ٹیگور کی ساری شاعری اور بالخصوص "گیتا نجلی" کی جان ہے۔ اس کی وجہ اس ترجمے میں استعمال کی جانے والی زبان کا بہت زیادہ معرب و مفرس ہونا ہے۔ اس بات کو ایک موازنے کے ذریعہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ سید ظہیر عباس نے "گیتا نجلی" کے ایک گیت کے ایک ٹکڑے کا منظوم ترجمہ یوں کیا ہے ؂

جی رہا ہوں میں بہ امید ملاقات ہنوز
ہے مگر دور بہت عید ملاقات ہنوز

اور عبدالعزیز خالد نے اسی ٹکڑے کا منظوم ترجمہ اس طرح کیا ہے ؂

کٹ رہی ہے اسی آس میں زندگی
رام جانے کب آئے ملن کی گھڑی

خالد کے مندرجۂ بالا ترجمے کی زبان چونکہ آسان اردو ہے اور اس میں کچھ ہندی کے الفاظ بھی شامل کیے گئے ہیں اس لیے "ہندوستانیت" کا تاثر ابھر آیا ہے اور اس کے برخلاف سید ظہیر عباس کے درج بالا ترجمے کی زبان چونکہ حد درجہ معرب و مفرس ہے اس لیے اس میں "ہندوستانیت" کا کوئی تاثر نہیں ابھر سکا ہے۔

مجموعی طور پر "گیتا نجلی" کا یہ ترجمہ کچھ کمزوریوں کے باوجود قابل داد ہے اور اسے معیاری ادب کے شائقین میں مقبولیت عام ملنی چاہیے۔

—— ڈاکٹر اختر بستوی

نام کتاب: جلوۂ کربلا، شاعر: شارب لکھنوی
قیمت: دس روپے، ملنے کا پتہ: حبیب حیدر خاں
رستم نگر، لکھنؤ ۳

اس مجموعے میں شارب لکھنوی کے اہم مجموعۂ نوحہ جات اور سلام کو یکجا کر دیا گیا ہے، موصوف کے نوحوں و سلاموں کے مجموعے "تنویر کربلا"، "کرب و بلا"، "نور کربلا" اور "انوار کربلا" عرصہ سے نایاب تھے۔ اس مجموعہ

میں شارب صاحب نے اپنے سلام اور چار قصائد بھی شامل کر دیے ہیں۔

شارب لکھنوی اچھے اور پختہ شاعروں میں ہیں۔ ان کے کلام میں غزل کی چاشنی اور مرثیے کا آبِ زلال ملتا ہے۔ کتابت اور طباعت غنیمت ہے۔ محافل اور مجالس میں اس کی افادیت مسلم ہے۔

——— ڈاکٹر فضلِ امام

نام کتاب: سرگزشت آصف، مصنف: پروفیسر ہارون الرشید
قیمت: ۱۲ روپے، ملنے کا پتہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی
۱۷۔ سندری موہن ایونیو کلکتہ ۱۴......

وحشت کلکتوی کے جانشین آصف بنارسی مرحوم نے ڈھاکہ میں اردو کی شمع روشن رکھنے میں تادم حیات کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی باوجود انتہائی نامساعد حالات کے نہ صرف یہ کہ خود گیسوئے اردو سنوارتے رہے بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دیتے رہے جس کا نتیجہ ہے کہ ان کے شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد آج بھی ان کی روش پر قائم رہتے ہوئے زبان و ادب کی خدمت میں منہمک ہے۔

ڈھاکہ کے پروفیسر ہارون الرشید صاحب نے عبدالرحمٰن آصف بنارسی مرحوم کی حیات و شاعری پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے ایک مختصر سی کتاب مرتب کر کے ایک بڑا کام کر دیا ہے، اس طرح ایک گمنام شاعر کا وہ کلام جو تلف ہو جانے کو تھا محفوظ ہو گیا۔

آصف بنارسی مرحوم کلام میں صحت زبان اور محاوروں کے برمحل استعمال کو ضروری سمجھتے تھے انھوں نے ابتذال سے بچنے کی کوشش کی۔ وہ ایک مستند، خوش گو مگر گوشہ نشین شاعر تھے۔ انھوں نے کم و بیش ساٹھ سال گیسوئے سخن کو سنوارنے میں صرف کیے مگر اپنے کو نمایاں کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہ کی۔ انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام تک شائع نہیں کرایا۔ ان کے رنگ کا اندازہ کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل اشعار کا مطالعہ کرنا کافی ہوگا ع

بیچ سے سلسلۂ قصۂ غم توڑ دیا
تیرے عاشق نے جوانی ہی میں دم توڑ دیا

افسانہ میرے دل کا اب تک ہے اک حقیقت
حالانکہ ہر حقیقت افسانہ ہو گئی ہے
وقت ڈالے گا ہماری بھی حقیقت پر نقاب
وہ بھی دن آئے گا ہو جائیں گے جب افسانہ ہم

آصف بنارسی مرحوم کے مختصر انتخاب کلام میں بہت سے ایسے اشعار دلکش و دلکشیں ملیں گے جو ان کی قادر الکلامی اور فصاحت بیان کے مظہر ہوں گے۔ یقیناً مغربی بنگال اردو اکاڈمی قابلِ مبارکباد ہے کہ ایسے قابلِ تعریف کام کر رہی ہے اور گمنام شعرا کو منظرِ عام پر لاکر ان سے مستفید ہونے کا نادر موقع فراہم کر رہی ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: فکر برتر (شعری مجموعہ) شاعر: علیم صبا نویدی
قیمت: اٹھارہ روپے، ملنے کا پتہ: تامل ناڈو اردو پبلیکیشنز
ماونٹ روڈ۔ مدراس

علیم صبا نویدی کا شمار جنوبی ہند کے بڑے اہم اردو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ وہ ایک منفرد جدید شاعر ہیں۔ اب آزاد غزل کی آبیاری کا کام انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا ہے۔ ان کے شعری دامن میں نثری غزل۔ پابند نظم (سانیٹ وغیرہ) آزاد نظمیں اور نثری نظمیں سب کچھ موجود ہے۔ زندگی کی تلخیوں اور ذاتی آلام نے ان کے کلام میں کرب اور سوز و گداز پیدا کر دیا ہے۔ وہ سماج کے سامنے اپنے ہر پوشیدہ راز کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام کے چند نمونے پیشِ خدمت ہیں ؎

فن مصلحت شکار ہوا تو دماغ نے — دامن جلا کے رکھ دیا اپنے نصیب کا
میں مہکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر — میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اتار

المختصر علیم صبا نویدی ایک بالغ نظر فنکار اور اہم شاعر ہیں۔ مجموعے کی کتابت اور طباعت ٹھیک ہے۔ تسلسل صفحات صحیح نہیں ہے۔

——— خلیل اللہ خاں



(دائیں سے بائیں) جناب رباب رشیدی، امیر احمد صدیقی : ایڈیٹر نیا دور
ممتاز ترقی پسند شاعر جناب غلام ربانی تاباں اور جناب رئیس انصاری لکھنؤ ٹیلی ویژن
کے مشاعرے کے سیٹ پر محو گفتگو ہیں۔

AUGUST, 1985
Rs. 1-00 Paisa

REGD. NO. LW/NP-444
Annual Subs.
Rs. 10/-

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226 001




ستمبر اکتوبر
قیمت : دو روپیہ

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۰ نمبر ۶-۷

ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر: ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: ——— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر: ——— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: ——— ۴۷۱۰۸

پبلشر پرشانت کمار مشرا
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

اس وقت ملک میں فرقہ پرست اور تشدد پسند طاقتیں پوری طرح سرگرم ہیں اور فرقہ وارانہ اشتعال پھیلا کر اس ملک کی سالمیت اور یک جہتی کو ختم کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف روشن خیال، ترقی پسند، جمہوری اور سیکولر عناصر غیر متحد اور غیر منظم اور کسی حد تک بے عملی کی حالت میں ہیں۔ اس سے فرقہ پرست اور تشدد پسند طاقتیں پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ جس سے ہماری اعلا روایات، ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب، ہماری آزادی، ہمارے جمہوری اور سیکولر آدرشوں، ہماری سالمیت اور یک جہتی سب کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی اس ملک کی اعلا روایات، مشترکہ گنگا جمنی تہذیب، جمہوری اور سیکولر آدرشوں، نیز اس ملک کی سالمیت اور یک جہتی کی بقا و استحکام کے لیے نہ صرف یہ کہ کوشاں اور سرگرمِ عمل رہے بلکہ انھوں نے اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر دی۔ ان کی یہ عظیم قربانی آج ملک کے پس منظر میں، آج کے حالات میں، بہ زبان خاموشی پکار پکار کر ہم سے کہہ رہی ہے کہ ہم اپنا فرض پہچانیں اور فرقہ پرست نیز تشدد پسند طاقتوں کے خلاف پوری طرح منظم اور متحد ہو جائیں اور ان کی ناپاک سازشوں کو ناکام بنا دیں۔

گاندھی جی جن کا مذہب پر پورا یقین تھا اور عملی طور سے بھی وہ بے حد مذہبی انسان تھے، ان کی تمام پالیسیوں اور سیاست کی بنیاد روشن خیالی اور سیکولرزم پر قائم تھی۔ گاندھی جی کا یہ کردار اور یہ طرز عمل آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور انھیں کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہ کر ہی ہم اپنی روایات کو، مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کو، اپنی آزادی، جمہوریت اور سیکولر آدرشوں کو، اپنی سالمیت اور یک جہتی کو قائم و دائم رکھ سکتے ہیں۔ تو آیئے ہم یہ عہد کریں کہ جس طرح مہاتما گاندھی نے ہر مذہب، اس کے عقائد اور بزرگوں کا جس طرح مساوی طور پر احترام کیا، ہم بھی اسی طرح تمام مذاہب کا، تمام عقیدوں اور سارے مذہبی رہنماؤں کا احترام کریں گے اور اپنے طرز عمل سے کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے اور نہ ایسی کوئی بات ہونے دیں گے جس سے کسی کی دلآزاری ہو۔ درحقیقت ہم نے بابائے قوم کی تعلیمات اور اصولوں کو بڑی حد تک فراموش کر دیا ہے۔ گاندھی جینتی کے اس مبارک موقع پر ملک کے نجات دہندہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنا محاسبہ کرے اور دیکھے کہ وہ گاندھی جی کے سیکولر آدرشوں، اعلا اقدار اور زریں اصولوں پر کس حد تک عمل پیرا ہے۔

وفیات

گزشتہ دنوں لکھنؤ کی دو ادبی شخصیتوں سید کرار حسین رفعت لکھنوی اور اظہر لکھنوی کا انتقال ہو گیا۔ رفعت لکھنوی محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ علمِ شعر اور عروض پر بھی انھیں زبردست دسترس حاصل تھی۔ اسی لیے ان کی شاعری میں زبان و بیان اور فن کے تمام ضوابط نمایاں ہیں۔ علم عروض پر وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ رباعی کے فن پر ان کا ایک بسیط مضمون نیا دور میں بھی شائع ہو چکا ہے اور ابھی کچھ عرصہ قبل ان کی ایک ایسی غزل بھی نیا دور میں شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے بحر کا ایک تجربہ کیا تھا۔ ان کی شاعری میں لکھنؤ کی نزاکت خیال اور شائستگی پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ ایک انتہائی منکسر المزاج اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔

● اظہر لکھنوی بھی شہر نگاراں کے ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ انھیں گنگناتے اور مترنم لہجے کا شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ بڑے ملنسار اور خوش مزاج انسان بھی تھے۔ اور نیا دور کے پرانے معاونین میں تھے۔ ان کی زندگی کا آخری دور گوشہ نشینی اور پریشان حالی میں گذرا۔ پھر بھی ان کی ملنساری اور خوش مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ادارۂ نیا دور ان دونوں فن کاروں کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ

لالۂ صحرائے کربلا

وہ حسینؓ ابنِ علیؓ، نازِ علیؓ، جانِ علیؓ
لالۂ پہلوئے زہرؓا، گوہرِ کانِ علیؓ
وہ حسین ابنِ علی، وہ مایۂ آلِ رسولؐ
قبلۂ اہلِ تمنا، کعبۂ آلِ رسولؐ
وہ حسین ابنِ علی، وہ مرہمِ انسانیت
وہ نگہدارِ بقائے عالمِ انسانیت
وہ حسین ابنِ علی، وہ عشق کا سوز و سرور
ریشۂ جاں کی طراوت، آنکھ کی پتلی کا نور
آ! دکھاؤں میں تجھے فرزندِ حیدرؓ کی جھلک
آ! بتاؤں میں، پیمبرؐ کا نواسہ کون تھا
کون تھا، جس نے دیا دنیا کو پیغامِ ثبات
جذب تھا جس کی رگ و پے میں شعورِ صد حیات
پیاس تھی جس کی، سحابِ دجلہ و موجِ فرات
سیکڑوں صبحوں کا سرچشمہ تھی جس کی ایک رات
ظلمتوں میں جلوۂ صبحِ تمنا کون تھا
جس نے ہنس کر چوم لی صیقل شدہ خنجر کی دھار
جانتی ہے کربلا کی خاک، ایسا کون تھا

وہ لہو سے جس کے، دشتِ کربلا روشن ہوا
کربلا کیا، دو جہاں کا آئینا روشن ہوا
آفتابِ صبح پرور تھا وہ، اس کی ذات سے
مطلعِ ایثار و احسان و وفا روشن ہوا

دشمنوں سے گفتگو بھی کتنی معصومانہ تھی
بدنما تھا جو ورق تاریخ کا، روشن ہوا
اس کے دامن کی ہوا تھی، دامنِ بادِ مراد
تیز آندھی میں چراغِ ارتقا روشن ہوا
پاؤں رکھتے ہی شہادت کی عزیمت گاہ میں
زندگی پر، زندگی کا مدعا روشن ہوا
کس ادا سے کر گیا کالے سمندر کو عبور
نیل کی تاریک موجوں میں عصا روشن ہوا
دل شکستوں کو ملا قربانیوں کا حوصلہ
دور تک جہد و عمل کا سلسلہ روشن ہوا
کیا بجھاتا اس کی مشعل کو یزیدوں کا نفس
جس قدر روشن تھا وہ، اس سے سوا روشن ہوا

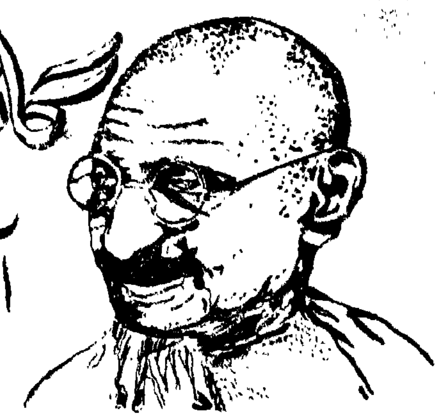
شخصیت جیسی ہو، ویسا ہی تخاطب چاہیئے
میں نے لب کھولے تو حرفِ ماجرا روشن ہوا
خیر و برکت کا وظیفہ ہے کہ اس کا ذکرِ پاک
مدتوں کے بعد یہ دستِ دعا روشن ہوا

●●

گاندھی جی

آغازِ سفر سے منزل تک

احمد جمیل



ہمارا دیش کتنا عظیم ہے کہ یہاں موہن داس کرم چند گاندھی جیسی نادرِ روزگار شخصیت کی قیادت قوم کو نصیب ہوئی۔ ملک کو ویسے بھی جلد یا بدیر آزاد تو ہونا ہی تھا مگر کون جانے غلطیوں کے پیمانہ تک کیا بیت جاتی۔ باپو نے ایک مخصوص فلسفۂ حیات جس کی بنیاد عدم تشدد پر تھی، کے زیرِ سایہ آزادی کی جنگ لڑی۔ جو دنیا کی تاریخ میں ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ اس فتح نے ہندستانیت کو بلا بخشی، یہاں کی اخلاق قدروں کو روشن کیا اور مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی برتری ثابت کی۔ روحانیت کے اس پیکرِ جمیل نے رواداری، نرم دلی، وسیع النظری، سچائی، سادگی اور محبت کا ایک ایسا سبق پڑھایا جسے پڑھکر تمام ہندستانی بلا تفریق مذہب و ملت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ باپو ئے قوم دکھی لوگوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نظر میں سب ایک ہی خالق کے بنائے ہوئے اور ایک ہی منزل پر جانے والے تھے وہ سبھی کی چارہ گری کے لیے بے چین رہتے تھے۔ بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کی دیواریں انھوں نے اپنے آہنی عزم و ارادہ کے ذریعہ گرا دی تھیں۔ افریقہ میں رہ کر انھوں نے مظلوم افریقیوں کی بھی اسی طرح مدد کی جس طرح اپنے بھائیوں کے لیے سرگرمِ کار رہتے تھے۔ وہ ایک زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے جس کے سامنے بڑے بڑے فولاد دل بھی پگھل جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی گھرانے میں پرورش پا کر اور مذاہبِ عالم کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ "مردِ حق آگاہ" بن گئے تھے۔ انھوں نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کیا تھا کہ مذہبیت تنگ نظری کی طرف لے جاتی ہے بلکہ ان کے عمل نے ایک بار دنیا کو پھر باور کرایا کہ صحیح قسم کی مذہبی تعلیم اور مذہبی ماحول ہی انسان کو انسانِ عظیم بناتا ہے۔ خدا کا خوف اس کے بندوں پر رحم کھانا، دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک و حسنِ اخلاق کا معاملہ رکھنا یہ مذہب ہی کے واسطے سے آتا ہے۔ روحانیت کا چراغ بھی اسی کے فیضان سے روشن ہے۔

گاندھی جی ۲؍ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پوربندر کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں اسکول میں داخل کیے گئے۔ دو برس بعد بغرضِ تعلیم راج کوٹ جانا پڑا۔ وہاں انھوں نے والد کی اجازت سے "راجہ ہریش چندر" ناٹک دیکھا جس نے ان کی معصوم زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔ وہ ہمیشہ کہتے کیوں نہ ہم ہریش چندر جیسے سچائی پسند بن جائیں جس نے اپنی ہر چیز حتیٰ کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی اس راہ میں قربان کر دیا۔ ایک بار جب وہ تیرہ برس کے تھے ان کے اسکول میں انسپکٹر معائنے کے لیے آئے۔ انھوں نے لڑکوں سے املا لکھوایا۔ پانچ الفاظ میں ایک لفظ گاندھی جی ٹھیک نہیں لکھ سکے۔ استاد کی نظر پڑی تو انھوں نے اشاروں میں سمجھانا چاہا کہ ساتھ والے لڑکے کی کاپی سے نقل کر لیں۔ جب یہ نہیں سمجھے تو انھوں نے اپنے جوتے کی نوک پیر پر اس زور سے رکھی کہ وہ بلبلا اٹھے۔ پھر بھی اپنے استاد کے اشارے کو نہ سمجھ سکے بعد میں جب استاد نے فہمائش کی تو حقیقت آشکار ہوئی۔ مگر گاندھی جی نے استاد کی عزت میں کوئی کمی نہیں کی وہ خود لکھتے ہیں "ہمیں نقل کرنے کا فن کبھی نہ آیا۔ استاد کی جو عزت میرے دل میں تھی، اس واقعہ سے اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ مجھے کبھی بڑوں کی برائی نظر نہ آتی تھی آگے چل کر مجھے اسی استاد کی اور کمزوریاں بھی معلوم ہوئیں لیکن میں پہلے کی

طرح ان کا ادب کرتا رہا۔ کیوں کہ میں نے تو بڑوں کی فرمانبرداری سیکھی تھی۔ ان کے کاموں پر نکتہ چینی کرنا نہیں سیکھا تھا۔ بزرگوں کی غلطیوں کو نظرانداز کرنا میری فطرت میں تھا۔"

سولہ برس کی عمر کو پہنچے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا یہ ان کی زندگی کا پہلا صدمہ تھا۔ اٹھارہ سال میں میٹرک پاس کیا۔ بعد میں بڑے بھائی نے انھیں مزید تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔

گاندھی جی نے انگلینڈ میں ہی انجیل کا مطالعہ کیا اور وہیں آنحضرت صلعم کی زندگی پر ٹھامس کارلائل کی تصنیف کا مطالعہ کیا۔

اس طرح انھوں نے دیگر مذاہب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں۔ ۱۰ جون ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہندستان واپس آگئے اور وکالت شروع کر دی مگر چند روز میں انگریزوں کے رویے نے ان کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ اسی اثنا میں جنوبی افریقہ کی دادا عبداللہ کمپنی سے جس کے افراد سے ان کے خاندانی روابط رہے تھے، ایک پیغام گاندھی جی کے بڑے بھائی کو ملا کہ ہمیں ایک مقدمہ کے سلسلے میں موہن داس کرم چند کی ضرورت ہے۔ جس کا معقول معاوضہ دیں گے۔ آپ ان کو یہاں بھیج دیں۔ الغرض گاندھی جی ڈربن پہنچ گئے عبداللہ سیٹھ نے ان کو اپنے عزیزوں کی طرح رکھا۔ جنوبی افریقہ میں رہ کر باپو کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے ان کو ایک بہادر لیڈر بنا دیا۔ حالات کے تقاضوں نے انھیں مجبور کیا کہ وہ یہیں رہ کر اپنے ہندستانی بھائیوں کی مدد کریں اور بیرسٹری بھی کریں۔ تین سال کے بعد اپنے بیوی بچوں کو لینے واپس آئے اور یہاں آکر ایک کتابچہ لکھا، جس میں جنوبی افریقہ میں انگریزوں کے مظالم کا احوال درج تھا۔ یہ کتابچہ سبز پمفلٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ جنوبی افریقہ واپسی سے پہلے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے لیڈر، سر فیروز شاہ مہتہ، لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک، اور گوپال کرشن گوکھلے سے ملے جن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"سر فیروز شاہ مہتہ، میری نظر میں ہمالیہ کے برابر تھے اور لوکمانیہ تلک سمندر کی طرح مگر گوکھلے گنگا کی مانند تھے۔ اس پاک دریا میں آدمی جی بھر کر نہا سکتا تھا۔ ہمالیہ پر چڑھنا محال تھا اور سمندر میں کشتی لے جانا دشوار۔ مگر گنگا گود پھیلائے اپنی طرف بلاتی تھی اس میں کشتی لے جانے سے دِل مسرت ہوتی تھی سیاسی لیڈروں میں میرے دل کو جو لگاؤ گوکھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب تک ہے وہ کسی اور سے نہیں۔"

۱۹۰۱ء میں گاندھی جی ایک نئی جوت جگا کر جنوبی افریقہ سے ہندستان لوٹ آئے۔ اسی سال انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ گاندھی جی نے اس جلسہ میں شرکت کی گوکھلے انھیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ جن کی وجہ سے کانگریس کے اجلاس میں انھیں جنوبی افریقہ کے بارے میں کچھ بتانے کا موقع ملا۔ کانگریس کے ارکان سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ تیسری بار جنوبی افریقہ کے حالات کی ابتری نے انھیں پھر سرگرم سفر کیا۔ یہ قیام بہت مفید اور ایک انقلابی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اب ستیہ گرہ کی تحریک نے جنم لیا اور راہنما کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ جیلیں بھرنے لگیں، اور عوام گاندھی جی کی قیادت میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ آٹھ سال کی لگاتار محنت کے بعد باپو کی ستیہ گرہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کو راحت نصیب ہوئی۔

۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو گاندھی جی بمبئی پہنچے۔ جہاں گوکھلے نے بہ نفس نفیس ان کے شاندار استقبال کا انتظام کیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد گوکھلے راہیٔ ملکِ بقا ہوئے اور اپنی ذمہ داریاں گاندھی جی کے سپرد کر گئے۔ اب انھوں نے سارے ہندستان کے سفر کی ٹھانی اس طرح وہ ہندستانیوں کی مشکلات سے تفصیلی طور پر واقف ہوئے۔

رولٹ ایکٹ کے نفاذ کی گاندھی جی نے سخت مخالفت کی لیکن جب حکومت نے انکار کیا تو انھوں نے ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا۔ راج گوپال آچاریہ کی رائے ہوئی پہلے سارے ملک میں ہڑتال کا اعلان کیا جائے اور اس روز تمام ہندستانی برت رکھیں۔ چنانچہ ایک دن کا برت رکھا گیا سب نے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں ملک کی آزادی کے لیے دعا مانگی۔ دہلی میں سوامی شردھانند اور حکیم اجمل خاں کا بول بالا تھا۔ مسلمانوں

نے خود حاضر ہو کے جامع مسجد میں تقریر کرائی۔ اتحاد کا یہ نظارہ سرکاری افسروں کو گراں گزرا۔ انھوں نے گولی چلوادی جس سے آٹھ آدمی مارے گئے۔ لاہور اور امرتسر میں بھی یہی کیا گیا۔ گاندھی جی جنوبی ہند کا دورہ کرتے ہوئے ۴ر اپریل کو بمبئی پہنچے۔ ۶ر اپریل کو عظیم الشان جلوس روانہ ہوا۔ کچھ مسلمان پہلے جلوس کو مسجد میں لے گئے اور وہاں گاندھی جی اور سروجنی نائیڈو سے تقریریں کرائی گئیں۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو عدم تعاون تحریک شروع کردی گئی۔ اسی دن بال گنگا دھر تلک اس جہان سے سدھار گئے۔ انگریز حکومت گاندھی جی کو دبانے پر اپنی ساری طاقت صرف کیے دے رہی تھی مگر ہونا کچھ اور ہی تھا۔ یہ "نقیر" "گیان دھیان" سے اپنی روحانی قوت اتنی بڑھا چکا تھا کہ مادی طاقتیں اس کے سامنے ہیچ نظر آتی تھیں۔ انھیں متعدد مرتبہ قید کیا گیا۔ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں لیکن ان کا حوصلہ بڑھتا ہی رہا۔ انھوں نے نامساعد حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری اور ملک و قوم کے لیے ایک ایسی ٹیم تیار کی جس نے نہ صرف حکمران قوم کے چھکے چھڑا دیے بلکہ ہندستان کو ایک ایسا دستور بخشا جس کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی۔

باپو ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے آزادی کی صبح دیکھی۔ مگر ان کا دل بجھ سا گیا تھا۔ ان کی صحت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ اتحاد کا جو منظر خلافت تحریک اور جنگ آزادی کے دوران دیکھنے کو ملا تھا وہ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ انگریز نے نفرت کا جو بیج بو دیا تھا وہ پھلتا پھولتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان حالات میں "غمگسار قوم" کیا شاد ہوتا۔ آزادی کے فوراً بعد فسادات کی آگ میں جس طرح ہندستان جل رہا تھا وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ آخر انھوں نے ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنا آخری برت شروع کیا۔ تیسرے دن اُن کا وزن گھٹ کر ۱۰۷ پونڈ رہ گیا۔ چوتھے روز باپو کی نبضیں ڈوبنے لگیں۔ پاکستان اور ہندستان سے ہزاروں تار آئے کہ آپ برت توڑ دیں۔ مگر ان سب کے جواب میں یہی آواز سنائی دی: "میرا اس بات پر پورا یقین ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا اگر اسے مجھ سے کچھ اور کام لینے ہوں گے تو وہ میری زندگی محفوظ رکھے گا۔" ۱۸ر جنوری ۱۹۴۸ء کی صبح سارے مذاہب کے نمائندے جمع ہوئے اور انھوں نے بابائے قوم کے سامنے ایک معاہدہ پر دستخط کیے جس کے خاص نکات حسب ذیل تھے:

ہم اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی جان و مال اور مذہب کی حفاظت کریں گے اور دہلی میں جو کچھ ہوا وہ پھر کبھی نہ ہوگا۔ (گاندھی جی نے سن کر سر ہلا دیا۔) ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار پر سالانہ عرس ہمیشہ کی طرح منعقد ہوتا رہے گا۔ (باپو کا چہرہ چمکنے لگا۔) گاندھی جی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس عہدنامے کو پڑھنے کے بعد راجندر پرشاد نے درخواست کی کہ وہ اپنا مرن برت توڑ دیں۔ باپو رونے لگے۔ شکر کی ہچکیاں بندھ گئیں اور پھر مولانا آزاد نے سنگترے کے رس کا ایک گلاس پلا کر ان کا برت ختم کرایا۔

بالآخر اسی اتحاد کے نقیب کی حیثیت سے انھوں نے اپنی منزل پالی۔ شہادت اور وہ بھی عظیم مقصد کی خاطر سب کو کہاں ملتی ہے۔ ابدیت کا تاج سب کے سر پر نہیں رکھا جاتا لیکن وہ اس منصب کے حقدار تھے ان کا نام تاریخ آزادی کا عنوان بن کر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ آنے والی نسلیں ان کی شخصیت کو مشعلِ راہ بناتی رہیں گی۔ مگر ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ ہم باپو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتاتے رہیں کہ وہ کیا تھے اور کیا چاہتے تھے۔

●●●

رئیس رامپوری
بے تک روڈ۔ رامپور (یوپی)

"مہاتما گاندھی"

جس نے قصرِ جفا کو ڈھایا، بندِ غلامی توڑ دیا
ذکر ہے اُس مردِ آہن کا قصہ ہے اُس آندھی کا
آزادی حاصل کرنے کی راہ دکھائی دنیا کو
دنیا میں رہتی دنیا تک نام رہے گا گاندھی کا

"دو اکتوبر"

یہ مبارک اور اہم تاریخ، جس تاریخ کو
ایک شخص معتبر، اک دیدہ ور پیدا ہوا
جس نے پنجے سے غلامی کے چھڑایا دیش کو
آج آزادی کا وہ پیغامبر پیدا ہوا

مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم

نسخ + تعلیق = نستعلیق

اردو زبان جس خط میں لکھی جاتی ہے وہ عربی اور اس کا انداز نستعلیق کہلاتا ہے۔ یہ لفظ دراصل "نسخ" اور "تعلیق" دو عربی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ روزمرہ کی بول چال میں "نسخ و تعلیق" کو پورا ادا کرنا مشکل تھا اس لیے زبان کی خراد نے "خ" اور "د" کو چھیل کر ہلکا پھلکا سا لفظ نستعلیق بنا لیا۔

یہ لفظ جن دو لفظوں سے مرکب ہے وہ بھی عربی خط کے دو مستقل انداز ہیں ان میں کا پہلا آج تک زندہ اور بالعموم عربی زبان کے لکھنے میں کام آتا ہے۔ تعلیق کا چلن بہت دن ہوئے کہ جاتا رہا۔

یہ دونوں انداز ایک اور انداز خط سے بنے ہیں جو عام طور پر "کوفی" نام سے مشہور اور مدت سے متروک ہے۔

کوفی خط اُس عربی خط کی اصلاحی شکل کا نام ہے جو عرب میں اسلام سے پہلے مروج تھی۔ چوں کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کوفہ حکومت کا مرکز اور علوم و فنون کا مخزن قرار پا چکا تھا، اس لیے قدیم خط نے بھی وہاں اپنے پر پُرزے درست کیے اور اس کی نسبت سے "کوفی" کہلانے لگا۔

اس خط میں اونچائی کم اور گولائی ندارد تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کے اہرام کی بنیادیں بھر کر چھوڑ دی گئی ہیں، یا بھاری بھرکم ہاتھ پاؤں، بھدّے جوڑ بیوند اور سپاٹ نقشے والے بونوں کی پلٹن پرا جمائے کھڑی ہے۔

دسویں صدی عیسوی تک پہنچ کر عجمی میل جول سے عربی کے معیارِ حُسن میں سادگی کے ساتھ پُرکاری بھی آگئی۔ اس کا اثر فنون لطیفہ کی دوسری شاخوں کی طرح خط پر بھی پڑا۔ اس صدی کے آخر یا گیارھویں صدی کے شروع میں بغداد کے ایک وزیر ابنِ مُقلہ نے اس مسالے سے تین نئے انداز خط ثُلث، مُحقَّق اور تَوقیع نکالے اور پھر ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری لمبائی کم کرنے سے نسخ پیدا کیا۔ ابن مقلہ نے اسی پر بس نہ کی بلکہ "محقق" میں اکت بڑھا کر "ریحان" اور "توقیع" میں سادگی اور روانی زیادہ کر کے "رقاع" بھی ایجاد کیا مگر ان سب میں نسخ کے اندر رعنائی زیادہ تھی اس لیے فن کاروں نے سب سے زیادہ اس کی طرف توجہ کی اور چودھویں صدی عیسوی میں یاقوت مستعصمی کے ہاتھوں اس خط کے حُسن کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں جس قدر خطاط گزرے ہیں وہ سب کے سب یاقوت کے متبع اور پیرو ہیں۔

یوں تو عبداللہ صیرفی، عبداللہ طباخ ہروی اور شمس کاتب شیرازی وغیرہ اس سلسلے کے مشاہیر میں گنے جاتے ہیں مگر شمس شیرازی کا اثر اتنا بڑھا کہ خط نسخ کا ایک انداز "شیرازی نسخ" کے نام سے عرصے تک زبان زد رہا۔

نستعلیق کا دوسرا جزو "تعلیق" عربی میں "لٹکانا" کا مترادف ہے، کتابوں کے مشکل الفاظ یا مطالب کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں اہلِ علم برجستہ کچھ جملے کتاب کے حاشیوں پر یا بین السطور میں لکھ دیا کرتے تھے اور انھیں "تعلیقات" کہتے تھے۔ عموماً یہ نوٹ اپنے ذاتی

استعمال کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اس بنا پر معمولی سادہ خط میں ہوتے تھے۔ خواجہ تاج الدین سلمانی نے اس سادہ و رواں اندازِ تحریر کے اصول اور ضابطے بنائے اور اسے "خط تعلیق" کا نام دیا۔ یہ نام بعد میں مختصر ہو کر صرف "تعلیق" رہ گیا جس طرح "زبان اردوئے معلّی" نے رفتہ رفتہ صرف "اردو" کی شکل اختیار کرلی ہے۔

خواجہ میر علی تبریزی نے جو پندرھویں صدی عیسوی کے مشہور خطاط ہیں "تعلیق" میں "نسخ" کی باضابطگی، نزاکت اور لوچ کی رنگ آمیزی کرکے اس کا نام "نسخ و تعلیق" رکھا۔ یہ کام کچھ ایسے مبارک وقت میں انجام دیا گیا تھا کہ نستعلیق سارے خطوں کا ناسخ نہیں تو سب پر حاوی ضرور ہو گیا اور اتنا عام ہوا کہ آیندہ اسی سے خط کے "شفیعا" اور "شکست" انداز استخراج کیے گئے۔

نسخ ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد کے ساتھ ہی

اسألوا تعطوا
اطلبوا تجدوا
اقرعوا يفتح لكم



"ذیل میں عربی اردو فارسی خط کے مختلف انداز ایک ماہر خطاط کامل سلیم البابا کے کتابت کردہ درج ہیں۔"

الخط الكوفي

۱- نمونہ کوفی اندازِ خط

[illegible]

۲- نمونۂ ثانی اندازِ خط

سلامة الانسان في حفظ اللسان

فضل العقل على الجاهل كفضل البصر على العمى
سلامة الانسان في حفظ اللسان

۳- نمونۂ ثلث اندازِ خط

الخط الثلث

[illegible]

۴- نمونۂ نسخ اندازِ خط

الخط النسخ

[illegible]

۵- نمونۂ نستعلیق اندازِ خط

الخط التعليق

من سالم الايام طابت حياته وقلت احزانه ونعم باله

۶- نمونۂ ریحان اندازِ خط

[illegible]

۷- نمونۂ رقعی اندازِ خط

الخط الرقعي

[illegible]

۸- نمونۂ دیوانی جلی اندازِ خط

[illegible]

۹- نمونۂ دیوانی اندازِ خط

الخط الديواني

[illegible]

خوشنویس کامل سلیم البابا

ببیروت سنہ ۱۳۱۷

وارد ہوگیا تھا مگر اس نے مشرقی ہندوستان پہنچ کر ایک مخصوص رنگ اختیار کیا جو "خطِ بہاری" کہلاتا ہے۔ اس میں ثلث اور توقیع کی آمیزش کے ساتھ کسی قدر کوفی کی شان بھی پائی جاتی ہے اور پٹھانوں کی عمارتوں کی طرح سادگی و قوت کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

اکبر کے ابتدائی عہد سے شیرازی نسخ کا اثر بڑھتا نظر آتا ہے یہاں تک کہ نادر شاہ کے حملۂ ہندوستان کے بعد شیرازی و ہندی کی امتزاجی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے سب سے بہتر لکھنے والے قاضی عصمت اللہ خاں دہلوی تھے۔

بہاری اور دہلوی انداز کے ساتھ کشمیری اسکول کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کشمیر کی آب و ہوا اور لطافت و حسن نے اکثر ایرانیوں کو بھی اپنی طرف کھینچا ہے خود کشمیریوں میں بھی جمالیاتی ذوق اور صنعت و فن کاری کا زبردست ولولہ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے ایرانیوں سے فن خطاطی سیکھ کر ایک نئی راہ نکالی۔ اس طرز خط میں دہلوی کی سی نزاکت نہ تھی۔ کشمیریوں نے اس کمی کو نقاشی سے پورا کرنے کی کوشش کی اور گلکاری میں ہندیوں سے بازی لے گئے۔

نستعلیق خط بابر کی آمد ہندوستان سے بہت پہلے یہاں روشناس ہو چکا تھا۔ چنانچہ امیر خسرو مرحوم کی مثنویوں اور دواوین کے چند ایسے نسخے رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہیں جو چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے اندر لکھے گئے تھے مگر اس کی حقیقی ترقی اور عام رواج اکبری عہد کے ایرانی خطاطوں کی بدولت ہوا۔ جہانگیر و شاہجہاں کے زمانے میں بھی دیسی اور بدیسی خطاط اس فن کی آبیاری کرتے رہے۔ مگر جس خطاط کا سلسلہ آیندہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا وہ ایران کے شہرۂ آفاق استاد میر عماد حسنی کا بھانجا اور شاگرد آقا عبدالرشید دیلمی ہے۔ یہ عہد شاہجہاں میں وارد ہند ہوا اور تا آخر بادشاہ کی قدردانی کے سائے میں فن کی خدمت کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی ماحول نے عمادی شان میں بھی جدت پیدا کی اور ایک تیکھا انداز لکھنوی نام سے اس بزم میں شریک ہوا۔

میر عیوض علی ملیح آبادی کے ساتھ یہ رنگ رام پور پہنچا اور اتنا مقبول ہوا کہ وہاں کے عوام و خواص سب اس خانوادے کے سلسلۂ شاگردی میں منسلک ہیں۔ رام پوری رنگ کے مشہور استاد الٰہی بخش مرجان رقم اور محمد علی خاں خوش رقم ہیں۔ میر احمد حسن مرحوم نے جو منشی محمد علی خاں مرحوم کے استاد تھے الٰہی بخش مرجان رقم ہی سے اصول فن سیکھے تھے۔

نستعلیق اپنے نوک پلک کی انتہائی نزاکت اور دوائرہ مدات کی سخت اصولی پابندیوں کے باعث روزمرہ کی ضرورت میں آسانی سے کام نہ آسکتا تھا۔ اس لیے محمد شفیع ثانی ایک خوشنویس نے عہد شاہجہاں میں ایک انداز خط "شفیعا" کے نام سے ایجاد کیا۔ یہ نستعلیق کے دائروں کو لمبا کرنے اور بعض حرفوں کو دوسرے کے ساتھ خلاف اصول ملا دینے اور شوشوں کی باریکی کو کم کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانی منشیوں نے شفیعا کو اور رواں کرنا چاہا تو نتیجہ شکست یا گھسیٹ کی شکل میں نکلا۔ یہ خط دوسرے خطوط کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو اردو شاعری میں مرزا غالب کے نسخۂ عرشی زادہ کے اشعار کی ہے کہ جتنا آسان کرنے کی کوشش کیجیے اور پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ شکستہ کے ماہروں کی تحریر کا پڑھنا ناواقف کے لیے کوہ کندن اور کاہ آوردن سے کم نہیں ہے۔

---

* جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مدرسۂ کتابت کی افتتاحی تقریب کی تقریر صدارت کے اقتباسات۔

غلام ربانی تاباں
۲۲۰۔ ذاکر نگر، نئی دہلی

غزل

وہ بھی دن آگیا ہر راہ میں پتھر نظر آیا
بڑی مدت میں دیوانوں کو جینے کا ہُنر آیا

کبھی ایسا لگا ہے درد سے دل نے شفا پائی
کبھی اک تیز خنجر تھا کہ رگ رگ میں اُتر آیا

یہ میخانہ ہے پندِ واعظ کی محفل نہیں زاہد
نہ کوئی گُم راہ سے بھٹکا، نہ کوئی راہ پر آیا

جہانِ شوق میں یوں تو چراغوں کی کمی کیا تھی
مگر غربت میں کام آخر چراغِ رہ گزر آیا

چمن کی صبح کہیے، میکدے کی شام کہہ دیجے
بڑا دل چسپ نظارہ سرِ مقتل نظر آیا

کبھی یوں بھی ہوا ہے زندگی کے شوخ خوابوں میں
ابد کا رنگ بھرنے کے لئے دستِ ہُنر آیا

اس میں کا سب کچھ ہے فرازِ عرش سے تاباںؔ
نہ دل آیا، نہ غم آیا، نہ سر آیا، نہ در آیا

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی
جموں (کشمیر)

قاہرہ میں ایک دن

اپنے گلشن سے نکالا نہ کبھی جس نے قدم
آج آوارہ ہے وہ بوئے چمن کی صورت

لے کے بحرین کا طوفان نگاہوں میں کبھی
کبھی نظروں میں لئے شہرِ عدن کی صورت

کہیں ذرات میں ہے طور کی بجلی کا جمال
اور کہیں بحر کی امواج کرن کی صورت

سامنے آئی جو تصویرِ فرات و دجلہ
آگئی یاد مجھے گنگ و جمن کی صورت

قاہرہ! مشرق و مغرب کے دھڑکتے ہوئے دل
ترا چہرہ ہے کہ تاریخِ زمن کی صورت

ایک اس طرح کا میں آج مسافر ہوں کہ جو
ڈھونڈھتا پھرتا ہے غربت میں وطن کی صورت

اور کیا میں تری توصیف کروں تجھ سے بیاں
اے کہ صحرا میں ہے تو لعلِ یمن کی صورت

شامِ دہلی کا تری شام پہ ہوتا ہے گماں
اور ہے صبح تری صبحِ دکن کی صورت

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
۳۳۸ - نرسنگھ گڑھ سری نگر کشمیر

ایک یادگار انجمن انجمن ترقی اردو



حالی — آرنلڈ — ڈپٹی نذیر احمد خاں — محسن الملک — شبلی — وقار الملک

انجمن ترقی اردو کا یہ یادگار گروپ فوٹو آج سے ۸۰ سال قبل اردو کے مشہور ادیب اور صحافی شیخ عبدالقادر نے نومبر ۱۹۰۴ء کے مخزن لاہور میں شائع کیا تھا۔ تصویر اس سے بھی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ بقول شیخ صاحب گذشتہ چند سالوں میں جو کوششیں زبان اردو کے ذخیرۂ علمی کی ترقی کے لیے ہوئیں ان میں "انجمن ترقی اردو" کا قائم ہونا خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ گروپ فوٹو کے اشخاص انجمن ترقی اردو کی تحریک کے بانی تھے۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو زبان کے ذخائر کے بڑھانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور جن کی عمریں مشاغل علمی کی نذر ہوئی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے صدر آرنلڈ اور سکریٹری شبلی تھے۔ ذیل میں اس یادگار انجمن کے ہر فرد کے بارے میں کچھ ایسے انکشافات کیے جاتے ہیں جن سے تحقیق کا طالب علم استفادہ کر سکتا ہے۔

(۱) گروپ فوٹو میں دائیں طرف سب سے پہلے مولانا حالی تشریف فرما ہیں۔ یادگار غالب، حیات سعدی، حیاتِ جاوید، مقدمۂ شعر و شاعری، حالی کی وہ تصانیف ہیں جن سے اردو ادب مالامال ہے۔ حالی اردو فارسی کے علاوہ عربی کے بھی عالم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں

۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء کو عربی کا امتحان دیا تھا۔[۲۷]

پنجاب کے مشہور صحافی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور نے ہفتہ وار اخبار کو روزانہ جاری کیا۔ حالی نے نومبر ۱۹۰۱ء میں انھیں مبارکباد کا حسب ذیل تار بھیجا:۔

"جو لوگ پنجابی اردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جا رہی ہے۔ اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی ہے یقیناً وہ وقت دور نہیں ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بجائے لاہور اردو کا گھر ہو جائے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا"[۲۸]

حالی نے پیسہ اخبار کے بارے میں اپنے تاثرات اس وقت بیان کیے جب ڈاکٹر اقبال کی اردو پر حسرت موہانی تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس تار کے ذریعہ سے حالی نے اقبال کی غلط تاویلوں کو صحیح قرار دیا تھا"

اقبال کو حالی سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں حالی انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ ضعف اور پیری کے سبب خود نظم نہ پڑھ سکتے تھے۔ اگر پڑھتے بھی تو مجمع زیادہ تھا اور حالی کی آواز زیادہ دور تک نہ پہنچ سکتی۔ اقبال بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ نظم پڑھ کر سنائیں۔ اقبال نے نظم سنانے سے پہلے حالی کی مدح و توصیف میں ذیل کی رباعی پڑھی ؎

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی[۲۹]

ایک اور موقع پر اقبال حالی کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دیدہ بیفسرد
سید دگر اورا نمے از اشک سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

حالی کے جشن صد سالہ کے موقع پر خواجہ غلام السیدین کے چھوٹے بھائی خواجہ اظہر عباس نے مسدس حالی کا صدی ایڈیشن بہت ہی خوبصورت انداز میں شائع کیا۔ جب اس کا ایک نسخہ اقبال کو ملا تو انھوں نے ۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ اظہر عباس کے نام ذیل کا خط لکھا:۔

"ڈیر مسٹر اظہر عباس!

آپ کا خط مل گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک خط موصول ہوا تھا مگر افسوس کہ میں علالت کی وجہ سے خطوط کا جواب لکھنے میں بہت سست ہو گیا ہوں۔

مسدس حالی نہایت عمدہ چھپی ہے۔ اس کے متعدد دیباچے نہایت مفید ہیں۔ میں نے کئی رسالوں کے بعد اسے کل اور پرسوں دوبارہ پڑھا اور نیا لطف اٹھایا۔ امید ہے کہ آپ مرحوم کا باقی کلام بھی اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی اور نفیس جلدوں میں شائع کر سکیں گے۔ محمد اقبال"[۶]

حالی نے سر سید احمد خاں کی فرمائش پر ۱۸۸۶ء میں ایک انقلابی نظم مسدس میں کہی جسے اردو شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "مسدس حالی" اور "مد و جزر اسلام" کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی کتاب ایک ہے اور اس کے دو نام ہیں۔ جناب شکیل الرحمٰن صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کا یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ حالی نے بہت ساری نظمیں لکھی ہیں۔ مسدس حالی اور مد و جزر اسلام دو طویل نظمیں ہیں جن سے حالی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شکیل صاحب "باغ و بہار"

اور "قصۂ چہار درویش" کو بھی میر امن کی دو الگ الگ کتابیں سمجھتے ہیں۔ اسی طرح موصوف کلامِ اقبال کے مجموعے بانگ درا، ضرب کلیم، بال جبریل اور کلیاتِ اقبال کو اقبال کی چار تصانیف قرار دیتے ہیں[8]۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ کلیات کسے کہتے ہیں۔

جب مسدس حالی ۱۸۷۹ء میں پہلی مرتبہ چھپا اور اس کا نسخہ سرسید کو ملا تو انھوں نے مورخہ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء کو شملہ پارک ہوٹل سے حالی کو ایک طویل خط لکھا۔ مسدس کی تعریف کے بعد سرسید لکھتے ہیں :-

"بے شک (جیسا کہ آپ نے دیباچے میں لکھا ہے) میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں۔ کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں[9]"

حالی کی رباعیات بھی مشہور ہیں۔ رباعیات حالی کا مجموعہ پہلی مرتبہ مولوی رحمت اللہ رعد نے چھوٹی تقطیع میں ۱۹۰۴ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس کتاب پر رسالہ دکن ریویو ص ۲۹ مطبوعہ جون و جولائی ۱۹۰۴ء میں تبصرہ کیا۔ اور کاتب منشی الطاف حسن پر اعتراض بھی کیے۔

اسی سال جی۔ ای۔ وارڈ نے رباعیاتِ حالی کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ انگریزی کے ساتھ رومن حروف میں اصل رباعیات بھی درج کی ہیں۔ اس کتاب سے حالی کی شہرت انگلستان تک پہنچ گئی۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ آخری صفحے میں درج ہے کہ ۱۷ جون ۱۹۰۴ء کو حکومت ہند نے حالی کو شمس العلماء کا خطاب دیا ہے۔

(۲) مولانا حالی کے پاس مسٹر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ صاحب کھڑے ہیں۔ از روئے قاعدہ انھیں اس انجمن میں سب سے آگے کرسی نشین ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ابتدائے قیامِ انجمن سے وہ اس مجلس کے صدر رہے تھے اور ان کے مفید مشورے سے کئی علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے کے لیے منتخب ہوئیں۔ مگر وہ ازراہ انکساری جو علماء کا خاصہ ہے اور جو ان کے مزاج میں بکثرت موجود تھا مستعد استاد تھے۔ آرنلڈ ۱۹ اپریل ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ سٹی آف لندن اسکول اور میگڈین کالج کیمبرج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۸ء یعنی دس سال تک علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد رہے اور ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ سے آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے[10]۔ انھوں نے قیامِ علی گڑھ کے دوران مسلمانوں کی وضع اور طرزِ بود و باش اختیار کی تھی جس کی بنا پر سید سلیمان ندوی ان کو کامل مسلمان نہ سہی تو نیم مسلمان ضرور سمجھتے تھے[11]۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ :-

"میں نے کالج میں آرنلڈ کو کبھی انگریزی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھوں میں موٹے دستے کی چھڑی لیے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آجاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو کہ ملا جی کسی مسجد میں درس دینے جاتے ہیں[12]"

ان دونوں بزرگواروں کی تائید اخبار وکیل امرتسر سے بھی ہوتی ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ :-

"آرنلڈ طلبائے مدرستہ العلوم کو بورڈنگ کے

"کال کال کشرکت نماز جماعت کے لیے گھیرتے پھرا کرتے تھے۔ یعنی ان کو مسلمان بچوں کی نماز وغیرہ کی پابندی کا بڑا خیال رہتا تھا"[13]

آرنلڈ نے ہی علی گڑھ میں ۱۸۹۰ء کی ابتدا میں "انجمن اخوان الصفا" قائم کی تھی[14] لاہور جانے سے قبل علی گڑھ میں آرنلڈ کے اعزاز میں ایک الوداعی جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر شبلی نے اپنی تقریر میں ذیل کے دو شعر پڑھے ؎

آرنلڈ آنکہ دریں شہر و دیار آمد و رفت
دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت
آمد آں گونہ بہ کالج کہ بہ گلزار نسیم
رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت[15]

یہ آرنلڈ ہی تھے جن سے اقبال نے فلسفہ کا درس لیا[16] اور انھوں نے ہی اقبال کو یورپ میں اعلیٰ تعلیم کی ترغیب دی[17] آرنلڈ لاہور میں اپنی ملازمت چھوڑ کر ۲۶ فروری ۱۹۰۴ء کو انگلستان روانہ ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد اقبال بڑے ملول اور رنجیدہ ہوئے۔ انھیں آرنلڈ سے جو محبت و عقیدت تھی وہ ان کی نظم "نالۂ فراق" سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نظم پہلی مرتبہ آٹھ بند میں چھپی تھی۔ نظم کی ابتدا میں اقبال نے ذیل کے تاثرات قلمبند کیے تھے :-

"استاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکنت قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ——— ایک روز تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لاکے کھڑا کر دیا۔ اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آگئے۔ جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اس وقت لکھی بھی جا چکی تھی۔ تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردآمیز اظہار تھا کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ آپ کی تشریف آوری کے بعد دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں بہت سی تبدیلی ہوگئی"[18]

نظم پر اقبال نے نظر ثانی کر کے اس کے تین بند حذف کیے اور صرف پانچ بند بانگِ درا میں شائع کیے۔ ذیل میں وہ تین بند درج کیے جاتے ہیں جن میں اقبال آرنلڈ کی جدائی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں ؎

ہوگئی رخصت مسرت، غم مرا ہمدم ہوا
دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا
کچھ عجیب اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا
دل مرا منت پذیرِ نالۂ پیہم ہوا
حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہ گوشم دیدہ اند

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پرخوں مرا
صورتِ سیماب مضطر ہے دلِ محزوں مرا
دردِ فرقت سے ہے رنگیں نالۂ موزوں مرا
داغِ حرماں ہے سراپا ہر گلِ مضموں مرا
آہ وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

زندگی کا دامنِ انساں میں گویا خار ہے
آرزو کا دل میں، سینے میں نفس کا خار ہے
یوں تو اس عالم کے ہر ذرّے سے اگلتا خار ہے
خارِ فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے
"زندگانی در جگر خار است و در پا سوزن است
تا نفس باقی است در پیرہن ما سوزن است"

لندن میں بھی اقبال نے آرنلڈ سے استفادہ کیا اور ان کے پاس جایا کرتے تھے۔

آرنلڈ کا انتقال لندن میں ۹ جولائی ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ اقبال کو ان کی موت سے شدید صدمہ ہوا۔ انھوں نے ۱۶ جولائی کو لیڈی آرنلڈ کے نام ایک خط لکھا جس میں نہ صرف

رسمی ہمدردی اور غم گساری کا اظہار کیا ہے بلکہ اپنی ذات کے حوالے سے آرنلڈ کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے[19]

(۳) آرنلڈ کے پاس شمس العلماء حافظ محمد نذیر احمد جلوہ فروز ہیں۔ وہ ۱۸۳۱ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے ناول نگار ہیں جن کے ناول ہندستانی معاشرے کے مطابق ہیں۔ موصوف اپنے زمانے کے بہترین مقرر تھے۔ اردو نثر نگاری میں وہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، ایامیٰ، محصنات، ابن الوقت، رویائے صادقہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ سب سے پہلے اور مقبول کتاب مراۃ العروس کا ایک نہایت عمدہ انگریزی ترجمہ مع حواشی انگلستان میں شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ مسٹر وارڈ صاحب ہیشنر سی۔ ایس کی اردو دانی کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے رباعیاتِ حالی کا بھی انگریزی ترجمہ مع حواشی کیا ہے۔ سید محمد عنامن کنتوری نے وارڈ صاحب کے ترجمۂ مراۃ العروس کی منظوم تقریظ ۸۵ شعر میں لکھی جو مخزن لاہور مطبوعہ مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ چونکہ تقریظ ایک نایاب و نادر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

مہرِ عالمتاب جب پنہاں ہوا
پڑ گیا دنیا پہ پردہ رات کا
ہر طرف سے اک خموشی چھا گئی
لے کے جامِ بیخودی نیند آگئی
کر دیا ایک اک کو مستِ خوابِ ناز
اٹھ گیا نیک اور بد کا امتیاز
ہو کے فارغ سارے دن کے کام سے
بستروں پر لیٹے لوگ آرام سے
خوابِ راحت سے ہوئے سب ہوشیار
خلق کا جاری ہوا پھر کاروبار
یوں ہی جب سات آٹھ نو دس بج گئے
ڈاکیہ وارد ہوا کچھ خط لیے
ان خطوں میں ایک بُک پیکٹ بھی تھا
دیکھتے ہی جس کے جی خوش ہو گیا
کس طرح کہیے کہ وہ تحریر تھی
مشفقِ نادیدہ کی تصویر تھی
الغرض دل کو زیادہ کب تھی تاب
جب لفافہ کھولا نکلی اک کتاب
پڑھ کے ٹیٹل پیج ظاہر ہو گئی
تھی جو کچھ تعبیر شب کے خواب کی
یعنی وہ جو خضر صورت تھے بزرگ
مجھ پہ ہیں جو مہرباں جیسے بزرگ
ہیں وہ جی۔ ای۔ وارڈ صاحب ذی ہنر
فاضلِ نام آور و بالغ نظر
جو ہیں اُستادِ علومِ مشرقی
بلکہ نقادِ علومِ مشرقی
ہیں ادیبِ کاملِ اردو زباں
جیسے کوئی فاضلِ ہندوستاں
عورتیں جب قوم میں جاہل رہیں
مرد لائق ہو سکیں ممکن نہیں
جام وہ جس میں یہ آبِ صاف تھا
ساغرِ جم سے ہے رتبہ میں سوا
یعنی شرح بابِ عاداتِ العروس
نسخۂ نایاب مراۃ العروس
جو توجہ سے بنا ہے وارڈ کی
شمع فانوسِ زبانِ انگلش
روشنی کا جس کی ہوگا یہ اثر
لیڈیاں یورپ کی جو ہیں باخبر
دیکھیں گی خال و خطِ خوبانِ ہند
سمجھیں گی کچھ حالتِ نسوانِ ہند
جس سے پیدا ہوگا ربطِ باہمی

آپ نے کی یگانگی میں کچھ کمی
وہ جو پنے ہندی جو تھی چکھی ہوئی
سامنے یورپ کے تم میں تھی دھری
یعنی پہلے جو کتاب اردو میں تھی
اب وہ انگریزی میں چھپ کر آگئی
پھر خیال استفادہ ہو گیا
شوق پابند ارادہ ہو گیا
کیا کہوں پڑھ کر ملا کیسا مزہ
ہر ورق پر کرتا تھا شکر عطا
یوں تو انگلش کی ثنا ممکن نہیں
اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں
صاف ہے سنجیدہ ہے آسان ہے
پھر بھی پوری ترجمہ کی شان ہے
وارڈ سا فاضل کہاں ضامن کہاں
ذرہ نتواند رسد تا فرقداں
آپ کی تعریف اور میرا دہن
اس میں ہے خود مجھ کو بھی جائے سخن

نذیر احمد کی دوسری مشہور تصنیف توبۃ النصوح ہے۔ اس کا منظوم اردو ترجمہ سید امیر حسن فروغ شاگرد داغ نے بقالب مثنوی کی صورت میں ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں کیا۔ "مفادِ آخرت" اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کتاب کا حوالہ کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ اس لیے سرورق کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا
مثنوی توبۃ النصوح منظوم
۱۳۲۰ھ
اسم تاریخی
مفادِ آخرت
مصنفہ
عالی جناب شاعر شیریں مقال ثانی سحبان مولوی سید امیر حسن صاحب المتخلص بہ فروغ لکھنوی وکیل ہائی کورٹ نظام حیدرآباد دکن

زیر نگرانی
حق گو و حق شناس جناب مولوی غلام عباس صاحب
مہتمم امامیہ جنرل بک ایجنسی لاہور
حاج سٹیم پریس لاہور میں باہتمام ایشر داس صاحب مینیجر چھپا

کتاب میں کل ۲۴۸ صفحات ہیں۔ ص۲ میں چہاردہ معصومین کا شجرہ ایک گلدستہ میں بنا ہوا ہے اس کے اوپر اور نیچے ذیل کا شعر درج ہے ؎

گلے از گلشن پیغمبر است ایں
نہال بوستان حیدر است ایں

صفحہ ۲۴۷ اور ۲۴۸ میں "قطعۂ منظوم بر تقریظ و تاریخ سال تصنیف مثنوی مفادِ آخرت مصنفہ جناب مستطاب العالم البار مولوی السید محمد غلام جبار صاحب فاضل زاد فضلہ وکیل ہائی کورٹ سرکار نظام حیدرآباد دکن۔ تقریظ ۳۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ ذیل میں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

تخلص فروغ اسم امیر حسن
سخن سنج و ذی خلق و مجد و علا
نہایت ہیں خوش فکر نازک خیال
ذہانت کا بس ان پہ ہے خاتمہ
کہوں گر میں فردوسیِ عصر انھیں
تعلی نہ ہوگی کچھ اس میں ذرا
عروج ان کو کیوں شاعروں میں نہ ہو
کہ استاد ان کے ہیں اوج و بقا
انھیں کی یہ تصنیف ہے مثنوی
نصیحت کا دریا ہے گویا بہتا
ہے بحر لطافت اگر اس کی نظم
تو مضمون ہیں گوہر بے بہا
حقیقت میں جیسی ہے یہ مثنوی
نہیں اس کی ہوسکتی ویسی ثنا
کیا ہے عجب نیک کام آپ نے

خدا آپ کو دے گا اس کی جزا
رہِ راست سے جو کہ گمراہ ہیں
انھیں ہوگی یہ مثنوی رہنما
گناہوں سے تائب وہ ہو جائیں گے
نہ ہوگی کبھی ان سے سرزد خطا
کہیں گے شب و روز اسے پڑھ کے سب
اتوب الی اللہ صبح و مسا
سُنی اس کی تصنیف کی جب خبر
یہ فاضل کے دل نے کہی اس سے کہا
رقم سال تہنیت کر اس کا تو
عروسِ ہدایت ہے زینت فزا
۱۳۲۶ھ

تقریظ کے بعد منظوم حمد باری (۳۶ شعر) نعتِ سرورِ کائنات (۲۶) اور مدح حضرت علی علیہ السلام (۶۳) درج ہیں۔
صفحہ ۸ پر قصے کا آغاز درج ذیل الفاظ سے ہوتا ہے :۔
" ایک برس دہلی میں ہیضے کی بیماری بہت سخت آئی۔ نصوح نے ہیضہ کیا اور سمجھا کہ وقت مرگ قریب ہے۔ یاس کے عالم میں اس کو مواخذۂ عاقبت کا تصور بندھا۔ ڈاکٹر نے اس کو خواب آور دوا دی تھی۔ سو گیا تو وہی تصور اس کو خواب موحش بن کر نظر آتا "

شہر دہلی میں کہتے ہیں ایک سال
زور ہیضہ کا تھا یہ دور از حال
لاش ہر سمت سے نکلتی تھی
سچ تو یہ ہے کہ گولی چلتی تھی
ہر گلی کوچہ میں یہی تھی پکار
گرم رہتا تھا موت کا بازار
ہر طرف موت ہی کے تھے ساماں
ہوئے جاتے تھے گھر کے گھر ویراں
بھر گئے تھے اسی صدا سے کان
شور تھا کُلِّ مَنْ عَلَیہَا فَانْ

ہے جو اک کوچۂ حکیم بقا
اس دلی کا صرف حال یہ تھا
تیس چالیس روز مرتے تھے
دارِ فانی سے کوچ کرتے تھے
سب کے سب نزع غم سے تھے بیتاب
خوش فقط گورکن تھے یا غسال
تھا ہر اک شخص اپنی حالت میں
شہر کا شہر تھا مصیبت میں
کل جہاں تھی کٹوروں کی جھنکار
آج سنسان تھے وہی بازار
ہاں مگر ایک نصوح نیک خصال
کرتا تھا شکر ایزد متعال

کتاب اشعار ذیل پر ختم ہوتی ہے ؎

گزرے دہلی میں جس قدر ہیں حکیم
کرتے ہیں اس کے نام کی تعظیم
اب حمیدہ کا حال باقی ہے
اک وہی خوش خصال باقی ہے
علم کے ساتھ اس کی عمر بڑھی
حفظ قرآں کیا، حدیث پڑھی
نہیں کچھ جھوٹ اس میں سچ ہے یہ بات
شہر میں جس قدر ہیں مستورات
علم کا ان میں کچھ جو چرچا ہے
بی حمیدہ کا سب وہ صدقا ہے

(۴) ڈپٹی نذیر احمد کے پاس مولوی سید مہدی علی خان المعروف نواب محسن الملک صاحب بہادر تشریف فرما ہیں۔ سرسید مرحوم کے جانشین اور علی گڑھ کالج کے مشہور سکریٹری کا نام ایسا نہیں جس کے متعلق کسی بیان کی ضرورت ہو۔ تہذیب الاخلاق ان کے دم قدم سے تھا۔ تقریر میں جادو کی تاثیر تھی بات کرتے تھے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اردو زبان کے مقرروں میں نواب محسن الملک کا ہم پلہ کوئی

تھا۔ ان کی تقریریں نفیس استعارات اور دل فریب تشبیہات کے سبب رنگین ہوتی تھیں۔ اخبار نور الآفاق اور نور الانوار ان کے زبردست مخالف تھے۔ یہ دونوں اخبار کانپور سے تہذیب الاخلاق کی توڑ پر اسی زمانے میں جاری کیے گئے تھے۔ اودھ اخبار لکھنؤ میں نواب موصوف کے کئی معرکۃ آرا مضامین نظر سے گزرے ہیں۔ ان تینوں اخباروں میں سرسید تحریک کے خلاف اور حق میں بہت سا مواد فراہم ہوتا ہے ان اخباروں کی فائلیں امر سنگھ کالج سری نگر کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ نواب محسن الملک کے مضامین تہذیب الاخلاق جلد اول میں ان کے انتقال سے پہلے ہی چھپے تھے۔

نواب محسن الملک اٹاوہ میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو سرسید تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے بعد شملہ میں انتقال کیا۔ مولانا حالی نے اس موقع پر ایک دردناک قطعہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حالی کے بیان کی تائید محمد الدین فوق سے بھی ہوتی ہے۔ وہ "ماتم نواب محسن الملک" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ

"نواب محسن الملک کا ماتم سارے ہندوستان میں منایا گیا۔ ۳۰ اکتوبر کو یہ خبر کشمیر پہنچی۔ ۳۱ اکتوبر کی سہ پہر کو خان صاحب منشی سراج الدین احمد میر منشی ریذیڈنسی، ماسٹر صادق علی خان صادق ہیڈ ماسٹر، خواجہ صمد جو ککر و اور مولوی عتیق اللہ صاحب سکریٹری انجمن نصرت اسلام سری نگر کی سعی سے اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر کے وسیع صحن میں ایک ماتمی جلسہ ہوا۔"[21]

فوق نے ماتمی جلسے میں ایک ترکیب بند پڑھا تھا۔ ذیل میں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

مٹ گیا جورِ فلک سے قوم کا محسن بھی آج
آہ پھر گم کردہ رہ یہ کارواں ہونے کو ہے
قوم کا خادم بھی سید بھی تھا مہدی بھی تھا
رونقِ بزمِ جہاں زیبِ جناں ہونے کو ہے
یوں تو ہے وقتِ ظہورِ مہدی و احمد مگر
آہ جو کچھ ہے عیاں وہ بھی نہاں ہونے کو ہے
وقف تھا تو قوم کی خاطر مگر شملہ میں آہ
کیا خبر تھی نذرِ مرگِ ناگہاں ہونے کو ہے
کیا بتائیں ہم بقولِ داغ کیا جاتا رہا
جو بھروسہ تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا

(۵) نواب محسن الملک کے پیچھے مولانا شبلی کھڑے ہیں۔ وہ اردو فارسی کے اعلیٰ درجے کے انشا پرداز ہیں۔ اور دونوں زبانوں کے بلند پایہ محقق اور ناقد ہیں۔ تاریخ و سیرت پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

المامون، الفاروق، الغزالی، موازنۂ انیس و دبیر، سیرۃ النعمان، سیرۃ النبوی، شعر العجم۔

(۶) آخر میں چھٹے نمبر پر مشتاق حسین معروف بہ نواب وقار الملک کرسی نشین ہیں وہ امروہہ میں ۱۸۳۹ء پیدا ہوئے۔ وہ بھی سرسید کے سرگرم کارکنوں میں تھے۔ تہذیب الاخلاق میں ان کے زوردار مضامین چھپتے تھے۔ ان کا انتقال ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں ہوا۔ تفصیلی حالات داستان تاریخ اردو اور تاریخ ادب اردو میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ●●●

۱؎ مخزن لاہور مطبوعہ نومبر ۱۹۰۶ء، ۲؎ اودھ اخبار صفحہ ۸ مورخہ ۶ اگست ۱۸۷۰ء، ۳؎ اخبار وکیل امرتسر صفحہ ۲ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۳ء، ۴؎ اردوئے معلی صفحہ ۳ فروری ۱۹۰۴ء، ۵؎ مسدس حالی صدی ایڈیشن مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۶؎ نیا دور لکھنؤ صفحہ، جنوری ۱۹۸۳ء ۷؎ نظم صبح چمن صفحہ ۹۵، ۸؎ نظم صبح چمن صفحہ ۱۲۰، ۹؎ مسدس حالی صدی ایڈیشن ۱۹۳۵ء، ۱۰؎ حیات شبلی صفحہ ۱۳۱، ۱۱؎ معارف مطبوعہ جولائی ۱۹۳۰ء شذرات، ۱۲؎ ذکر عبدالحق صفحہ ۲۳ سید سلیمان ندوی، ۱۳؎ وکیل امرتسر صفحہ ۵ مورخہ ۶ اگست ۱۹۰۳ء، ۱۴؎ نیا دور لکھنؤ صفحہ ۶، ۱۵؎ حیات شبلی صفحہ ۱۳۱ سید سلیمان ندوی، ۱۶؎ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ صفحہ ۱۳۱ ڈاکٹر وحید قریشی (لاہور)، ۱۷؎ دی آرڈننٹ بلگرام صفحہ ۳۸، ۱۸؎ مخزن لاہور جلد ۱، مطبوعہ مئی ۱۹۰۶ء، ۱۹؎ لیٹرز اینڈ رائٹنگز آف اقبال صفحہ ۱۱، ۲۰؎ داستان تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۵۳، ۲۱؎ کلام فوق صفحہ ۸۹۔

بشیر بدر
D-120 شاستری نگر میرٹھ

غزلیں

(۱)

نہیں یہ آنکھ میں آنسو نہیں محبت ہے
تم آگئے ہو تو غم کتنا خوبصورت ہے

خدا نے اس کو بنایا ہے کیسی فرصت سے
غزل کا خواب ہے احساس کی نزاکت ہے

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

یہ آنسوؤں سے لکھا تھا اُداس آنکھوں میں
کہیں نہ جاؤ تمھاری بڑی ضرورت ہے

ابھی خبر نہیں شاید مرے عزیزوں کو
تمھارے شہر میں انسان کی جو قیمت ہے

ذرا سی بات کا اتنا ملال کرتے ہو
شکایتیں بھی وہیں ہیں جہاں محبت ہے

کوئی خیال ہو اس کا خیال لگتا ہے
اسی کو سوچتے رہنا مری عبادت ہے

(۲)

یہ کسک دل کی دل میں چبھی رہ گئی
زندگی میں تمھاری کمی رہ گئی

ایک میں، ایک تم، ایک دیوار تھی
زندگی آدھی آدھی بٹی رہ گئی

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح
میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی

میرے گھر کی طرف دھوپ کی پیٹھ تھی
آتے آتے اِدھر چاندنی رہ گئی

ریت پر آنسوؤں سے ترے نام کی
جو کہانی لکھی، بے پڑھی رہ گئی

میں نے روکا نہیں وہ چلا بھی گیا
بے بسی دور تک دیکھتی رہ گئی

اطہر علی فاروقی
۳۳ - دریاباد - الٰہ آباد - ۳

(ڈراما)

تو غم کیا ہے!

[ہم نے (بشرطِ حیات) ارادہ کیا ہے کہ فیض احمد فیضؔ کی اسیرانہ زندگی کو ڈرامائی فیچر کے روپ میں پیش کریں اور وہ صرف اس لیے کہ ان کے کلام کا زیادہ حصہ اسی وقفے کا ہے اور ۱۹۵۱ء سے پہلے کلام سے ہر اعتبار بہتر۔ ابتدائی کلام اکثر (بیشتر غمِ جاناں (وہ بھی زیادہ تر ذاتی حقائق) پر مشتمل ہے۔ یوں تو غم دوراں کا احساس انھیں انکے والد محترم کے انتقال کے بعد سے شروع ہو گیا تھا اور انھیں غرباء اور مساکین کے مصائب اور آلام ستانے لگے تھے مگر ۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک میں شمولیت نے اس احساس میں زیادہ شدت اور خلوص پیدا کیا... میجر محمد اسحاق صاحب نے "زنداں نامہ" میں ان کی زندانی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کام یقیناً لائقِ ستائش ہے، لیکن (معذرت کے ساتھ) عرض کرنا پڑتا ہے کہ مجموعہ نہ صرف نامکمل ہے بلکہ جو تاریخیں دی ہیں اور وہ بھی قابلِ وثوق نہیں ہیں۔ ہم سردست ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ایک غزل "ستم کی راہیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تیری انجمن سے پہلے" زنداں نامہ کے صفحہ ۵۹ پر تاریخ ۱۱-۲۲ مئی ۱۹۵۲ء دی۔ مگر مسز ایلیس فیضؔ صاحبہ کے نام نوشتہ خط نمبر ۹، مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۵۲ء کے صرف یہ جملے پڑھ کر اندازہ کیجیے:

"میں نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا ہے اور شاید اس ہفتے تک کچھ اشعار ہو جائیں اپنے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ اشعار یہ ہیں ستم کی راہیں ...."

اس لیے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل، ۱۱ یا ۱۸ مارچ ۱۹۵۲ء میں نظم ہوئی ہے نہ کہ ۱۹۵۳ء میں۔ مزید براں "زنداں نامہ" کا انتخاب صرف مانٹگمری (ساہیوال) جیل تک محدود ہو گیا ہے۔ سرگودھا جیل، لائل پور جیل اور قلعہ لاہور جیل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں وہ اپنے ۱۲ جون ۱۹۵۱ء کے خط نمبر ۲ میں لکھتے ہیں "گرفتاری کے بعد میں نے ابھی ابھی چھٹی نظم ختم کی ہے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ گزشتہ تین سال میں جتنا کچھ لکھا تھا ان تین ماہ میں اس سے دوگنا لکھ چکا ہوں" حیدرآباد (سندھ) جیل جہاں فیضؔ صاحب زیادہ عرصے تک رہے اور وہاں کی تخلیقی شاعری نسبتاً زیادہ ہے۔ انتخاب میں اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی ...

اس ڈرامائی فیچر "توعم کیا ہے" میں ہم صرف سرگودھا، لائل پور اور قلعہ لاہور جیل کی اسیرانہ "قید تنہائی" اور زندانی شاعری پیش کر رہے ہیں اور اسیرانہ زندگی اور زندانی شاعری کا پہلا ایکٹ یا حصہ سمجھئے۔ ان کے کلام پر ناقدانہ تبصرہ بعد میں پیش کیا جائے گا۔ جب کبھی مکمل اسیرانہ زندگی کتابی صورت میں شائع ہو سکے گی۔۔۔ [ا۔ ف]

(۱) طوفانِ حوادث

افراد۔ (۱) راوی۔ عمر ۵۰ سال۔ گندمی رنگ بدن مائل بہ فربہی۔ ہلکی سفید داڑھی۔ لب تراش مونچھیں صرف کرتا۔ پاجامہ۔ کشمیری ٹوپی اور چپل پہنے ایک کرسی پر بیٹھا ہے اور لکھ رہا ہے۔

(۲) ایک موسیقار۔ جواں سال۔ گندمی رنگ۔ صحت مند۔ کلین شیو۔ پینٹ اور بش شرٹ میں۔

راوی۔ کل جو کچھ میں نے تم سے کہا تھا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب تک حق و باطل کا ٹکراؤ باقی ہے، حق پرست حوادثات کے طوفان میں گھرے رہیں گے۔ زور آور باطل پرست انھیں طرح طرح سے دبانے کی کوشش کریں گے۔ خواہ وہ اختلاف مذہبی مسائل کے ضمن میں ہو فرماں روایان ملک اور جمہور پرست غربا اور مساکین کے ہمدردوں کے درمیان ہو۔ ادیب ہوں یا شاعر۔ تاریخ ساز ہستیاں ہوں یا مؤرخ۔ صحافی ہوں یا سیاست دان۔ جب جب دیانت اور بد دیانتی کا تصادم ہوا ہے۔ دیانت دار حق پرست حوادثات کے گرداب میں پھنستے رہے ہیں، مگر حق پرستوں کے عزائم میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ تو فرماتے رہے

موسیقار۔ (گاتا ہوا داخل ہوتا ہے)

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب\
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں (مرزا غالبؔ)

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب\
وہ تو چلتی ہے تجھے تیز اڑانے کے لیے (ڈاکٹر اقبالؔ)

راوی۔ اور فیض احمد فیضؔ نے پاکستان مزدور فیڈریشن کے مزدوروں کے مطالبات کی حمایت میں پاکستان ٹائمز میں ایک زوردار آرٹیکل لکھ ڈالا جس کے نتیجے میں وہ سرگودھا جیل میں قید تنہائی بھگتنے کے لیے یہ کہتے ہوئے چل دیے۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو۔

پلے بیک موسیقار۔ غمِ جہاں ہو غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم\
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

(۲) متاعِ لوح و قلم

افراد۔ (۱) فیض احمد فیضؔ۔ عمر تقریباً ۴۰ سال۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ فربہ اندام۔ کلین شیو۔ پینٹ بش شرٹ میں

(۲) اسسٹنٹ جیلر عمر ۳۰ سال دبتا گندمی رنگ۔ دراز قامت۔ متوسط بدن۔ کلین شیو

(۳) واچ اینڈ وارڈ عمر تقریباً ۴۵ سال سانولی رنگت۔ متوسط بدن۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ داڑھی صاف۔

(۴) پلے بیک موسیقار۔

تاریخ اور مقام اور وقت۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء تا ۲۰ مئی ۱۹۵۱ء سرگودھا جیل۔ ۹ اور ۱۰ بجے دن درمیان

[یہ وہ اشارہ ہے - سرگودھا جیل کی ایک کوٹھری
ستون سا پلنگ - جس پر فیض احمد فیض بستر بچھا
رہے ہیں اور ذرا ہٹ کر ایک اسٹول رکھا ہے -
فیض صاحب سر جھکائے پلنگ پر بیٹھے ہیں کہ
اچانک اسسٹنٹ جیلر داخل ہوتے ہوئے
موصوف کو سلام کرتا ہے]

ض احمد فیض۔ (سلام کا جواب دیتے ہوئے) آپ کی تعریف
اور زحمت کشی کا مقصد ؟

یلر ۔ میں اس جیل کا اسسٹنٹ جیلر ہوں جہاں
آپ قید تنہائی میں رکھے گئے ہیں اور مقصد!
قوانین جیل کی پابندی!

یض احمد فیض۔ یعنی۔

جیلر۔ (مؤدبانہ انداز میں) تلاشی اور جو کچھ آپ کے
پاس ہے اس کو جیل کے قبضے میں دے دینا۔

ض احمد فیض۔ (مسکراتے ہوئے) بڑے شوق سے آپ قانون
کی بجا آوری کریں۔

(اسسٹنٹ جیلر اور اس کا ساتھی سب چیزیں
رکھتا جاتا ہے۔ کتابیں۔ رسالے۔ کاغذات
وغیرہ۔ جیلر اس کی فہرست تیار کرتا ہے اور آخر
میں بش شرٹ کی بالائی جیب سے لگا ہوا فاؤنٹین
پین نکالنے لگتا ہے...)

ض احمد فیض۔ بھائی! اسے تو چھوڑ جاؤ اور کاغذ کے وہ
ٹکڑے بھی۔ یہ کس لیے لے جا رہے ہو؟

سسٹنٹ جیلر۔ حضور! آپ قید تنہائی میں رکھے جا رہے ہیں۔
اس لیے تمام چیزوں کے ساتھ کاغذ اور قلم بھی
لے لینا پڑتا ہے۔

یض احمد فیض۔ (ہنستے ہوئے) مخالفین کا خیال ہے کہ فیض
کے قوا مضمحل ہو جائیں اور ذہن مفلوج ہو جائے
نہ وہ کسی سے بول سکے اور نہ اس سے کوئی۔ لیکن
یہ نہ بھولے کہ

پلے بیک سنگر۔ (ترنم سے) ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

فیض احمد فیض۔ اگر وہ المناک یادوں سے ملول ہو سکتا ہے تو
خوشگوار امیدوں کے سہارے مسکرا سکتا ہے۔
ہنس سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پانی کے چند
قطرے ٹپک سکتے ہیں اور ہنسی کے قہقہے بھی۔

اسسٹنٹ جیلر۔ (افسردگی سے) درست فرما رہے ہیں آپ اور پھر
آپ تو ایک بلند مرتبہ شاعر اور ایک باعظمت
صحافی بھی ہیں اور شاعر....

فیض احمد فیض۔ جیلر صاحب! اس وقت تو ہم ایک ملزم کے سوا
اور کچھ بھی باقی نہیں رہے مگر یہ نہ بھولیے کہ جیل
کی کوٹھری بدن تو قید میں رکھ سکتی ہے مگر تخئیل
کی پرواز کوئی پابندی قبول نہیں کرتی (کچھ سوچتے
ہوئے)

پلے بیک سنگر۔ (پورا قطعہ ترنم سے پڑھتا ہے)
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

(جیلر اور اس کا ساتھی سب سامان باندھ کر سلام کرتے
ہوئے چلے جاتے ہیں۔ لائٹ فیڈ آوٹ گویا رات
ہو گئی ہے۔ فیض صاحب بستر پر لیٹے ہیں۔ پھر
اضطراری حالت میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ دس کا گھنٹا
بجتا ہے۔ فیض صاحب بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ
سوچ کر پھر ٹہلنے لگتے ہیں اور

فیض احمد فیض۔ (خود بخود بولنے لگتے ہیں) آئیڈیلزم بھی ایک
طرح کی خود غرضی ہے اور اس پر بھی فاشزم
کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں۔ ہم جو یہاں آئے
ہیں تو صرف اسی نصب العین اور آئیڈیلزم کی
بدولت۔ اوہ کتنا دکھ دیا ہے میں نے اپنے

اعزا اور احباب کو جن کا اس نصب العین
سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں اور نہ انھیں اس
سے کوئی دلچسپی ہی ہے۔ اپنی ضعیف ماں کو بھائیوں
کو اور ان سے زیادہ اپنی شریکِ حیات ایلیس
کو جس نے ہماری محبت میں اپنا سکھ چین بھلا دیا۔
اپنی بھولی بھالی بچیوں کو (بستر پر بیٹھ جاتے
ہیں اور سر جھکا لیتے ہیں)

پسِ پردہ ——— ایک آواز (اداکارانہ انداز میں
تحت اللفظ)

تیرے آبا کہ تھے نامحرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب تیرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو تو کرتا ہے کاغذ پہ قلم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

(فیض احمد فیض چونک پڑتے ہیں۔ مسکراتے
ہیں اور گنگنانے لگتے ہیں:)
(تحت اللفظ مدھم سُر میں)

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

(اور پلے بیک سنگر پوری غزل ترنم سے پڑھتا
ہے اور فیض صاحب ٹہلتے رہتے ہیں۔)

پلے بیک سنگر۔ تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

....

(اور پھر چار پانچ دن بعد فیض صاحب جیل
کمرے کے برآمدے میں سگریٹ پیتے ہوئے ٹہل
رہے ہیں)

فیض احمد فیض۔ صبح کا سہانا اور خوشگوار سماں ہے۔ کتنا طرب افزا
موسم ہے۔ بادِ صبا کے نرم نرم اور سرد جھونکے
جب انسانوں کے چہروں کو چھوتے ہیں تو ایک
فرحت افزا امنگ ابھرنے لگتی ہے اور پرندوں
کی ترنم ریز چہچہاہٹ کسی کی یاد کی کسک پیدا
کر دیتی ہے مگر ہم قیدیوں کے لیے (گنگناتے ہوئے)

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

(پلے بیک سنگر پوری غزل ترنم سے پڑھتا ہے)

پلے بیک سنگر۔ نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

(اور پھر تیسرے دن فیض صاحب کوئی آٹھ بجے
رات کو جیل کوٹھڑی کے برآمدے میں کچھ افسردہ
سے ٹہل رہے ہیں۔ آج ۴ مئی ہے اور قیدِ تنہائی
میں تقریباً دو مہینے ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی آیا اور
نہ کسی کا خط۔ کچھ خبر نہیں معلوم ہوئی۔ یک بیک
ان کے مُنہ سے نکل جاتا ہے۔ اب یہاں کوئی
نہیں کوئی نہیں آئے گا۔"

پلے بیک سنگر۔ (ترنم سے) پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
گُل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(پھاٹک کھلنے کی آواز پیروں کی چاپ د
اسسٹنٹ جیلر آتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ جیلر۔ (سلام کرتے ہوئے) کل علی الصباح سپاہی
آپ کا بستر باندھ دے گا اور کوئی سات
بجے تک تیار ہو جائیں آپ!
فیض احمد فیض۔ آخر کیوں بھائی؟ کیا بات ہے؟
سپرنٹنڈنٹ جیلر۔ آپ کا ٹرانسفر دوسرے جیل میں ہو گیا ہے۔
فیض احمد فیض۔ آخر کہاں؟
سپرنٹنڈنٹ جیلر۔ یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔ اسٹیشن پر گارد سے
معلوم ہو جائے گا۔ (چلا جاتا ہے)
پلے بیک سنگر۔ (دردناک ترنم سے) مرے درد کو جو زباں ملے۔
مجھے اپنا نام و نشاں ملے
(فیض احمد فیض، کچھ افسردہ سے بستر پر لیٹ
جاتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

• • •

(۳) وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

•

•

افراد۔ (۱) فیض احمد فیض (۲) پلے بیک سنگر
(۳) نیوز پیپر ہاکر
تاریخ۔ وقت اور مقام۔ ۵ مئی ۱۹۵۱ء تا
۲۹ مئی ۱۹۵۱ء، نو، دس بجے رات کے درمیان۔
لائل پور جیل۔
(پردہ اٹھتا ہے۔ فیض احمد فیض سگریٹ پیتے
ہوئے کروٹیں بدل رہے ہیں اور کچھ گنگناتے
جاتے ہیں۔ وہ بات.... وہ بات۔ اٹھ کر
ٹہلنے لگتے ہیں۔
پلے بیک سنگر "تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری
ہے" والی غزل ترنم سے پڑھتا ہے)
پلے بیک سنگر۔ تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

۔۔۔ مل جلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ سے اب کے بہار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
(۱۲ مئی کی شام ہے۔ غروب آفتاب کے وقت
شفق کی سرخی کا سماں دیکھ کر فیض صاحب گوناگوں
جذبات میں الجھ جاتے ہیں۔ تنہائی کی کوفت،
شریکِ حیات اور بچیوں کی یاد اور غم ستانے
لگتے ہیں۔ اِدھر اُدھر سراسیمہ سے ٹہلتے ہیں۔ ہوا
کا ایک جھونکا انھیں جھنجھوڑتا ہے۔ وہ گنگنانے
لگتے ہیں)
پلے بیک سنگر۔
شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
یہ ضد ہے یارِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
(فیض احمد فیض سو کر اٹھتے ہیں سگریٹ پینے
لگے ہیں اور کچھ حساب کرتے ہیں)
فیض احمد فیض۔ آج ۲۴ مئی ہے
نیوز پیپر ہاکر۔ آگیا غدّار بنرادر ڈان کی سنسنی خیز خبر پڑھیے
(فیض صاحب چونکتا ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں
جنرل اکبر خاں، سجاد ظہیر اور فیض کے لیے سزائے
موت کا تقاضا اور زبردست مطالبہ۔ یہ چودہ
پندرہ اشخاص ملک کے غدار ہیں۔ اور وطن کے
دشمن۔ سزائے موت کا مطالبہ۔ پڑھئے اور
ضرور پڑھیے۔
فیض احمد فیض۔ یہ صاحب اقتدار اشخاص آنکھ کے اندھے اور

کان کے کچے تو مشہور ہی ہیں، لیکن ایسا اندازہ
بھی ہوتا ہے کہ عقل کے اندھے بھی ہیں (ذرا
زوردار آواز میں)
مملکت اور حکومت کو ایک سمجھ لینا کتنی بڑی
غلطی ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے ملک اور
مملکت کا وفادار رہے اس لیے کہ حُبّ الوطن
مِنَ الایمان، اس سے بے وفائی کرنا غداری
ہے اور حکومتیں تو بدلتی رہتی ہیں اور ان سے اختلاف
ہو ہی جاتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب اراکینِ
حکومت صرف اپنے لیے اور اپنی فلاح و بہبود
اور صرف اپنے مفاد کے لیے، بلکہ اپنے اقتدار کی
بقا کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو نامناسب
ناروا ہے۔

نیوز پیپر ہاکر کی آواز۔ "احسان" کا غدار نمبر پڑھیے اور غدارانِ
وطن کے لیے سزائے موت کا زبردست مطالبہ۔
جنرل اکبر خاں، سجاد ظہیر اور فیض کے لیے....

فیض احمد فیض۔ ہم جانتے تھے کہ یہ حرکت "احسان" کے ایڈیٹر
کی ہے۔ اور ان کا عملہ تو پہلے بھی ہمارے خلاف
آرٹیکل اور نظمیں لکھ چکا ہے..... اور ہاں۔!
یہی دیکھیے نا ٹریڈ یونین فیڈریشن اور کسان پارٹی
کے کارکنوں کو کن کن خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔
غدار۔ دشمنِ وطن۔ دشمنِ اسلام۔ اور تو اور مرتد۔
یہاں تک کہ ہمارے خلاف مسجد وزیر خان کے
پیش امام نے لامذہبیت کا فتویٰ دے دیا۔

ایک غیبی آواز۔ اور سر سید احمد خاں کے لیے تو مکہ معظمہ سے ان
کے مخالفین کفر کا فتویٰ لائے تھے۔ مگر ہوا کیا؟ نہ
ان کے مخالفین کا نام و نشان ہے اور نہ اس
فتوے کا کوئی اثر اور سر سید احمد کے کارنامے آج
بھی اظہر من الشمس ہیں۔ خوب کہو تو عبادت بجز

"خدمتِ خلق نیست"

فیض احمد فیض۔ اور ہمیں اراکینِ حکومت سے یہی تو شکایت ہے کہ
وہ حقیقت سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور خدمتِ
خلق کو جرم قرار دیتے ہیں۔ صرف افواہوں کی بنیاد
پر عمل کرتے ہیں اور یوسف کو ملزم ٹھہرانے سے پہلے
دامنِ یوسف نہیں دیکھتے۔

پلے بیک سنگر۔ انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر
یک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے
جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھیے

(پیروں کی آہٹ، جوتوں کی پٹ پٹ جیلر داخل
ہوتا ہے)

جیلر۔ (سلام کرتے ہوئے) کل آپ تیار رہیں۔ آپ
کا ٹرانسفر قلعہ لاہور جیل ہو گیا ہے یعنی ۵ مئی کو۔

فیض احمد فیض۔ بہت خوب! سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں
آئے (جیلر چلا جاتا ہے اور فیض افسردگی سے یہ
شعر پڑھتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں)
رَمانِیَ الدَّهرُ بالأَرْزاءِ حتّیٰ
فُؤادِیَ فی غِشاءٍ مِنْ نِبالِ
اور تو اور تکسّرتِ النِّصالُ علی النِّصالِ۔ تیر
پر تیر گھستے چلے جا رہے ہیں۔ سینہ تیر دل سے چھلنی
ہو رہا ہے مگر

پلے بیک سنگر۔ بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل، تو ہم صبر میں کامل

— • • • —

(۴) اُداسی بکھرتی جاتی ہے

•

•

افراد۔ (۱) فیض احمد فیض (۲) پلے بیک سنگر (۳) ہنگ...

دیا۔ بحث اتنی بڑھی کہ آل احمد سرور اور سید احتشام حسین بھی اظہار خیال پر مجبور ہوگئے اور ایک صاحب نے تو مولانا آزاد کا ادبی فتویٰ بھی حاصل کر لیا۔ شعر یوں تھا :۔

ہم نشیں اندیشۂ فریاد کی تعبیر دیکھ
کچھ دھواں سا اٹھ رہا ہے خانۂ صیاد سے

مگر ان کی حیات کا سب سے بڑا معرکہ وہ تھا جو انھوں نے بر سر عدالت سر کیا۔ اس جنگ میں ان کے حریفِ مخالف مولانا انفر موہانی تھے ۔ شہادت کے کٹہرہ میں نہ صرف معروف شعراء طلب ہوئے بلکہ فریقین مقدمہ سے تقطیع بھی کرائی گئی ۔ طویل پیشیاں ہوئیں اور آخر میں جیت سراج لکھنوی کی ہوئی ۔ ادبی معرکوں کی تاریخ میں یہ مقدمہ آج بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔

اپنے شاگردوں کے درمیان جن کی تعداد خاصی بڑی ہے، وہ "میاں" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے ۔ کبھی کبھی کٹرہ میں ان کے مکان کی طرف سے گزر ہوتا تو باہر کے چھوٹے سے بیٹھکے میں اپنے کسی نہ کسی شاگرد کو اصلاحِ سخن سے نوازتے نظر آتے۔ سراج صاحب سے مشورۂ سخن کرنے والوں میں ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے ۔ ان کے بعض معروف شاگردوں میں منظر شوائی، شفق شاہان جشنی، قادر صدیقی، تبسم فاروقی، دشنو کمار شوق، حیات وارثی، شمبھو دیال شفق، تجسس اعجازی، گنیش بہاری طرز، چھوٹے نواب اصغر اور خود ان کے بیٹے معراج لکھنوی قابل ذکر ہیں ۔

احباب کا حلقہ بہت مختصر تھا مگر جتنے تھے وہ بہت مخلص تھے ۔ جعفر حسین منظر لکھنوی سے ان کی دیرینہ رفاقت ضرب المثل تھی۔ جس ہوٹل میں سراج صاحب اور منظر صاحب کی نشست ہوتی تھی وہاں "یادِ سراج و منظر" کے نام سے شہر کے نوجوان شعراء کے زیرِ اہتمام بڑی شان و شوکت سے ایک مشاعرہ کئی برس تک ہوتا رہا جو قومی یک جہتی کی جیتی جاگتی نشانی سمجھا جاتا۔

انھوں نے پوری زندگی ایک چھوٹے سے گھر میں، جو برقی روشنی کی چکاچوند سے بھی محروم تھا، خاموشی سے گزار دی۔ وسائل اس کی اجازت نہ دیتے کہ بجلی لگوا لیتے۔ ایک بار ایک متمول شاگرد نے "میاں" سے درخواست کی کہ وہ اپنے خرچ سے اس گھر میں بجلی کا کنکشن دلا دے مگر لائق شاگرد کی اس پیش کش کو سراج صاحب کی خودداری نے قبول نہ کیا۔ ایک شعر میں برجستہ اس کا ذکر کرتے ہیں ؎

جل رہے ہیں میں نے روشن کر دیے تھے جو چراغ
اور میرے گھر میں مانگے کا اجالا بھی نہیں

خودداری اس منزل پر پہنچ گئی تھی جہاں سے واپسی کا کوئی سوال نہ تھا۔ ایک بار والیٔ رامپور نواب رضا علی خاں کے جشن سالگرہ کے سلسلہ میں ایک بہت بڑا مشاعرہ رامپور میں منعقد کرنے کی تجویز ہوئی۔ نواب صاحب نے اپنے شناسا حکیم صاحب عالم صاحب کے توسط سے مشاعرہ کے لیے شاعروں کو مدعو کرنے کی ذمہ داری سراج صاحب کے سپرد کرنا چاہی۔ سراج صاحب نے پیش کش قبول کر لی اور مشاعرہ کا بندوبست بھی کر دیا۔ ہندستان بھر کے نامور شعراء مشاعرہ میں مدعو کیے گئے۔ سراج صاحب بھی رامپور گئے اور مشاعرہ میں شرکت کی بھاری بھاری لفافوں میں معاوضہ کی رقمیں مشاعرہ کے بعد شاعروں کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ جب ایسا ہی ایک لفافہ سراج صاحب کے پاس پہنچا تو وہ اسے لے کر نواب صاحب کے پاس پہنچے اور وہ لفافہ پورے شاہی آداب کے ساتھ ہز ہائنس کے سامنے پیش کر دیا اور کہا "سرکار یہ کد و کاوش میں نے کسی معاوضہ کے لیے نہیں کی تھی ۔ مشاعرہ کامیاب رہا یہی میرا صلہ ہے ۔ میری خواہش ہے کہ یہ رقم مدعو شعرا کے درمیان تقسیم کر دی جائے ۔" نواب صاحب اس بے غرض کاوش سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سراج صاحب کو بڑے اہتمام سے اپنی خاص سواری کے موٹر پر لکھنؤ بھجوایا اور جب بھی ان کا ذکر آیا اچھے الفاظ میں یاد کیا۔

سراج صاحب کا مجموعۂ کلام "شعلۂ آواز" جو تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ سید صدیق حسن کے مقدمہ کے ساتھ اس مجموعہ میں ۱۶۰ غزلیں ہیں جو ان کے رنگ

شاعری کی نمائندہ ہیں۔ وہ لکھنؤ اسکول کے نامور شاعر اور زباں داں پیارے صاحب رشید اور پھر ان کے بھائی بازرضا صاحب حمید کے شاگرد رہے اور پھر ان کے بعد مطالعہ اور مشق سے اپنے فن کو نکھارا اور سنوارا۔

نمونۂ کلام

یہ آدھی رات یہ کافر اندھیرا
نہ سوتا ہوں نہ جاگا جا رہا ہے

سب یہی کہتے ہیں مجھ کو ترا سودائی ہے
اب مرا ہوش میں آنا تری رسوائی ہے

یہ بے بسی ہماری یہ بے کسی ہماری
اقدامِ خودکشی ہے یا زندگی ہماری

انسانیت کے خون سے ہولی تو کھیل لی
تاریخ باز پرس کرے گی بہار سے

چہرہ اداس، آنکھوں میں آنسو لبوں پہ آہ
سب رنگ پھیکے پڑ گئے دل ٹوٹنے کے بعد

جو ذرّہ جس جگہ تھا وہیں مسکرا دیا
تم نے تو ہر قدم پہ اُجالا بچھا دیا

مٹا سا حرف ہوں گزری ہوئی سی بات ہوں میں
جبینِ وقت پہ اک نقشِ بے ثبات ہوں میں

●●

ڈاکٹر حضور نوابؔ لکھنوی
شاہ نجف روڈ۔ لکھنؤ

بھری محفل میں سنّاٹا لگے ہے
ہر اک انسان اب تنہا لگے ہے

نہ جانے اس سے کیا رشتہ لگے ہے
وہ جب دیکھے ہے تو اچھا لگے ہے

ہر اک ذرّے میں پنہاں نور تیرا
یہ دُنیا تیرا آئینہ لگے ہے

غموں پر ہیں تبسّم کی نقابیں
ہر اک چہرہ مجھے اپنا لگے ہے

جو ہو محروم تیرے نقشِ پا سے
وہ گلشن بھی مجھے صحرا لگے ہے

مکمل کس طرح ہو عکس تیرا
مجھے ہر آئینہ چھوٹا لگے ہے

مری تشنہ لبی دیکھی تھی جس نے
وہ دریا آج بھی پیاسا لگے ہے

بس اک منزل کی جانب سب رواں ہیں
یہ دُنیا تیرا نقشِ پا لگے ہے

تلاطم سے جو ٹکراتا ہے نوابؔ
اسے طوفاں کا اندازا لگے ہے

ڈاکٹر ترلش
پنجاب یونیورسٹی
ایوننگ کالج چنڈی گڑھ
۱۶۰۰۱۴

جوش ملیح آبادی کے کلام میں ہندستانیت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فن کار اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے وہ اپنی ذہنی سطح اپنی آب و ہوا سے، اپنے معاشرے سے اثر قبول کر کے اپنی قوت متخیلہ کی آمیزش سے اپنے فن میں حسن پیدا کرتا ہے اور پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں، بالخصوص دکن کے شعرا کے یہاں ہندستانیت اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے لیکن فارسی شاعری کے بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ ساتھ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کی آب و ہوا ایرانی ہوتی چلی گئی اور اپنی دھرتی پر اردو شعرا کی پکڑ کمزور پڑنے لگی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی نے ہمارے معاشرے میں ایک زبردست تغیر برپا کیا اور ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑ ڈالا تو اردو شاعری میں پہلی مرتبہ اپنی مٹی کا درد اور اپنے وطن کی غلامی کا قلق سنائی دینے لگا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء سے قبل اردو میں جو شہر آشوب لکھے گئے، ان میں اردو شعرا کی سماجی اور سیاسی بیداری کے نقوش موجود ہیں لیکن ۱۸۵۷ء سے قبل ہمارے یہاں وطنیت کا وہ تصور موجود نہیں تھا جو پورے ملک کو ایک جغرافیائی اکائی کی صورت عطا کرنے میں معاون ثابت ہوتا۔ ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کی اردو شاعری میں ہندستان کی تحریکِ آزادی کی مکمل تاریخ بکھری پڑی ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اردو شاعری نے نہ صرف قدم قدم پر مجاہدینِ آزادیٔ ہند کا ساتھ دیا بلکہ مادرِ وطن کو آزاد کرانے میں اپنے فرائض کو بخوبی سر انجام دیا ہے۔ تحریکِ آزادی سے متعلق نظمیں کہنے والے متعدد با کمال شعرا کی آوازوں میں ایک آواز خاصی منفرد اور باغیانہ آواز تھی جس کی شناخت میں ہم اسی آواز کی بازگشت سے مدد لے سکتے ہیں کہ۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
نعرہ میرا انقلاب و انقلاب و انقلاب

یہ تھی شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی آواز جسے اردو دنیا شاعرِ انقلاب کے نام سے یاد کرتی ہے۔

عنفوانِ شباب ہی میں جوش کے دل و ذہن میں مادرِ وطن کی غلامی کا داغ سلگنے لگا تھا اور انھیں نہ صرف بدیسی حکمرانوں سے ہی شدید نفرت ہو گئی تھی بلکہ وہ اس جاگیردارانہ نظام سے بھی سخت متنفر ہو گئے تھے جس سے انگریزی سامراج کو تقویت مل رہی تھی۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت جوش نے باغیانہ انداز میں گورنر سر ہیلر کی پیش کردہ اس ڈپٹی کلکٹری کو ٹھوکر مار دی تھی جسے حاصل کرنے کے لیے ہندستانی امراء و رؤسا اپنا ایمان تک بیچ ڈالنے کو تیار رہتے تھے۔

اپنے اولین مجموعۂ کلام 'روحِ ادب' سے ہی جوش نے ان خد و خال کی نمائش شروع کر دی تھی جن پر بعد کو ان کی انقلابی شاعری کا قصرِ تعمیر ہونا تھا۔ 'روحِ ادب' سے لے کر 'نقش و نگار' کی تدوین تک جوش اگرچہ مجموعی طور پر شاعرِ شباب، شاعرِ فطرت، شاعرِ منظر نگار یا شاعرِ خمریات کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن ان کے کلام میں اظہار کی بے تکلفی اور فکر و نظر کی وہ آزادی نمایاں ہے جو بعد میں ان کی شاعری کا خاصہ بنتی ہے۔ اپنی شاعری کے اس ۱۶ سالہ سفر میں جوش کا تحت الشعور اپنی مٹی سے جڑا ہوا ہے ان شعرا کے برعکس جن کے تخیل میں ایران کے معشوقوں کی نرگسی آنکھیں اور ان کی ساقی گری کارفرما رہتی تھی، جوش کے کلام میں کہیں جمنا کے کنارے گردوں کی جبیں دمک اٹھتی ہے تو کہیں گنگا کے گھاٹ پر نہاتی ہوئی ایک ہندستانی

دوشیزہ اپنے لاجواب حسن سے شاعر کو اپنا پجاری بنا ڈالتی ہے۔ اپنی دھرتی کی محبت میں بندھا ہوا یہ شاعر کبھی باغ سے اٹھلا کے آتی ہوئی مالن کے حسن کی تعریف میں اپنا قلم تھامتا ہے تو کبھی دونوں ہاتھوں سے سروں کی ٹوکری سنبھالتی ہوئی جامن والیوں کے شباب پر نعرۂ تحسین بلند کر اٹھتا ہے۔ کبھی اسے کوہستانِ دکن کی عورتوں کا حسن فریفتہ ہونے کی دعوت دینے لگتا ہے تو کبھی کسی دہقانی کی جوانی اسکے کلام میں گنگنانے لگ جاتی ہے۔

اگرچہ ۱۹۳۶ء کے بعد جوشؔ کی شاعری کا دھارا اپنا رخ بدل لیتا ہے اور شاعرِ شباب شاعرِ انقلاب بن جاتا ہے لیکن ہندستان کی مٹی کی سوندھی باس، یہاں کے کھیت کھلیان، یہاں کے زمین و آسمان، یہاں کے دریا اور پہاڑ، یہاں کے تیوہار، یہاں کے رسم و رواج، یہاں کی تہذیب و تمدن جوشؔ کے فکر و نظر میں ہمیشہ جلوہ گر رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کبھی 'ذی حیات مناظر' میں انھیں بیاباں سے دبے پاؤں آتی ہوئی ہواؤں میں بانسری کی آواز سنائی پڑتی ہے، کبھی 'فاختہ کی آواز' میں میکے کی گھٹائیں یاد کرتی ہوئی کسی خاتون کی سسرال دکھائی پڑنے لگتی ہے۔ کبھی 'البیلی صبح' میں کوئی نئی نویلی دلہن اپنی جبیں سے افشاں چھڑانے میں محو دکھائی دیتی ہے اور کبھی 'شام کا ایک منظر' میں روپ کی خوشبو میں شبنم کی نمی ایک سرور بھرنے لگتی ہے۔ کبھی 'برسات کی پہلی گھٹا' میں کافر پپیہے کی صدا ان کے کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے تو کبھی 'جاڑا اور انگیٹھی' میں کونلوں کی کلیوں کے چٹکنے کی آواز ان کا من موہ لیتی ہے۔ کبھی 'گرمی اور دیہاتی بازار' میں وہ ماؤں کے کاندھوں پر گردنیں ڈالے ہوئے بچوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں تو کبھی 'بہار کی ایک دوپہر' میں ان کی نگاہ کھیتوں میں گیت گاتی ہوئی لڑکیوں کا طواف کرنے لگتی ہے۔

یہی وہ جذبہ ہے جسے میں ہندستانیت کا نام دیتا ہوں۔ اپنی مٹی کی بو باس میں لپٹا ہوا شاعر کا مشاہدہ جب اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش کے حسن سے اپنے کلام کو سجاتا سنوارتا ہے تو اسکی آواز قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے قاری کو کسی اجنبی 'ان دیکھی دنیا' کا تصور کر کے پرائی تہذیب سے لطف اندوز ہونے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ ان تمام مناظر کے حسن میں وہ جادو بھر دیتا ہے جسے آج تک اس کی نظر دیکھ کر بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔ جوشؔ کی وطنی شاعری کا یہ پس منظر ان کی شاعری کا ایک انتہائی اہم پہلو ہے جو قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ ستائش بھی۔

۱۹۳۶ء کے بعد جوشؔ کا ذہن مکمل طور پر آزادیِ ہند کی تحریک کے ساتھ وابستگی اختیار کر لیتا ہے۔ یہیں سے ان کے کلام میں تلخی اور ترشی کا لہجہ شروع ہوتا ہے جو بعد میں جوشؔ کی شاعری کا وصف بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ صبحِ آزادی کی آمد کو التوا میں ڈالنے والی انگریز کی ہر سیاہ چال کو جوشؔ تیکھی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور ہر قدم پر نہ صرف ہندیوں کو انگریز کے ناپاک ارادوں سے خبردار ہی کرتے ہیں بلکہ ان کی غلامانہ ذہنیت پر پے در پے وار کر کے ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دینے لگتے ہیں۔ 'سائمن کمیشن' کے عنوان کی نظم میں جوشؔ کا اندازِ تکلم انتباہ تک محدود ہے کہ ؎

کہیں ہے دھوپ سے نادان بدتر
غلامی کی گھٹا کا شامیانہ

لیکن 'شکستِ زنداں کا خواب' میں ان کے یہاں آنے والے انقلاب کی گونج صاف سنائی دینے لگتی ہے کہ ؎

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید قیدی کچھ اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

یا پھر 'آثارِ انقلاب' میں ؎

اٹھو چونکو بڑھو منہ ہاتھ دھو آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

انقلاب کا یہ دھارا عوامی بیداری کے روپ میں جلوہ گر ہونے لگتا ہے تو جوشؔ کا کلام اسکی روانی کو تیز کرنے کی دھن میں 'زوالِ جہانبانی' کا اعلان کر کے ہندستانی کاشتکاروں کو جگاتے جھنجھوڑتے ہوئے 'نظامِ نو' کی تشکیل پر آمادہ کرنے لگتا ہے ؎

ختم ہو جائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا!

سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوتے ہوئے جوشؔ ہندستانی عوام کو 'وفاق' کی دعوت دیتے ہوئے انھیں انڈیا ایکٹ کے پردے میں چھپی تازہ بلاؤں سے خبردار کرتے ہیں ؎

ہشیار اہلِ ہند کہ اس زمین پر
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے

اور پھر بے باکانہ انداز میں شہنشاہِ ہندوستان یعنی جارج سے مخاطب ہو کر اسے آگاہ کرتے ہیں کہ ؎

جو نیچے جلدی ہوائے تند گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

جوشؔ کے انداز کی تلخی اور ان کے کلام کی چابکدستی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" میں کھل کھیلتی ہے۔ اس نظم میں جوشؔ نے جس بے خوفی و بے باکی کے ساتھ انگریزوں کو جلی کٹی سنائی ہیں اور جس بے رحمی سے ان کی سیاسی ریاکاریوں کا پردہ فاش کیا ہے، اس سے جوشؔ کی وطنی شاعری ایک نئے افق کو چھو کر عظیم تر ہو جاتی ہے۔ طنز کے ساتھ ملی جلی ان کے انداز کی تلخی ملاحظہ ہو ؎

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں

جوشؔ کی اس نظم کی اثر انگیزی سے سراسیمہ انگریزی حکومت نے اس نظم کو ضبط کر لیا اور جوشؔ کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ جوشؔ کی نظم 'تلاش' اسی تلاشی کے ردِ عمل میں کہی گئی ہے۔

۱۹۴۵ء میں کیبنٹ مشن ہندستان آیا۔ جوشؔ نے اسی بیباکی سے 'وزارتی وفد کا فریب' کے عنوان سے ایک نظم کہی اور ہندستانی عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو زبان دی۔

ملک کی آزادی کو پسِ پشت ڈالنے کے لیے انگریزوں نے ایک اور چال چلی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت کا بیج بو کر انگریزوں نے مسلم لیگ کی پشت پناہی کے ذریعے اس کی آبیاری کی اور بالآخر یہ بیج ایک تناور درخت کی صورت میں رونما ہوا اور اس ملک کے ٹکڑے کر گیا۔ جوشؔ ابتداء سے ہی انگریزوں کی اس چال سے باخبر تھے اور وہ بار بار اپنی نظموں کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو سمجھاتے رہے اور اپنے دل میں یہ عزم پالتے رہے کہ ؎

ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے

اخوت کا یہی جذبہ تھا جس کے تحت جوشؔ زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرتے رہے اور یہی وہ جذبہ حب الوطنی تھا جس کے طفیل جوشؔ کی شاعری، کلامِ شاعرِ انقلاب کے عنوان سے پہچانی گئی۔

غزل

رمیش چند ر دویدی
شوقؔ مرزاپوری الہ آباد

ملتی رہتی ہے مجھے اپنی خبر شام و سحر
ہوتے رہتے ہیں حقائق جلوہ گر شام و سحر

کچھ قفس والوں سے کہہ جاتے تو ہیں ظلمات و نور
تلملا جاتے تو ہیں کچھ بال و پر شام و سحر

اہلِ زنداں گردشِ ایام کے ہیں رازداں
ہل کے رہ جاتے ہیں کچھ دیوار و در شام و سحر

زندگی اور موت میں کچھ فرق کرنا تھا محال
کام کر جاتا نہ تیرا غم اگر شام و سحر

حسن کچھ چونکا ہوا رہتا ہے مجھ سے رات دن
ملتی رہتی ہے انھیں میری خبر شام و سحر

بادۂ ہستی سے مجھ کو گاہ نشّہ گہہ خمار
زندگی ہوتی رہی زیر و زبر شام و سحر

بس یہیں سے دیکھتا ہوں دونوں وقتوں کا ملاپ
یاد آتی ہے تری نیچی نظر شام و سحر

زندگی عشق بھی تھی شوقؔ کب اک رنگ پر
کوئی یاد آیا بہ عنوانِ دگر شام و سحر

●●●

حق بنارسی
۱۳۲/۴۵۲ بابو پوروہ، کانپور

غزل

عام جن فضاؤں میں رسمِ دل نگاری ہے
ہم نے ان فضاؤں میں زندگی گزاری ہے

حادثہ شکار اب تک خوئے انکساری ہے
کس قدر بلا ساماں پاسِ وضعداری ہے

تشنہ کام رندوں کا، کون پوچھنے والا ـ؟
پیرِ میکدہ تنہا صرفِ مے گساری ہے

جانے کیا تقاضا ہے ذوقِ خود نمائی کا
بارِ خاطرِ جلوہ رسمِ پردہ داری ہے

دل کی دھڑکنوں میں ہر آہٹ ان کے قدموں کی
کس قدر سکوں افزا، طرزِ بے قراری ہے

وہ جو تھے جفا پیشہ، درخورِ جزا ٹھہرے
ہم وفا کے مجرم ہیں کیا سزا ہماری ہے

کتنا قیمتی لمحہ، تھا تمہاری قربت کا
مختصر سہی لیکن، عمر بھر پہ بھاری ہے

نشتر آزما یارو! اور چاہتے کیا ہو؟
زخم زخم گہرا ہے، ضرب ضرب کاری ہے

کس کی آرزوؤں کا میں کروں لحاظ اے حق
وہ نظر بھی پیاری ہے، زندگی بھی پیاری ہے

شارب لکھنوی
یونانی میڈیکل آفیسر اسسٹنٹ فارمیسی
موہان روڈ لکھنؤ

غزل

اب تو دنیا کی یہ تصویر نظر آتی ہے
زندگی شعلہ و شمشیر نظر آتی ہے

منزلِ خوبیٔ تقدیر جسے کہتے ہیں
ناز پروردۂ تدبیر نظر آتی ہے

کیا ہے دیوانگیٔ عشق کوئی کیا سمجھے
ایک الجھی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے

دل ہو روشن تو ہر اک رات کی تاریکی میں
کچھ نہ کچھ صبح کی تنویر نظر آتی ہے

موت کیا چیز ہے یہ ہم نہیں سمجھے لیکن
زندگی حلقۂ زنجیر نظر آتی ہے

تیرے انکارِ محبت کا یقیں کیسے کروں
تیری آواز گلوگیر نظر آتی ہے

ایسا عالم بھی گزرتا ہے کتابِ دل پر
کوئی تصویر نہ تحریر نظر آتی ہے

حسرتِ دید ہوئی جاتی ہے شبنم شبنم
شعلہ شعلہ تری تصویر نظر آتی ہے

خونِ دل خونِ جگر دیتے ہیں شارب ہم لوگ
جب غزل جنتِ کشمیر نظر آتی ہے

ڈاکٹر اختر جہاں حسین
۲۶ کینٹ روڈ، لکھنؤ

فراق کی شاعری میں سلاست اور روانی

اُردو شاعری کے ابتدائی دَور میں جہاں نظیر اکبر آبادی نے زبان میں نت نئے انداز ، اُن رچاؤ، مقامی وعوامی رنگ و آہنگ کی آمیزش سے قوس و قزح کا منظر پیدا کر دیا وہاں فراق نے دَورِ جدید میں خیالات و جذبات، محسوسات و وارداتِ قلب و نظر کی ترجمانی کے لیے کلاسیکی انداز کو قائم رکھتے ہوئے اردو شاعری کو ایک نیا اور نادر اسلوبِ اظہار عطا کیا جو اچھوتا ہی نہیں خالص ہندستانی بھی ہے۔

فراق کی شاعری صرف حسن و عشق کی حکایاتِ دیرینہ پر مبنی نہ ہو کر ایک مخصوص آہنگ، موسیقی اور ترنم کی حامل ہے۔ ان کو اپنے تصورات اور افکار کو اس طرح دامنِ غزل میں سمونا آتا ہے جیسے کوئی مغنی آتش نفس اپنی انگلیوں کے ربط سے ساز کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور وہ نغمات کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ حجاب سے نکل کر فردوس گوش بن کر سامنے آجائیں۔

فراق کے سادہ اور آسان اشعار میں بھی ہزار معنی پنہاں ہیں۔ وہ شاعروں کی اس صف میں شمار کیے جاتے ہیں جن کا مطالعہ بے پناہ وسیع بلکہ لامحدود ہے۔ ان کی نگاہ دُور رس اور دُور بیں ہے فراق جیسے بلند پایہ فنکاروں کی تخلیقات میں ان کی علمیت کا رنگ ضرور جھلکتا ہے۔ لیکن فراق نے سادگی اور پرکاری کے نظریہ کو اپنایا، وہ بڑے سے بڑے اور ادق سے ادق خیال کو انتہائی سلاست اور روانی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں خیال کے نشیب و فراز موجود ہیں۔ وہ گاہ شعلہ، گاہ شبنم ہیں۔ لیکن ان کا یہ مزاج ان کی شاعری کے لیے مضرت رساں ثابت نہیں ہوا۔ فراق ایسے دَور کے شعرا کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں ہر سمت ہنگامہ خیزیاں ہیں اور ایک تحریک ذہنوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہے، وہ بھی اس تحریک میں شامل ہیں لیکن وہ غمِ روزگار سے اتنی فرصت ضرور نکال لیتے ہیں کہ غمِ جاناں کی لذتوں سے بہرہ یاب ہو سکیں

فراق ایک حسن پرست شاعر ہیں ان کی جمالیاتی حس بیدار ہے حسن کو مختلف ادا و انداز سے سنورتا ہوا دیکھ کر ایک سرور کی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے اور یہ نشہ آور کیفیت ان کی ہستی پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ شور شغل اور ہنگاموں کی یہ دنیا جس کا نام عشق ہے ہر وقت شاعر کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ جس وقت اپنے محبوب کا سراپا بیان کرتے ہیں تو ان کا انداز والہانہ ہوتا ہے اور کائنات کی ہر حسین چیز کا عکس ان کو اپنے محبوب میں نظر آتا ہے اس کی سحر کار آنکھیں دیکھ کر انبساط کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ مسکراتی آنکھیں جن میں رقص کرتی ہے بہار
شفق کی گل کی بجلیوں کی شوخیاں لیے ہوئے

فراق کے کلام کا اعجاز یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں کسی مافوق الفطرت کیفیت کا بیان نہیں کرتے ان کی شاعری اپنی دنیا کی شاعری ہے اور اسی دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ اسی "عالمِ آب و گل" کے جذبات و احساسات سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ آسمان پروازی میں مبتلا نہیں ہوتے ان کا کلام ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

مثال کے طور پر فراق کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے ؎

کچھ ایسی بھی گزری ہیں تیرے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے کہ کوئی بھی غم نہ ہو لیکن ایک انجانی سی اضطراری اور بے چینی کی کیفیت اس کی نیندیں اڑا لے جاتی ہے۔ فراق نے دل پر گزری ہوئی اس کیفیت کا اظہار کتنی صداقت اور خوبصورتی سے کیا ہے، ایک شعر میں فراق طنزیہ لہجے میں اپنے محبوب کو نصیحت کرتے ہیں ؎

بدگماں ہو کے مل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
یہ جھجکے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی ہے

فراق کا ایک اور خوبصورت شعر ملاحظہ کیجیے ؎

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

گو کہ اس شعر کا مضمون کوئی نیا نہیں لیکن سلاستِ الفاظ اور سادگی بیان کے ساتھ محبت کی اس خاص کیفیت کو جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن ادا نہیں کر سکتا، ایسے سہل ممتنع میں پیش کر دینا شاعر کا کمال ہے۔

ایک اور شعر میں فراق کے زاویۂ بیان نے ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ شعر ہے ؎

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تجھے رنجشِ بیجا بھی نہیں!

مہربانی اور محبت کے نازک فرق کو "رنجشِ بیجا" کے ذکر کے ساتھ کس لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ فراق کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ ان کے کلام میں والہانہ ادا ہر جگہ موجود ہے جو محبت کا لازمی نتیجہ ہے اور غزل کی جان ہے اور محبت سے ان کا مقصد زندگی ہے۔ فراق اپنے درد کو عزیز رکھتے ہیں اور یہی درد ان کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ ان کی شاعری میں جو سوز و گداز ہے وہ اسی درد اور محبت کا فیض ہے جس نے ان کی روح کو بالیدگی عطا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کے ٹوٹے تعلقات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

یوں تو بجی بجی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز
دنیا کے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

اس مرصع غزل کے تینوں اشعار میں بیک وقت نئی شاعری کا رجحان اور پرانی قدروں کی صدائے بازگشت موجود ہے جو ایک سچے اور عہد آفریں شاعر کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہے۔ نئی قدروں کو اپنانے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ماضی کو بالکل فراموش کر دیا جائے جس طرح انسان کے سانس لینے کا انداز روزِ ازل سے ایک ہی ہے، اسی طرح اس کے عقیدے بھی ایک سے ہیں، صرف اس کی زندگی کے طریقے اور انداز بدلتے رہتے ہیں، اور زمانہ کے ساتھ تغیرات ضرور رونما ہوجاتے ہیں۔ "بجی بجی نگاہِ ناز" کا اٹھنا اور اس سے "دنیائے دل" میں کسی "واردات" کا ظہور پذیر ہوجانا ایک بہت ہی حسین تخیل ہے جو فراق کے ذہن سے ٹکرا کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ تخیل کی بلند پروازی فراق کے کلام کی ایک اہم خوبی ہے، ایک نہایت نازک تخیل ملاحظہ کیجیے ؎

ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی
بہت ہے اس قدر بھی خیر یادِ رفتگاں ہونا

آوازِ جرس کی صدائے بازگشت کو "یادِ رفتگاں" کہنا نہایت لطیف خیال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فراق کی شاعری ایک نئے ذہن اور ایک نئے وجدان کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ ان کا آہنگ جدید ہے، ان کے ذہن میں ٹھہراؤ ہے، ان کے خیالات میں بانکپن ہے۔

فراق نے انگریزی کا لہجہ اردو کو بخشنے میں بڑی محنت اور جگر سوزی سے کام لیا ہے۔ روانی اور شیرینی جو غزل کی جان ہے

فراق کے اشعار میں برقرار رہتی ہے حالانکہ ایک زبان کا خیال دوسری زبان میں آنے کے بعد وہ اثر مشکل ہی سے قائم ہو پاتا ہے جو اس زبان کا خاصہ ہوتا ہے۔ بیان پر ایک مثال پیش کرنا برمحل ہوگا۔ فراق نے انگریزی کے ایک مشہور ادیب کی مندرجہ ذیل سطریں پڑھیں:

"Her Pure and eloquent blood
spoke in her cheek and so dis-
tinctly wrought that one might
almost say her body thought"

ان سطروں کا تاثر فراق کے ذہن پر قائم ہوا اور ان کے شاعرانہ ذہن نے فوراً اسے اُردو شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا۔ فراق کا شعر ہے ؎

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود ایک جہاں لیے ہوئے

اسی طرح جب ہیملیٹ (Hamlet) کا دماغ خراب ہوتا ہے تو اس کی محبوبہ اوفیلیا (Ophelia) تنگ آکر کہتی ہے:

"What a noble mind is here
over-Thrown."

اس جملہ میں حیرت اور استعجاب کی جو کیفیت ہے اسے فراق نے کس قدر سادہ انداز سے نہایت دلکش پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے ؎

کتنے نظامِ شمسی یارو درہم برہم ہو کے رہے
میرے دیوانہ پن پر تم کو کیوں اتنی حیرانی ہے

اس طرح کی بہت سی مثالیں فراق کے کلام میں ملتی ہیں۔ شیلی (Shelly) کی مشہور نظم "Ode to the West Wind" کو فراق نے بڑی خوبی سے اُردو زبان میں "ترانۂ خزاں" کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ اس کے چند بند ملاحظہ کیجیے ؎

غنچے کو چمن میں جو چٹکنا ہو چٹک لے
جس رنگ کو گلشن میں چمکنا ہو چمک لے
گر حسنِ گلستاں کو دمکنا ہو دمک لے
کچھ دن کہ بادِ بہاری بھی لچک لے
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

ہر ذرّے میں رکھ دی ہے جو اک آتشِ پنہاں
بھڑکے گی وہی بن کے گل و لالہ و ریحاں
اے مرگِ مفاجات چمن جانِ گلستاں!
ہیں کتنی بہاریں تری شرمندۂ احساں
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

شیلی کی اس نظم کو اتنی سلاست اور روانی کے ساتھ اُردو کا جامہ فراق ہی پہنا سکتے تھے۔

فراق نے ساری عمر درس و تدریس میں گزاری۔ انگریزی زبان کے ماہر ہونے کے باوجود انھوں نے اُردو زبان کو اپنایا۔ ان کو اُردو سے بے حد پیار تھا۔ انھوں نے اردو زبان سے اپنی والہانہ عقیدت کا ثبوت اس طرح بھی دیا کہ جو عظیم شعری تخلیقات انگریزی میں موجود ہیں ان میں سے اکثر کا ترجمہ اُردو میں کیا اور انگریزی کے بہت سے خیالات اُردو میں سمو دیے۔

فراق اُردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے تخیّل میں جو نزاکت اور شادابی، ان کی فکر میں جو گہرائی اور ہمہ گیری اور ان کی جذباتی کائنات میں جو پختگی اور فراوانی ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اُردو غزل کا رُخ موڑ دیا۔

فراق کا کلام اپنے اندر صدیوں زندہ رہنے کی طاقت رکھتا ہے وہ اپنے وقت سے بہت آگے کے شاعر تھے۔ آنے والی نسلیں ان کے کلام کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانے پر مجبور ہوں گی۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب کو جو کچھ دیا ہے اس کی اہمیت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُردو ادب جتنا ترقی کرتا جائے گا فراق کی قدر و قیمت اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ **

فصیح اکمل

۱۰۱ - ہاتھی محل - کولھواڑہ
وسائی تھانے

غزل

کچھ نیا کرنے کی خواہش میں پرانے ہو گئے
بال چاندی ہو گئے، بچے سیانے ہو گئے

زندگی ہنسنے لگی پرچھائیوں کے شہر میں
چاند کیا ابھرا کہ سب منظر سہانے ہو گئے

ریت پر تو ٹوٹ کر برسے مگر بستی پہ کم
اس نئی رُت میں تو بادل بھی دِوانے ہو گئے

بادلوں کو دیکھ کر وہ یاد کرتا ہے مجھے
اس کہانی کو سُنے کتنے زمانے ہو گئے

جوڑتا رہتا ہوں اکثر ایک قصّے کے وَرق
جس کے سب کردار لوگو! بے ٹھکانے ہو گئے

میر کا دیوان آنکھیں، جسم قائم کی غزل
جانے کس کے نام میرے سب خزانے ہو گئے

ریت پر اک نامکمل نقش تھا قُربت کا خواب
فاصلہ بڑھنے کے اکملؔ سو بہانے ہو گئے

عنبر بہرائچی

سلون ۔ رائے بریلی

غزل

یہ سچ ہے سر پہ ہمارے کوئی کلاہ نہ تھی
مگر ہمارے بنا شہر کو پناہ نہ تھی

اُداس لوٹ گئے سبز موسموں کے سفیر
زمین اپنی تو اس درجہ بے گیاہ نہ تھی

ہمیں تھے ایسے جو میداں میں فتحیاب ہوئے
معاونت میں ہماری کوئی سپاہ نہ تھی

وہ منتظر تھا کسی معجزہ کا ہر لمحہ
خود اپنے آپ سنورنے کی اس کو چاہ نہ تھی

خجل بہت تھا بھلا فیصلہ وہ کیا کرتا
مری ہنسی مرے حالات کی گواہ نہ تھی

وہی تو دے گیا مجھ کو جہنموں کی فضا
وہ ایک لمحہ جسے فرصتِ گناہ نہ تھی

ہمارے سر پہ کوئی سائبان نہ تھا عنبرؔ
ہمارے پاؤں تلے کوئی سیرگاہ نہ تھی

عروج زیدی
محلہ کٹ کوئیاں - رام پور
۲۴۴۹۰۱

شاد عارفی - حیات اور فکر و فن کے آئینے میں

۱۹۰۲ء تا ۱۹۶۴ء

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ زبان ترسیل خیالات کا ایک اہم وسیلہ ہے اور زبان و فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے — اگر زبان کا سہارا نہ ہوتا تو انسان فکر سے محروم رہتا۔ فکر تجریاتی ہو یا تخلیقی بہرعالم یہ ایک زندہ اور سانس لیتی ہوئی حقیقت ہے کہ فکر کی نشو و نما میں زبان کا بڑا دخل ہے۔ اس بحث کے نتیجے میں جب ہم شاد عارفی کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا کہ انھیں زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ اب رہا بلندیٔ فکر کا سوال — اس کے بارے میں خود شاد عارفی (مرحوم) نے کہا ہے ؎

سر سے ٹوپی گر جائے گی، گردن دُکھ کر رہ جائے گی
تب میرے اہرام معنی تک "تنقید پہونچ پائے گی

ان کے اس دعوے میں نہ تعلّی کا کوئی پہلو ہے اور نہ خودستائی کا اسے مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے کہ خود ان کی شخصیت میں سیکڑوں رنگوں کی آمیزش تھی جس کا نہ صرف انھیں احساس تھا بلکہ اپنے "عروج فن" پر مکمل اعتماد تھا۔ انھوں نے ترقی پسندی اور حقیقت پسندی کو اپنا کر عام روش سے ہٹ کر شاعری کی ہے جس میں کلاسیکل شعر و ادب اور اندازِ فکر و نظر کی علم برداری کے ساتھ ایک نیا اسلوبِ نگارش ملتا ہے۔ ذرا شاد عارفی کے اس مقطع کے تیور ملاحظہ ہوں ؎

میں چراتا نہیں مضمون شگفتہ اے شاد!
چھین لیتا ہوں اگر دامنِ الہام میں ہوں

انھیں ابتدائی رنگین مزاجی کے دور میں محبت کی نفسیاتی کشاکش سے واسطہ پڑا چنانچہ اس دور کے غزلیہ اشعار اور طربیہ نظموں میں حُسن و جوانی کی انگڑائیاں لیتی ہوئی تصویریں ہیں۔ کلام کا بالاستیعاب مطالعہ بتاتا ہے کہ انھوں نے مدتوں فضا میں رومانی شاعری سے اپنے منفرد لہجہ میں نشاط و مستی کی گلابی چھلکائی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر ان کی مرصع غزلوں کے چند شعر پیش کر دوں تاکہ قارئین کرام پر ان کا پیرایۂ بیان و رنگِ تغزل کھل سکے ؎

تیز ہوتی جا رہی ہے نکہتِ گیسوئے دوست
اپنی جانب رہنمائی کر رہا ہے کوئے دوست

میری اُلفت سے اُسے انکار بے حد تھا مگر
جب کہا لوگوں نے یہ تحریر، اب خاموش تھا

کہنا پڑے گا شوخیٔ اشعار دیکھ کر
لکھی ہے یہ غزل، نگہِ یار دیکھ کر

بھرا گھر جس کی شوخی اور طرّاری کا قائل ہے
مجھے دیکھا کہ اُس پر ہو گئی سنجیدگی طاری

گیسو بدوش، محوِ تماشائے آئنہ
تیری نگاہ روزنِ دیوار پر نہیں

انگلیاں اُس کی مرے ہاتھ میں ہیں جام کے ساتھ
ہاتھ کھینچے نہ بنے، جام گرائے نہ بنے

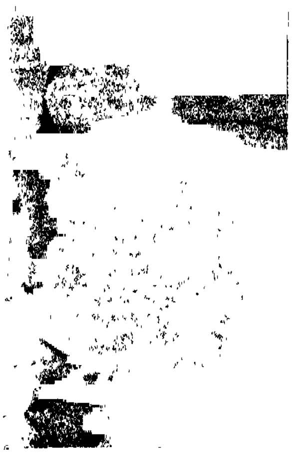
ابھی ہنگامہ آرا دل میں ہے اک عشرتِ رفتہ
ابھی تک اس کی خوشبو آ رہی ہے میرے بستر سے



شریمتی سونیا گاندھی ۱۲ ستمبر ۱۹۸۵ء کو شیعہ کالج لکھنؤ میں سیلاب زدہ لوگوں کو امداد تقسیم
کرتے ہوئے تصویر میں وزیر اعظم شری راجیو گاندھی بھی نظر آرہے ہیں۔

گورنر اترپردیش جناب محمد عثمان عارف اترپردیش کے نئے وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ کو
ان کے عہدے اور رازداری کا حلف دلاتے ہوئے







گورنر اتر پردیش جناب
کے جنرل سکریٹری شرد

نر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف ۱۵ اکتوبر ۸۵ء کو دیوا شریف ضلع بارہ بنکی
میں قومی یک جہتی سے متعلق ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ شری ویر بہادر سنگھ دیوا شریف میں حاجی وارث علی شاہ
کے مزار پر چادر چڑھا کر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تصویر
میں سابق وزیر اطلاعات اتر پردیش شری عبدالرحمان نشتر بھی نظر
آرہے ہیں۔

اُردو جرنلسٹ کانفرنس کے حاضرین



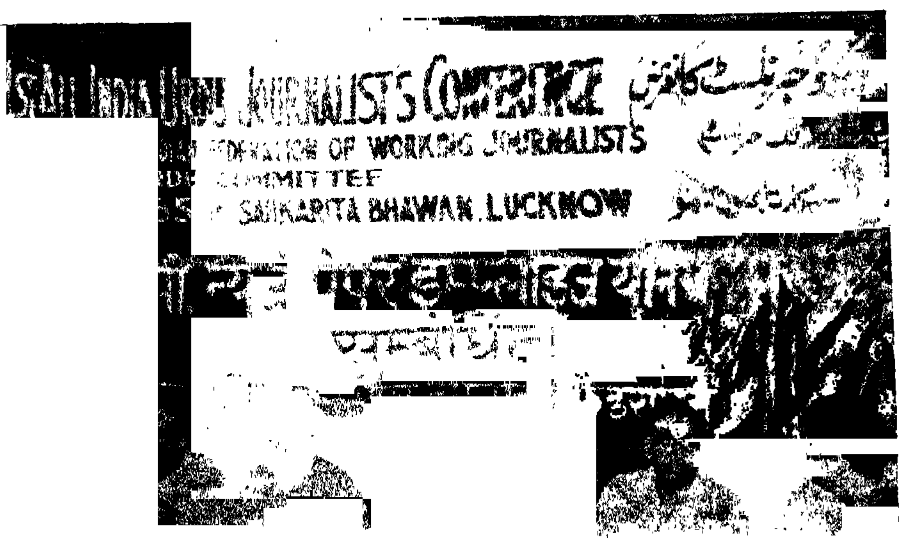


ڈاکٹر اختر بستوی بستی میں منعقدہ تقریب
ایک شام کیفی اعظمی کے نام کے موقع
پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔



… کونسل نے شفیق میموریل سوسائٹی
… ۳۰ اکتوبر کو علامہ شفیق جونپوری
… پیش کرتے ہوئے

لکھنؤ میں ۲ اکتوبر ۸۶ کو کل ہند اردو جرنلسٹ کانفرنس منعقد ہوئی جسے وزیر اعلیٰ شری ویر بہادر سنگھ نے بھی خطاب کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں وزیر اعلیٰ کے ساتھ شری وکرم راؤ اور شری ہاشم رضا عابدی الہ آبادی وغیرہ بھی نظر آرہے ہیں۔





جناب کیفی اعظمی اور بیگم شوکت کیفی ۱
ستمبر ۸۵ء کو بستی میں روٹری کلب کے
جلسے میں شرکت کے لئے آتے ہوئے جو
کیفی صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوا۔



لکھنؤ الکٹرک سپلائی انڈرٹیکنگ کی گاندھی میموریل کلچرل سوسائٹی کی جانب سے ۲ اکتوبر ۸۵ء
کو منعقدہ کوی سمیلن اور مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے ممتاز کوی اور شعرائے کرام
اور ان سے محظوظ ہوتے ہوئے سامعین۔



یہ مسکرا کے دیکھنے سے اور کیا مراد تھی ؟
جو تم نے آسرا دیا تو میں نے مدّعا کہا
بار ہا خط دے کے واپس نامہ بر سے لے لیا
اور یہ سب جانتے ہیں جس نظر سے لے لیا
مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی سوچ میں بیٹھے ہوں کسی کام میں ہوں

یہ اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ ان کا کلام جذبات نگاری، شوخی، بے باکی، سلاست، صفائی، روانی، بے ساختگی، محاکات اور البیلے پن کا نچوڑ ہے گویا ع

"سوچ نئی، لہجہ تیکھا، لفظ کھرے، آواز جدا"

ان کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ وہ سنگلاخ زمین اور مشکل سے مشکل بحر میں بھی باتوں باتوں میں اشعار موزوں کر دیتے تھے جن میں ان کے منفرد اور دور سے پہچانے جانے والے رنگ کلام کی گہری چھاپ ہوتی تھی۔

جب کبھی وہ اپنے گرد و پیش کو بھول کر ماضی کی دلچسپ یادیں دہراتے تھے تو یقین فرمائیے کہ تمام ماحول پر دھنک کے سے رنگ برنگے خوش نما پھول بکھر جاتے تھے۔

اندریں حالات اہل نظر کے نزدیک یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ان کے فن میں حُسن بھی ہے، تازگی بھی ہے اور توانائی بھی۔

شادؔ عارفی پرانی روایتوں میں جکڑے ہوئے شاعر نہ تھے، کلام میں روایتی تغزّل کم اور بہت کم ہے، وہ اپنے مخصوص لہجہ اور طرز بیان میں انفرادیت کے لحاظ سے نہایت بلیغ اور پُرکار ہیں، ان کے انداز فکر میں خلوص کی آنچ ہے، یہی وجہ ہے کہ مضمون آفرینی و تخیل کی بلند پروازی کا فلک بوس مرتبہ حاصل ہے۔ وہ تخیل سے زیادہ تاثیر کے شاعر ہیں اور تاثیر ہی شاید ہمارے دور کا تقاضا بھی ہے۔ شادؔ عارفی نے اپنے فن کے بارے میں خود فرمایا ہے ؎

اور پھر کہتے ہیں کس کو ندرتِ طرزِ ادا
میرے شعروں میں مری آواز پہچانی گئی

انھوں نے عہد جوانی میں محبت کی قندیلیں فروزاں کو رکھی تھیں لیکن شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں نے کب کسی کا ساتھ دیا ہو؟ ان کے خواب بھی ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اس مرحلہ پر جب ہم ان کے جذباتی و نفسیاتی مدوجزر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انھوں نے پیکرانِ ناز و جمال کو کھو کر کچھ دنوں کے لیے اپنے آپ کو بھی کھو دیا اور اس طرح اپنے چاروں طرف تنہائیوں اور اداسیوں کا ایک ویرانہ آباد کر لیا۔ وہ جب اس ویرانے کی طرف دیکھتے تو یادِ عہدِ رفتہ کے سائے انھیں اپنی طرف لپکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر انھوں نے یہ سارا المیہ بڑے صبر و تحمل سے برداشت کر لیا۔

محرومی، دل شکستگی، ذہنی الجھن اور بے حد حسّاس دل رکھنے کے باوجود انھوں نے ضبط کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ شادؔ ہی کا دل گردہ تھا جو وہ غم آشنا زندگی کو ہنس ہنس کر برداشت کرتے رہے، اگرچہ ان کی ہر خوشی غم زدہ بن کر رہ گئی تھی،

اُن کے دل و دماغ ایک بھیانک طوفان کی زد میں آئے ہوئے تھے، انھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے دل کی دھڑکنوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھا تھا مگر کہا تو صرف یہ کہا ؎

شادؔ مغموم جو مسرور نظر پڑتا ہے سچ کہا ہے کہ تخلص کا اثر پڑتا ہے
بربادیوں کو ہم نے گلے سے لگا لیا اُن کی خوشی کو اپنے موافق بنا لیا

یا شاید اپنے صبر آزما ماحول میں انھوں نے اس شعر کے مضمون کو اپنا خونِ دل پلا کر تخلیق کا کرب برداشت کیا ہو ؎

بے رونقی شمع تمنّا نہ پوچھیے جیسے کوئی چراغ کسی قبر پر جلے

اپنی زندگی کے اس موڑ پر ان کا نظریۂ حیات کتنا معنی خیز و غیر محدود تھا، وہ کہتے تھے کہ زندگی ایک بحرِ ذخّار ہے، ایک ایسا بے کراں اور موّاج سمندر ہے جس کی وسعت کے اظہار کے لیے الفاظ ساتھ نہ دیں، جس میں لہریں اٹھتی ہیں، انگڑائیاں لیتی ہیں، ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتی ہیں اور انجام کار ایک دوسرے سے بچھڑ جاتی ہیں۔

یونانی مفکر افلاطون نے اپنی تصنیف ری پبلک (REPUBLIC) میں شاعروں کے خلاف یہ کہہ کر آواز اٹھائی ہے کہ وہ ایسا نقّال ہے جو اخلاق کو سنوارنے کے

بجائے سفلی جذبات کو ابھارتا ہے، وہ حسن و عشق کے موضوع پر قلم اٹھا کر زندگی کے حقائق سے بھٹکاتا اور گمراہ کرتا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں اسٹیفن گاسن نے اپنے اس نظریہ کا اظہار کیا کہ شاعری انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے، وہ سستی مسرت فراہم کرکے انسان میں اخلاقی کمزوری پیدا کرتی ہے، میتھو آرنلڈ شعر کے بارے میں یہ خیالات منظرِ عام پر لایا کہ شاعری کو زندگی کا عکاس ہونا چاہیے۔ اس سے عقائد اور خیالات کی اصلاح تو ہو لیکن یہ لے اس حد تک نہ بڑھے کہ شاعر ناصح و خطیب بن کر رہ جائے، اس میں اشاروں کنایوں اور استعاروں میں بات کہنے کا سلیقہ ہونا چاہیے اور حتی الوسع شعری لوازمات کا خیال رکھا جائے کیونکہ اس سے شعری حسن متاثر نہ ہوگا اور نتیجتہً اس کا آب و رنگ قائم و باقی رہے گا۔ اس کے برخلاف راست کہنے پر شاعری درس اور تبلیغ کے مرتبہ پر پہنچ جائے گی۔ نظیری نے کہا ہے ع

" برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست "

ان نظریات کی روشنی میں یہ موضوع زیرِ بحث آتا ہے آیا شاعری بنیادی طور پر اخلاقی ہوتی ہے یا غیر اخلاقی، اور شاعر کو اخلاقی اقدار کا پاس و لحاظ کرنا چاہیے یا ان سے انحراف۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ آرٹ زندگی کا تابع نہیں ہوتا بلکہ اپنے عہد کے اخلاقی اقدار کا تابع ہوتا ہے، ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ ہر شاعر کچھ نہ کچھ مفروضہ اخلاقیات کے اصولوں سے رابطہ رکھتا ہے۔ شاد عارفی بھی اس خیال کے حامی تھے کہ شعری اخلاقیات کو اپنے زمانہ کی اخلاقیات کا ترجمان ہونا چاہیئے، وہ ان جذبات اور احساسات کو سماج اور سوسائٹی کے اخلاق سے مغائر سمجھتے تھے جو سستی مسرت کے نام پر لوگوں میں عام ہو جائے، وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاقی معیار کو بلند اور ارفع دیکھنے کے حق میں تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ انسانوں میں ذہنی پستی، غیر مہذب اور غیر اخلاقی اقدار کا چلن عام ہو اور اس کے ذریعے سوسائٹی سستی مسرت حاصل کرنے لگے؛ ان کے گرد و پیش کے حالات نے ان کے اس نظریہ کو مستحکم تر بنا دیا۔ وہ زندگی اور ادب کے رشتہ کو بہت مضبوط قرار دیتے تھے، مشاہدات اور تصورات کے افق پر وہ اپنے ماحول اور سماج کو طرح طرح کے زاویوں سے دیکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ پہاڑ سے گرے ہوئے انسان کے کھڑے ہونے کا امکان ہوسکتا ہے لیکن نگاہوں سے گرا ہوا انسان کبھی کھڑا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ لوگوں کی کمزوریوں پر وہ اپنے انداز میں چوٹ کرتے تھے تاکہ برائی سب کے سامنے آجانے پر اس کا سدھار ممکن ہو۔ انھوں نے اپنے شاعرانہ طنز کی مفروضہ غرض و غایت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے ؎

فرض ہیں ہم پہ بیاناتِ بصیرت، اے شاد!
جس کی قسمت میں سنبھلنا ہے، سنبھل جائے گا

خود شاد عارفی کی محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان طویل ہے، تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے کیونکہ اس مضمون کا حجم طوالت کا متحمل نہ ہوگا۔ ان کے راستوں کے پھول مرجھا گئے تھے اور ان کی جگہ آگ کے شعلوں نے لے لی تھی گویا اس طرح ان کا ہر راستہ آگ کا دریا بن گیا تھا۔ قدرے وضاحت کے لیے اشاروں کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ان کی زندگی یکسر ویران ہوگئی تھی، ذرائع معاش رفتہ رفتہ ختم ہوگئے تھے، حق تلفیوں نے زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا۔ بیشتر اقارب "عقارب" بن گئے۔ حاسدوں اور رجعت پسندوں کی ریشہ دوانیوں نے جینا حرام کر دیا اپنی آنکھوں سے دروغ کے فروغ کا معائنہ کیا۔ اپنے ہم جنسوں کی "انا" کو مجروح ہوتے ہوئے دیکھا، بد باطنوں اور تملق پسندوں کو "مسندِ اعزاز" پر پایا۔ اندریں حالات ان کی صحت خراب رہنے لگی، غیر معمولی ذمہ داریوں اور عسرت نے ان کے گھر میں ڈیرے ڈال دیئے، سریع الاحساس اور حقیقت پسند ہونے کے باعث وہ اپنے ماحول میں بڑی گھٹن محسوس کرنے لگے جس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا، اس مسموم فضا کو بدلنے کے لیے وہ اور تو کچھ نہیں کر سکے ہاں بڑی بے جگری سے انھوں نے یہ کہتے ہوئے اپنے فن کو نوکیلے طنز کا روپ دینے کا سہرا خود اپنے سر باندھ لیا ؎

لہجہ بدل گیا تھا سوالِ حقوق پر بد باطنوں کے ہاتھ اک عنوان آگیا

اس مرحلے پر جب زیادہ لے دے ہوئی تو وہ بھی کب تک صبر و ضبط سے کام لیتے، میرے نزدیک ع

غزل میں رام پور کے پٹھان تھے تو شاد تھے

چنانچہ یہ کہتے ہوئے وہ بھڑک اٹھے :

وارفتگیِ شوق میں طوفان آگیا

اب میرے ہاتھ جس کا گریباں آگیا

سچ پوچھئے تو یہ طوفان نام نہاد طوفان نہ تھا اور اس طوفان کو روکنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ سچائی خطرے سے محفوظ ہے اور میدانِ جنگ میں بہادر آدمی خواہ تنہا ہو وہ بجائے خود ایک لشکر ہوتا ہے۔ شاد عارفی خود اپنے متعلق ایسے بے باکانہ اعتراف کے ساتھ

دس پانچ برس حضرتِ حالی کی طرح شاد !

مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

سچی سچی اور کھری کھری باتیں، تادمِ آخر اپنے مخصوص طنزیہ لہجہ والے شعری سانچے میں ڈھال کر دنیا والوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ ان کے کلام میں دل کی دھڑکنیں بھی ہیں اور معاشرہ کے دلکش اور بھیانک روپ بھی۔ اُن کا قلم بے خوف اور روایت شکن تھا۔ ان کے نمائندہ اشعار طنزیہ ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی فکر انگیز تخلیقات میں ان کے مزاج کا عکس پایا جاتا ہے۔ ذرا ان شعروں کے تیور تو دیکھئے

زمانہ ساز کو ہونٹوں میں کیوں بُرا کہہ دوں

مرا مزاج تو یہ ہے کہ برملا کہہ دوں

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا

شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

پروفیسر آل احمد سرور کی رائے میں شاد کے ہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے محبت اور نفسیاتِ انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں جنھیں ایسے بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اُن کے نزدیک جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شاد عارفی کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اُجاگر کیا ہے اُسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔

اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک تہذیبی روایات کی علامت تھے جن سے انھیں جذباتی لگاؤ تھا۔ انھیں اپنا معاشرہ بھی عزیز تھا اور انسان کی خودی بھی۔ روایت سے بغاوت کی گود میں پلا ہوا کلام انداز بیان کے اعتبار سے دل آویز تھا اور لہجہ کے اعتبار سے طنز آمیز۔ بنجر زمین ہو یا پتھریلی، وہ پتھر دلی سے ایسے منھ بولتے مجسمے اور پیکر تراش لیتے تھے جنھیں دیکھ کر زندگی کو رشک آئے۔

ہند و پاک میں اکثر لوگ اُن کے اشعار کی تعریف و توصیف میں رطب اللساں ہیں اور کچھ مذمت آمادہ لیکن یہ ممکن ہے کہ موافقین ہوں یا مخالفین انھیں پوری دلچسپی کے ساتھ نہ پڑھیں، ان کے اشعار میں اکثر کردار ہمارے ماحول کے جیتے جاگتے کردار ہیں جن کا انھوں نے بڑی گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ بات شرح و بسط سے تو کہنے کا موقع نہیں ہے سردست اختصار سے کام لیتے ہوئے مشتے نمونہ از خروارے چند ہم رنگ اشعار حاضر ہیں جن میں ندرتِ بیان بھی ہے، عصری آگہی بھی ہے، سماجی کمزوریوں کی پردہ دری بھی ہے، روایت کو رسوائی سے بچانے کا انداز بھی ہے اور صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ لطافتِ بیانِ واقعہ بھی ہے

دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں کون ہے کس رنگ میں

سوچتی رہتی ہے دنیا کس کو رسوا کیجیے

اپنے گھر کے راز وطن کے دشمن تک پہنچانے والا

"جعفر" شاید باطن ہوگا "صادق" شاید طینت ہوگا

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا اور اخبار میں اعلانِ ضرورت ہوں گے

برابر ہیں فغان و درد و نغمہ یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے؟

سوچنا پڑتا ہے کس نے کیا کہا؟ کس جا کہا؟

نسبتاً بھٹی سے بالا تر ہے مے خانے کی بات

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

گل کھلاتی ہے نسیم سحری باغباں اپنی ہوا باندھتے ہیں

بھاؤ، انعام، دعا، بھیک، گریباں، خنجر
آج ہر ہاتھ کسی کام سے وابستہ ہے

ابھی تو موسم ناخوشگوار آئے گا
پھر اس کے بعد پیام بہار آئے گا

ہمسایوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے گھر کو آگ لگا دی

سیپیں ہوں یا قبر کی چادر پھولوں کا انجام برا ہے

وہ ہمیں تلقین فرماتے ہیں ایسے مشورے
جیسے اندھے سے کہا جائے کہ "بائیں ہات کو"

دوستو! پیروی کے یہ معنی نہیں ہر نشانِ قدم پر قدم رکھ دیا

جب گریباں گیر ہو جاتا ہے ٹھکرایا ہوا
ظلم تب گھبرا کے کہتا ہے "ارے یہ کیا ہوا؟"

وہی اخلاق کو، ایماں کو بناتے ہیں سپر
وہ جو اخلاق کے قائل ہیں، نہ ایمانوں کے

مرے ٹھکرائے جانے کو زمانہ کیا سمجھتا ہے
وہ ناقدر دانی ہے جو رشک قدر دانی ہے

نام سے کام حفاظت کا نہیں چل سکتا!
کسی رہزن کی ضمانت نہیں "درباں" ہونا

وقت کیا شے ہے پتا آپ کو چل جائے گا
ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھو گے تو جل جائے گا

اب رہی ان کے جارحانہ طنز اور تلخ گفتاری کی بات، تو اس کی آڑ میں ان کی آواز زندگی کی آواز ہے، ان کی فکر سماج کی فکر ہے، ان کا تیکھا اسلوب "آبروئے فن" ہے اور یہ محض اس لیے کہ آزادیٔ ضمیر کا تحفظ، ضابطۂ اخلاق کا تصور، فنی اصولوں کی پابندی اور محبت کا عالم گیر جذبہ ان کی شخصیت اور فن میں اس طرح رچا بسا ہوا تھا جیسے پھول میں خوشبو ۔۔۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ اختیار کردہ فنِ طنز ان کے حق میں "زہر ہلاہل" سے کم نہ تھا ۔۔۔ حق گوئی پھر شدتِ جذبات کے ساتھ چبھتے ہوئے لفظوں میں!! گویا کڑوا کریلا، پھر نیم چڑھا۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ان کا شعری آئینہ جس طبع شدہ چہرے کے سامنے پہنچا اس کا حال اپنی حقیقت کھل جانے کے ڈر سے ان کے خلاف مختلف قسم کے دسیوں محاذ بنا دیتا۔ اس نوعیت کے واقعات سامنے لانے کے لیے ایک علیحدہ مبسوط مضمون سپردِ قلم کیا جا سکتا ہے۔

شاد عارفی نے ایک جگہ اپنے فنِ طنز کی ہمہ جہتی کا ذکر اس انداز سے کیا ہے ؎

نقدِ ماحول کہ فن ہے میرا
ہر طرف روئے سخن ہے میرا

ان کے اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کرانے کے لیے کسی عنوان اور کسی اشارے کے بغیر دور رس نظر رکھنے والے قارئین کی خدمت میں چند ایسے طنزیہ اشعار پیش کیے جائیں جو موضوع سخن کی بھرپور تائید کے ضامن ہوں تاکہ زندہ ثبوت کی روشنی میں دعوے کی سچائی پہ شک و شبہ کی گنجائش کا امکان ختم ہو جائے چنانچہ شعر تو عمومی حیثیت سے بلا تبصرہ حاضر ہیں مگر سوچنے کی بات ہے یہ کڑوی اور کسیلی باتیں سن کر ان کا "ممدوح" مائل بہ انتقام اور "درپئے آزار" نہ ہوگا تو کیا انھیں انعام و اکرام سے نوازے گا!

<u>شاد عارفی کے نذرانے "سماج" کے حضور میں</u>

کہنے والوں نے کہا "ظل الٰہی" ان کو
ہم جنھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

واہ کیا مصرعہ کہا ہے، پھر عنایت کیجیے
آپ کو ہم نامرادانِ وفا کا پاس ہے

تو شاد کیا بانجھ ہو گئی مادرِ علوم و فنون و حکمت
بجوریوں کے شکم سے ہونے لگے جو عزت مآب پیدا

کوئی مصرف نہیں دولت کا اگر دوسرا "تاج محل" بنوا دو

مصرعہ ہے اگر آپ برا مان نہ جائیں
اوچھوں سے کوئی کارِ نمایاں نہیں ہوتا

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی!
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

غالبؔ کے شعر نام سے میرے سُنا کے دیکھ
پھر اعتراضِ ناقدِ فن آزما کے دیکھ

ماسوا کی تاک میں ہیں سبحہ گردانوں میں ہیں
کچھ یہودی بھی بڑے پکّے مسلمانوں میں ہیں

معرفت کی یہ منزل مجھ سے طے نہیں ہوگی
جو مجھے بُرا سمجھے، میں اُسے بھلا کہہ دوں

اِن ماہرانِ شعر و ادب نے جناب شادؔ!
عُریانیِ غزل کا کبھی جائزہ لیا؟

اُس نے جب تو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی۔

حیدر آباد میں فانیؔ پہ جو بیتی اے شادؔ!
تجھ پہ یو۔پی میں وہی ظلم ہُنر ہے کہ نہیں؟

کبھی کوئی بیاں ہے، کبھی کوئی بیان ہے
جو پینترے بدل سکے وہ آپ کی زبان ہے۔

جہاں اے شادؔ! کج فہموں سے شاعر داد پاتا ہے
گویا اُس جگہ مقصود ہوتا ہے غزلخواں سے

ہماری فکر میں رہتے ہیں اے شادؔ!
جنھیں ہم دھیان میں لاتے نہیں ہیں

اے شادؔ! مجھ کو حُبِّ وطن کے لحاظ سے
کہنا یہی پڑے گا کہ اچھی گزر گئی

اُن کے بہت سے نوکیلے طنز والے اُن اشعار سے صَرفِ نظر برتتے ہوئے جن کی اساس سیاست، سماجی مساوات اور معاشی یکسانیت وغیرہ پر ہے اپنے قول کی تائید میں مندرجۂ بالا ہلکی پھلکی تخلیقات پیش کی گئی ہیں مگر ان سے بھی شاعر کے کلام کا رنگ و آہنگ اور پیرایۂ بیان بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور اشعار کے مجموعی تاثر سے صحیح رائے قائم کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ندریں حالات یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایسا شوخ رنگ اور ایسی البیلی آواز پہلے کہیں نہ مل سکے گی۔

شادؔ عارفی صرف اُردو بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہی نہ تھے بلکہ وہ اُردو میں سانس تک لیتے تھے گویا اُردو ان کی سب کچھ تھی، وہ ان کے بے پناہ شغف اور محبت کا مرکز ہی نہیں ذریعۂ معاش بھی تھی، انھوں نے اپنی یہ روش آخر تک برقرار رکھی۔ کسی مصلحت کی یہ مجال نہ تھی کہ جرأت مندانہ اور بے باکانہ اظہارِ واقعہ کے موقع پر ان کے قلم کو روک دیتی، انھوں نے روایات کی قیود سے آزاد ہو کر نئے اسالیب، موضوعات اور نئی تشبیہات و استعارات کے تجربے کیے، ان کے سامنے جو بھی مسائل آئے انھوں نے ضروری اور مناسب لہجہ میں انھیں تخلیقی حُسن کے ساتھ ادب میں برتا۔ ان کے ہاں شعور کی پختگی کے ساتھ احساس کا رچاؤ بھی شدید ہے اور ان دونوں کی ہم آہنگی ہی سے مقصدی تخلیق ممکن ہے۔

شادؔ عارفی نے غزلوں کے علاوہ بڑی موثر اور دلکش نظمیں بھی لکھی ہیں اور حکیمانہ نکات پر اخلاقی، تعمیری و سماجی رجحانات کی ترجمانی کا حق ادا کرنے والے اثر انگیز قطعات بھی جو اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے شعری سرمایہ سے فن کارانہ عظمت، جودتِ طبع، اور فنی صلاحیتوں کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ اس میں صحتِ زبان و قدرتِ کلام کے دوش بدوش گوناگوں شعری و ادبی لوازمات کا احترام کہیں مجروح نہیں ہوتا۔

ان کا کلام لاکلام معائبِ زبان و بیان سے پاک ہے۔ زود گوئی اور بسیار نویسی کے باوجود ان کے خیالات میں نہ تو ناہمواری ہے اور نہ ژولیدگی۔ ہاں اشعار میں [illegible] کی آنچ، رجائیت، فنی دسترس، خارجی اور داخلی حُسن، طنز کی لہر اور مستقبل کے اشارے ان کے مخصوص اور منفرد آہنگ کے ساتھ ملتے ہیں۔ دنیائے طنز میں شادؔ عارفی کا کلام ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے طنز کا نشتر تیز کرنے کے لیے ایسا لہجہ اپنایا تھا جو واقعی بے مثال و لاجواب ہی نہیں ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت اور فکر و فن کی شناخت کا ضامن بھی ہے۔

لیکن اس ضمن میں خود ان کی رائے غور طلب ہے ۔

یہ فنِ طنز" مرے حق میں درحقیقت شاد !
بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

اس احساس کے باوجود "خانۂ جہاں" فلاکت کی ترشی سے بھی ان کی حقیقت پسندی کا نشہ ہرن نہیں ہوا ـــ وہ زندہ تو رہے مگر حیات کی پوری تابانیوں کے ساتھ زندہ نہ رہے اُن کی زندگی ماندہ اور تھکی ہوئی زندگی تھی جس کا اس مقطع سے ثبوت ملتا ہے ۔

چمن میں پھولوں کی مہک ہو نہ ستاروں کی چمک
شاد ایسی سحر و شام سے وابستہ ہے

ذرا اس شعر میں اُن کے "اندازِ فکر" کو دیکھئے جس میں بیان کی صداقت لفظ لفظ سے جگمگا رہی ہے ۔

اس انجمن سے اٹھوں گا گھڑی گھڑی کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں

وہ کبھی حاسدانِ بدسگال کی ریشہ دوانیوں کو ہنس کر ٹال دیتے تھے اور کبھی زیادہ دل برداشتہ ہو جاتے تو یہ کہہ کر ان پر اپنی تیغ طنز کا بھرپور وار کرتے ۔

جو میسر تھی مجھے وہ بھی تن آسانی گئی
دوستو ! لیکن تمھاری ذات پہچانی گئی

شاد عارفی کو اپنے فن اور منفرد لہجہ پر اعتماد تھا ، وہ اپنے مستقبل کی تابناکی کے تصور سے بڑی حد تک مطمئن تھے ۔ انھوں نے کہا ہے ۔

یہ حقیقت کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے
رات کے بعد ہے اِک صبح درخشاں ہونا

مجھے اے شاد ! ان رجعت پسندوں سے تو کیا لینا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیب جواں مجھ کو

کل جو دَور آئے گا ' عہدِ غور آئے گا ' شاد !
غم نہ کر دُنیا ' آج خوش گلو کی ہے

اور ۔

ہم غلط رجحان رکھتے تھے کہ آپ ؟
آپ سے پوچھیں گے مستقبل میں ہم

اگرچہ شاد عارفی اپنا سوال دہرانے کے لیے آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسودۂ خواب مرگ ہوجانے کے باوجود وہ ہندو پاک میں بسنے والے اپنے پرستارانِ فن کے دلوں میں ہنوز زندہ ہیں ۔

لوگوں کو اندھیرے میں صرف اندھیرا نظر آتا ہے لیکن میں اندھیرے کو روشنی کی پرچھائیں سمجھتا ہوں ۔ جب چاروں طرف اُجالا ہوتا ہے تو اندھیرا پرچھائیوں کا روپ لے کر زندہ رہتا ہے اور رات کی تاریکی میں روشنی کا بھرم ماہ و انجم کی شکل میں باقی رہتا ہے ۔ کون کہتا ہے کہ روشنی اندھیرے میں بند رہتی ہے یا اندھیرا روشنی میں ؟ یہ تو ایک ہی حقیقت کے دُو رُخ ہیں ۔ اندھیرے اور روشنی کے پردوں کو ہٹا دیا جائے تو صرف سچائی اور حقیقت باقی رہ جاتی ہے ۔

●●

تو غم کیا ہے ـــ صفحہ ۲۶ کا بقیہ

BEST WORSHIP ـــ سوشل ازم اور یہی ہے ہمارا نصب العین ۔

(پیروں کی آہٹ ۔ جیلر آتا ہے اور سلام کرتے ہوئے کہتا ہے)

جیلر ۔ آپ کا ٹرانسفر سنٹرل جیل حیدرآباد (سندھ) ہوگیا ہے اور آپ پر راولپنڈی سازش میں شمولیت کا جرم ہے ۔"

(فیض صاحب ہنستے ہیں اور
پردہ گرتا ہے ۔)

●●●

مراجعت

شاداب رضی
لکچرر، پی۔ جی ڈپارٹمنٹ آف اُردو
بھاگلپور یونیورسٹی
بھاگلپور

دوڑتے بھاگتے لمحوں کے تعاقب میں کبھی
میں نے آوارگیٔ برگِ خزاں دیکھی ہے
پیش و پس اور چپ و راست بگولوں کا سفر
پہلوئے گُل میں رواں برقِ تپاں دیکھی ہے
دوڑتے بھاگتے لمحوں کے تعاقب میں کبھی
میں نے خود اپنے تعلق سے یہ محسوس کیا
ڈال سے چپکے ہوئے دق زدہ پتّے کی طرح
نظرِ موجِ ہَوا سے رہا سہما سہما
کرب کے بیشگیٔ احساس سے طاری جیسے
فرق سے تا بہ قدم رُوح و بدن پر رعشہ
حلق میں خار چُبھے اور لبوں پر نشتر
چھا گیا میری رگ و پے میں تھکن کا نشہ

ایسے ہنگام بھی دورانِ تعاقب آئے
دل نے جذبے کو مرے سرد بھی کرنا چاہا
میری آنکھوں میں شبِ تار نے انگڑائی لی
حوصلے نے مرے تھک ہار کے مرنا چاہا
عزم کے پاؤں بھی رُکنے سے لگے تھے، لیکن
یاس کا اَبر چھنٹا، پھُوٹی شعاع کی اُمید
جیسے گھنگھور گھٹا چیر کے نورانی لکیر
ایک دو پل کو کرے ظلمتِ شب کی تردید

میں نے فہمائشِ دل کی "ابھی مایوس نہ ہو
پالنا مہرِ جہاں تاب کا ہے پہلوئے شب
مرحلہ ہائے غم و یاس کے بعد اے دلِ من!
تیرا مقصود تری نذر گزارے گا طرب"
اُٹھ! کہ پھر عزم کا سامانِ سفر تازہ کروں
نفسِ سوختہ کو بارِ دگر تازہ کروں۔

بارے دل پھر سے تعاون پہ رضامند ہوا
مثلِ خاشاک تھا میں کوہِ دماوند ہوا

بڑھ کے تخیل کی پلکوں نے مرے تلووں سے
ایک اک کر کے سبھی خارِ الم چُن ڈالے
جوششِ حوصلۂ نو کی عنایت کے طفیل
ان گنت خواب تصوّر نے مرے بُن ڈالے

یوں لویں دے اٹھی تاریک فضا کی چلمن
جیسے قاصر ہو چھپانے سے قبا رنگِ بدن
جیسے چھن چھن کے کوئی نُور کہیں سے آئے
بے حجابانہ، قد و قامت ترکانہ لیے
شاہدِ وقت ملا نازشِ جانانہ لیے
توڑ کر بانہوں کی محراب اشارے کر کے
کہی وہ بات کہ جس کا نہ یقیں ہو پائے

ہر نفس ایک نیا رنگ بدلتی دُنیا
یوں لگا، میری قدم گیر ہوئی جاتی ہے
نشۂ بادۂ شبنم ہو کہ پھولوں کے سبُو
ایک اک شے مری راہوں میں بچھی جاتی ہے
دوڑتے بھاگتے لمحوں کا تعاقب کر کے
میں نے سمجھا کہ چلو! ایک بڑا کام کیا
اب کسی شوخ شگوفے کو کسی غنچے کو
اب کسی شاخ کسی پھول کسی بھونرے کو
زرد موسم کے حوالے نہیں ہونے دوں گا
ہجر کو قرب کے رنگین اُجالے دوں گا
مو پریشاں تو کبھی چاک گریباں کر کے
صحرا صحرا نہ پھرے گا کوئی مارا مارا

تیز ہوں گے نہ سر خار جنوں زاروں میں
ختم ہو جائیں گے تبدیلِ فصل زاروں میں
ہر طرف مشکِ ختن کا جہاں ڈیرا ہوگا
بس دھنک رنگ بہاروں کا بسیرا ہوگا
ہوں گے مرقد نہ جہاں تشنہ تمناؤں کے
در کھلے ہوں گے جہاں ہر طرف آشاؤں کے

دفعتاً صرصرِ سفاک کی مٹھی لہرا کر
ہو گئی ساری فضا گرد و غبار آلودہ

چند ذرّوں کی خلش کر گئی آنکھوں کو مری
آن کی آن میں یک لخت خمار آلودہ
یک بیک میرے کفِ دست اُٹھے آنکھوں تک
کھل گئے میرے تصور کے بھرم ہی سارے
خیمۂ خواب سے خوابوں کے سبھی بنجارے
ایسے نکلے کوئی بھونچال میں جیسے گھر سے

پھر وہی عارض و لب پھر وہی بادِ سموم
موجۂ خون کی مانند رگ و پے میں تھکن
تشنگی، گردِ سفر، پھر وہی دیرینہ جلن
خواب پھر خواب ہیں خوابوں کی حقیقت معلوم
خواب کا رشتہ صداقت سے خیالی، موہوم

پھر نیا وہم دکھاتا ہے مگر اپنی جھلک
ہیں مرے دستِ نظر اور گریبانِ فلک

**

سُلطان احمد نادم
ملک گیتی گیٹ، باسی کی مسجد
لکھنؤ

غزل

ہو نا رہتا ہے یہاں کیسا تماشا جانیں!
اور اس کھیل میں کیا اپنا ہے حصّہ جانیں

میں تو حالات کے سانچوں میں ڈھلا کرتا ہوں
مجھ کو اپنا نہ کہیں مجھ کو نہ اپنا جانیں

زخمِ ہستی تو ہمیں نے ہیں سجائے دل میں
یہ جہاں والے کہاں درد کا رشتہ جانیں

موڑ دیتے ہیں وہی لوگ ہوا کا رُخ بھی
دُھوپ کو دُھوپ جو سائے کو نہ سایا جانیں

مشترک ہوتے ہیں آلامِ جہاں کے کتنے
دیکھ کر زخم مرے، حالِ زمانہ جانیں

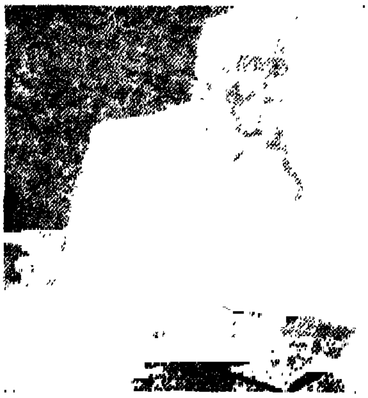
ہنس کے وہ وقت کے انداز بدل دیتی ہے
زندگی کو نہ فقط فکر کا لمحہ جانیں

کہکشاں انجمِ شبنم کی تو کہہ سکتے ہیں
اہلِ طوفاں کبھی دریا کو نہ دریا جانیں

رہبروں کو تو نئی سمت ہی چلنا ہوگا
ان کو منزل کی نہ پہچان نہ رستہ جانیں

دیکھنا ہم کو تھی کشتی کی فقط تیز روی
وہ تھا طوفان کہ گرداب یہ ہم کیا جانیں

سانس لینے کے لئے ہے یہ ضروری نادم
سخت کتنا ہے اب اس شہر میں پہرا جانیں



شاکر جرولی
دیہا مکان - جرول
ضلع بہرائچ

سراج لکھنوی

سادہ لباس پہنے، آہستہ مگر پروقار چال سے راستہ طے کرتے، اپنے خیالوں کی دنیا میں گم وہ اکثر مجھے کڑہ ابوتراب خاں کی پیچ دار گلیوں میں آتے جاتے نظر آجاتے اور انھیں دیکھ کر یہ گمان بھی نہ گزرتا کہ قمیص پیجامے میں ملبوس سر پر معمولی سی ٹوپی رکھے بیگانگی کے انداز سے گزر جانے والی یہ شخصیت انھیں سراج لکھنوی کی ہے جن کا یہ زبان و شعر آج بھی لکھنؤ کے روایتی انداز بیان کا طرۂ امتیاز ہے :-

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

ان کو دیکھ کر اکثر خیال آتا کہ وہ جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ مشاہیر سخن کی صفوں سے کسی نے ایک نایاب مجسمہ کو اٹھا کر قدیم لکھنؤ کی گلیوں کے حوالہ کر دیا ہے — وہی متانت وہی سنجیدگی اور وہی کلاسیکی خود فراموشی! کبھی کبھی سوچا کہ پوچھ بیٹھوں یہ شناسا لگتی ہوئی اجنبی سی صورت کس کی ہے؟ کئی بار انھیں حکیم صاحب عالم کے مطب کے برآمدے میں صاحب عالم سے' جو نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ شاعروں کے پرستار بھی تھے' محو گفتگو دیکھا، اکثر وکٹوریہ اسٹریٹ کے ایک ریسٹورنٹ' میں جو اس زمانہ میں اہل سخن کا اڈہ تھا' بیٹھے اور ادبی مباحث میں حصہ لیتے پایا مگر شوق جستجو کے باوصف کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا — اور تب اچانک برف اپنے آپ پگھل گئی -

ہوا یوں کہ راجہ بازار میں کاشانہ اکرام کی ایک ادبی محفل میں شرکت کے لیے جب پہنچا تو وہ مسند صدارت پر اپنی پوری سادگی کے ساتھ جلوہ افروز تھے — دوستوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہی سراج صاحب ہیں — دبستان لکھنؤ کے ممتاز شاعر اور عدم واقفیت کا بھلا ہو کہ ان کے بڑے بیٹے معراج لکھنوی میرے بچپن کے دوست تھے مگر نہ کبھی میں نے پوچھا نہ انھوں نے بتایا کہ وہ کس شاخ ثمردار کے ثمر ہیں ۔

یہ زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ اساتذۂ فن سے بھرا پڑا تھا — جعفر علی خاں اثر، آنند نرائن ملا، شمس لکھنوی، تدبیر لکھنوی، حبیب احمد صدیقی، سید نواب افسر، منظر لکھنوی، سالک لکھنوی، عمر انصاری، اسلم لکھنوی — خوشگوار اور فن کار شعراء کی تعداد اتنی بڑی ہوتی کہ "بزم شعرا" کے مشاعروں میں ترتیب دینے کا کام منتظمین کے لیے ایک چیلنج ہو جاتا۔ طرحی مشاعرہ کا دور جب شباب پر ہوتا تو ایسا لگتا کہ "بہار ادب" "نئی زندگی لے کر پھر سے رونما ہوگئی ہے' ایسے میں جب سراج صاحب اپنی نئی غزل کے ساتھ جانے پہچانے لہجے میں مصروف تکلم ہوتے تو اس بار رونق محفل کا رنگ ہی اور ہوتا۔ متقی، عزیز، محشر، ثاقب اور آسی کی تمناؤں کا لکھنؤ شاید اسی طرح کی محفلوں کا تقاضائی تھا — !

سراج صاحب کو اپنی زندگی میں کئی ادبی معرکے سر کرنا پڑے، "فریب شکریہ" اور "اندیشۂ فریاد" کی بحث قومی آواز کے کالموں میں اب تک محفوظ ہے۔ انھوں نے بڑی جرأت مندی سے اپنے مخالفین کی کاری ضربوں کے بھرپور جواب دیئے اور اس ردوبدل میں اپنے نظم نگار قلم کو نثر طرازی کی پگڈنڈی پر ڈال

غیبی آواز (۳) جیل کا ایک ملازم عمر تقریباً ۴۴ سال۔

تاریخ۔ وقت۔ مقام۔ ۳۰ مئی ۱۹۵۱ء تا ۲ جون ۱۹۵۱ء۔ ۱۱ بجے دن۔ قلعہ لاہور جیل۔ بھگت سنگھ وارڈ کا ایک چھوٹا سا کمرہ۔

(کمرے میں معمولی سا ایک پلنگ۔ ذرا ہٹ کر ایک اسٹول دن کے ۱۱ کا گھنٹا بجتا ہے۔ جیل کا ملازم چائے کا ایک کپ اور ایک بن لیے داخل ہوتا ہے اور اسٹول سرکا کے پلنگ کے پاس لگا کر اس پر چھوٹی سی ٹرے میں رکھا کپ وغیرہ رکھ دیتا ہے اور چلنے لگتا ہے)

فیض احمد فیض۔ ارے بھائی سو کیا چائے کا یہی وقت ہے اور صرف بن

ملازم۔ حضور! ہم سے جب کہا گیا لے کر حاضر ہو گیا۔ حضور گردشِ روزگار بلکہ اصحاب اقتدار کا ستایا ہوا ایک گریجویٹ مجرم ہوں۔ اور ایک قیدی!

فیض احمد فیض۔ (ہنستے ہوئے) تو تم بھی برادری کے آدمی ہو۔ ایک قیدی

ملازم قیدی۔ حضور! چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک (قیدی چل دیتا ہے اور فیض چائے پینے لگتے ہیں اور خود بخود دل ہی دل میں کہتے ہیں)

فیض احمد فیض۔ آج صرف دو ہی دن ہوئے ہیں پھر بھی نہ جانے کیوں اس جیل میں ہمیں اتنی وحشت کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ ہم کبھی مصیبت سے نہیں گھبرائے۔ بھوکے بھی رہ سکتے ہیں۔ جب ہمارے سامنے مزدور اور کسانوں کی بھوک آ جاتی ہے، جنھیں مکا کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ ان کے جائز مطالبات نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ اس جیل میں نہ جانے ہمیں کیا ہوتا جا رہا ہے کہ

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے

ایک غیبی آواز۔ (ترنم سے)

ساتھی نا ہو اداس، ساتھی نا ہو اداس
رات اندھیری کٹ جائے گی ہوگا نیا سویرا
دُکھ کے بادل چھنٹ جائیں گے پھر ہوگا نیا سویرا
ساتھی او ساتھی! ہوگا نیا سویرا
نا ہو اداس ساتھی

فیض احمد فیض۔ ٹھیک اور بہت ٹھیک اور ہم بھی اسی انتظار میں ہیں۔

پھر وہی آواز۔ تاریخ کے ورق الٹو ساتھی! اور پڑھو ایک راجکمار کس طرح دنیا سے دکھ۔ درد مٹانے کے لیے راج بھون چھوڑ دیتا ہے اپنی پیاری پتنی یشودھرا اور ننھے سے بیٹے راہل کو چھوڑ دیتا ہے پریم اور ممتا کی زنجیروں کو چھوڑ کر، جب وہ سوچتا ہے کہ یہ سنسار غریبوں، دکھیوں، روگیوں اور مجبوروں کے آنسوؤں کا اتھاہ ساگر۔ جوانی کا روپ سمجھتا ہے۔ جب بکڑوں۔ ہزاروں انسان دکھ ساگر میں بہتے جا رہے ہوں تو انسانیت کے ناتے انھیں بچانا ہی چاہیے۔ ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ سکھ اور چین کے سپنے دیکھیں۔

فیض احمد فیض۔ سچ کہہ رہے ہو تم اور یہی جذبہ لے کر تو ہم جیل میں سزا بھگت رہے ہیں۔

پھر وہی آواز۔ اور جانتے ہو کہ نتیجہ کیا ہوا اس کی باتیں ایک دھرم بن گئیں، جس نے نہ پرماتما کو مانا اور نہ آتما کو، صرف جن سیوا اور جن سیوا اور آخر کار وہ دیوتا بن گیا اور اس کی مورتیاں پوجی جانے لگیں۔ وہ تھا کپل وستو کا راجکمار سدھارتھ۔ مہاتما بدھ۔

فیض احمد فیض۔ HUMAN SERVICE IS THE ——

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ایم کوٹھیاوی راہی
قاضی پور خورد، گورکھپور

سفر جاری ہے!

تم سے کہنے کو میں کہہ بیٹھا مری لگتی ہو!
اور اب سوچ کے یہ بات ہنسی آتی ہے
کتنے ہی پھولوں سے یہ بات کہی ہے میں نے
دلکشی جن کی، تصور میں چلی آتی ہے

نام بھی بھول گیا، شکل بھی، وہ چہرے بھی
سلسلے ٹوٹ گئے ساری ملاقاتوں کے
ہاں مگر یاد ہیں اب بھی کئی مہتاب سے جسم
ہو گئے ساتھ جو خلوت میں رکی راتوں کے

مل ہی جاتی ہے مگر پھر بھی "نگارِ منزل"
ہاتھ رکھ دیتی ہے زخموں پہ جو مرہم کی طرح
ساز اٹھا لیتی ہے خاموش ہوا کی صورت
اور سو جاتی ہے گاتے ہوئے موسم کی طرح

زندگی یاس کی ماری ہوئی محبوبہ ہے
جس کی زلفوں سے بہلنا ہے مقدر اپنا
سائے کی طرح سدا ساتھ لگی رہتی ہے
ہے کہیں اس کا ٹھکانا نہ کوئی گھر اپنا

پھر بدل جاتی ہے دھن اس کی بھی لمحہ لمحہ
اور وہ چہرہ بھی آکاش پہ ٹنک جاتا ہے
کتنے ہی چاند غباروں میں ہیں ڈوبے اب تک
کتنے ہی پھولوں کا رہ رہ کے خیال آتا ہے

اک سفر ہے جسے رہنا ہے مسلسل جاری
ایک آنسو ہے جسے آگ نہیں ہونا ہے
اک صدا ہے، جسے گھٹنا ہے سدا سینے میں
ایک نغمہ ہے، جسے راگ نہیں ہونا ہے

تم سے کہنے کو میں کہہ بیٹھا مری لگتی ہو
اور اب سوچ کے یہ بات ہنسی آتی ہے
کتنے ہی پھولوں سے یہ بات کہی ہے میں نے
دل کشی جن کی تصور میں چلی آتی ہے

غزلیں

بسنت کمار بسنت
۲۵۶/۳۹ - ٹیڑھی بازار، رکاب گنج
لکھنؤ

اس دور میں بشر سے بشر ہے کشاں بہت
جنھیں خلوص و مہر و وفا ہے گراں بہت

ہر سمت دیدنی ہے مہ و گل کی آب و تاب
ہر سمت ہے نمائشِ لالہ رُخاں بہت

رکھے جو چند تنکے کہیں پر سمیٹ کر
چمکی ہے آسمان پر برقِ تپاں بہت

سب کو تلاش آج مرے نقشِ پا کی ہے
اس رہ گزر پہ جس سے گئے کارواں بہت

اب اجتماعِ ماہ وشاں خواب ہو گیا
خوابِ حسیں بھی لگتا ہے خوابِ گراں بہت

نوکِ مژہ پہ اشک ہے برہم ہے زلف زلف
ہر گل کی آنکھ نم ہے بہت خونچکاں بہت

تاجر نہیں بسنت کروں میں جو فن کا مول
بکنے کو یوں تو اہلِ سخن ہیں یہاں بہت

اختر شاہجہانپوری
رنگین چوپال، شاہ جہاں پور

ترے وجود کی اک معتبر خبر ہوں میں
سراپا حُسن ہے تو اور بس نظر ہوں میں

کبھی کھُلے وہ دریچہ تو چاند کو دیکھوں!
وگرنہ خود کو سمجھتا ہوں بے بصر ہوں میں

جنھیں شعورِ مُسافت، نہ منزلوں کا شمار
تو پھر وہ کیوں یہ سمجھتے ہیں ہمسفر ہوں میں

میں سنگِ میل ہوں لازم ہے احترام تجھے
کہ راہبر ہوں نہ منزل ہوں نہ رہگذر ہوں میں

ہر ایک منظرِ ہستی میں ہوں پسِ منظر
فضائے دہر میں اس طرح منتشر ہوں میں

اُچھالتے ہو مری سمت کس لیے پتھر!
کہ برگ و بار سے عاری جب اک شجر ہوں میں

ہر ایک شخص کرے گا پھر احترام اختر
اگر خود اپنی نگاہوں میں معتبر ہوں میں

جاوید قسیم
ٹی/ایس/۱۔ آر اے نارتھ
جھانسی کینٹ

تیر اس کے تو نشانوں سے بھٹکتے کم ہیں
اور لگتے ہیں جنھیں وہ بھی سسکتے کم ہیں

ظاہری حسن و محبت پہ نہ جاؤ لوگو
پھول خوش رنگ جو ہوتے ہیں مہکتے کم ہیں

یوں تو منزل پہ پہنچ جاتے ہیں سب ہی لیکن
رہنما ٹھیک ہو تو لوگ بھٹکتے کم ہیں

شام کو ہارے تھکے لوٹتے کھیتوں کساں
گاؤں کو تیز بھی چلتے ہیں تو تھکتے کم ہیں

ٹوٹ جاتی ہیں ہواؤں میں بھی شاخیں اُنکی
سخت ہوتے ہیں شجر جو وہ لچکتے کم ہیں

تجربے کار جو ہوتے ہیں زمانے میں قسیم
راہِ ہستی میں قدم ان کے بہکتے کم ہیں

اظہر مسعود رضوی
ادبستان،
دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

میری تصویر

جس طرح (بقول مشتاق احمد یوسفی) کچھ مصنف محض مقدمہ لکھنے کی چاٹ میں کتابوں پر کتابیں تصنیف کرتے چلے جاتے ہیں، اسی طرح رسالوں میں اپنی تصویر چھپوانے کی تحریص بعض لوگوں سے 'مضامینِ نو' کے انبار لگواتی رہتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مصنف کے فن سے زیادہ اس کی تصویر نکھرتی چلی جاتی ہے۔ ایک واقعہ سنیے!

الف اور جیم مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصویریں تمام ادبی رسالوں میں چھپا کرتی تھیں، مضامین بھی چھپتے تھے۔ انھیں ایک دوسرے سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ایک دن الف کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو جیم سے بہت مشابہ تھا۔ اس نے کہا "جیم صاحب، بندہ آداب بجا لاتا ہے۔" وہ بولے "آداب ــــ لیکن معاف کیجیے گا، جیم میں نہیں، میرے والد صاحب قبلہ ہیں" پھر چونک کر کہنے لگے "اخاہ، آپ ہیں! واللہ کمال کی مشابہت پائی ہے ــــ بھائی آپ کے صاحبزادے الف صاحب تو خوب لکھتے ہیں!!"

ہوتا یوں ہے کہ جب کسی مصنف کو یہ گمان گزرتا ہے کہ اب وہ سامعین گرامی کی محفل سے اٹھ کر قارئین کرام کے دل میں داخل ہوا چاہتا ہے تو سب سے پہلا کام جو وہ کرتا ہے وہ یہ کہ مختلف زاویوں سے اپنی متعدد تصویریں کھنچواتا ہے۔ انھیں چھوٹے بڑے رسالوں پر رکھ رکھ کر دیکھتا ہے، بیوی بچوں کی صلاح لیتا ہے اور پھر محلے والوں سے مشورہ کرتا ہے۔ جب کسی ایک تصویر پر اجماع ہو جاتا ہے تو حسبِ ضرورت متعدد پوسٹ کارڈ یا پاسپورٹ سائز کی کئی درجن کاپیاں نکال کر محفوظ کر لیتا ہے۔ ایک کاپی قدِ آدم تیار کرا کے ڈرائنگ روم میں اپنے مرحوم باپ کی تصویر سے دو ہاتھ اوپر آویزاں کرتا ہے۔ جگہ کم ہو تو باپ کی تصویر اتار کر اپنی بیوی کے مائکے بھجوا دیتا ہے جہاں تصویر کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو باپ کے ساتھ اس کی زندگی میں رکھا جاتا تھا۔

تصویر کھنچوانے کی ہمیشہ وہی تاریخ درج کی جاتی ہے جس دن وہ کسی رسالے کو بھیجی جاتی ہے۔ کبھی تصویر کے سامنے اور کبھی پشت پر طلعت محمود کے مشہور گانے کی یہ لائن بھی قدرے ترمیم کے ساتھ لکھ دی جاتی ہے:

تصویر میری دل ترا بہلا نہ سکے گی

کسی رسالے میں شائع ہونے والے مضامین سے ایڈیٹر اور بسا اوقات خود مصنف اور قارئین کا متفق ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ افسانوں میں افراد و واقعات کبھی فرضی ہوتے ہیں (بعض محققین بہ نظر احتیاط تحقیقی مضامین میں بھی اس بات کا التزام رکھتے ہیں) کسی فرد یا واقعے سے ان کی مطابقت کو، عدم اتفاق کی تمام علامتوں کے باوجود، محض اتفاق کی شرارت سمجھنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اب تصویریں بھی ایسی چھپنے لگی ہیں جنھیں، تاوقتیکہ کسی گزیٹیڈ افسر کی مُہر تصدیق چہرے کے بیش تر حصّے کو چھپا نہ لے، مطابق اصل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک رسالے میں مندرجہ ذیل تصحیح و معذرت چھپی:

"پچھلے شمارے کے صفحات پر ہمارے دیرینہ کرم فرما اور مشہور شاعر جناب سوفار امیٹھوی کی تصویر چھپی تھی جس پر غلطی سے کیپشن لگ گیا تھا "میلۂ مویشیان میں اول آنے والی بھینس" اور ص ۱۹ پر اول آنے والی بھینس کی تصویر کے نیچے "سوفار امیٹھوی" ہم اس غلطی

کے لیے دونوں سے معذرت خواہ ہیں۔"

مذکورہ رسالے کا 'پچھلا شمارہ' دیکھا تو محسوس ہوا کہ اگر یہ تصحیح نہ چھپتی تو لوگ واقعی غلط فہمی میں مبتلا رہتے۔

ایک صاحب مرحوم مزاح نگاروں کا تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ اتفاق سے ایک رسالے کے دس سال پرانے شمارے میں میری ایک تصویر دیکھی۔ رسالہ کچھ بے عزت سا تھا۔ ادبی ہونے کے باوجود مع اپنے ایڈیٹر کے دس سال سے زندہ تھا۔ انھوں نے ایڈیٹر کو خاکسار کے بارے میں خط لکھا کہ مرحوم کی تاریخ ولادت و وفات انھیں درکار ہے۔ جب راقم کے بارے میں مطلع کیا گیا کہ ابھی بہ قید حیات ہے تو انھیں یقین نہ آیا۔ اب کی رسالے کے صفحہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ "میں نے ان بزرگوار کے بارے میں دریافت کیا ہے، جن کی تصویر (جو انتقال سے چند منٹ یا زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے پہلے اتاری گئی ہوگی) آپ کے رسالے کے فلاں صفحے پر چھپی تھی اور مصنف کی تصویر کے ساتھ رسمِ زمانہ کے مطابق آپ نے ایک مضمون بھی شائع کیا تھا۔" ایڈیٹر جب اپنا پچھلا بیان بدلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو انھوں نے حلف نامہ طلب کر لیا۔ ایڈیٹر نے وہ خط مجھے بھیج دیا اور اس سے پہلے کہ موصوف قیاسی "تاریخ وفات" لکھ کر راقم السطور ہٰذا کے مزار کو 'مرجع خواص و عوام' ثابت کر کے سرعزیز کو (قوالی کرنے والے) 'مغنی پسران' کے شور سے پُر کر کے 'کاسۂ طنبور' بنا دینے کا اقدام کرتے، حلف نامہ بھجوا دیا:

"میں فلاں ولد فلاں، ساکن محلہ فلاں کا ہوں
اور قائمی ہوش و حواس حلفیہ تحریر کرتا ہوں کہ
نہ صرف بہ قید حیات ہوں بلکہ سر دست
مرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔"

معلوم ہوا کہ اس حلف نامے نے موصوف کو سخت صدمہ پہنچایا اور انھوں نے تذکرہ لکھنے کا ارادہ ترک کر کے منجن بیچنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ بھی کھلا کہ اول الذکر محض منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا، فی الاصل ثانی الذکر ہی سپہ گری، کی طرح 'سو سال سے پیشۂ آبا' تھا۔

ہر چند کہ دل میں امنگیں اٹھیں، ارمانوں نے کروٹیں بدلیں اور آنکھوں نے رنگین خواب دیکھے لیکن ظاہری شکل و شمائل کے اعتبار سے میں نے لڑکپن سے براہ راست بڑھاپے میں قدم رکھا تھا۔ میری جوانی باعثِ صدر شکِ پیری تھی۔ کسی پیر فرتوت کا ذکر ہوتا تو لوگوں کی نگاہیں بے ساختہ میری جانب اٹھتیں، دفتر جاتے وقت قبرستان کے پاس سے گزرتا تو پھاٹک پر بیٹھے گورکن حریص نگاہوں سے مجھے تکا کرتے۔ ایک منچلا تو ایک دن ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "کئی دن سے بُہنی نہیں ہوئی — سرکار ہی کرم فرما دیں!!"

کئی فوٹوگرافروں سے منت کی کہ میری ایک تصویر ایسی بنا دو جس میں اپنی اس جوانی کو دیکھ سکوں جس نے جاتے وقت مجھے ٹھینگا بھی نہیں دکھایا۔ جب فوٹوگرافروں کا فن اور کیمروں کی بازی گری ایسی تصویر اتارنے میں لاچار ہو گئی تو مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میرا آٹھویں درجے کا شناختی کارڈ (Identity card) اتفاق سے محفوظ تھا۔ اس میں سے اپنی تصویر اکھاڑ کر ایک ماہر فوٹوگرافر کو دی کہ اس میں مونچھوں کا اضافہ کر کے نئی کاپی تیار کر دے۔ اوپر جو واقعہ درج کیا گیا وہ اسی تصویر سے متعلق تھا۔

اس واقعے کے بعد سے میں نے مضمون کے ساتھ تصویر اور جو رسالے تحریر کی اشاعت بشرطِ تصویر کرتے تھے انھیں مضمون بھیجنا بھی بند کر دیا۔ ایڈیٹروں کے تقاضے آئے لیکن مصلحتاً خاموشی اختیار کی کہ تصویر نہ بھیجنے کے لیے کوئی عذر نہیں تھا اور تھا بھی تو (دوسروں کی نظر میں) انتہائی نامعقول۔ بعض حضرات نے میری خاموشی کے دوسرے ہی معنی لیے۔ کئی ایڈیٹروں نے میرے سوگ میں دفتر بند کر دیے اور ایسے بند کیے کہ دوبارہ کھولے ہی نہیں (بعد میں معلوم ہوا کہ کتابت، طباعت، کاغذ وغیرہ کے بلوں سے بچنے کے ایسے مواقع کو ادبی رسالے ہاتھ سے کم ہی جانے دیتے ہیں)، کچھ ایڈیٹر راقم کے 'شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے یادگاری

مجلّے کے اہتمام میں لگ گئے۔ بھنک ملی تو میں نے ایسے ہی ایک ایڈیٹر کو خط لکھا۔

پیارے ایڈیٹر

مجھے باخبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ تم میری یاد میں اپنے رسالے کا خصوصی نمبر نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ تم — کہ میرے عالم صحت میں بھی میری صحت و سلامتی کی خاطر۔ دست بہ دعا رہتے تھے یقیناً اس خبر سے خوش ہو گے کہ میں زبان و ادب کی خدمت کے لیے ابھی زندہ ہوں، پچھلے دنوں آئس کریم کھانے سے دو چار چھینکیں ضرور آگئی تھیں سو اب افاقہ ہے۔

تازہ ترین تخلیق بھیج رہا ہوں — باقی باتیں عندالملاقات، !"

"ایڈیٹر کے نام مرحوم کا آخری مکتوب" کے عنوان سے میرا یہ خط بھی متذکرہ یادگاری مجلّے کی زینت بنا دیا گیا۔ میں نے دوبارہ خط لکھا کہ "جب تم مجھ کو مرحوم قرار دے ہی چکے ہو تو آئندہ میرا مضمون کیونکر چھاپو گے!" جواب آیا "مضمون بلا تکلف و تاخیر بھیجو۔ آئندہ شمارے سے "مرحوم کی غیر مطبوعہ تخلیقات" کے عنوان سے مستقل کالم قائم کر دیا گیا ہے جو انشاءاللہ تمھارے زندہ رہنے تک جاری رہے گا" آگے لکھا تھا "تمھیں میرے سرِ عزیز کی قسم، اب کوئی مضمون کسی اور رسالے کو نہ بھیجنا ورنہ ہم دونوں کہیں گے نہ رہیں گے" پھر لکھا تھا "تم کو خود احساس ہوا ہو گا کہ مرنے کے بعد تمھاری شہرت کو اچانک چار چاند لگ گئے ہیں — پہلے جو ناقد بغیر گالی کے تمھارا نام لینا ادبی کفر گردانتے تھے اب تمھارا ذکر آتے ہی ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں" آگے مژدہ سنایا گیا تھا "یہی نہیں، پہلی برسی کے موقع پر تمھاری شخصیت اور فن پر ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد کرنے کی تجویز بھی پاس ہو چکی ہے۔ تمھاری ادبی خصوصیات کی تلاش میں سربرآوردہ ادیبوں کا ایک وفد مختلف ممالک کے دورے پر روانہ ہو چکا ہے۔

اگر تمھاری ادبی خصوصیات مل گئیں تو بین الاقوامی ادبی رویوں کی روشنی میں ان کا جائزہ ایسے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ لے گا جن کو نوبل انعام مل چکا ہے۔ اس کارروائی کے بعد یہ جائزہ "بین الاقوامی ادبی رویوں کی لاشعوری سطح پر مابعدالطبیعیاتی نظام تخلیق کے تحت مترتب ہونے والے اثرات کا ارتکاز کے مسائل اور تم" کے عنوان سے دنیا کی سات اہم ترین زبانوں میں کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا" پھر ایک اور خوش خبری تھی "اپنے ہی تک رکھنا — اس موقع پر تمھاری بیوہ کو ایک لاکھ روپے کی تھیلی بھی پیش کی جائے گی" مزید براں یہ کہ "قابل صد رشک ہو تم کہ پس مرگ ملنے والے سارے اعزازات سے لطف اندوز ہونے کے لیے زندہ ہو!!"

مدیر موصوف نے کچھ ایسا دل کش مرقع پیش کیا کہ واقعی مرنے کو جی چاہنے لگا اور میں نے بہ رضا و رغبت باقی عمر عالم مرحومی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ میونسپلٹی کے بابو کو پانچ دس دے کر ڈیتھ سرٹی فیکیٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی کر ڈالی تاکہ سند پاس رہے اور اگر کوئی میری مرحومی پہ شک کرے تو سرکاری کاغذ دکھا کر اسے قائل کیا جا سکے۔ قسمت کی خوبی کہ وہ بابو بے چارہ خوف خدا کا مارا نکلا۔ اس نے نظروں کی ہتھوڑی سے ٹھونک بجا کر میرا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا "دو ایک روز بعد مل جائے تو کوئی ہرج تو نہ ہو گا؟" میں نے کہا "نہیں" تو بولا "ٹھیک ہے۔ ضرورت پڑنے پر آپ کے وارثان خود ہی لے جائیں گے"! میں نے جواب دیا "نہیں — میں ہی حاضر ہو جاؤں گا" اس نے کہا "اچھا اچھا — آپ ہی لے جائیے گا!" اور پھر اس انداز سے میری طرف دیکھا کہ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ ایک مریض نے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے ہوئے سرجن سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب — میں ٹھیک ہونے پر کدو کی بھجیا کھا سکوں گا؟" سرجن نے سوال کیا "کیا تمھیں کدو کی بھجیا اتنی ہی پسند ہے؟" مریض نے کہا "ہاں" تو سرجن نے ساتھ چلتی ہوئی نرس سے کہا "ان کے لیے پہلے کدو کی

بھی منگواؤ — آپریشن کل ہوگا !"

میری موت کی خبر اڑتے اڑتے میرے شہر اور پھر محلے تک بھی پہنچ گئی اور مجھے "نقارۂ خدا" یعنی "زبانِ خلق" کے ڈر سے خانہ قید ہونا پڑا۔ بیگم چائے کی پتی منگواتیں تو پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے پڑ جاتا، بچے کاپی پنسل کا تقاضا کرتے تو قولنج کے مارے تڑپنے لگتا۔ گھر سے نکلتا بھی تو چوروں کی طرح آدھی رات کے بعد۔ رفتہ رفتہ بیگم کو اندازہ ہو گیا کہ میرے جملہ عوارض اسی وقت عود کر آتے ہیں جب دن میں مجھ سے باہر جانے کو کہا جاتا ہے۔ ایک روز آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "تمھیں میرے سرِ عزیز کی قسم — سچ سچ بتانا کہ باہر جانے سے کیوں کتراتے ہو؟" میں نے کہا "طبیعت جو خراب ہے !" میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں "گھر میں پڑے رہنے کے باوجود ہاتھ تنگ نہیں ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہو تو آدھی رات کے بعد — کہیں ڈاکہ واکہ تو......؟" جب میں نے "عاشقی" کے بغیر ہی "عزتِ سادات" کو خطرے میں پڑتے دیکھا تو سارا ماجرا کہہ ڈالا — ایک لاکھ کی تھیلی کو مصلحتاً گول کر گیا کہ میری برسی سے پہلے ہی اس کا قلع قمع ہو جاتا اور عالمِ مرحومی کا خاتمہ محرومی پر ہوتا — اس انکشاف پر بیگم نے وہ فیل مچایا کہ میرے "قرض خواہ"، جو مجھ سے زیادہ اپنے پیسے کا ماتم کر کے صبر کر چکے تھے، جوق در جوق آنے لگے اور میری وفات سعادت آثار کی تردید اس زور و شور سے ہوئی کہ جینا دوبھر ہو گیا۔

جب ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تو بیگم کو ایک لاکھ کی تھیلی کی بات بھی بتا دی۔ اس خبر نے بیگم کو جو دھچکا پہنچایا اس سے میں آج تک شرمندہ ہوں۔ بسورتی ہوئی بولیں "اب کچھ نہیں ہو سکتا؟" میں نے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے!" وہ کہنے لگیں "ایسا نہ کہو — بہت کچھ ہو سکتا ہے —!" میں نے پوچھا "مطلب؟" پُر امید ہو کر بولیں "ہمت سے کام لو تو اب بھی کچھ نہیں گیا!" اس مبہم جملے میں پوشیدہ آرزو کی شدت کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے سوال کیا "آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" کہنے لگیں "یہی کہ تمھارے بال بچوں کی زندگی چین سے گزر سکتی تھی !!"

بیگم کی آنکھوں میں امید کی جگمگاتی ہوئی کرن میرے اوپر بجلی بن کر گری۔ میں سیدھا اسٹیشن کی طرف بھاگا اور ٹکٹ کٹا کر ایڈیٹر مذکور الصدر کے شہر میں وارد ہوا۔ وہاں پہلا کام یہ کیا کہ ان کے رقیب رسالے کو ان کے خلاف بہت سخت تحریری بیان دیا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر لے کر پورے شہر میں اپنے زندہ ہونے کا اعلان کیا اور اس وقت تک وہاں رکا رہا جب تک "مرحوم کی غیر مطبوعہ تخلیقات" کے کالم کی جگہ "موصوف کی دھوکا دھڑی" کے عنوان سے میری شان میں تفصیلی مضمون نہیں شائع ہو گیا۔

یہ شمارہ لے کر میں گھر واپس آیا۔ رسالہ بیگم کو دیا جس کا استقبال انھوں نے اسی طرح کیا جس طرح اسپتال میں جاں بحق ہونے والے مریض کی لاش کا اس کے گھر والے کرتے ہیں۔

— —

غزلیں

چرن سرن ناز مانک پوری
۳۳۔ میاں پور جون پور

محبت تم نے کی تو ہے جو پھر دہراؤ تو جانیں
گلابی مست آنکھوں کی جو پھر چھلکاؤ تو جانیں

مکر کر وہ تمہارا مان جانا یاد ہے ہم کو
جو من من کر مکر کر پھر سے تم من جاؤ تو جانیں

ڈھلک جاتا تھا آنچل اور پلک جھک جھک کے اٹھتی تھی
اسی انداز سے پھر آج تم شرماؤ تو جانیں

ہمارے پاس تک آ آ کے جانے کی کرو باتیں
ہمارے پاس سے جا جا کے پھر لوٹ آؤ تو جانیں

لبوں کی بڑبڑاہٹ سے جو رستی تھی کبھی رہ رہ
وہی بانی کی امرت بوند پھر ٹپکاؤ تو جانیں

یہ الجھانے میں آنچل کا سرکنا خوب ہے لیکن
بدل دے رخ ہوا آنچل کو یوں لہراؤ تو جانیں

نہ جانے نازؔ صاحب کہہ گئے کیا باتوں باتوں میں
نہ کہہ کر اپنے من کی تم بھی کچھ کہہ جاؤ تو جانیں

فاطمہ وصیہ جائسی
۳۷۔ ساتویں گلی۔ نشاط گنج۔ لکھنؤ

وہ چار تنکے جو بنیادِ آشیاں ٹھہرے
چمن کے واسطے کیا جانے کیوں زیاں ٹھہرے

چمن کو اپنے سجانا انھیں مبارک ہو
ہمارا ذکر ہے کیوں ہم تو بے مکاں ٹھہرے

گھٹن سماج کی لمحوں کی بے یقینی ہے
جو معتبر نہ کبھی تھے وہ رازداں ٹھہرے

ہر ایک وقت کے سانچے میں ڈھلتا جاتا ہے
خبر نہیں ہے کہ یہ کارواں کہاں ٹھہرے

غبارِ راہ کی مانند اڑتے جاتے ہیں
انھیں تلاش ہے اور ہم رواں دواں ٹھہرے

ہمارا نام وصیہؔ نہ مٹ سکا ان سے
جو لوحِ دل پہ بنے ہم وہی نشاں ٹھہرے

توفیق جمال نجیب آبادی
۱۵ اے پی نمبر ۲۔ بلاک نمبر ۱/۱ سیکریٹریٹ کالونی
مہانگر۔ لکھنؤ

پیامِ صبح دے کر شام کی جانب چلا سورج
حیات و موت کا ہر راز اب سمجھائے گا سورج

کہاں ڈھونڈھیں گے آخر روشنی فکر و نظر والے
ہے کم فہمی کی تاریکی میں گم احساس کا سورج

جدا کر کے سویرا جا چکا اب شام آنے دو
اندھیرے کو اجالے سے گلے ملوائے گا سورج

وجودِ ماہ و انجم میں بھی ڈھل کر کارفرما ہے
فقط دن ہی نہیں راتوں کو بھی روشن رہا سورج

تمازت جس کی دنیا کے لیے ہے وجہ بربادی
ابھر آیا ہے مغرب کے افق پر وہ نیا سورج

تماشا یہ بھی کیا ہم نے کہ کچھ کلیوں کو جھلسا کر
سزا کے خوف سے بادل کے پیچھے چھپ گیا سورج

لکھی ہے اے جمالؔ اس نے تری قسمت میں تاریکی
نہ دے گا روشنی تجھ کو تری تقدیر کا سورج

قاسم آتا
سیدواڑہ۔ محمد آباد
اعظم گڑھ

جرم کا نام زندہ ہے کہ نہیں ...

شبلی کالج میں ۷۰،۱۹۶۹ء کی میگزین شائع ہونے والی تھی۔ میرے استاد محترم نے مجھ سے ایک روز فرمایا قاسم صاحب آپ جرم کے ہم وطن اور ساتھ ہی ان کے شاگرد رشید ہیں۔ اس میگزین کے لیے انھیں پر کوئی مضمون کیوں نہیں لکھتے ہیں نے جواب دیا۔ خیال تو اچھا ہے۔ شام کو جب گھر لوٹا تو ڈاکٹر صاحب کا حکم یاد آیا۔ مگر اسے عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کے متعلق کچھ جرم صاحب سے بھی گفتگو کر لینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس امر کو آئندہ پر ٹال دیا۔ ایک شام شوق دیدار میں گھر سے باہر نکلا۔ مجھے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ بازار میں ایک دکان ہے جس پر اکثر و بیشتر اس وقت جرم صاحب بیٹھتے ہیں۔ اس لیے میں ان کے گھر نہ جاکر سیدھے اسی دکان کی طرف لپکا، دکان کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لکڑی کی چھوٹی سی پٹی ہے جس پر ملک سخن کا بادشاہ جلوہ افروز ہے۔ پاؤں میں جوتا ہے۔ تن پر سفید پائجامہ ہے جس پر کالی شیروانی قدرے زیب دے رہی ہے، سر پر ایک سیاہ ٹوپی ہے اور ہاتھ میں ایک سادہ سی چھڑی ہے۔ چہرہ بالکل صاف ہے اور یہ صاف چہرہ صاف دل کا آئینہ ہے۔ آنکھوں پر عینک ہے جن میں سے دیدے کافی بڑے نظر آرہے ہیں۔ وقت کا استاد فن ہے مگر گردن جھکی ہوئی ہے۔ میدانِ قلم کا سپہ سالار ہے مگر ہاتھوں میں رعشہ ہے اقلیم سخن کا تاجدار ہے اور کمر خمیدہ ہے۔ مجھے روبرو پایا تو بولے۔ کہو کیسے آنا ہوا۔ میں نے جواب دیا۔ قدم بوسی کو حاضر ہوا ہوں۔

اور یہ کہتے ہوئے سامنے کی پٹی پر بیٹھ گیا، ادھر ادھر کی بات کے بعد۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمان سنایا۔ سن کر مسکرائے۔ پھر لبوں کو جنبش دی۔ ع

چین سے جرم وطن میں کبھی رہنا نہ ہوا
اپنے ہمراہ لیے پھرتی ہے شہرت۔ مجھ کو

ارشاد ہوا۔ ٹھیک ہے لکھیے۔ آپ کی محبت ہے ورنہ وطن میں کب کسی کی قدر ہوتی ہے۔ اور پھر خاموش ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا۔ موصوف۔ اب اشعار کے دفتر کھول دیں گے جو اس امر میں میرے مددگار ہوں گے۔ مگر یہاں تو رنگِ گفتگو ہی کچھ اور تھا۔ بات سمجھ میں آئی۔ "Art lies in concealing the Art"

جب خاموشی ناقابل برداشت ہوگئی۔ دست بستہ عرض کیا کہ حضور میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ فرمائیں۔ کانپتی ہوئی انگلیوں میں دبی ہوئی بیڑی کا ایک گہرا کش لینے کے بعد وہ بولے ع

محبت نامرادی بے زبانی اور خودداری
انھیں دو چار لفظوں سے بنی ہے داستاں میری

یہ آواز فانی کی آواز سے کافی مل رہی تھی۔ مگر زوردار تھی۔ بات پر بات نکلی تو کہنے لگے۔ لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ جس میں دور دراز کے شعرائے کرام نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ اس مشاعرے میں میں بھی حاضر تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ یکے بعد دیگرے شعرا اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے رہے۔ احسان دانش نے بھی اپنے مخصوص انداز میں غزل پڑھی۔ مگر جب

غزل کا یہ شعر پڑھا ــــ

مایوس ہو کے باغ سے لوٹیں نہ بجلیاں
صیاد میں رہوں نہ رہوں آشیاں رہے

تو سارا ماحول واہ واہ کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد اس وقت کی رسم کے مطابق جب میرے سامنے شمع آئی تو غزلخوانی سے پہلے میں نے مجمع سے خطاب کیا کہ ابھی آپ لوگوں نے احسان دانش کا آشیاں کے قافیہ میں شعر سماعت فرمایا ہے، اسی قافیہ میں خاکسار کا بھی یہ شعر ملاحظہ کیجیے ع

مجھ کو کیا اسیر تو ظالم اسے بھی پھونک
جب میں نہیں چمن میں تو کیوں آشیاں رہے

اس پر واہ واہ کا زبردست شور ہوا اور یہی شعر حاصل مشاعرہ رہا۔ میں نے کہا۔ یہ واقعہ ضرور تحریر کروں گا۔ مجھے تلقین کی ع

خیال خاطر احباب چاہیے ہردم

میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے رخصت کی اجازت مانگی۔ مجھے بغور دیکھا اور کہا۔ جاؤ۔ خدا حافظ۔

ابھی یہ میگزین شائع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء کی شام کو ایک الم ناک خبر کانوں کے پردے سے ٹکرائی کہ جرم صاحب اس دنیا سے اٹھ گئے۔ سن کر دل بیٹھ گیا۔

ماربوس نے کہا ہے "موت ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ باقی سب کچھ افسانہ ہے"۔ پوری بستی غم کے گھپ اندھیرے میں ڈوب گئی آج آسمان ادب کا آفتاب غروب ہو گیا۔ منطق و فلسفہ۔ تفسیر و ادب اور اسلوب و بیان کا ماہر اور شعر و سخن کا نباض ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ موصوف کا اصلی نام ابوالحسن تھا۔ جرم آپ کا تخلص تھا۔ اعظم گڑھ کے قصبہ محمد آباد میں ایک محلہ سید واڑہ ہے، جو علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ وہیں آپ ۴ فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے اور اپنی صلاحیتوں سے دنیائے ادب پر چھا گئے۔ MICHAEL ANGILO کا قول ہے "مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا۔ بلکہ حقیقت میں بت ابتدا ہی سے سنگ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر رہتا ہے" اور متقاضی ہوتا ہے" موصوف کو بھی ابتدا ہی سے شعر و ادب سے شوق تھا۔ شروع شروع میں اصلاح شعر و سخن ریاض خیرآبادی سے لیتے تھے۔ مگر ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو اودھ کا سفر کیا۔ اور دربار آرزو میں حاضر ہوئے۔ سید انور حسین آرزو لکھنوی کی دوراندیش نظریں انھیں دیکھتے ہی تاڑ گئیں۔ فوراً اپنے قریب بلایا اور پہلو میں جگہ دی۔ پھر جو شفیق استاد نے طبیعت کی روانی علم کی پیاس اور فن کی تڑپ دیکھی تو جرم صاحب کو فکر و فن اور شعر و سخن کی بلندیوں تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ خود جرم نے بھی صدق دل سے اس کا اعتراف کیا ہے ع

ممکن نہیں کہ ترک کروں رنگ آرزو
اے جرم سنگ ریزے چنوں کیوں گہر کے بعد

فکر معاش میں کمسنی ہی میں وطن چھوڑ دیا اور کلکتے کا رخ کیا۔ جلد ہی یہ خبر شہر میں عام ہو گئی کہ ایک ساحر رنگین بیاں شہر میں قیام پذیر ہے۔ قدردانوں کا مجمع جوق در جوق بہر زیارت جمع ہونے لگا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ اب تک "زود سخن" بھی منظر عام پر آ چکا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں آپ کا دوسرا مجموعہ "شعلۂ رنگیں" شائع ہوا۔ اس نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ جناب ابراہیم ہوش، پرتو لکھنوی، جانشین آرزو لکھنوی۔ طوطی بنگال علامہ وحشت کلکتوی اور دیگر حضرات نے بیک زبان ان کے کمال فن کا پرزور الفاظ میں اعتراف کیا۔ بقول پرتو صاحب "آپ ایک کہنہ مشق بالغ نظر اور صاحب طرز شاعر ہی نہیں بلکہ شعر و سخن میں استادی کا درجہ بھی رکھتے ہیں"۔ یہی نہیں بلکہ سب نے متفقہ طور پر اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ ع

"جرم کی بات اس زبان میں ہے
جو غزل کی زبان ہوتی ہے"

جرم صاحب کی شاعری انسانی جذبات و تجربات نفسیات و احساسات فطرت کی ترجمان ہے۔ انھوں نے اپنی

تخلیقات کی بنیاد۔ زندگی کی سچائیوں پر رکھی ہے۔ WOR-
DSWORTH) نے کہا ہے کہ "شعر کو اپنے ملوکانہ جمال و جلال کی بنیاد زندگی کی معمولی سچائیوں پر رکھنی چاہیے" شعر محض تفریحِ طبع کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بقول ارسطو "شاعری ساری تحریروں میں سب سے زیادہ فلسفیانہ ہوتی ہے۔"
اور بقول حالی "شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔ لیکن ازروئے انصاف اس کو علمِ اخلاق کا نائب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں" اقبال کی طرح آپ نے بھی اپنی شاعری سے سوئے ہوئے ذہنوں اور پژمردہ قوموں کو بیدار کرنے کا کام لیا ہے۔ محض فرسودہ واقعات اور ماضی کی ورق گردانی نہیں کی ہے بلکہ حال اور مستقبل کا آئینہ بھی لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ انقلاب کی دعوت دینے والوں اور مصیبت جھیلنے والوں کو نئی دنیا کی بشارت دی ہے
ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بڑا گناہ ہے احساسِ کمتری اے جرمؔ
یہی سبب ہے جو دل کو اُبھارتا ہوں میں

چلتے نہیں ہیں وقت کی رفتار دیکھ کر
ہم خود بُرے بنے ہیں زمانہ بُرا نہیں

وہ انقلاب کو دیتے ہیں دعوت پیہم
لگی ہے دھن جنھیں دنیا نئی بنانے کی

مصیبت جھیلنے والے نئی دنیا بنالیں گے
تماشہ دیکھنے والے ترا انجام کیا ہوگا

نکال راستہ نقطے سے عہدِ حاضر کے
پلٹ کے دیکھ نہ گزرے ہوئے زمانے کو
دل ہے تو زمانے کی تمنا بھی رہے گی
بے خار کوئی ہم نے گلستاں نہیں دیکھا

بے خبر وہ بھی ہیں زمانے سے
جو زمانے میں ہیں زمانے سے

جرمؔ صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس میں ایک اثر ہے۔ یہ اثر حُسن و عشق کی معاملہ بندی میں زیادہ نمایاں ہے۔ مگر یہاں وہ امتیاز نہیں ہے جو اقبالؔ کے یہاں ملتا ہے۔ بلکہ یہاں عشق کا وہی رنگ نمایاں ہے جو مصحفیؔ اور حسرتؔ کے یہاں ملتا ہے۔ جرمؔ صاحب بھی پریم چند کی طرح "محبت تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی غذا کے نہ ملنے سے ہیں" کے قائل ہیں ان کی نظر میں عاشق و معشوق شریکِ ازلی ہیں۔ وہ حُسن کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس بات کا بھی انکشاف کرتے ہیں کہ عاشق بھی اپنی ایک حیثیت اور ایک حرمت رکھتا ہے اور اس کی فطرت کے بھی کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ اور عشق عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ محبت ہی زندگی کا فطری اور لازمی میلان ہے۔ محبت ہی سے زندگی کے پیچ و خم سلجھتے ہیں اور حیات و کائنات ایک نعمت بے بہا معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کتنی نظر فریب ہے الفت کی ابتدا
انجام آئینہ ہے مگر سوجھتا نہیں

سمجھ لو جرمؔ دستورِ محبت زمانے بھر کو سمجھانا پڑے گا

وقتِ رخصت ان کا دامن تھام لوں
یہ خیال انجمن میں آیا ہی نہیں

ملال ہوتا اگر غیر بے وفا کہتا
یہ فقرہ تم نے کہا ہے تو کوئی بات نہیں
مجھ سے اتنے قریب آجاؤ بے حجابی حجاب ہو جائے
یگانہ اپنے فن میں کس قدر بے درد قاتل تھا
اسی پہلو پہ آخر تیر مارا جس طرف دل تھا

(باقی ص ۶۲ پر)

غزل

مقبول نعمانی
جامعہ نوریہ میرگنج - بریلی

مری چاہتوں مرے آنسوؤں کا تمام قرض اُتار دے
مری زندگی کبھی چند دن مرے ساتھ رہ کے گزار دے

تیرے راستے کا میں ہوں شجر تجھے سونپ دوں گا میں سب ثمر
میرے انگ انگ کو سینچ دے مجھے شاخ شاخ بہار دے

مرے بام و در میں چھپا ہوا ہے سکوتِ مرگ کا سلسلہ !
تجھے تیرے روپ کا واسطہ مرے گھر کا روپ سنوار دے

وہی دوپہر وہی پیاس ہے مرے پاس خالی گلاس ہے
مرا دل بہت ہی اداس ہے میری زندگی مجھے پیار دے

مرے نام سے جو جُدا نہ ہو مرے بعد بھی جو فنا نہ ہو
کبھی کاش مجھ پہ مرا خدا کوئی ایسا شعر اُتار دے

گوھر شیخ پوری
تلیا باغ۔ وارانسی

احساس کی سولی پہ جو مصلوب رہا ہے
وہ شخص تو ہر عہد میں محبوب رہا ہے

تاریخ کے صفحات بھی دیتے ہیں گواہی!
افلاس میں جینا بڑا معیوب رہا ہے

مٹی کے مکانوں پہ ہوئی جھوم کے بارش
برسات کا انصاف بھی کیا خوب رہا ہے

احساس کی آواز کو سمجھو تو کہوں میں
یہ شام کا سورج ہے کہ دل ڈوب رہا ہے

تاریخ ادب دیکھئے گوہر تو غزل کا
ہر عہد میں بدلا ہوا اسلوب رہا ہے

مناظر حسن شاہین
موضع ڈتو، پوسٹ بارا۔ ضلع گیا

کس کے دیدار کو اُٹھا ہوں ابھی
اپنی آنکھوں میں جھانکتا ہوں ابھی

سو گئے ہیں نجوم یادوں کے
خود سے ملنے کو جاگتا ہوں ابھی

شق نہ ہو جائے آئینہ دل کا
اپنے چہرہ کو پڑھ رہا ہوں ابھی

کیوں زمانے کو بیچ میں لاؤں
تبصرہ خود پہ کر رہا ہوں ابھی

شام ہوتے ہی زخم مہکے گا
پھول یادوں کے چن رہا ہوں ابھی

مجھ کو ڈھونڈو گے تم کہاں آخر
شہر میں اپنے لاپتا ہوں ابھی

مجھ پہ ٹوٹا تھا کوہِ غم لیکن
اس کے سینے پہ میں کھڑا ہوں ابھی

کیوں جگاتے ہو نیند گہری ہے
میں نہ اُٹھنے کو سو رہا ہوں ابھی

مجھ سے مل کر رہو گے تم تنہا
میں کہ خود سے بچھڑ چکا ہوں ابھی

راکھ ہونا ہے ایک دن شاہین
اندر اندر سلگ رہا ہوں ابھی

مشرف عالم ذوقی
مہادیوا، آرہ (بہار)

کہانی نہیں لکھنے والی ہے!!

بوڑھوں کے تیور صرف بوڑھے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بڑھاپا بچوں اور جوانوں کی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ کیا پتہ وہ کب کس بات پر خوش ہو جائیں، کب کس بات پر منھ پھلا دیں، کس بات پر اُداس ہو جائیں۔ بڑی خبطی سی شے ہے بڑھاپا۔ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بھی طبیعت گھبرا جاتی ہے۔ مگر اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ اُٹھنے پر سر گھومنے لگتا ہے۔ پیر کے جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا ہے ہاتھ الگ کانپنے لگتا ہے۔ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو لیٹے لیٹے پوتے کو صدا لگاتا ہوں ...

"ببلو... او ببلو ...!"

دوسرے ہی لمحہ وہ بھاگتا ہوا کمرے میں آجاتا ہے ...

.... "جی دادا...."

اشارے سے اُٹھانے کے لیے کہتا ہوں۔ ببلو پیٹھ کی طرف ہاتھ لگا کر بٹھا دیتا ہے۔ اُٹھ جاتا ہوں تو پھر سوالوں کے ایک لمبے سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ ایک جگہ بیٹھنے کی بھی عادت نہیں رہی۔ کتنے ہی دوست ہیں جو لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ان مضبوط ہاتھوں پر ہمیشہ سے فخر رہا تھا ــ آج تھک ضرور گیا ہوں مگر لاٹھی پکڑنے کی کمزوری نہیں کر سکتا۔ کمرے سے باہر نکل کر بہوؤں کو صدا لگاتا ہوں:

"شاداں بیٹی... عصمت ... ناہید ... کوئی ہے ... ذرا چائے بنا دینا..."

باورچی خانے میں کچھ بھن بھن سی ہوئی ہے۔ جانتا ہوں، بہوؤں کے درمیان اس بے وقت کی فرمائش اور اس خبطی عادت کو لے کر ناک سکوڑی جا رہی ہوگی ــ "ابا پریشان کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی وقت ہے چائے پینے کا؟ مگر چائے تو بنانا ہی ہوگی۔"

بڑھاپے میں کب کس چیز کی طلب ہوگی، پہلے سے سوچا نہیں جا سکتا۔ اپنے آپ کو کس قدر توڑتے ہوئے اور موت سے جوڑتے ہوئے کبھی ضرورت اور کبھی بلا ضرورت کسی بھی اجنبی خواہش کی صدا لگانا پڑتی ہے۔ بہوئیں کیا جانیں، کہ اس عمر میں بڑھاپا کتنی عجیب عجیب سی خواہشوں کو سُلا کر کے بڑھاپا کہلاتا ہے ــ بوڑھا رو نہیں سکتا، بوڑھا آدمی زیادہ ہنس نہیں سکتا ... یہ سب عیب پاگل پن میں گنے جائیں گے۔ بچے جمع ہو جائیں گے .. کیا بات ہے ابا؟ بہوئیں پوچھیں گی، پوتے پوتیاں گھبرا جائیں گی۔ اور پھر ان سے کیا کہوں گا کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو بچو! بوڑھے آدمی کو بھی اکیلے پن میں یاد ستا سکتی ہے۔ گزری ہوئی بھولی بسری پرانی یادیں اچانک سناٹے میں آکر رونے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ بوڑھے آدمی کا بھی کوئی ماضی ہوتا ہے، کوئی بیوی ہوتی ہے۔ بیوی ــ جو اب نہیں رہی۔ وقت کی دوڑ میں دو تین سال ہی پیچھے نہیں چھوٹی بلکہ صدیوں کے لمبے سفر کا فاصلہ طے کر گئی۔!

دھم سے آکر چوکی پر بیٹھ گیا ہوں۔ کتنا تھک جاتا ہوں۔ صرف کمرے سے باہر چوکی تک کا سفر..... گزری یادوں سے ابھی ابھی

جی رہے ہو لمحہ تک کا سفر ..... بوڑھا جی کھول کر رو بھی تو نہیں سکتا ... اپنے آپ کو دابے رہنا پڑتا ہے ..... بچوں میں، پوتے پوتیوں میں .... بہوؤں میں .... افکار نو کے طلسم کدے میں خود کو پناہ دینی پڑتی ہے، کہ اے بوڑھے ــ ! تمہارے ہی دم سے یہ رونقیں جوان ہیں... تمہاری اُداسی، تمہاری خاموشی، بچوں کے ہنستے مسکراتے چہروں کی چمک چھین لے جائے گی ..... سب کے سب پریشان ہو جائیں گے ـ صرف تمہارے لئے ـ !!

عصمت چائے لے کر آجاتی ہے ـ

پیچھے مسکراتی ہوئی ناہید کھڑی ہے ـ "ابا! آپ کمرے سے باہر نکل آئے اس وقت ۔؟"

ناہید کا سوال جیسے سُنا ہی نہیں .... ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ہے۔ سب کو بوڑھے کا کتنا خیال ہے ۔ عصمت بیٹی سے پوچھتا ہوں ....' چائے میں کتنی شکر ڈالی بیٹی"

شاداں کہہ رہی ہے ۔" ابا! آپ کو اس وقت کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہئے تھا، ٹھنڈک بہت ہے"

بوڑھا صرف سنتا ہے ۔ بہوئیں کتنا سوچتی ہیں۔ کوئی تکلف نہیں ہوا ابا کو ـ کیسے کہوں کہ بڑھاپے میں خبطی موڈ کے سہارے ہی جینا پڑتا ہے ۔ کوئی وقت نہیں ہوتا باہر نکلنے کا ۔ جب موڈ بن جائے کچھ کرنے کا خیال آجائے ۔ اور نہیں کرو تو اپنا ہی آپ ڈسنے لگتا ہے آخر زندگی بھر ایک آفیسر کی زندگی جیا ہوں ۔ بڑا عہدہ، بڑا رتبہ ۔ اور آفیسر جب سرکس کے رنگ ماسٹر کی طرح ہاتھ میں بیلٹ لے کر اپنے آپ کی مجبوری پر حاوی ہو جائے تو کوئی بھی خواہش دبائی نہیں جا سکتی۔ ضدی بچے کی طرح ہر خواہش کا مزا لینے کا دل چاہتا ہے ۔

" ٹھنڈک بہت ہے ابا! اور آپ نے اوپر صرف کرتا ہی پہن رکھا ہے ۔"!

چائے کی چسکیاں لیتا ہوا ٹھہر جاتا ہوں، خود کا جائزہ لیتا ہوں ۔ ہاں ٹھنڈک کچھ بڑھ گئی ہے ۔ عصمت نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ چائے کا کپ لے کر اپنے کمرے کی طرف لوٹ پڑتا ہوں۔ کچھ دیر اور بستر میں آرام کرنا چاہیے۔ وقت گزاری کے لئے میگزین سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں

پڑھتے رہو جب تک نیند نہیں آجائے ۔ اور اس عمر میں کیا بھی کیا ہے ـ بچوں کی شادی ہو گئی ۔ اب فکر ہے تو موت کی ۔ آنکھیں بند کب ہوتی ہیں، بلاوا کب آتا ہے ؟ اکیلے جیتے ہوئے کیسے اچھا لگتا ہے کتنے ہی دوست ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ۔ جو باقی ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ سنتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے ۔ ارے فلاں چلا گیا ۔؟ کچھ دیر کے لئے سن سے ہو جاتا ہوں اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ سا جاتا ہے ـ مگر ایسی خبروں کے لئے جیسے اب خود کو پوری طرح سے تیار کر چکا ہوں ۔ شروع شروع تو ایسے کسی دوست کے بارے میں سنتے ہوئے تو واقعی بہت صدمہ ہوتا تھا مگر اب ـــ اثر تو ہوتا ہے مگر اتنا نہیں .... شاید اس لئے کہ اس عمر میں ایسی ہی خبروں کے سننے کی امید رہتی ہے .... کچھ دیر کے لئے مرنے والے کی خصوصیت گنوائی جاتی ہے .... پھر معمول کی طرح روزمرہ کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں..... شاید میرے بعد بھی میرے دوست احباب ایسا ہی کریں گے ۔؟

پھر کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا ہوں ۔ اپنی موت کے بارے میں جب جب سوچتا ہوں تو ایسے ہی کچھ دیر کے لئے پورا وجود برف کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ پھر برف پگھلنے لگتی ہے، اور اس لفظ سے دُور نکلنے کی کوشش کرتا ہوں..... مگر یہ بھی سچ ہے کہ اب زندگی کے لئے کوئی خاص خوشی نہیں رہ گئی، بلکہ خود ہی ہر روز حساب لگایا کرتا ہوں ..... آج ایک روز اور گزر گیا ..... آسیہ کو گئے کتنا عرصہ ہوا ؟ ... آسیہ! بوڑھی آنکھیں کچھ سوچ کر گیلی ہو جاتی ہیں ۔ اور پھر کہیں سے کوئی پرانی صدا پورے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے .... صاحب ... صاحب کلب نہیں چلئے گا ... صاحب کو چائے دو ..... صاحب کے کھانے کا وقت ہو گیا ....."

آسیہ پورے گھر میں دوڑ رہی ہے اور یہ بھی عجیب بات رہی کہ وقت کی دوڑ جاری رہی ۔ وہ ریٹائر بھی ہو گئے مگر آسیہ بوڑھی نہیں لگی ـ ہاں وہ خود بوڑھے ضرور ہو گئے ..... وقت بوڑھا لگا... اتنی ہی کچی تھی آسیہ، زندگی کی بے معنویت میں بھی ساتھ رہنے کا وعدہ کر کے آئی تھی ... مگر اتنی جھوٹی نکلی کہ کینسر کے معمولی سے مرض میں

زندگی کے اس پختہ و مدرسے کی اینٹ کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے بادلوں کے بیچ اوجھل ہوگئی .... اور پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ اب زندگی نہیں کٹ سکتی .... نہیں گزر سکتی ـــــ بڑھاپا ایک مرض ہے، ایک روگ ہے جو بوڑھی بیوی کے سہارے کاٹا تو جا سکتا ہے مگر اکیلے نہیں کٹ سکتا ـــــ بچوں میں، بہوؤں میں، پوتے پوتیوں میں خوشیوں کا عکس تو ڈھونڈا جا سکتا ہے مگر زندگی کی وہ چمک جو کئی سال پہلے قبرستان کے اندھیرے میں دفن کر آیا ہوں ـــــ بس اسی دن سے جینے کی خواہش [illegible]۔ اور انگلیوں پر گزرے ہوئے دنوں کا حساب شروع ہوگیا۔ [illegible]ات کا ایک لمبا سلسلہ.... کیموز کے انجکشن.... دوائیاں اور [illegible] ہوئے سارے جسم میں پھیلتے ہوئے درد کا احساس بڑھتا گیا مجو ٹھیک کہتے ہیں.... دوائیاں بیکار ہیں، بڑھاپے میں دوائیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں سیکڑوں قسم کے مرض ہو ہی جاتے ہیں۔ کس کس کا علاج کرایا جائے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ صبح کی روشنی میں کمرے میں سمٹے ہوئے تمام دوست احباب اب زندگی کی بات نہیں کرتے بلکہ سب کے سب بڑی آسانی سے موت کی باتیں کیا کرتے ہیں پتہ نہیں کب موت آئے گی، کب بلاوا آئے گا۔؟ پہلے عجیب لگتا تھا مگر اب ان باتوں کی عادت پڑ گئی ہے۔ خود کو ان باتوں کے لئے پوری طرح تیار کر چکا ہوں .... ہاں آج صبح ایک جھٹکا سا لگا.... دس بجا تھا، جب مجو، فاروق، ظفر یہ تمام لوگ کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے۔ علی کا انتظار تھا۔ علی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ سب علی کو ہی یاد کر رہے تھے کہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے دروازے پر رک کر خاص انداز سے علی کا سلام مارنا ـــــ "محبوب بھائی! سلام علیکم!"

"آہا....!" لیٹے ہی لیٹے کتاب سے نظریں اٹھا کر علی کو دیکھتا ہوا میں جواب اچھالتا۔ علی لاٹھی ایک طرف رکھ کر بیٹھ جاتے۔

مجو کی آنکھوں میں گلوکوما اتر آیا تھا۔ سورج کی تیز شعاعوں کے بیچ علی کے چہرے کو شناخت کرتے ہوئے دھندلی دھندلی آنکھیں کچھ روشن سی ہو جاتی ہیں۔ پھر مجو مذاق پر اتر آئے ...

"بھائی علی! آج قورما پلاؤ کھایا ہے کیا۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔؟"

"قورما اور پلاؤ تو اب آپ ہی کے یہاں کھائیں گے مجو بھائی۔"

علی کی کھنکتی ہوئی آواز ابھرتی ـــ "بھابھی کے ہاتھ کا بنا ہوا ـــــــ کھلائیں گے نا ـ؟"

"ٹھیک ہے۔" شاید پہلی بار مجو بڑے اطمینان سے بولے تھے۔ لاٹھی سے زمین کھودتے ہوئے۔

"پرسوں عمران آئیں گے، کچھ پیسہ ہو جائے گا۔ جمعہ کو کھانے پر آؤ۔ قورما اور پلاؤ دونوں چلے گا۔"

"ہم سب شرکت کریں گے۔" فاروق نے حسب معمول ٹہوکا لگایا تھا۔

مجو نے دعوت دی ہے.... لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔ اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ علی کہتے بھی ہیں کہ آپ لیٹے رہئے محبوب بھائی۔ مگر دل نہیں مانتا۔ چائے کے لئے پوتے کو آواز دیتا ہوں....

"بلو! چائے لے آؤ۔"

جمعہ کو اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، بس آنے ہی والا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ مجو جیسے کنجوس آدمی نے دعوت کیسے دے دی۔ شاید دوست پر پیار آ گیا ہوگا.... سب ہنسے جا رہے تھے۔ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے.... علی کا معمول تھا روز دس بجے آتے۔ لاٹھی ٹیکتے ہوئے.... آج بھی قد آور جسم .... بیوی رخصت ہو چکی تھیں ... لاولد تھے .... یہی غم کھائے جا رہا تھا۔ مجو لڑکیوں کی شادی کو لے کر پریشان تھے۔ سب کے الگ الگ مسئلے۔ سب کے الگ الگ غم ـــــ اور اس دن ساڑھے دس بج گئے مگر علی نہیں آئے۔ مجو بھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے انتظار کر رہے تھے ... آج علی نہیں آئے۔ کل ہی جمعہ ہے .... آج عمران شام تک آئیں گے۔ انگلیوں پر حساب چل رہا ہے۔ ٹھیک اسی وقت علی کے گھر سے لڑکا آتا ہے۔

"علی صاحب گزر گئے۔"

"کیا؟" کمرے میں اچانک بالکل سناٹا پھیل جاتا ہے ـــــ مجو نے فاروق کو دیکھا۔ فاروق نے ظفر کو۔ ظفر نے میری طرف... میں نے اٹھنے کی کوشش کی .... کوئی کچھ نہیں بولا... ہاں ایک چیختا

نا لو اسامنے کی منڈیر پر آکر بیٹھ گیا۔ مجو تیزی سے اُٹھے۔ لاٹھی
رتے ہوئے باہر آئے۔ کوّے کو ہنکاتے ہوئے بولے۔ جا.....
ٹ.. ہٹ.... کوّا ویسی ہی بے سری آواز نکالتا ہوا پھر آسمان کی
نب پرواز کر گیا۔ کتنی ہی ٹھنڈی اور گرم سانسیں کمرے میں گونج
یُں..... بدن میں کچھ دیر کے لئے طوفان سا آ گیا...

"علی چلے گئے۔!"

کمرے میں پھر سنّاٹا ہے....

"جنازہ کب جائے گا۔؟"

"شام کو عصر کی نماز کے بعد"۔

کانپتے ہوئے ہونٹ پھر گونگے بن گئے —

"کیا ہوا تھا علی کو۔؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ صبح کو آرام سے
ٹھے۔ پانی مانگا۔ پھر سینے کے پاس ہلکا ہلکا درد محسوس کیا تو لیٹ گئے
اکٹر کو بلانے کو کہا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر آئے، وہ جا چکے تھے"۔

لڑکا جا چکا ہے یہ منحوس سی خبر دے کر — ایک عجیب سی
بے یقینی پورے کمرے میں پھیل گئی ہے۔ سامنے والی کرسی خالی پڑی
ہے۔ کل اسی پر تو بیٹھے تھے علی۔ پرسوں بھی۔ اس سے پہلے بھی۔
بابد وہ جب جب آئے اسی مخصوص کرسی پر بیٹھے... مجو چپ ہیں۔
ٹی ہلا رہے ہیں، بیچارے کو کل دعوت دی تھی.... کیا معلوم تھا..
نکھیں پھر بے رونق ہو گئی ہیں....

"بہت اچھا فٹ بال پلیر تھا علی"۔ میں آہستہ سے کہہ پاتا
ہوں — "زندگی بھر ساتھ رہے۔ ساتھ پڑھے لکھے، ساتھ ساتھ
لری کی، ریٹائر بھی ایک ہی سال میں ہوئے.... مجھ سے اچھا
ٹ بال کھیلتا تھا وہ... اس عمر میں بھی کیسی اچھی ہیلتھ تھی...
ملا گیا....."

دھوپ کچھ سخت ہو گئی ہے۔ ببلو چائے لے کر آ گیا
ہے۔ سب چائے پینے لگتے ہیں۔ علی کی کرسی خالی ہے۔ رہ رہ کر
دھیان اسی خالی کرسی پر جا رہا ہے۔ مگر اب ان باتوں کا سلسلہ
نی سے موڑ دیا گیا ہے۔ اور کیا ضروری ہے کہ اس سلسلے کو قائم
رکھا جائے... کون جانتا ہے کب کس کی باری آ جائے... سب تو
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں...... ایک لائن سے جانے کو تیار۔
مگر علی.....

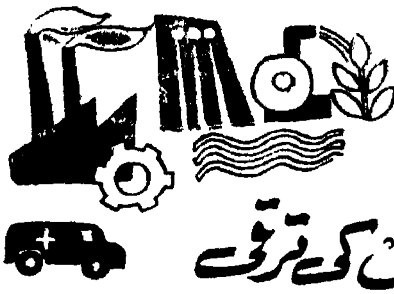
علی روز آتے تھے مگر اب کبھی نہیں آئیں گے۔ روز ہنستے
ہنساتے تھے... اب یہ دن کبھی نہیں لوٹیں گے۔ مجو کو روز چھیڑتے
تھے اور مجو انھیں روز چھیڑتے تھے۔ اب یہ لمحے دُور چلے گئے ہیں
کیا یہ کوئی بڑا حادثہ نہیں.... پھر گفتگو کا سلسلہ صرف علی پر کیوں نہیں ٹھہرتا
کیا کوئی حادثہ اس سے بھی بڑا ہو سکتا ہے... مگر یہ آنسو کہاں چلے گئے
ہیں.... ظفر، فاروق، مجو علی کی بات کیوں نہیں کرتے.... ایک جھٹکے
کے بعد اب سب معمول پر لوٹ آئے ہیں۔

علی کا تذکرہ ہر لمحہ پرانا پڑتا جا رہا ہے — دوپہر ہو گئی ہے
شام کو علی کے جنازے میں شرکت کرنا ہے... محفل برخاست ہو گئی
ہے۔ پہلے لاٹھی ٹیکتے ہوئے مجو گئے.... پھر فاروق۔ پھر ظفر... اب
ہم تنہا رہ گئے ہیں — اب کچھ ہی دیر میں بہوؤں کی پکار سنائی
دے گی — "ابا! کھانا کھا لیجئے"

رات کا ایک بج گیا ہے، مگر نیند آنکھوں میں نہیں ہے
علی کو مٹی دے کر مغرب کے بعد ہی لوٹ آیا تھا — عمر کی اس منزل پر
زندگی کے بارے میں غور کرتا ہوں تو زندگی نہ کوئی پہیلی لگتی ہے، نہ
کوئی معمہ.... بلکہ قبرستان کی چہار دیواری نظروں میں گھوم جاتی ہے
کیا زندگی صرف یہی ہے، ایک ہی محور پر لگی ہوئی۔ اب یا تو کچھ عجیب
نہیں لگتا — یا پھر سب کچھ عجیب لگتا ہے تو پھر اندر سے ایک صدا
سنائی دیتی ہے — ہوشیار ہو جاؤ — کہانی تمھیں لکھنے
والی ہے —!"

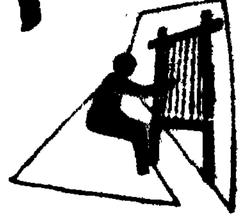
کہانی — اور وہ بھی مجھے لکھنے والی ہے — ہنسی آتی
ہے — کیسے یقین کروں۔ مجھ جیسوں پر کہانی — اور کون لکھے گا؛
خود کہانی لکھے گی — چپ ہو گیا ہوں، جانے کیا سوچ کر —
یہ آواز رات کے ایک بجے اس تنہا کمرے میں مجھے بار بار پریشان
کر رہی ہے — "ہوشیار ہو جاؤ — کہانی تمھیں لکھنے والی ہے۔
اس لئے کہ تم نے ایک پوری زندگی دیکھی ہے — ایک زندگی جھیلی ہے"

(باقی ص۴۲ پر)



اتر پردیش کے

دیہی اور پہاڑی علاقوں کی ترقی



سہیل احمد

ہمارے ملک کی آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ دیہی آبادی پر مشتمل ہے جس کی گذر بسر کا انحصار آج بھی زراعت پر ہونے کی وجہ سے معیارِ زندگی کے بلند ہونے کی رفتار نہایت سست رہی ہے اس لیے وہاں زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کو بھی مسلسل فروغ دیا جارہا ہے تاکہ معیارِ زندگی بلند ہوسکے اور خوشحالی آسکے۔

ملکی پیداوار میں زرعی پیداوار کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے دیہی علاقوں کو ترقی دینا ازحد ضروری ہے کیونکہ زیادہ پیداوار کے حصول سے ہی ملک خوشحال بن سکے گا۔ دیہی علاقوں پر توجہ دیتے وقت پہاڑی علاقوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جہاں پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار کے علاوہ مختلف قسم کی دستکاریوں پر مبنی اشیا حاصل ہوتی ہیں۔

اتر پردیش میں بھی آبادی کا زیادہ تر حصہ دیہی علاقوں میں آباد ہے اور زراعت کے پیشے سے خصوصاً اور صنعت وحرفت سے عموماً وابستہ ہے۔ اس لیے حکومتِ اتر پردیش بھی دیہی اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے مسلسل کوشاں رہی ہے اور ہے۔

اتر پردیش کے مواضعات میں وہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور دیہی نوجوانوں کو مواضعات میں روزگار دلانے نیز دیہی علاقے کی تیز رفتار ترقی کے لیے ریاستی حکومت نے متعدد اقدامات کیے ہیں۔

جہاں ایک جانب بڑے اور درمیانہ آبپاشی وسائل کو فروغ دیا جارہا ہے تو دوسری جانب چھوٹے آبپاشی کاموں کے توسط سے آبپاشی کے مزید وسائل فراہم کیے جارہے ہیں۔ نجی چھوٹے آبپاشی پروگرام کے ذریعہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں میدانی علاقوں میں ۱۰۷۶۰۶ بورنگ پمپ سیٹ، ۲۶۳۹۲ ٹیوب ویل، ۱۰۸۷۴ زیر زمین پمپ سیٹ، ۳۸۲۰ پختہ کنوئیں اور ۲۱۸۴ رہٹ اور پہاڑی علاقوں میں ۵۵ ہائیڈرم، ۳۷۱ کیلومیٹر گول، ۱۴۵۹ حوض بنائے گئے جن سے ۲٫۷۳ لاکھ ہیکٹر رقبے میں مزید آبپاشی صلاحیت تشکیل دی گئی۔ مواضعات میں روزگار کے مواقع بڑھانے کی غرض سے قومی دیہی روزگار اسکیم اور بے زمین روزگار گارنٹی اسکیم چلائی جارہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۵۱۶٫۷۰ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار مہیا کیا گیا، جبکہ اس سے قبل ۴۵۹٫۸۰ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار مہیا کیا گیا تھا۔

دیہی علاقوں میں رہائش کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے کمزور طبقے کے لیے مکانات کی اسکیم کے تحت گذشتہ سال ۵٫۳۱ کروڑ روپیہ مختص کیا گیا تھا۔ جس کا پورا استعمال رہائشی بندوبست کے لیے کیا گیا۔ دیہی علاقے میں رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لیے دیہی آواس وکاس پریشد کی تشکیل بھی کی گئی ہے۔

دیہی علاقے میں بایوگیس پلانٹ لگانے کا کام تیز رفتاری سے جاری ہے۔ سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۹۰۰۰ بایوگیس پلانٹ لگانے کے نشانے کے مقابلے میں ۳۰۴۸۷ بایوگیس پلانٹ لگائے گئے۔

مال گزاری کے مساوی رقم علاقائی کمیٹیوں کے توسط سے گاؤں سبھاؤں کو ترقیاتی کاموں کے لیے دی گئی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ میں ۲۷،۵۴ کروڑ روپیہ اس کام کے لیے الاٹ کیا گیا۔ اس رقم سے عام ترقیاتی بلاکوں کو تین لاکھ روپیہ اور بڑے ترقیاتی بلاکوں کو چار لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ الاٹ کیا گیا۔

دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کے بندوبست اور صفائی کی سہولت فراہم کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں۔ ریاست میں ۸۵-۱۹۸۴ میں ۴۰۰۷ مواضعات میں پینے کے پانی کا بندوبست کیا گیا۔

چھٹے پنج سالہ منصوبے کی مدت کے دوران گزشتہ مارچ تک ۲۰۲،۸۹ کروڑ روپے کے مصارف سے ۹۹۴۹ مواضعات میں پینے کے پانی کا بندوبست کیا گیا جس میں سے ۷۴۵۴ مواضعات قلت زدہ تھے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے سالانہ منصوبے کے لیے ۳۹،۳۸ کروڑ روپے کے مصارف منظور کیے گئے ہیں جس سے ۳۸۶۵ قلت زدہ مواضعات میں پینے کے پانی کی سہولت فراہم کرنے کا نشانہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سال ۲۲۰ مواضعات میں پائپ کے ذریعہ پانی فراہمی اسکیموں کو نئی شکل دی گئی ہے اور ان کے سدھار اور توسیع کے کام بھی انجام دیے گئے۔

ریاست میں سال ۸۶-۱۹۸۵ کے دوران ۸۸۰۰ قلت زدہ مواضعات میں پینے کے پانی کی فراہمی کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ جس کے مقابلے میں گزشتہ اپریل اور مئی میں ۲۸۲ مواضعات میں پینے کے پانی کا بندوبست کیا گیا۔ زیر نظر مدت کے دوران محکمۂ دیہی ترقی نے ۲۶۰ کنوئیں اور ۲۳۲ ڈگیاں تعمیر کرائیں۔

کم سے کم ضرورت پروگرام کے تحت ۱۹۷۱ کی آبادی کی بنیاد پر ۱۵۰۰ یا اس سے زیادہ آبادی کے سبھی ۱۰۸۹۸ مواضعات کو اور ۱۰۰۰ سے ۱۴۹۹ تک کی آبادی کے کل ۱۱۰۶۷ مواضعات میں سے ۵۵۳۴ مواضعات کو ۱۹۹۰ تک سڑکوں سے مربوط کرنے کا قومی نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس نشانے کے مقابلے میں گزشتہ مارچ تک ۱۵۰۰ یا اس سے زیادہ آبادی والے ۸۱۶، مواضعات کو کسی نہ کسی سڑک سے مربوط کیا جاچکا ہے۔ اسی طرح ایک ہزار سے ۱۴۹۹ تک آبادی والے ۵،۱۴ مواضعات کو بھی سڑکوں سے مربوط کیا جاچکا ہے جو ۱۹۹۰ء تک کے مقررہ نشانے سے زیادہ ہے۔

سال ۸۵-۱۹۸۴ میں قومی سڑکوں کی تعمیر پر خاص زور دیا گیا۔ دیہی بے زمین روزگار گارنٹی پروگرام کے تحت ۴۸۷، کیلومیٹر لمبے راستوں کو کھڑنجہ کی سطح تک بنانے کے لیے ۱۳۵،۹۰ کروڑ روپے کی اسکیم منظور کی گئی۔ اس کے علاوہ ۲۰،۷۸ کروڑ روپے کی لاگت سے ۲۰۷۸ کیلومیٹر کچے راستوں پر کھڑنجہ بچھانے کی منظوری دی گئی۔

سال ۸۵-۱۹۸۴ میں دیہی بجلی کاری کے زمرے میں خاص کامیابی ملی ہے۔ اس مدت میں ۴۳۳۲ مواضعات کی بجلی کاری کے مقابلے میں ۵۰۴۶ مواضعات کی بجلی کاری کی گئی۔ ۸۶-۱۹۸۵ کے لیے ۴۶۰۰ مواضعات نیز ۳۱۰۰۰ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کی بجلی کاری کا نشانہ تجویز کیا گیا ہے۔ مواضعات میں اسٹریٹ لائٹ کا بندوبست کرنے کی غرض سے ریاستی حکومت نے ۲،۳۰ کروڑ روپے الاٹ کیے۔

محکمۂ دیہی ترقی کی جانب سے مقوی غذا اسکیم بھی چلائی جارہی ہے۔ سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں مقوی غذا پروگرام ریاست کے ۱۰۷ ترقیاتی بلاکوں میں چلایا گیا۔ ان میں ۴۴ ترقیاتی بلاک پہاڑی علاقے کے ہیں۔ خصوصی مقوی غذا پروگرام دیہی علاقے میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست خاندان کے چھ سال سے کم عمر کے بچوں، حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں کی صحت کا معیار بلند کرنے کی غرض سے چلایا جارہا ہے۔

پہاڑی علاقے کی تیز رفتار ترقی کے لیے بھی پیداواری اور آمدنی بخش مدوں پر زیادہ رقم خرچ کرنے، سماجی سہولتوں کی توسیع اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کی جانب خصوصی توجہ دینے کی حکمت عملی پر عمل درآمد کیا جارہا ہے۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

نثار احمد

خوابوں کا درد

جوائننگ رپورٹ دینے کے بعد ندیم جیسے ہی کمرے کے باہر نکلا اس کی ملاقات اجیت سکسینہ سے ہوگئی۔

"آہا۔ تم آگئے؟" اسے دیکھتے ہی اجیت خوشی سے چیخ کر بغلگیر ہوگیا۔

"ہاں یار۔ ابھی ابھی میں نے جوائین کیا ہے۔"

"کمال ہے تقریباً ایک ماہ قبل تم نے مجھے لکھا تھا کہ تمھارا تبادلہ یہاں دوردرشن کیندر میں ہوگیا ہے۔ لیکن دکھائی اب دے رہے ہو۔ اتنے دن کہاں گول رہے؟"

"یوں ہی۔" ندیم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے سوچا کچھ دن آرام کرلیا جائے۔"

"اوہ۔"

"تم سناؤ۔ یہاں کس سیکشن کو دیکھ رہے ہو؟"

"بچوں کا پروگرام پروڈیوس کررہا ہوں۔" اجیت نے جواب دیا۔

"اچھا یہ کہو بچپن کی یادیں تازہ کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر ندیم ہنس پڑا۔ اور اجیت کے ہمراہ اس ہال کی جانب بڑھ گیا جہاں آج کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ اس میٹنگ کو دوردرشن میں پروگرام میٹنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں ایک دن پہلے کے ٹرانسمیشن کی رپورٹ پڑھی جاتی ہے۔ یعنی پچھلی شام کو نشر ہونے والے پروگراموں کی ٹیکنیکل کوالٹی اور ان کی اچھائیوں یا خامیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

میٹنگ کی کارروائی اس وقت شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہال میں جیسے ہی ندیم داخل ہوا۔ وہاں موجود سبھی لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہوگئیں۔ زیادہ تر چہرے جانے پہچانے نظر آئے۔ کیونکہ وہ ان سے پونا انسٹی ٹیوٹ میں ٹریننگ کے دوران مل چکا تھا۔ پورے ہال میں اس وقت صرف ایک ہی خاتون نظر آرہی تھیں۔ اردو پروگرام کی پروڈیوسر مس غزالہ، بلا کی شوخ اور چنچل۔ خودپرستی اور غرور کی جیتی جاگتی تصویر۔ ہر ایک کا مذاق اڑانا جس کی عادت میں شامل تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ جسے اپنی شامت بلانی ہو وہ غزالہ سے بات کرے۔

اجیت نے ہر ایک سے ندیم کا تعارف کرایا۔ سبھی لوگ بڑی محبت سے پیش آئے لیکن جب وہ لوگ غزالہ کے قریب پہنچے تو اس نے ناک سکوڑ کر ندیم کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر تمسخرانہ انداز میں بولی۔

"اچھا۔ تو آپ ہی ہیں وہ۔ یعنی میوزک پروگرام کے نئے پروڈیوسر۔ جن کا ذکر ایک مہینے سے اس سینٹر میں کسی پھٹے ہوئے ساز کی طرح بھربھرا رہا تھا۔ بھئی واہ مزا آ آپ کو دیکھ کر۔ واقعی داد دینی پڑے گی سرکار کو آپ کے تقرر پہ تان پورے کی مانند لمبا بدن، یہ بھونپو کی طرح ہاتھ پیر اور ڈھولک جیسا یہ بے ڈھنگا چہرہ۔ آپ تو واقعی میوزک پروڈیوسر ہیں۔"

سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ندیم اس کی اس

حرکت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ جواب دے اجیت اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔

غزالہ سے اس کی دوسری ملاقات فلم، ٹیپ لائبریری میں ہوئی۔ اپنی ایک ریکارڈنگ کے سلسلے اسے ویڈیو ٹیپ کی ضرورت تھی۔ وہ جب لائبریری پہنچا تو وہاں غزالہ کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ غزالہ اس وقت دستاویزی فلموں کی الماری میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر وہ بولا۔

"معاف کیجئے محترمہ ....."

"معاف کیا۔" غزالہ نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ "کہیے کیا قصور سرزد ہوا ہے آپ سے؟"

"میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کی کچھ مدد کروں۔"

"شکریہ۔ مجھے سخت اعتراض ہے۔" غزالہ نے حسبِ عادت بُرا سا منھ بنا کر جواب دیا۔

"وہ کیوں محترمہ۔ کیا میں جان سکتا ہوں؟"

"وہ یوں کہ مجھے فیض کی ایک غزل کی منظر نگاری کے لیے ایک ایسی فلم کی تلاش ہے۔ جو کسی ہل اسٹیشن سے متعلق ہو۔ لیکن جناب ٹھہرے میوزک پروڈیوسر۔ آپ سے تو کتھک، بھارت ناٹیم یا پگڑی وغیرہ کی ہی امید کی جا سکتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ ادب میں اپنی ٹانگ پھنسانے کے بجائے تان سین کے اس دیپک راگ کے بارے میں تحقیق کریں جس کے گانے سے دیپک جل اٹھتے تھے یا آگ لگ جایا کرتی تھی۔"

ندیم لمحہ بھر کے لیے گھبرایا لیکن پھر سنبھل کر بولا۔ "ویسے محترمہ آپ کے خیال میں اس راگ سے کیا ہوتا تھا؟ آگ لگتی تھی یا دیپک جل اٹھتے تھے؟"

لیکن غزالہ کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جلدی سے بول اٹھا۔ "مگر آپ کو بھی کیا معلوم۔ آپ کو تو صرف چچا غالب کی ان اشرفیوں کے بارے میں ہی معلوم ہوگا۔ جو انھیں انعام کے طور پر بادشاہِ وقت عطا کیا کرتے تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ ویڈیو ٹیپ لینے کی خاطر لائبریرین کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ اور غزالہ اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

ندیم کی غزالہ سے تیسری ملاقات ڈیوٹی روم میں ہوئی۔ اس کی اس دن ٹرانسمیشن ڈیوٹی تھی اور وہ نشر ہونے والے پروگراموں کی رپورٹ تیار کر رہا تھا کہ غزالہ ڈیوٹی روم میں داخل ہوئی۔ اس کو دیکھ کر ندیم نے کرسی سے کھڑے ہو کر بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور اسے چائے آفر کی۔ غزالہ بولی۔ "مسٹر ندیم کسی لڑکی پر ڈورے ڈالنے والی یہ حرکتیں بڑی گھسی پٹی ہیں ....."

"بجا فرما رہی ہیں آپ۔" ندیم چہک کر بولا۔ "کیونکہ میں ٹھہرا میوزک کا ایک ادنیٰ سا پروڈیوسر۔ ادب سے ناواقف۔ ظاہر ہے آپ سے قریب ہونے کے لیے میں آپ کو حسن و رعنائی کے سانچے میں ڈھلے سنگِ مرمر کے مجسمہ سے تشبیہ تو دے نہیں سکتا۔ ہاں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو راگ میگھ ملہار، مالکوس یا بھیرویں کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں۔ یا پھر بہت کوشش کروں گا تو آپ کو بانسری، جل ترنگ، ستار یا سرود وغیرہ کہہ سکتا ہوں۔ ویسے آپ کیا پسند فرمائیں گی کہ اگر آپ کو میں خیال، ٹھمری، دادرا وغیرہ وغیرہ کے نام سے پکاروں۔"

"مسٹر ندیم!" غزالہ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں سے تنگ آ کر تقریباً چیختی ہوئی بولی۔ "میرے نام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ مجھے میرے نام کے علاوہ کسی اور نام سے پکارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" ندیم نہایت معصومیت سے بولا "میں تو بقول آپ کے میوزک کا پروڈیوسر ادب سے کوسوں دور۔ اسی لیے آپ کے حکم کے مطابق موسیقی کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ اگر آپ کو ناگوار گزرتی ہے۔ تو میں سیدھی سادی اردو زبان میں بات کروں گا۔"

"لیکن کیوں؟ مجھ سے بات کرنا کیا ضروری ہے۔ اگر آپ مجھ سے نہیں بولیں گے تو اس سینٹر میں طوفان تو نہیں

آ جائے گا۔"

"آ بھی سکتا ہے محترمہ۔" ندیم آنکھوں کو چوڑا کرتے ہوئے بولا۔"کیونکہ خاموشی ہمیشہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔"

اور دوسروں کا مذاق اڑانے والی غزالہ آج خود ندیم سے مرعوب ہو گئی۔ زچ ہو کر اس نے ندیم سے کہا:"آپ بہرحال آدمی دلچسپ ہیں۔ اگر بکواس کچھ کم کرتے تو یقیناً میں کہہ سکتی تھی کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

یہ سن کر ندیم اچھل پڑا۔"آپ نے اس کا موقع ہی کب دیا۔ ورنہ میرے اس ڈھولک جیسے بے ڈھنگے چہرے پر آپ کو کوئی ڈھنگ کی چیز ضرور نظر آتی۔"

غزالہ کو اس پر ہنسی آ گئی۔ ندیم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دونوں ڈیوٹی روم کے ایک کونے میں بیٹھے مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ غزالہ کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے ندیم کی باتیں سن رہی تھی۔ اور پورا اسٹاف جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔ اس آفت کی پڑیا کو سنجیدہ دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔

اس تیسری ملاقات کے بعد ندیم دبے پاؤں غزالہ کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ اب غزالہ کی زبان پر صرف ندیم کا نام تھا۔

غزالہ رفتہ رفتہ رسمی تکلفات کی دیوار توڑ کر ندیم کے اور قریب آتی گئی اور ندیم کی محبت کے سنہرے خواب بنتی رہی۔ شوخی اور چنچلتا کا وہ جیتا جاگتا مجسمہ اب سنجیدگی اور حیا کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ پورا اسٹاف اس کی اس تبدیلی پر حیران ضرور تھا۔ مگر لوگ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ اس انقلاب کا سبب صرف ندیم ہے۔ اسی لیے پورے سنٹر میں اس پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لیکن غزالہ ان سب باتوں سے بے نیاز محبت کی حسین وادی میں گم ہوتی گئی۔ وہ ندیم کی شخصیت میں ایسا ڈوب گئی کہ سب کچھ فراموش کر بیٹھی۔ ندیم اسے اپنے ان خوابوں کی تعبیر لگتا تھا جو اس نے کبھی دیکھے تھے۔ اب اسے اس دن کا شدت سے انتظار تھا۔ جب وہ ندیم سے اپنے دل کی بات کہہ کر اپنی زندگی ایک نئے عنوان سے شروع کرتی۔

اور پھر ایک دن....

غزالہ اپنے ایک پروگرام کی ریہرسل کی خاطر ریہرسل روم میں بیٹھی آرٹسٹوں کا انتظار کر رہی تھی کہ ندیم ہاتھ میں ایک لفافہ لیے داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔"ارے تم یہاں بیٹھی ہوئی ہو؟ میں نہ جانے تم کو کہاں کہاں تلاش کر آیا۔"

غزالہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ندیم کو اپنی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر اس کے دل کے نہاں خانوں میں خوشی کی لاتعداد شمعیں روشن ہوتی چلی گئیں۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کھو سی گئی۔ وہ جیسے مدہوش سی ہونے لگی اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"اوہ! تم کہاں کھو گئیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
ندیم کی آواز پر وہ چونک پڑی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ندیم لفافے سے ایک سنہرا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"یہ میرے اس امتحان کی کامیابی کا سرٹیفکیٹ ہے جس کی تیاری میں برسوں سے کر رہا تھا۔" ندیم بولا۔

"کیا مطلب؟"

"ہاں غزالہ۔ کئی سال کی ریاضت اور لگن کے بعد آخرکار میں نے رشیدہ کو پا لیا۔ اگلے اتوار کو ہماری شادی ہو رہی ہے۔ یعنی یہ میری شادی کا دعوت نامہ ہے۔ پتہ وغیرہ سب لکھا ہوا ہے۔ امید ہے کہ تم ضرور آؤ گی اور رشیدہ کو دیکھ کر میرے انتخاب کی داد دو گی۔" ندیم جوش میں بہت کچھ کہہ گیا۔ لیکن غزالہ اس کے آگے کچھ نہ سن سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک سائے تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد کارڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور وہ خود صوفہ پر بے جان سی لڑھک گئی۔ ●●

فراق نمبر: تاثرات کے آئینے میں
(حصہ دوم)

شفیق اختر شفیق آبادی
[illegible]

عزیزم مکرم! سلام مسنون

"نیادور" کا "فراق نمبر (حصہ دوم) دعا بھی تھی اور تمنا بھی کہ ۲۲۸ صفحہ کا یہ تاریخ ساز نمبر کبھی ختم نہ ہو۔ ہائے چھ گھنٹہ کے مستقل مطالعہ کے بعد ختم ہو گیا۔ اگر فراق صاحب کو یہ پتہ ہوتا کہ امیر احمد صدیقی میری موت کے بعد ایسا بے مثال اور عظیم الشان نمبر نکالیں گے تو وہ پہلے ہی مر گئے ہوتے۔ جوش صاحب دنیا سے سدھارے۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ کمانے کھانے کا موقع ملا۔ گراں قیمت نمبر نکالے گئے۔ صفحات کم۔ مواد عنقا۔ مگر کمانے والوں نے ہزاروں کمالئے۔ بھٹو مرحوم کو پھانسی دی گئی پاکستان میں دولت کے انبار لگ گئے اکثر ہندوستانی ناشروں کے پاس۔ فیض مرحوم ہوئے۔ سکوں کی بارش ہوئی کچھ رسالوں کی گود میں۔ "نیادور" نے فراق کو جھونپڑوں تک پہنچانے کے لیے قارئین کو ایک روپیہ پچاس پیسے کا ٹکٹ تھما دیا۔ جاؤ "اپنی بات" کے اسٹیشن سے "تاثرات کے آئینے میں" کے اسٹیشن تک معلوماتی سفر کرو۔ کچھ چھوٹے اسٹیشن راہ میں پڑے اور کچھ جنکشن — ہر جگہ بھیڑ بھاڑ، دوڑ دھوپ "تاک جھانک — آنکھیں محو نظارہ، ذہن سرگرم سفر۔ دوڑ دھوپ"۔ کیا نمبر نکال دیے۔ سبحان اللہ۔ ڈر رہا ہوں کہ اونچی دکانوں کے مالک آپ کو واجب القتل کہیں قرار نہ دے دیں۔ کس کس مضمون کی تعریف کروں؟ ہر مضمون سونے پر سہاگا۔ ظ، انصاری، ملک زادہ منظور احمد، وامق جونپوری، رمیش چندر دویدی، مشتاق نقوی وغیرہ کے مضامین بہت پسند آئے۔ سرگرم، کھٹے، میٹھے۔ کچھ نشتر، کچھ زخم، کچھ مرہم۔

ٹائیٹل پیج — ایک ایسا کوزہ جس میں ساتوں سمندر موجزن۔ ابتدائی تقریر — غور و فکر — پرشباب آنکھیں۔ دنیائے شاعری کی وسعتوں کا جائزہ لیتی ہوئیں — آخری تقریر — محو حیرت ہوں یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی —؟ آپ مبارکباد اس لیے قبول فرمایئے کہ آپ کی جد و جہد، آپ کا عزم، آپ کی تمنا "فراق نمبروں" میں کھل [illegible] دل، اتر پردیش کی سرکار کو اس لیے مبارک کہ اس نے اردو کے عظیم شاعر پر سخاوت کے چالیس دروازے کھول دیے۔ کتابت، طباعت، کاغذ — سب ہی لاجواب — اب یہی دعا ہے کہ آپ جی بھر کے زندہ رہیئے اور ایسے ہی جغادری نمبر نکالتے رہیئے۔ ہمارے وزیر اعلا اگر یہ چاہتے ہیں کہ "نیادور" خوب سے خوب تر بنے تو آپ کو وہ ہرگز ریٹائر نہ ہونے دیں۔

نامی انصاری
چمن گنج کانپور

مجتبیٰ! تسلیم!

فراق نمبر حصہ دوم بیشک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ شاعری اور شخصیت پر چند مضامین اس نمبر میں بھی بہت گراں قدر ہیں۔ دونوں نمبر ملا کر فراق کی مجموعی شاعرانہ حیثیت پر ایک ایسی دستاویز بن جاتی ہے جس سے نہ صرف آج بلکہ مستقبل میں بھی اہلِ ذوق خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

"اپنی بات" کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ مواد کے اعتبار سے دوسرا حصہ، پہلے سے "قدرے بہتر" ہے۔ میری بھی بعینہٖ یہی رائے ہے۔

اشفاق احمد اعظمی، اعظم گڑھ۔

نیا دور فراق نمبر حصہ دوم کو قریب قریب سب پڑھ ڈالا۔ یہ فراق کی حیات اور فن و فکر پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ فراق پر تحقیقی کام کرنے والے کو نیا دور کے ان دونوں خصوصی شماروں کا سہارا لیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ ان میں تحقیقی اور تنقیدی دونوں طرح کے مواد شامل ہیں اور بعض مقالے تو نہایت جرأت مندانہ اور بے باکی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

تسنیم بلخی، بہار شریف، نالندہ۔

مدیر محترم تسلیمات

نیا دور کے فراق نمبر کے لیے خصوصی مبارکباد قبول کیجئے طلبا و طالبات کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالر کے لیے یہ ایک نعمت ہے۔!

نیا دور اپنے تمام نمبروں میں درجہ بدرجہ ترقی کر رہا ہے اور اس سلسلے میں واحد پرچہ ہے جس کی ہمسری کا کوئی دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ پورے ہندوستان میں فراق نمبروں سے ادب نواز حلقوں میں نیا دور کو جو مقبولیت ملے گی اس کی کوئی حد و حساب نہیں۔!

آپ کی توجہ اور لگن حکومت یوپی کی فراخ دلی، نیک نیتی ادب نواز حلقوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔!

حکیم محمد حسین خاں شفا، رام پور

فراق نمبر حصہ دوم نظر نواز ہوا۔ نقش ثانی کو دیکھ کر نقشِ اول سے بہتر کہنے پر مجبور ہو گیا۔ بہرحال آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ فراق پر اتنا عمدہ، جامع محققانہ نمبر شائع کر دیا۔ اور مختلف زاویۂ نظر کے نقادوں سے مضامین لکھوا کر ایک جگہ سلیقہ سے جمع کر دیے۔

منظر اعجاز، مظفر پور۔

فراق نمبر جلد دوم نظر سے گزرا۔ میرا خیال ہے کہ یہ جلد اول سے زیادہ وقیع ہے۔ ویسے اس کی پہلی جلد بھی اپنی جگہ بھرپور تھی۔ ایک تو ریاستی حکومت کی حوصلہ افزائی اس پر آپ کی بھرپور محنت ان دونوں نے مل کر واقعی ایک کارنامہ ہی انجام دیا۔ اتنی کم قیمت پر تو شاید اس کا ٹائٹل پیج بھی نہیں ملتا۔

ایم۔ ایس اختر۔ ڈسٹرکٹ فشریز آفیسر ہماچل پردیش

"نیا دور" کا فراق نمبر دوم نظر نواز ہوا۔ آپ نے اس دور میں اتنا معیاری پرچہ شائع کر کے اردو داں حضرات پر احسان کیا ہے۔ آپ کی کاوش قابلِ صد ستائش ہے۔

حکومت اتر پردیش بھی قابلِ مبارکباد ہے کہ اس دور میں بھی وہ اردو کی وہ خدمت کر رہی ہے جو کسی اور حکومت نے نہیں کی ہے اور اتنا خوبصورت پرچہ تقریباً مفت بانٹ رہی ہے۔

عظیم امروہوی۔ امروہہ

فراق نمبر حصہ دوم، پہلے پہ دہلا ثابت ہوا۔ فراق کا کوئی بھی محقق نیا دور کے اس نمبر سے بچ کر نہیں گذر سکتا۔ اس نمبر کو شائع کر کے درحقیقت آپ نے نہ صرف فراق پر بلکہ اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ جن لوگوں نے اس نمبر کا پوری توجہ سے مطالعہ کر لیا ہوگا۔ فراق کی شخصیت اور فن کی مکمل اور سچی تصویر ان کی نگاہوں میں جذب اور ذہن میں پیوست ہو گئی ہوگی۔

حباب ہاشمی، الہ آباد۔

"نیا دور" کا فراق نمبر (حصہ دوم) باصرہ نواز ہوا۔ "نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول" کا مصداق۔ ایک یادگار ادبی دستاویز کی شکل میں کیا شاندار اور وقیع نمبر نکالا ہے آپ نے کہ بیساختہ آپ کی مساعیِ جمیلہ کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ میری طرف سے پُرخلوص مبارکباد قبول فرمائیں۔ تمام مشمولات گرانقدر افادیت کے حامل ہیں اور فراق صاحب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دونوں نمبر مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

●●

نقد وتبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: لمحوں کی دھڑکنیں

نام شاعر: محمد عثمان عارف نقشبندی۔ گورنر اترپردیش

کسی ادبی شہ پارے کو پرکھنے کے لیے تخلیق کار کی ذاتی زندگی، ماحول اور اس کے نظریات کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ محض تخلیقات کی روشنی میں ہم اُس فنکار کا صحیح تجزیہ نہیں کر پاتے ہیں۔ فنون لطیفہ میں شاعری کو جو درجہ حاصل ہے، ارباب نظر بخوبی جانتے ہیں۔ موجودہ صنعتی دور میں جہاں چاروں طرف مشینوں کی حکومت ہے اِس ساحرہ کا جادو آج بھی سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ چند سال پہلے ناقدانِ سخن یہ سوچنے لگے تھے کہ شاید یہ تیز رفتار زندگی، تسکینِ طبع کی یہ دولت بھی ہم سے چھین لے جائے اور احساس وجدان کی یہ کیفیت کو کوئی نام نہ دیا جا سکے نیز روح کی تھرتھراہٹ شور و ہنگامہ میں دب کر نہ رہ جائے مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ادب کسی حد تک آج کی طوفانی موجوں کی لپیٹ میں آیا ضرور ہے۔ اس کے علاوہ ہماری زندگی کے مسائل اور اقدار کی شکست و ریخت نے بھی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب اِن حالات میں اگر کوئی جذبوں کی بات کر رہا ہے، ماضی کے دریچے کھول رہا ہے۔ انسانیت کو آواز دے رہا ہے، درد و غم کی بزم آراستہ کیے بیٹھا ہے تو وہ شخص قابلِ ستائش ہے، لائقِ احترام ہے اور محبت سے ذکر کیے جانے کا سزاوار ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد جب ہم "لمحوں کی دھڑکنیں" کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں تو ایک خوشگوار تاثر ذہن و دل پر طاری ہوتا ہے۔ لمحوں کی دھڑکنوں کو سننے والے اور انھیں شعری پیکر عطا کرنے والے شاعر جناب محمد عثمان عارف نقشبندی کو قدرت نے دلِ گداختہ کی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ یہ ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ "قلم کے کاشت" کے نام سے ۱۹۸۰ء میں طبع ہو کر صاحبانِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ عارف صاحب بیکانیر (راجستھان) میں پروان چڑھے جہاں شعر و نغمہ سے فضا معمور تھی۔ خود ان کے والد بزرگوار جناب محمد عبد اللہ بیدل مرحوم (ڈسٹرکٹ ڈسشن جج) ایک ممتاز شاعر تھے اور بیخود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اس طرح علم و فضل اور شعر و شاعری کی یہ دولت گراں مایہ عارف صاحب کو ورثے میں ملی۔ حسب دستور اپنے عہد کے مشہور استاد پروفیسر مولوی بادشاہ حسین رعنا لکھنوی سے زبان و بیان کے رموز و نکات سیکھے۔ اس طرح دل کے جذبات کو ندرتِ بیان کے ساتھ ادا کرنے کا گُر ہاتھ آ گیا۔

تقریباً ۲۰۰ صفحات پر بکھری ہوئی ان کی یہ فکری کاوش ادبی دنیا میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آغاز میں بزرگ ادیب اور سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر نور الحسن ہاشمی کا بسیط مقدمہ اور جناب ریوتی سرن شرما کا ایک تجزیہ ہے جس سے اس مجموعے کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل گوئی کے بارے میں پروفیسر نور الحسن ہاشمی نے درست فرمایا ہے کہ "غزل گوئی اپنی رفعت اسی وقت حاصل کرتی ہے جب ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے اس میں پختگی پائی جائے۔ غزل کی زبان اور اس کا اندازِ بیان اُس کے تار و پود ہیں۔ اگر کسی شاعر کو زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں ہے تو ایسے شاعر کی غزل مستند نہ ٹھہرے گی۔ اسی طرح اندازِ بیان کو ادبی محک پر پورا اترنے کے لیے اس نے اگر مستند شعراء کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے تو وہ اپنے کلام کو روانی اور دلکشی کے ساتھ نہ پیش کر سکے گا۔ عارف صاحب نے قدیم اساتذہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے زمانے کے مستند شعرا کو سنا بھی ہے۔ ساتھ ہی اپنے والد محترم اور اپنے استاد مکرم حضرت رعنا لکھنوی کی تربیت سے فیضان حاصل کیا ہے اس لیے صحتِ زبان اور اندازِ بیان کا جہاں تک تعلق ہے ان کے کلام میں کلاسیکی روایت کی پوری شان

جلوہ گر ہے۔ الفاظ کی صحیح نشست اور محاورات کا برجستہ اور برمحل استعمال اُن کے کلام کا جوہر ہے۔

جناب عارف نقشبندی کی غزلوں میں عارفانہ رنگ کی بھی جھلک ملتی ہے، اس میں معصوم جذبوں کی مہک بھی محسوس ہوتی ہے، زندگی کی کڑی دھوپ کا بھی احساس ہوتا ہے اور مجاز و حقیقت کی قوسِ قزح بھی دکھائی دیتی ہے۔ یعنی "لمحوں کی دھڑکنیں" غزلوں کا ایک ایسا مجموعہ نظر آیا جس سے تشنگانِ علم و ادب جی بھر کے سیراب و شاداب ہوں گے۔ کلاسیکیت کا جو رچاؤ اُن کے شعروں میں ملتا ہے وہ فنِ مشاقی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری عصری رجحانات اور میلانات کی آئینہ دار بھی ہے۔ اُن کے شعروں کا حُسن سادگی اور پُرکاری میں ہے جس کے ڈانڈے مولانا حسرت موہانی سے مل جاتے ہیں۔ سیاسی زندگی میں رہ کر عثمان عارف صاحب شعر و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں جو خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ اُن کا یہ مجموعہ مقبول و مشہور ہوگا اور ادبی حلقوں میں دادِ تحسین وصول کرے گا اور وہ اسی طرح ایک طویل عرصے تک ملک و قوم کی خدمت کے ساتھ گلشنِ ادب کی بھی آبیاری کرتے رہیں گے۔

اس پرخلوص تمنا کے بعد میں اپنی پسند کے چند شعر قارئین کی نذر کرتا ہوں:

پہ گرم رہنے بھی دو ہوتا ہے بہلانے سے کیا
زندگی کی گردشیں رکتی ہیں پیمانے سے کیا

ہر پھول کو دیکھوں یہ ہے آوارہ نگاہی
ہر نقش میں تو جلوۂ جاناں نہیں ہوتا

موجوں کو بنا لیتا ہوں میں اپنا سفینہ
طوفاں بھی مرے سامنے طوفاں نہیں ہوتا

جلنے والا ہی سمجھ سکتا ہے دل کی آگ کو
ہجر میں عارف مرا ہمدم چراغِ شام تھا

نہیں سمجھا فریبِ جلوۂ محفل نہیں سمجھا
بہت سمجھایا میں نے دل کو لیکن دل نہیں سمجھا

تمہیں دیکھوں تو کیا دیکھوں تمہیں بھولوں تو کیا بھولوں
محبت میں تو اپنا بھی گماں باقی نہیں رہتا

کانٹوں کی حکایت ہو کہ پھولوں کی حقیقت
مجھ سے سنو میں واقفِ اسرارِ چمن ہوں

جن کے ہیں بڑے ظرف یہ قصہ ہے انہیں کا
غم تیرا کہاں پست خیالوں کے لیے ہے

زندگی جن کے لیے ہم جان دیتے تھے کبھی
آج ہم ان کے تصور سے ہی کیوں گھبرا گئے

فکر پاکیزہ، سبک لفظ ہوں، احساس لطیف
شعر اس رَو میں ڈھلا ہو تو غزل ہوتی ہے

گذری جدھر جدھر سے فضائیں مہک گئیں
خوشبو ترے بدن کی نسیمِ چمن میں ہے

کچھ قدر کر شباب کی آخر شباب ہے
یہ عمر وہ ہے جس میں گنہ بھی ثواب ہے

اہلِ چمن کی رنجشِ باہم کو دیکھ کر
فصلِ بہار لوٹ گئی بے دلی کے ساتھ

کنارہ ڈھونڈنے والے کنارے پر ہی مرتے ہیں
کبھی وہ لطف اندوزِ تلاطم ہو نہیں سکتے

ہمارا حق ہی رہا کیا بہار پر عارف
ہمارا خون اگر رنگِ گلستاں میں نہیں

سینے سے لگا کر رکھا ہے ہر اچھے بُرے کو
دنیائے محبت ہے الگ دیر و حرم سے

ترا عشق ہے سفینہ تری یاد ہے سہارا
نہ ملے خدا کرے اب کہیں عمر بھر کنارا

ہر گام پہ جلوؤں نے اک جال بچھایا ہے
دیوانہ تو الجھے گا دیوانے کو کیا کہیے

فوٹو آفسیٹ پر چھپی اس کتاب کا سرورق بہت ہی دلکش اور کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔

—— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: مَعَارفِ غزل، شاعر: میر علی محمد عارفؔ مرحوم
مُرتبہ: سیّد علی محمد واثقؔ، قیمت: تیس روپے۔
ملنے کا پتہ: میر انیس ہاؤس۔ کوچۂ میر انیس۔ و نصرت پبلشرز لکھنؤ

میر علی محمد عارفؔ لکھنؤ کے اس مخصوص خانوادۂ ادب سے تعلق رکھتے تھے جس کی مرثیہ نگاری نے اردو کے شعری ادب کو ایسے گرانقدر سرمائے سے مالامال کیا ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے ادب میں ملنا ناممکن ہے۔ میر انیسؔ کے بیٹے میر نفیسؔ کے نواسے علی محمد عارفؔ بھی بنیادی طور پر اسی فکر کے شاعر تھے جو ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز تھی۔ مرثیہ نگاری میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا اور اس صنف میں انھوں نے نئے نئے گوشے پیدا کر کے نہ صرف اپنے ملکۂ شعری اور فنی توانائی کے ثبوت فراہم کیے ہیں بلکہ اپنی امتیازی حیثیت سے خاندان کی اعلیٰ علمی اور تہذیبی روایات کو بھی برقرار رکھا ہے۔

عارفؔ کا دور دبستان لکھنؤ کی ادبی گہما گہمی کا وہ دور تھا جب ہر طرف غزل گو بج رہی تھی اور پیارے صاحب رشیدؔ، بندہ کاظم جاویدؔ، امیر مینائی، جلالؔ اور تعشقؔ جیسے صاحبان کمال بہ یک وقت عروس غزل کی مشاطگی میں مصروف تھے۔ شاید یہ اسی ماحول کا اثر تھا کہ جناب عارفؔ کی بیشتر غزلیں ان کے بعض پیشرووں کی طرح ضائع نہ ہو سکیں اور اپنے عہد میں مقبول ہوئیں۔

عارفؔ کی غزلیں ان کے اپنے دور کی غزل گوئی کے اس خاص پس منظر کی عکاسی کرتی ہیں جس کو لکھنؤ کی قدیم غزل کا مزاج کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

عجب انداز میں کرتے ہیں وہ اقرار وصلت کا
کہ ہاں کہتے ہیں منھ سے اور نہیں معلوم ہوتی ہے

تلواریں ابروؤں نے لگائیں مژہ نے تیر
بوسے کا لینا کون سا ایسا قصور تھا

شرماتے ہو کیوں آتے ہوئے دیکھ لو تم آپ
جز یاس کوئی اور مرے گھر میں نہیں ہے

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے
بچھاؤں پھول کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

ہم آنکھ بند ہوتے ہی فوراً عدم میں تھے
ہستی سے بس یہ ملک فقط اتنا دور تھا

جناب عارفؔ کے پوتے اور میر محمد ہادی لائقؔ کے فرزند سید علی محمد واثقؔ اس لحاظ سے یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس گرانقدر ذخیرۂ غزل کو طباعت سے آراستہ کرا کے اپنی ادبی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

—— ساحرؔ لکھنوی

نام کتاب "سخنِ نامی" شاعر: حضرت شاہ محمد فہد الحسینی متخلص بہ نامیؔ، مرتب: وقار خلیل۔ (حیدر آباد)

زیر نظر شعری مجموعہ ایک صوفی کے کلام پر مشتمل ہے جسے وقار خلیل صاحب نے مرتب کیا ہے۔ نامیؔ صاحب ایک صوفی خانوادہ کے فرد تھے لہذا فطرتاً ان کے کلام میں صوفیانہ خیالات حاوی ہیں۔ غزل کے علاوہ انھوں نے حمد، نعت اور دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ جس طرح سوچتے ہیں اسی طرح اسے دلنشین انداز میں نظم کر دیتے ہیں۔ تصنع و تکلف سے وہ اپنے کلام کو گراں بار نہیں کرتے۔ انھوں نے دنیا کو اہل بصیرت کی طرح دیکھا ہے۔ وہ غم و ماتم کے شاعر نہیں ہیں، ان کے کلام میں رجائیت ہے۔

نمونۂ کلام:-

دو دن کی زندگی میں نہ اتنا مچل کے چل
بالشت بھر خوشی پہ نہ گز بھر اچھل کے چل

رفتار نا درست ہے پگڈنڈیاں ہیں تنگ
ناداں! اکڑ کے چلنے سے بہتر سنبھل کے چل

سیراب عشق میں کبھی ہوتا نہیں کوئی
بھرتا نہیں ہے جی تمھیں سو بار دیکھ کر

نامیؔ صاحب کے کلام میں تصوف کا رنگ گہرا ہے اور ان کی محبت مجاز کے پھندوں سے آزاد ہو کر حسن حقیقی کی متلاشی ہے اور یہ مجموعہ اسی تلاش حسنِ باقی کی نشان دہی کرتا ہے۔

—— معین الدین حسن کاکوروی

جرم کا نام زندہ ہے کہ نہیں (صفحہ ۵۶ کا بقیہ)

پیالہ میں اک نئی شوخی تھی ناز حسن کی
عشق یکساں ہی رہا آغاز سے انجام تک

مختصر یہ کہ جرم صاحب کو دنیائے شعر و ادب میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے اور انھوں نے عروس سخن کی زلفیں سنوارنے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

●●●

کہانی تمھیں لکھنے والی ہے (صفحہ ۶۱ کا بقیہ)

تم موت کے بارے میں بھی جانتے ہو اور زندگی کے بارے میں بھی ـــــ بہت سے لوگ موت کے اس اندھیرے کنوئیں میں جھانکنے سے ڈرتے ہیں اور تم ـــــ عمر کے اس موڑ پر ـــــ زندگی اور موت کے بیچ کے اس فلسفے کو جان گئے ہو جہاں کچھ نہیں ہے ـــــ کچھ نہیں ہے ـــــ زندگی اور موت کے اسی فاصلے کو طے کرنا ہے ـــــ اور آنکھیں موند کر سو جانا ہے ـــــ حقیقت بس اتنی سی ہے ـــــ کہانی کے بعد تمھیں بھی نیند آجائے گی ـــــ اور تم سو جاؤ گے ـــــ بے مقصدیت کا یہ سفر آہستہ آہستہ اپنی آخری منزل کو پا لے گا ـــــ پھر یک لمبی خاموشی ـــــ اور بند کتاب ....!!

اور محبوب! یہ بھی دیکھو کہ ـــــ رات کے ایک بج چکے ہیں اور تم سونے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور علی کی باتیں کہیں نہیں ہیں ـــــ بعد آنے والے علی کی باتیں کہیں نہیں ہیں ....

اس لئے ہوشیار ہو جاؤ ـــــ خود احتسابی کا جرم نہ کرو۔
کہانی تمھیں لکھنے والی ہے ..... کہانی تمھیں لکھنے والی ہے
کہانی تمھیں لکھنے والی ہے .....!!

●●●

پہاڑی علاقوں ـــ (صفحہ ۶۳ کا بقیہ)

کم سے کم ضرورت پروگرام، خصوصی مربوط اسکیم قبائلی ترقی پراجکٹ اور بیس نکاتی پروگرام پر موثر عمل درآمد کو یقینی بنایا گیا ہے۔

سال ۸۵-۱۹۸۴ میں آٹھ پہاڑی اضلاع کے منصوبہ جاتی مصارف ۱۶۵ کروڑ روپے تھے جس میں ۹۸،۸۴ کروڑ کی خصوصی مرکزی امداد شامل تھی۔

تعلیم کی توسیع کی غرض سے ۳۱ نئے ہائی اسکولوں ۲۵ نئے انٹرمیڈیٹ کالجوں، ۶۱ جونیر ہائی اسکولوں اور ۱۶۳ پرائمری اسکولوں کے قیام کی منظوری دی گئی۔ ۱۰۰ ہائر سکنڈری اسکولوں کے لیے ٹین شیڈ، اور ۲۰ ہائی اسکولوں نیز ۱۱۰ پرائمری اسکولوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر کی منظوری بھی دی گئی۔

اتر کاشی میں ایک آئی۔ ٹی۔ آئی اور منی کی ریتی، گوپیشور، چیاوت اور بھوالی میں ایک ایک آئی۔ ٹی۔ آئی کی برانچ کی منظوری بھی دی گئی۔ آٹھ پہاڑی اضلاع میں الکٹرانک تربیتی مرکز قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

پہاڑی علاقے میں ۹،۷،۳۳ کیلو میٹر نئی موٹر سڑکوں ۵۶،۳۵۹ کیلو میٹر ہلکی موٹر سڑکوں، ۷۰،۴۵۰ کیلو میٹر پیدل راستوں کے ساتھ ساتھ ۱۳ موٹر پلوں اور ۵۰ پیدل پلوں کی تعمیر کی بھی منظوری دی گئی۔

اس طرح ہم اس مختصر سے جائزے سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حکومت اتر پردیش دیہی اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے مسلسل نئی نئی اسکیمیں اور پروگرام وضع کر رہی ہے جس سے ہمارے دیہی عوام فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

●●●

SEPTEMBER & OCTOBER, 1986
Rs. 2-00 Paisa

Urdu Monthly

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226 001

REGD. No. LW/NP-444
Annual Subs.
Rs. 10/-





دہلی پہنچنے کے موقع پر ۲ دسمبر ۱۹۵۰ کو دہلی ہوائی اڈہ پر وزیر اعظم نہرو راجہ جی کا خیر مقدم کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ ... دیر بہادر

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم کی عملی تصویر



ہمارے وزیراعلا : شری ویر بہادر سنگھ

اتر پردیش کے نئے وزیراعلا شری ویر بہادر سنگھ زبردست تنظیمی اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کا یقین تقریر کم عمل پر زیادہ ہے۔ وہ ایک کم سخن لیکن عمل شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی عوامی اور سیاسی خدمات ایک طویل عرصے پر محیط ہیں۔ چنانچہ ان کے تجربے سے یہ ریاست اب پوری طرح مستفید ہوسکے گی، اس سے یہاں بلاشبہ عوامی فلاح و ترقی اور خوشحالی کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔

شری ویر بہادر سنگھ کا جنم ۱۸ رفروری ۱۹۳۵ء کو گورکھپور کے موضع ہرنہی میں ہوا تھا۔ گورکھپور یونیورسٹی سے انھوں نے ایم اے کیا اور ۱۹۵۱ء میں کانگریس پارٹی میں شامل ہوئے۔

شری سنگھ پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں الکشن میں کامیاب ہوئے ۱۹۶۹ء کے درمیانی مدتی انتخابات میں بھی انھیں کامیابی حاصل ہوئی چودھری چرن سنگھ کی سربراہی میں بننے والی بھارتیہ کرانتی دل اور کانگریس کی مخلوط حکومت میں وہ پہلی بار نائب وزیر محکمہ تعمیرات عامہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء کے درمیانی مدتی انتخابات میں وہ پنیارا (گورکھپور) کے حلقۂ انتخاب سے کامیاب ہوئے اور شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی سربراہی میں بننے والی حکومت میں انھیں وزیر آبپاشی و نقل و حمل کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں شری پت مشرا کی وزارت میں وہ وزیر آبپاشی و صنعت ہوئے پھر اگست ۱۹۸۴ء میں جب شری نرائن دت تیواری اتر پردیش کے وزیراعلا منتخب ہوئے تو ان کی حکومت

میں شری ویر بہادر سنگھ کو وزیر صنعت مقرر کیا گیا۔

۲۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو گورنر اترپردیش شری محمد عثمان عارف نے شری ویر بہادر سنگھ کو راج بھون میں وزیر اعلا اترپردیش کی حیثیت سے حلف دلایا۔

وزیر اعلا کے عہدے کی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد شری ویر بہادر سنگھ نے ریاست کو ایک مستعد اور باعمل نظم و نسق فراہم کرنے اور ریاست کی رفتار ترقی کو تیز سے تیز تر کرنے کے سلسلے میں بڑے مصمم عزم کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کے مددگار ہاتھ غریب سے غریب فرد تک پہنچیں گے اور مختلف پروگراموں کی موثر عمل آوری کو یقینی بنانے کے لیے نظم و نسق میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں گی اور ترقیاتی اسکیموں کو ایک مقررہ مدت کے اندر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پوری چوکسی اور چستی کا مظاہرہ کرے گی، ریاست کو ایک صاف ستھرا اور باعمل نظم و نسق دے گی اور جہاں کہیں ضرورت ہوگی، وہاں پوری سختی کی جائے گی۔

وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ نے مزید کہا کہ بدعنوانی اور کسی طرح کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی اور آج جو اقدامات کیے جا رہے ہیں، ان کے نتائج دو ایک ماہ کے اندر ہی سامنے آنے لگیں گے۔

وزیر اعلا کے یہ عزائم اس بات کے غماز ہیں کہ انھوں نے حقیقتاً اس ریاست کے کمزور، نادار اور پسماندہ طبقوں کا معیار زندگی بلند کرنے اور ترقی و خوشحالی کی منزل تک ان طبقوں کو پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

وزیر اعلا روزانہ عوام سے جس سادگی اور خلوص سے ملتے ہیں جس طرح ان کی دشواریاں اور مسائل سنتے ہیں اور انھیں فوری طور پر حل کرنے کی ہدایت متعلقہ افسران کو دیتے ہیں، وہ یقیناً اترپردیش میں ایک نئے عوامی دور کا نقیب ثابت ہوگا جس میں سبھی طبقوں اور فرقوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مساوی مواقع عملی طور سے حاصل ہوں گے۔ شری سنگھ نے جس انداز میں اور جن عزائم کے ساتھ وزارت اعلا کی ذمے داری سنبھالی ہے اور کام شروع کیا ہے، اس سے بلاشبہ اترپردیش میں بہتر کارکردگی کا ایک نیا ماحول پیدا ہوا ہے۔

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۰ نمبر ۹-۸

نومبر/دسمبر ۱۹۸۵ء

ایڈیٹر: —— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: —— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر: —— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر: —— ۴۷۱۰۸

پبلشر پرشانت کمار مشرا
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

اپنی بات

کچھ عرصہ قبل وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے کہا تھا کہ ہمیں فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے ابھی کافی جدوجہد کرنا ہے اور اقلیتوں کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا کرنا ہے کہ حکومت ان کی جان و مال کی مکمل حفاظت کرے گی۔ وزیراعظم کے انھیں خیالات کی روشنی میں مرکزی قومی یک جہتی کونسل کی تشکیل نو عمل میں آئی اور یہ ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مثبت مشورے دیتی رہے۔

مرکزی قومی یکجہتی کونسل کی سفارش پر حکومت اتر پردیش نے بھی فرقہ وارانہ فسادات کے اندیشے کو ختم کرنے اور لوگوں میں بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دینے، قومی اتحاد کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری مشورے دینے کی غرض سے ریاستی یکجہتی کونسل کی تشکیل نو کی ہے۔ ضلع کی سطح پر تشکیل شدہ یکجہتی کمیٹیوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں بھائی چارے سیکولرزم اور جمہوریت کے جذبہ کو مستحکم کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کرتے رہیں۔ یہ کمیٹیاں ان اسباب کا ازالہ بھی کریں گی جن سے فساد ہونے کا خدشہ ہو۔ ان کمیٹیوں سے ایسا بندوبست کرنے کے لیے کہا گیا ہے جس کے تحت مختلف مذاہب کے اہم تیوہار جیسے عید، ہولی، رکشا بندھن اور دیوالی وغیرہ اجتماعی طور سے منائے جائیں۔

فرقہ وارانہ منافرت کا مسئلہ تمام شہریوں کو یکساں طور سے پریشانی میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مسائل کے اسباب کی تلاش اور ان کا ازالہ کرنے میں شہریوں کی حصے داری سب سے زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اتر پردیش کے وزیراعلا شری ویر بہادر سنگھ نے یہ حکم جاری کیا کہ شہری دفاع کمیٹیوں کو یہ ذمہ داری سپرد کی جائے کہ وہ اپنے علاقوں میں فساد پھیلانے والے عناصر پر کڑی نگاہ رکھیں اور اگر بدقسمتی سے ایسا کوئی واقعہ ہو جائے جس سے فساد ہونے کا اندیشہ ہو، تو فساد سے پہلے ہی اسے ...... روکنے کے لیے اقدام کریں۔ یہ بھی احکامات جاری کیے گئے ہیں کہ خود شہریوں کو فساد روکنے کے کام میں پوری طرح شامل کیا جائے اور ہر شہر ہر ضلع میں امن کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ ان کمیٹیوں میں صرف سماجی کارکنوں کو رکھا جائے تاکہ سیاسی گروہ بندی اس کام میں حائل نہ ہو سکے۔ ابھی تک اس قسم کی کمیٹیاں اسی وقت سرگرم عمل ہوتی تھیں جب فساد ہو جاتا تھا۔ لیکن اب ایسا بندوبست کیا جا رہا ہے کہ یہ مستقل طور پر سرگرم عمل رہیں تاکہ فساد کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

ریاست میں فرقہ وارانہ خیرسگالی برقرار رکھنے کے کام سے شہری دفاع و ہوم گارڈ تنظیموں کو بھی وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان تنظیموں سے کہا گیا ہے کہ وہ بھی مختلف تیوہاروں کے موقع پر مختلف پروگراموں کا اہتمام کریں اس کام کے لیے حکومت انھیں مالی امداد بھی دے رہی ہے۔ ریاست کے بعض اضلاع ایسے ہیں جنھیں حساس مانا جاتا ہے اور وہاں فرقہ وارانہ تناؤ کا اندیشہ نسبتاً زیادہ رہتا ہے۔ ایسے علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے اور فساد روکنے کے سلسلے میں ضروری بندوبست کرنے اور فرقہ وارانہ خیرسگالی برقرار رکھنے کے کام کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ حکومت اس سلسلے میں بھی کوشاں ہے کہ ذمہ داری کے عہدوں پر ایسے افسران کو ہی رکھا جائے جو سیکولرزم پر پورا یقین رکھتے ہوں اور فرقہ وارانہ خیرسگالی قائم رکھنے کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کے جذبے سے کام کریں۔ ایسا بندوبست بھی کیا گیا ہے کہ اقلیتی فرقے سے متعلق افسران نظم و نسق اور پولیس میں تعینات کیے جائیں۔ یہ احکامات بھی ہیں کہ اگر کسی افسر نے جانبداری یا اپنی ذمہ داری نباہنے میں لاپرواہی برتی تو اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

.... ایڈیٹر

ادم پرکاش بجاج
۱۵۴، وکاس کنج، وکاس پوری
نئی دہلی

پیار ہی پیار

راتیں اپنی جگہ، کتنی رنگین ہیں
دن بھی اپنی جگہ کتنے پرکیف ہیں
کتنی صدیوں سے یہ حسن پر نور ہے
طور ہی طور ہے

دھوپ چھاؤں وہی
روشنی بھی وہی
چاندنی بھی وہی
آدمی بھی وہی
زندگی بھی وہی
وقت کا رنگ ہے
سوچ کا ڈھنگ ہے
روشنی کی جگہ
لوگ مانگیں اندھیروں کی کالی گھٹا
چاندنی کی مٹی دل سے چاہت طلب
ہر کوئی زیست سے تنگ ہے
برسرِ جنگ ہے
کہنہ قدروں کی دل میں نہیں قدر کچھ
کیسی سموم دیکھو چلی یہ ہوا
عرش پر، فرش پر
کتنا اندھیرا ہے

کتنی صدیوں سے حاصل کیا ارتقا
آج مٹ جائے گا
دوستی کی جگہ دشمنی لے گی اب
پیار مٹنے پہ کالی گھٹا چھائے گی
دردِ انساں کا پھر کون ہوگا امیں
مٹ چلا ہے یقیں
آج شیطان پھر جلوہ گر ہے کہیں
لے کے افواج کو
کینہ نفرت کی طوفانی افواج کو
ڈیرا ڈالے ہوئے
کو بہ کو، سو بہ سو
نیکیاں چھپ گئیں
آدمی مٹ گیا تو مٹے گا جہاں
ہوگی پھر سے حکومت بھی شیطان کی

اب مرے دوستو
نیند اپنی تجو
اب نہ غفلت کرو
اٹھ کے شیطان کی طاقتوں سے لڑو
اور اسے مات دو۔
کوئی دیپک جلا کر چمن زار میں

روشنی پھر کرو
اپنا دل تھام لو
دولتِ شادمانی سبھی کو ملے
ان اندھیروں کا مٹ جائے نام و نشاں
تذکرے پیار کے
پھر سے ہونے لگیں
پھر مروت ملے
پھر محبت ملے
پھر عقیدت ملے
دل کی دولت ملے
لوگ بیدار ہوں مست ایثار ہوں
ہر شجر مسکراہٹ میں لپٹا ہوا
پنچھیوں سے فضاؤں میں جھنکار ہو

ہر طرف پیار ہو
پیار ہی پیار ہو

حسین امین

نہرو کی یاد گلاب کی طرح تازہ

"یہ آپ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟
مجمع کی نگاہیں اسی طرف گھوم گئیں جس طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

"میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں۔ بیٹھ جائیے نہیں تو اوروں کو دقت ہوگی"

اور نہ جانے کون بیٹھ گیا۔ وہی بیٹھ گیا ہوگا جس سے کہا گیا تھا۔ لیکن وہ شخص مجمع کو نظر نہیں آیا تھا۔ پھر آواز آئی۔

"یہ مائکروفون ہے یا مذاق"

اور کئی لوگ لپک کر مائکروفون کو ٹھیک کرنے پہنچ گئے

"آپ سب اسے تھوڑے ہی بنائیں گے۔ ایک بنائے گا"

اس مجمع کے بالکل پیچھے ایک صاحب نے زور سے کچھ کہا تو دوسرے نے کہا "ابے چپکے چپکے بول پنڈت جی بگڑ جائیں گے!"۔

یہ سب آزادی ملنے کے بعد بالکل شروع کے زمانے میں شاید [illegible] میں ہوا۔ جب ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو امین الدولہ پارک میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ پنڈت جی کا بھی عجب اسٹائل تھا۔ وہ اکثر ہجوم سے بات کرنے لگتے تھے۔ جلسہ گاہ میں عورتوں کے لئے خاص طور پر آگے جگہ بنواتے تھے۔ اس زمانے میں سکیورٹی اتنی سخت نہیں ہوتی تھی جتنی اب ہے۔ اور پنڈت جی کا سکیورٹی والوں سے سخت ٹکراؤ بھی رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ سکیورٹی کا گھیرا توڑ کر پبلک میں چلے جاتے تھے۔ اور کبھی کسی بچے کا منھ چومتے کسی سے اس کا نام پوچھتے یا یہ کہ وہ کہاں پڑھتا ہے کبھی خود ہی پھیڑ چھانٹنے لگتے۔

ایک بار لکھنؤ میں حضرت گنج سے گذرتے ہوئے جب پنڈت جی نے پوری سڑک پر دو رویہ قطار میں کھڑے ہوئے مجمع کو جو بیشتر نوجوانوں پر مشتمل تھا ہاتھ ہلا کر گویا "ہیلو" کہا تو نہ جانے کتنوں کے خوشی میں آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے اور گلوگیر آواز میں پنڈت نہرو زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے اس سے قبل اموسی ہوائی اڈے پر پنڈت جی جب جہاز سے باہر آئے تو ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے ایک جم غفیر وہاں تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں بچے بھی تھے۔ پنڈت جی کو جو ہار پہنائے جا رہے تھے وہ ان کو اتار اتار کر بچوں کی طرف اچھال دیتے تھے۔ ایک بار پنڈت جی اچانک رک گئے اور پولیس کا گھیرا توڑتے ہوئے بچوں کے پاس گئے اور پھر ان کی آواز آئی۔ "یہ کیا یہ کیا" ننھے منے بچے پنڈت جی کو اپنے اتنے قریب پا کر کھل ہی تو گئے۔ پھر پنڈت جی نے ایک نسبتاً بڑے لڑکے سے ہار لیتے ہوئے کہا "یہ میں نے اسے دیا تھا" ایک چھوٹے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ اس لڑکے نے فوراً بچے کو وہ ہار دے دیا۔ پنڈت جی نے ایک دوسرا ہار اس بڑے لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ اس ہار میں ان کا محبوب ترین پھول گلاب بھی تھا۔

پنڈت جی ہر ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے لیے مجمع کوئی چیز نہیں تھا۔ انھوں نے ہمیشہ مجمع کو ایک شخص سمجھا اور اس سے

بات چیت اور ہنسی مذاق تک کر لیتے تھے۔ اور ان کا یہ انداز صرف اپنے وطن تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ساری دنیا میں وہ یہی کرتے تھے اور ان کی انہی باتوں نے ان کو ساری دنیا میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ وہ بے حد سوشل انسان تھے اور ان کے اندر غضب کا تنوع تھا۔

پنڈت جی کی شخصیت کا کرشمہ یہ ہے کہ صدی کی عظیم عالمی شخصیتوں میں لینن، اسٹالن، روز ویلٹ، چرچل کی صف میں ایک قدآور شخصیت بن کر چھا گئے اس کا بہت کچھ سبب تو ان کے مزاج کا تنوع ہو سکتا ہے۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ایک عظیم سیاست داں، مدبر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اعلا پائے کے صحافی بھی تھے جد وجہد آزادی کے دوران وہ نیشنل ہیرالڈ میں اپنے جلسوں کی رپورٹنگ خود ہی کیا کرتے تھے۔ سائنس کے طالب علم ہونے کے باوجود ان کی صحافت، ادب اور تاریخ سے دلچسپی ایک انوکھی بات تھی اور اس میں بھی طرہ امتیاز یہ تھا کہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات میں اُن کی ان تمام خوبیوں کا رنگ ملتا ہے۔

ان کی شخصیت کے کئی اور بھی دلچسپ پہلو ہیں۔ وہ خوش گفتار، خوش پوش، جامہ زیب، نفاست پسند، حسین، پُر مذاق شاعرانہ مزاج، کھلاڑی اور درد مند انسان تھے۔ تیراکی کے وہ شوقین، شہہ سواری کے وہ رسیا، قدرتی مناظر کے وہ دلدادہ بچوں سے ان کو بے حد پیار اور ایڈونچر ان کی فطرت، گلاب ان کی جان۔

پنڈت نہرو نے ناوابستگی کے تصور کو وسعتیں عطا کیں عدم تشدد کے گاندھیائی فلسفے کو عملی طور پر فروغ دیا۔ نوآبادیاتی نظام کے خلاف عالمی سطح پر جدوجہد کی اور ہر ملک کی جنگ آزادی کی بھرپور حمایت کی۔ عالمی بھائی چارہ کے لیے ہر ملک سے ہاتھ ملایا۔ ہر سو شانتی اور پرامن بقائے باہم کا پرچار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سطح کے دوسرے لیڈروں کا احترام مخصوص نظریاتی حلقوں تک محدود ہو کر رہ گیا اور ان میں وہ ہمہ جہتی نظر نہیں

آئی جو پنڈت جی میں تھی جن کو ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے کہ انھوں نے ناوابستگی کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا۔ اور سب سے دوستی رکھی اور اس پر ان کی شخصیت کی دوسری جہتیں۔ یہ انہی کی قیادت تھی جس نے ہندستان کو تیسری دنیا میں اتنا اہم مقام دلایا کو آج وہ تیسری دنیا کا سربراہ ہے۔

آج ہندستان جس جگہ پر کھڑا ہے وہ نہرو کی بصیرت کی دین ہے۔ ہندستان جب ۱۹۴۷ء میں غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوا تو اتنا لاغر اور کمزور تھا کہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ کوئی کھانا دے تو کوئی کپڑا۔ اسے نہرو کی حمیت نے گوارہ نہیں کیا۔ انھوں نے ملک کے بگڑے ہوئے خدوخال کو درست کرنا شروع کیا۔ جہالت دور کرنے کے لیے تعلیم عام کی۔ احساس کمتری دور کرنے کے لیے ملک کو ترقی یافتہ ملکوں کی سطح پر لانے کا ڈھانچہ تیار کیا، کثیر آبادی والے اس ملک کے کروڑوں انسانوں کے پیٹ بھرنے کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے زرعی پیداوار بڑھانے کی سعی کی، باندھ بنوائے، کھاد کے کارخانے لگوائے زمین کو تازہ دم کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں سبز انقلاب آچکا ہے۔ غلہ رکھنے کی جگہ کم پڑ گئی ہے۔ صنعتوں کو ترقی دینے کے منصوبے بنائے جو ایسے تھے کہ آج ہندستان اپنی مصنوعات دنیا بھر میں ایکسپورٹ کر رہا ہے اور ساتھ ہی ملک کی دفاع کی طرف توجہ دی چنانچہ آج ہندستان دفاعی معاملے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے معاملے میں نہرو جی کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے چنانچہ آج ہندستان سائنس کے میدان میں دنیا کے چھ ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے۔

پنڈت جی نے ملک کی باگ ڈور ایک بہت ہی نازک وقت میں سنبھالی تھی اور شاید اسی لیے انھوں نے آرام حرام ہے کا نعرہ دیا تھا جو اس وقت کی ضرورت کا ترجمان تھا۔ ہر محاذ پر توجہ اور دلجمعی کی ضرورت تھی اور پنڈت جی ہر محاذ پر توجہ دے رہے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں مرد مجاہد تھے۔ آزادی کی لڑائی سے لے کر

(بقیہ صفحہ ۱۴)

غزلیں

بشیر بدر
ڈی ۱۴۰، شاستری نگر، میرٹھ

میں کب کہتا ہوں وہ اچھا بہت ہے
مگر اس نے مجھے چاہا بہت ہے

خدا اس شہر سے محفوظ رکھے
وہ بچوں کی طرح ہنستا بہت ہے

ستارے، شمعیں، جگنو اور آنسو
محبت میں ابھی رونا بہت ہے

میں دنیا بیچ کر تجھ کو خریدوں
مگر یہ سلسلہ سستا بہت ہے

یہ دل کتنا اکیلا ہو گیا ہے
تمہارے ساتھ بھی رونا بہت ہے

وہ اب لاکھوں دلوں سے کھیلتا ہے
مجھے پہچان لے اتنا بہت ہے

دکھلا کے یہی منظر بادل چلا جاتا ہے
پانی سے مکانوں پہ کیسے لکھا جاتا ہے

اس موڑ پہ ہم دونوں کچھ دیر بہت روئے
جس موڑ سے دنیا کو اک راستہ جاتا ہے

دونوں سے چلو پوچھیں۔ اس کو کہیں دیکھا ہے
اک قافلہ آتا ہے اک قافلہ جاتا ہے

اک شمع جلاتے ہو اک شمع بجھاتے ہو
یہ چاند ابھرتا ہے دل ڈوبتا جاتا ہے

دنیا میں کہیں ان کی تعلیم نہیں ہوتی
دو چار کتابوں کو گھر میں پڑھا جاتا ہے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اقبال کا لڑکپن

چند جھلکیاں

کھیل کود کا زمانہ

جن دنوں میں اقبال کی تاریخِ ولادت کا مسئلہ ہندستان اور پاکستان میں عاشقانِ اقبال کی توجہ اپنی طرف مبذول کئے ہوئے تھا، سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر وحید قریشی اس عقدے کو حتی الامکان حل کرنے کے لیے اقبال کی ایک ہم مکتب کرم بی بی سے ملنے کے لیے سیالکوٹ پہنچے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:- ان کی ایک ہم مکتب کرم بی بی مرحومہ سے جو عمر میں ان سے صرف دو برس چھوٹی تھیں اس مکتب کا ذکر آیا تو جیسے بیتے ہوئے دن واپس آگئے۔ بڑے مزے سے لیکن بہ سبب پیرا سالی رک رک کر کہنے لگیں: ہم ایک ساتھ پڑھتے پڑھائی کے ساتھ کھیل کود میں وقت گزرتا۔ اقبال بڑا شریر تھا' طرح طرح کی شرارتیں کرتا' خود ہنستا ہمیں ہنساتا۔ پڑھنے لکھنے میں بلا کا تیز۔ معلوم ہوتا تھا اسے پہلے ہی سے سب کچھ یاد ہے۔"[۱]

اقبال کو لڑکپن میں کبوتر پالنے کا شوق بھی تھا۔ اس سلسلے میں عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں: بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے، اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے'

آپ نے فرمایا:

"کمبخت، اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ حضرات، ذرا اسے پکڑ کر دیکھئے"

لال پہلوان (لالو) جو اقبال کے بچپن کے دوست ہیں' ان کی کبوتربازی کے قصے سناتے ہیں۔"[۲]

اقبال کی اس مبینہ شوخ بیانی پر تبصرہ کرتے ہوئے فقیر سید وحیدالدین لکھتے ہیں کہ مصنف کتابِ مذکور نے راوی کا حوالہ دئے بغیر لکھا ہے کہ بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا شوق تھا۔ اتنی بات تو بے شک درست ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لڑکپن سے لے کر بڑے ہونے تک کبوتر پالنے کا شوق رہا لیکن مولانا میر حسن صاحب کے درس کی مجلس میں بٹیر بازی اور بے حد گستاخانہ دیدہ دلیری کی کہانی جس نے بیان کی ہے' سراسر زیادتی اور بے انصافی کی ہے۔"[۳] یہ تو خیر فقیر سید وحیدالدین کی ذاتی رائے ہے جس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ راقم التحریر کے نزدیک اقبال کا یہ مبینہ جواب کہ حضرت ذرا اسے پکڑ کر تو دیکھئے "گستاخانہ دیدہ دلیری نہیں ہے بلکہ یہ اظہار محض بھولپن' ذہانت اور برجستہ گوئی پر دلالت کرتا ہے۔ جہاں تک اقبال کے کبوتر پالنے کے شوق کا تعلق ہے اس کی تفصیل شیخ عطا محمد کے داماد خالد نظیر صوفی کی زبانی

لکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"بچپن میں آپ کو کبوتروں سے بے حد لگاؤ رہا۔ چونکہ اس زمانے میں فراغت زیادہ تھی اس لیے لوگ عجیب عجیب مشاغل رکھتے تھے۔ انھی میں سے ایک مشغلہ کبوتر پالنا بھی تھا اور سیالکوٹ کے محلہ کشمیریاں میں تو یہ شغل الا قوبلا تہوار تھا۔ آج بھی وہاں اس کے کافی آثار ملتے ہیں۔ چونکہ بچے پرندوں اور جانوروں کے دلدادہ ہوتے ہیں اس لیے ان کا اس ماحول میں کبوتروں کی طرف راغب ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ میاں جی (والد اقبال) نے ان کا شوق دیکھ کر انھیں گھر ہی پر کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ کبوتروں کے شوق میں غلط صحبت میں نہ پڑ جائیں۔ اب نا بالغ کوٹھے پر سے اپنے کبوتر اڑاتے اور گھنٹوں خاموش بیٹھے ان کی پرواز سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ کبوتروں کا شوق انھیں کافی عرصے تک رہا۔ لاہور میں انار کلی میں بھی ان کے پاس کبوتر تھے۔ پر جب میکلوڈ روڈ منتقل ہونے تو کبوتروں کے لیے خاص ڈبے بنوائے لیکن جب جاوید ماموں پیدا ہوئے تو انھوں نے یہ شوق ختم کر دیا اور تمام کبوتر گھر سے نکال دیئے تاکہ جاوید ماموں اس شغل کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ کبوتروں سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی آپ چھت پر یا صحن میں لیٹے ہوتے تو دور فضا میں محوِ پرواز کبوتروں کو فوراً پہچان لیتے کہ یہ کون سی قسم ہے اور وہ کون سی نسل" [3]

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید علامہ اقبال کی کبوتر بازی اور بٹیر بازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس بات کا تو راقم الحروف بھی چشم دید گواہ ہے کہ حضرت علامہ نے یہاں نظام الدین کے آموں کے باغ میں لاہور کے اہلِ علم سے خوش گپیوں کے دوران میں بٹیر بازی کے فن پر گفتگو فرمائی اور ہاتھ سے بٹیر کو مٹھیانے کا طریقہ بتایا" [4]

سخن گسترانہ بات

علامہ اقبال کی کبوتروں سے گہری دلچسپی کا ذکر سید نذیر نیازی نے بھی کیا ہے اور ان کی اس تحریر سے ایک معنی خیز نکتہ سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"حضرت علامہ کو کبوتروں سے بڑی دلچسپی تھی بلکہ ایک زمانے میں انھوں نے خوب خوب کبوتر پال رکھے تھے۔ یہ شوق انھیں بچپن ہی سے تھا جس میں راقم الحروف کے برادر عم زاد سید محمد تقی مرحوم بھی ان کے شریک تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف جب قیام دہلی میں پہلی مرتبہ مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوا اور بسلسلۂ تعارف ان سے حضرتِ علامہ سے میرے تعلق کا ذکر کیا گیا تو کہنے لگے "میں ان کے علم و فضل کا قائل ہوں، لیکن یہ خودی کیا چیز ہے؟ میں خودی کو نہیں سمجھا، تم سمجھا، خودی ہے کیا؟

"میں نے عرض کیا "میں یہ جرات کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں۔ یوں بھی جب بایں علم و فضل آپ نہیں سمجھے کہ خودی کیا ہے تو مجھ جیسا کم علم انسان اسے کیا سمجھے گا۔"

"اس پر مولانا مسکرا کر کہنے لگے" اقبال نے جب اسرارِ خودی لکھی اور اس کا ایک نسخہ ہمیں بھیجا تو ہم نے اس کی بڑی تعریف کی اور ہم واقعی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کے علم و فضل کو کوئی نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو بصیرت دی ہے، کسی کو نہیں ملی۔ لیکن جب ہم نے انھیں لکھا کہ یہ جو آپ نے بار بار خودی کی طرف اشارہ کیا ہے تو ہم نہیں سمجھے خودی کیا ہے؟ ہمیں سمجھا دیجئے۔ تو اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا ہمارے پاس کبوتر کا ایک نہایت اعلیٰ جوڑا ہے، اجازت ہو تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔"

"اتنا کہہ کر مولانا نے سامعین کی طرف دیکھا اور کہنے لگے ہم ان کا مطلب سمجھ گئے" [5]

یہاں تک واقعہ بیان کرنے کے بعد سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

مولانا شدت سے وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔
حضرت علامہ شاید انھیں یہ سمجھا رہے تھے کہ جس
چیز کے بارے میں آپ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے
رہے ہیں وہی بار بار اور نئے سے نئے روپ
میں آپ کے سامنے آتی رہتی ہے۔ یہی
خودی ہے۔ ؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید نذیر نیازی نے یہاں ایک عمدہ نکتہ پیش کیا ہے اور گمان اس طرف جا بھی سکتا ہے کہ اقبال نے نظریۂ وحدۃ الوجود کی روشنی میں خودی کا مفہوم مولانا عبدالسلام کے سامنے رکھا ہو لیکن کبوتروں کے جوڑے کی پیش کش سے یہ مفہوم مراد لینا کہ اقبال نے وحدۃ الوجود کی مروجہ تاویل کے اثبات میں بات کہی اقبال کے نظریۂ تصوف کی تائید نہیں کرتا مثنوی "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور اس وقت تک اقبال نظریہ وحدت الوجود کی اس تاویل سے قطع تعلق کر چکے تھے جس کی روشنی میں انھوں نے ایک زمانے میں اس طرح کے اشعار کہے تھے۔

صیادِ آپ حلقہ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ
(بیا)

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

خدا کی ہستی دنیائے زمان و مکان سے کہیں آگے ہے چنانچہ خدا کو لامحدود اور دنیا کو محدود اور زمانی تسلیم کیا گیا ہے وحدۃ الوجود کا تصور عام دوسری حد تک پہنچتا ہے یعنی یہ کہ خدا حدودِ زمان و مکان سے کہیں باہر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے خدا ہے اور خدا ہی سب کچھ ہے اور خدا اور کائنات دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا ایک حقیقت ہے اور کائنات اس کا ایک غیر حقیقی پرتو۔ کائنات کی اپنی حقیقت نہیں ہے۔ اس کی حقیقت خدا ہی کی حقیقت ہے۔ اس کی حقیقت محض ایک پرتو یا بعض کے نزدیک وہم و طلسم ہے۔

گویا اقبال نے خودی کی حقیقت مولانا عبدالسلام کے سامنے نظریۂ وحدۃ الوجود کی تمام تاویل کی روشنی میں پیش نہیں کی بلکہ اس کی تردید میں پیش کی۔

دراصل اقبال نے کبوتروں کے جوڑے کی پیش کش والی بات اس لیے کی ہوگی کہ وہ زندگی کی ماہیت کا فلسفہ مولانا عبدالسلام ایسے فاضلِ بے بدل کے سامنے رکھنا چاہتے ہوں گے کیونکہ ایک بار زندگی کی ماہیت پر غور کیا جائے تو اقبال کے نظریۂ خودی کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ انفرادیت زندگی کی خصوصیت ہے اور اس لیے بقول اقبال وحدت، کثرت میں اسیر ہونے کے باوجود ہر جگہ بے چگوں بھی ہے اور بے نظیر بھی۔ کبوتر ہو (یعنی پرندے اور حیوانات) یا کانٹے اور پھول ہوں (یعنی نباتات) یا بیابان اور کہسار (یعنی جمادات) یہ سب زندگی کی انفرادیت کی مختلف منزلیں ہیں۔ انسان اس کی آخری اور بلند ترین منزل ہے۔ ڈارون نے یہ بات جس انداز سے بھی کہی ہو مولانا روم اس نظریۂ ارتقا کو یوں بیان کرتے ہیں۔

آمدہ اول بہ اقلیمِ جماد	وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد	وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیوانی اوفتاد	نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں	خاصہ در وقتِ بہار و ضیمراں
ہمچو میلِ کودکاں با مادراں	سرِّ میلِ خود نداند در لباں

ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت ؎

یا دوسرے لفظوں میں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون (بالِ جبریل)

گویا زندگی کی ماہیت کے اندر ہی زندگی کی خصوصیات پوشیدہ ہیں زندگی کیا ہے؟ فرد ہی کا دوسرا نام زندگی ہے اور خودی زندگی

کی اعلیٰ ترین اور جلیل ترین خصوصیت ہے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند (ضربِ کلیم)

راقم التحریر کی ناقص رائے میں کبوتروں کے جوڑے کہ
پیش کش سے نظریۂ وحدۃ الوجود سے وابستہ مفہوم عام کی تائید
نہیں بلکہ تردید مقصود تھی اور اگر اس پیش کش کو "بالِ جبریل" کے
ان اشعار کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو کبوتر کے جوڑے کی پیش
کش سے اقبال کا نظریۂ خودی پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گِل خوش آئی اسے محنتِ آب و گِل
یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم، یہ بت خانۂ شش جہات اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس ازل سے ابد تک رمِ یک نفس!

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

بات دراصل اقبال کے بچپن اور لڑکپن کی ہو رہی تھی۔ اور سید نیازی مرحوم و مغفور کے ایک اقتباس کی بدولت وحدت الوجود اور اقبال کے نظریہ خودی پر بحث درمیان میں آ گئی اور اقبال کے لڑکپن کا ذکر ادھورا رہ گیا اگرچہ ابھی اس ضمن میں بہت کچھ کہنے کو باقی ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مولوی سید میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی کبوتر بازی کے شوق میں اقبال کے رفیق تھے۔ ایک دفعہ سید محمد تقی کہیں سے کبوتروں کے چار جوڑے لائے۔ اور انھیں پالنا شروع کر دیا۔ اقبال نے دیکھا تو کہا۔

جی میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے
کوئی کالا کوئی اسپید ہے دو مٹیالے

ایک دن انتہائی انہماک کے ساتھ آسمان پر نظر جمائے ہوئے کبوتروں کی پرواز دیکھ رہے تھے۔ مولوی سید میر حسن نے یہ انہماک دیکھ کر کہا۔ علم حاصل کرنے کے لیے اسی انہماک سے کتاب پر نظر رکھو کبوتروں کی پرواز سے تو صرف علمی زندگی کی جد و جہد ہی سیکھی جا سکتی ہے۔ دیکھئے، اپنے دور کے ایک جید عالم ایک فقرے میں کیا کچھ کہہ گئے۔

کبوتروں کے ساتھ ان کے دل لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں۔ "محمد اقبال کہتے ہیں جب میں کبوتروں کو پہنائے فضا میں پرواز کرتے دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں بھی ان کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں اڑ رہا ہوں۔ افلاک کی سیر ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کبوتروں کی اڑان اور آسمان پر وازی محمد اقبال

کی شاعرانہ اور فلسفہ پسند طبیعت کو بڑی مرغوب تھی۔ لقا کبوتر سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ کہتے اس کبوتر کا سینہ تان کر ایک شانِ تمکنت اور طمطراق سے چلنا مجھے بہت پسند ہے۔ رفتہ رفتہ کبوتروں سے انھیں ایک حیاتیات داں کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ ان کی عادات اور خصائل، طاقتِ پرواز اور مختلف انواع کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے۔ کہتے ان کی اصل تو ایک ہے لیکن یہ گھریلو کبوتر جنگلی کبوتروں سے کیسے الگ ہوئے۔ اس حد تک الگ کہ ان کی عادات و خصائل کو جنگلی کبوتروں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ یوں کبوتروں سے ان کا ذہن دوسرے وحوش وطیور کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ ان کی عادات اور خصائل کا مطالعہ کرنے لگے تا آنکہ یوں انھوں نے ایک نظامِ علامات وضع کر لیا جو ان کے خیالات اور تصورات کے ابلاغ کا نہایت موثر ذریعہ ثابت ہوا۔ ان کے یہاں کبوتر ایک علامت ہے، شاہین ایک علامت کنجشک فرومایہ بھی علامت"۔ [۸]

موسیقی سے دلچسپی

اقبال کے لڑکپن کی دلچسپیوں اور مشاغل کبوتر بازی کے علاوہ موسیقی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موسیقی یا راگ کے ساتھ انھیں دلچسپی اوائل عمر ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ اپنے راگ کے شوق سے متعلق بعد کے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبال
راگ ہے دین مرا راگ ہے ایمان مرا

لڑکپن میں READING IN POETRY نامی ایک کتاب اقبال کے زیرِ مطالعہ رہی۔ نویں درجے میں۔ اس پر انھوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ اس طرح لکھا ہے۔

THIS BOOK NOW BELONGS TO MOHD.
IQBAL, STUDENT 9TH. CLASS
S. M. CITY SIALKOT,

اسی کتاب پر ایک جگہ انھوں نے راگ کے بول تحریر فرمائے ہیں۔

سا رے گا ما پا دھا نی
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷

کھرج رکھب گندھار مدھم پنچم دھیوت نکھار
شا

اس کے نیچے بیدل، غالب، ناسخ اور واقف کے مختلف اشعار درج ہیں جو پنسل سے لکھے ہونے کی وجہ سے صاف نہیں پڑھے جاتے۔ اس کتاب پر ایک دوسری جگہ راگ کے بول یوں درج ہیں۔

(خاص) دا گا ری (خاص) کھرج دھا۲

پا (خاص) گا ری سا ری گا"۔ [۹]

حواشی

[۱] دانائے راز۔ سید نذیر نیازی صفحہ ۱۳۔ [۲] ذکرِ اقبال عبدالمجید سالک۔ صفحہ ۱۲۔ [۳] روزگارِ فقیر، فقیر سید وحید الدین جلد اوّل صفحہ ۲۴۲۔ [۴] خالد نظیر صوفی بازار چوڑی گراں کی جگہ بار بار محلہ کشمیریاں لکھتے ہیں۔ اس کا سبب راقم التحریر کے نزدیک یہ ہو سکتا ہے کہ محلہ کشمیریاں اور بازار چوڑی گراں کو ایک ہی محلہ قرار دے کر اقبال کی تاریخ ولادت ۹ دسمبر ۱۸۷۷ء ثابت کی جا سکے [۵] شیخ نور محمد کو بھی کبوتر محبوب کیوں نہ ہوتا۔ آخر وہ بھی ایک کبوتر ہی تو تھا جو علامہ کی ولادت سے قبل ہی شیخ نور محمد کے لیے علامہ کی ولادت کا مژدہ جانفزا لے کر آیا تھا۔ [۶] اقبال درونِ خانہ۔ خالد نظیر صوفی ص ۱۰۔ [۷] سرگزشتِ اقبال عبدالسلام خورشید ص ۲۲ [۸] اقبال کے حضور، جلد اوّل، سید نذیر نیازی ص ۱۴۳ [۹] اقبال کے حضور جلد اوّل۔ سید نذیر نیازی ص ۱۴۹ [۱۰] اوّل اوّل دانائی ارتقا جمادی صورت میں نمایاں ہوا۔ جمادی صورت کے بعد اس نے نباتاتی صورت اختیار کی نباتاتی صورت میں اس کی عمریں گزر گئیں حتیٰ کہ اسے اپنی جمادی صورت کے متعلق کچھ یاد نہ رہا اور جب وہ نباتاتی حالت سے حیوانی حالت تک پہنچا تو اسے اپنی نباتاتی زندگی کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کا ایک رجحان عالمِ نباتات کی جانب رہا خاص طور سے موسمِ بہار کے وقت جب کہ پھول کھل اٹھتے ہیں اسی طرح جس طرح بچے اپنی ماں کی جانب ایک طبعی رجحان رکھتے ہیں اور انھیں علم نہیں ہوتا کہ ماں کا دودھ پینے کیلئے ان کے ہونٹوں میں کیوں ایک رغبت اور شوق کی کیفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان ایک اقلیم سے دوسری اقلیم تک چلتا رہا حتیٰ کہ وہ عاقل، دانا اور مضبوط ہو گیا جس طرح وہ اب ہے۔ [۱۱] دانائے راز۔ سید نذیر نیازی۔ ص ۳۳۔ [۱۲] اقبال درونِ خانہ۔ خالد نظیر صوفی ص ۱۵۔

مظفر حنفی
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

یاد ان کو نہ کر بات بڑھ جائے گی
پھوس بنگلے میں برسات بڑھ جائے گی

میری آنکھوں کے تارے نہ ٹوٹے اگر
چاند گھٹ جائیگا رات بڑھ جائے گی

ہم فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرو
اور توقیرِ ذات بڑھ جائے گی

ان گنت مدعی ہیں مسیحائی کے
شہر میں شرحِ اموات بڑھ جائے گی

ایک دن سبز موسم گزر جائے گا
زرد پھولوں کی اوقات بڑھ جائے گی

اپنے حصّے کی بستی جلائے رہو
ورنہ غم کی یہ رات بڑھ جائے گی

اس قدر صاف گوئی، مظفر میاں
کون سی آپ کی ذات بڑھ جائیگی

عبداللہ کمال
دوسری منزل، شیام جی
بلڈنگ، نور باغ ڈونگری
بمبئی

حسین خواب نہ دے اب یقین سادہ دے
مرے وجود کو یا رب نیا لبادہ دے

نہ چھین مجھ سے مرا ذوقِ خود نوردی بھی
مرے قدم کو بھی منزل نہ دے ارادہ دے

غمِ حیات کو پھیلا دے آسمانوں تک
دلِ تباہ کو وسعت بھی کچھ زیادہ دے

مجھے قرار نہ دے تو بسِ غبارِ نفس
میں شہ سوار ہوں میدان بھی کشادہ دے

مرے رفیقوں کو دے حوصلہ کہ سنگ اٹھائیں
مرے خلوص کو ہر سنگ سے افادہ دے

مرے حریفوں کے دم خم میں ہو کمی تو انہیں
مرے غرور سے توفیقِ استفادہ دے

چمک دے چاند کو ٹھنڈک ہوا کو دلکو امنگ
اداس قصّے کو پھر ایک شاہزادہ دے

اتار دے مری رگ رگ میں پھر سے سبز لہو
سکوتِ دشت کو پھر شورشِ اعادہ دے

ڈاکٹر کلیم سہسرامی
پروفیسر و صدر شعبۂ السنہ
راج شاہی یونیورسٹی
راج شاہی۔ بنگلہ دیش

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
کچھ اپنی اور کچھ ان کی زبانی

ماہنامہ ساقی (دہلی) اور "نگار" (لکھنؤ) کے صفحات پر جب نظر پڑتی تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام نظر سے گزرتا، ان کے مضامین اور افسانے دلچسپی سے پڑھتا، لیکن یہ طالب علمی کا عہد تھا، ان تحریروں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ "ساقی" کے صفحات پر ایک گروپ فوٹو بھی نظر سے گزرا تھا جس میں ڈاکٹر اختر حسین کے علاوہ شاہد احمد دہلوی انصار ناصری، ظفر قریشی وغیرہ کی تصویریں تھیں، لیکن سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے مزاج و معیار اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کا موقع اس وقت ملا جب میں اردو آنرز کے امتحان میں شریک ہونے والا تھا، تنقید کے پرچے کے لیے ان کی انقلاب آفریں کتاب "ادب اور انقلاب" خصوصیت سے مطالعہ میں رہی، اس سے اندازہ ہوا کہ غیر ملکی خصوصاً فرانسیسی تنقیدی عناصر کو اردو ادب میں جس طرح پیش کیا گیا ہے، اس سے ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ اردو تنقید کا دامن بھی مالا مال ہو گیا ہے، ایم۔اے کی تیاری کے سلسلے میں تنقید و ادب سے دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں بھی پڑھیں تاکہ ان کے فکر و فن اور ذہن و زاویۂ نظر کو بہتر طور پر سمجھ سکوں، اس کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ یہ وہی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہیں جنھوں نے "پیام شباب" مرتب کرکے پہلی بار بنگال کے مشہور باغی شاعر قاضی نذر الاسلام کو اردو میں متعارف کرایا اور کالی داس کی شہرہ آفاق کتاب "شکنتلا" کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے کیا، ایک طرف "ادب اور انقلاب" کے مصنف ہیں تو دوسری طرف "محبت اور نفرت" کے مشہور افسانہ نگار اور میکسم گورکی کی "آپ بیتی" کے مترجم بھی۔ لیکن عجیب اتفاق کہ جب برصغیر تقسیم ہو چکا اور میں ایم۔اے پاس کر چکا تو ڈاکٹر صاحب کی جھلک ایک مخصوص مجلس موسیقی میں دیکھی، یونسکو کے جنوب مشرقی ایشیائی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کراچی سے ڈھاکے تشریف لائے ہوئے تھے، اور شاہد احمد دہلوی صاحب جنوبی ایشیا کے دورے سے موسیقی پر لکچر دے کر واپس ہوئے تھے، ہم چند احباب نے ان کے اعزاز میں پروفیسر احمد حسن اشک صاحب کے دولت خانہ محلہ آغا مسیح لین میں ایک مجلس موسیقی کا انتظام کیا، ڈھاکا ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر برادر محترم کلیم اللہ صاحب کی وساطت سے ریڈیو کے مخصوص موسیقار، طبلہ نواز، سارنگی اور ستار کے ماہرین آگئے تھے، اختر صاحب یہیں اپنے قدیم علی گڑھی دوست ڈاکٹر نفیس احمد صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ جغرافیہ ڈھاکا یونیورسٹی کے ساتھ تشریف لائے تھے، نشست کے درمیان جب وقفہ ہوا تو ان سے تعارف ہوا، مجھ سے استفسار کیا کہ آپ کا مشغلہ کیا ہے؟ جب بتایا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نگرانی میں شاد عظیم آبادی پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہا ہوں تو میری طرف کچھ زیادہ متوجہ ہوئے، فرمانے لگے کہ شاد کے بھانجے نواب نصیر حسین خیال کے علمی و ادبی مقالوں کو دستیاب کرنے کی کوشش کیجیے، ان پر ایک اچھا کام ہونا چاہیے پھر وہ کراچی واپس چلے گئے اور میرا تقرر راجشاہی گورنمنٹ ڈگری کالج میں ہو گیا اور میں راجشاہی چلا آیا۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر حسین خطیبی (ایران اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر)

[illegible] تعلیم اور تہران پارلیمان کا ایک وفد آیا۔ ... ایران۔ پاکستان دوستی کو استحکام بخشنے کے لیے پاکستانی طلبا کے لیے فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے بیس وظیفے کا اعلان کیا۔ مشرقی پاکستان سے قرعہ فال میرے نام بھی پڑا، اور ۱۹۶۲ء میں نومبر کی ایک سرد ترین رات کے دو بجے پاکستانی طلبا کے ساتھ تہران کے مہرآباد ہوائی اڈے پر پہنچا، کراچی سے پاکستانی اور ایرانی دونوں ممالک کے دفتروں کے اطلاع دینے کے باوجود پاکستانی سفارت خانہ کا ایک نمائندہ بھی ہوائی اڈے پر موجود نہ تھا، ہم نو وارد ان بساطِ ہوائے دل، ایرانی ہوائی کمپنی کے عملوں سے مخصوص درخواست پر ہوائی اڈے سے جا کر تہران یونیورسٹی کے دبیرخانہ (انتظامی امور) کے بلاک کے سامنے چھوڑ دیئے گئے۔ تہران کی سردیوں میں نہ رہنا، نہ راستوں سے واقفیت، قلی کا پتا نہیں، سامان کون سنبھالے یہ ایسی ناگفتہ بہ اور عبرت ناک داستان ہے جس کی وجہ جواز پاکستانی سفارت خانے کے ثقافتی دفتر کے پاس آج بھی نہیں۔

تین مہینے بعد میری بیگم بھی ایران پہنچ گئیں، آہستہ آہستہ جن اردو والے طبقوں سے واقفیت اور شناسائی بڑھی ان میں حسن صاحب، سلطان احمد صدیقی صاحب اور ان کے پڑوسی فاروقی صاحب کے نام لیے جا سکتے ہیں، سلطان صاحب اور فاروقی صاحب ردولی (یو.پی) کے تھے جو پاکستان اور ایران کی ہوائی کمپنی میں اعلا عہدوں پر تھے اور حسن صاحب کا تعلق مظفر پور (بہار) سے تھا جو ایران کی کسی بڑی تجارتی کمپنی میں حساب دار تھے، اور تمام پاکستانیوں میں سب سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے، ان لوگوں سے روابط استوار ہوئے تو یہ انکشاف ہوا کہ فاروقی صاحب ایک خوش گو شاعر بھی ہیں اور حسن صاحب بہار نیشنل کالج (پٹنہ) میں ۱۹۴۳ء کے دوران میرے رفیق درس تھے، ان حضرات کے یہاں کبھی کبھار دعوتوں میں بھی شرکت ہوتی ۱۹۶۷ء میں ایک مرتبہ حسن صاحب نے خصوصیت سے مجھے مدعو کیا اور یہ بتایا کہ آج ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں، میں بڑے اشتیاق کے ساتھ پہنچا، ڈاکٹر صاحب سے تعارف ہوا تو ڈھاکے کی اس مجلس موسیقی کی یاد دہانی کرائی جہاں کئی سال قبل ہم دونوں مل چکے تھے، انھیں یہ بات یاد آگئی اور پھر وہ کچھ دیر استاد محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کی خیر و عافیت دریافت کرتے رہے، اس کے بعد شاد عظیم آبادی اور نواب نصیر حسین خیال کے بارے میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب کے خیال میں شاد کے عہد میں ان سے بہتر غزل گو نہ تھا، جب وہ ادبی، تنقیدی اور شاعرانہ زاویۂ نظر سے شاد کے کلام پر گفتگو کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ میر سے کر شاد تک کی غزل گوئی کی تاریخ میری نظروں کے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا استدلال اور تجزیہ شاد کی موافقت میں ایسا مضبوط اور مستحسن ہوتا کہ اس سے انکار کی گنجائش ممکن نہ ہوتی، یہی علمی و ادبی گفتگو بعد میں میری اور ان کی قربت کا سبب بنی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خوردی و بزرگی اور عزیز داری سرپرستی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر ایسا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سے موقع بہ موقع ملاقات ہوتی رہی جسے مرزا رفیع سودا کے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے ماہے
صحبت غیر میں گاہے سرِراہے گاہے

میں یونیورسٹی کی کلاسوں اور اپنے تحقیقی کام میں مصروف ہو گیا لیکن جب پاکستانی طلبا میں اجتماعی شعور اور ادبی ذوق بیدار ہوا تو ماہانہ مشاعرے کی طرح ڈالی گئی اور پاکستانی حضرات مقیم تہران میں فاروقی، بدر الدجیٰ، حسن، سلطان احمد صدیقی، برہان کنڈٹ یالی، زیدی، ذکی اور عبد المتین صاحبان جیسے اہل ذوق حضرات باری باری اپنے یہاں نشستوں کا انتظام کرتے رہے، اور تقریباً تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا، خوش قسمتی سے ن۔م راشد صاحب وہاں یونسکو کے ادارۂ نشر و اشاعت کے سربراہ تھے اور مہدی مسعود صاحب (حضرت سراج لکھنوی کے صاحبزادے) سفارت پاکستان میں کاؤنسلر تھے اختر صاحب کے علاوہ ان حضرات کی شرکت سے مشاعروں میں جان پڑ جاتی، لیکن ن۔م۔ راشد صاحب مشکل سے دو بار شرکت کر سکے، آپریشن کے بعد فرشی نشست پر وہ نہیں بیٹھ سکتے تھے، اختر صاحب جب تہران میں موجود ہوتے تو یقیناً تشریف لاتے اور مہدی مسعود صاحب بھی عموماً اپنی شرکت سے مشاعرے کو باغ و بہار بنا دیتے، اختر صاحب کبھی کبھار کسی شعر کی تعریف کر دیتے لیکن مہدی مسعود صاحب کا حافظہ بہت اچھا تھا، انھیں مجاز لکھنوی کا کلام اور طویل نظمیں یاد تھیں، سامعین

ے اصرار پر فرمائش پوری کرتے' صاحب ذوق، سنجیدہ اور بڑے خلیق شخص تھے، عموماً مشاعروں کی صدارت یہی حضرات انجام دیتے اور جلسے کی ترتیب و تنظیم فاروقی صاحب کے ذمے ہوتی' مردوں کے علاوہ خواتین بھی شریک ہوتیں اور یونیورسٹی کی طالبات میں سے ڈاکٹر شمیم ناصر زیدی' ڈاکٹر ممتاز چودھری' ڈاکٹر زبیدہ خانم کی شعر خوانی سے مجلس مشاعرہ رنگین و خوشگوار بن جاتی' طلبا میں ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری' ڈاکٹر صابر آفاقی' ڈاکٹر جعفر حلیم' ڈاکٹر حامد حسین' ڈاکٹر خیال امروہوی' راقم السطور، مستقل ملازمین میں فاروقی صاحب' ذکی صاحب' ڈاکٹر شہریار نقوی' ڈاکٹر محمود الحسن انصاری' سفارت پاکستان کے کلچرل اتاشی سید محمد جعفری اور حسنِ علی شعر خوانی میں حصہ لیتے' زینت مشاعرہ کے لیے دوسروں کا انتخاب شعر کبھی کبھار ڈاکٹر آفتاب اصغر پیش کرتے اور سامعین کے اصرار پر مرتضیٰ موسوی صاحب کلاسیکی انداز میں کسی خاتون کی غزل سناتے جس سے پکے گانے کا لطف آجاتا. پہلی مرتبہ جب ڈاکٹر اختر حسین صاحب شریک مشاعرہ ہوئے اور صدارت کے فرائض انجام دیئے تو میں نے ان کی اجازت سے یہ رباعی پڑھی:

نقادِ ادب' اخترِ کامل آئے ره رو کے رہبرِ منزل آئے
دنیائے ادب جن سے ہے پُرنورِ کلیم وہ مہرِ سخن' رونقِ محفل آئے

چند نشستوں کے بعد ایسا ہوا کہ اختر صاحب اور مہدی مسعود صاحب دونوں ہی نے مشاعرے کو اپنی شرکت سے زینت بخشی' بعض احباب نے غزل سے پہلے قطعے اور بعض نے رباعیاں پڑھیں' جب راقم السطور کی باری آئی تو موقع سے فائدہ اٹھا کر حسب حال فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

یہ شعر و سخن اہلِ ادب کے مابین شاعر کو بھی ملتا ہے ثوابِ دارین
یوں اختر و مسعود بہم ہیں دونوں دراصل جسے کہیے قران السعدین

غزل سے پہلے ابتدا میں رباعی پڑھنے کی قدیم روایت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تہران یونیورسٹی میں اردو زبان وادب کے ایک پاکستانی استاد نے قطعے کی بحروں میں بڑے فخر سے کئی رباعیاں پیش کیں اور طلبا کی طرف سے جنمیں راقم السطور کے علاوہ ڈاکٹر صدیق شبلی' ڈاکٹر مرتضیٰ جعفری وغیرہ نے جب یہ آوازہ بلند کیا کہ واہ کیا بحر رمل میں باعیاں پیش کی ہیں تو بعض اصحاب سمجھ کر مسکرا دئے اور بعض کچھ نہ سمجھے' واہ واہ میں بات آئی گئی ہو گئی' اور دوسرے پاکستانی استاد نے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر جو کتابچہ فارسی زبان میں حاضرین میں تقسیم کرایا اس میں غالب کو حج بیت اللہ اور زیارت قم سے بھی سرفراز فرما دیا جو غالب کے جیتے جی کبھی پوری نہ ہوئی تھی' اللہ غریق رحمت کرے انھیں بھی اور ان کے ساتھ ساتھ غالب کو بھی!

اختر صاحب تہران میں یونسکو کے ادارے کے سربراہ تھے' اپنی سرکاری مصروفیتوں کے علاوہ اکثر و بیشتر حسن صاحب (جو اپریل ۲۰۰۵ء میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو گئے) کے یہاں بلا تکلف بیگم حمیدہ اختر کے ساتھ (اگر وہ تہران میں ہوتیں) تو آ جاتے اور کبھی ان کے پڑوسی فاروقی صاحب کے یہاں۔ انھیں سیخ کباب بہت پسند تھے جسے عام طور پر وہ "بہاری کباب" کہتے تھے اور کبھی تو حسن صاحب سے فرمائش کر کے خاص طور پر تیار کراتے اور دعوت کام و دہن کے بعد لطف اندوز ہوتے' ایسے موقعوں پر عموماً میں بھی ہوتا' حسن صاحب سے اپنی قربت کے علاوہ ان کی بیگم سے ایک جہت اور بھی نکلی کہ بہار کے مشہور نظم گو شاعر عبدالغنی شمس (کرلے پر سرائے) کی وہ صاحب زادی تھیں' اور شمس صاحب پٹنہ میں ہماری طالب علمی کے زمانے میں سینئر شاعر کی حیثیت سے ہم لوگوں کے درمیان موجود ہوتے لیکن ڈاکٹر صاحب خود کھانے کے شوقین نہیں لوگوں کو کھلانے کے بھی شوقین تھے' اور ان کے یہاں مجھے یاد نہیں آتا بلکہ شاید ہی کوئی ایسی دعوت ہوئی ہو جس میں' میں مدعو نہ تھا' ایسا کم دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی دولت کے ساتھ ساتھ' مادی دولت سے بھی نوازا ہو اور اعلا عہدہ بھی عطا کیا ہو اور ایسے شخص کا مزاج و معیار اعتدال پر ہو عجیب اتفاق کہ اس صفت سے مشیت نے اختر صاحب کی بیگم صاحبہ کو بھی یکساں طور پر نوازہ تھا' اور وہ چھوٹے بڑے' اعلا عہدہ دار اور طالب علم میں قطعی کوئی فرق نہ کرتی تھیں' خاندانی وجاہت و امارت کے سلسلے میں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اختر صاحب کے والد انجینیر تھے اور انھیں والدین کی طرف سے اتنی زمین داری ملی تھی جس میں آ ہوگی

کے ساتھ گزارہ ہو سکتا تھا اور ان کی بیگم صاحبہ "نیلی چھتری" واسطہ ظفر صاحب کی صاحبزادی ہیں لیکن دونوں کا مزاج تناسب و توازن اور سادگی و ظرافت کا ایسا نمونہ ہے جس سے دوسروں کو سبق لینا چاہیئے میرے مکان کی نیچے والی منزل میں ٹیلیفون تھا، جب میں کسی ہفتے ڈاکٹر صاحب کے یہاں نہ پہنچتا تو کبھی وہ اور کبھی ان کی بیگم صاحبہ ٹیلیفون پر خیریت دریافت فرماتیں، ایک مرتبہ کئی ہفتے کی غیر حاضری کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میری اہلیہ علیل ہیں تو ایک دن بعد مغرب ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ، میرے دوست حسن صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ میرے یہاں بلا تکلف آ پہنچے، میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ یونسکو کا سربراہ تہران یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے چھوٹے سے کمرے پر آ سکتا ہے اور وہ بھی اس سادگی کے ساتھ کہ پہلے سے کوئی اطلاع نہ دی، ان کے خیال میں مریضہ کی مزاج پرسی اور وہ بھی غیر ملک میں ضروری تھی کہ تنہائی و بے مائگی کا احساس نہ ہو۔ ان کی بیگم صاحبہ تو اور بھی مجھے متہم کرنے لگیں کہ واہ جی، تم نے پہلے کیوں اطلاع نہ دی، کیا ہم لوگ غیر تھے؟ یہ تھا ان کے کردار کا ایک اخلاقی پہلو، ...... تیموری آرٹ پر شرکت کرنے کے بعد غیر ممالک کے دورے سے ہوتے ہوئے جب مالک رام صاحب (ماہر غالبیات) تہران تشریف لائے تو پہلی بار ڈاکٹر عبدالودود اظہر (صدر شعبۂ فارسی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی) کے توسط سے ان کا نیاز حاصل ہوا۔ کئی دن ان کے ساتھ مقامی لائبریریوں کی چھان بین کے بعد جب انھیں معلوم ہوا تو وقت متعین کر کے اختر صاحب سے ملے، ان دونوں کے درمیان جو علمی و ادبی گفتگو ہوئی اس میں خصوصیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کی بعض غیر مطبوعہ تحریروں کا تذکرہ ہوتا رہا، اس موقع پر ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفر آباد کالج کشمیر) بھی میرے ہمراہ تھے، واپسی میں ہم دونوں مالک رام صاحب کو ان کے ہوٹل پہنچا کر واپس آ گئے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ماہر علم، معروف نقاد اور مشہور افسانہ نگار ہونے کے باوجود اتنے خاموش طبع تھے کہ ایران کے اہل علم کو بعد میں ان کی علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ ہوا، اگرچہ وہ ایران کی وزارت اعلا تعلیم سے بھی خیر تھے۔ لیکن کبھی اپنے علم و فن کا پروپیگنڈا یا تذکرہ نہ کرتے، چنانچہ جب سفارت پاکستان نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک پاکستانی دانش ور ہیں تو اس کے ایما سے انجمن ایران و پاکستان کے زیر اہتمام ان کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی جس میں ایرانی دانش ور اور اسکالر بھی تھے، ڈاکٹر صاحب نے اس میں ایران و پاکستان کے قدیم علمی و ادبی اور تاریخی و ثقافتی تعلقات پر اردو میں بڑی سیر حاصل اور بصیرت افروز تقریر کی جس کا ترجمہ ساتھ ساتھ سفارت پاکستان کے مترجم مرتضیٰ موسوی صاحب نے کیا، اس موقع پر ن۔ م۔ راشد صاحب بھی موجود تھے، جب میں نے راشد صاحب اور اختر صاحب سے گذارش کی کہ اجازت ہو تو ایک گروپ فوٹو لے لی جائے تو یہ دونوں حضرات بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ رضامند ہو گئے، اور میرے علاوہ تہران یونیورسٹی کے دو اور طالب علم شبیر اختر صاحب (مقیم تہران) اور ڈاکٹر جعفر حلیم (شعبۂ فارسی گلگٹ کالج) بھی اس گروپ میں شریک ہو گئے، ڈاکٹر صاحب کی کتاب "گرد راہ" میں یہ گروپ فوٹو یادگار تہران کے طور پر شامل ہے۔ اس تقریب کی تفصیلی اطلاع جب ایران کے اخبارات میں آئی تو پھر کیا تھا، رفتہ رفتہ ایرانی اسکالر اختر صاحب سے کبھی ملتے اور کبھی ان کے گرد جمع ہو جاتے۔

تہران یونیورسٹی کے ڈین آف لیٹرز اور تاریخ ادبیات ایران کے مشہور محقق استاد محترم ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا اور غیر ملکی طلبا کے سرپرست اور شعبۂ فلسفہ اور تاریخ ادیان کے صدر ڈاکٹر سید حسین نصر کو بھی ڈاکٹر صاحب کے دولت خانہ پر دیکھا، دونوں نے اپنی اپنی تصانیف انھیں پیش کیں اور ایران و پاکستان کے علمی و ادبی مسائل پر بھی گفتگو کی، ڈاکٹر صاحب کو فارسی بولنے کی مشق نہ تھی لیکن فرانسیسی اور انگریزی زبانیں ڈاکٹر اختر حسین، ڈاکٹر صفا اور ڈاکٹر نصر کے درمیان افہام و تفہیم کا مشترک ذریعہ نکلیں، گفتگو بڑے اچھے اور سنجیدہ ماحول میں ہوتی، ایرانی اسکالروں میں فلسفۂ اسلام اور تاریخ ادیان پر موجودہ سائنسی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ ڈاکٹر سید حسین نصر نے کام کیا ہے، اسی زمانے میں ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں انگریزی زبان میں غیر ممالک کے مختلف معتبر اداروں سے شائع ہو چکی تھیں

ڈاکٹر صفا نے یونسکو کی فرمائش پر فارسی شاعری کا انتخاب تین جلدوں میں "گنج سخن" کے نام سے فارسی اور فرانسیسی میں شائع کیا تھا، جب یہ کتابیں اختر صاحب کو پیش کیں تو ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوے ڈاکٹر صاحب نے ان سے سوال کیا کہ حسن دہلوی، امیر خسرو دہلوی کو آپ حضرات لائق توجہ سمجھتے ہیں، قیام پاکستان کے بعد اقبال کو بھی ایران نے وہ اہمیت دی جو اس سے قبل انھیں نہ دی گئی تھی لیکن مرزا غالب دہلوی کو وہ مرتبہ کیوں نہ دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا آپ حضرات سمجھتے ہیں کہ وہ اردو زبان کا بہت بڑا شاعر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فارسی شاعری کے بارے میں خود اعتراف کرتا ہے کہ:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

پھر غالب کی شاعری پر دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی، ڈاکٹر صفا نے یہ صفائی پیش کی کہ انھوں نے اپنے انتخاب میں غالب کو شریک کیا ہے لیکن اختر صاحب نے بتایا کہ ایک دو صفحے کا انتخاب مع سوانح حیات غالب کے شایان شان نہیں۔ اس سلسلے میں اختر صاحب نے ایک اہم اور دلچسپ سوال صفا صاحب سے یہ کیا کہ نویں صدی ہجری کے غزل گو عبدالرحمٰن جامی کے بعد کیا ایران نے غالب جیسا کوئی غزل گو تقریباً تین صدی کے عرصے میں پیدا کیا ہے جس کی شاعری مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے؟ ڈاکٹر صفا خاموش ہو رہے اور اختر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی کتاب سے ایران کی نمائندگی تو ہو جاتی ہے لیکن برصغیر پاک و ہند کی فارسی شاعری کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس گفتگو کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے برادر محترم مظفر حسین شمیم صاحب کو بہ اصرار آمادہ کیا اور انھوں نے برصغیر کے فارسی گو شاعروں کا انتخاب مع سوانح حیات ایک سال کی مدت میں ترتیب دے دیا، اور یہ کتاب ایران سے "شعر فارسی در ہند و پاکستان" کے عنوان سے شائع ہو گئی، اختر صاحب کا اصل مطمح نظر یہ تھا کہ شعر و ادب کا بالغ نظری سے جائزہ لیا جائے اور ہر قابل ذکر شاعر و ادیب کو اس کا جائز مقام دیا جائے، اشعار کے انتخاب کا معاملہ تو ذاتی پسند و ناپسند پر ہے شمیم صاحب نے اسی کتاب پر اردو زبان میں مقدمہ لکھا تھا، ایک دن اختر صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ یہ مقدمہ لے جا کر غور سے پڑھوں اور انھیں اپنی رائے سے آگاہ کر دوں، پھر اس کا ترجمہ فارسی میں کر دوں تاکہ اہل ایران اسے سمجھ سکیں، میں مقدمہ لے تو آیا، دوبارہ، سہ بارہ پڑھ کر کچھ نشانات لگائے اور کچھ یادداشتیں نوٹ کیں لیکن یہ خیال ذہن کو بار بار کریدتا رہا کہ میری یہ رائے اختر صاحب کے بڑے بھائی کے افکار کے متعلق ہے بعض لوگوں کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے افکار پر کسی قسم کی تنقید سننا گوارہ نہیں کرتے، میں بار بار کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح خوش اسلوبی سے اسے ٹال دوں لیکن کوئی معقول اور مناسب صورت نظر نہ آئی، آخر ایک دن ڈرتے ڈرتے مقدمے کا مسودہ لے کر اختر صاحب کے یہاں پہنچا، ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے دریافت فرمایا کہ اب تک میں نے مقدمے کا مطالعہ کیا یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ مطالعہ تو کر چکا ہوں لیکن معلوم نہیں آپ میرے خیال سے متفق ہو سکیں گے یا نہیں، میرے انداز بیان میں پس و پیش تھا، انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ آپ اپنے خیال کا اظہار بلاتکلف کیجیے، پھر ہم دونوں اس پر غور کریں گے اور جو مناسب صورت ہو گی اسے اختیار کریں گے، میں نے زیر بحث حصوں کو ان کے سامنے پڑھا، بعض حصوں کو حذف کر دینے کی سفارش کی اور بعض جگہ کچھ اضافے کا خیال پیش کیا، میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بالغ نظر ناقد و مورخ ہونے کی حیثیت سے ہر جگہ مجھ سے اتفاق کیا اور میری سفارش پر آمادہ ہو گئے، پھر ترمیم و اضافے کے بعد میں نے اس مقدمے کا فارسی میں ترجمہ کر دیا، اس سلسلے میں سب سے اہم بات جس کی طرف میں نے اشارہ کیا وہ یہ تھی کہ اس انتخاب میں بنگال کے فارسی شعراء کی نمائندگی نہیں ہوتی، ڈاکٹر صاحب میرے اس خیال سے بھی پورے طور پر متفق ہو گئے اور فرمایا کہ ممکن ہو تو اس میں یہ کمی پوری کر دی جائے، لیکن میرے لیے دشواری یہ تھی کہ میرے پاس خاطر خواہ مواد نہ تھا، غرض کمی پوری نہ ہو سکی، اور کتاب ناشر کے حوالے کر دی گئی ۱۹۶۸ء میں جب میری ملاقات کراچی میں ڈاکٹر صاحب سے ہوئی تو از راہ لطف و کرم اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے

حاصل ہوا! اس کا ردعمل یہ ہوا کہ تہران سے واپسی کے بعد میں نے بنگلا دیش یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی فرمائش پر "سخنوران فارسی در بنگلا دیش" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر دی لیکن چوں کہ یہ فارسی زبان میں ہے اس لئے اس کی اشاعت کی نوبت ہنوز نہ آسکی۔

ڈاکٹر صاحب کی ادبی و تنقیدی حیثیت کے تعارف کے بعد اس سے متعلق فارسی میں ان پر کچھ مضامین شائع ہوئے اور ان کے بعض افسانوں کے تراجم بھی چھپے، اور اس طرح ایرانی اسکالروں کے حلقوں میں ان کا خاطر خواہ استقبال کیا گیا' ایرانی اسکالروں سے تاریخ کے موضوع پر جب انھیں گفتگو کرتے سنتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کا حافظہ کس قدر قوی اور رواں ہے کہ مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ بعض تاریخوں کی خامیوں پر بھی ان کی نظر گہری تھی اور وہ غیر مستند تاریخوں کو اپنی گفتگو کے درمیان رد کر دیتے تھے' یہ بات میرے لیے اور بھی باعث حیرت تھی کہ تہران یونیورسٹی میں سیاسی' ادبی اور ثقافتی تاریخ کے مین بحیثے ہم لوگوں کو الگ الگ پڑھائے جاتے تھے لیکن ایران کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی دسترس حیرت انگیز حد تک تھی' بعض واقعات کے تو سال وقوع بھی ڈاکٹر صاحب بڑی آسانی سے حوالے کے طور پر پیش کرتے تھے اور مزید برآں ہند و پاکستان و ایران کی تاریخ و ثقافت کا تقابلی مطالعہ اور اس پر گفتگو اور بھی دلچسپ ہوتی تھی' وہ جس قدر خاموش طبع تھے اس سے کبھی میں نے یہ اندازہ نہ لگایا تھا۔

جب میرے متعلقین ۱۹۶۸ء کے آخر میں واپس ڈھاکے چلے آئے تو میں تنہا رہ گیا اور کوشش یہ تھی کہ اپنا کام جلد ختم کر کے واپس آجاؤں' اتفاق سے ان کے متعلقین بھی کراچی آگئے تھے' ان کا مکان کافی بڑا اور تربیت یافتہ باورچی تھا' انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ میرے یہاں چلے آئیے' تنہا قیام و طعام اور اخراجات کے بارے نجات مل جائے گی اور ہم دونوں فرصت کے اوقات میں کچھ ادبی گفتگو کر لیا کریں گے' لیکن برابر میں نے ان کی پیش کش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ عذر پیش کیا۔ آخرکار یہ طے پایا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ تعطیل کے دن دوپہر یا رات کا کھانا انھیں کے یہاں کھاؤں گا۔ میں گھنٹہ دو گھنٹہ قبل پہنچ جاتا بہت سارے ادبی و سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی' ایران کے دستور کے مطابق پہلے تو ڈاکٹر صاحب خشک میوے میز پر منگوا لیتے پھر مختلف قسم کی شرابوں کی بوتلیں جو انھیں یونسکو کے کوٹے میں مہمانوں کی تواضع کے لیے ملتی تھیں' پھر سوڈا' پھر برف کے ٹکڑے' انھیں کی صحبتوں میں شرابوں کے جتنے نام میں نے سیکھا اور ان کی کیفیت و ماہیت سے واقفیت ہوئی' اس سے پہلے کبھی زندگی میں ایسا موقع نہ آیا تھا' پینے پلانے کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب ذرا آزاد خیال ہیں' کبھی کبھار اپنے صاحبزادے کو بھی اپنے ہاتھ سے تیار کر کے ایک گلاس بڑھا دیتے' ایک بار جب میں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو فرمانے لگے کہ گھر میں یہ ساری چیزیں موجود رہتی ہیں' اگر انجانے میں اس نے شراب' سوڈے اور برف کا تناسب برقرار نہ رکھا تو نتیجہ خطرناک ہوگا' اس لیے موجودگی میں کبھی کبھار تربیت ضروری ہے تاکہ اس کی نوبت آئے تو صحت پر برا اثر نہ پڑے' جب میں بیگم اور بچے کے ساتھ ہوتا اور کچھ کھانے پینے کے لیے تیار نہ ہوتا تو اختر صاحب کی بیگم صاحبہ خود باورچی خانے میں جا کر دو پیالیوں میں ہم دونوں کے لیے مرغ کی یخنی لے آتیں اور بڑی سادگی سے یہ تقاضا کرتیں کہ اچھا' چلو کچھ نہ کھاؤ' کم از کم یہ یخنی تو پی لو۔ تم تو یوپی کے نہیں پھر اتنا تکلف کیوں کرتے ہو' اور مجبوراً ان کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ چلیے آج "رکابی رستوراں" میں دوپہر کا کھانا کھائیں' سنتے ہیں بڑا صاف ستھرا انتظام ہے اور لذیذ "چلو کباب" کھلاتا ہے' ڈاکٹر صاحب کے مکان سے قریب ہی یہ رستوراں ایک گلی میں تھا' ہم دونوں ٹہلتے ہوئے پہنچے' واقعی اچھا خاصا انتظام تھا۔ ایک بڑے ہال میں کوئی بیسیوں میزیں لگی ہوئی تھیں' ہماری فرمائش کے مطابق چلو کباب کی دو پلیٹیں آگئیں اس کے ساتھ اچار اور چٹنی بھی تھی جو عموماً دوسرے رستوراں میں نہیں دیتے چھری کانٹے ایک پلاسٹک کے پیکٹ میں لائے گئے معلوم ہوا کہ اسٹیرلائز کئے ہوئے ہیں' ہم لوگ جب پہنچے تو صرف ایک میز پر دو شخص تھے' دیکھتے ہی دیکھتے تمام میزیں بھر گئیں' تقریباً ساٹھ ستر فیصدی غیر ملکی کھانے والے تھے بقیہ ایران کے اونچے طبقے کے نمائندے۔ جب بل آیا تو ۲۵ تومان ہوئے

عام طور سے اچھے اوسط ریستوراں میں بھی فی کس دس تومان سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔

باہر سے آنے والے حضرات اگر انھیں علم ہوتا کہ اختر صاحب تہران میں ہیں۔ تو ان سے ضرور ملنے آتے اس میں قدر مشترک ان کی سرکاری حیثیت نہ ہوتی بلکہ علم و ادب اور پرانے تعلقات کو دخل ہوتا، برصغیر کے مشہور مورخ اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی مصر اور ترکی کا دورہ کرنے کے بعد جب ایران پہنچے تو کئی دن یہاں ان کا قیام رہا جب انھیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق معلوم ہوا تو میرے ساتھ ان سے ملنے گئے، عجیب اتفاق کہ دانی صاحب بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کے سند یافتہ تھے اور اختر صاحب نے بھی وہاں سے ساہتیہ النکار (سنسکرت ایم۔ اے کے مساوی) پاس کیا تھا' تاریخ سے بات شروع ہوئی تو آثار قدیمہ تک یہ سلسلہ جاری رہا' ان کا تحفظ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور حکومت اس باب میں کیا کر رہی ہے اور یونسکو کا ادارہ کیا کچھ تعاون کر سکتا ہے' جب یہ موضوع ختم ہو گیا تو سنسکرت ادب پر گفتگو شروع ہوئی اور بنارس یونیورسٹی کی پرانی یادوں کو دونوں حضرات تازہ کرتے رہے۔

ایک مرتبہ ابن انشا صاحب کراچی سے کسی سرکاری دورے پر ایران پہنچے ایران شہر میں سفارت پاکستان کے قریب ایک ہوٹل میں قیام کیا' سب سے پہلے ڈاکٹر اختر حسین صاحب کی ملاقات کے لیے ... ... ان کے یہاں گئے' ڈاکٹر صاحب نے مجھے اطلاع بھجوائی لیکن میں پاکستان کے سفارت خانے گیا ہوا تھا' ابن انشا صاحب کے متعلق وہیں اطلاع مل گئی' واپسی میں سر راہ ان کا ہوٹل تھا' دریافت کیا تو موجود نہ تھے' ٹیلیفون نمبر چھوڑ دیا' جب واپس قیام گاہ پر پہنچا تو میرے قدموں کی آہٹ پاتے ہی خاتون خانہ نے بلا کر کہا کہ تمہارا ٹیلیفون ہے' کوئی پاکستانی صاحب تمہارا نام لے رہے ہیں' ان کی بات سمجھ میں نہ آ سکی ہندی بول رہے ہیں یا فارسی' میں نے ٹیلیفون اٹھایا تو ابن انشا صاحب تھے' انھیں بھی شکایت تھی کہ ان کی فارسی مالک خانہ کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی' بہر کیف شام کو ملنے کا وقت طے ہو گیا' میں اپنے دوست شبیر اختر صاحب کے ساتھ ان کے ہوٹل پہنچا' وہاں آر سی ڈی کے ایک افسر خالد صاحب بھی تھے جو بعد میں وزارت تعلیم و ثقافت کے ڈپٹی سکریٹری متعین ہوئے، شبیر صاحب نے ہم سبھوں کو دوپہر کے کھانے پر دوسرے دن مدعو کیا اور سازمان برنامہ "پلاسکو" کی سب سے بالائی منزل پر لے گئے جہاں سلف سروس ریستوراں تھا، بڑے سکون کی جگہ تھی بیٹھے بیٹھے کھائیے اور تمام تہران کے مناظر بھی دیکھیے' انشا صاحب نے شبیر صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں آتے ہی انھوں نے شبیر صاحب کے نام ایک خط ڈاک کے حوالے کیا ہے کہ مجھ سے ملیے' لیکن یہ خط شبیر صاحب کو نہ ملا۔ کئی دن بعد یہ خط شبیر صاحب کو ملا اور اسی دن ابن انشا صاحب رخصت ہونے والے تھے' شبیر صاحب نے بتایا کہ ابن انشا صاحب نے لفافے پر "مقامی" (local) لکھ دیا تھا' اس لیے تاخیر ہوئی' ایران کی موجودہ فارسی میں "شہری" لکھتے ہیں' واپسی کے بعد ابن انشا صاحب نے اپنے اخباری کالم میں ایرانی ڈاک اور تار کی تساہلی کا تذکرہ کیا اور اس کا ردعمل یہ ہوا کہ پاکستانی سفارت ایران کے کلچرل آتاشی ناخوش ہو گئے کہ دونوں ملک کے تعلقات پر اس کا اثر پڑے گا۔ ان افسر صاحب کا نام "محمد عثمان" تھا۔ جب ان کا تقرر ایران میں ہوا تو اختر حسین صاحب نے بڑی سنجیدگی سے لیکن مسکراتے ہوئے پاکستان کی وزارت تعلیم کی غیر دانش مندی پر نکتہ چینی کی کہ ایران ایک شیعہ ملک ہے' کم از کم ایسے شخص کو یہاں بھیجتے وقت مذہبی رجحانات کا تو خیال کرنا چاہیے تھا' کیوں کہ کلچرل شعبے کا تعلق زیادہ تر پبلک سے ہے۔ لیکن ان نزاکتوں پر کون غور کرتا ہے؟ میرے خیال میں جعفری صاحب کی بہ نسبت عثمان صاحب زیادہ کامیاب رہے۔ اپنے کاموں میں بڑے سرگرم تھے۔

ایک دن جب ڈاکٹر صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ سفارت پاکستان کے افسروں سے ملتے جلتے آپ کو نہیں دیکھتا' فرمانے لگے اول تو ان لوگوں میں شعر و ادب کا مذاق نہیں اور دوسرے یہ کہ وہ ہمیشہ انگریز کے سامان اور کسٹم فری چیزوں کی گفتگو کرتے ہیں اور یہ نقطہ نظر کارفرما رہتا ہے کہ مالی منفعت کس طرح ہو سکتی ہے اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں' کبھی کبھار سفیر صاحب اور کاونسلر صاحب کے یہاں خصوصی دعوتوں میں اصولاً اور اخلاقاً چلا جاتا ہوں۔

کبھی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا تذکرہ آجاتا تو

اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے ساتھ اپنے قیام کی تفصیل، انگریزی اردو لغت کی تدوین، مولوی احتشام الحق صاحب (شان الحق حقی کے والد بزرگ وار) اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ دلی) کے کمروں اور مصروفیتوں کا حال بیان کرتے، انھوں نے فرمایا کہ میرے بی۔ اے پاس کرتے ہی مولوی صاحب نے پروفیسر رخیہ احمد صدیقی کو ایک خط لکھ کر مجھے اورنگ آباد بلوالیا اور میں مولوی صاحب کے معاون کی حیثیت سے انجمن کے کاموں میں شریک ہوگیا، ایک دن علامہ اقبال کا تذکرہ آیا تو ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ مجھے ان کے بعض بنیادی خیالات سے اختلاف تھا، اس موضوع پر ایک مقالہ لکھ ڈالا جس کی اشاعت مولوی صاحب کے رسالہ اردو میں ہوئی، بعض ادبی حلقوں میں بڑی چہ می گوئیاں ہوئیں، ۱۹۳۶ء میں "جشن حالی" پانی پت میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا گیا تو میں بھی مولوی صاحب کے ساتھ گیا، چوں کہ اس جشن کے روح رواں مولوی صاحب تھے، اس لیے اسٹیج سکریٹری کے فرائض مجھے انجام دینے پڑے، جب علامہ اقبال تشریف لائے تو مولوی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہیں اختر حسین رائے پوری، وہی نوجوان جنھوں نے "اردو" کی ایک اشاعت میں آپ کے خیالات پر تنقید کی ہے، علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں ایسے نوجوانوں کی قدر کرنا چاہیے۔ یہ مضمون میری نظر سے گزرا ہے، اسی طرح ایک دن مولوی عبدالحق صاحب کی ذاتی پسند و ناپسند کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مولوی صاحب کے ان معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا، ان کے مزاج میں گویا ایک طرح کی جاگیر دارانہ انانیت تھی، وہ اپنی جیسی کسی کی پروا کیے بغیر کر گزرتے تھے جب میں نے استفسار کیا کہ مثال کے طور پر کوئی واقعہ بیان کیجیے تو فرمانے لگے کہ جب میں حکومت پاکستان میں شعبۂ تعلیم کا ڈپٹی سکریٹری تھا تو ترقی اردو بورڈ، اردو لغت بورڈ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے منصوبے بنائے جسے حکومت نے منظور کر لیا اور مولوی صاحب نے بھی پسند فرمایا، پھر کہنے لگے کہ مولوی عبدالحق صاحب کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اعزازی پروفیسر تھے، انھوں نے اپنی مصروفیت اور ضعیفی کی بنا پر یونیورسٹی کو مجبور کیا کہ اردو کے پروفیسر کی اسامی پر کسی معقول شخص کا تقرر کر کے انھیں اس ذمہ داری سے سبک دوش کر دیا جائے۔ چنانچہ اردو کے پروفیسر کے انتخاب کے لیے جب کمیٹی بیٹھی تو اس میں وائس چانسلر کے علاوہ مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور چند دیگر حضرات بھی تھے، امیدواروں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر سجاد (سابق اردو پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی) اور چند دیگر حضرات تھے انٹرویو کے بعد جب یہ گفتگو شروع ہوئی کہ کس کا تقرر ہونا چاہیے تو مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ ان کی رائے میں ڈاکٹر عبادت سے بہتر اور کوئی امیدوار نہیں، اس پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کہا کہ یہاں وفاقی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی پروفیسر شپ اور صدارت کا سوال ہے، یہ اسامی کسی سینیر اور اہل شخص کو دینی چاہیے مثلاً ڈاکٹر سجاد صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے ہی پروفیسر کے عہدے پر مامور رہ چکے ہیں اور یونیورسٹی کے اعلان کے مطابق سند یافتہ بھی ہیں حیدرآباد کے قیام کے زمانے ہی سے مولوی صاحب سجاد صاحب سے ناخوش تھے اس لیے انھوں نے بڑے تند و مد سے ان کی مخالفت کی، ایسا محسوس ہوا گویا یہ نزاع مولوی صاحب اور شادانی صاحب کے درمیان شروع ہوگیا، شادانی صاحب نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عبادت صاحب ڈاکٹر بھی ہیں اور صاحب تصانیف بھی لیکن وہ پنجاب یونیورسٹی میں سینیر لیکچرار ہیں جو شخص سال دو سال ریڈر بھی نہ رہ چکا ہو اسے یک بہ یک کس طرح لیکچرار سے پروفیسر کے عہدے پر مامور کیا جا سکتا ہے، ہماری یونیورسٹیوں میں یہ دستور نہیں، مزید یہ کہ عبادت صاحب کی عمر کا جو تقاضا ہے وہ ریڈر سے زیادہ کی اسامی پر متعین نہیں کیے جا سکتے، یہاں یونیورسٹی اور عہدے کے وقار کا سوال ہے، مولوی صاحب کافی برہم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ تو میں چلا، آپ ہی لوگ فیصلہ کیجیے، دوسرے ممبروں نے گزارش کی کہ مولوی صاحب تشریف رکھیے، آپ بزرگ اور صدر شعبہ ہیں، آپ کے بغیر ہم لوگ کس طرح فیصلہ کر سکتے ہیں دوسرے ممبروں کی بھی رائے لی جائے، گفتگو جب آگے بڑھی تو مولوی صاحب نے ڈاکٹر اختر حسین صاحب سے دریافت کیا کہ تم تو حکومت کے

بنے ہوا در تعلیم یافتہ بھی، تمہاری کیا رائے ہے؟" مولوی صاحب کو یقین کامل تھا کہ اختر صاحب سے ان کے جو دیرینہ تعلقات ہیں ان کی بنا پر وہ مولوی صاحب کے حق میں اپنی رائے دیں گے لیکن جب اختر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا کہ عبادت صاحب کی اہلیت سے میں بھی واقف ہوں ان کی تحریریں نظر سے گزرتی ہیں لیکن عمر اور تجربے کا یہ تقاضا نہیں کہ انھیں یکجا ر سے براہ راست پروفیسر بنا دیا جائے میرے خیال میں ڈاکٹر شادانی کی رائے صائب اور متوازن ہے۔ اس پر مولوی صاحب ایسے برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم سے یہ توقع نہ تھی، تم بھی شادانی صاحب کے ہم نوا ہو گئے، تو پھر میری موجودگی کا یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے۔ کہ میں کسی قسم کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہیں اور مجلس انتخاب کسی فیصلے کے بغیر ختم ہو گئی، دراصل جب ڈاکٹر عبادت بریلوی دلی کالج میں تھے اور انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے منتقل ہو کر دریا گنج دلی آ گیا تھا تو اس وقت عبادت صاحب انجمن کے کاموں میں مولوی صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے اور دونوں میں تعلقات بہت استوار ہو گئے تھے بعد میں پھر دونوں پاکستان چلے آئے، مولوی صاحب کا خیال تھا کہ عبادت صاحب کراچی آ جائیں گے تو ممکن ہے کہ انجمن کے معاملات میں بھی ان کا تعاون حاصل ہو جائے۔ گویا مولوی صاحب اپنے تعلقات کی بنا پر اپنی کمزوری پر پردہ نہ ڈال سکے اور ان کی ذاتی پسند ایک طرف ڈاکٹر عبادت کی موافقت میں اور دوسری طرف ڈاکٹر سجاد صاحب کی مخالفت میں جاگیردارانہ انانیت کی صورت میں ابھر آئی، یہ تھا مولوی عبدالحق صاحب کے کردار کا مطالعہ ڈاکٹر اختر حسین کے الفاظ میں۔

قیام ایران کے زمانے ہی میں ان کے پاس رسالہ "اوراق" (لاہور) پہنچنے لگا اور ان کے قدیم شاگرد عارف عبدالمتین صاحب کے تقاضے ہونے لگے کہ ڈاکٹر صاحب ان کے لیے کچھ لکھ دیں۔ موضوع کی تلاش تھی اسی زمانے میں مولوی عبدالحق کا "چڑیا خانہ" کے عنوان سے نہایت دلچسپ مضمون سپرد قلم فرمایا اور جب "اوراق" میں چھپ کر آ گیا تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیا۔

ایران میں ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک بین الاقوامی امر کی تھی، وہ یونسکو کے سربراہ تھے، ان کا دفتر ایران شہر میں پاکستا[ن] سفارت خانے کے قریب تھا جب میں سفارت خانہ جاتا تو ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں بھی حاضری دیتا، سرکاری اصول کے مطاب[ق] ان کی سکریٹری خاتون سے دریافت کرتا کہ وہ مصروف تو نہیں ہیں، وہ میرا نام پوچھتی اور انھیں اطلاع دے آتی، وہ کبھی فوراً بلا لیتے اور کبھی پانچ دس منٹ بعد کام سے فارغ ہو کر۔ کافی چائے سے تواضع فرماتے، کچھ دیر اردو، فارسی ادب یا پاکستان[ی] مسائل پر گفتگو ہوتی، اور میں جب واپسی کے لیے اجازت چاہت[ا] تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کر سیڑھیوں تک مجھے رخصت کرنے آتے، انتہائی معذرت کے باوجود کہ وہ کیوں زحمت کر رہے ہیں فرماتے کہ آپ میرے مہمان ہیں نا۔ ایسے اخلاق کا مظاہرہ سفارت پاکستان کے کسی فرد کی طرف سے کبھی نہ ہوا، وہ لوگ ڈاکٹریٹ کلاس کے ریسرچ اسکالر کو مدرسے کے طلبا سے زیادہ اہمیت دیتے تھے، خصوصاً ہمارے کلچرل اتاشی سید محمد جعفری صاحب تو گو معطل ہو چکے تھے، پاکستانی طلبا، کی سرگرمیوں سے متعلق مخبری کا کام ان کے بڑے صاحب زادے کرتے تھے، جب تک میں بار[ہا] رہا پاکستانی طلبا کے اعزاز میں انھوں نے ایک دعوت تک نہ کی اور نہ تہران یونیورسٹی کے استادوں کو مدعو کر کے ہمارا ان سے تعارف کرایا جس کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی اور جس کے لیے ماہانہ الاؤنس سرکاری طور پر انھیں ملتا تھا، البتہ وزارت فرہنگ و ہنر میں پاکستانی طلبا کے متعلقہ افسر علی اکبر جعفری صاحب نے پاکستانی طلبا کے ساتھ ایسا مخلصانہ، شریفانہ اور ہمدردانہ سلوک کیا جسے بیس سال گزرنے کے باوجود بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلے کی ایک دلچسپ کڑی اور یاد آ گئی یعنی ۵۵۰ کے مرکزی دفتر میں جو دعوتیں ہوتی تھیں ان میں صرف ایرانی اور ترکی طلبا بلائے جاتے تھے، ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ آپ لوگوں کو وہاں نہیں دیکھا، میں نے جواب دیا دعوت نہ تھی جس صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت پر دو ذمہ دار افسروں نے جس کا

تعلق نہ ہو سکی۔ ڈی سے تھا بطورِ شکایت پوچھا کہ ایرانی اور ترکی طلبا، سالانہ دعوتوں میں آتے ہیں، آپ پاکستانی طلبا کیوں نہیں آتے، کچھ بے تکلفی ہو گئی تھی، میں نے طنزاً کہا، جناب والا دعوت کے بغیر آپ ہم سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں، وہ دونوں کہنے لگے کہ ہر سال پاکستانی صاحب کے دعوت نامے ہم لوگ پاکستانی کلچرل اتاشی کو بھجوا دیتے ہیں، ایسی صورت میں ہمیں یقین رہتا ہے کہ کوئی طالب علم نہ چھوٹے گا۔ ہم لوگوں نے بڑی بے چینی سے پتہ لگایا تو بات سچ نکلی، پھر ایک دن ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ سفارت خانے کا کارنامہ سنئے، فرمانے لگے کہ یہاں ملک اور طلبا کے وقار کا سوال ہے کلچرل سیکشن کو ایسا نہ کرنا چاہئے، گویا دو سال تک ہم لوگ جعفری صاحب کے طفیل دعوتوں سے محروم رہے، اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ایک بار ماہانہ مشاعرے کی نشست میں میں نے ایک قطعہ پڑھ دیا، اتفاق سے مہدی مسعود صاحب کاؤنسلر (جو آجکل کہیں سفیر ہیں) اور ڈاکٹر اختر حسین صاحب بھی موجود تھے، اس دن ہمارے ایک ساتھی سید سبط حسن رضوی صاحب کو ڈاکٹریٹ ملی تھی، کسی کو غلط فہمی ہوئی کہ ان پر چوٹ ہے اور کوئی شکوک نظروں سے دیکھنے لگا کہ سفارت پاکستان پر طنز ہے، تقریباً آٹھ دس مہینے بعد سفارت پاکستان کے خفیہ ذرائع سے معلوم ہوا کہ انھوں میرے اس طنزیہ قطعے کی چھان بین ہوتی رہی کہ اس کا نشانہ کون ہے لیکن سفارت کو مایوسی ہوئی۔ لیجئے آپ بھی اس قطعے سے لطف اندوز ہو لیجئے۔

ڈاکٹر بننے سے کچھ حاصل نہیں ۔۔۔ گرچہ ہے ہر شخص عاقل و فہیم
کوک ٹیلوں کے لیے ہیں اور لوگ ۔۔۔ شعر پڑھنے کے لیے ہم ہیں کلیم

فروری ۱۹۶۶ء میں میری واپسی کے موقع پر پاکستانی طلبا نے مجسمہ شاہ رضا کے قریب ایک چھوٹے سے رستوراں میں عشائیہ کا انتظام کیا، ڈاکٹر صاحب کو اسی دن دوپہر کے بعد اطلاع دی گئی لیکن وہ اپنی تمام تر سادگی اور شائستگی کے ساتھ بروقت تشریف لے آئے، یہ بھی نہ سوچا کہ یہ رستوراں ان کے معیار و وقار کے شایانِ شان ہے کہ نہیں، پاکستانی طلبا، بہت خوش ہوئے اور ان کی تشریف آوری کا خصوصیت سے شکریہ ادا کیا اور میں ڈاکٹر صاحب کے خلوص و سرپرستی کا قائل ہو گیا۔

ایک دن ایران اور برصغیر کی فارسی شاعری پر بات چل نکلی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آج تک "سبک ہندی" پر ایران کی نظر سے کوئی سیر حاصل مقالہ نہیں گزرا، آپ وطن پہنچ کر ایک خیال انگیز اور مدلل مقالہ اس موضوع پر لکھئے تاکہ ایرانی اسکالر بھی اب تک برصغیر کی فارسی شاعری کے جن اہم نکات اور نازک خیالات کو محض تصنع سمجھتے ہیں اس کے قائل ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مشورہ مجھے پسند آیا اور اس کی تکمیل کا خیال بھی دامن گیر رہا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ مثل مجھ پر صادق آئی کہ "سر منڈاتے ہی اولے پڑے" ابھی رہنے سہنے کا ٹھکانہ اطمینان بخش طور پر نہ کر پایا تھا کہ ۱۹۷۱ء خون کا دریا بہنے لگا، انسانی زندگی کی قدر و قیمت ایسی اور اتنی ارزاں ہو گئی کہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اس شعر کی تعبیر تصویر بن کر گھومنے لگی:

آبادیاں تو دیکھیں، بربادیاں بھی دیکھو
کیا کیا حسین گلشن کانٹوں میں ڈھل گئے ہیں

اس وقت ڈاکٹر صاحب تہران سے منتقل ہو کر یونسکو کے ہیڈ کوارٹر پیرس میں مامور تھے، میرے ایک بنگالی دوست متعینہ پیرس کے ذریعے میری خیر و عافیت دریافت کی کیوں کہ اس وقت کون زندہ تھا اور کون مردہ اس کی اطلاع ملک کے باہر کیا ملک کے اندر بھی مشکل ہی سے پہنچتی تھی، ان کے اخلاق اور محبت کا تقاضا دیکھئے کہ جب ان کی کتاب "گردِ راہ" شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھجوا دیا۔ کچھ دنوں سے ان کی آنکھیں پڑھنے لکھنے کا کام کے لائق نہیں ہیں لیکن موقع نکال کر وہ مجھے یاد کر ہی لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے، آمین!

• • •

غزلیں

اعزاز افضل
۹۵، بودر چیت پور روڈ، کلکتہ

اک تو ہے سو بیگانہ، جب چاہے برا چاہے
اک دل ہے سو دیوانہ، کیا اپنا بھلا چاہے

مقصودِ سفر اپنا گیسو ہے نہ دامن ہے
خوشبو کی وہی منزل، جو بادِ صبا چاہے

یہ شوق کا مقتل ہے، وہ عقل کی دلدل ہے
اب آگے تری مرضی جس سمت چلا چاہے

ذرّوں کا سمٹنا کیا، ذرّوں کا بکھرنا کیا
وہ طرزِ عمل اپنا، جو موجِ ہوا چاہے

اس موسمِ گل تک ہے، میعادِ اسیری کی
کھلتا ہے درِ زنداں، اب کے جو خدا چاہے

کوسوں کی تھکن اس پر یہ شرطِ سبک گامی
معتوبِ سفر ٹھہرے، رکنا جو ذرا چاہے

وہ پھول توجہ کے، وہ زخم تغافل کے
اک جان کی قیمت کیا، جو تیغِ ادا چاہے

ہاں تجھ کو کہا ظالم، ہاں تجھ کو کہا قاتل
اب کہہ کے مکرنا کیا، دے دے جو سزا چاہے

افضل یہ وفاداری، یہ وضع زیاں کاری
ہوگا کوئی ایسا بھی، جو اپنا برا چاہے

علی احمد جلیلی
جلیل منزل، سلطان پورہ
حیدر آباد ۵۰۰۰۲۴

لٹ گئے، چھن گئے، سب خواب سہانے میرے
زندگی بیٹھ کے روتی ہے سرھانے میرے

ایک اڑتی ہوئی خوشبو تھا میں کیا ہاتھ آتا
رہ گئے تھک کے تعاقب میں زمانے میرے

اپنی یادوں کو دبے پاؤں ذرا آنے دو
جاگ اٹھیں نہ کہیں زخم پرانے میرے

دے کے دھوکا غمِ دوراں کو لگی ہیں آنکھیں
کوئی آواز سے بولے نہ سرہانے میرے

زندگی کل یہ بدن تیرا سبک تھا کتنا
آج دکھتے ہیں ترے بوجھ کو شانے میرے

مرثیے رہ گئے، ہنستے ہوئے ہونٹوں پہ علی
کھو گئے وقت کی شورش میں ترانے میرے

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی

اس صدی کے آخری بیس برسوں کی شروعات سے ہی ہم خود کو گہری مصیبتوں میں گھرا محسوس کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی بلا ہے جو ہماری زندگی کے ہر پہلو پر گہرا اثر ڈال رہی ہے۔ ہمارے روزی ہمارا کھانا پینا اور آب و ہوا ہماری سماجی زندگی کا ہر پہلو اور ہماری سیاسی زندگی اس بلا کا شکار ہو چکی ہے۔ ہمارا ذہن ہمارا کردار اور ہماری روحانی قوتیں اس کی لپیٹ میں آ چکی ہیں پہلی بار انسانی زندگی اور دھرتی کے نیست و نابود ہونے کے امکانات نمایاں ہونے لگے ہیں۔

دنیا کو کئی بار برباد کر دینے کی صلاحیت رکھنے والے نیوکلیئر (NUCLEAR) ہتھیاروں کو جمع کیا جا چکا ہے اور ایسے ہتھیاروں کی دوڑ بڑی تیز رفتاری سے بڑھتی جا رہی ہے نومبر [illegible] میں سالٹ (STRATEGIC ARMS LIMITATION TREATIES) کا دوسرا دور چل ہی رہا تھا کہ امریکہ نے نیوکلیئر ہتھیاروں کی پیداوار بڑے پیمانے پر بڑھانا شروع کر دی جس کی وجہ سے امریکہ کا سالانہ دفاعی بجٹ ۱۰۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ گیا۔ اسی وقت سے امریکہ کی بم فیکٹریاں پوری رفتار سے کام کر رہی ہیں اس نیوکلیئر پاگل پن پر خرچ ہونے والی رقم عام انسان کے تصور کے باہر کی چیز ہے۔ [illegible] میں فوجی دنیا کا خرچ ۴۲۵ بلین ڈالر کے قریب تھا (ایک روز کا خرچ ایک بلین ڈالر سے کچھ زیادہ ہی پڑا) تیسری دنیا کے بہت سے ملک ان ہتھیاروں کی خرید فروخت میں مبتلا ہیں اور ان میں سے بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جن کی آمدنی اتنی نہیں ہے جتنی رقم یہ ملک ہتھیاروں کے خریدنے پر صرف کرتے ہیں۔

دوسری طرف دنیا کے ۱۵ ملین انسان خاص طور پر بچے ہر سال بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں اور ۵۰۰ ملین لوگ آدھا پیٹ کھا کر زندگی بسر کرتے ہیں دنیا کے تقریباً ۴۰ فیصد لوگ اپنی بیماری کے علاج کیلئے دوا تک نہیں خرید سکتے اور دنیا کے ترقی یافتہ ملک انسانی صحت کی دیکھ بھال پر خرچ ہونے والی رقم سے تین گنا زیادہ ہتھیاروں پر خرچ کرتے ہیں۔ دنیا کے ۳۰ فیصد انسانوں کو پینے کا صاف ستھرا پانی نصیب نہیں ہے جبکہ دنیا کے سائنسداں اور انجینیر —— خطرناک سے خطرناک ہتھیار بنانے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں فوجی کارخانے اس ملک کی سرکار کا ایک لازمی جز بن چکے ہیں۔ امریکہ ساری دنیا کو یہ سمجھانے میں لگا ہوا ہے کہ یہ ہتھیار ملک کی حفاظت کیلئے ضروری ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ نیوکلیئر ہتھیاروں کی کثرت کا مطلب ہے خطرہ کا بڑھ جانا۔ گذشتہ کچھ برسوں میں امریکہ کی دفاعی پالیسی میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ اس کا مقصد کسی حملہ سے اپنے ملک کی حفاظت نہیں ہے۔ بلکہ اپنے حملہ کرنے کی طاقت کو بڑھانا ہے۔ اسی طرح مزائل (MISSILE) کی ایجاد کے ساتھ ساتھ نیوکلیئر جنگ کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ نیوکلیئر ہتھیاروں سے ہماری حفاظت نہیں ہو سکتی (جیسا ہمکو سمجھانے کی کوشش ہو رہی ہے)

کے بیاں جانے کے بالکل قابل نہیں ... مجھے اس سے نفرت ہے
بخدا اس کے نام ہی سے نفرت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس
نفرت نے اس حقارت نے میرے دل میں اس کی محبت
کے بیج بو دیئے ہیں۔"

"بغیر عنوان کے" میں بظاہر کوئی بڑا موضوع نظر نہیں آتا۔ اس میں داستان کا رنگ ہے اور نہ ریاضت کا آہنگ بلکہ یہ ایک عام انسان کی نفسیاتی ناآسودگی کی داستان ہے۔ سعید کی ناآسودگی کا سبب راجو اور صرف راجو ہے۔ جو اسے نفسیاتی کشمکش میں جھونک دیتی ہے۔ اسے ہسپتال کے وارڈ میں پہنچاتی ہے اور اسے اندر ہی اندر تڑپاتی ہے۔ منٹو کے فنکار قلم نے اس کرب کو ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

منٹو انسانی نفسیات کے نباض ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی جبلت کے فطری تقاضوں کی عکاسی کی ہے یہ خصوصیت ان کی کہانیوں میں شروع سے ہی نظر آتی ہے۔ اسلئے "شوشو" ہو یا "ہتک" ہو یا سوراج کے لیے" انسانی نفسیات کی دردن بینی جگہ جھلکتی ہے۔ وہ انسان کے باطن کے اندر ہی اندر گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہیں اور وہ در نایاب نکال لاتے ہیں جو زبان پر آکر جھجک نہیں سکتے۔ وہ سماجی بندشوں اور اخلاقی احتساب کے نام حصاروں کو توڑ دیتے ہیں اور انسان کی اصل اسکی فطرت اس کے جبلی تقاضوں پر پڑے پردے سرکا دیتے ہیں۔ "بغیر عنوان کے" انسان کے جبلی تقاضوں کی کہانی ہے۔ منٹو کا ہیرو اپنی ناآسودہ جنسی جبلت سے مغلوب ہے لیکن ساتھ ہی اپنے معاشرہ کی روایتوں کے قواعد و ضوابط اس کے طور طریقوں کے تابع ہے۔ اس لئے وہ اپنی خواہشات کو دبانے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ سرفریا کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس پر واضح کرتا ہے۔

"میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں۔ میں نے ایسی
فضا میں پرورش پائی ہے جہاں آزادیٔ
گفتار اور آزادیٔ خیال بہت بڑی بدتمیزی
تصور کی جاتی ہے۔ جہاں سچی بات کہنے والا
بے ادب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں اپنی خواہشات
کا دبانا بڑا ثواب خیال کیا جاتا ہے۔"

وہ اس کشمکش میں مارا جاتا ہے۔ لیکن آخر میں وہ اپنے فطری جنسی دباؤ کی چکی میں پس کر نڈھال ہو جاتا ہے اور سرفریا کی سلگتی ہوئی بانہوں میں کھو جاتا ہے۔ اخلاقی انداز پر فطری تقاضے غالب آجاتے ہیں۔

منٹو کا اسلوب منفرد ہے۔ جس طرح اپنے افسانوں میں انھوں نے زبان و بیان کا اپنا انداز اختیار کیا ہے جس کا کوئی مدمقابل نہیں وہ شاعری نہیں کرتے اور نہ الفاظ کا اسراف لیکن تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ جن سے ان کا مافی الضمیر زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ ان کی تراکیب بھی ان کے فن کے دوسرے لوازمات کی طرح ایک شان بے نیازی رکھتے ہیں ان کے استعارے ہوں یا تراکیب وہ دوسرے لوگوں کی طرح کثرت استعمال سے گھسے اور پامال نظر نہیں آتے۔ ان میں ایک تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ، ترکیب استعارہ یا تشبیہ صرف اس موقع کے لیے گڑھی گئی ہے۔ کہانی کے چوکھٹے میں فٹ ہو کر یہ الفاظ اپنے معنی بدل دیتے ہیں اور ایک نئی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ منٹو کے اسلوب کی ندرت، جدت طرازی اور تیکھا پن ان کے فن کی رعنائی کا ایک اور ثبوت ہے۔ چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ لطیف اور اس میں اتنا ہی فرق تھا جتنا لدھیانہ کی دری اور کشمیر کے گدگدے قالین میں۔
۲۔ اس کا ماتھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کہا کرتا جب دیباچہ اتنا دلچسپ تو معلوم نہیں کتاب کتنی دلچسپ ہوگی۔
۳۔ اس کے جسم کا ہر ذرہ بیوی کا تھا۔
۴۔ ناف کا گڑھا اس کے خمیرے آٹے جیسے بھرے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے انگلی کھبو دی ہے۔
۵۔ اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی زبان پر وہی ذائقہ پیدا ہوا جو شلجم کا گودا چباتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

منٹو کا یہ چھوٹا سا ناولٹ ناول نگاری کے شعبے میں منٹو کا پہلا تجربہ تھا لیکن اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر وہ اس شعبے میں اسی لگن

(بقیہ صفحہ ...)

سید جعفر مہدی
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

میرا وطن

کوئی دیکھے میرے گلستاں کی پھبن
ہر روش پر چھلکتا ہوا بانکپن
ڈالی ڈالی ہے اپنی ادا میں مگن!
مسکرائے بہاروں سے سرو و چمن
سارا گلشن ستاروں بھری انجمن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

کوہ و صحرا میں بجتی ہیں شہنائیاں
دور تک ہیں ہمالیہ کی پرچھائیاں
اجنتا میں ایلورا کی تنہائیاں
نیلے ساگر میں بہتی ہیں رعنائیاں
پھوٹ نکلا اجنتا سے ایک بانکپن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

ہے مسرت کا ہر موڑ پر اک نشاں
کوئلیں ہیں مگن ڈالیاں نغمہ خواں
کھیتوں کی بالیوں کا وہ رنگیں سماں
جیسے بالک کوئی ہو رہا ہو جواں
اک حسین نرم و نازک ہے سیمیں بدن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

جیسے گلشن میں جنت کی سوغات ہو
اس میں کشمیر، بنگال، گجرات ہو
جو نہیں ہے زمانے میں وہ بات ہو
ہر گھڑی اس میں خوشیوں کی برسات ہو
اس کی ہر اک ادا نازِ گنگ و جمن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

بشیر فاروقی

وطن کو چھوڑنے والو!

وطن کو چھوڑنے والو! وطن میں لوٹ آؤ
فصیلِ جلوۂ گنگ و جمن میں لوٹ آؤ
تمہارے ہاتھ میں تعمیر و ارتقا کی رسن
تمہارا ذہن تمہارا ہو تمہارا فن!
اسی دیار اسی انجمن کے کام آئے
وطن کی دی ہوئی دولت وطن کے کام آئے
میں جانتا ہوں کہ تم حلقۂ بہار میں ہو
دیارِ رنگ میں ہو بزمِ گلعذار میں ہو
مہک رہے ہیں شب و روز خوشبوؤں کی طرح
چمک رہا ہے زرِ نقد جگنوؤں کی طرح
سحر حسین ہے دلکش ہیں شام کے منظر
جہاں ہو تم وہاں دنیا کی دولتیں ہیں مگر
متاعِ سکۂ زر پیار کا بدل تو نہیں
مئے نشاط غمِ یار کا بدل تو نہیں
نگاہ زلف ادا کب سے انتظار میں ہے
کسی کا دستِ دعا کب سے انتظار میں ہے
دریچے پوچھتے ہیں گھر بلا رہے ہیں تمہیں
محبتوں کے یہ منظر بلا رہے ہیں تمہیں
کہیں بھی جاؤ گے دل کا سکوں نہ پاؤ گے
تم اپنی ماں کی محبت کہاں سے لاؤ گے

ڈاکٹر معراج احمد
ریڈر، شعبہ سماجیات
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

ادب اور ماحول

نیا دور کے نومبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں میرا ایک مضمون "ماحول اور ادب" کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس کی افادیت کے پیش نظر قومی آواز نے اس کو اپنے ۱۴ نومبر ۱۹۶۶ء کے ضمیمے میں بحوالہ نیا دور شایع کیا تھا۔ اس مضمون میں ادب کی مختلف اشکال اور اصناف پر ماحول کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ منسلکہ مضمون میں تصویر کے دوسرے اہم رخ کا تجزیہ کیا گیا ہے یعنی کثیر الجہتی ماحول پر ادب کے ہمہ گیر اور دور رس اثرات کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

(م ا)

جس طرح شعری اور نثری ادب پر ماحول کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی طرح ماحول پر بھی ادب اثر انداز ہوتا ہے۔ ماحول کو بدلنے میں دوسرے اسباب و عناصر کے ساتھ خیالات اور نظریات کا بھی اہم رول ہوتا ہے فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) تاریخ میں خیالات کے منصب کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ مشہور جرمن فلسفی ہیگل (HEGEL) نے تاریخی، سماجی اور ماحولیاتی تبدیلی میں خیالات کی کارکردگی کو نمایاں کیا ہے۔ تصوراتی فلسفہ خیالات، تصورات اور نظریات کی اولیت اور فوقیت میں عقیدہ رکھتا ہے یہ فلسفہ خیال کی تقدیم اور مادے کی تاخیر کو ایک حقیقت مانتا ہے۔ تصوراتی فلسفی یہ مانتے ہیں کہ مقدم خیال یا نظریہ ہوتا ہے جس کے سانچے میں مادی اشیا اور ماحول اپنے کو ڈھالتے جاتے ہیں۔ اگر خیال کی بنیادی حیثیت کو نہ مانا جائے تو تاریخی مادی اور سماجی تبدیلیوں کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہیگل (HEGEL) کے نظریے کو جدلیاتی تصوریت (DIALECTICAL IDEALISM) کہا جاتا ہے۔ ہیگل کا نظریہ تھا کہ انسان کے ذہن اور اس کی تخلیقِ فکر کا ارتقا، خیالات کے ٹکراؤ کے باعث ہوتا ہے پہلے کسی شے کے بارے میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، پھر اسی شے کے بارے میں ایک دوسرا مخالف یا متضاد خیال جنم لیتا ہے لیکن دونوں خیالات کے بیچ ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے تصوراتی جدلیات پیدا ہوتی ہے۔ پھر آگے چل کر دونوں کی آمیزش (SYNTHESIS) ہو جاتی ہے اور ایک تیسرا خیال سامنے آتا ہے جو سابقہ دونوں خیالات کے مقابلے

یادہ جامع اور حسین ہوتا ہے [illegible] خیالات اور تصورات ... دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مادی دنیا بھی ارتقا کے ... طے کرتی جاتی ہے۔

ادب کی چاہے وہ شعری ہو یا نثری، تخلیق خیالات، تصورات ... ت اور الفاظ کی آمیزش سے ہی ہوتی ہے۔ عمومی طور پر ادب ... حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ ادب عالیہ اور ۲۔ ... سماجی اور [illegible] ادب۔ ادب کی یہ دونوں ہی اقسام ... اپنے طور پر ماحول کو متاثر کرتی ہیں اور اس میں تبدیلیاں ... [illegible]

ادب عالیہ اور ماحول

ادب عالیہ کا تعلق تخلیقی عمل سے ہوتا ہے اور لطیف ... میں لطیف خیالات اور تصورات کے ذریعے انسانی جذبات ... احساسات کو متاثر اور متحرک کرتا ہے اور ایک خاص اثر انسان ... کے احساس اور فکر پر مرتب کرتا ہے۔ ادب لطیف اعلا ... اور آدرشوں کی عکاسی کرتا ہے اور انسان کے نفس ... ت اور کردار کا تزکیہ کرتا ہے۔ کثافت کی جو تہہ نفس و ... نفس پر چڑھی ہوتی ہے اعلا اور لطیف ادب اس کو دور کرتا ... ت کو نکھار دیتا ہے اور انسان کے لطیف جذبات سے بہرہ ور ... دوسروں کے ساتھ اس کے راہ و رسم اور ربط ضبط کو ... گی عطا کرتا ہے، سماجی رشتوں کو ایک نئی گیرائی اور ... بخشتا ہے اور سماجی زندگی کے توازن اور نرم روی میں ... کرتا ہے اور انسان کو دوسروں کے دکھ اور درد کو سمجھنے ... میں شریک ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح ادب عالیہ ... جی ماحول پر اثر انداز ہو کر اس کو ارتقا کے بلند تر منازل کی طرف ... لے جانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S.ELIOT) نے اپنی مشہور کتاب ... میں شاعری کے سماجی منصب SOCIAL FUNCTIONS OF [illegible] ... روشنی ڈالی ہے۔ شاعری کس طرح سماجی منصب کی حامل ہوتی ہے ... [illegible] ایلیٹ نے اپنی اس اہم تصنیف [illegible]

اور [illegible] شاعری ایک فن لطیف کی حیثیت سے انسان میں لطیف جذبات اور احساسات کو فروغ دے کر اور اس کی شخصیت میں دوسروں کے احساسات کو محسوس کرنے (EMPATHY) کی صلاحیت پیدا کر کے ناہموار سماجی رشتوں کو ہموار کرنے اور غیر متوازن سماجی زندگی کو متوازن بنانے کا کام کرتی ہے۔

مشہور برطانوی نقاد اور شاعر میتھیو آرنلڈ (MATHEW ARNOLD) نے شاعری کو زندگی کی تنقید کہا ہے۔ شاعری کے سماجی منصب کو نمایاں کیا ہے۔ آرنلڈ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص شائستہ اور مہذب بننا چاہتا ہے اور اس کو کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ادب عالیہ خصوصاً شاعری کا مطالعہ کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرد کو سماجی اور اس کو سماجی طور پر باشعور اور حساس بنانے میں ادب کا ایک خاص رول ہوتا ہے۔

سماجیاتی مفکرین نے بھی فنون لطیفہ اور ادبیات کے سماجی منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے ادب کو سماجی کنٹرول کا ایک اہم ذریعہ بتایا ہے۔ جس طرح رسوم و رواج، قوانین، رائے عامہ اور اختیار فرد کے افعال اور رکھ رکھاؤ کو کنٹرول کرتے ہیں اسی طرح فنون و ادب بھی سماجی زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ سماجی زندگی میں اعلیٰ اقدار اور آدرشوں کی ترویج کر کے اس کو توازن، آہنگ [illegible] اور تسلسل عطا کرتے ہیں۔

ادب جس طرح سماجی ماحول کو متاثر اور تبدیل کرتا ہے [illegible] طرح یہ فطری اور مادی ماحول پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ انسان [illegible] حسن کا جذبہ اور لطافت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اس میں اپنے مادی ماحول کو سنوارنے اور حسین بنانے کی ترغیب اور تحریک پیدا کرتا ہے وہ اپنی رہائش گاہوں کو آراستہ کرتا ہے۔ اطراف میں ایک باغ [illegible] کی نشو و نما کرتا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھل کر اس کے ذوق جمال کو تسکین دیتے ہیں۔ ماحول کو خوبصورتی عطا کرتے ہیں اور روح کو فرحت بخشتے ہیں۔ اسی طرح انسان اپنی بستیوں اور شہروں کو خوشنمائی عطا کرتا ہے اور ان کو ایک خاص انداز سے آراستہ

بی۔ آ۔ پیرزادہ
شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی۔
سری نگر۔

منٹو بحیثیت ناول نگار

سعادت حسن منٹو کی عظمت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کی عظمت اور انفرادیت کا ایک زبردست ثبوت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فن نہ صرف ان کے معاصرین کیلئے بلکہ ان کے بعد بھی بے حد متنازعہ فیہ رہا۔ ان کے بیشتر افسانوں نے بحث و تمحیص کے دفتر کھول دیئے۔ فرانس کے مشہور افسانہ نگار موپاساں کی طرح ان کی زندگی اور فن کا ماحصل مختصر افسانہ ہے اگر وہ افسانوں کے علاوہ کچھ اور نہ لکھتے تو بھی بقائے دوام کے دربار میں نظر آتے۔ لیکن انھوں نے صرف اسی میدان تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے مکتوبات، مضامین، خاکوں، ڈراموں ترجموں، انشائیوں اور فلمی کہانیوں سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ انھوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کی توانائی آزمائی۔ حالانکہ یہ ان کا میدان نہیں تھا۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں جب کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول "شکست" لکھا تو اردو کے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ اس ناول کو پڑھ کر منٹو، اشک، فیض، چراغ حسن حسرت اور کئی لوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ مدتوں کے بعد ایک اچھا ناول سامنے آیا تھا۔ یہ سبھی لوگ ایک اچھے ناول کی تخلیق کے لیے پر تولنے لگے۔ لیکن کرشن چندر کے چیلنج کا فوری طور پر مقابلہ نہ کر سکے۔ منٹو نے اس دور کے آس پاس ایک ناولٹ "بغیر عنوان کے" لکھا جو ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "کارواں" میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور بعد میں کتابی صورت میں سامنے آیا۔ کئی برسوں کے بعد انھوں نے "تکلیف" کے عنوان سے ایک اور ناول لکھا جو مکمل نہ ہو سکا۔

ناول نگاری منٹو کا میدان نہیں۔ اس کے لیے ایک صبر آزما مزاج اور وقت کی فراوانی چاہیئے۔ یہ دونوں چیزیں منٹو کے پاس نہیں تھیں۔ راقم السطور نے ایک بار ان کے دوست اور ہم عصر کرشن چندر کی توجہ اس طرف مبذول کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا۔

> "منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اور اس کے ساتھ ہی کسی قدر عجلت پسند۔ لہٰذا انھوں نے ناول نہیں لکھے"۔

اس بات کی تصدیق محمد اسداللہ کی کتاب "منٹو۔ میرا دوست" سے بھی ہوتی ہے۔ منٹو کی ناول نگاری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

> "ایک دفعہ میرے ایک دوست نے ان سے پوچھا منٹو صاحب آپ ناول کیوں نہیں لکھتے؟
> منٹو صاحب کا جواب تھا:
> یہاں روز پینے کے لیے پیسہ چاہیئے۔ روز افسانہ لکھتے ہیں روز کا روز معاوضہ مل جاتا ہے۔ اب ناول کون لکھے؟"

یہ بات صحیح ہے کہ بٹوارے کے بعد جب وہ پاکستان چلے گئے تو وہ مفلس و قلاش ہو چکے تھے۔ لاہور میں جن سنہرے مستقبل کی بشارت انھیں ملی تھی۔ وہ ایک سراب ثابت ہو چکا تھا۔ مسلسل مایوسیوں نے ان کا ذہن شل کر دیا تھا۔ انھیں روز شراب چاہیے تھی۔ روز کا افسانہ لکھتا اور

سے منگنی چج کر ڈیل کی قیمت وصول کرتے۔ اور یہ حقیقت کہ ناول نگاری کے لیے ان کا مزاج نہیں بنا تھا تاہم اس صنف میں انھوں نے اگر سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہوتا۔ تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو ناول نگاری کے فن میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہوتا جو منٹو سے عبارت ہوتا۔

"بغیر عنوان کے" ایک مختصر ناولٹ ہے جسے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ منٹو نے اسے احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں افسانہ کہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ منٹو جب اسے لکھ رہے تھے تو ان کے ذہن میں افسانہ ہی کا خاکہ ہو جسے بعد میں انھوں نے پھیلا دیا اور ایک بڑے کینوس پر پیش کیا۔ ایک اور دلچسپ بات ہے کہ اس ناولٹ کے دوسرے اور تیسرے باب کو منٹو نے ایک علاحدہ افسانے کی صورت میں تحریر کیا تھا جسے نقوش لاہور کے افسانہ نمبر بابت نومبر ۱۹۶۸ء (شمارہ ۱۱۰) میں نقوش کے مدیر نے "راجو" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوٹ لکھا ہے کہ یہ منٹو کی غیر مطبوعہ کہانی ہے۔ افسانے کی اختتامی چند سطور خود منٹو کے ہاتھ کی تحریر کا عکس ہیں جن کے نیچے سعادت حسن منٹو کے دستخط ہیں اور ۱۲ جنوری ۱۹۵۵ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ اس تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ افسانہ منٹو کی موت سے صرف تین دن پہلے لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے بعد انھوں نے صرف ایک افسانہ "کبوتر اور کبوتری" کے عنوان سے لکھا۔ اس وجہ سے بھی اس افسانے کی بڑی اہمیت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "بغیر عنوان کے" ناولٹ کے دوسرے باب کا بیشتر حصہ اور تیسرے باب کے چند جز اس افسانے میں مکمل طور سے نقل کئے گئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ "بغیر عنوان کے" کا ہیرو سعید ہے اور اس افسانے میں واحد غائب "وہ" ہے بعض مقامات پر چند فقرے حذف کئے گئے ہیں۔ دونوں کے متن میں نوکرانی کے تئیں ہیرو کی نفرت کا اظہار ملتا ہے جس کے پس پشت دراصل اس کی پسندیدگی کا جذبہ کارفرما ہے۔ "راجو" (افسانے) میں اس جذبے کا اظہار کفایت الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے اور ناولٹ "بغیر عنوان کے" میں اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ ہاں البتہ اس کے بعد ناولٹ کو جس سمت میں موڑ دیا گیا ہے۔ افسانے کی سمت اس سے ذرا مختلف ہے۔ ناولٹ میں راجو، سعید کے تحت الشعور میں دبی رہتی ہے اور وہ بھاگ کر لاہور چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ آخر میں مس فریا کی بانہوں میں دھنس کے رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس راجو (افسانے) میں منٹو اس کی شادی گھر سے بھگوا کر راجو کے ساتھ کرواتا ہے۔ ناولٹ کے اختتام پر قاری کچھ غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جو منٹو کا خاص ہنر ہے لیکن راجو نام کے افسانے میں یہ بات نہیں ملتی راجو (افسانے) کا اختتام عامیانہ ہے اور اس میں منٹو کی کہانیوں کے فنکارانہ اور چونکا دینے والے اختتام کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

"بغیر عنوان کے" جیسا کہ ذکر ہو چکا آٹھ ابواب پر مشتمل ناولٹ ہے۔ اس میں صرف چار کردار اہم ہیں۔ سعید عباس، راجو اور مس فریا۔ ناولٹ کا موضوع ایک کنوارے نوجوان کی نفسیاتی کشمکش ہے۔ جو مختلف قسم کی جوان عورتوں کی قربت میں رہ کر مختلف نفسیاتی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا عمل اور ردِ عمل اس کے نفسیاتی ہیجانات کی عکاسی کرتا ہے۔ ناولٹ کا ہیرو سعید ایک کنوارہ نوجوان ہے جس پر یہ خبط سوار ہے کہ اسے عشق کیوں نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے احباب اور دوست بڑی ڈینگیں مار کر اپنے معاشقوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آخر وہ ان تمام لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جو اس کی نظروں کے سامنے روز گزرتی ہیں۔ ان کے ساتھ عشق کرنے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس کی نگاہوں میں کھب نہیں جاتی۔ کوئی ہندو ہے جس کے ساتھ عشق کرکے فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو سکتے ہیں۔ کسی کی منگنی کا لومل جیسے گرانڈیل ویسے ہو چکی ہے۔ کوئی کسی کٹر مولانا کی دختر نیک اختر ہے جس کا تصور کرتے ہی سعید کی آنکھوں کے سامنے مسجد کی چٹائیاں آجاتی ہیں اور کسی کے دونوں ہاتھ عشق سے بھرے ہوئے ہیں۔ آخر اس کی نظریں سوداگروں کی نوکرانی راجو پر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں۔ راجو

چار بھائیوں کے کنبے کی نوکرانی ہے۔ یہ چاروں باری باری اس لڑکی کو "عورت" بنا چکے ہیں۔ اس لیے اس میں ایک نہیں بلکہ چار عورتیں اکٹھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک رات گلی میں شور و غل سن کر سعید جاگ پڑتا ہے اور گلی میں اس لڑکی کو لالٹین کے کھمبے کے نیچے ننگ دھڑنگ دیکھتا ہے۔ سوداگروں کا چھوٹا بھائی راجو کی منتیں کرتا ہے کہ وہ کمرے کے اندر چلی آئے کیونکہ اس طرح سے رسوائی کا امکان ہے۔ لیکن راجو متوقع مظالم سے ڈر کر کمرے کے اندر جانے سے انکار کرتی ہے۔ سعید جو فاصلے سے اس منظر کو دیکھ رہا ہے اپنے اندر اس لڑکی کے لیے رحم کا جذبہ محسوس کرتا ہے لیکن دوسرے دن جب وہ سوداگروں کے ہاں سے بھاگ کر سعید کے گھر میں نوکرانی کی حیثیت سے پناہ لیتی ہے تو سعید کے دل میں رحم اور نفرت کے ملے جلے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں وہ نمونیہ کا شکار ہو جاتا ہے اور سخت بخار میں ہذیانی کیفیت کے ماتحت راجو سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس درمیان اسے علاج کیلئے ہسپتال میں داخلہ لینا پڑتا ہے۔ جہاں وہ مس فریا نام کی ایک شوخ و شنگ نرس کو التفات کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اس سے دوستی کا متمنی ہوتا ہے۔ صحتیاب ہونے کے بعد جب وہ واپس گھر لوٹتا ہے تو پھر اس کی مڈبھیڑ راجو سے ہوتی ہے۔ اس کے تئیں وہ پھر نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہے حالانکہ وہ اس سے نفرت کبھی نہیں کرنا چاہتا۔ محبت کے بارے میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ عورت ساری کی ساری اس کی ہو۔ وہ عاشق اور ڈکٹیٹر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے مطابق "جو عورت ایک ہی دسترخوان پر بڑے ہی سلیقے سے چار بھائیوں کو کھلا چکی ہو، اس سے محبت کرنا بے معنی ہے" تبدیلی آب و ہوا کے لیے جب سعید لاہور چلا جاتا ہے تو وہاں اس کی ملاقات ایک بار پھر مس فریا سے ہوتی ہے جسے کوئی شخص دھوکہ دیکر ہسپتال سے بھگا لایا ہے شادی کر لی ہے اور ایک رات بے یار و مددگار چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ فریا سعید کے قریب آجاتی ہے اس کے ساتھ ہوٹل میں قیام کرنے لگ جاتی ہے اور بڑے خلوص کے ساتھ سعید کو

جسمانی محبت پیش کرتی ہے۔ لیکن سعید اس سے احتراز کرتا ہے۔ سعید اسے کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ محبت نہیں کر سکتا۔ محبت تو کسی اور کے ساتھ کر چکا ہے جس سے وہ نفرت کرتا ہے۔ لیکن آخر فریا کی جلتی ہوئی باہوں میں نڈھال ہو جاتا ہے۔

اس بظاہر معمولی پلاٹ کے کینڈے میں جس گہرائی اور بصیرت کے ساتھ منٹو نے ناول کے ہیرو کی جذباتی اور ذہنی کشمکش پیش کی ہے اردو ناول کے ادب میں اس کی کم مثالیں ہیں۔ جدید ناول دروں بینی کا فن ہے اور کرداروں کی جذباتی زندگی کی غمازی کرتا ہے۔ منٹو نے یہ کارنامے لگ بھگ پینتالیس سال قبل انجام دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اردو کے کسی ادبی مورخ اور نقاد (بالاستثنائے ڈاکٹر یوسف سرمست) نے اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور اردو کا یہ اہم ناولٹ نظر انداز ہو کر رہ گیا ہے۔ "بغیر عنوان کے" کرداری ناول ہے اور عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح اس میں سوانحی انداز ہے۔ یہاں ناولٹ کے ہیرو سعید کے خیالات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس اساس پر سعید کا کردار تعمیر ہوتا ہے۔ جو ناولٹ پر چھایا ہوا ہے باقی کردار محض اس کا سایہ ہیں۔ پلاٹ میں واقعات کی مثبت ڈرامائی ہے۔ واقعات کے سہارے سے مختلف خیالات اور نظریات سامنے آتے ہیں۔ نظریات کے ٹکراؤ سے کردار ابھرتے ہیں۔ مثلاً سعید کا دوست عباس، اپنے نظریہ عشق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"میں ایسی محبت کا قائل نہیں جو دق یا
سل کے روگ کی طرح ہمیشہ کے لیے چمٹ
جائے میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو برس
عورت سے عشق کر سکتا ہوں اور بس"
"مجھے عورت چاہیے عورت، گرم گرم گوشت والی
عورت جس کے گالوں پر میں اپنی محبت کے
مرد تو سے سینک سکوں"

مگر سعید اس نظریہ کی نفی کرتا ہے۔ وہ عباس پر واضح کرتا ہے۔ "محبت وہ چیز نہیں جس کا ذکر تم کرتے ہو۔ تم ایک عورت

سے صرف ایک برس تک محبت کرنے کے قائل ہو مگر میں عمر بھر کا پٹہ لکھوانا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے کسی سے عشق ہو جائے ..... تو میں اس پر اپنی ملکیت چاہتا ہوں . . . وہ عورت ساری کی ساری میری ہونی چاہیئے۔ اس کا ایک ایک ذرہ میری محبت کے ماتحت ہونا چاہیئے عاشق اور ڈکٹیٹر میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ دونوں طاقت چاہتے ہیں۔ دونوں حکمرانی کی آخری حد کے خواہش مند ہیں... اگر تمہاری شہوت کی بھوکی عورت سے ملاقات ہو جائے تو تم کیا کہوگے "میں نے عشق لڑایا ہے"... یہ محبت نہیں محبت کچھ اور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا محبت ایک نہایت پاک جذبہ کا نام ہے اور جیسا ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ یہ شہوت سے ملوث نہیں ہوتی۔ میں اس کو بھی نہیں مانتا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے معلوم ہے محبت کیا ہے مگر . . . . میں واضح طور پر اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتا ۔"

اس طرح سے عباس اور سعید کی افتاد طبع کا علم ہوتا ہے، بلکہ دونوں کے کردار ابھرتے ہیں۔ یہ دراصل سعید کے جذبات ہیں جن کے آئینے میں ہم عباس، راجو، مس فریا اور دوسرے چھوٹے کرداروں کو دیکھ سکتے ہیں۔

سعید کی نوکرانی راجو سوداگروں کے گھر میں رہ کر اپنی بے چارگی اور مفلسی کے ہاتھوں لٹ جاتی ہے۔ حالات نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے مالکوں کے سپرد کر دے لیکن اس کے باوجود وہ وہاں سے بھاگ کر سعید کے گھر میں پناہ لیتی ہے یہاں سعید بھی بے خیالی میں اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ لیکن پھر اسے راجو سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ "بغیر عنوان کے" کی کہانی محبت اور نفرت کے اسی نفسیاتی امتزاج کی کہانی ہے جسے منٹو نے انتہائی فن کاری سے پیش کیا ہے۔

جدید ناول کا فن دروں بینی کا فن ہے۔ یہ خارجیت کو نہیں۔ داخلیت کو پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ناول میں انسان کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کی مصوری پر زور دیا جاتا ہے۔ منٹو نے برسوں پہلے اس راز کو سمجھا تھا۔ سعید کے کردار میں دراصل منٹو نے انسان کی دوہری شخصیت کی تحلیل نفسی کی ہے۔ ایک انسان بیک وقت ایک ہی شخص سے محبت بھی کر سکتا ہے اور نفرت بھی۔ انسان کے بے کل باطن میں جذبات کا یہ تضاد اور ٹکراؤ بظاہر بے ہنگم لگتا ہے۔ لیکن اس کے پس پشت کتنی تہہ در تہہ الجھنیں ہیں منٹو نے ان گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اسلیے جب ایک کردار کے بعد دوسرا کردار آتا ہے۔ تو جذبات کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی سوچوں کی کئی پرتیں اٹھ جاتی ہیں۔

سعید کے سامنے دو مسئلے ہیں۔ وہ راجو کی طرف ایک نفسیاتی جھکاؤ محسوس کرتا ہے۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔ لیکن ایک سماج اور ایک معاشرے میں رہتا ہے اور اس کے فرد کی حیثیت سے اس کے قوانین اور ضوابط کے سامنے سر بھی جھکاتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں نہیں کہ ان ضوابط کے سامنے بغاوت کا نعرہ بلند کرے۔ وہ سماجی اندار کا پاسدار ہے اسلئے وہ راجو جیسی آبرو باختہ عورت سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن یہ ہوش کی بات ہے۔ بخار میں جب اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس کا دل اس کی زبان پر یوں آجاتا ہے وہ راجو سے کہتا ہے۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ اس لیے نہیں کہ تم محبت کرنے کے قابل ہو۔ اس لئے نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو پھر کس لیے... کاش کہ میں اس کا جواب دے سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لیے کہ تم نفرت کے قابل ہو۔ تم عورت نہیں بلکہ ایک سالم مکان ہو۔ ایک بہت بڑی بلڈنگ ہو مگر مجھے تمہارے ہر کمرہ سے محبت ہے اس لیے کہ وہ غلیظ ہیں۔ ٹوٹے ہوئے ہیں . . . . مجھے تم سے محبت ہے۔"

سعید کا خیال ہے کہ محبت کے بغیر مرد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ نرس مس فریا جب اس پر چھا جانا چاہتی ہے تو وہ اپنے تحت الشعور کو چھپا نہیں پاتا وہ صاف الفاظ میں اس کے سامنے اعتراف کرتا ہے۔

"تمہیں حیرت ہوگی کہ مجھے ایک عورت سے محبت ہے جو محبت

کئے جانے کے بالکل قابل نہیں . . . . مجھے اس سے نفرت ہے
بخدا اس کے نام ہی سے نفرت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس
نفرت نے اس حقارت نے میرے دل میں اس کی محبت
کے بیج بو دیئے ہیں۔"

"بغیر عنوان کے" میں بظاہر کوئی بڑا موضوع نظر نہیں آتا۔ اس میں نہ رومان کا رنگ ہے اور نہ سیاست کا آہنگ بلکہ یہ ایک عام انسان کی نفسیاتی ناآسودگی کی داستان ہے۔ سعید کی ناآسودگی کا سبب راجہ اور صرف راجہ ہے۔ جو اسے نفسیاتی کشمکش میں جھونک دیتی ہے۔ اسے ہسپتال کے وارڈ میں پہنچاتی ہے اور اسے اندر ہی اندر تڑپاتی ہے۔ منٹو کے فن کار قلم نے اس کرب کو ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

منٹو انسانی نفسیات کے نباض ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی جبلت کے فطری تقاضوں کی عکاسی کی ہے یہ خصوصیت ان کی کہانیوں میں شروع سے ہی نظر آتی ہے۔ اسلئے "شوشو" ہو یا "منو نیا" ہتک ہو یا سوراج کے لیے "انسانی نفسیات کی دردوں بینی ہر جگہ جھلکتی ہے۔ وہ انسان کے باطن کے اندر ہی اندر گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہیں اور وہ درنایاب نکال لاتے ہیں جو زبان پر آکر چمک نہیں سکتے۔ وہ سماجی بندشوں اور اخلاقی، احتساب کے تمام حصاروں کو توڑ دیتے ہیں اور انسان کی اصل اسکی فطرت اس کے جبلی تقاضوں پر پڑے پردے سرکا دیتے ہیں: "بغیر عنوان کے" انسان کے جبلی تقاضوں کی کہانی ہے۔ منٹو کا ہیرو اپنی ناآسودہ جنسی جبلت سے مغلوب ہے لیکن ساتھ ہی اپنے معاشرہ کی روایت اس کے قواعد و ضوابط اس کے طور طریقوں کے تابع ہے۔ اسی لیے وہ اپنی خواہشات کو دبانے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ مس ثریا کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس پر واضح کرتا ہے۔

"میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں میں نے ایسی
فضا میں پرورش پائی ہے جہاں آزادیٔ
گفتار اور آزادیٔ خیال بہت بڑی بدتمیزی
تصور کی جاتی ہے۔ جہاں سچی بات کہنے والا
بے ادب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں اپنی خواہشات
کا دبانا بڑا ثواب خیال کیا جاتا ہے"۔

اور اس کشمکش میں مارا جاتا ہے لیکن آخر میں وہ اپنے فطری جنسی دباؤ کی چکی میں پس کر نڈھال ہو جاتا ہے اور مس ثریا کی سلگتی ہوئی بانہوں میں کھو جاتا ہے۔ اخلاقی اندازپر فطری تقاضے غالب آجاتے ہیں۔

منٹو کا اسلوب منفرد ہے۔ جس طرح اپنے افسانوں میں انھوں نے زبان و بیان کا اپنا انداز اختیار کیا ہے جس کا کوئی مدمقابل نہیں وہ شاعری نہیں کرتے اور نہ الفاظ کا اسراف لیکن تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ جن سے ان کا مافی الضمیر زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ ان کی تراکیب بھی ان کے فن کے دوسرے لوازمات کی طرح ایک شان بے نیازی رکھتے ہیں ان کے استعارے ہوں یا تراکیب وہ دوسرے لوگوں کی طرح کثرت استعمال سے گھسے اور پامال نظر نہیں آتے۔ ان میں ایک تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ، ترکیب استعارہ یا تشبیہ صرف اس موقع کے لیے گڑھی گئی ہے۔ کہانی کے چوکھٹے میں فٹ ہو کر یہ الفاظ اپنے معنی بدل دیتے ہیں اور ایک نئی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ منٹو کے اسلوب کی ندرت، جدت طرازی اور تیکھاپن ان کے فن کی رعنائی کا ایک اور ثبوت ہے۔ چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ لطیف اور اس میں اتنا ہی فرق تھا جتنا لدھیانہ کی دری اور کشمیر کے گدگدے قالین میں۔

۲۔ اس کا ماتھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کہا کرتا جب دیباچہ اتنا دلچسپ تو معلوم نہیں کتاب کتنی دلچسپ ہوگی۔

۳۔ اس کے جسم کا ہر ذرہ بیوی تھا۔

۴۔ ناف کا گڑھا اس کے خمیرے آٹے جیسے بھرے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے انگلی کھبو دی ہے۔

۵۔ اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی زبان پر وہی ذائقہ پیدا ہوا جو شلجم کا گودا چباتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

منٹو کا یہ چھوٹا سا ناولٹ، ناول نگاری کے شعبے میں منٹو کا پہلا تجربہ تھا لیکن اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر وہ اس شعبے میں اسی لگن

(بقیہ ص ۴۴)

سید خضر برکت
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

میرا وطن

کوئی دیکھے میرے گلستاں کی پھبن
ہر روش پر مہکتا ہوا بانکپن
ڈالی ڈالی ہے اپنی ادا میں تمکن!
لہلہائے بہاروں سے سرو و چمن
سارا گلشن ستاروں بھری انجمن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

کوہ و صحرا میں بجتی ہیں شہنائیاں
دور تک ہیں ہمالیہ کی پرچھائیاں
انجمن ہیں ابلورا کی تنہائیاں
نیلے ساگر میں بہتی ہیں رعنائیاں
پھوٹ نکلا اجنتا سے ایک بانکپن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

ہے مسرت کا ہر موڑ پر اک نشاں
کونپلیں ہیں مگن ڈالیاں نغمہ خواں
کھیتوں کی بالیوں کا وہ رنگیں سماں
جیسے بالک کوئی ہو رہا ہو جواں
اک حسین نرم و نازک ہے سیمیں بدن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

میرے گلشن میں جنت کی سوغات ہے
اس میں کشمیر، بنگال، گجرات ہے
جو نہیں ہے زمانے میں وہ بات ہے
ہر گھڑی اس میں خوشیوں کی برسات ہے
اس کی ہر اک ادا ناز گنگ و جمن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

بشیر فاروقی

وطن کو چھوڑنے والو!

وطن کو چھوڑنے والو! وطن میں لوٹ آؤ
فصیلِ جلوۂ گنگ و جمن میں لوٹ آؤ
تمہارے ہاتھ میں تعمیر و ارتقا کی رسن
تمہارا ذہن تمہارا ہو تمہارا فن!
اسی دیار اسی انجمن کے کام آئے
وطن کی دی ہوئی دولت وطن کے کام آئے
میں جانتا ہوں کہ تم حلقۂ بہار میں ہو
دیارِ رنگ میں ہو بزم گلعذار میں ہو
مہک رہے ہیں شب و روز خوشبوؤں کی طرح
چمک رہا ہے زرِ نقد جگنوؤں کی طرح
سحر حسین ہے دلکش ہیں شام کے منظر
جہاں ہو تم وہاں دنیا کی دولتیں ہیں مگر
متاعِ سکۂ زر بیار کا بدل تو نہیں
مئے نشاطِ غمِ یار کا بدل تو نہیں
نگاہ زلف ادا، کب سے انتظار میں ہے
کسی کا دستِ دعا کب سے انتظار میں ہے
دریچے پوچھتے ہیں گھر بلا رہے ہیں تمہیں
محبتوں کے یہ منظر بلا رہے ہیں تمہیں
کہیں بھی جاؤ گے دل کا سکوں نہ پاؤ گے
تم اپنی ماں کی محبت کہاں سے لاؤ گے

ڈاکٹر معراج احمد
ریڈر، شعبۂ سماجیات
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ،

ادب اور ماحول

نیا دور کے نومبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں میرا ایک مضمون "ماحول اور ادب" کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس کی افادیت کے پیش نظر قومی آواز نے اس کو اپنے ۱۴ نومبر ۱۹۶۶ء کے ضمیمے میں بحوالہ نیا دور شایع کیا تھا۔ اس مضمون میں ادب کی مختلف اشکال اور اصناف پر ماحول کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ منسلکہ مضمون میں تصویر کے دوسرے اہم رخ کا تجزیہ کیا گیا ہے یعنی کثیر الجہتی ماحول پر ادب کے ہمہ گیر اور دور رس اثرات کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ (م۔ا)

جس طرح شعری اور نثری ادب پر ماحول کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی طرح ماحول پر بھی ادب اثر انداز ہوتا ہے۔ ماحول کو بدلنے میں دوسرے اسباب و عناصر کی طرح خیالات اور نظریات کا بھی اہم رول ہوتا ہے فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) تاریخ میں خیالات کے منصب کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ مشہور جرمن فلسفی ہیگل (HEGEL) نے تاریخی، سماجی اور ماحولیاتی تبدیلی میں خیالات کی کارکردگی کو نمایاں کیا ہے۔ تصوراتی فلسفہ خیالات، تصورات اور نظریات کی اولیت اور فوقیت میں عقیدہ رکھتا ہے یہ فلسفہ خیال کی تقدیم اور مادے کی تاخیر کو ایک حقیقت مانتا ہے۔ تصوراتی فلسفی یہ مانتے ہیں کہ مقدم خیال یا نظریہ ہوتا ہے جس کے سانچے میں مادی اشیاء اور ماحول اپنے کو ڈھالتے جاتے ہیں۔ اگر خیال کی پیش روی کو نہ مانا جائے تو تاریخی مادی اور سماجی تبدیلیوں کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہیگل (HEGEL) کے نظریے کو جدلیاتی تصوریت (DIALECTICALIDEALISM) کہا جاتا ہے۔ ہیگل کا نظریہ تھا کہ انسان کے ذہن اور اس کی تخلیق فکر کا ارتقار خیالات کے ٹکراؤ کے باعث ہوتا ہے پہلے کسی شے کے بارے میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، پھر اسی شے کے بارے میں ایک دوسرا مخالف یا متضاد خیال جنم لیتا ہے لن دونوں خیالات کے بیچ ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے تصوراتی جدلیات پیدا ہوتی ہے۔ پھر آگے چل کر دونوں کی آمیزش (SYNTHESIS) ہو جاتی ہے اور ایک تیسرا خیال سامنے آتا ہے جو سابقہ دونوں خیالات کے مقابلے،

سے زیادہ جامع اور مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح خیالات اور تصورات کا ارتقاء ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مادی دنیا بھی ارتقاء کے منازل طے کرتی جاتی ہے۔

ادب کی چاہے وہ شعری ہو یا نثری، تخلیق خیالات تصورات محسوسات اور الفاظ کی آمیزش سے ہی ہوتی ہے۔ عمومی طور پر ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ ادب عالیہ اور ۲۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی ادب۔ ادب کی یہ دونوں ہی اقسام اپنے اپنے طور پر ماحول کو متاثر کرتی ہیں اور اس میں تبدیلیاں لاتی ہیں۔

ادب عالیہ اور ماحول

ادب عالیہ کا تعلق تخلیقی عمل سے ہوتا ہے اور لطیف پیرائے میں لطیف خیالات اور تصورات کے ذریعے انسانی جذبات اور احساسات کو متاثر اور متحرک کرتا ہے اور ایک خاص اثر انسان کے شعور، احساس اور فکر پر مرتب کرتا ہے۔ ادب لطیف اعلا قدروں اور آدرشوں کی عکاسی کرتا ہے اور انسان کے نفس شخصیت اور کردار کا تزکیہ کرتا ہے۔ کثافت کی جو تہہ نفس و احساس پر چڑھی ہوئی ہے اعلا اور لطیف ادب اس کو دور کرتا شخصیت کو نکھار دیتا ہے اور انسان کے لطیف جذبات سے بہرہ ور کر کے دوسروں کے ساتھ اس کے راہ و رسم اور ربط ضبط کو کشادگی عطا کرتا ہے، سماجی رشتوں کو ایک نئی گیرائی اور گہرائی بخشتا ہے اور سماجی زندگی کے توازن اور نرم روی میں اضافہ کرتا ہے اور انسان کو دوسروں کے دکھ اور درد کو سمجھنے اور اس میں شریک ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح ادب عالیہ سماجی ماحول پر اثر انداز ہو کر اس کو ارتقاء کے بلند تر منازل کی طرف لے جانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S.ELIOT) نے اپنی مشہور کتاب میں SOCIAL FUNCTIONS OF POETRY شاعری کے سماجی منصب پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعری کس طرح سماجی منصب کی حامل ہوتی ہے اور اس کو ادا کرتی ہے اس کا تجزیہ ایلیٹ نے اپنی اس اہم تصنیف میں کیا ہے۔ شاعری ایک فن لطیف کی حیثیت سے انسان میں لطیف جذبات اور احساسات کو فروغ دے کر اور اس کی شخصیت میں دوسروں کے احساسات کو محسوس کرنے (EMPATHY) کی صلاحیت پیدا کر کے ناہموار سماجی رشتوں کو ہموار کرنے اور غیر متوازن سماجی زندگی کو متوازن بنانے کا کام کرتی ہے۔

مشہور برطانوی نقاد اور شاعر میتھیو آرنلڈ (MATHEW ARNOLD) نے شاعری کو زندگی کی تنقید کہا ہے۔ شاعری کے سماجی منصب کو نمایاں کیا ہے۔ آرنلڈ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص شائستہ اور مہذب بننا چاہتا ہے اور اس کو کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ ادب عالیہ خصوصاً شاعری کا مطالعہ کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرد کو سماجی بنانے اور اس کو سماجی طور پر باشعور اور حساس بنانے میں ادب کا ایک خاص رول ہوتا ہے۔

سماجیاتی مفکرین نے بھی فنون لطیفہ اور ادبیات کے سماجی منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے ادب کو سماجی کنٹرول کا ایک اہم ذریعہ بتایا ہے۔ جس طرح رسوم و رواج، قوانین، رائے عامہ اور اشتہار فرد کے افعال اور رکھ رکھاؤ کو کنٹرول کرتے ہیں اسی طرح فنون و ادب بھی سماجی زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ سماجی زندگی میں اعلیٰ اقدار اور آدرشوں کی ترویج کر کے اس کو توازن، آہنگ، نرمی اور تسلسل عطا کرتے ہیں۔

ادب جس طرح سماجی ماحول کو متاثر اور تبدیل کرتا ہے اسی طرح یہ فطری اور مادی ماحول پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ انسان میں حسن کا جذبہ اور لطافت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اس میں اپنے مادی ماحول کو سنوارنے اور حسین بنانے کی ترغیب اور تحریک پیدا کرتا ہے وہ اپنی رہائش گاہوں کو آراستہ کرتا ہے۔ اطراف میں ایک باغ یا پھلواری کی نشو و نما کرتا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھل کر اس کے ذوقِ جمال کو تسکین دیتے ہیں۔ ماحول کو خوبصورتی عطا کرتے ہیں اور روح کو فرحت بخشتے ہیں۔ اسی طرح انسان اپنی بستیوں اور شہروں کو خوشنمائی عطا کرتا ہے اور ان کو ایک خاص انداز سے آراستہ

وزیر اعظم
شری راجیو گاندھی
اتر پردیش ہندی سنستھان
کی جانب سے ۶؍ نومبر
۱۹۸۵ء کو رویندرالیہ لکھنؤ
میں منعقدہ تقسیم انعامات
تقریب کا افتتاح کرتے
ہوئے۔ وزیر اعلیٰ شری
ویر بہادر سنگھ بھی (اوپر کی)
تصویر میں نظر آ
رہے ہیں:-
(درمیانی تصویر میں)
وزیر اعظم ممتاز ہندی
ادیب شری جینیندر کمار
کو بھارتی پرسکار
دیتے ہوئے۔ گورنر اتر پردیش
جناب محمد عثمان عارف
بھی وزیر اعظم کے ساتھ
نظر آ رہے ہیں:
(نیچے) حاضرین کا ایک منظر۔
تصویر: نیر زیدی









وزیر اعظم شری
راجیو گاندھی دو
اسکول کی گولڈن
جبلی تقریبات کے
موقع پر اسکول کے
اولڈ بوائز کے سا

گورنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف ۲۳ نومبر ۸۵ء کو راج بھون لکھنؤ میں پانڈیچیری
کے لیفٹیننٹ گورنر شری تربھون پرشاد سے محوِ گفتگو ہیں۔





گورنر اتر پردیش جناب محمد عثمان عارف کی خدمت میں ۱۱ دسمبر ۸۶ء کو راج بھون میں یونی سیف کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں دنیا کے بچوں کی صورتحال سے متعلق ۸۶ء کی رپورٹ پیش کی گئی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں چیف سکریٹری شری کلیان کرشنن بھی نظر آرہے ہیں۔



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۲۱ دسمبر ۸۵ء کو سکریٹریٹ (انیکسی) میں مولانا اسد مدنی (ایم پی) سے محوِ گفتگو ھیں



ہندی۔ اردو سنگم کی جانب سے ۲۳ ۔ نومبر ۸۵ء کو سہکاریتا بھون لکھنؤ میں آنجہانی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی یاد میں منعقدہ "ایک شام اندرا کے نام" کے موقع پر سنگم کے جنرل سکریٹری شری حیات وارثی وزیراعلا شری ویر بہادر سنگھ کا استقبال کرتے ہوئے

"ایک شام ۔ اندرا کے نام" کے موقع پر وزیراعلا شری ویر بہادر سنگھ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ۔



کرتاہے یہ اس کے جذبۂ حسن کا ہی نتیجہ ہوتا ہے جس کو فرد کے اندر پیدا کرنے میں فنون و ادب کا خاص ہاتھ ہوتا ہے۔

مادی اور سماجی ماحول کو متاثر کرنے اور بدلنے میں مذہبی کتابوں نے بھی زبردست کام کیا ہے قرآن، مہابھارت اور رام چرت مانس کو مذہبی کتابیں ہونے کے ساتھ ساتھ، بالترتیب عربی، سنسکرت اور ہندی (اودھی) زبان کا ادبی شاہکار بھی مانا جاتا ہے۔ قرآن کے اثر اور تاثیر نے سارے عالم کے مادی اور سماجی ماحول کو بدلا ہے۔ قوموں کو ایک مکمل ترین نظام حیات دے کر انسانوں کے ذہن پر چھائے ہوئے توہمات اور جہالت کے اندھیرے کو ختم کیا ہے اور ظلمت پسندی سے نکال کر انسان کو علم اور عمل کی روشنی میں لا کر کھڑا کیا ہے۔ قرآن نے آزادی، مساوات اور اخوت کے آفاقی اقدار پر زور دے کر قوموں کی انفرادی اور سماجی زندگی کو بالغ نظری اور روشن خیالی عطا کی ہے اور ایک نئی تہذیب اور تمدن سے ان کو آشنا کیا ہے۔ قرآن کی تاثیر کا راز جہاں اس کے پیغام کی ہمہ گیری میں پوشیدہ ہے وہیں اس کی بے پناہ ادبی نزاکتوں اور لطافتوں میں بھی پنہاں ہے

اسی طرح مہابھارت کی ادبی حیثیت بھی مسلم رہی ہے اور اسکو سنسکرت کا ادبی شہ پارہ مانا جاتا ہے۔ مہابھارت ہزاروں سال سے ہندو سماج کے خد و خال کو اجاگر کرتی رہی ہے اور اس کا دل یعنی "گیتا" ہندوؤں کے لیے روحانی وجدان اور اخلاقی ہدایت کا سرچشمہ رہی ہے۔ مہابھارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ بھارت میں ہے وہ مہابھارت میں ہے۔ تلسی داس کی رام چرت مانس بھی ہندی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس طرح خواص مہابھارت سے شغف رکھتے آئے ہیں اسی طرح رام چرت مانس عوام میں مقبول رہی ہے اور وہ اس سے وجدان اور روشنی حاصل کرتے رہے ہیں اور اس رزمیے کے کرداروں کی شخصیت اور اقدار کی تقلید کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتے رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں رام لکشمن، سیتا اور ہنومان کے تئیں بے پناہ عقیدت کے جذبات پیدا کرنے اور ان کی پوجا کو عام کرنے کا سہرا تلسی داس کی رام چرت مانس کے سر ہے۔

جذبۂ حسن کو ابھارنے، لطیف احساسات کو بیدار کرنے اور اعلیٰ اقدار کی ترویج کے ساتھ ساتھ ادب فرد میں شجاعت اور دلیری کے جذبات کو بھی فروغ دیتا ہے۔ قدیم ایران میں لوگوں میں جنگجویانہ جذبات کو ابھارنے میں رزمیہ شاعری کا اہم رول رہا ہے فردوسی کا شاہنامہ رزمیہ شاعری کے کمالات سے بھرا ہوا ہے۔ رزمیہ نظمیں اس وقت پڑھی جاتی تھیں جب سورما میدان میں جنگ کے لیے جاتے تھے۔ یہ نظمیں ان کے جذبۂ شجاعت کو للکارتی تھیں۔ عرب میں بھی قبل از اسلام اور مابعد اسلام دونوں ہی عہدوں میں جنگ کے موقعہ پر رجز یہ اشعار پڑھے جاتے تھے اور سپاہیوں کو جوش میں لایا جاتا تھا۔

ہندوستان میں ہندی ادب کا ابتدائی دور رزمیہ شاعری کا دور (دیرگاتھا کال) رہا ہے آلہا اسی دور کی تخلیق ہے یہ آج بھی ملک میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے محنت کش طبقہ اس سے خاص شغف رکھتا ہے اور وجدان لیتا ہے۔ یہ ہمت اور جاںنثاری کے جذبات کو فروغ دیتی ہے قدیم راجاؤں کے دربار میں درباری شاعر ہوا کرتے تھے جن کو "چارن" "بیدھ گاتھک" اور "راجیہ کوی" کہا جاتا تھا۔ یہ کوی اپنے ہم وطنوں میں وطن سے محبت اور دشمن کے خلاف جنگ میں جاںنثاری اور دلیری کے جذبات کو ابھارنے کے لیے نظمیں لکھا کرتے تھے چند بردائی پرتھوی راج کا درباری شاعر اور صلاح کار [illegible] نے "پرتھوی راج راسو" نام کی رزمیہ نظم لکھی تھی۔ بھوشن شیواجی کا درباری شاعر تھا۔ یہ رزمیہ شاعری ہی کرتا اور سناتا تھا۔

اردو ادب نے بھی ہم وطنوں میں حب الوطنی، جاںبازی اور سرفروشی کے جذبات پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اقبال اور نظیر اکبر آبادی نے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی عکاسی اپنی نظموں میں کر کے قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے ماحول سازگار کرنے کے سلسلے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔ اقبال

کی نظمیں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" "ہمالیہ" نیا شوالا وغیرہ حب الوطنی کے جذبات سے معمور اور سرشار ہیں اور ان نظموں نے ایک خاص ذہن کی تعمیر کی ہے اور فرقہ وارانہ یگانگت اور یکجہتی کے جذبات کو فروغ دے کر ملک میں قومی ہم آہنگی اور اتحاد برقرار رکھنے میں مدد دی ہے۔ آزادی کے مجاہدین اور سرفروشوں نے جن نعروں اور نغموں کی تخلیق کی ہے انھوں نے جنگِ آزادی کے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے اور جبر و استبداد سے ٹکرانے کے لیے ان کو وجدان دیا ہے۔ "انقلاب زندہ باد" اور "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جس طرح انقلابِ فرانس کو تین الفاظ پر مشتمل نعرے "آزادی، مساوات، اخوت" (LIBERTY, EQUALITY, FRATERNITY) نے توانائی بخشی تھی اسی طرح برطانوی سامراج کے خلاف ہندستانیوں کی جنگِ آزادی کو "انقلاب زندہ باد" کے نعرے سے طاقت حاصل ہوئی تھی۔

۲۔ سیاسی، سماجی و اقتصادی ادب و ماحول

سیاسی، سماجی اور اقتصادی ادب اگرچہ ادبِ عالیہ کے تحت نہیں آتا لیکن اس قسم کے ادب نے بھی کثیر الجہتی ماحول کو متاثر کرنے اور بدلنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس کا دور اب ختم ہو چکا ہے، کا ارتقا، کچھ خاص نظریات کا حامل رہا ہے اور اس کی پشت پناہی کے لیے بھی مخصوص افکار وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔ انگلینڈ میں ہربرٹ اسپنسر (HERBERT SPENCER) نے ڈاروِن کے نظریات کو وسعت دے کر انسانی سماج پر ان کا اطلاق کیا تھا اور ان کے پس منظر میں ہی انسانی سماج کا تجزیہ کیا تھا۔ اسپنسر نے اس امر پر زور دیا تھا کہ انسانی سماج میں بھی بقائے وجود کے لیے جد و جہد کا عمل چلتا رہتا ہے۔ اس لیے صرف مضبوط ترین عناصر کو ہی بقا کا حق ملنا چاہیے جو کہ اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ ان نظریات کے ذریعہ نجی معیشت اور فرد کو اقتصادی عمل کی مکمل آزادی اور اس میں حکومت کی کم سے کم مداخلت پر زور دیا گیا تھا اس سے سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت حاصل ہوئی تھی۔

یورپ میں ان نظریات کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ہائک (HAYEK) اور مائیسز (MISES) نے اور امریکہ میں ولیم گراہم سمنر (W. G. SUMNER) نے فروغ دیا تھا۔ سرمایہ داری نے ایک طویل تاریخ اور ایک خاص ہمہ گیر تہذیب کی تخلیق کی تھی۔

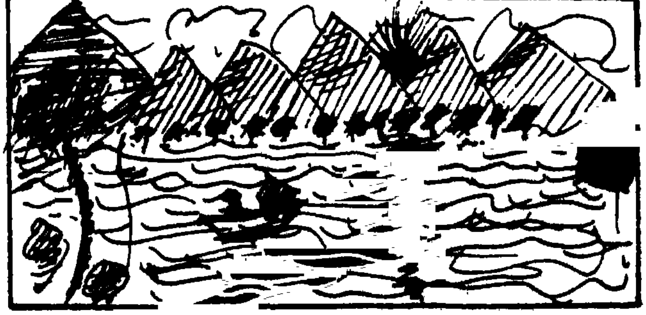
اشتراکی نظام بھی جو سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ عمل میں وجود میں آیا تھا، کچھ مخصوص نظریات کا ہی نتیجہ تھا۔ مارکس (MARX) انگلز (ENGELS) لینن (LENIN) اور ماؤ (MAO) کے نظریات اور تحریروں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اس کو یکسر بدل دیا ہے اشتراکی نظام ان مفکرین کے نظریات کی ہی دین ہے۔ ان نظریات نے دنیا کو ایک نئے نظامِ حیات سے روشناس کرایا ہے اور کروڑوں مزدوروں اور محنت کشوں کو استحصال، غربت، جہالت اور پسماندگی کے بھیانک اندھیرے سے نکالا ہے اور سیاسی اقتصادی اور سماجی نظام میں اشتراک و تعاون اور مساوات کی اعلیٰ اقدار کی ترویج کر کے سارے عالم کے سامنے امید کی ایک نئی کرن پیش کی ہے۔

• • •

اندر سروپ دت نادآں
بی۔ ۳/۲۶۹، پنجم وہار، نئی دہلی

جزیرہ

میں جانتا ہوں
کہ تم ہو اُس کامراں جزیرے کی سخت مٹی
جو آنسوؤں سے بھرے سمندر کی گود میں مسکرا رہا ہے
جو اپنے سینے پہ پنچ تارے سجا سجا کر
فلک کو آنکھیں دکھا رہا ہے
مگر نہیں ہے خبر یہ جس کو
کہ موت ساماں
مہیب طوفاں
اٹھے ہیں اکثر سمندروں سے
اور ان گنت
کامراں جزیروں کو گود میں لے کے سو گئے ہیں
اور ان جزیروں کا نام لیوا کوئی نہیں ہے بھرے جہاں میں



کشور سلطانہ
۱۳۹۷، افغانان، کرتپور
(بجنور)

زندگی سے خطاب

مجھ کو معلوم ہے دکھ درد ترا، غم تیرا
مجھ سے پوشیدہ نہیں کوئی بھی عالم تیرا
جانتی ہوں، کہ ہے ہر لمحہ جہنم تیرا
وقت نے توڑ دیا عزمِ مصمم تیرا
پھر بھی مایوس نہ ہو تیری پرستار ہوں میں
لاکھ دشمن ہے جہاں تیری طرفدار ہوں میں
تو نہ حالات کو گھبرا تری غمخوار ہوں میں
خود کو تنہا نہ سمجھ تیری مددگار ہوں میں

مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، برا عالم تیرا
جانتی ہوں کہ نہیں کوئی بھی ہمدم تیرا
پھر بھی بانٹوں گی میں دکھ درد ترا غم تیرا
تجھ کو لوٹاؤں گی پھر عزمِ مصمم تیرا
حوصلہ، زندہ دلی، جرأت و ہمت دے کر
ولولہ، پختہ دلی، عزم کی دولت دے کر
آگہی، حسنِ عمل، ذوقِ عبادت دے کر
ناز فرمائے خدا جس پہ وہ عظمت دے کر
زندگی یاس کی دلدل سے نکالوں گی تجھے
غم نہ کر قالبِ حالات میں ڈھالوں گی تجھے

منشا مرزا
۸۳، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

لکھنؤ عروج و زوال کے آئینے میں

جس لکھنؤ کو آج آپ صنعتی ترقی سے آراستہ ہو کر اپنے اصل چہرے سے تیزی کے ساتھ محروم ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ایک زمانے میں اس کی تہذیبی میراث اور ادبی روایات کا ہر زبان پر ذکر تھا. عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس قسم کی نفاست، رواداری، شائستگی، وضع داری اور شرافت نفس کا مظاہرہ کسی زمانے میں لکھنؤ میں دیکھنے کو ملتا تھا اور جس کی تشکیل و تعمیر دلی کی بربادی کے بعد اٹھارہویں صدی میں پہلے فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس کی کوئی مثال دنیا کی تہذیبی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ اس تہذیب کی نشو نما میں لکھنؤ کے عوام و خواص دونوں نے برابر سے حصہ لیا تھا۔ اس کی سرپرستی ایک طرف تو یہاں نوابوں اور امرا نے فراغ دلی سے کی تو دوسری طرف یہاں کے شاعروں، ادیبوں، صوفیوں، فقیروں، سپاہیوں، غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں نے بھی اس کی بھرپور آبیاری کی۔ یوں تمام طبقوں کی مشترکہ کوششوں سے یہ نئی گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی۔

اس تہذیب کو مولانا عبدالحلیم شرر نے "ہندستان میں مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ" قرار دیتے ہوئے یہ صحیح کہا ہے کہ اس پر "پرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہو گیا"۔[1] اس تہذیب کے متعلق ڈاکٹر صفدر حسین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ "صبح بنارس کی تازگی، شام اودھ کی ملاحت اور شب مالوہ کی جلوہ گستری" یہاں ایک ساتھ دیکھنے کو مل جاتی ہے۔[2] اور مرزا جعفر حسین نے بجا طور پر اس تہذیب کو "مقامی ہندو روایات اور ایرانی جاہ و جلال کا ایک حسین و جمیل اور دلفریب انضمام" قرار دیا ہے۔[3] یہ کہانی اپنے آپ میں نہایت عبرت انگیز اور خاصی دلچسپ بھی ہے کہ لکھنوی تہذیب کا عروج کن حالات کے تحت ہوا تھا اور اس کے زوال کے کیا اسباب تھے؟

لکھنؤ کے عروج کی تاریخ، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، دلی کے زوال کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ ایک عشرت کدہ اجڑا اور دوسرا آباد ہوا۔ دلی کی بربادی اور لکھنؤ کی آبادی کی کہانی کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ تہذیبیں مٹتی نہیں، اپنی ماہیت بدل کر دوسری تہذیبوں میں ضم ہو جایا کرتی ہیں۔ لکھنؤ کی زرخیز مٹی میں دلی کے گل بوٹوں کو پھلنے پھولنے اور اپنی نئی شکل ظاہر کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہی مغلیہ سلطنت کی پرشکوہ عمارت میں شگاف پڑنے شروع ہو گئے تھے اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد تک پہنچتے پہنچتے یہ عمارت بالکل ہی منہدم ہو کر رہ گئی. وہ افراتفری اور بدنظمی کا ایسا پرآشوب دور تھا کہ جس میں دلی نہیں معلوم کتنی بار اجڑی اور اس پر جان چھڑکنے والے اپنی اپنی جانیں بچا کر اسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے پر مجبور رہے۔ دلی کے اس دور کی بربادی کا نقشہ یوں تو وہاں کے تمام اہم شعرا نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے، لیکن میر نے اپنے ایک شعر میں اس عہد کا پورا

کر سب سمیٹ کر بیش کر دیا ہے۔

نہاں کر کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

دہلی سے اجڑے ہوئے قافلے جب لکھنؤ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پناہ گزیں ہوئے تو اپنے ساتھ دہلی مرحوم کی روایات لے کر آئے۔ ان تہذیبی روایات اور اودھ کی ثقافتی میراث کی آمیزش سے ایک نئی اور انوکھی تہذیب پروان چڑھی جسے ہم لکھنوی تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سید سالار مسعود غازی کی ہندستان آمد (تقریباً ۱۰۳۰ء) کے بعد یہاں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا وہ یہاں کے برہمنوں اور کائستھوں کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے۔ مذہبی رواداری اور صلحِ کل کا جذبہ یہاں کے باشندوں میں فطری طور پر ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے۔ ان آنے والے مسلمانوں میں شاہ پیر محمد شاہ اور شاہ مینا جیسے برگزیدہ صوفی حضرات بھی شامل تھے جنھوں نے اس سرزمین کے تمام باشندوں کو بلا تفریقِ مذہب و ملت امن و آشتی کا پیغام سنایا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغل شہنشاہ ہمایوں نے جون پور میں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست یاب ہو کر یہاں پناہ لی تھی۔ اکبرِ اعظم کے دور میں لکھنؤ نے کافی ترقی کی اور یہاں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا اکبر نے ہی شیخ عبدالرحیم کو لکھنؤ جاگیر کے طور پر عطا کیا تھا۔ شیخوں نے اس شہر میں سکونت اختیار کرنے کے بعد اسے ایک اہم تجارتی مرکز بنا دیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے دور میں جب ملا نظام الدین فرنگی محل میں آ کر اقامت پذیر ہوئے تو یہ شہر علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ اس تمام عرصہ میں شیخ زادے یہاں کے معاشرہ پر چھائے رہے۔ انھوں نے مچھی بھون اور پنج محل کی شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ مچھی بھون اور پنج محل کے اطراف میں بلا اجازت قدم بھی رکھ سکے۔

آخر ۱۷۲۲ء میں نواب سعادت خاں برہان الملک کو جو نیشاپور کے سید زادے تھے اودھ کا صوبے دار مقرر کر کے لکھنؤ بھیجا گیا اور انھوں نے نہایت حکمت عملی سے بلا خون خرابے کیے شیخ زادوں کو زیر کیا اور قلعۂ مچھی بھون پر قبضہ حاصل کیا۔ یہیں سے لکھنؤ کی اس گنگا جمنی تہذیب نے تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کرنا شروع کر دیں، جس کے متعلق مرزا جعفر حسین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس کی تعمیر میں اودھ کی قدیم ہندو روایت اور ایران کی جاہ و جلال سے پُر اسلامی [illegible] روایات نے برابر کا حصہ لیا ہے۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد تک اودھ کی راجدھانی فیض آباد تھی جس پر کسی زمانہ میں راجہ رام چندر جی راج کرتے تھے، مگر نواب شجاع الدولہ کے انتقال (۱۷۷۵ء) کے بعد جب نواب آصف الدولہ مسندِ حکومت پر فائز ہوئے تو انھوں نے فیض آباد کے بجائے صوبۂ اودھ کا پایۂ تخت لکھنؤ کو قرار دیا اور اس کے ساتھ ہی لکھنؤ کا دربار شان و شوکت اور عیش و عشرت کے لیے سارے عالم میں مشہور ہو گیا۔ لیکن ان عشرت پسند اودھ باسیوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے عشرت کدے بہت جلد ویران کر دیئے جائیں گے۔ علی وادی نے مرتے وقت سراج الدولہ کو انگریزوں کے خطرے سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا، لیکن بکسر اور پلاسی کی شکستوں نے سراج الدولہ کو بھی بے بس کر دیا۔ پھر نواب آصف الدولہ کا دور آیا جنھوں نے آصفی امام باڑے اور رومی دروازے کے علاوہ اور بھی لاتعداد شاندار عمارتیں تعمیر کروا کر اس شہر کو قابلِ دید بنا دیا۔

اسی دور میں کلاڈ مارٹن نے شاندار کوٹھی تعمیر کرانے کا سلسلہ شروع کیا اور یہاں کی امارت، جاہ و جلال اور شان و شوکت کی داستانیں دنیا بھر میں مشہور ہونے لگیں۔ آج جب کہ یہ تہذیب مٹ چکی ہے۔ اس کے شاندار مرقعوں کو دیکھ کر اور اس کی [illegible] داستانیں سن کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ وہ کیسے عجیب لوگ تھے جنھوں نے اس عشرت کدے کو آباد کیا اور یہاں کی محفلوں کی رونق بنے، لیکن یہ نہ دیکھ سکے کہ جن بنیادوں پر وہ عالی شان محلات تعمیر کرتے چلے جا رہے ہیں، وہ اندر سے کتنی کھوکھلی اور کمزور ہیں ہر حال اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود یہ لوگ آج بھی بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ وقت نے انھیں طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا ہے۔ تاہم فانوسِ تاریخ میں اکثر ان کی شکلیں جگمگا اٹھتی ہیں اور زبانِ حال سے یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ اپنے تمام تضادات کے باوجود کیا ہم شاندار نہ تھے؟

غازی الدین حیدر کے دور میں لکھنؤ کی ظاہری شان و شوکت اپنی انتہا پر پہنچ گئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے دربار سے اودھ کے حکمرانوں کو بادشاہ کا خطاب مل گیا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے تک اس ظاہری شان و شوکت میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا گیا۔ لیکن اب اس کی بنیاد اندر ہی اندر ہلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ظاہر ہے دکھاوے، جاہ و جلال اور شان و شکوہ کی چکا چوند میں کوئی تاریخ کے اس مہیب آسیب کو نہ دیکھ سکا جس نے آن کی آن میں اس عمارت کو بالکل ہی تاراج کر کے رکھ دیا۔

شجاع الدولہ کے بعد اودھ کے حکمرانوں میں کوئی ایسا جری پیدا نہ ہوا جو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک سکتا۔ شجاع الدولہ کے بعد کے تمام حکمراں وقت کے بدلتے ہوئے تیوروں کو نہ پہچان سکے۔ انگریز اپنے ریذیڈنٹوں کی معرفت ان حکمرانوں کو اپنی سازش کے جال میں جکڑتے چلے گئے اور ان کے بے نام اقتدار کی جڑوں کو اس قدر کھوکھلا کر دیا کہ وہ محض ایک فرضی چیز بن کر رہ گیا یہاں تک کہ واجد علی شاہ کا دورِ آخر آن پہنچا۔ یہ مختصر دور ایک طرف لکھنؤ کے عروج کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے تو دوسری طرف لکھنؤ کے زوال کا کھلا اعلان بھی ہے۔ واجد علی شاہ انقلاب کی آہٹ کو سن چکے تھے، مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے کہ وہ محض برائے نام اور فرضی اقتدار کے مالک تھے، تاہم انھوں نے اپنی حد بھر کوشش کی، لیکن وقت کی کروٹ کو کون روک سکا ہے۔ تہذیبوں کے بننے اور بگڑنے کے فطری عمل کو کون ٹال سکتا تھا؟

راگ رنگ کی محفلوں اور رقص و موسیقی کے ہنگاموں سے وقت بچا کر واجد علی شاہ نے اپنی فوج کے رسالوں پر توجہ دینی چاہی مگر یہ ان کی سعیٔ لاحاصل تھی۔ ان کے پاس فوج تھی ہی کہاں؟ پچھلے حکمرانوں نے ریذیڈنٹ بہادر کی مسلسل مداخلتوں کے آگے سپر ڈال کر فوج کی کمان ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دی تھی۔ واجد علی شاہ کو جب یہ احساس ہوا کہ بادشاہ کہلانے کے باوجود ان کے پاس اختیارات نام کی کوئی شے نہیں ہے تو وہ حیران رہ گئے۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ریذیڈنٹ کی منظوری حاصل کرنا لازمی تھا۔ ابھی وہ قیصر باغ کی رونقوں سے سر اٹھا کر تاریخ کے حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ ۱۸۵۶ء کا انقلابی حکم نافذ ہو گیا اور وہ اسیر کر کے مٹیا برج (کلکتہ) بھیج دیئے گئے۔[1]

یوں لکھنؤ کے عروج کی کہانی زوال میں بدل گئی۔ ۱۸۵۷ء کے خوں آشام ہنگام میں بیگم حضرت محل اور ان کے جاں باز ساتھیوں نے (جن میں ہندو و مسلمان سب شامل تھے) انگریز فوج سے زبردست ٹکر لی، جس کی نشانیاں آج بھی بیلی گارد کے کھنڈرات پر نقش ہیں۔ اور تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ سقوطِ لکھنؤ کا سانحہ سب سے آخر میں پیش آیا۔

مرزا جعفر حسین نے "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" میں لکھنوی تہذیب کے اس انحطاط اور زوال سے بحث کرتے ہوئے، تین اسباب گنوائے ہیں۔ اول یہ کہ مغربی تہذیب ایشیائی تہذیب پر غالب آگئی، دوم یہ کہ جاگیردارانہ نظام نے دم توڑ دیا اور سوم جو سب سے اہم ہے یہ کہ تعیش بے تحاشا، "تباہی کا سبب بنا جس طرح اور تہذیبیں عروج و زوال کے مختلف مدارج سے گزر کر، نئی تہذیبوں کے لیے جگہ چھوڑ دیتی ہیں، اسی طرح لکھنوی تہذیب نے بھی مغرب کی تہذیب نو کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ دراصل اس تہذیب کے عروج میں ہی اس کے زوال کے اسباب مضمر تھے جنھیں اس کے حکمراں دیکھ نہ سکے۔ آخر میں واجد علی شاہ نے اسے محسوس بھی کیا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ بساط الٹنے ہی والی تھی۔ بالآخر ۱۸۵۷ء کے سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا۔ اب شان و شوکت، جاہ و جلال اور رواداری کی وہ داستانیں داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ لکھنوی تہذیب کی کچھ مٹی ہوئی نشانیاں اگر باقی بھی رہ گئی تھیں، تو ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے انھیں بالکل ہی فنا کر دیا اب تو "داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی" کوئی آخری شمع بھی نظر نہیں آتی۔

حوالے :-

[1] گزشتہ لکھنؤ، مولانا عبدالحلیم شررؔ، ترتیب رشید حسن خاں، صفحہ ۱۱
[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ڈاکٹر سید صفدر حسین، " ۱۱
[3] قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، مرزا جعفر حسین، " ۴۲۰

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد
لکھنؤ

دشتِ زرد زرخیز

(نہیب غوری کے نام)

تجھے ڈھونڈتی ہے مری نظر
اسی رہگذر اسی موڑ پر
کہ جہاں تھا میرا تو ہمسفر

ترے نقشِ پا تھے یہیں کہیں
ترے راستوں پہ سجے ہوئے
میں انھی کو دیکھ کے چل پڑا
سرِ رہگذر سرِ رہگذر

ترے شہرِ زر کی گلی گلی
تری جستجو میں نکل پڑی
تری خوشبوؤں کی تلاش میں
تری یاد مجھ کو بھی لے چلی

صفِ دوستاں سرِ دشمناں
میں جہاں گیا
میں جدھر گیا
ترا ذکر روز و شب رہا
مرے ساتھ ساتھ ہی سب رہا

وہ ترا خلوص وہ دوستی
وہ محبتیں وہ رفاقتیں
تری سادگی تری چاہتیں
وہ سخن کے پھول وہ گفتگو
وہ قہقہے وہ ہاؤ و ہو

میں اُداس اُداس اسی موڑ پر
وہ جدھر
ترا مکان ہے
یہی سوچ کر ٹھٹھک گیا
یہ نگر تو بے چراغ ہے
یہاں کس کا کوئی سراغ ہے
یہ جو گھر ہے اب اُجاڑ ہے

ترے بعد سارے دیار میں
اڑی ایسی دھول کہ جو ہر طرف
یہ جہان
خاک ہو گیا
جو بہت قریب تھا کھو گیا
یہاں کون ہے جو مرے لئے
سرِ راہ پلکیں بچھا سکے
مجھے دوست کہہ کے بلا سکے

ڈاکٹر آفاق فاخری
جلال پور۔ ضلع فیض آباد

غزل

وہ شہر جس کو شہرِ عذاب لکھا ہے
اسی کو لوگوں نے عزت مآب لکھا ہے

تمھارے شہر میں پتھراؤ سے جو زخم آئے
ہم اہلِ دل نے انھیں بھی گلاب لکھا ہے

بس اک لفافے میں تتلی کا پر ملا مجھ کو
عجیب اس نے یہ خط کا جواب لکھا ہے

جہاں جہاں سے طبیعت ہو آپ پڑھ لیجے
ہمارے چہرے پہ دل کا نصاب لکھا ہے

چلو کہ سلوٹیں آفاق گن لیں بستر کی
ہماری راتوں کا اک اک حساب لکھا ہے

کیف احمد صدیقی
کیف منزل
[illegible] سیتاپور

زیب غوری کی یاد میں

"زردزرخیز" اس کی شخصیت
کھو گئی نیلگوں خلاؤں میں
محوِ آہ و فغاں ہے شہرِ سخن
سسکیاں بھر گئیں فضاؤں میں

کچھ دنوں بعد مضطرب ہو کر
وہ وطن سے بہت ہی دُور گیا
اب پلٹ کر کبھی نہ آئے گا
اپنے گھر سے وہ اتنی دُور گیا

خوں فشاں ہے نگارِ شعر و سخن
شاعری کا نصیبہ پھُوٹ گیا
اک اُبھرتا ہوا ستارۂ فن
آسمانِ ادب سے ٹوٹ گیا

اس کے دل کو قرار مل نہ سکا
بمبئی کی حسین باہوں میں
آخری نیند سو گیا آخر
وہ کراچی کی شاہراہوں میں

سازِ ہستی کا آخری نغمہ
اس کی سانسوں کے ارتعاش میں تھا
کیا خبر تھی کہ اس کا ذوقِ حیات
ان دنوں موت کی تلاش میں تھا

کیا رہا شہر کانپور میں اب
گو وہاں ہیں بہت سے اعلیٰ صفات
سچ جو پوچھو تو زیب کے آگے
زیب دیتی نہ تھی کسی کی ذات

دل میں اک حشرِ اضطراب لئے
شہروں شہروں پھرا وہ آوارہ
جب کہیں بھی سکونِ دل نہ ملا
لوٹ آیا وطن میں دوبارہ

کیفؔ وہ تیرا قدر دانِ سخن
اب کہاں کانپور میں موجود
رمز و حسنات و عشرت و برکات
کچھ غنیمت ہے بس انھیں کا وجود

جاوید الزام

غزل

راہِ غمِ ہستی کو پھُولوں سے سجانا ہے
ظلمت کی فضاؤں کو آئینہ بنانا ہے

جینے کا نیا کوئی انداز نکالو اب
جینے کا ابھی تک کیوں انداز پُرانا ہے

یوں کھول کے دل اپنا، مت ہاتھ ملا سب سے
کب کون بدل جائے کیا کس کا ٹھکانا ہے

معصوم گلابوں کا انداز بدل جائے
اے بادِ صبا تجھ کو اب جھُوم کے آنا ہے

سچ دیکھنے والا ہو، سچ بولنے والا ہو
آئینہ کوئی ایسا بازار سے لانا ہے

اشعار کی محفل میں تنقید کے پتھر سے
ہر حال میں اپنے کو الزام بچانا ہے

کرتاہے یہ اس کے جذبہ حسن کا ہی نتیجہ ہوتا ہے جس کو فرد کے اندر پیدا کرنے میں فنون و ادب کا خاص ہاتھ ہوتا ہے۔

مادی اور سماجی ماحول کو متاثر کرنے اور بدلنے میں مذہبی کتابوں نے بھی زبردست کام کیا ہے قرآن، مہابھارت اور رام چرت مانس کو مذہبی کتابیں ہونے کے ساتھ ساتھ، بالترتیب عربی سنسکرت اور ہندی (اودھی) زبان کا ادبی شاہکار بھی مانا جاتا ہے۔ قرآن کے اثر اور تاثیر نے سارے عالم کے مادی اور سماجی ماحول کو بدلا ہے۔ قوموں کو ایک مکمل ترین نظام حیات دے کر انسانوں کے ذہن پر چھائے ہوئے توہمات اور جہالت کے اندھیرے کو ختم کیا ہے اور ظلمت پسندی سے نکال کر انسان کو علم اور عمل کی روشنی میں لاکر کھڑا کیا ہے۔ قرآن نے آزادی، مساوات اور اخوت کے آفاقی اقدار پر زور دے کر قوموں کی انفرادی اور سماجی زندگی کو بالغ نظری اور روشن خیالی عطا کی ہے اور ایک نئی تہذیب اور تمدن سے ان کو آشنا کیا ہے۔ قرآن کی تاثیر کا راز جہاں اس کے پیغام کی ہمہ گیری میں پوشیدہ ہے وہیں اس کی بے پناہ ادبی نزاکتوں اور لطافتوں میں بھی پنہاں ہے

اسی طرح مہابھارت کی ادبی حیثیت بھی مسلم رہی ہے اور اسکو سنسکرت کا ادبی شہ پارہ مانا جاتا ہے۔ مہابھارت ہزاروں سال سے ہندو سماج کے خدوخال کو اجاگر کرتی رہی ہے اور اس کا دل یعنی "گیتا" ہندوؤں کے لیے روحانی وجدانی و اخلاقی ہدایت کا سرچشمہ رہی ہے۔ مہابھارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ بھارت میں ہے وہ مہابھارت میں ہے۔ تلسی داس کی رام چرت مانس بھی ہندی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس طرح خواص مہابھارت سے شغف رکھتے آئے ہیں اسی طرح "رام چرت مانس" عوام میں مقبول رہی ہے اور وہ اس سے وجدان اور روشنی حاصل کرتے رہے ہیں اور اس رزمیہ کے کرداروں کی شخصیت اور اقدار کی تقلید کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتے رہے ہیں۔ شمالی ہندستان میں رام، لکشمن، سیتا اور ہنومان کے تئیں بے پناہ عقیدت کے جذبات پیدا کرنے اور ان کی پوجا کو عام کرنے کا سہرا تلسی داس کی رام چرت مانس کے سر ہے۔

جذبہ حسن کو ابھارنے، لطیف احساسات کو بیدار کرنے اور اعلیٰ اقدار کی ترویج کے ساتھ ساتھ ادب فرد میں شجاعت اور دلیری کے جذبات کو بھی فروغ دیتا ہے۔ قدیم ایران میں لوگوں میں جنگجویانہ جذبات کو ابھارنے میں رزمیہ شاعری کا اہم رول رہا ہے فردوسی کا شاہنامہ رزمیہ شاعری کے کمالات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ رزمیہ نظمیں اس وقت پڑھی جاتی تھیں جب سپاہی میدان میں جنگ کے لیے جاتے تھے۔ یہ نظمیں ان کے جذبہ شجاعت کو للکارتی تھیں۔ عرب میں بھی قبل از اسلام اور مابعد اسلام دونوں ہی عہدوں میں جنگ کے موقعہ پر رجزیہ اشعار پڑھے جاتے تھے اور سپاہیوں کو جوش میں لایا جاتا تھا۔

ہندستان میں ہندی ادب کا ابتدائی دور رزمیہ شاعری کا دور دیرگا تھا کال) رہا ہے   آلہا اسی دور کی تخلیق ہے یہ آج بھی ملک میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے محنت کش طبقہ اس سے خاص شغف رکھتا ہے   اور وجدان لیتا ہے۔ یہ ہمت اور جانثاری کے جذبات کو فروغ دیتی ہے قدیم راجاؤں کے دربار میں درباری شاعر ہوا کرتے تھے جن کو "چارن" "بدھ گاناک" اور "راجیہ کوی" کہا جاتا تھا۔ یہ کوی اپنے ہموطنوں میں وطن سے محبت اور دشمن کے خلاف جنگ میں جانثاری اور دلیری کے جذبات کو ابھارنے کے لیے نظمیں لکھا کرتے تھے چند بردائی پرتھوی راج کا درباری شاعر اور صلاح کار تھا اور اس نے "پرتھوی راج راسو" نام کی رزمیہ نظم لکھی تھی۔ بھوشن شیواجی کا درباری شاعر تھا۔ یہ رزمیہ شاعری ہی کرتا اور سناتا تھا۔

اردو ادب نے بھی ہموطنوں میں حب الوطنی، جانبازی اور سرفروشی کے جذبات پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اقبال اور نظیر اکبرآبادی نے ہندستان کی ملی جلی تہذیب کی عکاسی اپنی نظموں میں کرکے قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے ماحول سازگار کرنے کے سلسلے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔ اقبال

کی تخلیق "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" "ہمالیہ" "نیا شوالا" وغیرہ حب الوطنی کے جذبات سے معمور اور سرشار ہیں اور ان نظموں نے ایک خاص ذہن کی تعمیر کی ہے اور فرقہ وارانہ یگانگت اور یکجہتی کے جذبات کو فروغ دے کر ملک میں قومی ہم آہنگی اور اتحاد برقرار رکھنے میں مدد دی ہے۔ آزادی کے مجاہدین اور سرفروشوں نے جن نعروں اور نظموں کی تخلیق کی ہے انھوں نے جنگ آزادی کے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے اور جبر و استبداد سے ٹکرانے کے لیے ان کو وجدان دیا ہے۔ "انقلاب زندہ باد" اور "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جس طرح انقلاب فرانس کو تین الفاظ پر مشتمل نعرے "آزادی، مساوات، اخوت" (LIBERTY, EQUALITY, FRATERNITY) نے توانائی بخشی تھی اسی طرح برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستانیوں کی جنگِ آزادی کو "انقلاب زندہ باد" کے نعرے سے طاقت حاصل ہوئی تھی۔

۳۔ سیاسی، سماجی و اقتصادی ادب اور ماحول

سیاسی، سماجی اور اقتصادی ادب اگرچہ ادبِ عالیہ کے تحت نہیں آتا لیکن اس قسم کے ادب نے بھی کثیر الجہتی ماحول کو متاثر کرنے اور بدلنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس کا دور اب ختم ہو چکا ہے، کا ارتقا کچھ خاص نظریات کا حامل رہا ہے اور اس کی پشت پناہی کے لیے بھی مخصوص افکار وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔ انگلینڈ میں ہربرٹ اسپنسر (HERBERT SPENCER) نے ڈارون کے نظریات کو وسعت دے کر انسانی سماج پر ان کا اطلاق کیا تھا اور ان کے پس منظر میں ہی انسانی سماج کا تجزیہ کیا تھا۔ اسپنسر نے اس امر پر زور دیا تھا کہ انسانی سماج میں بھی بقائے وجود کے لیے جد و جہد کا عمل چلتا رہتا ہے۔ اس لیے صرف مضبوط ترین عناصر کو ہی بقا کا حق ملنا چاہیے جو کہ اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ ان نظریات کے ذریعہ نجی معیشت اور فرد کو اقتصادی عمل کی مکمل آزادی اور اس میں حکومت کی کم سے کم مداخلت پر زور دیا گیا تھا اس سے سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت حاصل ہوئی تھی

یورپ میں ان نظریات کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ہائک (HAYEK) اور مائیسز (MISES) نے اور امریکہ میں ولیم گراہم سمنر (W. G. SUMNER) نے فروغ دیا تھا۔ سرمایہ داری نے ایک طویل تاریخ اور ایک خاص ہمہ گیر تہذیب کی تخلیق کی تھی۔

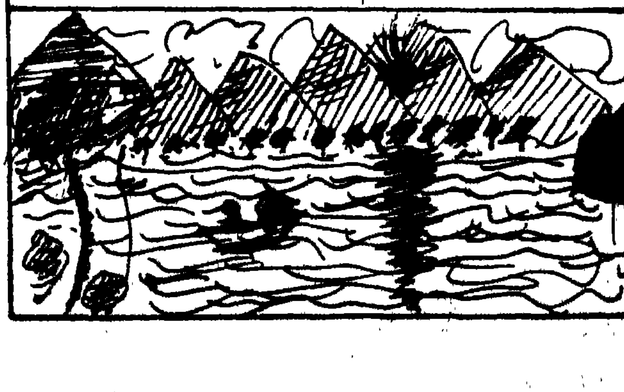
اشتراکی نظام بھی جو سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ عمل میں وجود میں آیا تھا، کچھ مخصوص نظریات کا ہی نتیجہ تھا۔ مارکس (MARX) انجلز (ENGELS) لینن (LENIN) اور ماؤ (MAO) کے نظریات اور تحریروں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اس کو یکسر بدل دیا ہے۔ اشتراکی نظام ان مفکرین کے نظریات کی ہی دین ہے۔ ان نظریات نے دنیا کو ایک نئے نظامِ حیات سے روشناس کرایا ہے اور کروڑوں مزدوروں اور محنت کشوں کو استحصال، غربت، جہالت اور پسماندگی کے بھیانک اندھیرے سے نکالا ہے اور سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام میں اشتراک و تعاون اور مساوات کی اعلیٰ اقدار کی ترویج کر کے سارے عالم کے سامنے امید کی ایک نئی کرن پیش کی ہے۔

•••

اندر سروپ دت ناداں
بی ۔ ۲۶۹/۳، پنچم وہار نئی دہلی

جزیرہ

میں جانتا ہوں
کہ تم ہو اُس کامراں جزیرے کی سخت مٹی
جو آنسوؤں سے بھرے سمندر کی گود میں مسکرا رہا ہے
جو اپنے سینے پہ پنچ تارے سجا سجا کر
فلک کو آنکھیں دکھا رہا ہے
مگر نہیں ہے خبر یہ جس کو
کہ موت ساماں
مہیب طوفاں
اٹھے ہیں اکثر سمندروں سے
اور ان گنت
کامراں جزیروں کو گود میں لے کے سو گئے ہیں
اور ان جزیروں کا نام لیوا کوئی نہیں ہے جہاں میں!



کشور سلطانہ
۱۳۹۷، افغانان کرتپور
(بجنور)

زندگی سے خطاب

مجھ کو معلوم ہے دکھ درد ترا، غم تیرا
مجھ سے پوشیدہ نہیں کوئی بھی عالم تیرا
جانتی ہوں، کہ ہے ہر لمحہ جہنم تیرا
وقت نے توڑ دیا عزمِ مصمم تیرا

پھر بھی مایوس ہو تیری پرستار ہوں میں
لاکھ دشمن ہے جہاں تیری طرفدار ہوں میں
تو نہ حالات کو گھبرا تری غمخوار ہوں میں
خود کو تنہا نہ سمجھ تیری مددگار ہوں میں

مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، برا عالم تیرا
جانتی ہوں کہ نہیں کوئی بھی ہمدم تیرا
پھر بھی بانٹوں گی میں دکھ درد ترا غم تیرا
تجھ کو لوٹاؤں گی پھر عزمِ مصمم تیرا

حوصلہ زندہ دلی جرأت و ہمت دے کر
ولولہ، پختہ دلی عزم کی دولت دے کر
آگہی حسنِ عمل ذوقِ عبادت دے کر
ناز فرمائے خدا جس پہ وہ عظمت دے کر

زندگی یاس کی دلدل سے نکالوں گی تجھے
غم نہ کر قالبِ حالات میں ڈھالوں گی تجھے

مشتاق مرزا
[illegible]

لکھنؤ عروج و زوال کے آئینے میں

جس لکھنؤ کو آج آپ صنعتی ترقی سے آراستہ ہو کر اپنے اصل چہرے سے تیزی کے ساتھ محروم ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ایک زمانے میں اس کی تہذیبی میراث اور ادبی روایات کا ہر زبان پر ذکر تھا. عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس قسم کی نفاست، رواداری، شائستگی، وضع داری اور شرافت نفس کا مظاہرہ کسی زمانے میں لکھنؤ میں دیکھنے کو ملتا تھا اور جس کی تشکیل و تعمیر دہلی کی بربادی کے بعد اٹھارہویں صدی میں پہلے فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس کی کوئی مثال دنیا کی تہذیبی تاریخ میں ملنا مشکل ہے. اس تہذیب کی نشو نما میں لکھنؤ کے عوام و خواص دونوں نے برابر سے حصہ لیا تھا. اس کی سرپرستی ایک طرف تو یہاں نوابوں اور امرا نے فراغ دلی سے کی تو دوسری طرف یہاں کے شاعروں، ادیبوں، صوفیوں، فقیروں، سپاہیوں، غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں نے بھی اس کی بھرپور آبیاری کی. یوں تمام طبقوں کی مشترکہ کوششوں سے یہ نئی گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی.

اس تہذیب کو مولانا عبدالحلیم شرر نے "ہندستان میں مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ" قرار دیتے ہوئے یہ صحیح کہا ہے کہ اس پر "پرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہو گیا".[۱] اس تہذیب کے متعلق ڈاکٹر صفدر حسین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ "صبح بنارس کی تازگی، شام اودھ کی ملاحت اور شب مالوہ کی جلوہ گستری" یہاں ایک ساتھ دیکھنے کو مل جاتی ہے.[۲] اور مرزا جعفر حسین نے بجا طور پر اس تہذیب کو "مقامی ہندو روایات اور ایرانی جاہ و جلال کا ایک حسین و جمیل اور دلفریب انضمام" قرار دیا ہے.[۳] یہ کہانی اپنے آپ میں نہایت عبرت انگیز اور خاصی دلچسپ بھی ہے کہ لکھنوی تہذیب کا عروج کن حالات کے تحت ہوا تھا اور اس کے زوال کے کیا اسباب تھے؟

لکھنؤ کے عروج کی تاریخ، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، دلی کے زوال کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے. ایک عشرت کدہ اجڑا اور دوسرا آباد ہوا. دہلی کی بربادی اور لکھنؤ کی آبادی کی کہانی کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ تہذیبیں مٹتی نہیں، اپنی ماہیت بدل کر دوسری تہذیبوں میں ضم ہو جایا کرتی ہیں. لکھنؤ کی زرخیز مٹی میں دلی کے گل بوٹوں کو پھلنے پھولنے اور اپنی نئی شکل ظاہر کرنے کا پورا پورا موقع ملا.

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہی مغلیہ سلطنت کی پرشکوہ عمارت میں شگاف پڑنے شروع ہو گئے تھے اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد تک پہنچتے پہنچتے یہ عمارت بالکل ہی منہدم ہو کر رہ گئی. وہ افراتفری اور بدنظمی کا ایسا پرآشوب دور تھا کہ جس میں دہلی نہیں معلوم کتنی بار اجڑی اور اس پر جان چھڑکنے والے اپنی اپنی جانیں بچا کر اسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے پر مجبور ہوے. دہلی کے اس دور کی بربادی کا نقشہ یوں تو وہاں کے تمام اہم شعرا نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے، لیکن میر نے اپنے ایک شعر میں اس عہد کا پورا

طفیل احمد انصاری
مفتی محلہ - جون پور

ہادیؔ مچھلی شہری پر ایک نظر

مچھلی شہر علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ شیراز ہند جونپور یوں تو مرکزِ علم تھا ہی مگر اسکا یہ خطہ علم و فن کے سدا بہار اور نادر پھولوں سے رشکِ بوستاں رہا ہے۔ سید محمد ہادی اسی مردم خیز قصبے میں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ قاضی سید ثناء الدین شاہانِ شرقی کے عہد زریں میں قاضی القضاۃ ہو کر جونپور تشریف لائے تھے "آپ نے اپنی تمام عمر درس و تدریس اور زہد و تقویٰ میں گذاری آپ کے فیضِ علم سے بہت سے طلبا مستفیض ہوئے۔"[1] قاضی موصوف کے اہلِ خاندان کے اکثر بزرگ عہدہ قضا پر متمکن رہے ہیں ہادی مچھلی شہری کے والد محترم مولوی سید عبد الرزاق شاکر بھی سب جج تھے۔ شاکر صاحب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے تلامذہ میں تھے۔ عودِ ہندی[2] میں شاکر صاحب کے نام دس مکتوب ملتے ہیں۔

شاکرؔ مچھلی شہری عربی و فارسی کے دلدادہ اور فاضل تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے صاحبزادے کو بھی عربی و فارسی کی تعلیم قصبے کے مکتب میں دلائی۔ انگریزی تعلیم کیلئے ہادی علی گڑھ گئے اور وہاں سے انھوں نے بی۔ اے اور قانون کی سند حاصل کی تعلیم سے فراغت کے بعد وکالت کے پیشے کو اپنایا اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی تقسیم وطن کے بعد کراچی (پاکستان) ہجرت کی اور وہیں پر اپنی تمام عمر علم و ادب کی خدمت میں گذار دی۔

ہادیؔ کو شعر و شاعری کا شوق اپنے والد شاکرؔ سے ورثہ میں ملا تھا بچپن سے ہی شعر گوئی پر مائل ہوئے اور صرف ۱۳-۱۴ سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے۔ اس عمر میں مشورۂ سخن حضرت جلیلؔ مانکپوری سے کیا اور اس طرح جہانِ شاعری میں باقاعدہ داخل ہو گئے اور یوں مشقِ سخن کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ جلیلؔ مانکپوری کی سرپرستی میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے ادبی گلدستوں میں بھی ان کی طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔

ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کے زمانۂ تعلیم کے دوران علم و فن کے اس عظیم مرکز اور شعر و ادب کے ستھرے اور پاکیزہ ماحول نے ہادی مچھلی شہری کو شعر و شاعری سے مزید دلچسپی کا سامان فراہم کیا۔ یہاں کی ادبی و شعری محفلوں میں آپ نمایاں طور سے حصہ لیتے تھے۔ "علی گڑھ منتھلی" اور ایم اے او کالج میگزین میں ہادیؔ کی غزلیں بھی شائع ہونے لگیں۔ اس دور کی ایک غزل کے چند چیدہ چیدہ اشعار پیش کر رہا ہوں جس سے ان کی ابتدائی شاعری نیز تخیلی اور فکری بالیدگی کا اندازہ ہو جائے گا۔ ساتھ ہی ہادی کے ابتدائی شعری رجحانات کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

باوفا یار بے وفا نکلا! | کیا میں سمجھا تھا کیا نکلا
اس کی محفل میں کچھ خبر ہی نہیں | کیا کہا منھ سے اور کیا نکلا
لے چلا دیر سے حرم کو مجھے | دل کافر تو پارسا نکلا
آئے ہیں میرے قتل کرنے کو | ہائے کس طرح مدعا نکلا
ہم سمجھ لیں گے تجھ سے اے زاہد | میکدے کی طرف جو آ نکلا
آ گئے باتھ حضرتِ ناصح | خوب بندوں کا حوصلا نکلا
سارے عالم میں کیا کہوں ہادیؔ | میں ہی ایک موردِ بلا نکلا

مندرجہ بالا غزل کے اشعار قدیم طرزِ سخن کی عکاسی کرتے ہیں۔ مضامین

میں کوئی جدت تو نہیں ہے لیکن شوخی اور حضرت ناصح سے چھیڑ چھاڑ کے ساتھ ہی انداز بیان بھی اس دور کے شعری مذاق سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ بایں ہمہ اشعار میں سلاست و روانی اور صفائی زبان کی خوبی نمایاں ہے۔

الہ آباد کے زمانۂ قیام میں وکالت کے پیشے کی مصروفیت کے دوران جہاں وہ اپنے ناخن تدبیر سے قانون کی گتھیوں کو سلجھانے میں مشغول رہتے تھے وہیں گیسوئے غزل کی آرائش کا عمل بھی جاری رہتا تھا۔ شعر و سخن کی مخصوص ادبی محفلوں و مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ چنانچہ پنڈت رادھے ناتھ کول نے ۱۹۳۴ء میں جو شاندار محفل مشاعرہ الہ آباد میں منعقد کی تھی اس میں بھی ہادی مچھلی شہری ایڈوکیٹ شریک تھے تبھ شعر و شاعری سے حد درجہ شغف اور اردو ادب کی بے لوث خدمت ہادی کا نصب العین تھا۔ اس دور کے مشہور ادبی جرائد زمانہ، الناظر اور اردوئے معلیٰ میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔ پاکستان جانے کے بعد بھی وہاں کے متعدد ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ نیز ریڈیو کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے

حسرت موہانی نے انتخاب سخن کے نام سے اساتذہ کا انتخاب کلام شائع کیا تھا۔ چنانچہ جلد سوم میں ہادی مچھلی شہری کا بھی انتخاب کلام شائع ہوا تھا۔ یہ انتخاب مختصر ہے جو تقریباً پچیس غزلیات پر مشتمل ہے۔ اور ہر غزل کا مطلع اور مقطع انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس دور کی زیادہ تر غزلیں حسن و عشق کے محدود دائرے کے اندر کلاسکی روایت کی بازگشت ہیں پھر بھی کچھ اشعار اپنی طرف متوجہ کرنے کی کشش رکھتے ہیں۔ یہ دیوان تقسیم ملک سے پہلے شائع ہوا تھا جسمیں ہادی کے ابتدائی دور کا کلام بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ اس دیوان کی تقریظ حضرت جگر مرادآبادی نے تحریر کی تھی۔ آیئے حسرت موہانی کی انتخاب کردہ غزلوں کے کچھ اشعار کا جائزہ لیں ؎

دل پہ میرے جو گذرتی ہے وہ گذرے لیکن
یہی نظریں تمہیں اک دن نہ پشیماں کر دیں

اس طرح لذت ایذا کی نہ ہو گی تکمیل
لاؤ زخموں کو نمک بھر کے نمکداں کر دیں

چل گیا مجھ پہ آرزو کا فریب ۔۔۔ بے رخی ان کی التفات ہوئی
پھر لگا دل پہ انکا تیر نگاہ ۔۔۔ پھر وہی آج واردات ہوئی

غبار راہ محبت ہوں پائمال نہ کر ۔۔۔ مٹے ہوؤں کو کہیں اے فلک مٹاتے ہیں
کیا خوشی ہیں کوئی تاثیر ہی باقی نہ رہی ۔۔۔ زندگی غم کی طلبگار ہوئی جاتی ہے
پانی کا وہ اک قطرہ آنسو جسے کہتے ہیں ۔۔۔ فیضان محبت سے دریا نظر آتا ہے
خیر سن لو میرا فسانۂ غم ۔۔۔ یہ تو کہہ دو گے کیا کرے کوئی

ہادی مچھلی شہری کے انتخاب کی ان غزلوں کا تجزیہ کرنے سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ کلام میں روانی و سلاست کے ساتھ اشعار میں درد و اثر کا عنصر بھی موجود ہے۔ کلام میں حضرت جلیل کا سا انداز بیان اور زبان کی گھلاوٹ تو نہیں ہے لیکن اشعار میں کہیں کہیں ترنم اور رنگ الفاظ کے استعمال سے اس کی دلکشی میں اضافہ ہوا ہے۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو ہادی صہبائے مینائی سے سرشار نظر نہیں آتے لیکن اس کے ذائقے سے آشنا ضرور معلوم ہوتے ہیں اسی لیے کہیں کہیں حضرت جلیل کا رنگ بھی نمایاں ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

اس اک نگاہ کرم کا امیدوار ہوں میں
جفا شعار تجھے میری التجا کی قسم
غضب کی چھیڑ ہے ہادی یہ اور کیا کہیے
وہ کھا رہے ہیں مرے ترک مدعا کی قسم
وہ مجھے قتل کر کے نادم ہیں ۔۔۔ نہیں معلوم یہ ادا کیا ہے
انداز نظر سے ہے فقط حسن کی ترکیب
جو شکل نگاہوں میں سما جائے حسیں ہے

سخت جانی کلِ مجھے غم ان کو خنجر کا گلہ
وہ بھی نادم ہوگئے میں بھی پشیماں ہوگیا

محبت میں دلِ مایوس کی دشواریاں ہے ہے
تڑپ اٹھتا ہوں ہادی جب وہ عہدِ یاد کرتا ہوں

حضرت جلیل سے تلمذ حاصل کرنے کے چند سال بعد ہادی کی طبیعت پر جمود طاری ہوگیا اور کئی سال تک انھوں نے شعر و شاعری سے مکمل احتراز کیا۔ ان کی شاعری کا حقیقی اور کامیاب دور ۱۹۱۳ء سے شروع ہوتا ہے جس کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔ اس دوسرے دور میں انھوں نے پھر اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنے ذوقِ سلیم کی رہنمائی میں نیز شعور و آگہی اور قوتِ مشاہدہ کے ساتھ ایسی مشق بہم پہنچائی کہ خود استاد ہوگئے۔ پاکستان کراچی میں انھوں نے از سرِ نو دو دیوان مرتب کیے تھے۔ ایک کا تعلق صرف غزلیات سے ہے اور دوسرا ملّی و مذہبی اور مناظرِ فطرت سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔ ہادی نے غزل کے پورے آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا سلیقہ بھی ہے اور اس پر عبور بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر عبدالوحید ان کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"ہادی کی غزلوں میں بڑی شگفتگی و شیرینی اور درد و اثر پایا جاتا ہے۔ ہمواریٔ کلام اور لطفِ بیان کا یہ عالم ہے کہ آپ غزلوں پر غزلیں پڑھتے جائیے کہیں ثقالت و گرانی کا نام تک نہ پائیگا۔" ؎

ملاحظہ فرمائیں ؎

محوِ کمالِ آرزو مجھ کو بنا کے بھول جا
اپنے حریمِ ناز کا پردہ اٹھا کے بھول جا
لطفِ جفا اسی میں ہے یادِ وفا نہ آئے پھر
مجھ کو ستم کا واسطہ مجھ کو مٹا کے بھول جا

تیاں ہی ابھی آیا تھا کوئے جاناں کا
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
وہ پوچھتے ہیں دلِ مبتلا کا حال اور ہم
جواب میں فقط آنسو بہائے جاتے ہیں

دیکھ کر شمع کی آغوش میں پروانے کو
دل نے پھر چھیڑ دیا شوق کے افسانے کو
ذرے ذرے سے گلستاں میں برستی ہے بہار
کون ایسے میں سنبھالے ترے دیوانے کو

اللہ اللہ محبت کی وہ آئینہ گری
دیکھتا ہوں میں خود اپنے میں سراپا تیرا

وہ دل ہی کیا جو ہو نہ سکا داغ آشنا
وہ زندگی نہیں جو تمنا نہ بن سکی

نگاہِ شوق کی وہ آشفتہ سامانی نہیں جاتی
وہ جلوہ کیا قیامت تھا کہ حیرانی نہیں جاتی

ہادی مچھلی شہری کی غزلیں احساس کی گرمی، شعور کی پختگی سے آراستہ اور اثر و تاثیر سے پر ہیں۔ طرزِ ادا کی ندرت، بیان کی سادگی و پرکاری کے ساتھ حسنِ تغزل کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے غزل کی قدیم فنی روایات کو نئی جہت عطا کی ہے۔ زندگی کے مسائل کو حقیقی انداز میں پیش کر کے جدید غزل کی روایت کے ساتھ بھی حسین امتزاج پیدا کیا ہے۔ ایسے اشعار سے آج کا مذاقِ سخن بھی اپنے مزاج سے ہم آہنگ پا کر کیف و حظ محسوس کرتا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آئیے لطفِ سخن سے سرور حاصل کرنے کے لیے چند اشعار اور ملاحظہ کریں ؎

بیدرد مجھ سے شرحِ غمِ زندگی نہ پوچھ
کافی ہے اس قدر کہ جیے جا رہا ہوں میں

مرا وجود بھی تھا کوئی چیز کیا معلوم
اس اعتبار سے پہلے ہی مٹ چکا ہوں میں
مزارِ خاک کے ذروں میں مل گیا ہوں میں
مآلِ شوق ہوں آئینۂ وفا ہوں میں

خدا گواہ کوئی لطفِ زندگی نہ رہے
خودی کے ساتھ اگر کیفِ بیخودی نہ رہے

خندۂ صبح پر بہت موسمِ گل کو ہے غرور
تم بھی نگاہِ ناز سے دیکھ کے مسکرا تو دو

دور متوسط کے دیگر شعرا کی طرح ہادی مچھلی شہری بھی پیرو غالب کی ہی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جدت نہیں ہے پھر بھی اشعار میں ایک نیا تاثر ضرور ملتا ہے۔ ہادی نے غزل کی روایتی فضا میں نئے موضوعات کو بھی سلیقے کے ساتھ برتا ہے ؎

یا بند انقلاب ہے ہر پھول ہر کلی
تغیرِ رنگ و بو کے سوا کیا چمن میں ہے

ہر مصیبت تھی مجھے تازہ پیامِ عافیت
مشکلیں جتنی بڑھیں اتنی ہی آساں ہو گئیں

یوں تو ہادی کی غزلوں کا خاص موضوع عشق مجازی ہے جو اسکی مختلف کیفیات سے عبارت ہے پھر بھی کہیں کہیں صوفیانہ خیالات کی جلوہ ریزی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اس طرح کے شعروں میں طرز ادا کی لطافت بھی ہے اور دل آویزی بھی جس سے قاری بادہ تصوف سے سرشار ہو کر عرفان حاصل کرتا ہے ؎

تجھ سے ہو کر الگ رہا کیا ہے	اے خدا شانِ ما سوا کیا ہے
مرا وجود حقیقت مرا عدم دھوکا	فنا کی شکل میں ہر چشمۂ بقا ہوں میں
کہاں یہ وسعتِ جلوہ کہاں یہ دیدۂ تنگ	کبھی تجھے کبھی اپنے کو دیکھتا ہوں میں
شمار کس میں کروں نسبتِ حقیقت کو	خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

پھر جہاں یہ بھی رہ و رفاں میں تھیں شاید
اب دل کو خیالِ حرم و دیر نہیں ہے

عشق ہے کیفِ بیخودی اسکو خودی سے کیا غرض
جسکی فضا ہو وصل و ہجر عشق وہ عشق ہی نہیں

ہادی مچھلی شہری کا خاص میدان تغزل ہے جہاں ان کی مشاقی اور قادرالکلامی کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں گل و بلبل کے افسانے بھی ہیں اور عشق و محبت کی روایتی داستان بھی جسمیں شاعر کے نازک دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ اشعار میں شیفتگی اور شگفتگی کے ساتھ ہی انداز بیان کا بے ساختہ پن اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے اور اشعار کے نشتر دل میں لطیف چبھن کا احساس دلاتے ہیں۔

ہادی نے یوں تو اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن رفتہ رفتہ منظومات کی طرف بھی راغب ہوئے اور خاص توجہ نیچرل شاعری پر دی۔ ان کی نظمیں بھی نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ ہیں ہادی نے مناظر فطرت کی عکاسی اور اسکا بیان بڑے ہی فنکارانہ اور حقیقی انداز میں کیا ہے۔ نظموں میں جدت طرازی تو نہیں ہے پھر بھی سادگی و روانی کا ربط و تسلسل، بیان کی صفائی اور طرز ادا اپنی طرف ضرور متوجہ کر لیتا ہے۔ اس دور میں ان کی نظمیں خاصی مقبول ہوئیں جس کی وجہ سے درسی کتابوں میں بھی انھیں شامل کیا گیا۔ اس ضمن میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ پروفیسر وقار عظیم نے ورناکیولر درجات کیلئے "انوار ادب" مرتب کی تھی، اس میں ہادی کی نظم "گلاب کا پھول" وغیرہ کو انھوں نے منتخب کیا تھا بطور نمونہ ہادی مچھلی شہری کی ایک نظم "برسات میں باغ کا نظارہ" کے چند اشعار تحریر کئے جاتے ہیں جس سے شاعر کی مناظر فطرت سے شیفتگی کا بھی اندازہ ہو جائیگا ؎

کالی کالی یہ گھٹائیں یہ سہانا منظر
یہ گرج اور یہ بجلی کی چمک رہ رہ کر

لہلہاتے ہوئے پودوں کی قطاریں ہرسو
جس طرف دیکھئے رعنائی فطرت کا اثر
اللہ اللہ یہ فیاضیٔ موسم کا کمال
اک شجر بھی نظر آتا نہیں بے برگ و ثمر
خوشنما قوس قزح ایک طرف جلوہ فگن
جسمیں ہر رنگ عیاں زرد، گلابی احمر
دل رُبا شوخ ادا بیر بہوٹی ہرسو
دوڑتی پھرتی ہے سبزے پہ برنگِ خوشتر
اس طرح پڑتی ہیں نالابوں میں بوندیں گویا
پانی کی تہہ سے نکلتے ہیں اچھل کر گوہر
تارِ بارش سے ہے آواز ترنم پیدا
بھیرویں گاتا ہو جس طرح کوئی وقت سحر

ہادی کی نظموں میں عام فہم خوبصورت تشبیہہ و استعارہ کا استعمال فطری انداز سے ہوا ہے جس سے نظرا فروز مناظر کی عکاسی میں حسن اور تازگی پیدا ہوگئی ہے۔

آخر میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضرت ہادی مچھلی شہری اردو زبان کے مستند اور قادر الکلام شاعروں کی صف میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں اور انھیں جملہ اصنافِ سخن پر مکمل عبور حاصل ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی مناسب ہوگا کہ فارسی شاعری میں بھی ہادی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک دیوان فارسی میں بھی ہے جس میں ایک ہزار سے زائد رباعیات کے علاوہ غزلیات، قصائد اور منظومات وغیرہ شامل ہیں۔ اردو کلام کی طرح ان کا فارسی کلام بھی بہت وسیع ہے۔ ان کی فارسی منظومات موقر ایرانی مجلات میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

"سربرآوردہ ایرانی ادبا نے تعریف کرتے ہوئے حضرت ہادی کی زبان و تخیل کو ایرانی قرار دیا ہے۔" [۷]

زیر نظر مضمون ہادی مچھلی شہری کے فکر و فن پر ایک تعارف ہے جو اس جذبے کے تحت سپرد قلم کیا گیا ہے کہ اردو زبان و ادب کے ایسے بے لوث محسن کو فراموش نہ کیا جائے۔ امید ہے کہ عصر حاضر کے صاحب نظر ناقدین ہادی کے فکر و فن پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ ☆

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

☆☆

حواشی

(۱) تاریخ شیراز ہند جونپور مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ص ۷۶۶
(۲) عود ہندی۔ مطبوعہ منشی نولکشور واقع کانپور سنہ ۱۹۰۰ء
(۳) علی گڑھ منتھلی جلد ۷ نمبر ۶ جون سنہ ۱۹۰۹ء بحوالہ علی گڑھ میگزین انتخاب نمبر ۱۹۷۱ء۔
(۴) ماہنامہ نیا دور ستمبر ۸۳ء ص ۲۵
(۵) انتخاب سخن جلد سوم ص ۲۷۰-۲۶۵ مطبوعہ یو پی اردو اکادمی
(۶) جدید شعرائے اردو ۵۲۱ مطبوعہ فیروز اینڈ سنز لاہور۔ پاکستان
(۷) ایضاً ص ۵۲۱۔

نہرو کی یاد: (صہ کا بقیہ)

آزادی ملنے کے بعد اپنی زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے مجاہدانہ زندگی بسر کی۔

پنڈت جی میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ عام فہم زبان بولتے ان کا لہجہ بھی بڑا صاف ستھرا ہوتا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نہرو نے کبھی انگریزی تہذیب کی جھلک نہیں پیش کی۔ وہ مشترکہ تہذیب کے نمائندے اور خالص سیکولر کردار کے حامل تھے ان کی زبان ہندستانی ہوتی تھی۔ نہ ٹھیٹھ ہندی نہ ٹھیٹھ اردو بلکہ جب کبھی کوئی ٹھیٹھ زبان ان کے سامنے بولتا تو خفا ہو جاتے تھے۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے اعلا آدرش ہمارے رہبر ہیں ان کی یاد اس طرح ہمارے دل کو تازگی بخش رہی ہے۔ جس طرح ان کی شیروانی میں لگا ہوا گلاب ان کی محبت کی خوشبو بن کر فضا کو مہکاتا رہتا تھا۔ ●●●

رئیس رامپوری

سیف تک روڈ، رامپور

ماحصل کچھ نہ ٹھہرے مگر سوچنا
اب تو قسمت ہو ہر بات پر سوچنا

حاصلِ ربطِ ذہن و نظر سوچنا
عمر بھر دیکھنا' عمر بھر سوچنا

حیز ہیں زندگی بن نہ جائیں کہیں
اس کے بارے میں بہ سوچکر سوچنا

صبح سے شام تک کتنی باتوں کے غم
پھر ہر اک بات پر رات بھر سوچنا

اب تو یہ حال ہے' اپنے حالات پر
چاہتا ہوں نہ سوچوں مگر سوچنا

آدمی کی فراست کی پہچان ہے
وقت پر فیصلہ' وقت پر سوچنا

اے رئیس آج گذرا ہے دن کسطرح
شب میں آرام سے لیٹ کر سوچنا

جعفر عسکری

ممتاز محل عباد نگر گولہ گنج لکھنؤ

والدِ محترم پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں

عیوب مجھ میں ہیں سب ہنر اسی میں ہیں
میں خالی سیپ ہوں سارے گہر اسی میں ہیں

پڑھا ہے میں نے کتابِ حیات کو اس کی
حروف سارے لکھے معتبر اسی میں ہیں

بس ایک خط وہ مرے نام کا لکھا اس کا
تمام لذتیں شیر و شکر اسی میں ہیں

وہی ہے میرا مکاں اور ہیں مکیں اس کا
محبتوں کے کھلے بام و در اسی میں ہیں

مثال اس کی کہ اک نخلِ سایہ دار ہے وہ
خزاں میں بھی گل و برگ و ثمر اسی میں ہیں

ہنوز میرے تخیل کی کائنات ہے وہ
تمام انجم و شمس و قمر اسی میں ہیں

ہے اس کی یاد سے آباد اک جہاں جعفر
وفا و مہر کے سب بحر و بر اسی میں ہیں

رئیس نعمانی

تجارہ ہاؤس، دودھ پور
علی گڑھ

اس کی محفل میں مرا نام اگر لے لینا
دوستو! اپنے سروں کی بھی خبر لے لینا

چلتے چلتے جہاں تھک جاؤ مرے ہمسفرو!
مری ہمت' مرا عرفانِ سفر لے لینا

حق پرستی تو نہ چھوٹے گی مگر جب چاہو
ہے ہتھیلی پہ ہمہ وقت یہ سر لے لینا

درسِ تہذیب زمانے کو پڑھانے والو!
اپنے گھر کی بھی کسی روز خبر لے لینا

یہ عنایت بھی بہت ہے کہ غریبوں کا سلام
کبھی ملنا تو سرِ راہگزر لے لینا

آج کا فیصلہ کل وجہِ ندامت نہ بنے
میری باتوں کا نہ فوراً ہی اثر لے لینا

تجربہ دردِ محبت کا نہیں تم کو رئیس
زندگی ہے تو یہ الزام بھی سر لے لینا

ڈاکٹر احتشام الحق
توپ دروازہ لکھنؤ



ایک ہمہ گیر شخصیت

نومبر کا مہینہ ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ۱۴ نومبر کو جدید ہندستان کے معمار اعظم پنڈت جواہر لال نہرو پیدا ہوئے اور ۱۹ نومبر کو ہماری محبوب اندرا گاندھی۔ اگرچہ اندرا جی کو ہم سے جدا ہوئے ایک برس سے زیادہ مدت ہو رہی ہے مگر ان کی یاد کا زخم آج بھی تازہ ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے وہ اس قدر تیز گام اور سرگرم کار رہیں کہ ابھی تک ان کے قدموں کی چاپ ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔

اندرا جی ایک نرم و نازک خاتون ہوتے ہوئے جس طرح بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکر لیتی رہیں، وہ خود اپنی مثال آپ ہے۔ جس زمانے میں عنان حکومت ان کے ہاتھ میں آئی وہ اندیشوں اور وسوسوں کا زمانہ تھا۔ حساس دل دھڑک رہے تھے کہ اتنا بڑا ملک کیسے مستحکم رہ سکے گا۔ مگر اندرا جی نے خداداد صلاحیت اور بے پناہ ریاضت سے خود اعتمادی کا ایسا ماحول پیدا کیا، جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ عام تاثر تو یہ تھا کہ ایک خاتون کس طرح ان گتھیوں کو سلجھائے گی جو ملک کی ترقی میں حائل ہیں۔ لیکن جلد ہی لوگوں کی زبان پر یہ جملے آنے لگے کہ اندرا جی ہندستان جیسے گوناگوں مسائل سے دوچار ملک کا مداوا ہیں۔ وہ قوم کے دکھ درد کا پورا ادراک رکھتی ہیں۔ اور انھوں نے واقعتاً اپنے سترہ سالہ دورِ حکومت میں وہ سب کچھ کر دکھایا جو بادی النظر میں ناممکن سا لگ رہا تھا۔

اندرا جی کی مقبولیت کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ جمہوری قدروں کی امین تھیں اور سیکولرازم کی علمبردار۔ ان کو ملک کے ذرے ذرے سے محبت تھی۔ جس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہوں جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہوں اسے متحد رکھنا آسان کام نہیں ہے مگر وہ جانتی تھیں کہ ہندستانیوں میں کون سی باتیں مشترک ہیں۔ اندرا گاندھی اقلیتوں کی بڑی ہی خواہاں تھیں وہ کوئی پالیسی یا منصوبہ بناتے وقت اقلیتوں اور کمزور طبقوں کا ہمیشہ پورا پورا خیال رکھتی تھیں انھوں نے قومی یکجہتی کو استحکام بخشنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ وہ تمام مذاہب کے پیروؤں سے مساویانہ سلوک کرتی تھیں۔ سیکولرازم ان کے لیے کھوکھلا نعرہ نہ تھا بلکہ اس کے لیے انھوں نے آئین میں ترمیم بھی کرائی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سلسلے میں انھیں مختلف فرقوں کے اعتراضات کا نشانہ بھی بننا پڑا تھا۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود وہ اپنے ارادہ پر اٹل رہیں۔

اندرا جی نے ملک کو ترقی کی بلندیوں تک لے جانے کے لیے اپنے دورِ حکومت میں اہم اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیے وہ سائنسی نظریے کی حامی تھیں۔ ترقی یافتہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت پر ان کا جو یقین تھا اسی نے ہندستان کو ترقی پسند ممالک میں اتنا بلند مقام دلایا۔ وہ کہتی تھیں کہ ہندستان کو سائنس کے سبھی شعبوں میں خود کفیل ہونا چاہیے۔ اور وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ ہندستانی سائنسدانوں کو انکی ذہانت اور صلاحیت کی بنیاد پر ہر ممکن ترقی کا

موقع فراہم کیا جائے۔ وہ ایٹمی طاقت کے پرامن استعمال کی حامی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے ملک میں سائنس امن عالم دوستی اور انسانیت کے فروغ نیز ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے وقف ہے وہ سائنس اور ٹکنالوجی کا فائدہ عام لوگوں اور ناداروں تک پہنچانے کی خواہشمند تھیں تاکہ وہ خوشحال بن سکیں اور پیچھے نہ رہنے پائیں انھوں نے ایک جانب پریوی پرس کے خاتمہ کا اعلان کیا، بینکوں کو قومیایا اور ۲۰ نکاتی پروگرام کا آغاز کیا تو دوسری جانب خارجہ پالیسی کو بھی مستحکم بنایا۔ انھوں نے بڑی طاقتوں کے دباؤ کے باوجود ناوابستہ تحریک سے اپنے کو الگ نہیں کیا بلکہ اس کو اس درجہ قوت عطا فرمائی کہ ان کا شمار اس تحریک کی اہم شخصیتوں میں ہونے لگا اور پھر انھوں نے اس تحریک کی سربراہ کی حیثیت سے ناوابستہ ممالک کی کانفرنس کا انعقاد ہندستان میں کیا۔ انھوں نے دنیا میں کہیں بھی ہونے والے ظلم و استبداد کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی خواہ وہ مسئلہ فلسطین ہو، اسرائیل کے عربوں پر مظالم ہوں یا جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیتی حکومت کا مقامی باشندوں کے ساتھ جابرانہ رویہ۔ انھوں نے آزادی کی تحریک کا ہمیشہ ساتھ دیا اور عالمی امن کے لیے مسلسل کوشاں و سرگرم عمل رہیں۔

اندرا جی ہمارے ملک کی عظمت اور گنگا جمنی تہذیب کی تابناک علامت بن کر افق سیاست پر نمودار ہوئی تھیں۔ ان کی پوری زندگی جد و جہد سے عبارت تھی بچپن سے جوانی اور پھر عمر کے آخری حصے تک جہاں سے چاہیئے ان کی زندگی کے اوراق پلٹ ڈالیے کوئی ورق سادہ نظر نہ آئے گا۔ کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو اوّل تا آخر ورق ورق جگمگاتی نظر آئے گی۔

•••

اکبر اور مغرب

(صفحہ ۶۲ کا بقیہ)

سے سرسید کے دینی عقائد متزلزل بھی ہوئے اور انھوں نے آیات قرآنی کی من مانی تعبیر و تشریح بھی کی۔ اکبر اس قسم کی اندھی تقلید کے سخت مخالف تھے۔ وہ اگرچہ مدخولۂ گورنمنٹ تھے لیکن وہ مغرب کے فتنۂ سے بخوبی آگاہ تھے اسی لیے انھوں نے زمانۂ حال کا سامنا کرنے کی بجائے ماضی سے رشتہ جوڑا اور اپنی ساری توانائی کو مشرقی تہذیب کی محافظت میں صرف کر دیا۔ وہ انگریز کے پنشن خوار ہوتے ہوئے بھی تاحیات اس سے خائف رہے اور ہندستانیوں کو انگریز سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو

ناک رکھتے ہو تو تیغ تیز سے ڈرتے رہو

اکبر کی ذہنی ناآسودگی انتہا درجے کی جذباتی تھی بقول پروفیسر احتشام حسین

اکبر کا ذہن جس ناآسودگی کا شکار تھا وہ جذباتی تھی مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کے مقابلہ نے انھیں اوران کے مقصد کو کمزور بنا دیا............[1]

گو انھوں نے ہندستان کو مغرب کی کھوکھلی اور غلامانہ نقالی سے نجات دلانے کیلئے مبلغانہ انداز میں بڑا کام کیا لیکن اس دھن میں انھوں نے مغربی علوم اور سائنس کی مخالفت کر کے ہندستان پر معاشی اور سیاسی شعور کے دروازے بھی بند کرنے کی کوشش کی، ان کا طبقاتی شعور ایک تصور پرست کا شعور تھا، ان کے خیال میں حقیقت کی آمیزش تھی لیکن بے بنائے عقائد کے نیچے دبی ہوئی تھی[2]

---

[1] تنقید اور عملی تنقید از احتشام حسین

[2] تنقید اور عملی تنقید از پروفیسر احتشام حسین

عروج زیدی
کٹ کوئیاں، رامپور یوپی

شکستِ خواب کا عالم وہاں ملے گا تمہیں
جہاں جہاں بھی چمن میں دھواں ملے گا تمہیں

جسے یقینِ بصیرت، نہ اعتبارِ نظر
اسیرِ حلقۂ وہم و گماں ملے گا تمہیں

رہِ وفا میں ہر افتاد اک عبادت ہے
بہر قدم یہاں سنگِ گراں ملے گا تمہیں

اگر مجھے بھی سکونِ حیات مل جائے
پھر اضطراب کا منظر کہاں ملے گا تمہیں

تم اپنے دل سے ہر اک بات برملا کہہ دو
اب اس سے بڑھ کے کہاں رازداں ملے گا تمہیں

میں اس تلاش میں تو ظلمتوں سے گزرا ہوں
یہ مجھ سے پوچھو اجالا کہاں ملے گا تمہیں

عجب ہے عالمِ پست و بلند دہرِ عروجؔ
کہیں زمیں کہیں آسماں ملے گا تمہیں

نصیر ناطقی

اس طرح اپنے ذہن کو حق آشنا کرو
فرصت کے وقت صرف کتابیں پڑھا کرو

دیکھو نہ اس کو کون ہے کیا ہے حسب نسب
کیا کہہ رہا ہے غور سے اس کو سنا کرو

گر چاہتے ہو اہلِ محبت سے رسم و راہ
پہلے تکلفات سے دل آئینہ کرو

چاہتے ہو اس طرف سے تو از راہِ دوستی
ہم سے بھی دو گھڑی کے لیے مل لیا کرو

وہ بھی تمہارے غم میں برابر کا ہو شریک
نا آشنائے غم کو بھی غم آشنا کرو

سائے سے "سرخوشی" کے نکل کر کبھی کبھی
میرے بھی ساتھ دھوپ میں مر لیا کرو

اوروں سے بھول کر نہ توقع کرو نصیرؔ
اپنے ہی دم قدم کا فقط آسرا کرو

اسد اللہ محزونؔ
بیجانی اسکول رائے گنج
مغربی دیناج پور

ان کو نگاہِ شوق سے دیکھا کرے کوئی
حسنِ سبک نگاہ کو رسوا کرے کوئی

آہ و فغاں مآلِ محبت ٹھہر چکی
اب زندگی کی کیسے تمنا کرے کوئی

تاب و توانِ طاقتِ دیدار جب نہیں
پھر کس زباں سے ان سے تقاضا کرے کوئی

اب تو حبابِ زیست بھی ہونے کو ہے تمام
کیوں انتظارِ وعدۂ فردا کرے کوئی

دل خوگرِ جراحتِ حرماں نصیب ہے
آسائشوں کی کیسے تمنا کرے کوئی

داغِ فراق دے گئی پیری میں عمر بھی
اب کس پہ اس جہاں میں بھروسا کرے کوئی

سلجھا رہا ہوں محزوںؔ میں لغزشوں کی موت
دلدارئ حیات میں الجھا کرے کوئی

اقبال مجید
([illegible] بھوپال)

افسانہ

چودہ نمبر والی

وہ دھان پان سی عورت کیا کبھی سوتی بھی تھی۔؟

نائٹ ڈیوٹی میں کئی بار ڈاکٹر وحید اس وارڈ میں رہ چکا تھا۔ اسے کئی بار حیرت ہوئی کہ پلنگ کے برابر کے اسٹول پر اتنی جگہ کہاں سے آجاتی تھی۔ جیسے وہ اسٹول نہیں مسہری ہو۔ بس اسی واحد اسٹول پر وہ سب کچھ کرتی۔ اسی اسٹول پر بیٹھتی اور اس اسٹول کے بقیہ حصے پر عرق نکالنے کا برتن رکھتی اور موسمی کا عرق نکالتی۔ اسی پہ بیٹھے بیٹھے گلوکوز گھولتی اسی اسٹول پر پاندان رکھ کر اپنے لیے پان لگاتی۔ اسی اسٹول پر بیٹھ کر اور گود میں اپنا ٹفن رکھ کر دیر تک چبا چبا کر اپنا کھانا کھاتی۔ تیل کی شیشی ایک کونے میں رکھ کر اسی اسٹول پر سر میں تیل لگا کر کنگھی چوٹی بھی کرتی اور پھر اسی مختصر سے اسٹول پر دونوں پیر اٹھا کر رکھ لیتی اور گھٹنوں میں سر دے کر پتہ نہیں کس وقت آنکھ جھپکا کر اپنی نیند بھی پوری کر لیتی۔ ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا اسٹول جو اسپتال کی ملکیت تھی دراصل اس تیمار دار عورت کے لیے کھانے کی میز بھی تھی اور سونے کا پلنگ بھی سنگار میز بھی تھا اور ڈرائنگ روم کا صوفہ بھی کیونکہ شام کو چار بجے اپنے شوہر کے بھاری بھرکم جسم کو اپنے سوکھے ہاتھوں سے بلا کسی کی مدد لیے، بائیں طرف کروٹ دلا کر اور پیشاب کی بوتل خالی کر کے اور پھر مریض کو چمچے سے ایک کٹورہ دودھ پلا کر اور گیلے تولیے کے کونے سے مریض کا منھ صاف کر کے اور کٹورہ جالی دار الماری میں اپنی جگہ واپس رکھ کر جب وہ اطمینان سے اس مختصر سے اسٹول پر قدرے ڈھیل ڈھالی ہو کر بیٹھتی اور پڑوس کے مریض کی تیمار داری کرنے والی کم سن لڑکی سے باتیں بناتی تو ایسا لگتا کہ وہ اسٹول پر نہیں بلکہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی ہے۔

اور اپنے گھر آئے مہمان کی دلجوئی کر رہی ہے۔

چالیس کے پیٹے میں گندمی رنگت والی اس دھان پان عورت کا نام پتہ نہیں کیا تھا۔ وارڈ کے لوگ اسکو چودہ نمبر والی کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ جس پلنگ پر اسکا شوہر پچھلے دو ماہ سے پڑا تھا اسکا نمبر ۱۴ تھا۔

چودہ نمبر کو حلق کا کینسر تھا۔

پچھلے دو ماہ سے ڈاکٹر وحید چودہ نمبر کے علاج میں پروفیسر راگھون کا شریک تھا۔ پروفیسر راگھون کو پتہ نہیں کیوں یہ خیال بار بار پریشان کر رہا تھا کہ ۱۴ نمبر کو ابھی کچھ عرصہ اور دیکھ ریکھ میں رکھنا بہتر ہوگا۔ شاید سب کچھ جانتے ہوئے بھی کبھی کبھی بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی کسی انجان اور موہوم سی امید کا دامن پکڑ کر بس یونہی ایک بھولے بھالے بچے کی طرح یا پھر کسی ضعیف الاعتقاد بوڑھی عورت کی طرح کسی انہونی کے انتظار میں اپنے مریض کو نئی زندگی مل جانے کی توقع کرنے لگتا ہے۔

راگھون جانتا تھا کہ ۱۴ نمبر جیسے مریض آج تک کبھی نہیں بچے۔

وحید بھی جانتا تھا۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ اس کا حلق بند ہو جائے گا۔

ایک صبح چار بجے چودہ نمبر اسٹول سے فرش پر لڑھک گئی۔ شاید نیند کا جھونکا آگیا تھا۔ سر میں چوٹ بھی آگئی۔ اس دن بس یونہی وحید کو جیکب یاد آگیا۔ تب وحید ٹورنٹو اسپتال میں اپنی ٹریننگ پوری کر رہا تھا۔ اسی اسپتال میں جیکب بھی تھا۔ حلق کے کینسر کا مریض جیکب اور ۱۴ نمبر والا۔ ایک ہی موذی مرض کے مریض تھے۔ دونوں کے پلنگ دونوں کی خوراک دوائیں اور ان کے اوقات سب کچھ ایک سے تھے۔

پھر بس پتہ نہیں وہ کون سی چیز تھی جو ۱۴ نمبر کو جیکب سے الگ کرتی تھی وحید برابر لاشعوری طور پر اس فرق کو اندر ہی اندر کہیں تلاش کر رہا تھا

کیا حال ہے چودہ نمبر والی تمہارے مریض کا ؟ وحید نے ایک دن اسی عورت سے پوچھا۔

ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب" وحید کو جواب ملا" پہلے سے بہت ٹھیک ہے "

وحید نے ایک پل کو سوچا جوں جوں دن گذر رہے ہیں ۱۴ نمبر موت کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے لیکن یہ چودہ نمبر والی، ایک اسٹول پر دن اور رات کاٹ دینے والی عورت اپنے شوہر کی صحت کی جانب سے پہلے سے زیادہ ہی پر امید ہوتی جا رہی تھی۔

۱۴ نمبر والی کے پاس کل دو عدد دھوتیاں تھیں بچھانے کو ایک پھٹا پرانا کمبل۔ عورت کا بڑا لڑکا تین چار روز میں ایک بار آتا اور ضرورت کی معمولی کھانے کی چیزیں دے کر چلا جاتا۔ کب وہ اپنے لیے کھانا تیار کرتی، کب صرف ایک مٹھی بھنے چنے اور پیاز کھا کر ہی پڑ رہتی اور کب گڑ اور ستو پر گذارہ کر لیتی کوئی نہیں جانتا تھا۔ دس نمبر والی کے گھر سے جب بڑے بڑے ناشتے دان بھر بھر کر آتے تو کبھی دو کیلے کبھی روے کا حلوہ اور کبھی ایک دن کی باسی پوریوں کا ڈھیر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا، وہ خوش ہو کر انھیں لے لیتی۔ انھیں سکھا کر رکھتی اور اور کسی کے تھرماس کی بچی چائے کی ساتھ کھا پی کر پڑ رہتی۔

ایک دن وحید جب رات کی ڈیوٹی پر وارڈ کے اندر آیا تو چودہ نمبر والی جاگ رہی تھی۔ عورت نے وحید کو دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر بولی۔

" ڈاکٹر صاحب آج ان کے پھوڑے میں درد زیادہ ہے۔" وحید نے دیکھا عورت کے چہرے پر تھکن تھی اداسی تھی مگر مایوسی نہیں تھی۔ وحید نے اس سے کہا کہ وہ چار بجے بڑے ڈاکٹر صاحب کو کیفیت بتائے اور پھر وحید اپنے کام میں لگ گیا اس رات نرس نے وحید کو بتایا کہ ۱۴ نمبر والی دن بھر کچھ اداس رہی ہے۔ پوچھنے پر کہہ رہی تھی۔

" ڈاکٹرنی صاحب اب تو یہ بولتے بھی کم ہیں۔ مریض جتنے سادھ لے تو اوپر والے کے لیے مشکل ہو جاتا ہے"

تب ہی وحید کو لگا کہ وہ ٹورنٹو کے اسپتال میں جیکب کے پلنگ کے سامنے کھڑا ہے تب ہی وحید کے کانوں میں جیکب کی بیوی کی آواز سنائی دی

" ڈارلنگ ـــ" وہ شاید پندرہ دن بعد اپنے شوہر کو دیکھنے اسپتال آئی تھی ساتھ میں اس کا جوان بیٹا بھی تھا۔ بیٹا باپ کے پلنگ کے پاس کھڑا بے نیازی سے چیونگم چبا رہا تھا۔

" ڈارلنگ" جیکب کی بیوی نے اپنے شوہر کو پھر آواز دی تھی ماں اور بیٹے میں سے کوئی بھی اسٹول پر نہیں بیٹھا تھا۔

اسٹول ـــ وحید ایک بار تڑپ گیا۔ جیکب کے اسٹول پر کبھی کوئی نہیں بیٹھا ـــ اس خیال سے وحید کی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے سوچا شاید یہ اسٹول ہی تھا جو چودہ نمبر کو جیکب سے الگ کرتا تھا۔

" ڈارلنگ" وحید کے کانوں میں پھر جیکب کی بیوی کی آواز گونجی جو اپنے شوہر کو مخاطب کرنے کے لیے بار بار پکار رہی تھی۔ تب ہی جیکب نے دھیرے سے آنکھیں کھولی تھیں، وہ آنکھیں جن میں بے بسی تھی درد تھا اور ویران تنہائیوں کے گہرے اور ڈراؤنے سائے تھے۔ چیونگم چباتے ہوئے جیکب کے لڑکے کے جبڑے بار بار تھرک رہے تھے وہ اپنے نیم مردہ باپ کو کبھی کبھی بڑی اجنبی سی نظر کے ساتھ اس طرح دیکھ لیتا تھا جیسے وہاں اس کا باپ نہ ہو خالی بستر ہو۔ تھوڑی دیر پہلے ہی ڈاکٹر اسے بتا چکا تھا کہ جیکب مر رہا ہے اور رات تک اس کو مردہ خانے پہنچا دیا جائے گا۔

چودہ نمبر والی جس کے پاس دو دھوتیاں تھیں، لوگوں سے مانگے تانگے چند نوالے تھے اور ایک اسٹول تھا اور بیمار شوہر تھا اور اسپتال کے وارڈ کے ویران دردناک شب و روز تھے اور کچھ نہ ہوتے ہوئے شوہر کا پلنگ تھا اور پلنگ پر ایک جسم تھا، جسم جو ایک آسرا تھا، ایک آس تھی، ایک امید تھی اور وارڈ کے باہر دنیا بے معنی تھی، بے بسا طاقتی چودہ نمبر والی کی کل کائنات اس وارڈ کے ایک پلنگ پر تھی وہ پلنگ جو پچھلے دو ماہ سے اس کا رفیق تھا، ساتھی تھا، مونس و دمساز تھا۔

"کیا آپ کو باپ کی لاش چاہیئے۔ اسپتال کے منتظم نے جیکب کے لڑکے کو ایک فارم دیتے ہوئے سوال کیا۔

لاش ہم کیا کریں گے ـــ ؟ جواب ملا۔ (بقیہ صفحہ ۱۴۱)

غزلیں



واجدہ تبسم
دورودھنی گیٹ، سری نگر، کشمیر

میں تڑپ کر آہ بھر کر تلملا کر رہ گئی
جب کبھی اس بے وفا کی یاد آ کر رہ گئی

بارہا جب یاد تیری دل میں آ کر رہ گئی
بے خودیٔ شوق میں آنسو بہا کر رہ گئی

اشک جو ٹپکا شب غم خاک میں وہ مل گیا
بوند جو پلکوں پہ ٹھہری جگمگا کر رہ گئی

آپ کی تصویر بن جائیگی تھی کس کو خبر
میں تو کاغذ پر لکیریں ہی بنا کر رہ گئی

یوں تو میں نے ان سے کہنے کیلئے سب کچھ کہا
دل کی بات آئی تو ہونٹوں میں دبا کر رہ گئی

یہ کشاکش دیکھ کر اہل چمن کی روز و شب
تو تبسم بھی چراغ دل جلا کر رہ گئی

ہرمہندر سنگھ دیوانہ
رام نگر، کانپور روڈ، عالم باغ
لکھنؤ۔

تھک گیا تو بھیڑ ہی میں کھو گیا
دوست میں خود کو کہاں تک ڈھونڈتا

میں تو بس اپنے ہی میں کھویا رہا
کب ہوا تصویر سے کاغذ جدا

کر گئی پاگل ہوا سب کو تباہ
ایک سوکھا پیڑ تھا جو رہ گیا

کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں تھے
وقت کا اک وار سب کو کھا گیا

ہم فقیروں کو کسی سے کیا غرض
ہم کو اس دنیا سے کیا لینا بھلا

یوہنا مہ جبین
قاضی پور خورد
گورکھپور

بکھر رہے آگے سفر ہے میرا
کہ دشت میں ہر شجر ہے میرا

یہ پھول تیرے ہیں خار میرے
مگر سبھی پر اثر ہے میرا

زمانہ میری تلاش میں ہے
کہ جب سے چمکا ہنر ہے میرا

میں اپنے خوابوں میں بس گئی ہوں
کسی نے لوٹا جو گھر ہے میرا

تمام شب جاگتی ہیں آنکھیں
کہ پاسباں بے خبر ہے میرا

گئی ہوئی مہ جبیں کی خاطر
کھلا ہوا اب بھی در ہے میرا

اکرم فاروقی
سنٹرل اسکول فتح گڑھ

(افسانہ)

راجکمار

ہائے رے دیا ـــــ تنہائی کی اذیت ـ!!
بھگوان بچائے تنہائی کی اذیت سے ـ!! ساری اذیتیں برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن یہ ایک ایسی اذیت ہے جو برداشت کے تمام ٹانکے ایک ایک کر کے توڑ دیتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ مر جائیں پھر مر کر بھی نہ پایا تو کہاں جائیں گے ـــــ؟ ایشور نے زندگی کی نعمت جیسن تو برتنے کے لیے دی ہے اس لیے شیبا زندگی کو خندہ پیشانی کے ساتھ برتنے اور زندہ دلی کے ساتھ گذارنے کی قائل تھی ـــــ!! شیبا جب تک لکھنؤ میں رہی تو اُسے کسی کمی کا احساس نہ ہوا بھرا پُرا گھر تھا ـ امین آباد اور حضرت گنج کی غزل آفریں شامیں تھیں لیکن شادی کے پانچ سال بعد جب شیلندر کا تبادلہ ترِدندرم ہو گیا اور اُسے دفتر کی جانب سے ایک ایسے مقام پر فلیٹ ملا جو پہاڑی کے دامن میں قدرتی مناظر کے ساتھ اپنی خوبصورتی کی داد لے رہا تھا ـ لیکن شیبا کے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی ـ کیونکہ شیلندر کے آفس چلے جانے کے بعد تنہائی کے کھنکھورے اس کی نس نس میں رینگنے لگے، اُسے تمام قدرتی مناظر کا تمام حسن پھیکا پھیکا سا لگنے لگتا ـــ!!

وہ دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا ٹوٹ کر پیار کرتے کبھی کبھی ناولوں، فلموں اور داستانوں کی رومانی محبتیں یکبارگی سچ معلوم ہونے لگتیں ـ شیبا چاہتی کہ شیلندر ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہے لیکن پل کو بھی اس سے جُدا نہ ہو ـ یہی حال شیلندر کا بھی تھا وہ دفتر میں رہتا لیکن دل و ذہن شیبا کی باہوں میں قید رہتا اور چھٹی کا دن تو انھیں اور بھی چھوٹا لگتا بس ذرا کرم نیچ یا بمبا پلی تک ایک دو پکنک اسپاٹ پر گئے اور سورج نے کہا لوٹ چلو کہ اب چاند نکلنے والا ہے ـــ!!

شیبا چاہتی تھی کہ چاند کی نورانی کرنیں اس کی روح میں اتر جائیں اور اس کی روح کا گوشہ گوشہ منور ہو جائے اس کی ساری کائنات چاندنی کا روپ دھار لے ـ ذرہ ذرہ چاند بن کر اس کی روح میں سما جائے اور پھر وہ مستانہ وار کوئی بھیلا سا گیت زیر لب گنگنائے جس کا مکھڑا چاند کے مکھڑے سے بھی زیادہ حسین ہو اور جب وہ اس کے حسن کو دیکھے تو اُسے اپنا ہی عکسِ جمیل نظر آئے لیکن سورج کو شاید اس سے ضد تھی، وہ ہر پونم کی چاندنی کو اس طرح پی جاتا کہ ساری کیاریوں کے گلاب بن کھلے مرجھا جاتے، وہ صبح اٹھ کر پھر نئی امیدوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ ہر ایک پودے میں پانی ڈالتی، نِرائی کرتی اور تراش خراش کر کے اُسے دل کش بناتی اور جب کیاری میں رنگا رنگ پھول کھلتے تو وہ دیوانہ وار پودوں کے قریب جاتی اور چاہتی کہ سارے پھول توڑ کر اپنی گود میں بھر لے

لیکن وہ جب پھولوں کی رنگت کو اپنے چہرے سے ملاتی تو اس کی روح میں کانٹے سے چبھنے لگتے کوئی بھی پھول ایسا نہ ہوتا جو اس کے رنگ و روپ میں کھپ جاتا۔ وہ کئی لمحوں تک خود پسندی کے ریشمی حصار میں قید رہتی اور جب باہر آتی تو اکیلے پن کے کیکٹس اُسے بُری طرح گھیر لیتے اور وہ شلیندر سے کہتی "شلیندر! یہ تنہائی تو مجھے مار ڈالے گی"۔۔۔!!

"کیسی تنہائی ۔۔۔؟ میرے ہوتے ہوئے تم تنہائی محسوس کرتی ہو ۔۔۔؟" شلیندر اس کی سانسوں کی مدھر خوشبوؤں کو اپنی روح کے دریچوں میں اتارتے ہوئے کہتا۔

"ہاں ۔۔۔۔۔! میں تنہا ہوں ۔۔۔! بالکل اکیلی ہوں آخر میں کب تک یوں اکیلی رہوں گی میرا من نہیں لگتا"۔ "گھر سے کسی کو بلا لو نا ۔۔۔؟!!" شیبا گرم ہواؤں کی طرح ہانپتی ہوئی کہتی۔ "کسے بلا لوں ۔۔۔؟ کون کالے کوسوں دور یہاں آسکے گا ۔۔۔؟ ملن کا فائنل ہے صاحب بورڈ کے امتحان میں شرکت کرے گا۔ ماں جی کے بس کا سفر نہیں ہے ۔۔۔؟!" شلیندر نے سب کی مجبوریاں گنا دیں۔ "اچھا تو مجھے ڈھیر سارے ناول لا کر دو۔ میں تنہائی میں ناول پڑھا کروں گی" شیبا جانتی تھی کہ تنہائی کی بہترین دوست کتابیں ہوتی ہیں۔

شلیندر نے اگلے دن کی فائل پر نوٹنگ نہیں کی دن بھر بجھا بجھا سا رہا اور شیبا کی تنہائی کا احساس جونکیں بن کر بار بار اس کے ذہن کی نرم نسوں پر رینگنے لگتا وہ دیر تک غور و فکر کے باوجود کوئی فیصلہ نہیں کر پایا کہ آخر کیسے اور کب اس کی تنہائی دور ہوگی ۔۔۔؟

جب شام کو شلیندر دفتر سے لوٹا تو ایک درجن ناول اور میگزین اپنے ساتھ لایا۔ شیبا نئے ناول اور میگزین دیکھ کر خوش ہو گئی سب ہی معیاری و رومانی ناول تھے۔ شلیندر، شیبا کی نفسیات سے خوب واقف تھا کیونکہ اُسے جاسوسی اور گھٹیا قسم کے سستے ناولوں سے سخت نفرت تھی، وہ صحت مند رومان پر مبنی ایسے ناول اور میگزین پسند کرتی تھی جن کا مطالعہ دل و نظر میں وسعت، خیالات میں گہرائی اور سوچ و فکر میں گیرائی پیدا کرے۔

جب شلیندر ناشتہ کی میز پر بیٹھتا تو تازہ اخبار طلب کرتا لیکن شیبا کہتی "ایک وقت میں ایک ہی کام اچھا ہوتا ہے۔ پہلے ناشتہ کیجئے پھر اخبار پڑھیئے گا ورنہ صحت پر بُرا اثر پڑے گا" "اُف بابا تمہیں میری صحت کی بہت فکر ہے" شلیندر مسکراتے ہوئے کہتا۔ "آخر کیوں نہ ہو آپ کی صحت میری زندگی کا سرمایہ ہے" شیبا کے خیالات پاکیزہ اور بلند تھے۔

شلیندر جب دفتر چلا جاتا تو وہ پڑھے ہوئے ناولوں اور میگزینوں کو دوبارہ پڑھتی، اخبار کے اشتہارات تک پڑھ جاتی اور قتل و خودکشی والے وہ کالم بھی پڑھ جاتی جن کو پڑھ کر اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ کڑھائی، بُنائی اور سلائی کے کام کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اس لیے وہ بلا ضرورت نہ سوئٹر بنتی اور نہ کپڑے سیتی، اس کا یقین تھا کہ اگر ہر چیز حسبِ ضرورت ہر وقت خریدی جائے تو اس سے نہ اپنا نقصان ہوتا ہے اور نہ سماج کا ۔۔۔! شیبا نے بی۔ اے تک اکنامکس پڑھی تھی اس لیے وہ جانتی تھی کہ گرانی کیسے بڑھتی ہے اور کس طرح گھریلو عورتیں گرانی پر قابو پا سکتی ہیں؟ لیکن سب سے زیادہ گرانی تو اُسے تنہائی سے محسوس ہوتی تھی جو بے مول اُس کے لیے سستی تھی، وہ تنہائی میں کتابیں پڑھتی، ریڈیو سنتی، سوئٹر بنتی، رسوئی کا کام کرتی، کپڑے دھوتی، پریس کرتی اور کبھی تو پریس کیے ہوئے کپڑے پر بھی دوبارہ پریس کرتی، کبھی ادھر اُدھر کے مناظر دیکھتی۔ الغرض یہ کہ وہ صبح دس بجے سے لے کر شام کے پانچ بجے تک کا وقت ایسے گذارتی جیسے کوئی قیدی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک ایک دن رہائی کے انتظار میں کاٹتا ہے لیکن اُسے تو ایک ایک دن ایک صدی سا لگتا تھا۔ وہ لمحہ لمحہ ایسے گذارتی جیسے شمع قطرہ قطرہ ہو کر سحر تک پگھلتی ہے۔

شیبا چاہتی تھی کہ اُسے کسی اسکول ہی میں ٹیچنگ جاب مل جائے تو اس کا بیشتر وقت آسانی سے کٹ جائے گا لیکن وہ ٹرینڈ نہ تھی اس لیے سرکاری یا غیر سرکاری اسکول میں ملازمت نہ مل سکی اور وہ شہر سے اتنی دُور تھی کہ کسی کو پرائیوٹ کوچنگ بھی نہ دے سکتی تھی، کلرکی اسے پسند نہ تھی اس لیے دن بھر گھر ہی میں رہتی اور دن اسے پہاڑ سا لگتا۔ بس دن بھر کھڑکی کے باہر کے مناظر دیکھتی، اُونچے

اونچے ناریل کے پیڑ، کیلوں کے قطار در قطار درخت، جھیلوں کی سطح پر جمی ہوئی کائی اور نیلی فضاؤں میں اڑتے ہوئے سفید بگلے۔!!

جب وہ بگلوں کو سُدھ بُدھ کھوئے کسی کنج کے سائے میں بیٹھے ہوئے دیکھتی تو جلدی سے کھڑکی بند کر دیتی۔ شیبا کی دلی خواہش تھی کہ اس کی شخصیت کا ادھورا پن ختم ہو جائے۔ وہ پانچ سال سے اپنی پلکوں پر آشاؤں کے دیپ جلائے بیٹھی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اب کے بسنت میں اس کے صحن میں ضرور پھول کھلے گا لیکن ہر بسنت اپنے پیچھے پیلے پتوں کی بہار چھوڑ کر چلا جاتا اور ہر بار شخصیت کے ادھورے پن کے احساس کا زہر اس کی نس نس میں سرایت کر جاتا۔ جب کبھی اُسے اپنی سہیلی نجمہ یاد آجاتی تو وہ بہت خوش ہوتی اُسے یاد کر کے ــــ!! لیکن جب اُسے یاد آتا کہ وہ اپنے ننھے منے بچوں کے شور و غل میں گھری ہوئی ہے اور اس کی بات نہیں سُن رہی ہے تو اُسے نجمہ پر غصہ آتا اور اپنے نصیب پر بھی ــ!! نصیب کی بات یاد آتے ہی اُسے شیلا یاد آجاتی جس کی ساس نے صبح و شام اپنے بیٹے کے کان بھر بھر کے دوسری شادی کرادی اور شیلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے سینے پر دوسرا پتھر اس لیے گوارا کر لیا کہ کسی طرح اُس کا پتی پُتر کی کمی سے مُکتی پا جائے ــ!!

"کیا شلیندر بھی ــــ؟ نہیں ــ! اگر.....؟؟

اکثر وہ پیچیدہ سوالوں کی ناگ پھنیوں کے بیچ گھر جاتی اور جلدی سے دروازہ کھول کر کچھ دوری پر واقع میجر نائر صاحب کے بنگلے کی طرف چل پڑتی تاکہ وہ مسز نائر سے مل کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔ لیکن گفتگو کے لیے زبان کا مسئلہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا۔ مسز نائر ہندی سے قطعاً ناواقف تھیں۔ انگریزی بھی بس واجبی ہی سی جانتی تھیں۔ شیبا ملیالم سے قطعی بے بہرہ تھی۔ بس ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور گونگوں جیسے اشارے ہی مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ ہوتے۔ جب شلیندر اور شیبا شاپنگ کے لیے شہر جاتے تو ہندی سمجھنے والے دوکانداروں کی تلاش میں دیر تک بھٹکتے رہتے۔ مقامی زبان نہ جاننے کے باعث دوکاندار ایک ایک چیز کی دُگنی تگنی قیمت وصول کرتے۔ لیکن انھیں ہندی میں گفتگو کر کے جس روحانی آسودگی اور ذہنی بالیدگی کا احساس ہوتا اس کا کوئی بدل نہ تھا۔ جب شیبا بازار میں کیرالہ کی وہ برہنہ پاؤں سانولی سلونی لڑکیاں دیکھتی جو رنگا رنگ پھولوں سے سجا گھا گھرا، بلاؤز پہنے، جوڑے میں خوب ڈھیر سارے پھول لگائے اور ہاتھوں میں فائل دبائے اپنے اپنے کالج کی طرف تیز تیز قدموں سے جاتیں تو اُس کے من میں آتا وہ بھی انھیں کے ساتھ ہولے اور اکیلا پن بانٹ لے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر ہی رہ جاتی۔ اُسے وہ لڑکے بالے بھی اچھے لگتے جو سفید بش شرٹ اپنی سفید لنگیوں میں اس طرح دبائے رہتے جیسے وہ ہاف پینٹ ہوں۔ وہ دونوں ہوٹل اور گرم چائے سے بھی بہت جلد اُوب گئے تھے شاپنگ کے لیے مہینہ کا پہلا اتوار ہی مقرر تھا، باقی تین ہفتے نظر بندی کی کیفیت میں گذرتے اور صبح سے شام تک کی قید تنہائی شیبا کانٹوں کی سیج پر گذارتی۔ بس وہ صبح شام کا وقت اپنے کچن گارڈن میں گذارتی کبھی ٹماٹر کی پود لگاتی اور کبھی بیگن کی ــ!! کیاریوں میں منڈلاتی ہرے دھنیئے کی خوشبو اُسے بے حد اچھی لگتی تھی، اُس ساحلی شہر کی سُرخ مٹی میں پھول گوبھی تو مُرجھا کے رہ گئی۔ کچھ بند گوبھی کے پھول جوان ہوئے پر ان میں وہ ذائقہ نہ تھا جو لکھنؤ کی بند گوبھی میں ہوتا تھا۔ بازار میں اُبلا ہوا چاول ہی دستیاب تھا لیکن وہ تلاش کر کے کچے چاول ہی خریدتے۔ شیبا مٹن بریانی کے ساتھ رسم، اڈلی اور دوسا بھی بناتی۔"

"واہ شیبا! آج تو ڈائننگ ٹیبل سجا دی تم نے۔"

شلیندر نے واش بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

"شلیندر! یہ سب وقت گزاری کا ایک طریقہ ہے۔"

شیبا اڈلی پر ناریل کی ہری چٹنی ڈالتے ہوئے کہتی۔

شلیندر تنہائی اور وقت گزاری کے مسئلے سے بہت پریشان تھا وہ بہت چاہتا تھا کہ اس مسئلہ کا کوئی حل نکلے لیکن کوئی حل سامنے آنے والا نہ تھا

شیبا کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ کیرالا میں اونم کا تہوار بے حد جوش و خروش اور شان و شوکت سے منایا جاتا ہے، اس موقع پر مہابلی اپنی ریاست کے ہر گھر میں یہ دیکھنے آتے ہیں کہ ان کی پرجا دکھی تو نہیں۔ سب کو ہر طرح کا سکھ حاصل ہے یا نہیں؟ شیبا نے بھی اس موقع پر رنگا رنگ پھولوں کی دلکش رنگولی بنا کر دیپ مالائیں سجائیں اور مہابلی کی آرتی اتاری اور ان کے چرنوں میں کچا ناریل، نسیم پکے کیلے اور دھان کے دانے چڑھائے اور مقامی عورتوں کے ساتھ اونم کا گیت گایا اور من ہی من میں مہابلی سے منت کی " مہابلی میں آپ کی ریاست میں بہت دکھی ہوں، میرا وقت نہیں کٹتا میری تنہائی کا ساتھی مجھے دیدو --"!! ہفتہ بھر ناچ رنگ اور گانا بجانا جگہ جگہ ہوتا رہا وہ بھی چاہتی تھی کہ کتھا کلی کے مجموعی رقص میں شامل ہو کر مہابلی کو خوش کرے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے جسم میں اتنا لوچ نہیں کہ وہ کتھا کلی کا مظاہرہ کامیابی کے ساتھ کر سکے بس وہ تو اپنے دل میں مرادوں کا ہجوم لیے اپنے دروازے پر مہابلی کے سواگت میں پلکیں بچھائے بیٹھی رہی اونم بیت گیا، بسنت بھی بیت گیا، پر اس کی شخصیت کا ادھوراپن اور تنہائی کا ناگ جوں کا توں برقرار رہا۔ آہستہ آہستہ تنہائی کا رنگ اس کی رگ رگ میں اترنے لگا اور وہ اداس اداس سی رہنے لگی لیکن ایک دن بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی تنہائی کا علاج خود ہی سوچ لیا --!!

"شلیندر! اس بار اچھا سا ٹیپ ریکارڈ خریدنا ہے"۔ شیبا اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کی کشادہ پیشانی پر پڑی بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے شیریں لہجے میں بولی -" ٹیپ ریکارڈر؟ کیا کرنا ہے ٹیپ ریکارڈ کا؟" شلیندر نے اس کی ساڑی کے آنچل سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

" تم بہت اچھا گاتے ہو نا --؟ میں چاہتی ہوں فراق، بیکل اور زبیر رضوی کے کلام کو تمہاری آواز میں ٹیپ کر دوں اور تنہائی کے روح فرسا لمحات میں ان کی غزلیں اور گیت تمہاری آواز میں سنتی رہا کروں۔ پھر مجھے بالکل تنہائی کا احساس نہ ہو گا گھر سے کوئی آئے یا نہ آئے، پڑوس میں کوئی ہندی واں آکر بسے یا نہ بسے، مجھے اپنے گھر میں اب کسی کی ضرورت نہیں --!! شیبا اپنی تجویز پر اتنی مسرور تھی جیسے کسی یوجنا کی کامیابی پر انجینیر اور سائنسداں۔

شلیندر جب پہلی اکتوبر کو اپنے دفتر سے واپس گھر جا رہا تھا تو اسے یکبارگی ٹیپ ریکارڈ والی بات چیت یاد آگئی اور خود بخود اس کے قدم چالی مارکیٹ کی جانب مڑ گئے۔ لیکن جب وہ ریلوے کراسنگ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رک گئے، گیٹ بند تھا، ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ آرہی تھی اور جیسے ہی ٹرین آئی ایک نوجوان عورت بھاگتی ہوئی اس سے ٹکرائی ایک دم سنبھلی اور پھر گیٹ کی آہنی سلاخوں سے نکل کر ٹرین کے پہیوں کی طرف بھاگی لیکن شلیندر نے ایک سرعت کے ساتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ چھوڑ دو ...... چھوڑ دو ..... ! میں مرنا چاہتی ہوں وہ شلیندر کی باہوں میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ کسمسائی۔ ٹرین نکل گئی اور جوان عورت کا خودکشی کا ارادہ ناکام ہو گیا۔ آپ اتنی خوبصورت جوانی کو کیوں برباد کرنا چاہتی ہیں؟ زندگی قدرت کی امانت ہے اور کبھی امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہیے۔!! شلیندر نے ماحول نارمل ہونے کے بعد اسے محبت اور نرمی کے ساتھ سمجھایا۔ اب اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے میں اکیلی ہوں اور اکیلے پن سے اب عاجز آگئی ہوں یہ دنیا بہت گندی ہے مجھے عزت سے جینے نہ دے گی۔ مجھے مرجانے دو --!! وہ عورت اپنی پریشانیوں کے نقطۂ عروج پر کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر دیوانگی سی برس رہی تھی لیکن دیوانگی میں اس کا حسن و شباب اور نکھر آیا تھا۔ ! نہیں --!! نہیں !! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا تمہاری زندگی قدرت کا خوبصورت انعام ہے۔ میں یہ انعام پوری عزت کے ساتھ اپنے پاس رکھوں گا۔ چلو میرے ساتھ میرے گھر چلو --!!

ٹرن ..... ! ٹرن .....!! شلیندر نے دروازے کی گھنٹی پر انگلی رکھی۔ کون ..... ؟؟ شیبا نے اندر سے پوچھا۔

مہابلی کی ریاست کا نیا راجکمار --!! شلیندر نے شالنی کا صندلی ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیے ہوئے خوش آمدید

(بقیہ ص[illegible] پر)

غزلیں

کاشف لکھنوی

مرے مزاج میں احساسِ برتری ہے بہت
میں جانتا ہوں کہ مجھ میں ابھی کمی ہے بہت

نوائے عشق ہماری دبی دبی ہے بہت
خروشِ دل میں یقیناً ابھی کمی ہے بہت

یہ کس کے قدموں کی برکت ہے کون گزرا ہے
صداقتوں کی سرِ راہ روشنی ہے بہت

یہ بات بھی کسی طوفاں کا پیش خیمہ ہے
ہوائیں تیز ہیں ماحول میں نمی ہے بہت

جو ان کی یاد کے سائے میں چین سے گزرے
وہ چند لمحوں کی مصروف زندگی ہے بہت

خدا ہمیشہ تجھے میرِ میکدہ رکھے
ترا دیا ہوا اعزازِ تشنگی ہے بہت

ہمیں پہ تو نہیں موقوف اے جہاں والو!
ہر اہلِ دل سے مصائب کی دوستی ہے بہت

بہار آئی تو بعدِ خزاں مگر کاشف
چمن کے پھولوں میں اب بار سادگی ہے بہت

نقی کاظمی لکھنوی

۱۱۷، رستم نگر، فیض آباد

کون کہتا ہے کہ غربت کا لبادہ پہنا
یہ کفن، ہم نے بہر حال زیادہ پہنا

فکرِ اشعار میں، رنگین طبیعت نے مری
زیورِ ندرتِ تخئیل تو سادہ پہنا

غفلتِ وقت نے دیوار اٹھا دی کوئی
ہم نے جب ہوش میں ملبوسِ ارادہ پہنا

ہوشمندانِ جہاں، لرزہ براندام ہوئے
وقت نے جب بھی بغاوت کا لبادہ پہنا

اب یہ ڈر ہے کہیں کھل جائیں نہ اسرارِ حیات
میں نے بوسیدہ لباس، اتنا زیادہ پہنا

زندگی بھر جو تجھے ہوش میں رہنا ہے نقی
فکرِ محمود کو بس جامۂ بادہ پہنا

حبیب فکری

یہ سن کر ان کو لاج آئی بہت ہے
مرا دل ان پہ شیدائی بہت ہے

ترا پیراہنِ رنگیں مبارک
مری ہستی میں رعنائی بہت ہے

کہاں جائیں کہاں سر پھوڑ ڈالیں
طبیعت آج گھبرائی بہت ہے

بڑی ویرانیاں ہیں زندگی میں
چلے آؤ کہ تنہائی بہت ہے

ضرورت ہی نہیں کچھ اور مانگیں
ترا دستِ مسیحائی بہت ہے

محبت آ تجھے دل سے لگا لیں!
کہ تیرے دم سے رسوائی بہت ہے

بسا لیں چل کے کوئی اور دنیا
یہاں ہنگامہ آرائی بہت ہے

یہیں ہو جائیں گے خاموش فکری
ادا سے ایک انگڑائی بہت ہے

فراق نمبر : حصّہ دوم تاثرات کے آئینے میں

ثنا گورکھپوری ۔ کراچی ۔ پاکستان

"نیا دور" کے فراق نمبر کے دونوں حصے یہاں جب مجھے ایک صاحب کے توسط سے ملے، تو ساری کتابیں بالائے طاق رکھ کر تقریباً ایک ماہ ان دونوں کے مطالعے میں صرف کیا۔ واقعی آپ نے حق ادا کر دیا۔ فراق کا ہم سب پر یہ قرض بھی تھا اور ہم سب کی طرف سے آپ نے یہ قرض اتار دیا۔ آپکی اس پرخلوص اور انتھک محنت پر سچ تو یہ ہے کہ آپ کی یہ کوشش ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے یادگار رہے گی، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

اختر بستوی ۔ گورکھپور

"نیا دور" کے "فراق نمبر" کا حصہ دوم دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بھئی یہ آپ ہی کا دل جگر تھا کہ اس نمبر کے انتہائی خوبصورت اور شاندار حصہ اوّل کے بعد اس کے حصہ دوم کی اشاعت کا قصد کیا اور اسے اتنا دیدہ زیب اور اس قدر معیاری بنا کر پیش کیا کہ نقشِ ثانی نقشِ اول سے خوب تر ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ آپ نے "اپنی بات" کے عنوان کے تحت اپنے اداریے میں یہ درست لکھا ہے کہ "..... مواد کے اعتبار سے دوسرا حصہ پہلے حصے سے قدرے بہتر ہے" جہاں تک منظومات کا سوال ہے وہ تو حصہ اوّل ہی میں بہتر تھیں لیکن مقالات، جو نمبر کے بیشتر حصے کا احاطہ کرتے ہیں، بلاشبہ حصہ دوم میں زیادہ معیاری اور گرانقدر ہیں۔ حصہ دوم کو جو بات مواد کے اعتبار سے حصہ اوّل سے حقیقتاً بہتر بناتی ہے وہ یہ ہے کہ حصہ اوّل کے معدودے چند مقالات کو چھوڑ کر قریب قریب سارے مضامین میں اندازِ خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سا تھا جبکہ حصہ دوم کے بیشتر مقالات ایسے ہیں جن میں صرف تحسینی انداز نہیں اختیار کیا گیا ہے بلکہ فراق کی شخصیت اور ان کے فن کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کئی مضامین اس نوع کے ہیں کہ ان میں منفی پہلو پر زیادہ زور ہے۔ مثلاً رشید حسن خاں کا مختصر مضمون "چند تاثرات" اظہر علی فاروقی کا مقالہ "فراق گورکھپوری کا ایک روپ انوپ" اور رفاقت جونپوری کا مضمون "فراق : شخصیت اور شاعری" اس قسم کے مضامین کو شامل اشاعت کر کے آپ نے بہت اچھا کیا کیونکہ فن کی دنیا میں صحیح پرکھ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ فنکار کی ظاہری عظمتوں سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کے محاسن کے ساتھ ساتھ معائب پر بھی بیباکی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جائے۔ آپ نے "اپنی بات" میں لکھا ہے کہ "... جو ادبی الزامات فراق صاحب پر ان کے انتقال کے بعد لگائے گئے وہ اگر ان کی زندگی ہی میں ظاہر کر دیئے جاتے تو بہت سی باتوں کی وضاحت ہو جاتی اور بہت سے حقائق ہمارے سامنے آجاتے۔ پتہ نہیں کہ اربابِ نظر کس مصلحت سے خاموش رہے اور انھوں نے فراق کی زندگی میں لب کشائی نہیں کی"۔ فراق کی شخصیت کے تام جھام نے جس میں ان کی علمیت، لکچر، رعب، تحریکِ آزادی میں شمولیت، اور خود ہی اپنا پروپگنڈا کرنے کی عادت کا بہت ہاتھ تھا، ان کی زندگی میں بڑے بڑوں کو مرعوب رکھا۔ جب فراق زندہ تھے تو ان کی مخالفت میں "اربابِ نظر" اس "مصلحت" کی بنا پر بھی لب کشا نہیں ہوئے کہ جواباً انھیں فراق کے جس منھ پھٹ طرزِ گفتار اور بے لگام اندازِ تحریر کا سامنا کرنا پڑتا اسکی تاب لانے کی سکت

ان میں نہیں تھی۔ آج دانش جونپوری نے فراق کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے جو جارحانہ انداز اختیار کیا ہے اس کا ان کی زندگی میں تصور کر کے بھی موصوف کو جھرجھری آجاتی۔ چلئے فراق کے مرنے کے بعد ہی سہی لوگوں نے زبان تو کھولی اور شاعر و فنکار کی حیثیت سے ان کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین کرنے کیلئے انکے شعری و فنی عیوب کا ذکر تو کیا۔ رشید حسن خاں صاحب نے یہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت تو کی کہ غزل، نظم اور رباعی کسی صنف میں بھی فراق اعلیٰ درجے کے فنکار نہیں تھے۔ ویسے جناب فراق کی زندگی میں بھی جعفر علی خاں اثر جیسے اکا دکا جیالوں نے ان کی شاعری کے عیوب کی نشاندہی کرنے کی ہمت کی تھی۔ اثر مرحوم کے وہ مضامین تنقیدی ادب کے قارئین کو بھولے نہیں ہوں گے جو انھوں نے فراق کی رباعیات کے متعلق لکھے تھے اور جو ان کے مجموعۂ مضامین "چھان بین" میں شامل ہیں۔ اطہر علی فاروقی کے مضمون "فراق گورکھپوری کا ایک روپ انوپ" کا رنگ ڈھنگ اثر مرحوم کے انھیں مضامین کا سا ہے۔

مواد کے علاوہ "تزئین کاری" کے معاملے بھی "فراق نمبر" کا حصہ دوم اس کے حصہ اول سے بہتر ہے۔ آغا محمد حسن صاحب نے اس کی تزئین کچھ اس طرح کی ہے کہ یہ آنکھوں کو بھی اتنی ہی راحت پہنچاتا ہے جتنی کہ ذہن و دماغ کو۔ شاہنواز قریشی صاحب کے مضمون "فراق کی آنکھیں" کی تزئین کا انداز تو لاجواب ہے

بشیر بدر۔ میرٹھ

آپ نے فراق پر کیسے خوبصورت دو نمبر نکال دیے۔ آپ اور شاہنواز قریشی صاحب کی محنت، ریاضت اور صد درجہ سلیقہ مندی سے منکر ہونا کفر ہے۔

فاروق شفق۔ کلکتہ۔

"نیا دور" کا "فراق نمبر" کا دوسرا حصہ یہاں میں نے پانچ روپے میں خرید کر پڑھا۔ واقعہ یہ کے مندرجات کے اعتبار سے مجھے دوسرا حصہ پہلے حصہ کے مقابلے میں زیادہ پسند آیا۔ شخصیت کے وسیع تناظر میں لکھے گئے بہت سارے مضامین میں سے مجھے بالخصوص رمیش چندر دویدی، ملک زادہ منظور احمد، نذیر بنارسی اور مظہر نظامی کے مضامین بہت پسند آئے۔ دویدی صاحب نے اس مرتبہ بھی حق ادا کیا ہے۔ فراق صاحب کے فن سے بحث کرنے والے مضامین میں نریش چندر، عقیل رضوی اور ممتاز حسین کے مضامین کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھا اور سچی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے مایوس نہیں کیا۔ فراق صاحب کے فن اور ان کی شخصیت پر چند منفی مضامین بھی دیکھے۔ اس طرح دونوں رخ سامنے آگئے۔ چلئے اچھا ہی ہوا شاہ نواز قریشی صاحب کا مضمون بھی اپنے انوکھے پن کی وجہ سے پسند آیا۔ اس دستاویز سے صرفِ نظر کر کے فراق پر کوئی تنقیدی اور تحقیقی کام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آلوگ دائمی لائقِ مبارکباد ہیں۔

شمیم طارق۔ معرفت اردو بلٹز۔ بمبئی

فراق نمبر حصہ دوم کی کن کن خصوصیات کا ذکر کروں؛ فراق کو اگر جیتے جی معلوم ہو جاتا کہ ان کی موت کے بعد نیا دور اتنا خوبصورت اور جاندار نمبر نکالے گا تو وہ یقیناً مرنے میں بھی عجلت سے کام لیتے۔

ورق، ورق حرف حرف ... اس میں حسن ہی حسن ہے جو آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیتا ہے۔

مہدی پرتاپ گڈھی۔ پرتاپ گڈھ۔

فراق صاحب کی ذات اردو ادب کے لیے سرمایۂ افتخار تھی اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی ضامن بھی۔ آپ نے "نیا دور" کے ذریعہ انھیں ان کے شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کیا ہے میں آپ کی اس قابل قدر کاوش پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ایس۔ ایم عباس۔ جونپور۔

چشم بد دور۔ کیا خوبصورت
(بقیہ صفحہ… پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "اردو کی بین الاقوامی حیثیت"
مصنف: محمد نعیم اللہ خیالی: ملنے کا پتہ: قاضی پورہ بہرائچ
قیمت: ۳۰ روپے۔

شہرت کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر جن چند لوگوں نے سنجیدہ اور ٹھوس علمی کام کئے ہیں ان میں نعیم اللہ خیالی کا نام بھی نمایاں اور ممتاز ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جدید اور قدیم کی اصطلاحات سے اوپر اٹھ کر ایک متوازن اور سنجیدہ نقطہ نظر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کے علاوہ ان کی اور بھی تصانیف ہیں جن میں تاریخ مسعودی اردو کے غیر مسلم خاندانی شعرا، اردو مجلس اقوام متحدہ جرمن اردو ڈکشنری ترجمان اللغات، لغات ابجد فن تاریخ گوئی اور طبی لغات اربع خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

زیر نظر کتاب دراصل ایک ضخیم تحقیقی مقالے کا حصہ اول ہے جو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کیلئے لکھا گیا مگر نام نہاد ضابطے کی پابندیوں کے باعث ممتحن حضرات کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا اور اردو اکاڈمی کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں مصنف نے اردو حروف کی ماہیت دراوڑی، آرین، نادری، سامی اور مماثل عربی نظام تہجی کا نہ صرف نقشہ پیش کیا ہے بلکہ اردو حروف کی سائنٹیفک بنیاد، اردو رسم الخط کی فنی خصوصیات اردو حروف کی شکل و ساخت، اردو کتابت کی سہولت اور صحت املا، اردو رسم خط کی مشکلات، اور اسکے تغیر کا مسئلہ اسکی جامعیت اردو صوتیات و قرآت، اردو میں ہم آواز اور مشابہ اصوات، اردو میں ہم آواز حروف کی تعداد اور مشکلات اور مختلف زبان کے ہم آواز حروف کے تقابلی مطالعہ پر بھی روشنی ڈالی ہے صرف یہی نہیں بلکہ اعراب کی علمی اور فطری توجیح کو پیش کرتے ہوئے ان کے متعلق چند مفید تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ ایسے ٹھوس سنجیدہ اور علمی موضوع کے مواد اور ماخذ کی تلاش و تحقیق کے سلسلہ میں جس کد و کاوش اور دیدہ ریزی کی ضرورت تھی اسکا حق مصنف نے خاطر خواہ ادا کیا ہے۔ خیالی صاحب لائق صد تحسین و مبارکباد ہیں کہ انھوں نے دلائل اور براہین کے ساتھ اردو کی عالمگیر مقبولیت اور بین الاقوامی حیثیت پر اتنی سنجیدہ اور معیاری کتاب تحریر کی۔

کتابت، طباعت، جلد اور ڈسٹ کور ۔۔۔۔۔ یہ تمام چیزیں اوسط درجے کی ہیں ۔۔۔ ——— ملک زادہ منظور احمد

نام کتاب: "نغمۂ گلزار"
شاعر: محمد رشید احمد خاں رشید رام پوری
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: ذخیرہ مصنف، رام پور

استاد رشید رامپوری (وفات ۱۹۶۴ء)، ان اردو شاعروں کی آخری کھیپ میں تھے جن کے دم سے استادی شاگردی کی روایت تازہ تھی اچھے استاد کی صفت یہ ہے کہ وہ شاگرد پر اپنا رنگ مسلط نہ کرے بلکہ اس کے انفرادی رنگ کو چمکائے۔ رشید مرحوم ایسے ہی استادوں میں تھے۔ خود رشید کے رنگِ سخن کا اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے ہو سکتا ہے۔

عزیز اور دشمن برابر ہیں دونوں ... نہ یہ کام آئے نہ وہ کام آئے
اس خوف سے کہ پاؤں نہ کھل جائے غیر کا ... دن رات کوسے یار کا جھگڑا ہے اور ہم
پیدا ہوئے ہیں پھر یہ سمجھیں گے اے رشید ... جیتے بچے جو چارہ گردوں کی دولے ہم
ٹھہرا ہے عیادت پہ سفر ملکِ عدم کا ... آنے کے نہیں آپ تو جانے کے نہیں ہم
کیا کہا "میری محبت میں اثر کچھ بھی نہیں ... کیوں عیادت کو مری آئے اگر کچھ بھی نہیں
ادھر ابھی مجھے توبہ کا کب اقرار ہے ساقی ... نہ جب انکار تھا ساقی نہ اب انکار ہے ساقی
کوئی تو بات ہے جو اٹھاتا ہوں آپ کی ... ورنہ حضور کون کسی کا غلام ہے
میری میت پہ انہیں حور کا آیا جو خیال ... بولے جنت کو نہ جانا ارے مرنے والے
صبا اڑا کے مری خاک کوئے جاناں میں ... یہ کہہ رہی ہے کہ اٹھی تری خراب نہیں

ان شعروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رشید کو بیان پر عبور ہو

قدرت حاصل تھی۔ محاوروں کو وہ جس صفائی اور شگفتگی کے ساتھ شعر میں باندھتے ہیں اسے دیکھ کر داغ کی یاد آجاتی ہے اب ہماری شاعری سے زبان کا یہ رکھ رکھاؤ رخصت ہو چلا ہے۔

مجموعے کی ایک غزل صنعت غیر منقوطہ میں ہے۔ یہ بہت مشکل صنعت ہے اور اس میں کہے ہوئے شعروں کی زبان مصنوعی ہو کر رہ جاتی ہے لیکن رشید نے اس صنعت میں بھی ایسے صاف شعر نکالے ہیں کہ بہ یک نظر ان میں کسی صنعت کے التزام کا گمان نہیں ہوتا۔

وہ ہوا اور عدو کا گھر ہو — دور دو کر کس طرح سحر ہو
حال مرا اس طرح دگر ہو — آہ ادھر ہو واہ ادھر ہو
ہر دم ہوا احساس الم کا — دل سا ہمارا حال اگر ہو

اگر اس بات کی نشان دہی بھی کر دی جاتی کہ یہ غزل صنعت غیر منقوطہ میں ہے تو پڑھنے والے خصوصی طور پر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور شاعر کا کمال نظر انداز ہو جانے کا احتمال نہ رہتا۔

رشید مرحوم کے شاگرد رباب رشیدی نے، جو خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں، اپنے استاد کے کلام کو بہت سلیقے سے منتخب کر کے مرتب کیا ہے اور مرحوم کی صاحبزادی نے اپنے والد کے اس مجموعے کو بڑی نفاست کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا ہے۔ ہمیں دونوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ان کی بدولت ایسا کلام سامنے آیا ہے جس کے مطالعے سے لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور شاعری کا ہنر بھی سیکھا جا سکتا ہے۔

—— نیر مسعود

نام کتاب: **ادبی نگارشات**
مصنف: معین الدین حسن کاکوروی
قیمت: پچیس ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: مرکز ادب اردو ۱۳۷ شاہ گنج لکھنؤ

معین الدین حسن کاکوروی بڑے کہنہ مشق ادیب ہیں اور انھیں زبان پر زبردست قدرت حاصل ہے ان کا مطالعہ اور اس سے بڑھ کر مشاہدہ اور سب سے بڑھ کر ان کا جذبۂ اخلاص ان کی تحریر میں ایک خاص کشش اور حسن پیدا کرتا ہے اس لیے ان کے کسی مضمون کو ادھورا چھوڑ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ نیک دل اور پاک طینت انسان کی طرح اپنے قلم کو بھی پاک و صاف رکھتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں برملا کہہ دیتے ہیں۔

ادبی نگارشات ان کے اکیس مضامین کا مجموعہ ہے جس میں غالب، جوش اور فراق کے فن کو پرکھا اور جذبات کو سراہا گیا ہے۔ وہیں نثار احمد فاروقی اور ذکی کاکوروی کی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے یعنی معین صاحب قلم اٹھاتے وقت ادنیٰ و اعلیٰ کو بالکل اہمیت نہیں دیتے بلکہ اظہار رائے ہی کو مقدم رکھتے ہیں۔ جن سے ان کا جذباتی لگاؤ ہے یا جن سے انھوں نے فیض حاصل کیا ان کا احسان ادا کرنا اور اظہار محبت و عقیدت کرنا وہ عین سعادت سمجھتے ہیں۔ مکر و فریب، تصنع و ظاہر داری سے ان کا قلم خود ان کی شخصیت کی طرح بالکل پاک ہے اسی لیے ان کی تحریر میں روانی اور خلوص بدرجہ اتم موجود ہے۔

ادبی نگارشات میں شامل مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں خاص طور سے مولانا عبدالماجد دریابادی، کلام غالب کی ندرت اور احمد علی شوق قدوائی قابل ذکر مضامین ہیں۔

بحیثیت مجموعی ادبی نگارشات معین صاحب کی ایسی کوشش ہے جس کی بنا پر امید کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ لکھتے رہے تو یقیناً بعض بڑے مفید اور قابل ذکر مضامین کا اردو میں اضافہ کر کے اپنا مقام ضرور پیدا کر لیں گے۔

—— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: **"موجیں"**
شاعر: موج فتحگڑھی
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کے پتے: راجیندر بہادر موج، فتحگڑھ یوپی۔ دانش محل امین آباد لکھنؤ، نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ لکھنؤ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

● زیر نظر مجموعہ موج صاحب کی پختگی عمر اور ان کی دیرینہ ادب دوستی کا آئینہ دار ہے۔ بقول شخصے "شاعر جب بوڑھا ہوتا ہے تو اس کے سخن پر جوانی آتی ہے"۔ یہ قول موج صاحب پر پوری طرح صادق نہیں آتا۔ اس لیے کہ تخلیقی کاموں میں ان کی

دیکھیں اور کتا رکھیں گی [illegible] سکتے ہیں ابھی نہیں ہوا تھا" ہرگز
نہیں سمجھا جا سکتا لیکن اس امر سے بھی قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ جتنا وقت گزرتا جا رہا ہے ان کا سخن جوان ہوتا جا رہا ہے
وہ خود کہتے ہیں :

سنوارا ہے مری ہستی کو امواج حوادث نے
مری ہستی کا ہے دار و مدار اے موج طوفاں پر

ان کی بیدار مزاجی اور کج کلہی اس مجموعے کی اصل روح ہے۔
موج صاحب کا سارا کلام عصری تقاضوں پر مبنی ہے اور وہ اپنی شاعری کے ذریعے اپنے دور کے سماج کی بھرپور عکاسی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ وہ "بزبان شاعر" کے عنوان سے پیش لفظ میں اپنے مطمح شاعری کو اجاگر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"میری شاعری کا پس منظر کلاسیکی ہے لیکن میں نے اپنے اشعار میں قدیم روش سے ہٹ کر فکری جدت اور زبان و بیان کو انفرادی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے":

"موجیں" کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کا یہ بیان "قول فیصل" کے مطابق ہے۔ مجموعے میں حمد، نعت، منقبت، غزل، رباعی، نظم، قطعہ اور کرشن لیلا جیسے اہم اصناف اور موضوعات کو نہایت سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ اور کتاب کی تہذیب و تزئین میں بڑی دانشمندی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی "موجیں" ایک قابل مطالعہ شعری تخلیق ہے جسے حلقے میں پسند کیا جائے گا۔

—— ڈاکٹر سلمان عباسی

نام کتاب: "زندہ کتبے"
مصنف: عروج زیدی
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کے پتے: (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دلی ۶
(۲) سید عرفان علی زیدی، محلہ گنٹ کوئیاں، رام پور (یو۔ پی)

"زندہ کتبے" کے تخلیق کار حضرت عروج زیدی کا شمار ہند پاک کے ان گنت مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے، وہ بلند پایہ اور پختہ کار شاعر ہیں اور زبان و بیان کی نزاکتوں پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں وہ کسی ادبی یا سیاسی گروپ کی پشت پناہی کے بغیر کم و بیش نصف صدی سے سنجیدگی اور لگن کے ساتھ سماجی اور ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں مختلف اوقات میں اب تک ان کی نصف درجن تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں "شمع فروزاں" (مجموعہ قطعات) اور "سفینۂ غزل" کو معیارِ کلام کے پیشِ نظر یو۔ پی اردو اکاڈمی نے گراں قدر انعام سے نوازا تھا اب ان کے تاثراتی اور سوانحی نثری خاکوں کو جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں "زندہ کتبے" کے نام سے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

کلاسیکی سرمایہ کے محافظ کی حیثیت سے انھوں نے حضرت شاد عارفی، جگر مرادآبادی، نوح ناروی، شفیق جونپوری، راز یزدانی اور راہی القادری پر مضامین ترتیب دیے ہیں جن میں ان کی شخصیت اور فن کا ملا جلا عکس ہے، چوں کہ مصنف نے ان سب کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے اس لیے کتاب کے مندرجات میں واقعاتی استدلال بہت زیادہ ہے۔

موضوعاتی تنوع نہ ہوتے ہوئے بھی عروج صاحب نے اپنی تحریروں کی دلچسپی کو منفرد اسلوب اور طرزِ ادا کی گرمی سے برقرار رکھا ہے۔

"زندہ کتبے" پر بھی مصنف کو نہ صرف یو۔ پی۔ اردو اکاڈمی بلکہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے بھی انعام سے نوازا ہے۔

المختصر زیر تبصرہ کتاب نئی نسلوں کو اسلاف کے ادبی اور شعری کارناموں اور شخصیت سے متعارف کرانے کی قابلِ ستائش کوشش ہے۔

—— ظہیر صدیقی

نام کتاب: "گل و خار" (مزاحیہ افسانے) مصنفہ: فاطمہ حسن
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کے پتے: ۱۔ نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ۔
۲۔ دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔

شعر و ادب کی مختلف اصناف میں قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر

عصمت چغتائی، جمیلہ ہاشمی، الطاف فاطمہ، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، بانو وادا، ادا جعفری اور دیگر خواتین نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان خواتین کے تذکرہ کے بغیر ہمارے ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان خواتین نے بلاشبہ ہمارے فکشن اور شعری ادب میں گرانقدر اور ناقابل فراموش اضافے کیے ہیں۔ افسانوی اور شعری اظہار کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ خاص طور سے مذکورہ بالا شاعرات نے اردو شاعری کو ایک نیا اور نسائی لہجہ دیا ہے۔

اردو شعر و ادب میں نسائی اظہار اور نسائی لہجے کی روایت اب مستحکم ہو چلی ہے اور فروغ بھی پا رہی ہے۔ فاطمہ حسن صاحبہ کا نام بھی نسائی اظہار کی اسی روایت کی ایک کڑی ہے۔

فاطمہ حسن بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور سیدھے سادھے انداز میں سیدھے سادے افسانے لکھتی ہیں۔ جو اپنے روشن پہلو اور دلچسپ انداز کی بنا پر متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان کی زبان میں بھی بڑی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ "گل و خار" ان کے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں ۱۹ مزاحیہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں "رنگین پرزہ" "جب آزمائے نسخے فیل ہوئے" "مونچھوں کا ارمان" سے لیکر "نئے زمانے کی ساس" تک پر مصنفہ نے اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان افسانوں میں پلاٹ اور قصے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور قصے کو بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری اس سے بندھ جاتا ہے اور اس کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ ان افسانوں میں جو ماحول اور فضا ملتی ہے وہ قصے سے پوری طرح ہم آہنگ و جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہے۔

"گل و خار" میں مقدمہ، دیباچہ اور پیش لفظ ٹائپ کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یعنی دوسروں کے تاثرات اور رائے سے آپ کو متاثر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ چنانچہ آپ ان کی تحریر و تخلیق کی بنیاد پر ان کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہیں۔

ابتدا میں "ایک اعتراف" کے عنوان سے ایک صفحے پر مصنفہ نے چند سطروں میں "گل و خار" کے متعلق یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ "خدا کرے کہ یہ عام پسند بن جائے۔"

تو یقیناً اس میں پسند خاص و عام بننے کی پوری خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن آخر میں "ایک اعتراف" کا یہ صفحہ غلطی سے دوبارہ لگ گیا ہے۔ کتابت اور طباعت پر مزید توجہ کی ضرورت تھی۔

—— شاہ نواز قریشی

نام کتاب: "بارہ بنکی" •••

مصنف: چودھری سید علی محمد زیدی : قیمت: ۲۵ روپے

ملنے کے پتے: ۱۔ عزمی پبلیکیشنز، ارشاد منزل۔ رودولی، ضلع بارہ بنکی۔
۲۔ دانش محل امین آباد لکھنؤ۔

لکھنؤ سے ۲۷ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع، بارہ بنکی ملک ہی میں نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی مدت مدید سے مشہور و معروف رہا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے جانے مانے عالم مولانا عبدالماجد قصبہ دریاآباد کے تھے جو بارہ بنکی سے ۴۰ کیلومیٹر شمال میں ہے۔ اسی سرزمین پر رفیع احمد قدوائی پروان چڑھے جنھوں نے ملک و قوم کی بے مثل خدمت کی۔ مجاز اور خمار اسی سرزمین سے ابھرے۔ چودھری سید علی محمد زیدی نے سرزمین بارہ بنکی کے جغرافیائی و تاریخی حالات اور اہم واقعات و روایات سے متعلق موجود مواد اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک مبسوط اور مستند دستاویز بن گئی ہے جس سے تحقیقی کام کرنے والے یقیناً مستفید ہوں گے۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے

—— دیا شنکر

★

منٹو: ص۲۳ کا بقیہ

اور فن کارانہ خلوص کے ساتھ توجہ کرتے جو ان کی کہانیوں کا طرۂ امتیاز ہے تو اردو ناول نگاری میں ایک بالکل نئی فہج کا اضافہ ہوتا اور ان کے بعد کے ناول نگاروں کی نسل اس سے متاثر ہوتی اور اردو ناول کا ایک نیا اسکول سامنے آجاتا بہرحال اردو ناول کے فن کا مطالعہ کرتے ہوئے منٹو کے اس چھوٹے ناول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۴۔ نمبر والی: ص۵۹ کا بقیہ

تو کیا آپ لاش کو لاوارث مردہ گھر برائے طبی تجربات اور جراحی کی مشق کرنے والوں کے حوالے کرنا پسند کریں گے؟

"یہی ٹھیک رہے گا"

"اس کا آپ کو دس ڈالر معاوضہ بھی ملے گا۔ یہ لیجئے فارم"

لڑکے نے وہ فارم لے کر بھرنا شروع کر دیا۔ جب لڑکا فارم بھر رہا تھا تب جیکب کی بے نور آنکھوں میں ایک ہلکی سی حرکت ہوئی تو اس کی بیوی جیکب کے چہرے پر جھک گئی اور دھیرے سے بولی۔

"جیکب ڈاکٹر نا امید ہو چکے ہیں۔ ہم تمہیں آج آخری بار دیکھنے آئے ہیں" پھر اس نے آخری بار شوہر کو الوداع کہا دونوں ماں بیٹے دو منٹ اس طرح سیدھے اور خاموش سر جھکائے کھڑے رہے جیسے سوگ منانے کی رسم ادا کر رہے ہوں اور پھر دونوں وارڈ سے باہر نکل گئے جیکب کی آنکھوں کی پتلیاں وارڈ کے باہری دروازے کی طرف آہستہ سے مڑیں اور دھیرے دھیرے پتھروں میں تبدیل ہو گئیں۔

آج چودہ نمبر والی نے اپنا اسٹول مریض کے پلنگ کی پٹی سے جوڑ رکھا تھا۔ اور ٹیک لگائے مریض کے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامے تھی۔ کسی نرس نے اس سے کہہ دیا تھا۔ آج کا دن مریض پر بہت بھاری ہے۔

راجکمار: ص۶۴ کا بقیہ

لہجے میں کہا۔

شالنی بھی شلیندر کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہوئے زیر لب مسکرادی۔

شیبا نے پہلی تاریخ کی جمالیاتی رعنائیوں سے بھرپور سنہری شام کا تصور اپنی گہرائی آنکھوں میں سموئے جلدی سے کواڑ کھول دیئے۔

فراق نمبر: تاثرات ..... ص۶۷ کا بقیہ

نمبر آپ لوگوں نے ترتیب دیا ہے۔ ذوق نظر، حسنِ شعور، ترتیب و تزئین دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ کچھ اعتبار سے نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے کچھ زیادہ ہی ابھرا اور چمکا ہے۔ بے پناہ جد و جہد اور خلوص کے ساتھ قارئین کو یہ حسین تحفہ پیش کرنے کیلئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

فوق کریمی۔ علی گڑھ

فراق نمبر کو آپ نے جس محنت و جد و جہد سے کام لیکر ایک تاریخی دستاویز کی شکل دیدی ہے اس کیلئے آپ تمام اردو دوستوں بالخصوص پرستارانِ فراق کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ میری طرف سے اس شاندار نمبر کی ترتیب اور اسے حسین سے حسین تر بنانے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ ★



بدعنوانی اور کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔

— وزیراعلیٰ شری دیربہادر سنگھ

Vol. 40, No. 8 & 9
MBER & DECEMBER, 1985
Rs. 2-00 Paisa

Urdu Monthly

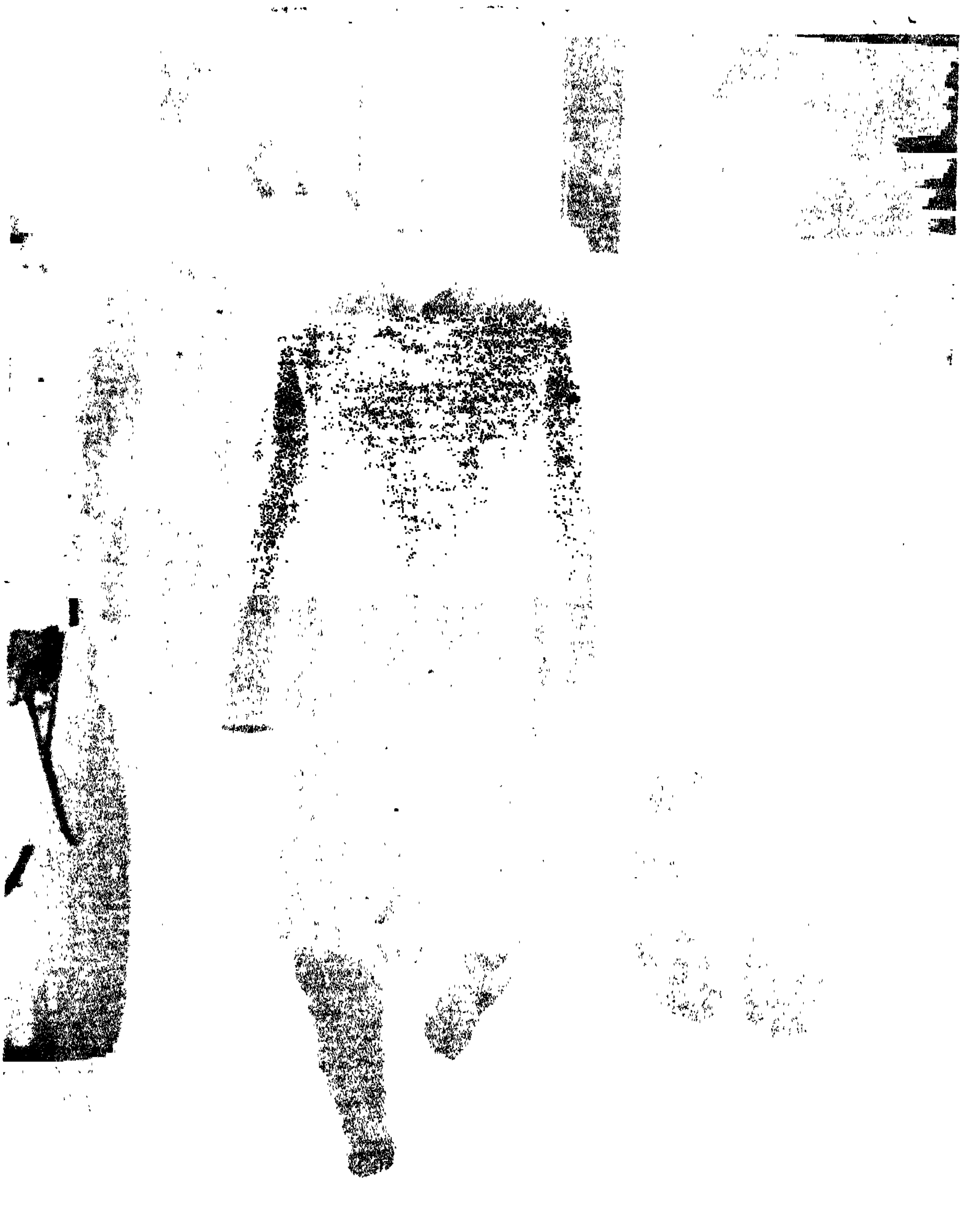
NAYA DAUR

REGD. No. LW/NP-444
Annual Subs.
Rs. 10/-



Printers, Luc





وزیر اعلا اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ ۱۴ فروری ۱۹۸۶ء کو مالیاتی سال ۸۷-۱۹۸۶ کا سالانہ ریاستی بجٹ پیش کرنے کے لیے اسمبلی جاتے ہوئے۔

نیا دور

جلد ۴۰ | نمبر ۱۰ تا ۱۲

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۶ء

ایڈیٹر : —— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : —— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : —— ۴۳۰۵۹
جوائنٹ ایڈیٹر : —— ۴۷۱۰۸

پبلشر پرشانت کمار مشرا
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
شرح سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۲، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہماری ریاست اترپردیش آبادی کے اعتبار سے ملک میں سب سے بڑی ریاست ہے اسی لیے اس کے مسائل بھی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اترپردیش، ہندستان کا دل ہے۔ اگر دل کمزور ہے تو سارا جسم کمزور ہوگا۔ لہٰذا حکومت کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ اترپردیش ہر شعبۂ حیات میں بھرپور ترقی کرے۔ ہمارے اوپر یہ بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ہر قدم پر حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ اترپردیش کے پچھڑے پن کا احساس یہاں کے ہر ذی شعور شہری کو ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب انگریز حکمرانوں کا جان بوجھ کر اس ریاست کو پسماندہ رکھنا بھی تھا کیونکہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک آزادی کی ساری لڑائیوں میں اترپردیش پیش پیش رہا جس کے نتیجہ میں انگریزوں نے یہاں ترقی و فلاح و بہبود میں کبھی دلچسپی نہیں دکھائی۔ آزادی کے بعد ہی اترپردیش میں ترقی کی نئی راہیں کھلی ہیں۔ اس وقت سے ریاست نے ہر شعبۂ حیات میں نمایاں ترقی کی۔ تعلیم، زراعت، بجلی، آبپاشی، صحت عامہ غرضیکہ ہر میدان میں کافی پیش رفت ہوئی ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جب سے ہمارے موجودہ وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ نے اترپردیش کی باگ ڈور سنبھالی ہے ترقی کی رفتار اچانک تیز تر ہوگئی ہے۔ انتظامیہ پہلے سے زیادہ چست ہوگیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کام کا ایک نیا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ شری ویر بہادر سنگھ کام کرنے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ وزیر اعلا ہونے سے قبل وہ ایک عرصے سے وزیر رہ چکے ہیں اور مختلف اہم محکموں میں اپنی صلاحیت اور بہترین کارکردگی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ خود اعتمادی کا جوہر ان کی سرشت میں شامل رہا ہے۔ وہ عموماً خاموشی اور لگن کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہیں۔ ان کی تیز نگاہیں اترپردیش کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور سارے مسائل آہستہ آہستہ حل ہوتے جارہے ہیں۔

یہ ہماری ریاست کے لیے فخر کی بات ہے کہ بیس نکاتی پروگرام میں اترپردیش کی پیش رفت قابل ذکر ہے۔ اس کی عمل آوری میں ہماری ریاست سارے ملک میں سرفہرست ہے۔ اس پروگرام میں نئی روح پھونکنے کے لیے جو نیا بیس نکاتی پروگرام ہمارے محبوب وزیر اعظم راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ سے منظور کرایا ہے اس سے ملک کو بڑی امیدیں بندھی ہیں اور تمام لوگوں نے اسے خوش آمدید قرار دیا ہے۔ ہمارے وزیر اعلا نے اس پروگرام پر وزیر اعظم کو مبارکباد دی ہے اور عہد کیا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے جی جان سے کوشش کریں گے۔ یہ نیا پروگرام امید کی ایک نئی کرن ہے اور اندھیروں میں اجالے کا پیغام ہے۔ بے روزگار، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی اس سے بڑا سہارا ملے گا اور وہ پہلے سے زیادہ ایک بڑی رقم بینک سے روٹی روزی کے حصول کے لیے آسان شرح پر حاصل کرسکیں گے۔ دیہی علاقوں کی فلاح و بہبود نئے پروگرام کا خاص حصہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملک کی بیشتر آبادی آج بھی دیہاتوں میں زندگی بسر کررہی ہے جس کی گذر بسر کا ذریعہ زراعت پر منحصر ہے زراعت کے فروغ کے لیے جدید وسائل کی ضرورت ناگزیر ہے۔ خدا کے فضل سے آج ہم بہت سی چیزوں میں خود کفیل ہوگئے ہیں مگر خوب سے خوب تر کی طرف بڑھنا ہی ہمارا نصب العین ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عوام کے معیار زندگی کو اونچا اٹھائے بغیر صحت مند معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آسکتا۔ موجودہ پردیش سرکار کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ سارے مسئلے بہت جلد حل ہوجائیں گے۔ ہمارے وزیر اعلا جس مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ صوبے کی ترقی اور امن و امان کے واسطے سرگرم عمل ہیں اس کے پیش نظر ان کی کوششیں یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوں گی اور ہماری ریاست اترپردیش بلندیوں کی طرف بڑھتی ہی جائے گی۔

بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر نیا دور کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی ہے۔ جس کا ہمیں بہت افسوس ہی نہیں شرمندگی بھی ہے۔ اب ہمارے لیے اور کوئی چارہ نہیں کہ اس کے تین چار مشترکہ شمارے نکال کر اس کی اشاعت کو معمول پر لے آئیں۔ اس کے لیے ہم اپنے قارئین سے انتہائی معذرت خواہ ہیں۔ ایڈیٹر

دیا شنکر سکسینہ بجر موجی
معرفت سریندر جیت سنگھ
نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹڈ، ۱۶/۹۶ مال روڈ کانپور

دل شاد ہو رہا ہے مسرور زندگی ہے
اہلِ وطن مبارک چھبیس جنوری ہے

موجِ صبا میں جیسے صبا کی مستیاں ہیں
میرے وطن میں جو بھی رہتے ہیں شادماں ہیں

آزادیٔ وطن کا گاتے ہیں سب ترانہ
عشرت کی زندگی ہے راحت کا ہے زمانہ

خورشید کی شعاعیں یوں جگمگا رہی ہیں
جیسے مسرتوں کا پیغام لا رہی ہیں

صبحِ بہار اپنے جلوے دکھا رہی ہے
میرے وطن کی دیوی پھر مسکرا رہی ہے

آزادیٔ وطن کی عظمت کا ہے تقاضا
نفرت کو ہم مٹا دیں گن گائیں ایکتا کا

آؤ کہ زندگی کو ہم جاوداں بنا دیں
بے کیف حوصلوں کو شوخ و جواں بنا دیں

ہندوستاں کا پرچم لہرائے نور بن کر
ہر سانس لب تک آئے موجِ سرور بن کر

چھبیس جنوری کا ہے فیض یہ ترانہ
میری نوائے دل ہے اے بجر مخلصانہ

ڈاکٹر مسعود دردولوی
لکچرر گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ

لے کے آئی پریم کا پیغام چھبیس جنوری
ہے مئے حبِ وطن کا جام چھبیس جنوری

عاشقوں نے دے دیا جانوں کو ہنستے کھیلتے
ہے انھیں قربانیوں کا نام چھبیس جنوری

ہو گیا دستورِ جمہوری جو نافذ ہند میں
کر رہی ہے سب کو مستِ جام چھبیس جنوری

دیکھ کر دہشت پسندی پاسبانِ ملک کی
ہو رہی ہے لرزہ بر اندام چھبیس جنوری

ہوتی ہے بے حد پریشاں دیکھتی ہے جب کبھی
ہند میں پھیلا ہوا کہرام چھبیس جنوری

سال بھر میں اپنے وعدے کس قدر پورے کیے
دیکھنے آتی ہے سب کے کام چھبیس جنوری

ہند میں جب تک نہ دیکھے ہر طرف امن و امان
پا نہیں سکتی کبھی آرام چھبیس جنوری

یاد آتے ہیں ہمیں وہ سب محبانِ وطن
جن کی جاں سوزی کا ہے انعام چھبیس جنوری

آپسی جھگڑے مٹا کر ایک ہو جائیں جو ہم
دیکھ کر مسرور ہو انجام چھبیس جنوری

جگن ناتھ آزاد

نگارخانہ

مالک رام کی نثر نگاری کے اطراف اس قدر وسیع اور اس طرح دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر ہم ایک ہی تسلسل میں ان سب پر نظر ڈالیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نثر کے ایک نگار خانے کی سیر کر رہے ہوں۔ میں جب کبھی مالک رام کے نثری کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں اور ان کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو معاً یہ شعر یاد آجاتا ہے

دامانِ نظر تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

اور میں سپر انداز ہو جاتا ہوں۔

مالک رام کی نثر نگاری کے ابعاد، اطراف اور تنوعات کی جانب اشارہ کر کے میں یہ کہنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ بات تو مجھ سے پہلے آل احمد سرور، کرنل بشیر حسین زیدی، مختار الدین آرزو، علی جواد زیدی، عرش ملسیانی اور دوسرے متعدد اہل قلم اور نقاد اپنے اپنے انداز میں کہہ چکے ہیں مثلاً کرنل بشیر حسین زیدی لکھتے ہیں:

"اردو میں جدید طرز کی علمی اور ادبی تحقیق کے علمبرداروں میں مالک رام صاحب ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور تقریباً چالیس سال سے تاریخِ ادب خصوصاً غالبیات کے میدان میں دادِ تحقیق دے رہے ہیں۔ انھوں نے غالب اور ان کی گوناگوں شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات اور دلچسپی کے دائرے کو وسیع کیا ہے اور غالب شناسی کے حلقے میں انھیں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ وہ اسلامیات میں بھی بہت اچھی نظر رکھتے ہیں اور اسلام میں عورت کے مرتبے پر ان کی کتاب خاص و عام میں مقبول ہو چکی ہے۔"

علی جواد زیدی اپنے مضمون "ذکرِ مالک" میں کہتے ہیں:

"مالک رام کی تصنیفات اور تالیفات کافی متنوع ہیں۔ اگرچہ انھوں نے غالبیات پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن دوسرے موضوعات پر بھی کم توجہ نہیں کی ہے۔ وہ ہمہ گیر ذوق رکھتے ہیں۔"

مختار الدین آرزو کا کہنا ہے کہ:

"انھیں صرف ایک پٹری پر ہمیشہ چلنا مرغوب نہیں۔ طرح طرح کے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں — کبھی 'فتوح البلدان' کا ترجمہ ہو رہا ہے کبھی سلیمان تاجر کا سفرنامۂ ہند و چین اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ کبھی غالب کے ذکر و اذکار کا شغل ہے تو کبھی عورت اور اسلامی تعلیم کے موضوع پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے۔ ایک زمانے میں فارسی کے سارے نعت گویوں کا کلام جمع کر رہے تھے۔ پھر خط آیا کہ "تلامذہ غالب" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھ رہے ہیں۔ ایک بار انھوں نے اطلاع دی کہ حمدربی کے متعلق ایک زیرِ ترتیب ہے جس میں اس کے آئین و قوانین کا ترجمہ کر کے شائع کر رہے ہیں۔ پھر مژدہ سنایا کہ افلاطون

کی تمام تحریروں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اب انھوں نے لکھا ہے کہ گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندستانی کی ضخیم مجلدات کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہتے ہیں .....“

اور عرش ملسیانی کے الفاظ ہیں :

علم کی جستجو میں جان نثار ۔۔۔ بہر تحقیق روز و شب بیدار
راہِ تحقیق پر چلے ہیں مدام ۔۔۔ چھان ڈالے عراق و مصر و شام
کارواں علم کا ہے تیز خرام ۔۔۔ اور اس کے امیر مالک رام
رمز داں ہیں یہ فکرِ غالب کے ۔۔۔ ہیں مصنف یہ ”ذکرِ غالب“ کے“

لیکن جب میں ان کی تحریر کو نگارخانۂ نثر کہتا ہوں تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ تحقیق، تنقید، غالبیات، تاریخ، تراجم اور دوسری ان تمام اصناف میں جن پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے، اُن کا اسلوب نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی اور موقع و محل کی مناسبت سے بھی تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے باوجود ان کے تمام اسالیب میں ایک قدرِ مشترک باقی رہتی ہے اور وہ ہے Readability جسے ہم حسنِ تحریر بھی کہہ سکتے ہیں اور لطفِ مطالعہ کی کیفیت بھی لیکن میں اس کے لیے ایک غیر تنقیدی لفظ استعمال کروں گا اور وہ لفظ ہے ”دلکشی“۔

مدت ہوئی ڈاکٹر وحید اختر کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف محققین کی بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تمام محققین میں سے خوبصورت زبان ہمیں صرف مالک رام کے یہاں ملتی ہے اور جب ہم مالک رام کی مختلف النوع تحریروں پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو ڈاکٹر وحید اختر کی اس رائے پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

”ہمارے نقادوں نے اچھی نثر کی متعدد خوبیاں گنوائی ہیں لیکن میرے نزدیک نثر کی سب سے بڑی خوبی اس کا نثر ہونا ہے جس طرح شعر کی سب سے بڑی خوبی اس کا شعر ہونا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نثری نظم ایسی ترکیبیں میرے گلے سے نہیں اترتیں۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ ایک تحریر کو ہم نثری نظم کہہ کر اسے خراب نظم کہہ رہے ہیں یا اچھی نثر یا اچھی نظم کہہ رہے ہیں یا خراب نثر۔ اگر نثر میں نظم کا انداز پیدا ہو گیا ہے تو اسے نثر کی ایک صنف کہیے۔ ایسے آپ نظم کیسے کہہ سکتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مالک رام کی نثر کی سب سے بڑی خوبی وہ ہے جو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علمی نثر جتنی مختصر اور موجز ہو گی اتنی ہی بلیغ اور جاندار ہو گی۔ اس وقت مجھے ولیم اسٹرنک کے الفاظ تو پوری طرح سے یاد نہیں آ رہے ہیں لیکن اپنی کتاب ”اسلوب کے عناصر“ (Elements of Style) میں وہ کچھ اس طرح کی بات لکھتے ہیں کہ فقرہ غیر ضروری الفاظ سے اور پیراگراف غیر ضروری فقروں سے خالی ہونا چاہیئے۔ اس کی مثال وہ اس بات سے دیتے ہیں کہ فقرے میں غیر ضروری الفاظ اور پیراگراف میں غیر ضروری فقرے بالکل اسی طرح مفقود ہونا چاہییں جس طرح ایک ڈرائنگ میں غیر ضروری لائینیں یا ایک مشین میں غیر ضروری پرزے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک نثر نگار صرف چھوٹے چھوٹے فقرے لکھے یا وہ کسی بات کی تفصیل بیان نہ کرے اور محض اشاروں ہی میں کچھ کہتا چلا جائے بلکہ ہر لفظ بھرپور انداز سے بولنا چاہئے۔ یہاں در اصل ولیم اسٹرنک لفظ کے تخلیقی استعمال کی اہمیت بیان کر رہے ہیں اور جہاں تک لفظ کے تخلیقی استعمال کا تعلق ہے یہ نثر میں بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح نظم میں کیونکہ لفظ کا تخلیقی استعمال ایک اہلِ قلم کی، خواہ وہ شاعر ہے خواہ نثر نگار، تخلیقی صلاحیتوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور انھیں اجاگر بھی کرتا ہے۔

میری اس بات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں یہاں نثر اور نظم کے ڈانڈے ملانے کی کوشش کر رہا ہوں اس لیے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک نثر نثر ہے اور نظم نظم۔ دونوں کے محاسن الگ الگ ہیں جن کا تھوڑا بہت ذکر اس مقالے میں آگے چل کر آئے گا۔

بات کو محض پھیلانے کی خاطر پھیلانا شاعری میں تو کام دے جائے گا لیکن نثر میں نہیں اور شاعری میں بھی بات کام

دے جانے کی حد ہی تک رہے گی۔ اس سے شاعری خوبصورت تو ہو جائے گی لیکن بڑی شاعری نہیں بن پائے گی۔ بڑی شاعری کے لیے معیار یہی ہوگا کہ بات کم سے کم لفظوں میں بیان کی جائے اور کم سے کم الفاظ اپنی زیادہ سے زیادہ تہیں کھولتے چلے جائیں۔ اس سلسلے میں جوش اور اقبال کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک کی شاعری محض خوبصورتی سے آگے نہیں بڑھ سکی اور دوسرے کے یہاں شاعری نے خوبصورتی اور عظمت دونوں کو سمیٹ لیا۔ خیر، بات میں یہاں نثر کی کر رہا ہوں اور نثر، بالخصوص علمی نثر مجمل بیانی کی متقاضی ہے نہ کہ الفاظ کو بے تحاشا استعمال کیے چلے جانے کی۔ اور مالک رام نے اس راز کو اس وقت پا لیا تھا جب انھوں نے لکھنے کی ابتدا کی تھی۔

مالک رام بہت پڑھے لکھے شخص ہیں، عالم ہیں لیکن ان کا انداز اُن پڑھے لکھے اہل قلم سے مختلف ہے جو اپنی تحریروں میں اپنے علم کا ڈھنڈورا پیٹتے چلے جاتے ہیں۔ حفیظ جالندھری نے (اللہ انھیں مغفرت کرے!) ایک سیمینار میں اقبال پر ایک عالم محقق کا مقالہ سننے کے بعد کہا تھا کہ اس میں اقبال کے متعلق تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوا، ہاں آپ کی علمیت کے ہم ہیچ مداں ضرور قائل ہو گئے ہیں بلکہ اس سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ حفیظ جالندھری کے اندر جو چھپا ہوا نقاد تھا (کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر تخلیق کار کے اندر کسی نہ کسی سطح کا نقاد ضرور پوشیدہ ہوتا ہے) اس وقت وہ اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالک رام اپنی تحریروں میں اپنے تبحر علمی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ علم ان کے یہاں آ کے ہضم ہو جاتا ہے اور ان کے اسلوب اور انداز بیان کا جزو بن کر ان کی تحریر میں نمودار ہوتا ہے۔ گہرے علمی مسائل کو بھی جب مالک رام بیان کرتے ہیں تو وہ تحریر اپنی دلکشی کے باعث ہمارے دل و دماغ کو متاثر کرتی چلی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک زیریں لہر کے طور پر ان کی عالمانہ بحث ہمارے علم میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً میرزا غالب ہندوستان کے فارسی لکھنے والوں میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے علاوہ کسی کو قابلِ استناد نہیں مانتے تھے۔ آخر ایسا کیوں تھا جب کہ ہندستان کے فارسی لکھنے والوں میں فیضی، بیدل، ناصر علی، قتیل، غنیمت کنجاہی، واقف بٹالوی ایسے پائے کے لوگ تھے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:-

"زبان ان علوم میں سے ہے جو سماعت پر مبنی ہیں یہاں قیاس سے کام نہیں چلتا۔ میں نے جو بہلوں سے سُنا وہ آج لکھ اور بول رہا ہوں۔ جو لوگ مجھ سے پہلے تھے، انھوں نے اپنے بڑوں کی پیروی کی۔ اور جو میرے بعد آئیں گے وہ اپنے بڑوں کا تتبع کریں گے۔ یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص جمہور کی رائے کے خلاف نئے محاورے گڑھنا اور لکھنا شروع کر دے۔ جب تک انھیں قبولِ عام اور تائیدِ جمہور کی سند نہ مل جائے وہ ٹکسال باہر ہیں اور زبان کا جزو نہیں سمجھے جا سکتے۔ انھیں یہ مقبولیت اور تائید جبھی حاصل ہوگی اگر وہ سماعی اصولوں پر پورے اتریں اور انھیں زبان میں داخل کرنے کا حق بھی صرف اُس ملک کے باشندوں کو حاصل ہے جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نہ کہ کسی اجنبی کو۔ غرض کہ یہ کلیہ بہر حال قائم رہے گا کہ زبان سماعی علم ہے قیاسی نہیں۔ یہ پہلا اصول ہے۔

جس ملک میں کوئی خاص زبان بولی جاتی ہے وہ اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان ہے اور وہ لوگ اہل زبان کہلاتے ہیں۔ چونکہ وہ گہوارے سے اپنے ارد گرد کے بڑے بوڑھوں سے یہ زبان سنتے چلے آئے ہیں، اس لیے جیسا وہ اس زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہوتے ہیں ایسا کسی

دوسرے ملک کا باشندہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی اجنبی محنت اور مشق سے اس زبان کے قواعد پر عبور حاصل کر لے اور ان قواعد کی رو سے لسے صحیح لکھ بھی لے لیکن اس کے باوجود اس کا درجہ زباندا کا ہے، اہلِ زبان کا نہیں۔ کیونکہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعد بعد کو۔ زبان اور بیان کے روزمرے میں سینکڑوں انوکھیں اور نزاکتیں ایسی ہیں جو تحریر میں آسکتی ہیں نہ کسی قاعدے قانون کی پابند ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق سماعت اور وجدان سے ہے۔ یہ باتیں اس اجنبی کو کسی قاعدے اور کتاب میں نہیں ملیں گی اور اس حد تک اس کا علم ناقص رہے گا۔ یہ دوسرا اصول ہے۔

یہ اجنبی جس نے وہ زبان کتابوں کی مدد سے سیکھی ہے جب کوئی چیز اس زبان میں لکھے گا تو قدرتاً اس کی تحریر میں وہ سادگی اور آمد، بے ساختگی اور شیرینی نہیں ہوگی جو آپ کو کسی اہلِ زبان کی تحریر میں ملے گی۔ وجہ ظاہر ہے۔ چونکہ اس نے اسے مکتب میں پڑھا ہے اس لیے اس کا علم خارجی ہے، داخلی نہیں، جب اس شخص کا جس نے جب سے ہوش سنبھالا یہی زبان سنی اور بولی۔ اس کے لیے یہ زبان ایسی ہے جیسے "فولاد میں جوہر یا تار میں سُر"۔ اسے لفظوں کی تلاش میں کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کے برعکس زباندان کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں الفاظ ڈھونڈنا پڑیں گے۔ اس سے خواہی نخواہی اس کے بیان میں تصنع اور آورد آجائے گی۔ یہ تیسرا اصول ہے۔

ان پیش کردہ اصولوں ہی سے ایک اور اصول پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی لفظ یا محاورے کی غلطی یا درستی میں بحث ہو تو اس کا فیصلہ اہلِ زبان کی سند سے ہوگا۔ اس بارے میں کسی بڑے سے بڑے اجنبی کا کلام بھی مفیدِ مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ چوتھا اور آخری اصول ہے۔

اگر ہم یہ چاروں اصول اپنے سامنے رکھیں تو ہم آسانی سے فیصلہ کر سکیں گے کہ غالب کا ان ہندستانی فارسی لکھنے والوں پر اعتراض کیا ہے۔ غالب اس سے انکار نہیں کرتے کہ یہ اصحاب عالم ہیں، فارسی جانتے ہیں اور لکھتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کا اہلِ زبان سے کیا مقابلہ؟

مالک رام کی نثر عالمانہ، متین اور سنجیدہ نثر ہے اس میں محمد حسین آزاد، اور صلاح الدین احمد کی نثر کا اندازِ زیر و بم ہمیں تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی نثر میں سمندر کا سکون اور گہرائی ہے، سمندر کے مدوجزر کی کیفیت نہیں ہے اور اس لیے نہیں کہ یہ اتار چڑھاؤ رکھنے والی نثر علمی مباحث کے لیے نہ صرف ناموزوں ہے اور اس لیے نہیں کہ یہ علمی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی نثر طنز و مزاح کے عنصر سے خالی نہیں اس میں ہمیں چٹکلے نہیں ملیں گے لیکن لطافت کا دامن اس نثر کے ہاتھ سے کبھی چھوٹنے نہیں پاتا۔ مالک رام لطیفوں سے اپنی نثر کو سجانے کی کوشش نہیں کرتے لیکن جب کسی کی داستانِ حیات بیان کرتے ہوئے اس کی زندگی کا کوئی لطیفہ سامنے آجاتا ہے تو اُسے ضرور زیبِ داستان بناتے ہیں۔ مزاح کی ایک لطیف کیفیت خود ان کی اپنی طبیعت میں بھی موجود ہے اور جب کبھی یہ کیفیت ان کی نثر میں نمودار ہوتی ہے تو نثر موجِ لطافت بن جاتی ہے۔ اس موجِ لطافت کی ایک جھلک ان سطور میں دیکھیے:

"ہمارے ایک دوست تھے حمید عرفانی۔ انھیں بھی تصویر کشی سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے لومایا کی اس تصویر کی نقل تیار کی اور ایسی عمدہ کہ باید و شاید۔ اس پر انھوں نے خود جگر سے

اُن کا ایک فارسی شعر لکھوایا اور دستخط لیے جب میں نے یہ تصویر اُن کے وہاں دیکھی تو میری نیت خراب ہو گئی۔ اب مجھے ٹھیک سا یاد نہیں کہ انھوں نے میرا شوق دیکھ کے خود ہی اسے میرے حوالے کر دیا یا میں نے ہی کچھ حیلہ بہانہ کر کے یہ ان سے ہتھیالی۔ بہر حال تصویر میرے قبضے میں آ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے کتابخانے کے ساتھ میں اسے اپنے عزیز دوست ملک احمد حسن مرحوم (ایڈیٹر دورِ جدید) کے پاس چھوڑ آیا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جب احمد حسن نے اسے دیکھا تو پوچھا کیوں بھئی؟ واقعی یہ جگر صاحب کی ٹھیک شبیہ ہے۔ میں نے کہا واہ صاحب! یہ آپ نے کیا کہا۔ اصل تو یہ تصویر ہے، جگر صاحب تو اسے دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔"

مالک رام اپنی نثر نگاری میں 'ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد' کے قائل ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تنقید آدابِ تنقید کی حدود کے اندر رہتی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کی تنقید کی طرح ان کی تنقید شاعرانہ اندازِ بیان کی نذر نہیں ہو جاتی اور نہ ہی ظ۔ انصاری کی مانند وہ تنقید کی زبان کو ہنسی مذاق اور طعن و تشنیع کے نشتر سے مجروح کرتے چلے جاتے ہیں بلکہ ہر موقع پر تنقید کے لیے تنقید کی مناسب زبان کا استعمال ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ مالک رام اس رمز سے آشنا ہیں کہ تنقید کا کام فیصلہ دینا نہیں بلکہ جائزہ لینا ہے۔ یہ کوئی دودھ اور پانی کو الگ کر کے دکھانے کا کیمیادی عمل نہیں ہے بلکہ تنقید کا کام تخلیقی عمل کو آگے بڑھانا ہے۔ اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو مالک رام کی تنقیدی عبارت خود ایک تخلیقی عمل کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے مثلاً ایک جگہ غالب کے قصیدوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان کے قصیدوں کی تشبیب یا تمہید بہت شاندار ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنا پورا زورِ کلام صرف کر دیتے ہیں۔ گریز عموماً بہت پُر لطف اور بے ساختہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مدح بہت کم اور مختصر اور اخیر میں دو ایک شعر میں دُعا پر وہ قصیدہ ختم کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شاعر ہیں اور مدح بھی کرتے ہیں لیکن ایک آدھ جگہ کو چھوڑ کر اُن کی مدح میں بے جا غلو اور اغراق کہیں نہیں ملتا" (ذکرِ غالب)

اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ مالک رام نے غالب کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمیشہ توصیفی بات ہی کہی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ برہانِ قاطع اور قاطع برہان کے قضیے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پھر اس کے بعد جس طرح شرم و حیا اور تہذیب و شرافت کی مٹی پلید ہوئی وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت ہی افسوسناک باب ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر "البادی اظلم" کے اصول سے دیکھا جائے تو اس کے لیے بہت حد تک مرزا خود ذمہ دار تھے۔ انھوں نے اپنی درشت گفتاری کی جو توجیہہ کی ہے وہ بہت بودی ہے۔ کوئی لاکھ "سپاہی زادہ" ہوا کرے اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کا مذاق یا تمسخر اڑائے یا اُسے سخت سست کہے۔ خاص کر جب بحث کا موضوع بھی علمی اور تحقیقی ہو۔ بے شک مرزا نے اپنی تحریر میں شوخیِ طبع اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن علمی مسئلوں کی تحقیق میں شوخی اور ظرافت نہیں متانت اور سنجیدگی درکار ہے۔"

مالک رام کی تنقید نگاری کے سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ تنقید کو مالک رام نے اس طرح اپنا موضوع نہیں بنایا جس طرح تحقیق کو لیکن چونکہ تحقیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے تنقیدی اشارے مالک رام کی تحقیق میں جا بجا نظر آتے ہیں جن سے صرف ان کی تنقیدی بصیرت ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ تنقیدی بصیرت قاری کے دل پر مستقل اپنا نقش بٹھاتی چلی جاتی ہے۔ جگر مراد آبادی کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

ان کے کلام میں دو مختلف رنگوں کا امتزاج ہے جرأت اور داغ کی مادیت بھی ہے اور مومن کی معنویت بھی۔ جگر کا مزاج ان تینوں سے ملتا جلتا ہے۔ جرأت اور داغ نے عشق جسمانی کی جو تصویریں اپنے کلام میں پیش کی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے ہاں کوئی پیچیدگی نہیں۔ وہی روزمرہ کی باتیں ہیں جو آئے دن ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ جگر نے ان دونوں پر یقیناً ترقی کی ہے۔ ایسی کربسا اوقات پڑھنے والے کا ذہن شعر کی مادیت کا پوری طرح سے احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام میں ان دونوں کی سی صاف عریانی نہیں، بلکہ وہ اکثر اپنا مدعا ایسے پردے اور درک سے بیان کر جاتے ہیں کہ انسان پر اس کی عارضی ہیجانیت اور پیش یا افتادگی تک گراں نہیں گزرتی اور وہ اس پر خاص توجہ دیے بغیر آگے گزر جاتا ہے۔

مومن کے یہاں حسن و عشق کی تصویریں زیادہ گہری ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے اختیار میں نہیں۔ ان کے کلام سے پوری طرح لذت یاب ہونے کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف قاری کے ذہن کی تربیت ایک خاص فکری ماحول میں ہوئی ہو بلکہ اس نے "فسق و فجور" کا کچھ نظری یا عملی تجربہ بھی کیا ہو۔ مومن نے زمانۂ ہجر و وصال کی مختلف واردا توں اور لاگ اور لگاوٹ کی گوناگوں کیفیتوں کا جو نفسیاتی نقشہ پیش کیا ہے، اس کا جواب نہیں لیکن چونکہ اُن کے ہاں ایک خاص طرح کا لفظی اشکال ہے اور اس کا تعلق فی الاصل بیشتر ان کے لہجے سے ہے جس سے بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی لیے قاری اس کی معنویت تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ حقیقت میں یہی وجہ ہوئی کہ مومن نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چونکہ جگر نے مدتوں رندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خاک چھانی تھی اس لیے وہ ان مضامین کے ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں جو مومن کا طرۂ امتیاز ہیں۔ نہ صرف یہی، بلکہ ان کے یہاں لفظی اشکال نام کو نہیں۔ ان کی بات فوراً ہر ایک کی سمجھ میں آجاتی ہے۔

شراب کے مضامین جنھیں خمریات کا نام دیا گیا ہے، جیسے کچھ اُن کے کلام میں بیان ہوئے ہیں آپ کو اردو میں بہت کم کسی اور شاعر کے یہاں ملیں گے۔ ریاض خیر آبادی کے خمریات مشہور ہیں۔ لوگ داغ کی بھی اس باب میں تعریف کرتے ہیں حالانکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ریاض اور داغ دونوں کے یہاں حد درجہ سطحیت ہے۔ میں ان دونوں کی قادر الکلامی کا انکار نہیں کر رہا ہوں۔ دونوں استاد ہیں اور زبان کی رنگینی اور شوخی میں تو ان کا جواب نہیں لیکن یہاں گفتگو خمریات سے ہے۔ فقرہ چست کر دینا یا پھبتی کہہ لینا اور بات ہے، اور سرخوشی کے عالم میں اپنے اندرونی احساسات اور دلی تاثرات کا بیان الگ چیز ہے۔ وہ کیفیت اور سرور جو صرف ایک رند میکش ہی محسوس کر سکتا ہے نہ ریاض کے بس کی بات ہے نہ داغ کی۔

یہاں میں مالک رام کی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" کا ذکر خاص طور سے کرنا چاہوں گا جو ان کے نو احباب اور مرزا غالب کے متعلق مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر [illegible] کی مثل صادق آتی ہے۔ تحقیق تو خیر اس کتاب کی جان ہے ہی، اس میں کردار نگاری اور شخصیت نگاری کے خوبصورت نمونے بھی موجود ہیں، سراپا نگاری کے بھی اور واقعہ نگاری کے بھی۔ نواب سائل دہلوی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کر خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

—— میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا، اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں —— اور جہاں چاندنی نہیں تھی وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں یہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا —— زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستر برس کا سن، کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم، میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، لمبوترا کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوک دار ناک، گلے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی، سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید داڑھی جو یک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے، شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں، سر پر ہلکی سی پلے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج بٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا آڑا پاجامہ، پاؤں میں خورد نوک کا جوتا، داہنے ہاتھ میں چھڑی اور بائیں میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا —— یہ تھے نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب بن نواب ضیاالدین خان بہادر نیر رخشاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خان بہادر والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو۔" بحوالہ مرزا فارت خان بخارائی ؎

اب سراپا نگاری کا ایک اور مرقع ملاحظہ ہو:

"تو خیر، جس مشاعرے میں ہم لوگ اس اتوار کے دن گئے، یہ "نابور پارٹی" یعنی انجمن ارباب علم و ادب کا مشاعرہ تھا۔ یہیں مرزا یاس یگانہ کو پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا۔ مشاعرے کی صدارت سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے کی تھی۔ انھوں نے میرزا سے اپنا کلام سنانے کو کہا تو وہ منبر پر تشریف لائے۔ لگ بھگ ۵۰ کا سن، متوسط قد، سانولا رنگ، تیکھا ناک نقشہ، بڑی بڑی ذہین اور چمکدار سیاہ آنکھیں، چشمہ لگائے ہوئے، یہ بڑی گھنی مونچھیں جنھیں بھرپور تاؤ دے رکھا تھا، سر پر اونچی دیوار کی سیاہ کپڑے کی ٹوپی اور گلے میں معمولی سپید کپڑے کی شیروانی تھی جس کی بائیں طرف کی جیب کے باہر گھڑی کی زنجیر دکھائی دے رہی تھی، نیچے سفید لٹھے کا پاجامہ، پیروں میں سیاہ رنگ کا پمپ شو اور ہاتھ میں ہلکی سی بید کی چھڑی۔ یہ تھے میرزا یاس عظیم آبادی" ؎

اور آخر میں جگر صاحب کی تصویر:-

"میانہ قد، خاصا سانولا رنگ، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھیں اور ان میں سرخی کی جھلک، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا، ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی جس میں چاول کم اور دال زیادہ تھی، سر پر لمبے لمبے بے ترتیب پٹے جو ٹوپی سے باہر نکلے پڑتے تھے۔ . . . .

. . . . گلے میں سیاہ رنگ کی شیروانی اور نیچے چوڑیدار چست پاجامہ، سر پر سلیٹی رنگ کی بالوں والی اونچی دیوار کی ٹوپی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا پمپ پہنے تھے۔ طبیعت میں حد درجہ بے چینی اور وحشت

ں! اب وہ صرف پندرہ منٹ بیٹھے رہے لیکن اس دوران میں بھی انھوں نے جو باتیں کیں، کچھ عجیب اُکھڑی اُکھڑی سی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا اپنے سائے سے بھڑک رہے ہوں۔ یہ تھے جگر صاحب!

یہاں مالک رام کی نثر نگاری کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا موقع نہیں کہ اُن کے کردار اور عادات کا ذکر کیا جائے لیکن بات ذرا سخن گسترانہ آپڑی ہے اس لیے یہ ذکر نامناسب بھی نہیں۔ میں انھیں کوئی چونتیس پینتیس برس سے بہت قریب سے دیکھتا چلا آرہا ہوں اور جانتا ہوں کہ ان کی زندگی "تو برائے وصل کردن آمدی" کی تفسیر ہے اور یہی بات جب اُن کی نثر میں ڈھلتی نظر آتی ہے تو کس قدر دلکش پیرایۂ اظہار اختیار کر لیتی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے لگ سکتا ہے۔ اسی واقعے کا تعلق اُس مقدمے سے ہے جو مولانا امداد صابری نے سید سلیمان ندوی مرحوم پر دائر کیا تھا۔ مالک رام لکھتے ہیں:

"مجھے جب اس مقدمے کی روداد معلوم ہوئی تو میں نے پیش کش کی کہ اگر اجازت ہو تو میں نواب سائل کے ذریعے سے صلح صفائی کی کوشش کروں۔ اس پر دونوں نے بھی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اسی شام نواب صاحب سے مل کر طے کیا کہ صابری صاحب سے ملنا چاہیے لیکن اگلی صبح میں نواب صاحب کے ہاں جانے سے پہلے سید صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے دریافت کیا کہ آپ کن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہوں گے کیونکہ میں نے خیال کیا کہ فریق ثانی سے بات چیت کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں ان کی طرف سے کس حد تک جانے کا مجاز ہوں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ بس یہی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح کے وقت ان کے پاس پہنچا۔ وہ چھتہ منگلو میں جناب سید مرتضیٰ علی صاحب کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے جب اطلاع کرائی ہے تو وہ ناشتہ کر کے باہر برآمدے میں تشریف لا چکے تھے۔ بہت لطف اور مہربانی سے پیش آئے۔ علیک سلیک کے بعد پہلے میرے متعلق دو چار باتیں ہوئیں لیکن چونکہ وقت تنگ تھا مجھے نواب سائل کو ساتھ لے کر صابری صاحب کے ہاں پہنچنا تھا، جو اندیشہ تھا کہ گھر سے نکل جائیں گے اور مقدمے کی اسی دن پیشی تھی۔ اس لیے میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میرے پوچھنے پر کہا کہ یہ مقدمہ غلط فہمی کی بنا پر دائر کیا گیا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا اس سے ہرگز میرا منشا یہ نہیں تھا کہ کسی طرح جناب امداد صابری صاحب کی ہتک یا دل آزاری ہو۔ وہ اگر مقدمہ واپس لے لیں تو میں مناسب الفاظ میں "معارف" میں معذرت شائع کر دوں گا تاکہ اُن کا ملال دور ہو جائے۔ خود مجھے بھی یقین تھا کہ "معارف" کے بنائے دعوے شذرات سے صابری صاحب کی مخالفت منظور نہیں تھی۔ بلکہ مرحوم اس سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ؎

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

بہرحال اس وقت انھوں نے جو کچھ مجھ سے کہا، اُس سے میرا اطمینان ہو گیا۔ میں یہاں سے نکل کر لال کنویں میں سائل صاحب کے مکان پر پہنچا اور ہم دونوں مدعی جناب صابری کے مکان پر پہنچے۔

بقیہ حالات سب کو معلوم ہی ہیں۔ فریقین نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نثر ایک واضح اور ابہام سے پاک اندازِ بیان کا نام ہے۔ شاعری میں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ سراپا علامت نگاری ہو یا براہِ راست اندازِ بیان۔ ہماری اعلیٰ شاعری میں دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ شاعری کی پرکھ کا معیار یہ نہیں ہے کہ شاعر نے اپنا مفہوم فوراً قاری تک پہنچا دیا ہے یا نہیں۔ شعر میں مفہوم کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ شاعری میں صوتی آہنگ کی اہمیت مفہوم سے کم نہیں

ولی اور پھر وجدان کو متاثر کرنے کی کیفیت ۔ اس کی الگ اہمیت ہے۔ اور ان سب کے ساتھ "سخن برہنہ نہ گفتن کمال گویائی است" خود اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن نثر کی علامیت یا سخن برہنہ نگفتن کی اہمیت ثانوی ہے۔ نثر کا کمال اس کا ابلاغ ہے۔ نثر میں داخلیت نہیں بلکہ خارجی مسائل اور تاثرات اپنا جادو جگاتے ہیں۔ (میں یہاں جدید افسانے کی بات درمیان میں لا کر اپنے موضوع سے دور نہیں جانا چاہتا ورنہ کہتا کہ ہمارے بعض جدید افسانہ نگاروں نے کہانی میں شاعری کی خصوصیات پیدا کرتے ہوئے ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کیا کہ کہانی سے کہانی پن خارج ہو گیا۔) ابہام، ایمائیت اور الجھاؤ جہاں شاعری کے حسن میں اضافے کا سبب بنتے ہیں وہاں یہ نثر کے لیے بدصورتی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ نثر وضاحت کے سہارے پنپتی ہے۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جب عظمت اللہ خان اور کلیم الدین احمد نے غزل کو ایک نیم وحشی صنفِ سخن کہا تھا تو کوئی نامناسب بات نہیں کہی تھی۔ ہم لوگوں نے یونہی اُن کی بات کا بُرا مانا تھا۔ ظاہر ہے کہ نیم وحشیانہ بات اُتنی واضح اور غیر مبہم تھوڑا ہی ہو سکتی ہے جتنی کہ صاف ستھری سجی ہوئی نثر۔ ممکن ہے یہ شخصیتیں یہی کہنا چاہتی ہوں اور انھیں مناسب پیرایۂ اظہار نہ مل سکا ہو۔ نثر بات چیت اور گفتگو کی زبان ہے۔ شعر بات چیت اور گفتگو کی زبان نہیں۔ شعر کا حسن رمزیت اور ایمائیت میں ہے۔ میلگجے پن اور اغلاق میں ہے۔ اُجلا اندھیرا اور دھندلی ضیا شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں لیکن نثر کا جوبن فراست، زیرکی، ذہانت اور صراحت کی بدولت نکھرتا ہے۔ یہی فراست، صراحت، وضاحت اور ژرف نگاہی مالک رام کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ نثر لکھنے والے کی افتادِ طبع کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں (writing is an act of faith) شاعر اور قاری کے ساتھ رشتہ دوستانہ بھی ہو سکتا ہے غیر دوستانہ بھی، مربیانہ بھی ہو سکتا ہے اور بے نیازانہ بھی، شریفانہ بھی اور غیر شریفانہ بھی لیکن نثر نگار کا رشتہ قاری کے ساتھ صرف دوستانہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ نثر نگار اس (commitment involvement) سے بیگانہ نہیں رہ سکتا جو اس کے اور قاری کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ ایک نامعقول شخص کیونکر معقول شعر کہہ سکتا ہے۔ میرے نزدیک ان کا یہ کہنا محلِ نظر ہے۔ ایسی مثالیں تو مل جائیں گی کہ نامعقول شخصوں نے معقول شاعری کی ہو لیکن ایسی مثال نہیں مل سکے گی کہ کسی نامعقول شخص نے معقول نثر لکھی ہو۔ نثر نگار کے اسلوب کا تعین شاعر کی طرح اس کا موڈ نہیں کرتا نہ ہی نثر نگار کا علم اس کے اسلوب کے حدود متعین کرتا ہے بلکہ نثر نگار کے اسلوب کا تعین اس کی افتادِ مزاج سے ہوتا ہے کیونکہ نثر نگار کی افتادِ مزاج شاعر کے تصورات کی طرح ہر لمحہ تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ تصورات ہر لمحہ اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ نظریات مقابلتہً مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ مالک رام کی نثر مجھے اُن کی اسی افتادِ مزاج کا پرتو نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک پُرانا واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ۱۹۶۲ء کی بات ہے لندن سے واپسی پر مجھے برسیلز (بلجیم) میں چند روز کے لیے مالک رام صاحب کے یہاں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن ہم شام کو سیر کرنے کے لیے نکلے۔ فارسی شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک مصرع پڑھا

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مالک رام صاحب نے ٹوکا اور کہا کہ صحیح مصرع یوں ہے

نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند

مجھے اس امر کا یقین تھا کہ میں نے مصرع جس صورت میں پڑھا ہے وہی صحیح ہے لیکن فارسی کے ایک جیّد عالم کے ساتھ بحث کرنا بھی میرے لیے نامناسب تھا چنانچہ میں نے کہا کہ اچھا موقع ملنے پر کسی کتاب میں دیکھ لیں گے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ میں چند روز بعد ہندوستان واپس آ گیا۔ مالک رام صاحب سے خط و کتابت تو تھی ہی۔ کوئی

(بقیہ صفحہ ۵۴ پر)

چندی گڑھ

مولانا حسرت موہانی

حال لکھنا ہے مجھے حسرت موہانی کا
اس شہنشاہِ غزل، شاعرِ لاثانی کا
عہدِ حسرت پہ مگر ایک اچٹتی سی نظر
تاکہ قاری کو ہو ماحول و زمانہ کی خبر
کوئی حد تھی نہ حکومت کی جفاکاری کی
ملک میں لہر سی اک لہر تھی بیداری کی
تھی نظربندیِ اربابِ ریاست کیا کیا
اور معتوب تھے اصحابِ صحافت کیا کیا
وہ زمانہ کہ منظم تھی "علی گڑھ تحریک"
نئی اقدار کا پرچم تھی "علی گڑھ تحریک"
روشنی بخش تھے مغرب کے فنون اور علوم
طبقۂ علم میں تھا تازہ خیالوں کا ہجوم
غالب و میر کا اندازِ بیاں کس میں تھا
عشقِ مومن کا بھلا شعلۂ جاں کس میں تھا
ابھی مقبول تھا رنگِ غزلِ داغ و امیر
ابھی قائم تھی روایاتِ غزل کی زنجیر
لاکھ کہنے کو محبت کا فسانہ تھی غزل
یہ حقیقت ہے کہ بدنامِ زمانہ تھی غزل
ابتذال اور رکاکت سے عبارت تھی یہ
ابھی فرسودہ تھی، تصویرِ قدامت تھی یہ
صرف لفظوں کے الٹ پھیر کا تھا نام غزل
پستیِ ذوق کے باعث تھی ابھی خام غزل

وہ تصنع، وہ بناوٹ کا چلن جاری تھا
جو پرانا تھا، وہی سکۂ فن جاری تھا
صاحبِ علم ہوئے صنفِ غزل سے بیزار
سب نے ٹھہرایا اسے کاسد و جنسِ بے کار
اک طرف حالی و آزاد کی تھی "نظمِ جدید"
دوسری سمت غزل کی وہی اندھی تقلید
غزلِ حالی و آزاد میں بھی رنگ نہ تھا
شعریت جس پہ ہو قربان، وہ آہنگ نہ تھا
ہائے! وہ دور کہ گردن زدنی جب تھی غزل
وجہِ صد دل شکنی، سوختنی جب تھی غزل
عہدِ حسرت میں کچھ ایسا ہی تھا منظر یارو!
اس میں حسرت کے چمکتے گئے جوہر یارو!
ان سے بڑھ کر نہ کوئی چاہنے والا دیکھا
اس کا اندازِ غزل سب سے نرالا دیکھا
عشق سادہ بھی تھا، پاکیزہ بھی، معصوم بھی تھا
ہمہ جذبات کی نیرنگیِ مفہوم بھی تھا
واقعیت بھی تھی، رنگین بیانی بھی تھی
آپ بیتی بھی تھی یہ، اور کہانی بھی تھی
ہر جگہ حسن کا رتبہ تھا بلند و بالا
دلِ عاشق میں نہ تھا عجز و نیازِ بے جا
حرمِ حسن کا اک اس کو نمازی کہیے
عشق کو اس کے بہرحال مجازی کہیے

اس کے شرو‌ع پہ نہ تھا سایہ جو ں کاری کا
وہ گنہگار نہ تھا ذہن کی بیماری کا
تھا قیامت کا تاثر بہ زبانِ سادہ
خوبصورت وہ تراکیب بیانِ سادہ
جا بجا تھے نظر افروز رجا کے انوار
کہیں جذباتِ قنوطی کا نہیں تھا اظہار
میٹھا میٹھا تھا نہ اب دائرۂ کارِ غزل
اس کی کوشش سے بڑھی وسعتِ اظہارِ غزل
اب مضامین کا تنوع تھا سخن کی رونق
تھے نئے پھول تغزل کے چمن کی رونق
چمک اٹھی غزل اب سے کے وقارِ تازہ
فکرِ نو میں لیے جدت کی بہارِ تازہ
ہوئی تہذیبِ محبت تو فقط حسرت سے
پھر غزل کو ملی عزت تو فقط حسرت سے
مردِ میدانِ صحافت اسے کہیے تو بجا
پیکرِ صدق و صداقت اسے کہیے تو بجا
ماہنامہ جو تھا "اردوئے معلیٰ" اس کا
تھا علی گڈھ میں ہر اک وارد و شیدا اس کا
بال ہی علم و سیاست کا نمائندہ تھا
اپنے افکارِ گہربار سے تابندہ تھا

مستقل بھی تھا اسی نوع کا اخبارِ جدید
جسے حاصل رہی اربابِ نظر کی تائید
اللہ اللہ وہ بے باک نگارش اس کی
دلِ دشمن میں اتر تی تھی کشا رہی اس کی
عمر بھر خل رہا اس کو سیاست میں بھی
خوش رہا قید میں، چکی کی مشقت میں بھی
تذکرے اس نے پرانے شعرا کے لکھے
منتخب شعر بھی ہر اک کے قلمبند کیے
شعر گوئی سے یوں انکو بچایا اس نے
جزوِ تاریخِ ادب انکو بنایا اس نے
فنِ شعری پہ کئی اس نے کتابیں لکھیں
بابِ تنقید میں کیا کیا تھے اصول و آئین
علم کے زور سے اصلاحِ زباں کی اس نے
جو بھی خامی نظر آئی، وہ بیاں کی اس نے
الغرض اسکے کمالات بیاں ہوں کیوں کر
پردۂ حرف و حکایت میں عیاں ہوں کیونکر

محسنِ علم و ادب حسرتِ موہانی تھا
بے نظیر اہلِ قلم، شاعرِ لا ثانی تھا

احمد ابراہیم علوی

یومِ جمہوریہ

قوموں کی زندگی میں بعض تاریخیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ان تاریخوں سے ان کے ماضی کا درد وابستہ ہوتا ہے، حال کے افکار منکشف ہوتے ہیں اور مستقبل کی نشاندہی ممکن ہوسکتی ہے۔ ۲۶ جنوری کی تاریخ ہندستان کے لئے کچھ ایسی ہی تاریخ ہے یہ وہ اہم تاریخ ہے جس میں ہندستان نے یہ اہم فیصلہ کیا تھا اور پھر اس کا نفاذ کیا تھا کہ وہ جمہوری طرزِ حکومت کو اختیار کرے گا جس سے دنیا کی تاریخ کو ایک ایسا موڑ حاصل ہوگا جس پر تمام مظلوم اقوام اور ترقی پذیر ممالک یکجا ہوکر اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مہذب طریقۂ کار اختیار کریں گے نیز حکومت کی باگ ڈور کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہ ہوکر عوام کے ہاتھوں میں ہوگی۔

۲۶ جنوری ہمارا یوم جمہوریہ ہے، اس دن سے ہم اپنے ذریعے اپنے ملک کے عوام کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے سینہ سپر ہوئے ہیں ہم نے عہد کیا ہے کہ طاقت کا سرچشمہ کسی ایک کو نہیں بننے دیں گے بلکہ ہمارے ملک کا طرز حکومت جمہوری ہوگا اور یہاں کے عوام اپنے حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہوئے اپنی پسند کی حکومت بنائیں گے جو ان کی حکومت ہوگی، ان کے مفاد کے لئے ہوگی اور ان کی مرضی کے مطابق ہی کام کرے گی۔

ایک ایسا ملک جو برسہا برس غیر ملکی اقتدار میں رہا ہو جس کا طول و عرض و حدود اربعہ غیر معمولی طور پر وسیع ہو انسانی آبادی بھی بہت زیادہ ہو، پھر تعلیمی پسماندگی سب سے بڑا مسئلہ ہو، وہاں جمہوری طرز حکومت اختیار کرنے کا فیصلہ بڑا تاریخ ساز فیصلہ ہے۔ جب ہندستانی رہبران قوم نے یہ فیصلہ کیا تو دنیا کی بیشتر اقوام نے مضحکہ اڑایا تھا اور کسی کو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ جمہوری طرز حکومت اختیار کرنے والا ملک ہندستان، دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ثابت ہوگا اور دنیا میں سب سے زیادہ یہیں جمہوریت پائدار اور کامیاب ثابت ہوگی سب کو اس دن کا انتظار تھا جب یہاں جمہوریت کی ناکامی کا اعلان ہوکر نیا طرز حکومت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن حقائق نے ثابت کر دیا کہ ہمارے رہبران قوم بڑے دور اندیش تھے انھوں نے جو فیصلہ کیا وہ بالکل صحیح ثابت ہوا اور اس سے ملک نے ایسی ترقی کی کہ اس کا شمار ترقی یافتہ اقوام میں ہونے لگا اور پھر دنیا نے تسلیم کرلیا کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوری حکومت ہندستان ہی میں ہے اس لئے اس کی تعظیم لازم ہے۔ اگر ہندستان نے جمہوری طرز حکومت نہ اختیار کیا ہوتا تو یقیناً ایسا نہ ہوا ہوتا شاید اقوام عالم میں ہندستان کی کوئی اہمیت بھی نہ ہوتی۔

۲۶ جنوری کی مبارک اور اہم تاریخ ہم کو بہت کچھ بتانے، یاد دلانے اور بہت کچھ کرنے کا حوصلہ دیتی ہے سب سے پہلے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ جمہوری نظام یوں ہی یا

بڑی آسانی سے نہیں حاصل ہوگیا بلکہ اس کے لئے ہمارے بزرگوں نے ہمارے رہبروں نے ایسی ایسی قربانیاں دی ہیں جن کے تصور ہی سے ہم کانپ اٹھتے ہیں۔ اس لئے ہم پر لازم ہوتا ہے کہ ہم ان کی عظیم قربانیوں کو یاد رکھیں ان کی عظمتوں کو تسلیم کریں اور سب سے بڑھ کر یہ عہد کریں کہ ان قربانیوں کو رائگاں نہ ہونے دیں گے بلکہ ملک کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوششیں کریں گے ہم اپنے ملک میں جمہوری اقدار کی پائداری کے لئے ہر ممکن کوششیں کریں گے تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ وہ ممالک جہاں مختلف مذاہب اور زبانیں ہوں، ملک کے مختلف گوشوں میں مختلف طرز رہائش رسم و رواج الگ الگ ہو، وہاں جمہوری حکومت سے زیادہ کامیاب کوئی اور حکومت ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

آج دنیا میں جتنے طرز کی حکومتیں ہیں جمہوری طرز حکومت ان میں سب سے مہذب اور سب سے مقبول ہے اس کا کوئی حاکم اور کوئی محکوم نہیں ہوتا یا تو سب حاکم ہوتے ہیں یا محکوم ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی جبر نہیں ہوتا سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، ایک دوسرے کا بھلا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان نے ہر جہت میں پیش رفت کی ہے، ہر میدان میں نمایاں اور قابل ذکر ترقی کی ہے۔ یہ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ یہاں جمہوری طرز حکومت اختیار کرکے یکجہتی، اتحاد اور اخلاص سے ملک کی تعمیر اور ترقی کی راہیں ہموار کی گئیں لیکن اگر یہاں جمہوری طرز حکومت نہ ہوتا تو پتہ نہیں یہ ملک کب کا ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ ہمیں اپنی اور اپنے ملک کی بھلائی کی خاطر ملک کی جمہوری اقدار کو استحکام بخشنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے اور ہر اس آواز کو دبا دینا چاہیئے جو جمہوری طرز حکومت کی مخالفت میں اٹھے۔

یہ ملک ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بودھ، جین سب کا ہے۔ سب کا اس پر یکساں حق اور سب کے یکساں فرائض ہیں۔ کسی کو کسی کی حق تلفی کی کوشش ہرگز نہ کرنا چاہئے کیونکہ ایسی ہر کوشش جمہوریت کے حق میں مضر ہوگی ہندوستانیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ سب کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کریں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ۲۶ جنوری کی تاریخ ہم کو یہ احساس بھی دلاتی ہے جمہوریت کے طفیل ہم کو جو حقوق حاصل ہوئے ہیں ان کا تحفظ اسی طرح ممکن ہے کہ ہمارے جو فرائض ہیں ہم انھیں بہ حسن و خوبی انجام دیں کیونکہ فرائض کی انجام دہی کے بغیر حقوق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ویسے تو ہر ملک کے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ٹیکس ایمانداری سے ادا کریں، اپنے ملک کے استحکام کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہیں لیکن جمہوری ملکوں میں شہریوں کے لئے یہ کہیں زیادہ ضروری ہوا کرتا ہے کہ وہ چاق و چوبند رہیں اور سرکاری واجبات کی ادائیگی ایمانداری سے کرتے رہا کریں۔

یوم جمہوریہ یقیناً مسرت و شادمانی کا دن ہے لیکن یہ عزم اور حوصلہ رکھنے کا بھی مطالبہ کرتا ہے اس دن ہمیں یہ عہد بھی کرنا چاہئے تو ہم ملک کی ترقی اور اس کے استحکام کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے، انتشار، افراتفری اور بدامنی پھیلانے والوں کو کامیاب نہ ہونے دیں گے اور قومی یکجہتی، اخوت، امن اور استحکام کی خاطر ہر قربانی اور ہر ایثار کے لئے بخوشی تیار رہیں گے۔

• • •

اختر لکھنوی
ریڈیو پاکستان: کراچی

یوں وفا کے نام کا پرچم کھلا رہنے دیا
ہم نے اپنے گھر کو بھی جلتا ہوا رہنے دیا

آنے والے قافلوں کی رہنمائی کیلئے
آبلہ پائی کا ہم نے سلسلہ رہنے دیا

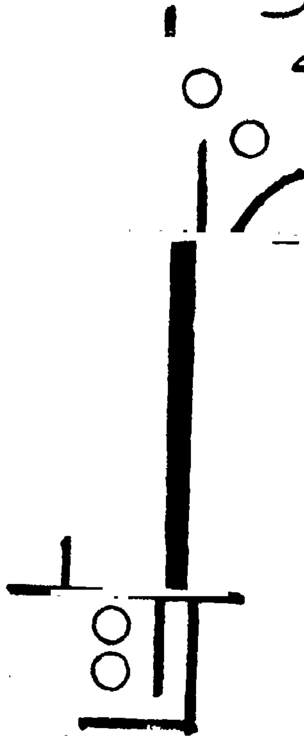
بار بار اس کو سنایا ہم نے حالِ دل مگر
جانے کیوں ہر بار، حرفِ مدعا رہنے دیا

یہ بتا بیٹے گی کیا تجھ پر، اگر تیری طرح
ناروا لہجے کو ہم نے بھی روا رہنے دیا

تم سے نسبت رکھنے والوں میں ہوائیں بھی بلیں
جو تمہارے نام کا تقاضہ دیا رہنے دیا

کچھ تو ترکہ چاہئے تھا وارثوں کے واسطے
ہاتھ خالی تھے، تو حقِ خوں بہا رہنے دیا

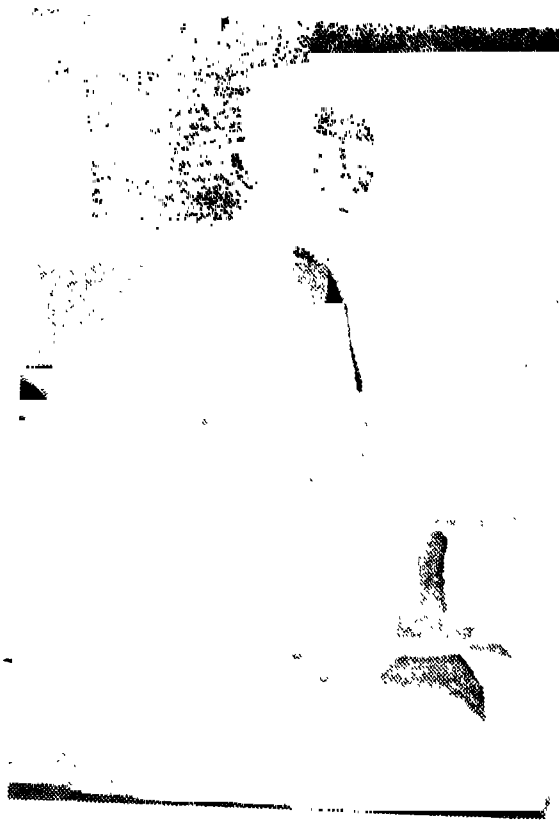
اپنا سر خود اپنے ہاتھوں ہم نے زخمی کر لیا
یوں بھرم اک ریت کی دیوار کا رہنے دیا



تمنا گورکھپوری
دار الادب ۲۴/۱۲ ۵ ڈی
کراچی ۳۶ پاکستان

بھاگ مسافر جلدی بھاگ
پیڑوں سے لپٹے ہیں ناگ
ناری جب سے بے بیراگ
جنگل میں لگتی ہے آگ
جھلمل ماتھے کی بندیا
جگمگ وہ سیندور سہاگ
کم سنکتے جاتے ہے
ادھر ادھر دو دو گجھاگ
دور گگن تک جا پہنچا
یگ بائل دھرتی کا راگ
بجکاری بھر بھر کے رنگ
کھیلے پھاگ لگائے آگ
کروٹ ایک بدلنے سے
آدھی رات میں گونجا راگ
میرے ساتھ بہت سویا
ساتھ مرے اب تو بھی جاگ
دل کا اک تارا لے آ
چھڑ رہا ہوں درد کا راگ
نس نس میں لہراتی ہے
برف سی ٹھنڈی ٹھنڈی آگ
تن من دھن سب کام کا ہے
کام پڑے تو یہ سب تیاگ
دیکھ کے پاٹ سمندر کا
بیٹھ گیا پانی میں جھاگ
آگے جیون کے تتلے
پیچھے پیچھے موت کا ناگ
رنگِ فراق میں سعیٔ تمنا
کچھ سو بھاگ ہے کچھ دُر بھاگ

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
سری نگر کشمیر



گنجینۂ نوادر کا ایک ورق

یعنی

اکبر الہ آبادی کی ایک نایاب تصویر اور غیر مطبوعہ خط بخطِ مُصنّف

"گنجینۂ نوادر" کے موضوع کے تحت بعض ایسے نادر و نایاب مخطوطات، مطبوعات، شعرا کے غیر مدون اور غیر مطبوعہ کلام اور نثر نگاروں کے اعلیٰ شاہکاروں کا ایک طائرانہ نظر میں جائزہ لیا جائے گا جو مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی اکبر الہ آبادی سے متعلق پیش کی جاتی ہے۔ مضمون میں بعض ایسے واقعات کا بیان کیا گیا ہے جن کا چرچا آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ہو رہا تھا اور اب دیدہ و دانستہ ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان میں سے بعض مسلمات ڈاکٹر اقبال سے متعلق ہیں۔ مثلاً یہ کہ اکبر نے جو خطوط خواجہ حسن نظامی اور مرزا سلطان احمد قادیانی کو لکھے تھے اور جو آج سے قبل کوئی ساٹھ سال سے زاید کا عرصہ ہوا کتابی صورت میں چھپ گئے تھے۔ یہ کتابیں اب کمیاب ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی، مرتبہ خواجہ حسن نظامی، مطبع شاہجہانی پریس دہلی۔ اگست ۱۹۲۲ء

(۲) مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد، مرتبہ مرزا سلطان احمد۔

دونوں مجموعۂ خطوط اقبال سے متعلق بہت اہم ہیں۔ اور ان کا حوالہ شاذ و نادر ہی کہیں مل رہا ہے۔ ہم نے مضمون میں صرف ان ہی باتوں کی نشاندہی کی جو اقبال کے بارے میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں مضمون میں اکبر سے متعلق زمانہ، کانپور، مخزن لاہور اور ادیب، الہ آباد وغیرہ کے مدیروں کے تاثرات بھی درج ہیں جو اب عنقا کے برابر ہیں۔

مضمون میں اکبر کا نادر و نایاب کلام، اکبر کی تصویر اور اکبر کا ایک غیر مطبوعہ خط بخط مصنف بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اکبر کی تصویر بہت پرانی ہے۔ غالباً ۱۸۹۴-۹۶ء کی ہے۔ اس زمانے میں وہ سشن جج تھے۔ تصویر اکبر کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آج سے ۸۰ سال پہلے مخزن، لاہور جلد ۱۱ نمبر ۶ بابت ستمبر ۱۹۰۶ء میں چھپی تھی۔ شیخ عبدالقادر مدیر مخزن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر اشاعت کے وقت بھی بہت پرانی تھی۔ لفظ "مدت" اس کی قدامت پر دال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۴ء سے بھی پہلے کی ہو گی۔ شیخ صاحب مخزن ہذا کے صفحہ ۳۹ میں لکھتے ہیں کہ:۔

" آج ہم وہ تصویر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کے لیے ہمارے ناظرین مدت سے منتظر تھے - خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کا کلام مخزن میں اکثر چھپتا ہے اور ان کا نام نامی اب کسی مزید تعریف کا محتاج نہیں "۔

تصویر اکبر کی جوانی کی معلوم ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عدالت میں ہی لی گئی ہو۔ اکبر گون اور انگریزی لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں - راقم نے اکبر کی کئی اور تصویریں دیکھیں - ایک تصویر ادیب، الہ آباد بابت دسمبر ۱۹۱۰ء اور دوسری زمانہ، کانپور میں چھپی تھی - یہ دونوں تصویریں بڑھاپے کی یادگار ہیں اور اکبر کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کی - بہرحال اکبر کی زیر بحث تصویر نادر اور بیش بہا ہے - اس پر شیخ عبدالقادر نے "خان بہادر سید اکبر حسین مدظلہ" اپنے قلم سے لکھا ہے -

مضمون میں اکبر کے ہاتھ کا ایک خط مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی[۳] کے نام شامل کیا جاتا ہے جو انھوں نے الہ آباد سے ۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو لکھا تھا۔ اس میں ڈاکٹر اقبال اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا بھی ذکر ہے - خط میں الہ آباد کے ڈاک خانے کی مہر میں ۲ مارچ ۲۰ء اور لکھنؤ کے پوسٹل سٹیمپ میں ۳ مارچ ۲۰ء کی تاریخ پڑی ہے - یہ خط راقم کو جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے کتب خانے میں دستیاب ہوا۔ جس کے لیے وہ ڈاکٹر نیر مسعود کا ممنون ہے - خط کا پتہ اور عبارت یہ ہے : -

لکھنؤ، نخاس جدید، اشرف آباد

جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز

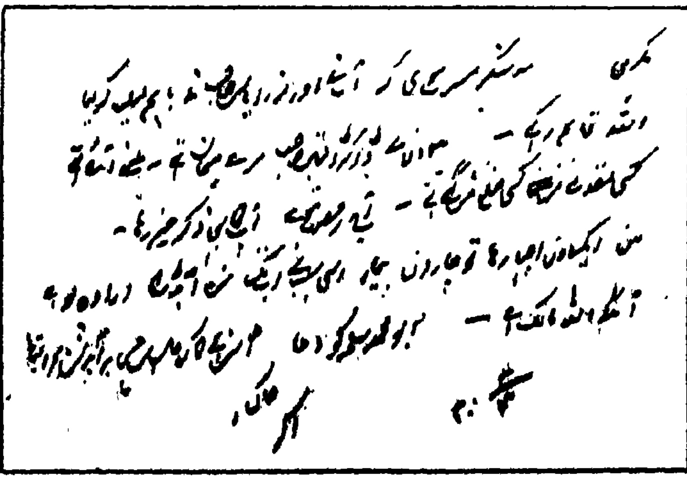
LUCKNOW

مکرمی - یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ نے اور مرزا یاس صاحب نے باہم میل کر لیا - اللہ قائم رکھے - ۳ دن ہوئے ڈاکٹر اقبال صاحب میرے مہمان تھے . ملنے آئے تھے - کسی مقدمے سے کسی ضلع میں گئے تھے - آج رخصت ہوئے - آپ کا بھی ذکر خیر رہا -

میں ایک دن اچھا رہا تو چار دن بیمار، اسی سبب سے اب تک نہیں اٹھ سکا - ارادہ تو ہے - آگے اللہ مالک ہے ابو محمد سلمہ کو دعا - اس بچے کا کیا حال ہے جس پر آپریشن ہوا تھا -

۲/۳ ۲۰ خاکسار

اکبر


مکرمی
یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ نے اور مرزا یاس صاحب نے باہم میل کر لیا
اللہ قائم رکھے - ۳ دن ہوئے ڈاکٹر اقبال صاحب میرے مہمان تھے - ملنے آئے تھے
کسی مقدمے سے کسی ضلع میں گئے تھے - آج رخصت ہوئے آپ کا بھی ذکر خیر رہا -
میں ایک دن اچھا رہا تو چار دن بیمار اسی سبب سے اب تک نہیں اٹھ سکا ارادہ تو ہے
آگے اللہ مالک ہے - ابو محمد سلمہ کو دعا اس بچے کا کیا حال ہے جس پر آپریشن ہوا تھا
خاکسار اکبر
۲/۳ ۲۰

اکبر الہ آبادی ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء (مطابق ۱۲۶۱ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی درس و تدریس کے بعد ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے - ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور آٹھ سال وکالت کرنے کے بعد ۱۸۸۰ء میں منصف ہوئے - ۱۸۸۸ء میں پہلے سب جج اور پھر ۱۸۹۴ء میں سشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے -

۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے - ۹ محرم ۱۳۴۰ھ (مطابق ستمبر ۱۹۲۱ء) کو انتقال کیا - صرف پچاس آدمی تجہیز و تکفین میں شامل تھے - اسد ملتانی نے تاریخ کہی

گفت با عقل اسد چون بشنید
خبر گفتم حیات اکبر
چیست تاریخ وفات اکبر
گفت "تاریخ وفات اکبر"
۱۹۲۱

اکبر سیشن ججی کی سبکدوشی کے بعد گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ پیارے لال شاکر لکھتے ہیں کہ :-

" خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کو جن کے دریائے کمال سے اردو کے ادبی رسالے سیراب ہوتے رہے ہیں اور جو ادیب کے خاص محسن و سرپرست ہیں، حال ہی میں اپنی اہلیہ محترمہ کے دفعتاً

۱۴ انتقال کا صبر آزما اور جانگداز صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے جس سے آپ کی طمانیت خاطر خواہ کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ مرحومہ نہایت قابل، منتظم اور تعلیم یافتہ تھیں جن کی موجودگی حضرت اکبر کو خانگی معاملات سے بے فکر بنائے ہوئے تھی اور جن کے انتقال سے ممدوح کی خانگی مصروفیت (جس میں ان کے نو عمر صاحبزادے کی غور و پرداخت بھی شامل ہے) اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب وہ شاعرانہ فرصت مشکل سے مل سکتی ہے۔ جس میں سے

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ہم اس نمبر میں ممدوح کے چند تو تصنیف اشعار شائع کرتے ہیں جن سے آپ کے حزن و ملال کا پتہ لگتا ہے اور جن میں وہ زندہ دلی نہیں پائی جاتی جو کلام اکبر کی خصوصیات میں داخل ہے۔ آپ کے اس عمیق رنج و الم میں ہم اپنی ناچیز ہمدردی پیش کرکے امید کرتے ہیں کہ دنیائے ادب ممدوح کے حزن و ملال میں کافی حصہ لے گی۔"

یہ اکبر کی دوسری بیوی تھیں جن کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ ان کے بعد اکبر کے ۱۴ سال کے بیٹے سید ہاشم کا انتقال ۵ رجون ۱۹۱۳ء کو ہوا۔ ادیب کے ایک اور شمارے میں درج ہے کہ :۔

" خان بہادر اکبر حسین صاحب پنشنر الٰہ آباد عرصے سے ضعفِ بصارت کے سبب تصنیف و تالیف کے شوق کو خاطر خواہ پورا نہ کر سکتے تھے۔ اسی حالت میں آپ کا تازہ فوٹو یکم دسمبر گذشتہ کو ادیب کے لیے لیا گیا تھا۔ انھیں ایام میں آپ بغرض علاج چشم کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ جہاں مغربی عمل جراحی میں کامیابی ہوئی اور یہ خبر بھی مسرت انگیز ہیں کہ آپ صحت یاب ہو کر واپس آگئے ہیں۔"

اکبر کا کلام دیگر رسائل کے علاوہ 'زمانہ'، کانپور میں بھی چھپتا تھا۔ جون، جولائی اور اگست ۱۹۰۳ء کے شماروں میں اکبر کے بعض اشعار میں غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اکبر نے ان کے بارے میں منشی دیا نرائن نگم کو متوجہ کیا۔ منشی صاحب 'زمانہ' بابت ستمبر ۱۹۰۳ء کے صفحہ ۲۰۲ میں معذرت کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

" افسوس کہ پچھلے دو پرچوں میں جناب خان بہادر میر اکبر حسین صاحب کے پاکیزہ اور قابل قدر کلام میں کتابت کی غلطیوں سے بعض اشعار کا لطف ہی کھو دیا۔ جون نمبر میں آپ کی مشہور رباعیوں کے بعد جو چند اشعار شائع ہوئے تھے اس میں ایک لفظ "وہی" رہ جانے سے مصرع میں سکتہ آگیا۔ جولائی و اگست میں سروائی آب پر جو قابل قدر نظم چھپی تھی اس میں اکثر جگہ ایسی غلطیاں رہ گئیں۔ صفحہ ۱۰۹ سطر اول میں "اوچھلتا ہوا" کی جگہ "چھلتا ہوا" چاہیئے۔ اس صفحہ کی سطر پانچ میں "جھپکتا" کی جگہ "جھلکتا" چاہیئے۔ سطر ۱۲ میں "پھنپھناتا" کی جگہ "جھنجھناتا" چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور غلطی یہ ہوئی کہ غلطی یا غلط فہمی سے تمہیدی نوٹ میں یہ نظم "ترجمہ" بتلائی گئی۔ حالانکہ دراصل یہ پاکیزہ طبعزاد ہے۔ "سودے" کی مشہور نظم کا محض "تتبع" کیا گیا ہے۔ نہ کہ ترجمہ۔ ہم ان سب کے لیے جناب اکبر و ناظرین کے معافی کے خواستگار ہیں۔"

'زمانہ' کے متعدد شماروں میں عرصے تک اکبر کا کلام شائع ہوتا رہا۔ جنوری ۱۹۰۴ء میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے ذیل کے اشعار ملتے ہیں ؎

فلک کے سامنے کیا مذہبی بہانہ چلے — چلیں گے ہم بھی اسی رخ جدھر زمانہ چلے
میں جانتا ہوں چھوڑیں گے آپ چال اپنی — کسی کا کام چلے، اے حضور یا نہ چلے
خدا کے واسطے ساقی یہی نگاہِ کرم — چلا ہے دَور تو پھر کیوں رُک کے پیمانہ چلے
کھِلا ہے باغ قناعت میں غنچۂ خاطر — خدا بچائے کہیں حرص کی ہوا نہ چلے
نصیب ہو نہ سکی دولتِ قدم بوسی — ادب کے چوم کے حضرت کا آستانہ چلے
فروغ عشق کا بے آہ کے نہیں ممکن — نہ پھیلے بوئے گلستاں اگر ہوا نہ چلے

خودی کے حس سے بھی ہوتا نہ آشنا اکبر
کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

کلیات اکبر دو جلدوں میں ان کی زندگی میں چھپا تھا۔ تیسری جلد ان کے صاحبزادے نے ان کے انتقال کے بعد شائع کی۔ بعض پرانے رسالوں میں ان کا کلام اب بھی ملتا ہے جو ان کے کلیات میں شامل نہیں ہوا ہے مولانا عبدالماجد صاحب اکبر کے کلیات سوم پر ۱۹۲۱ء میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"اس دور (۱۹۱۲ء سے لیکر آخر ۱۹۱۹ء تک) کے کلام کا
شائع شدہ مجموعہ ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔
ایک معتد بہ ذخیرۂ کلام اس کے بعد کا بھی ہے۔ یعنی ۱۹۲۰ء
سے لے کر عین وفات ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ
بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہو جائے۔ لیکن مرحوم کی
وفات کو ۲۳ سال گزر چکے ہیں مسودات کی حالت میں ہے۔
اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں[۱۵]"

اس کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بحمد اللہ چوتھا حصہ بھی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے
شائع ہوگیا۔"

یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بزم اکبر، کراچی کے اہتمام سے کلیات اکبر کے صرف تین ہی حصے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے۔ دوسرا اور تیسرا حصہ ایک ہی جلد میں ہے۔ دیباچے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ چوتھی جلد بھی شائع کی جائے گی لیکن ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گزری۔

اکبر نے ۱۹۰۳ء کا دہلی دربار دیکھا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کچھ قطعات "جلوۂ دربار دہلی" کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں نظم کیے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور نظم "جلوۂ دربار دہلی" کے عنوان سے جشن تاجپوشی منعقدہ ۱۹۱۱ء میں ۳۶ اشعار میں نظم کیے۔ یہ نظم رسالہ تمدن دہلی بابت ستمبر ۱۹۱۲ء ص۲۸ میں شاہ دلگیر اکبر آبادی کی ذیل کی تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی:۔

"جو آنکھ ۱۹۰۳ء میں چشم اکبر سے جلوۂ دربار دہلی دیکھ چکی تھی وہ اس تلاش میں تھی کہ ۱۹۱۱ء کا دربار دہلی بھی اسی آنکھ سے دیکھے مگر اس کی یہ حیرت کسی ادبی رسالہ سے پوری نہیں ہوئی۔ ناامید ہو کر اسے الہ آباد جانا اور وہاں لسان الملک کی نظر عنایت سے اس کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ اس خیال سے کہ بہت سی مشتاق آنکھیں اس جلوہ کے دیکھنے کی متمنی ہوں گی۔ ہم تمدن کے ذریعہ سے اسے پیش کرتے ہیں۔

اس جلوہ کے دو رخ ہیں اور دونوں اپنی نوعیت کے لحاظ سے لاجواب اور عدیم المثال ہیں۔ سچ یہ ہے کہ دربار دہلی کے متعلق جس قدر نظمیں ادبی رسائل میں آج تک شائع ہوئیں وہ جذبات اکبر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یقین نہ ہو تو ملاحظہ فرمائیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار
حکم حاکم سے ہوا تھا اجتماع انتشار

آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین
پھول اور سبزہ، چمک اور روشنی ریل اور تار

کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپیں
موٹر اور ایروپلین اور جگمگٹ اور اقتدار

مشرقی پتلون میں تھی خدمت گزاری کی امنگ
مغربی لوگوں سے شان خود پسندی آشکار

شوکت و اقبال کے مرکز حضور امپرار
زینت دولت کی دیوی امپرس عالی تبار

بحر ہستی لے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں
ٹیمز کے امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہمکنار

انقلاب دہر کے رنگین نقشے پیش تھے
تھی پئے اہل بصیرت باغ عبرت میں بہار

ذرے ویرانوں سے اٹھے تھے تماشا دیکھنے
چشم حیرت بن گئی تھی گردش لیل و نہار

مصلحت آمیز ہر طرز و طریق انتظام
حکمت آگیں ہر ادائے حاکمان نامدار

جامہ سے باہر نگاہ ناز فتاحان ہند
حد قانونی کے اندر آرزو بلوں کی قطار

خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا
فکر ذاتی میں خیال قوم غائب فی المزار

دعوتیں انعام اسپیچیں قواعد فوج کیمپ
عزتیں، خوشیاں، امیدیں، احتیاطیں اعتبار

پیش رو شاہی تھے پھر ہز ہائنس پھر اہل جاہ
بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار

[illegible] کلیات اکبر میں اس نظم کے صرف ۲۲ اشعار درج ہیں اور [illegible] اشعار غائب ہیں۔

شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن لاہور کلام اکبر کے دلدادہ تھے اور مخزن کے صفحات میں کلام اکبر کی تمہید میں لطیف پیرائے میں اپنا اظہار خیال فرماتے تھے۔ مخزن جلد ۱۱ نمبر ۲ بابت مئی ۱۹۰۶ء صفحہ ۵۰۔۱۰۵ میں "کلام اکبر" کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"خان بہادر سید اکبر حسین صاحب مدظلہ کی جو غزل آج ہم چھاپتے ہیں وہ ان کے خاص رنگ میں ہے۔ ہر استاد فن کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں ملتا —— شعرائے ہند میں بالعموم انداز کی خصوصیت طرز نظم تک محدود رہی ہے۔ مگر یہ بہت کم ہوا ہے کہ طرز خیال میں خصوصیت انداز پیدا ہو جائے۔ موجودہ زمانے میں خوش قسمتی سے چند ایسے اصحاب بھی ہیں جو ایک طرز خیال کو اپنا بنائے ہوئے ہیں۔ اور وہ جو کچھ لکھیں اسی خیال کی جھلک ان کی تحریر میں آجاتی ہے۔ مثلاً مولانا حالی کا کلام قوم کے احوال کے ماتم کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے اور یہ رنگ ان کے ہاں اس قدر موجود ہے کہ غزلیات دیوان بھی اس سے خالی نہیں۔ اسی طرح جناب اکبر کی شاعری اس جنگ و جدل کی تاریخ ہے جو مشرق اور مغرب کے اثرات کے درمیان ہمارے ملک میں جاری ہے۔ ممکن ہے اس جنگ کا انجام ہم اور ہمارے معاصر دیکھیں مگر کلام اکبر میں جا بجا یہ پیشگوئی موجود ہے کہ آخر مشرق میں مشرقی اثرات کا ہی غلبہ رہے گا کیونکہ اس کے خلاف ہونا مشرق کا مٹ جانا ہے اور یہ کسی ہمدرد ہند کا دل گوارا نہیں دیتا کہ جو قوم زمانے کے اتنے صدموں کے بعد معدوم نہیں ہوئی اب صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے گی۔ اکبر کا ایک مطلع اس خیال کو کس خوبی سے ادا کرتا ہے"

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

ذیل کی غزل نہایت شگفتہ زمین میں لکھی گئی ہے اور بہت قابل قدر ہے ؎

مطلع ؎ طفل نادان فریق غفلت ہوئے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

(۷ شعر)

مخزن لاہور جلد ۱۱ نمبر ۳ صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۴ بابت جون ۱۹۰۶ء ــ اس شمارے میں "فریاد زمانہ" کے عنوان کے تحت دو غزلیں درج ہیں۔ ایڈیٹر مخزن ان کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی غزل کی طرح جو تھوڑے دن ہوئے شائع ہو چکی ہے۔ جناب اکبر کے خاص رنگ میں ہیں۔ نظم کا ترنم قابل ملاحظہ ہے۔ نظم کیا ہے گویا ایک دردمند دل کی آہ ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر بے اختیار لب پر آگئی ہے۔ صاحب مصنف کا جو خط ان اشعار کے ساتھ ملا ہے اس کا یہ فقرہ نہایت دردناک ہے۔ —

قضا کے مبرم پر فریاد بے سود ہے لیکن آہ دلیل کی تابع نہیں"

مطلع ؎ بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں

(۹ شعر)

دوسری غزل کا مطلع ؎

ہوائے الحاد رنگ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے
جو بات بگڑی ہے وہ یکو نکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے"

انتخاب مخزن حصہ دوم صفحہ ۱۷۳ مطبوعہ ۱۹۰۷ء

مجنوں اور مجنوں کی ساس

"حضرت اکبر نے لیلیٰ بی جان اور مجنوں کا فرضی مکالمہ ایک قطعہ میں لکھا ہے اور لطیفہ کے پیرائے میں عاشق مزاج مسلمانوں پر چوٹ کی ہے۔ ہمارے کرم فرما جناب مولوی عبدالقدوس صاحب قدسی نے اس قطعہ پر کچھ اضافہ کر کے ہمیں بھیجا ہے۔ گویا حضرت اکبر کے کلام کی بے ساختہ داد ہے اور ہمیں امید ہے کہ مولانا قدسی کی داد خود حضرت اکبر دیں گے۔ اس عنوان میں قافیہ کی اطاعت

نمونہ رکھی ہے: (شیخ عبدالقادر)

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
ہمیں تو ان کی خوشحالی سے ہو یاس
سُناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو کرے ایم اے اگر پاس
تو فوراً دوں بیاہ لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

اس کے بعد قدسی کے ۱۹ شعر ہیں۔ ذیل میں چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

پریشاں ہو کے ماں لیلیٰ کی بولی
بھی کیا ایک ہی چلو میں بیاباس
نہ ہو تو صحبتِ ملا میں مدہوش
کیا واعظ نے تیرا ستیاناس
ارے لڑکے تو دیوانہ ہوا ہے
ذرا تہذیب کا تجھ کو نہیں پاس
ابھی لینی ہے ال ال ڈی کی ڈگری
ابھی پہننا ہے انگریزی المناس
ابھی باقی ہے لندن کی سیاحت
ابھی جانا ہے واں بالعین والراس
ٹکے کو ناہی ہوگا سارا دھندا
لگانا ہی پڑے گا تجھ کو کپاس
پڑھے لیلیٰ تو یونیورسٹی میں
رہے تو بحر و بر کا خضر و الیاس
ہمیں بھاتا نہیں داماد ایسا
ہمیں آتی نہیں یہ صحبتیں راس
خدا کے واسطے آ، راہ پر تو
بحول سروس ولایت جا کے کر پاس
تو ایسا ہو تو کردوں عقد پیوند
گہر ہو جائے پھر مقرونِ الماس

انتخاب مخزن حصہ دوم ص۱۸۱ مطبوعہ ۱۹۰۶ء

برق کلیسا

"خان بہادر سید اکبر حسین کا کلام یوں تو ہمیشہ دل میں چٹکیاں لینے والا ہوتا ہے۔ مگر یہ نظم "برق کلیسا" غضب کی چیز نکلی ہے۔ اس میں نہ صرف حسن و عشق کی تصویر کھینچی گئی ہے بلکہ مشرق و غرب کی تہذیب کی برائی بڑی خوبی سے دکھائی گئی ہے۔ "برق کلیسا" یہاں ایک غریب مسلمان کے خرمن ایمان پر گرتی اور اُسے جلا دیتی ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس جنگ و جدل میں ہمیشہ ایک ہی طرف رہے گی۔ خود اکبر فرما چکے ہیں:"

ع اور بھی دَورِ فلک ہیں ابھی آنے والے (ایڈیٹر)

اکبر کے جس غیر مطبوعہ کلام کا ذکر خواجہ حسن نظامی نے کیا اس کے بارے میں اب کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کس کے پاس موجود ہے۔ البتہ کلیات سوم کی اشاعت کے بعد اب بھی ان کا غیر مدوّن اردو اور فارسی کلام مختلف اخبار و رسائل میں موجود ہے۔ ان کے خطوط میں بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہیں۔ اس قسم کے اشعار کچھ خطوط اکبر کے سلسلے میں درج کیے گئے ہیں۔ مزید برآں ذیل میں چند غیر مدوّن اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

دیوان سے وحشت کے ہے ہر طبع کو اک انس
دل کھل گئے ہیں رنگ معانی کے چمن سے
حاصل ہوئی لذت بھی جو اشعار کو دیکھا

شارتخ بھی پیدا ہوئی "تحقیقِ سخن" سے

(۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

بھائیو! تم کبھی ہندی سے مخالف نہ ہو
بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا، مل گئی فی الفور نجات

ہم اردو کو عربی کیوں نہ کریں اردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لیے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں پر ایک اکھاڑہ قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

لکھنؤ میں شیعہ کالج کے قیام کے سلسلے میں ۱۹۱۶ء میں ایک ہمہ گیر مہم نواب سر فتح علی خان قزلباش (متوفی ۱۹۲۳ء) کے زیر اہتمام چلائی جا رہی تھی۔ اکبر الہ آبادی نواب موصوف کی بے لوث اور پرخلوص قومی خدمات سے اتنا متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے نواب صاحب کی شان میں ایک معرکہ آرا قطعہ کہا۔ دوسرا قطعہ بنائے شیعہ کالج کے حق میں ہے۔ یہ دونوں قطعات کلیاتِ اکبر میں ناپید ہیں اور پہلی مرتبہ "شیعہ کالج نیوز" لکھنؤ کی مورخہ ۷ اپریل اور ۱۲ اپریل ۱۹۱۶ء کی اشاعتوں میں بالترتیب شائع ہوئے تھے۔ ذیل میں ہم ایڈیٹر شیعہ کالج نیوز کے تاثرات کے ساتھ دونوں قطعے درج کرتے ہیں:۔

(۱) قطعہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی

"اس زمانے میں حضرت اکبر لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ کئی دن تک برابر ملاقات ہوئی۔ کالج کے متعلق بھی اکثر گفتگو رہی۔ دفعتاً مزاج ناساز ہو گیا اور الہ آباد واپس گئے۔ وہاں پہنچکر دو قطعے بھیجے۔ پہلا قطعہ حسب ذیل ہے جس میں نواب صاحب کی مساعی جمیلہ کی تحسین ایک واعظانہ رنگ میں ہے اور آپ اپنی نظیر ہے۔ دوسرے قطعے میں شیعہ کالج سے متعلق نہایت لطیف پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو آیندہ نمبر میں شائقین ملاحظہ فرمائیں گے" (ایڈیٹر)

صلح است بکو محترز از جنگ و جدل باش
گاہے بحق بزن و مرد عمل باش
خوب است دریں عہد تگاپو پئے تعلیم
کن پیرویِ فتح علی خانِ قزلباش

(۲) شیعہ کالج

مرے عزیز ہیں شیعہ، میں کس طرح یہ کہوں
کہ میں ہوں خوش جو ہوئی ان کی درس گاہ جدا
دلی دعا ہے مگر یہ کہ رکنِ قوم رہیں
گر بحیثیت وہ ہوں سب کے ساتھ خواہ جدا
بنائے کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا
وہی ہے منزلِ مقصود گو ہے راہ جدا
برائے دولت و آنر ہے ایک ہی مرکز
نہیں ہے اب بھی طریقِ حصولِ جاہ جدا
یہ دونوں سایۂ الطافِ مغربی میں ہیں
نہیں ہیں فضلِ الٰہی سے بادشاہ جدا
جو نسخہ تھا رز دلیوشن کا ہے ادھر بھی وہی
نہ کوئی حصن جدا ہے نہ ہے سپاہ جدا
یہ دونوں اب بھی بدستور ہیں بھائی ہیں
نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ جدا
ٹرین ایک ہے پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہوں
کہ اپنا بیگ سنبھالیں ملے پناہ جدا
وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج
نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جدا
شبِ وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت
جنھیں ہے ہجر وہ کر لیں گے اپنی آہ جدا
عجب نہیں جو بلندی و اتحاد بڑھے
دکھائے رنگ جو دنیا کا اشتباہ جدا
ہزاروں دور ہوں اپنے جو ہیں وہ اپنے ہیں
کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جدا

مگی ہیں ٹیچر و انجنیئر رسے ذاکر
وہ کر ہی لیں گے کسی طور سے نباہ جدا
ثواب نیک خیالی بھی پائے گا اکبر
سوسائٹی میں بزرگوں کی واہ واہ جدا[۱۰]

نئی روشنی کا ہوا تیل کم — حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے — نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے — سیاسی کمیٹی میں مل جائیے
اسی میل کا آج کل ہے ظہور — خدا جانے ظلمت ہے یہ یا کہ نور[۱۰]

ذیل کے دو شعر مرنے سے پہلے کہے تھے ؎

صاحب میں سب برائی لیکن وہ خوب جو کس
گاندھی میں سب بھلائی لیکن وہ محض بے بس
دنیا تو چاہتی ہے ہنگامۂ بر و جن
اور یاں ہے جیب خالی جو مل گیا وہ بھوجن[۱۱]

اقبال نے ۱۹۱۵ء میں اپنی لافانی مثنوی اسرار خودی کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ اس پر مولوی صاحبان نے ان کے خلاف ہنگامہ برپا کیا۔ خواجہ حسن نظامی محاذ آرائی میں پیش پیش تھے۔ ان حضرات نے یک زبان ہو کر یہ آواز اٹھائی کہ اقبال تصوف کے خلاف ہیں اور انھوں نے حافظ شیرازی کی توہین کی۔ خواجہ نظامی اسرار خودی کو لغو کہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی اسے "شگون نحس" قرار دیتے تھے۔ اکبر الہ آبادی بھی اقبال کی مخالفت پر میدان میں اتر آئے تھے۔ ذیل میں ہم خطوطِ اکبر سے اقبال کے متعلق ضروری اقتباسات درج کرتے ہیں۔

خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی

خواجہ صاحب کتاب کے صفحہ ۳ میں لکھتے ہیں:۔

"اس تیسرے حصے میں میرے مکرم دوست جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا تذکرہ کثرت سے ہے۔ اور ان کی مثنوی اسرار خودی اور رموز بے خودی پر مباحثے ہیں۔ اور ہر خط کا نہایت طویل اور معانی و حقائق کا ایک دفتر ہے۔ لیکن چونکہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے مثنوی اسرار خودی کی اس روش کو بدل دیا جس پر یہ خامہ فرسائی کی گئی تھی اور جس پر میرا اور جناب ڈاکٹر صاحب کا اختلاف پیدا ہوا تھا اور میں نے دیکھا کہ آخر زندگی میں حضرت اکبر بھی جناب ڈاکٹر اقبال صاحب کے مداح و مشتاق ہو گئے تھے اور امور اہم میں ان کو اپنا محرم راز و شریک بزم فرمانے لگے تھے۔ اس واسطے میں نے ان خطوط کو آیات منسوخ کی طرح صحیفۂ مکتوبات سے جدا کر دینا ضروری سمجھا بلکہ اگر ان کے اندر بعض لاجواب معانی و حقائق نہ ہوتے تو ان کو ضائع کر دیتا۔ مگر ضائع کرنے کو دل نہ چاہا اور وہ صرف عوام کی نظروں سے محفوظ کر دئے گئے۔"

اکبر مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت اقبال کے خطوط آئے۔ میں نے جواب بھی لکھے (صفحہ ۲۱)

یکم جنوری ۱۹۱۶ء۔ اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی مضمون لکھوں گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے۔ زوال اقبال سے مجھکو بہت ہی ملال ہوا ہے۔ اس باب میں پھر لکھوں گا۔ میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں مصروف کریں۔"

(صفحہ ۲۲)

۲۱ جنوری ۱۹۱۶ء "حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہوگا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدت وجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے ..... حضرت اقبال ہی خودی کو بڑھا کر "ہمہ منم" کہیں تو مطلب حاصل ہے ؎

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی ان میں ان میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے — آؤ گھر جائیں خدا ہی کے لئے
درزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی"

(صفحہ ۲۴)

۲ فروری ۱۹۱۶ء۔ "اقبال صاحب کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر غرب و شرق دونوں کے لئے بھیانک ہوگی۔"

اقبال کے بیان کی تائید ہوتی ہے ۔" (صفحہ ۶۲)

۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء ۔ " میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا ۔ میں نے ان کا خط دیکھ کر آپ کو مخاطب کر کے چند شعر کہے ۔

اے خواجہ مجھ کو نہ اقبال کو زد — تو ہی رکنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی
تم مجھ کو جو عشق کی تجلی میں اگر — ہیں دشمن فتنۂ رقیبان وہ بھی
پریوں کے لئے جنوں ہو تم کو اگر — دیووں کے لئے بنے سلیمان وہ بھی

کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم اسی سے امامت بارہ اماموں کی ثابت ہے اور میں تو لکھنؤ جاتا ہوں تو شیعہ مجتہدوں کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں ۔ البتہ ہاتھ باندھ کر پڑھتا ہوں ۔ کیونکہ عادت پڑی ہے اور اس میں کچھ حرج بھی نہیں .... (صفحہ ۵۷)

۲۴ اگست ۱۹۱۶ء ۔ " میں نے اقبال صاحب کو لکھا تھا کہ حسن نظامی سے محبت رکھنا چاہیئے ۔ انھوں نے لکھا کہ محبت تو رکھتا ہوں لیکن وہ برے طریقے سے اظہار مخالفت کرتے ہیں ۔ میں نے لکھا کہ آپ کو محبت اس لیے رکھنا چاہیے کہ خواجہ صاحب کتنا ہی اظہار بے خودی کریں لیکن عملی حالت میں آپ کے شریک غالب ہیں ۔ اسی کا اثر ہے کہ پونے دو برس ہو گئے ملنا میسّر نہیں ہوا اس خط کا جواب نہیں آیا ۔ حال ہی میں لکھا ہے ۔ آپ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال صاحب کے مقاصد کی میں قدر کرتا ہوں ۔ لیکن جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ دل شکن اور ضرر رساں ہے ۔ سوشل تعلقات کی شیرینی رخصت ہوتی ہے "

(صفحہ ۴۰)

اقبال صاحب کا خط آیا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ " میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں ۔ صرف چند مسائل سے اختلاف ہے

جو کچھ ہو شگفتگی دل بری چیز ہے ۔ یا گداز دل کہیے ۔ یہ نہیں تو وہ رنگ نہیں ۔ میں نے لکھ دیا کہ خواہش یہی ہے کہ آپ محبوب قلوب رہیں ۔ میں تو عبرت و آلام کے ہاتھوں مردہ ہو گیا ...." (صفحہ ۸۵)

۱۷ نومبر ۱۹۱۵ء ۔ " حضرت اقبال کے خیالات میں تبدیلی ہوئی ۔ کم سے کم اس کا اظہار ہوا ۔ اب ان کو اچھی اور موزوں اور مربوط سوسائٹی مل جائے گی "

۳۰ جون ۱۹۱۶ء ۔ " ڈاکٹر اقبال نے بھی سری کرشن مہاراج کا ذکر خیر اسرار خودی میں کیا ہے ۔ جناب امیر کی بہت مدح کی ہے ۔ سر علی امام کے نام معنون فرمایا وہ زیادہ پولیٹکل ہے ۔ آپ کے رنگ میں سادگی ہے آمد ہے ۔ اسرار خودی کی توضیح میں میں نے واحدی صاحب کو ایک مطلع لکھ بھیجا ہے ۔ دو چار لفظ ہیں ۔ لیکن توضیح تو ہو گئی ۔

جواب	سوال
حسن بیحد ہے کہ خود محدود ہے	عشق میں کیوں بیخودی مقصود ہے
بے خودی کا بھی یہی دستور ہے"	منکشف ہو جائیں اسرار خودی

(صفحہ ۸۸)

۹ مارچ ۱۹۱۸ء ۔ تین سال پہلے اقبال میرے مہمان ہوئے تھے ۔ کل ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے ۔ ۱۶ یا ۱۷ مارچ کو الہ آباد آؤں گا " (صفحہ ۱۰۱)

ایک اور خط میں خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں :-

" اقبال گورنمنٹ نے شکایت حافظ کو واپس لیا ۔ (ڈاکٹر اقبال کی اسرار خودی کی طرف اشارہ ہے " (صفحہ ۱۱۴)

مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد

مرزا سلطان احمد کتاب کے صفحہ ۴ میں لکھتے ہیں کہ :-

" سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ حضرت اکبر کے جو خطوط ان کے نام ہیں ان کا ایک انتخاب مع مقدمہ کے شائع کیا جائے ۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں گے کہ وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے جیسا کہ مکاتیب اکبر خطوط اکبر دو مختلف مجموعے اس سے پہلے دہلی و لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں .... حضرت اقبال مجاز ہیں کہ وہ اس ادبی مرحلے

کو جلد طے کریں اور اپنے نام کے اکبر خطوط چھاپ کر ملک و قوم کو مستفیض فرمادیں ۔"

۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء کو اکبر الہ آبادی مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں کہ:۔
ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی ۔صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے الہ آباد تشریف لائے تھے ...... ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیات الٰہی میں سے ہیں ۔ آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم، فلاسفر، نیک دل بزرگ کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے ۔" (صفحہ ۴۹)

۳۰ جنوری ۱۹۱۳ء ۔ "ڈاکٹر اقبال صاحب سے آپ کا ایڈرس دریافت کیا گیا تھا ۔ ہنوز جواب نہیں آیا ۔ لیکن پرچہ "اقبال" لدھیانہ میں آپ کا مضمون تحت عنوان "اقبال" نظر آیا ۔دل چاہا کہ اس کی مدح سرائی کروں لیکن وہ خیال اس پیرائے میں ظاہر ہوا ۔

خوب ہے موعظت حضرت سلطان احمد
دل انساں کی چمک خوب کہ سونا بہتر
غفلت و کبر سے غم خانۂ اکبر اچھا
خندۂ جام سے اقبال کا رونا بہتر
ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن
اپنے مداح کا مداح نہ ہونا بہتر

چونکہ آپ نے اکبر و اقبال کا ذکر خیر اپنے مضمون میں کیا تھا اس بنا پر یہ اشعار موزوں ہو گئے ۔ میں نے دفتر "اقبال" لدھیانہ کو بھیج دیے ۔

آج آپ کا الطاف نامہ پہنچا ۔ جناب والا! اگر مجھ میں یا حضرت اقبال میں کچھ ہے تو آپ ہی کے دل کی زبان ہے ۔ امام غزالی کے زمانے میں ایک مغربی سیاح جب وطن کو واپس گیا تو کسی نے پوچھا کہ اسلام کی نسبت تم نے کیا رائے قائم کی ۔ اس نے کہا کہ مجھ کو موقعہ زیادہ تحقیق کا نہیں ملا ۔ لیکن امام غزالی سے ملا تھا ۔ ایسا شخص چونکہ پیرو اسلام ہے لہٰذا میں اسلام کی نسبت اچھا خیال رکھتا ہوں ۔ (صفحہ ۵۵)

۲۵ جنوری ۱۹۱۶ء ۔ "خواجہ حسن نظامی صاحب کو میں نے بار بار یہی لکھا کہ حضرت اقبال کی مثنوی کی مخالفت پر قلم نہ اٹھائیں بعوض اس کے کہ ہم رندان بے سامان کے ساقی بنے رہے ۔ ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں ۔ ہم کو ان سے محبت ہے "آنچہ بخود نپسندی بدیگراں مپسند" پر عمل کرتا ہوں ۔ میں نے شاید اقبال صاحب کو اپنا یہ شعر لکھا تھا ۔

واعظا ایں نہ جنون است نہ کافر شدہ ام
اولت ناشدہ ختمت دمن آخر شدہ ام

ڈاکٹر اقبال صاحب صوفی صاحب حافظ شیراز صاحب سب کی حمایت ۔

نہ بسط دیکھتے ہیں نہ قبض دیکھتے ہیں
وہ ڈاکٹر ہیں زمانے کی نبض دیکھتے ہیں

وفا کا رنگ بدل جائے ہو یہ ان سے بعید
فقط موافق موسم لکھی ہے اک تمہید

عمل کا رخ نہیں قوت فرامُش یہ ہے
کیا ہے نسخہ جو تحریر بس غرض یہ ہے

جہاں میں قوتِ بازو دکھائیے اس وقت
مراقبے سے ذرا سر اٹھائیے اس وقت

اٹھاؤ ان پہ نہ ہرگز تم اعتراض کا ہاتھ
یہی کہو کہ بہت خوب ہم ہیں آپ کے ساتھ

دکھائیے تو خدارا خودی کے جوبن کو
مراقبہ بھی اٹھا دے گا اپنی گردن کو

شرابِ حضرت حافظ سے کچھ نہیں نقصاں
زمارچ تا بہ مئی اس کا ہے فقط ساماں

بس ایک ربع ہے کافی برائے مستی و حال
بقیہ سال ہے نذرِ طریقِ سعی و جدال

وہ خود ہی کہہ گئے ہیں یہ بہ پاس فکر معاش
سہ ماہ می خور و نہ ماہ پارسا می باش

بہت سی نظموں کا مسودہ میرے پاس ہے کہ آج تک کوئی مطلع نہیں۔ کابلی سے صاف نہ کر سکا۔ ازاں جملہ مندرجہ بالا اشعار میں بے تکلفانہ پیش کرتا ہوں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آپ محظوظ نہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو تسلیم" (صفحہ ۶۹)

نومبر ۱۹۱۴ء۔ "حضرت اقبال کے خیالات متعلق امامت وخلافت سے بھی اطلاع ہوئی ہوگی۔ زمانہ نے بے چین کر دیا ہے۔ بلند طبیعتیں اصلاح کی فکر میں ہیں" (صفحہ ۷۸)

دسمبر ۱۹۱۶ء۔ "ڈاکٹر اقبال صاحب بلا شبہ نہایت عالی خیال بزرگ ہیں۔ اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی ہے۔ خدا مدد کرے" (صفحہ ۸۰)

ارِ اپریل ۱۹۱۸ء۔ "اقبال صاحب نے رموز بے خودی عنایت فرمائی ہے۔ لیکن میں نے ہنوز نہیں دیکھی۔ نہ اس کی امید ہے نہ دل چاہتا ہے...... اسرار خودی کی تمہید دیکھ چکا۔ میرے کلیات حصہ اول میں ص۹۵ میں ایک شعر آپ ملاحظہ فرمائیں گے ؎

خودی و بے خودی دونوں ہیں عکسِ صورتِ جاناں
اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

یہ شعر ابتدائی زمانے کا ہے۔ لیکن اسرار خودی اور رموز بے خودی دونوں پر حاوی ہے۔ مولانا روم اور مسٹر تلک کا مرکب بہت قوی ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہو میں نے تو اسے پڑھا ہی نہیں۔ آپ نے ماحصل نکالا ہو تو لکھ بھیجئے" (صفحہ ۹۲)

اس نوعیت کے چند خطوط اکبر الہ آبادی مرتبہ طالب الہ آبادی میں بھی ہیں۔ چند خطوط یہ ہیں :۔

۲۰ مئی ۱۹۱۸ء کو اکبر سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :۔

"آپ نے ملا و صوفی کی نظم کو خوب زندگی بخشی۔ اقبال صاحب اس سے خوش نہ ہوئے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کس حق سے وہ ملا بنتے ہیں۔ میں تو صوفی بنتا نہیں — اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں جس کے معنی ہوئے شخصی۔ یہ لفظ مغربی معنوں نے استعمال کیا ہے۔ بمقابلہ فلاسفہ کے خدا کے جس کا وجود عالم ہی کے ساتھ اور اسی میں طاری وساری ہے۔ الگ نہیں۔ اقبال صاحب کا مطلب ہے کہ ہندو فلاسفی الگ خدا کو نہیں مانتی اور صوفی ہمہ اوست کہتے ہیں۔ لیکن میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں۔ اقبال صاحب نیک نیتی سے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ پروفیسر بھی تو ہیں" (صفحہ ۳۲۲)

۱۳ر اپریل ۱۹۲۱ء کو شیخ عبدالقادر کو لکھتے ہیں کہ

"مجھکو معلوم ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی ثنوی انگلستان میں پیدا ہوئی۔ مجھکو اپنا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق کو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں ؎

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی گیاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی آہ کا

(صفحہ ۳۲۶)

۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں :۔

"ثنوی اسرار خودی" مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت بڑا اثر ہوا صحیح نہیں۔ خودی کو بڑھانا چاہیئے۔ ثنوی کی نسبت کچھ زیادہ کہنا نہ چاہیئے۔ کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے شعر نہایت اچھے ہیں ؎

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

یہ خودی ہستی و تصوف ہے۔ دیباچے میں پولیٹکل دانشمندی بھی ہے" (صفحہ ۳۳۸)

اردو کے مشہور صحافی اور ادیب منشی دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" کانپور اکبر اور اقبال کے تازہ ترین کلام کو شائع کرتے تھے۔ اور وہ دونوں حضرات کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ ان کے کلام کی داد بھی دل کی گہرائیوں سے دیتے تھے۔ اس وقت ہمارے

ہے نظر زمانہ بابت اکتوبر ۱۹۱۸ء اور نومبر ۱۹۱۸ء کے دو
باب شمارے ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں منشی صاحب نے اکبر
کی شاعری پر ریویو اور نومبر کے پرچے میں ڈاکٹر اقبال کے کلام پر
تنقید و تبصرہ فرمایا۔ موصوف دونوں بزرگوں کے خیالات اور طرزِ فکر
موازنہ یوں کرتے ہیں:

"اکبر اور اقبال کی شاعری کی دنیا ایک دوسرے سے بالکل جدا اور نرالی ہے۔ اکبر قومی معاشرت کا مصلح اور اقبال روحانی شانتی کا منار ہے۔ اکبر مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں تنبیہ کرتا ہے تاکہ ہمارے طرزِ معاشرت اور تہذیب کا اصلی اور وطنی جوہر مفقود نہ ہونے پائے۔

وہ محبِ وطن ہے اور جب دیکھتا ہے کہ قومی معاشرت اصلیت اور مشرقیت سے خالی ہو رہی ہے تو کراہنے لگتا ہے۔ اکبر کی تمام عمر اس کوشش میں گزری کہ ہمارے جسدِ قومی پر مغربیت کا ملمع نہ چڑھنے پائے۔ اقبال کا نقطۂ خیال اس سے بھی بلند ہے۔ اس کی دنیائے شاعری بالکل نرالی ہے۔ وہ مجاز کی پرواہ ہی نہیں رکھتا۔ صرف حقیقت کی طرف دیکھتا ہے۔ مجاز اور حقیقت کے امتیاز سے اس کی آنکھیں ہر وقت پرنم رہتی ہیں۔

ع اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہے وہ

اقبال کے لیے دنیا کی ظاہری ترقی ایک فنا ہونے والی شے ہے اور وہ کسی اور چیز کا متوالا ہے۔ اسی کی تلاش و جستجو میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور جب اُسے نہیں پاتا تو رو دیتا ہے۔ اور اس کی آہ و زاری اشعار بن جاتی ہے۔ اقبال اس بلبل کی مثال ہے جس کو اپنے پر ہی قفس معلوم ہوتے ہیں۔ اکبر طرزِ معاشرت میں قوم کو قیدِ فرنگ سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اقبال قیدِ حیات سے مکدّر رہتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک منزل خیال کرتا ہے، آخرت کو زندگیٔ جاوید کی ابتدا سمجھتا ہے۔ موت سے بھی اسے لڑنے میں عار نہیں۔ اور اپنے خدا سے بھی حجت اور تکرار کرنے میں تامل نہیں۔ وہ روحانی نجات کو بخششِ ربانی کی طرح نہیں مانگتا۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو اہل اور اس کا حقدار بنانا چاہتا ہے۔ وہ کبھی کبھی خدا کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا ہے۔ لیکن ہمیشہ بے نیازی اور خودداری کا پہلو لیے ہوئے اسکی مثال اس فقیر کی سی ہے جو ایثارِ نفس، خلوصِ نیت، اور صدقِ عقیدت کی رضاعت رکھتا ہے اور اسی لیے وہ اپنی روحِ پُرفتوح کی عظمت سے واقف ہے۔"

●●● ———

حواشی

• خواجہ حسن نظامی۔ اردو کے مشہور صحافی، صاحبِ طرز انشا پرداز اور عالمِ دین۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ اکبر اور اقبال کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ اکبر ان کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

حسن نظامی کو میں نے دیکھا شریف خصلت فقیر طینت
محل ہے لیفے ہی عنصروں میں اگرچہ دہلی کی ہے ذہانت

عنانِ اندیشہ ہائے مضطر ادھر ادھر کو کبھی مڑی بھی
وہ دستِ دل ہے کہ جس سے چھوٹی کبھی نہ حبل المتینِ وحدت

ضمیر میں ان کے ہے تصوف معاشرت میں ہیں بے تکلف
فروع جو کچھ بھی پیش آئیں اصول میں ان کے ہے قناعت

اُدھر اقبال نے اسرارِ خودی شائع کی اور ادھر خواجہ صاحب نے ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کا علم نصب کیا۔ اس زمانے کے مشہور اخبار وکیل امرتسر، خطیب دہلی اور زمیندار لاہور میں موافقانہ اور مخالفانہ مضامین کا سلسلہ جاری ہوا۔ بعد میں اکبر کی ثالثی سے مخالفت کے سیلاب پر قابو پایا گیا۔ خواجہ صاحب کی متعدد تصانیف ہیں۔

• مرزا سلطان احمد یہ مرزا غلام احمد قادیانی کے لائق ترین بیٹے تھے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بڑے عالم، فلاسفر، صاحبِ طرز انشا پرداز اور اہلِ قلم تھے۔ مخزن، نیرنگِ خیال، لاہور، زمانہ کانپور، ادیب الہ آباد، العصر لکھنؤ اور خدنگِ نظر لکھنؤ وغیرہ میں ان کے متعدد مضامین راقم کی (بقیہ صفحہ ۲ پر)

غزلیں

وفا ملک پوری

اس دور میں ذہنِ بشر صید گماں ہے
آسیب زدہ آج بھی اک کہنہ مکاں ہے

چیخیں ہیں کراہیں ہیں کہیں آہ و فغاں ہے
ہر دل کیلئے درد کی سوغات یہاں ہے

افلاس عمل چہرے سے واعظ کے عیاں ہے
دل سوز سے خالی ہے زباں شعلہ فشاں ہے

جو سینے تھے گلہائے محبت سے فروزاں
ان سینوں میں اب صرف عداوت کا دھواں ہے

یوسف سا برادر ہی کہیں اب نہیں ورنہ
ہر شہر میں کچھ بردہ فروشوں کی دکاں ہے

غالب کے طرفدار تو مل جائیں گے لیکن
اے ہم سخنو کوئی سخن فہم کہاں ہے

اے وائے کہ ہے عشق بھی آلودۂ ہوس بھی
اے وائے کہ اب حسن بھی جلووں کی دکاں ہے

ہر شخص یہاں اپنے مسائل میں گھرا ہے
ہر دل میں تو فاسد کا طوفاں نہاں ہے

اعزاز افضل
نورچیت پور روڈ، کلکتہ

پھر عذابِ تیرگی نازل نہ ہونے دیجئے
روشنی کو ذہن میں داخل نہ ہونے دیجئے

اپنے غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ
خلوتوں کو زینتِ محفل نہ ہونے دیجئے

عیشِ طوفاں بھی ضروری ہے سفینوں کیلئے
شوق کو آسودۂ ساحل نہ ہونے دیجئے

پی کے خود کہہ دیجئے ساغر میں تھا آبِ حیات
انکشافِ سازشِ قاتل نہ ہونے دیجئے

یوں بھی اپنی جستجو کا دائرہ محدود ہے
راہ کو پابستۂ منزل نہ ہونے دیجئے

کیوں اڑائیں اپنے دیرینہ تعلق کا مذاق
ان کا دعوائے وفا باطل نہ ہونے دیجئے

جاگ اٹھے جذبات تو سینہ بھی شق ہو جائیگا
ہے یہی بہتر کہ دل کو دل نہ ہونے دیجئے

کہہ سکیں دشمن کہ افضل نے لیا ہے انتقام
یہ سعادت بھی انھیں حاصل نہ ہونے دیجئے

ڈاکٹر سید عبدالباری
صدر شعبہ اردو جی ایس پی جی کالج
اودھ یونیورسٹی، سلطانپور

اردو ڈراما: آغاز سے عصرِ نو تک

اردو ڈرامہ کے ارتقا کی کہانی امانت لکھنوی سے شروع ہوتی ہے جو عہد واجد علی شاہ کے ایک مقبول روزگار شاعر تھے لیکن یہ صنف ادب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً اسی زمانہ میں برگ و بار لائی جب کہ علیگڑھ تحریک کے زیر اثر اردو میں متعدد نئی اصناف فروغ پذیر تھیں اور فکر و فن کے نئے افق اردو کے اہلِ قلم کے سامنے روشن ہو رہے تھے۔ مغرب کے سائنٹیفک طرز فکر اور یورپین لٹریچر میں کروٹیں لیتی ہوئی حقیقت و واقعیت کی لہروں اور عقلیت پر دوش فنی شاہکاروں سے اردو کے اہلِ قلم کے فکر و فن کے زاویے تبدیل ہو رہے تھے۔ لیکن یہ حیرت انگیز امر ہے کہ ڈرامے زمانہ کی ان کروٹوں سے متاثر نہ ہوا اور جدید مسائل سے اس کی بے خبری برقرار رہی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈرامہ کی تعمیر میں خرابی کی کوئی صورت ضرور مضمر تھی پہلی غلطی تو خود امانت ہی سے ہوئی تھی جنھوں نے اندر سبھا ۱۲۶۸ھ میں لکھ کر ڈرامہ کا پہلی بار اس انداز سے تعارف کرایا تھا گویا یہ خوش پوش و خوش خوراک لوگوں کے دل بہلانے کا ایک وسیلہ ہے جنمیں غم زندگی اور غم جہاں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اندر سبھا سے پہلے ناٹک، رہس اور راس منڈل کی مختلف تفریحوں سے شمالی ہند کے لوگ روشناس تھے۔ اور خود واجد علی شاہ اور انکے پیشرو سلاطین اودھ نے بقول پروفیسر مسعود حسین رضوی اپنے شاہی اسٹیج کے لیے مختلف منظوم رہس اور ناٹک وغیرہ مرتب کرائے تھے لیکن امانت کی اندر سبھا جنگل کی آگ کی طرح اودھ کے قریہ قریہ تک پہنچ گئی۔ اگرچہ طبقہ اشراف نے اسے لائق اعتنا تصور نہ کیا اور اسے مرزا شوق کی "زہر عشق" کے قبیل کی مخرب الاخلاق شے تصور کرتے رہے غالباً یہی اخلاقی نقطۂ نظر اور تہذیبی گرفت اردو ڈرامہ کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنی رہی۔ اردو بولنے والوں کا تہذیبی معیار سوانگ بھرنے، نقل کرنے یا کسی دوسرے شخص کا بھیس بنا کر اسٹیج پر آنے کی اجازت دینے پر تیار نہ تھا۔ اس وقت ہندستان میں کوئی اس سطح پر آکر غور کرنے کے لیے تیار نہ تھا جس پر یونانی، فرانسیسی اور انگریزی ادب میں ہم ڈرامہ کو پاتے ہیں۔ اردو میں لوگ اسے رقص و موسیقی سے بھرپور اور رنگینی و سرمستی سے لبریز ایک غیر سنجیدہ اور سطحی تفریح تصور کرتے تھے ڈرامہ پر اسطرح کوئی نہیں غور کرتا تھا کہ یہ انسانی فطرت کی حقیقی اور دلکش مرقع کشی کا نام ہے جسمیں تمام جذبات و کیفیات انسانی کی ترجمانی کی جاتی ہے اور کرداروں کے مقدرات کے انقلاب کو کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے جس سے ہمارے لیے مسرت و بصیرت کا سامان بہم ہو سکے۔ یونان کے ڈرامہ نگاروں نے اسے تزکیہ روح کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ فرانسیسی ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈرامے کے پلاٹ کو اپنی قومی تاریخ کے مختلف تہذیبی ادوار کی روداد بنا کر پیش کیا تھا، انگریزی میں ڈرامہ انسانی روح کی رفعت و پاکیزگی کا ایک وسیلہ تھا۔ غرض یورپ کے ادب اور سنسکرت ادب کے ڈرامے ایسے آئینہ خانے کی مانند تھے جس میں انسانی جذبات کے تمام پہلوؤں کی تصویریں جھلکتی تھیں لیکن یہ اردو کی بدقسمتی تھی کہ انیسویں صدی میں اردو ڈرامہ امانت کی

کوشش سے نکل ممبئی کی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے نہایت غیر سنجیدہ ماحول میں جا پہنچا جہاں تجارتی اغراض سے اسکی پرورش و پرداخت کی گئی۔ ان کمپنیوں میں بے شمار لوگ اسی سے انکھیلیاں کرتے رہے اور نہایت سطحی اور ہر قسم کی چیزیں عوام کے مذاق کی تسکین کے لیے پیش کرتے رہے۔ ہاں خال خال ان کمپنیوں میں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے بچتے بچاتے ڈرامے کی نوک پلک درست کرنے کی فکر بھی کی۔ ان میں رونق بنارسی کا نام لیا جاسکتا ہے جنھوں نے درجنوں ڈرامے لکھے اور خاصی شہرت حاصل کی لیکن ان کا مقصد بھی عوام کے سماجی یا اخلاقی شعور کو بالیدہ بنانا نہیں تھا بس یہی غنیمت ہے کہ انھوں نے اس تفریح کو بے حیائی فحاشی اور سوقیت سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس زمانہ میں اردو میں اس کثرت سے ڈرامے لکھے گئے کہ تعداد کے اعتبار سے رطب و یابس کے اس انبار کے سامنے اس عہد کی ناولیں، سوانح عمریاں، تاریخی کتب اتنالیقے حتی کہ سرسید کے عناصر اربعہ کی جملہ فکری کاوشیں نہیں ٹھہر سکتی لیکن کیفیت کے اعتبار سے دیکھیے تو انیسویں صدی کے آخر تک اردو ڈرامہ کوئی ایسی کہانی یا کردار نہ دے سکا جسے یاد رکھا جاسکے۔

البتہ بیسویں صدی کے ربع اول میں ضرور پارسی کمپنیوں سے ایسے لوگ وابستہ ہوئے جنکا ادبی مذاق بلند اور زبان و بیان پر گرفت مضبوط تھی۔ اسی دور میں اردو ڈرامے کے افق پر آغا حشر نمودار ہوئے جو اس صنف ادب میں اپنے عہد کے سب سے باشعور فنکار تھے۔ انھوں نے شیکسپیئر سے خاصا استفادہ کیا تھا اور اپنی محنت و کاوش سے اردو ادب کو "صید ہوس"، "شہیدناز"، "سفید خون"، "خواب ہستی" اور "آنکھ کا نشہ" جیسے ادب پارے عطا کیے ان کے پلاٹ میں حقیقت و واقعیت کی جھلک نظر آتی ہے دیوں پریوں کو اسٹیج پر زحمت دینے کے بجائے وہ زندگی کی سچی تصویریں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بقول پروفیسر آل احمد سرور وہ بھی تجارتی اغراض سے اپنا دامن چھڑا نہ سکے اور انکی کاوشوں سے اردو ڈرامہ کو ہماری ادبی تاریخ میں صف اول میں کوئی مقام نہ دلا سکے۔

اس عہد تک ناٹک کمپنیوں نے اردو ڈرامہ کی جو [illegible] تھی اس سے بہت سے لوگ مضطرب تھے اور اصلاح حال کے لیے فکرمند تھے مگر ڈرامہ کو کوئی خواجہ الطاف حسین حالی نہ مل سکا تھا جو اس کے لیے کوئی مقدمہ تحریر کرتا اور اسکی سماجی معنویت کو اجاگر کرتا۔ اردو کے نقادوں اور ادب شناسوں کی بے اعتنائی کے علاوہ یہ اردو ڈرامہ کی تومی تقدیر تھی کہ اس عہد میں شیکسپیئر، بن جانسن، ابسن اور شا کے تراجم کرنے والے تو بہت تھے لیکن کوئی خود اردو کا برنارڈ شا یا ولیم شیکسپیئر یا کالی داس بننے کے صبر آزما منزلوں سے گذرنے کے لیے تیار نہ تھا بیسویں صدی جو ہوش ربا ذہنی و فکری انقلابات اپنے دامن میں لیکر آئی تھی اسکی وجہ سے ناٹک کمپنیوں کی خوش گپیوں اور مصنوعی اداکاریوں کے لیے اب زیادہ دن تک جگہ باقی رہنا مشکل تھی۔ ناٹک کمپنیاں اب ذہنی اعتبار سے اور بھی پست لوگوں کی نازبرداری میں مصروف ہوگئی تھیں اس صورت میں اردو ڈرامے نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور تھیٹر کی مکروہ فضا سے اہل علم کی دہلیز تک آ پہنچا محمد حسین آزاد، مرزا رسوا اور شرر جیسے بزرگ اسکی طرف متوجہ ہوئے حتی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی، برج موہن دتاتریہ کیفی اور ظفر علی خاں جیسے ہوشمند اور ثقہ اہل علم ڈرامہ کے حریم ناز میں داخل ہوگئے مولانا عبدالماجد کے "زود پشیماں" پر مولانا سلیمان ندوی جیسے علما ڈرامہ کے مستقبل سے امیدیں وابستہ کرنے لگے اور انھیں یہ توقع ہوئی کہ اردو ڈرامہ ممبئی و کلکتہ کی تماشا گاہوں کے کثیف ماحول سے باہر آکر صاف ستھری فضا میں سانس لے سکے گا۔ اور ہیئت اجتماعی کی اصلاح میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکے گا۔ لیکن یہ ذی علم شخصیتیں اردو ڈرامہ کے درد کا مداوا نہ بن سکیں ہاں انھوں نے اس کوچہ میں آکر اردو ڈرامے کی عزت و وقار میں ضرور اضافہ کیا۔ کم از کم اسکی ادبی حیثیت اور سماجی افادیت تسلیم کرلی گئی لیکن اب یہ بدعت شروع ہوگئی کہ لوگوں نے اسٹیج کی ضرورتوں کو نظرانداز کرکے خالص ادبی ڈرامے لکھنا شروع کردیئے کچھ لوگ اور آگے بڑھے اور انھوں نے سیاسی مسائل کو بھی اس خرادپر چڑھا دیا۔

کشن چند زیبا کا ڈرامہ "زخمی پنجاب" خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے برٹش حکومت نے باغیانہ خیالات کی وجہ سے ضبط کر لیا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۰ء تک حکیم احمد شجاع مدیر رسالہ "ہزار داستان لاہور" نے متعدد ڈرامے لکھے مثلاً "باپ کا گناہ" "بھارت کا لال" "آخری فرعون" وغیرہ جنھیں سے کئی اسٹیج کی رونق بھی بنے۔

اردو ڈرامہ میں طرز جدید کا آغاز اس صدی کی چوتھی دہائی میں ہوا جب کہ مغربی تھیٹر سے فائدہ اٹھانے کی شعوری طور پر کوشش کی گئی اور معاشرتی مسائل کو کھل کر ڈرامے کا موضوع بنایا جانے لگا۔ بقول پروفیسر محمود الٰہی یہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ تھا جہاں پارسی تھیٹر سے الگ اردو ڈرامے کی ایک نئی فضا قائم ہوئی۔ طرز جدید کے بانیوں میں نمایاں حیثیت اشتیاق حسین قریشی، عابد حسین، شاہد احمد، پروفیسر مجیب، فضل الرحمٰن، امتیاز علی تاج اور سدرشن وغیرہ کو حاصل ہے مگر یہ حضرات بھی سماجی حقیقت نگاری اور زبان و بیان کی سادگی کے تقاضوں کو پورا کرنے اور انشا پردازی کا جوہر دکھانے میں مصروف رہے اور اسٹیج کی ضرورتوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ ۱۹۳۵ء کے بعد بولتی ہوئی فلم نے ناٹک کمپنیوں کا زور توڑنا شروع کر دیا۔ مگر اس انقلاب سے بھی اردو ڈرامہ کا کوئی بھلا نہیں ہوا اس لیے کہ فلم کاروں کو جو کہانیاں منظور نظر تھیں وہ تھیٹر کی سطح سے کچھ بھی بلند نہ تھیں۔ بہر حال اس دور میں اردو ڈرامہ گو اسٹیج سے دور ہٹ گیا لیکن اس نے ادبی اعتبار سے خاصی بلندیوں تک رسائی حاصل کر لی۔ بالخصوص امتیاز علی تاج نے انارکلی میں مکالموں کی چستی، پلاٹ کے تناسب و توازن، کرداروں کی دلکش پیش کش اور خوشنما اسلوب بیان کے ذریعہ ایک ایسے فن کا مظاہرہ کیا جو اسٹیج کے نقطۂ نظر سے خواہ کامیاب نہ ہو لیکن ہمارے ذہنوں پر تاثرات کے گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑتا ہے۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد سماج کے اندر اقتصادی ناہمواریوں اور معاشرتی و طبقاتی کشمکش کا احساس اردو کے اہل قلم کے ایک گروہ کے اندر شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔ حقیقت نگاری کے لیے اور تیز ہو گئی۔ اور اہل قلم اب روحانی دھند سے نکل کر سماجی خیر اور معاشرتی عدل کے واضح تصورات کی تیز روشنی میں آگے قدم بڑھانے لگے۔ اس عہد میں حبیب تنویر، کرشن چندر، ڈاکٹر محمد حسن، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری وغیرہ نے اردو ڈرامہ کی طرف بھی توجہ کی اور کچھ قابل قدر خدمات اس صنف ادب کی انجام دیں لیکن یہ حضرات اقدار و روایات پر آنکھیں بند کر کے تیشہ چلانے میں اس قدر مصروف رہے کہ ڈرامہ کے فنی تقاضوں کی جوئے شیر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ مزید براں انسانی تہذیب و تاریخ کے بارے میں ان لوگوں کے نہایت ناقص تصورات نے انھیں انسانی فطرت کی صحیح ترجمانی سے محروم کر دیا اور فکر و فن کا کوئی ایسا کارنامہ یہ حضرات انجام نہ دے سکے جو دیرپا ثابت ہوتا۔

آزادی کے بعد جدید ہندستان میں معاشی خوشحالی کے جنون اور صنعتی ہماہمی نے انسان سے فرصت کے بچے کھچے لمحات بھی چھین لیے۔ اب اس کو فنون لطیفہ اور شعر و نغمہ سے محظوظ ہونے کے لیے مختلف ٹکڑوں میں فرصت و فراغت کے اوقات آنے لگے چنانچہ ناول کی جگہ مختصر افسانوں اور طویل اسٹیج ڈراموں کی جگہ مختصر و یک بابی ڈراموں کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ گیا۔ ریڈیو کے عام استعمال نے بھی اس ضرورت کا احساس پیدا کیا کہ ریڈیو پر نشر کرنے کے لیے ایسے مختصر ڈرامے لکھے جائیں جو گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں پیش کیے جا سکیں۔ چنانچہ عہد جدید میں یک بابی و ریڈیائی ڈراموں نے اسٹیج ڈراموں کی جگہ لے لی۔ آزادی سے قبل ریڈیو کی ضرورت کے پیش نظر اختر شیرانی، اثر لکھنوی، احمد عباس، آغا شاعر قزلباش، افسر میرٹھی، ناصر دہلوی، نسیم الہ آبادی اور فضل الٰہی وغیرہ نے یک بابی ڈرامے لکھے اور ان میں تقریباً تمام اجزا موجود ہیں جن سے طویل اسٹیج ڈراموں کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں نہایت اختصار و کفایت سے زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی تعبیر کی گئی ہے۔ ان ڈراموں میں حرکت و عمل کی گنجائش نہیں بلکہ صوتی نشیب و فراز اور مکالموں کے زور و اثر سے کام لیا گیا ہے۔

ان کی ہیئت ترکیبی کہانی، کردار اور مکالمے سے ہوتی ہے چنانچہ انھیں بحیثیت صنف ڈرامے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان ڈراموں میں زمان و مکان کی قید سے بھی چھٹکارا مل گیا اسلئے کہ صوتی اثرات کی مدد سے زمان و مکان کے فاصلوں کو طے کرنے کی کوشش کی گئی۔

غرض ریڈیو کی منزل تک آکر ڈرامہ کچھ افسانے سے قریب آگیا۔ اسطرح کے ڈراموں کو نقطۂ عروج تک پہنچانے والوں میں امتیاز علی تاج، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، راجہ مہدی علیخاں وغیرہ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یک بابی ڈراموں کے سلسلے میں بھی اردو میں خاصے کامیاب تجربات ہوے اور اچھی خاصی تعداد یک بابی ڈرامے گذشتہ تیس چالیس سال میں لکھے گئے اور لکھنے والوں کی ایک پختہ مشق اور جہاندیدہ جماعت سامنے آئی جیسے منٹو، اپندر ناتھ اشک، میرزا ادیب، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی جیسے نامور فنکار شامل ہیں۔ موجودہ دور میں اچھے ریڈیائی ڈرامے اردو میں لکھے جا رہے ہیں اور اختصار کے باوصف مکالموں کی روانی دلچسپی کرداروں کی نفسیاتی گہرائیوں کے انعکاس اور زبان و بیان کی سادگی و دلکشی کے ساتھ اردو ڈرامہ ہماری ادبیات کے سرمایہ میں وزن و وقار کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔ حبیب تنویر، پرکاش پنڈت، انور جلال، ظفر احمد اور فضل حسنین نے اردو ادب کو اچھے ریڈیائی ڈرامے دیئے ہیں۔

اب ہم ریڈیو اور فلم کے مراحل سے گذر کر ٹیلیویژن کی منزل تک آگئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں اس سے لطف اندوز ہونے کی سہولت مہیا ہوگئی ہے۔ اب ہر زبان کے ڈرامے کا مستقبل ٹیلیویژن سے وابستہ ہوگیا ہے۔ ٹیلیویژن کے پردے پر جہاں بصیرت و بصارت دونوں کی تسکین کے اسباب مہیا ہیں ریڈیو کی بندشیں باقی نہیں رہ گئی ہیں۔ یہاں گویا پردۂ فلم بھی ہے اور تھیٹر کا اسٹیج بھی جس کے ذریعہ حرکت و عمل کے تمام کرشمے آنکھوں کے سامنے آسکتے ہیں بس سوال یہ ہے کہ کون دریا کو کوزہ میں بند کر سکتا ہے اور کون چاول پر قل ہو اللہ لکھ سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو ڈرامے کے موجودہ ہونہار فنکار اس چیلنج کو قبول کریںگے

گنجینۂ نوادر کا ایک ورق

(ص ۲۹ کا بقیہ)

نظر سے گزرے ہیں۔ اقبال اور اکبر کے مخلص دوستوں میں تھے۔ مرزا صاحب کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا۔

۳ عزیز لکھنوی اردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاد شاعر تھے۔ تنقیدی مضامین بھی لکھتے تھے۔ اکبر اور اقبال سے ان کے مراسم تھے۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جوش ملیح آبادی اور آثر لکھنوی ان کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ "گلکدۂ عزیز" اور "صحیفۂ ولا" ان کی تصانیف ہیں۔ شبلی آپ کو رئیس الشعراء کہتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

۴ ادیب الہ آباد بابت نومبر ۱۹۱۰ء۔ ۵ ادیب الہ آباد بابت جنوری ۱۹۱۱ء

۶ انشائے ماجد صفحہ ۱۹ طبع ثانی، ۷ دیوان وحشت صفحہ ۱۴۷ مطبوعہ ۱۹۱۰ء

۸ روداد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ جلد دوم مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۴ء صفحہ ۳۹ تا صفحہ ۵۲۔

۹ شیعہ کالج نیوز جلد ۱، ۷ اپریل ۱۹۱۲ء۔ اکبر نے اس قطعہ میں نواب سر فتح علی خان قزلباش کی قومی خدمات کو سراہا ہے۔ انہی نواب صاحب کے گھر میں مولانا گرامی چار سال تک نواب صاحب کے بچوں کے اتالیق رہے۔ اور اسی کوٹھی میں ڈاکٹر اقبال نے ایران کے بہت بڑے عالم علامہ شیخ عبدالعلی ہروی سے قرآنی نکات اور دیگر معاملات میں استفادہ کیا تھا۔ اس کا اعتراف اقبال نے کئی خطوط میں کیا ہے۔ نواب صاحب کا انتقال لاہور میں ۱۹۲۳ء میں ہوا — میں جناب آغا باقر صاحب پروفیسر شعبۂ اردو شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے شیعہ کالج نیوز اخبار کی فائلیں استفادہ کے لیے حاضر کی تھیں۔

۱۰ "نقیب" بدایوں بابت اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۱۲ء، ۱۱ اکبر الہ آبادی صفحہ ۳۹۶ از طالب الہ آبادی۔

ڈاکٹر اختر بستوی
(لکچرر شعبۂ اردو)
گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور

کچھ اور اپنے روپ میں نکھر گئی ہے زندگی
کسی بھی امتحاں سے جب گزر گئی ہے زندگی

مزاجِ زندگی یہ ہے کہ سختیوں کے دور میں
دبی ہے اور دب کے پھر ابھر گئی ہے زندگی

کسی بڑے سفر کے راستے میں یہ جہاں پڑا
یہاں کا حسن دیکھ کر ٹھہر گئی ہے زندگی

گھٹا ہے آدمی کا دم، بشر کو موت آئی ہے
کوئی نہ کہہ سکا کبھی کہ مر گئی ہے زندگی

ستم تو آج ہے مگر یہ سوچ اخترِ حزیں
کرم بھی بار بار تجھ پہ کر گئی ہے زندگی

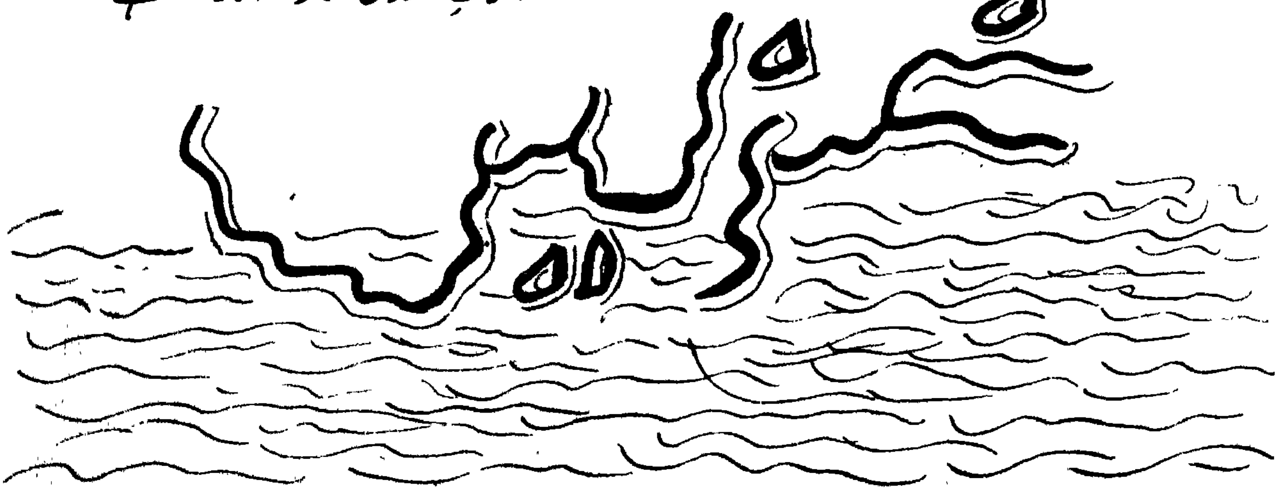
اِس بات نے پھر دل میں اک کرب ابھارا ہے
ہم جس کے نہ ہو پائے وہ شخص ہمارا ہے

گہرا ہو کہ ہلکا ہو، انسان کا ہر رشتہ
سوچو تو مصیبت ہے، سمجھو تو سہارا ہے

تنہائی کے ساحل پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو
احساس کے طوفاں نے ہر شب کو پکارا ہے

خوابوں کی حسیں وادی آباد نہ ہو کیوں کر
بہتوں کو وہاں رہ کر لٹنا بھی گوارا ہے

اختر کی ریاضت نے الفاظ کی دھرتی پر
افلاکِ تصوّر کی گنگا کو اتارا ہے



محمد اسحاق صدیقی
۵۔ اے گوئن تالاب لکھنؤ ۔۱۸



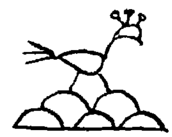
ہندستانی سکوں میں قطب شمالی کی جھلکیاں

ہندستان میں سکوں کا رواج کب اور کیسے ہوا۔ یہ بتانا مشکل ہے۔ ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) کی قدیم ریاست لیڈیا میں ساتویں صدی قبل مسیح میں سونا آمیز چاندی کے سکے رائج تھے۔ غالباً سکوں کی ایجاد کا تصور لیڈیا سے عراق اور ایران ہوتا ہوا ہندستان آیا۔

ہندستان میں چھٹی صدی قبل مسیح سے دوسری صدی قبل مسیح تک ایک خاص قسم کے چاندی کے سکے رائج تھے جن کا ہند کے قدیم ادب میں "پرانا" کے نام سے ذکر آیا ہے۔ سکوں کے ماہرین انھیں "پرانا" (PURANAS) کے علاوہ (PUNCH-MARKED COINS) بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ ان پر علامات ٹھپوں سے ٹھونک کر بنائی جاتی تھیں (آخری دور میں انھیں ڈھال کر بھی بنایا جانے لگا تھا) ان سکوں کے دفینے پورے ملک میں جا بجا کھدائی کے دوران ملے ہیں انھیں ہندستان کے ہر بڑے عجائب خانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سکے خاص تعداد میں ہندستان کے باہر یورپ اور امریکہ کے عجائب خانوں میں بھی پہنچ چکے ہیں۔ ماہرین نے ان سکوں کے کیٹلاگ تیار کیے ہیں، جن میں ہر سکے کی ناپ اور وزن، سامنے کے رخ اور پشت پر پائی جانے والی علامات کو دکھایا گیا ہے۔ علامات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ بعض ماہرین نے ان کی تشریح کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ ان کا خیال اس طرف نہیں گیا کہ ان علامات کا تعلق ہندستان سے نہیں بلکہ قطب شمالی سے ہے۔ میں اس نتیجے پر برسوں کے مطالعے کے بعد پہنچا ہوں۔ ان میں سے بعض علامات کی تشریح میں نے اپنے مضمون "پرانے سکوں کی پر اسرار علامات" (مطبوعہ نیا دور مئی ۱۹۸۵ء) میں پیش کی تھی۔ اس سے قبل کہ میں باقی علامات کی تشریح پیش کروں، یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ موجودہ اور زمانۂ قدیم کے قطب شمالی کے جغرافیائی ماحول میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے۔ آج کل قطب شمالی کے ارد گرد بحرِ منجمد شمالی (ARCTIC OCEAN) ہے۔ یہ برف گرمی میں جا بجا پگھل جاتی ہے اس بے انتہا سرد ماحول میں ادنیٰ قسم کے نباتات پائے جاتے ہیں دودھ پلانے والے جانوروں میں قطب شمالی کا سفید بھالو، سفید لومڑی اور خرگوش خاص ہیں۔ پرندوں میں سفید الو قابلِ ذکر ہے اور برف کے نیچے سیل مچھلیاں پائی جاتی ہیں، جو دراصل دودھ پلانے والا جانور ہے۔ اب سے ہزاروں سال پہلے قطب شمالی کے گرد جو سمندر ہے وہ برف پوش نہ تھا۔ وہاں کی آب و ہوا معتدل تھی اور ایک ایسا خطۂ زمین موجود تھا جہاں انسان کا رہنا ممکن تھا۔ مختلف اقوام کی مذہبی روایات کے تقابلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قطب شمالی پر ٹھیک قطب تارے کے نیچے ایک جزیرہ تھا۔ جس کے بیچ میں ایک کوہِ آتش فشاں تھا، جس سے کبھی کبھی دھواں نکلا کرتا تھا۔ جب یہ پہاڑ ٹھنڈا پڑ گیا تو اس کے دہانے میں پانی کے جمع ہونے سے ایک جھیل بن گئی جس سے چار دریا نکلتے تھے اور جزیرے کو چار حصوں

نیم بانٹتے تھے۔ اس جزیرے میں بعض منگول اور آریہ قبائل جا بسے تھے جو نہ جانے وہاں کب تک رہتے رہے۔ آب و ہوا کی تبدیلی سے یا اس جزیرے کے وسط میں موجود جوالا مکھی کی آتش فشانی سے مجبور ہو کر ان قبائل نے وہاں سے ہجرت کی اور کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ بہر حال وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ قطب شمالی کے مخصوص ماحول کی یادیں لیتے گئے جو مذہبی روایات کی صورت میں آج تک محفوظ ہیں۔ تاریخ کے اس بھولے ہوئے باب پر نشان کے "پرانے" سکوں سے کافی روشنی پڑتی ہے اور بعض حیرت انگیز حقائق سامنے آتے ہیں جو نہ صرف سکوں کے ماہرین بلکہ تاریخ انسانی میں دلچسپی لینے والے ہر شخص کے لیے پرکشش ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد سکوں کی علامات کی تشریح پیش ہے۔

مور



پرانے سکوں کے اس نشان کو پہاڑ پر کھڑا مور مانا جاتا ہے تاریخ ہند اور آثارِ قدیمہ کے ماہر اس کا مطلب "موریہ" نکالتے ہیں لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے کہ کیا واقعی ان سکوں کا تعلق موریہ خاندان کے راجاؤں سے تھا؟

مور کا حسن و جمال ہمیں رگ وید کے "سپرن" ("خوش نما پروں والا") کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی دم کے پروں کے نشان ہلال سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس پرند کو چاند کا ارضی نمائندہ مانا جاتا ہو۔ ناچتا ہوا مور تاروں بھرے آسمان کی گردش کی یاد دلاتا ہے۔ وادیٔ سندھ میں لاشوں کو مٹکوں میں بند کر کے دفن کرنے کا رواج تھا۔ کھدائی کے دوران ایسے مٹکے برآمد ہوئے ہیں، جن پر مور اور تارے بنے ہوئے ہیں۔ غالباً اس زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ نیک لوگوں کی روحوں کو مور آسمان پر تاروں کی دنیا میں خصوصاً قطب تارے پر لے جاتے ہیں۔

اسلامی روایات کے مطابق شیطان مور اور سانپ کی مدد سے اس جنت (باغِ عدن) میں داخل ہوا تھا۔ جہاں سے حضرت آدم و حوا نکالے گئے تھے۔ شمالی عراق میں آباد یزیدی کانسے کے بنے مور کے مجسمے کے گرد رقص کرتے ہیں اور اسے وہ ملک طاؤس کہتے ہیں۔ یہ مور دراصل قطب تارے کی مرموز علامت ہے اور اس دور کی یاد دلاتا ہے، جب قطب تارا ایر واقع (VEGA) تھا تقریباً دس ہزار سے آٹھ ہزار سال قبل مسیح (عرب اور مصر کے لوگ تاروں کے اس مجموعے کو جس میں یہ تارا واقع ہے گدھ مانتے تھے۔ چونکہ گدھ ایک کریہہ پرندہ ہے، اس لیے بعض اقوام نے اسے مور سے بدل دیا۔

سکوں پر بنی مور کی علامت ہمیں شاہنامۂ فردوسی کے سیمرغ کی یاد دلاتی ہے۔ سیمرغ مخفف ہے سین مرغ کا۔ سین بابلی اور آشوری اقوام میں چاند کے دیوتا کا نام تھا۔ گویا یہ پرند چاند سے منسوب تھا بعض روایات کے مطابق وہ کوہِ قاف پر رہتا ہے۔ چنانچہ آسیر کا شعر ہے ؎

ڈرتے ہیں ترے ناوکِ مژگاں سے یہ طائر
سیمرغ تلک قاف سے باہر نہیں آتا

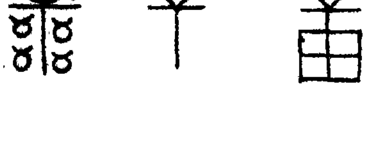
—— فرہنگ آصفیہ (جلد سوم ص ۱۵۱)

اگر یہ مان لیا جائے کہ پرانے سکوں پر بنا پرند سیمرغ (قطب تارا) ہے تو اس پہاڑ کو جس پر وہ کھڑا ہے کوہِ قاف ماننا پڑے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوہِ قاف اس پہاڑ کا نام تھا جو قطب شمالی پر تھا۔

سیمرغ کے بارے میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شجرِ عقل (TREE OF KNOWLEDGE) پر اس کا آشیانہ ہے۔ وہ تمام پرندوں میں سب سے دانشمند ہے۔ دنیا کی ساری زبانیں اور ہر علم و فن جانتا ہے۔ دنیا کے ماضی، حال اور مستقبل سے واقف ہے غالباً اس کی ہمہ دانی کا سبب یہ ہے کہ وہ شجرِ عقل کے پھل کھاتا ہے اس سے بھی اس کا تعلق قطب شمالی سے ثابت ہوتا ہے۔

(باغِ عدن اور شجرِ عقل کی تشریح کے لیے میرا گذشتہ مضمون دیکھیے)

فاختہ



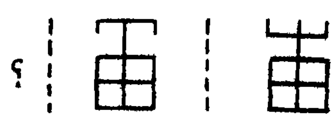
مندرجہ بالا علامات پرانے سکوں پر پائی جاتی ہیں۔ چار دریاؤں کی سرزمین سے قطبی جزیرہ مراد ہے جہاں چار دریا بہتے تھے۔ مرکز میں بنی کھڑی لکیر زمین کے محور کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی نوک پر بنا مثلث فاختہ کی مختصر تصویر ہے، جیسا کہ بائیں طرف بنے ہوئے نقوش سے ظاہر ہے۔ فاختہ سے مراد قطب تارا ہے کیونکہ اسے محور کی نوک پر بنایا گیا ہے (گویا فاختہ سیر دائیع کا بدل ہے)۔

قدیم کریٹ میں فاختہ کو دیوی کی علامت مانا جاتا تھا وہاں کے آثارِ قدیمہ میں ایسے ستون ملے ہیں جن کی چوٹی پر دوہرا تبر (DOUBLE AXE) لگا ہے اور اس پر ایک فاختہ بیٹھی ہے جیسا کہ سامنے کی تصویر میں دکھایا ہے۔ جو ایک تابوت پر بنی ہوئی ملی ہے یہ ستون وہاں پوجے جاتے تھے۔



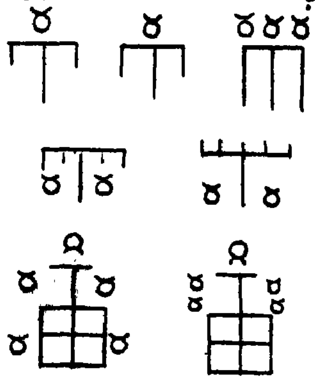
فاختہ بابل میں اشتر (ISHTAR) مصر میں ہیتھر (HATROR) یونان میں ایفرودیتی (APHRODITE) اور روم میں وینس (VENUS) دیویوں سے منسوب تھی۔ (یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ انسان نے خدا کو پہلے مرد کے بجائے عورت کے روپ میں پوجا تھا کیونکہ سماج کا نظام امہاتی تھا۔ جب اس کی جگہ ابوی نظام نے لی تو خدا کو ماں کے بجائے باپ مانا جانے لگا۔) یہی فاختہ عیسائیوں میں روح القدس کی علامت ہے۔

محور کی علامات



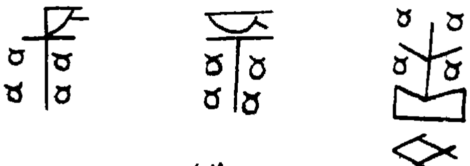
بائیں طرف کے نقش میں اوپر کا حصہ آسمان کی مختصر تصویر ہے (قدیم مصر کے تصویری خط میں آسمان کے لیے یہ علامت تھی) کھڑی لکیر محور کو ظاہر کرتی ہے جسے چار دریاؤں کی سرزمین (قطبی جزیرے) کے وسط میں دکھایا ہے۔ یہ علامت پرانے سکوں پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس کا بدلا ہوا روپ نظر آتا ہے جیسے دائیں طرف دکھایا ہے

مندرجہ ذیل علامات میں درمیان کی کھڑی لکیر زمین کے محور کو اور اوپر والا افقی خط آسمان کو ظاہر کرتا ہے۔



نیچے کی دو علامات میں چار دریاؤں کی سرزمین کے وسط میں کھڑی لکیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محور کی علامت ہے۔

اس سلسلے میں محور کی مندرجہ ذیل علامات بھی قابلِ غور ہیں۔



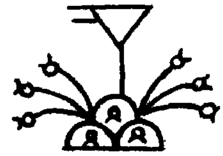
دائیں طرف کی پہلی علامت میں قطبی پہاڑ کے دہانے کے وسط میں محور کو دکھایا ہے۔ اس کے نیچے مچھلی بحرِ شمالی کی علامت ہے۔ برجِ ثور کی علامات سے غالباً پہاڑ کے تقدس کا اظہار مقصود ہے۔



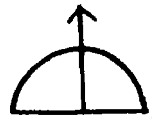
بائیں طرف کے پہلے نقش میں محور کے اوپر فاختہ قطب تارے کی اور مچھلیاں بحرِ شمالی کی علامت ہیں۔ دائیں طرف کے نقش اول الذکر کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔

عام طور پر پرانے سکوں کے ماہرین کھڑی لکیر اور اس کے اوپر

بنی ہوئی علامات کا مفہوم مختلف قسم کے نیزے یا علم سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ تشریح غلط ہے۔ جن نشانات کو علم سمجھا جاتا ہے ان کے درمیان کی کھڑی لکیر واقعی میں محور ہے اس کا واضح ثبوت یہ نقش ہے۔



یہاں قطبی پہاڑ (ہندوؤں کے میرو) کی چوٹی پر محور بنا کر اس کی نوک پر فاختہ کی مختصر علامت بنائی گئی ہے۔ فاختہ سے مراد قطب تارہ (سپتا رشی) ہے۔



تیر کمان

پرانے سکوں پر تیر کمان کی علامت بھی پائی جاتی ہے میرے خیال میں یہاں تیر کمان سے مراد ہتھیار نہیں ہے بلکہ تیر محور کی علامت ہے اور کمان گنبدِ فلک کو ظاہر کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیر کمان کی ایجاد عہدِ قبل تاریخ میں اتفاقاً عمل میں آئی جب کسی شخص نے محور کا تصور سمجھانے کے لیے ایک بے پتوں کی پتلی شاخ کو موڑ کر آسمان کی صورت ظاہر کرنے کے لیے کمان کی شکل میں موڑا اور پھر اس شکل کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے نیچے ایک تانت باندھی۔ اس کے بعد اس کے مرکز میں ایک لکڑی کو کھڑا کیا اور جب وہ اس طرح محور کا مقام سمجھا رہا تھا اتفاقاً چھڑی تانت کے کھینچنے پر دور جا گری اس اتفاقیہ دریافت سے تیر کمان کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا اور جب تیر کے سرے پر نوک دار پتھر تانت سے باندھ کر لگائے جانے لگے جانوروں کا شکار کرنا نہایت آسان ہو گیا۔

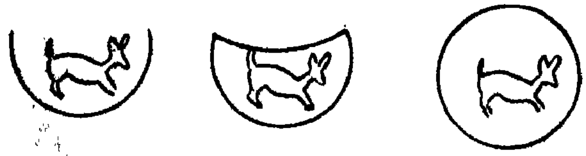


ہاتھی

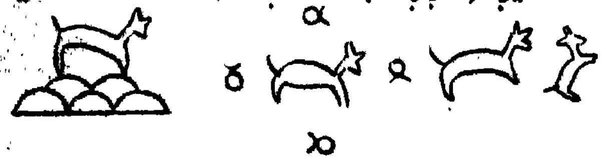
پرانے سکوں پر پائی جانے والی حیوانی علامات میں بیل کے بعد دوسرا عام نشان ہاتھی ہے۔ دیہ عجیب بات ہے کہ ان سکوں پر گھوڑے اور شیر کے نشانات بہت کم پائے جاتے ہیں (ہندو دیومالا کے مطابق ہاتھیوں کا راجہ ایراوت ہے جو اندر دیوتا کی سواری ہے۔ ہندو اور جینی جغرافیے کے مطابق ایراوت ورش زمین کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ اسے اترکورو ورش بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں سے مراد سائبیریا ہے۔ اس کا نام ایراوت ورش رکھنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہاں عہدِ قبل تاریخ میں میمتھ (MAMMOTH) کے بڑے بڑے جھنڈ پائے جاتے تھے۔ یہ جانور ہاتھی کا قریبی رشتے دار تھا، لیکن اس سے کہیں بڑا۔ اس کے جسم پر بھورے رنگ کے بڑے بڑے بال اور چہرے کے سامنے لمبے لمبے دانت اوپر کی طرف گھومے ہوئے ہوتے تھے۔ آب و ہوا کی دفعتاً تبدیلی سے یہ میمتھ مر گئے۔ کھدائی کے دوران ان کی ہڈیوں کے انبار اور لاشیں برف میں دفن ملتی ہیں۔ بعض تو اتنی اچھی حالت میں ملیں کہ کتے ان پر ٹوٹ پڑے اور گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگے۔ بعض کے پیٹوں سے ایسے غیر ہضم شدہ نباتات برآمد ہوئے۔ جو معتدل آب و ہوا میں پائے جاتے ہیں۔ قطب شمالی کی آب و ہوا کی اس دفعتاً تبدیلی کا سبب نامعلوم ہے۔ بہر حال ہندستان کے پرانے سکوں پر ہاتھی کی علامت بنانے سے نہ تو کسی راجہ کی فوجی قوت کا اظہار مقصود تھا۔ اور نہ شکار، بلکہ یہ علامت قطب شمالی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جہاں سے مذہب اور تہذیبِ انسانی کا آغاز ہوا۔

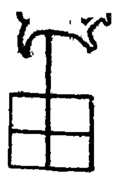
خرگوش

چاند اور خرگوش دونوں کو سنسکرت میں ششی کہتے ہیں۔ چاند کے دھبے مل جل کر خرگوش جیسے نظر آتے ہیں اسی لیے خرگوش کو چاند کی علامت مان لیا گیا اور پرانے سکوں پر چاند کے اندر یا باہر خرگوش کو دکھایا گیا ہے۔



نیچے سکوں پر پائی جانے والی چند مرکب علامات دکھائی گئی ہیں۔



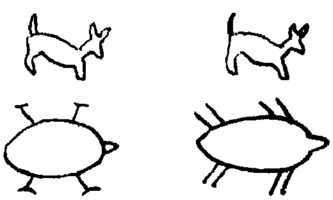


ان میں سے مشترک علامت کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض عالم اسے خرگوش مانتے اور بعض کتا۔ بہرحال جانور جو بھی ہو اس کا تعلق ۔۔۔ کے اُن مجموعوں سے معلوم ہوتا ہے انھیں عربی میں دُبِ اصغر (LITTLE BEAR) اور دُبِ اکبر (GREAT BEAR) یعنی چھوٹا بھالو اور بڑا بھالو کہتے ہیں۔ چنانچہ دائیں طرف کے پہلے نقش میں ایک کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا بنایا گیا ہے اسے عام طور پر کتا اور بلا بیان کیا جاتا ہے۔ بعض کو خرگوش پر چھپٹتا کتا نظر آتا ہے۔

نمبر۲ میں دُبِ اصغر کے گِرد ستاروں کو گردش کرتے دکھایا ہے۔ اس کا مقابلہ اس نشان سے کیجئے جس میں چار مچھلیاں قطبی جزیرے کا اسی طرح چکر لگا رہی ہیں (دنیا دو رمئی ۱۹۸۵ء ۔۔۔)

نمبر۳ میں قطبی پہاڑ کے اوپر خرگوش یا کتا بنانے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دُبِ اصغر کی علامت ہے۔

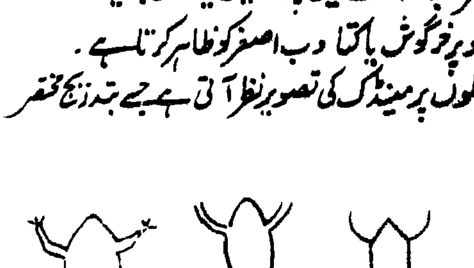
نمبر۴ میں چاروں دریاؤں کے ملک (باغِ عدن) کے اوپر دُبِ اصغر کی علامت نظر آتی ہے اور اس کے محلِ وقوع کا پتہ دیتی ہے۔



کچھوا اور مینڈک

اوپر کی مرکب علامت میں کچھوا زمین یعنی قطبی جزیرے کی علامت ہے۔ اس کے اوپر خرگوش یا کتا دبِ اصغر کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض سکوں پر مینڈک کی تصویر نظر آتی ہے جسے بتدریج مختصر کیا گیا ہے۔

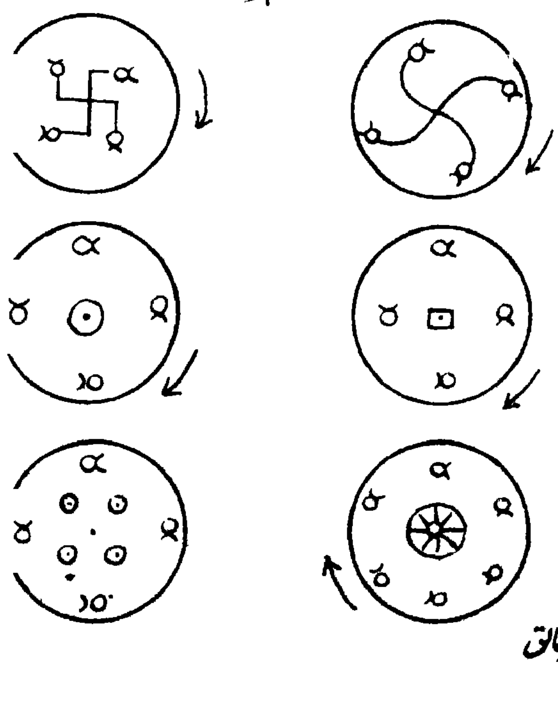


مینڈک کچھوے کا بدل ہے وہ نہ صرف زمین (قطبی جزیرے) کی علامت ہے بلکہ پیدائشِ عالم کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے چنانچہ بعض غیر مہذب قبائل کی پیدائشِ عالم کی روایات کے مطابق خالق دیوتا کے حکم پر ایک مینڈک پانی میں غوطہ لگا کر اپنے منہ میں مٹی نیچے سے اوپر لاتا ہے اور خالق دیوتا اس مٹی سے زمین بناتا ہے۔ (یعنی یہی بات کچھوے بارے بیان کی جاتی ہے) پانی کی سطح پر تیرتا مینڈک نہ صرف جزیرے کی ۔۔۔ ہے بلکہ اس کی کرخت گونج دار آواز اس آواز کی طرف اشارہ کر ۔۔۔ جس سے تخلیقِ عالم کی ابتدا ہوئی۔ میرے خیال میں پیدائشِ عالم ۔۔۔ تمام روایات کی بنیاد قطبی جزیرے کی پیدائش تھی۔ جب وہ ۔۔۔ نو آتش فشانی کے دوران جو آوازیں سنائی دیں۔ انھیں قدیم ان ۔۔۔ "ابتدائی آواز" کا نام دیا۔

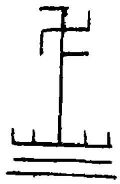
گردشِ فلک

قطب شمالی پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے۔ رات کو آسمان پر نظر ڈالنے سے قطب ستارہ ا۔۔۔ قائم نظر آتا ہے اور باقی تمام ستارے اس کا طواف کرتے ہیں۔ ہر دن یعنی چوبیس گھنٹوں کی مدت میں ستاروں کا ایک چکر ہے۔ یہ منظر دراصل زمین کی محوری گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ۔۔۔ پر سفر کرتے وقت ریل ٹھہری ہوئی اور باہر کی چیزیں بھاگتی نظر ۔۔۔ اسی طرح زمین ٹھہری ہوئی اور آسمان گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے جسے گردشِ فلک کہتے ہیں، وہ زمین کی محوری گردش کا عکس ہے۔

پرانے سکوں پر بہت سی ایسی علامات پائی جاتی ہیں ۔۔۔ مقصد آسمان کی گردش کو ظاہر کرتا ہے۔

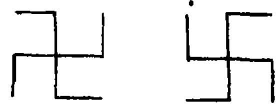


(پچھلے صفحہ پر) اوپر کی علامات میں آسمان کو دائیں سے بائیں
گردش کرتے دکھایا گیا ہے۔ پہلی دو علامات سے یہ بات ظاہر ہے کہ
سواستک کی علامت 卐 دراصل آسمان کی قطب تارے کے گرد
گردش کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی تائید لنکا (سیلون) کے قدیم سکوں
پر پائی جانے والی اس علامت سے بھی ہوتی ہے۔



اس میں کھڑی لکیر زمین کے محور کو اور نیچے کی
دو متوازی لکیریں (ہند قدیم کے سکوں کی دو لہریا لکیروں
کا بدل) بحرِ شمالی (ARCTIC OCEAN) کو ظاہر کرتی
ہیں۔ چھوٹی چار لکیریں چار سمتوں کی مظہر ہیں۔

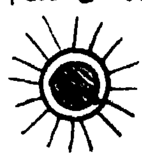
پرانے سکوں پر سواستک کی علامت عام طور پر پائی جاتی
ہے۔ سواستک کے دو روپ ہوتے ہیں۔



ان میں سے دائیں طرف کی علامت سے قطب شمالی کا چھ مہینے
کا دن اور طلوعِ آفتاب مراد ہے اور بائیں طرف کی علامت سے
قطب شمالی کی چھ مہینے کی رات اور غروبِ آفتاب مراد ہے۔ ان میں
سے دائیں طرف کی علامت کو مقدس اور بائیں طرف کی علامت
کو منحوس مانا جاتا ہے۔ یہ علامتیں آج بھی ہندوؤں میں رائج ہیں۔
ان میں سے اوّل الذکر علامت پرانے سکوں پر پائی جاتی ہے۔

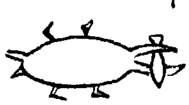
سورج گہن کی علامت

بعض علامات کا تعلق سورج گہن
سے معلوم ہوتا ہے۔



جب سورج، چاند اور زمین ایک سیدھ
میں ہوتے ہیں اور چاند زمین اور سورج کے
درمیان آجاتا ہے تب وہ سورج کو چھپا لیتا ہے اور چاند کا سایہ
زمین پر پڑتا ہے۔ اس کو سورج گہن کہتے ہیں بسا اوقات چاند کا سایہ
اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ زمین تک پہنچ سکے (کیونکہ چاند زمین سے کافی دور
ہوتا ہے اور سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے) ایسی حالت میں سورج پوری
طرح چاند کی آڑ میں نہیں چھپتا اور چاند کے پیچھے سے سورج کی سطح
ایک چمکدار حلقے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ایسے سورج گہن کو حلقے
دار گہن (ANNULAR ECLIPSE) کہتے ہیں۔ پرانے سکوں پر مندرجہ
بالا علامت اسی منظر کو پیش کرتی ہے: بیچ والا بڑا نقطہ پورا چاند
ہے اور اس کے پیچھے سورج کا چمکتا ہوا گولا ہے۔ بلاشبہ یہ منظر نہایت
حسین ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں "مگر کے منہ میں مچھلی" والی مشہور علامت بھی قابلِ
ذکر ہے جو نہ صرف پرانے سکوں پر بلکہ وادیٔ سندھ کی قدیم مہروں پر بھی
پائی جاتی ہے۔ چونکہ ان مہروں کے نیم تصویری رسم خط کو ابھی تک پڑھا
نہیں جا سکا ہے، اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس
علامت کا مفہوم کیا ہے۔

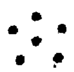


ہو سکتا ہے کہ اس سے سورج یا چاند گہن مراد ہو۔ مگر اس راکشس کو
ظاہر کرتا ہے جو سورج یا چاند کو نگلنا چاہتا ہے (ہند دعلمِ نجوم کا راہو) اور
مچھلی سورج یا چاند کی علامت ہو سکتی ہے۔ جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے
ویسے ہی چاند نیلے آسمان میں تیرتا ہے۔ غالباً مچھلی کے چاندی جیسے چمکتے
فلس کی بنا پر فارسی زبان میں ماہ (چاند) سے ماہی (مچھلی) کا لفظ بنایا
گیا۔

خوشۂ پروین



پرانے سکوں پر ہلال یا بدرِ کامل کے ساتھ یا علاوہ



چھ نقطے مختلف انداز میں ترتیب دیے ہوئے نظر آتے ہیں
میرے خیال میں ان سے خوشۂ پروین یا عقدِ ثریا مراد ہے۔ انھیں
انگریزی میں (PLEIADES) کہتے ہیں۔ ان کی علامات عراق کی
قدیم مہروں پر بھی نظر آتی ہیں۔ ستاروں کا یہ مجموعہ برجِ ثور (TAURUS)
میں شامل ہے۔ ہندی میں خوشۂ پروین کو کرتیکا کہتے ہیں جس کا تعلق
ہندی مہینے کارتک سے ظاہر ہے (کارتکے ہندوؤں میں جنگ کا دیوتا
ہے جس کے چھ سر ہیں اور اس کی سواری مور ہے)
برجِ ثور اور ثریا کی علامات کا سکوں پر پایا جانا اس دور کی

نشان دہی کرتا ہے جب آفتاب برجِ ثور میں داخل ہوتا اور سالِ نو کا آغاز ہوتا۔ ہندوؤں کا مشہور تہوار دیوالی اسی دور کی یادگار ہے۔ دیوالی کا[illegible] مہینے کے کرشن پکش کے آخری دن (اماوسیا) کو منائی جاتی ہے نئے چاند اور پورے چاند (پورنما) کے ساتھ نور ستارے کے بنانے سے ظاہر ہے کہ ان علامات کا تعلق قمری سال کی ابتدا سے ہے۔

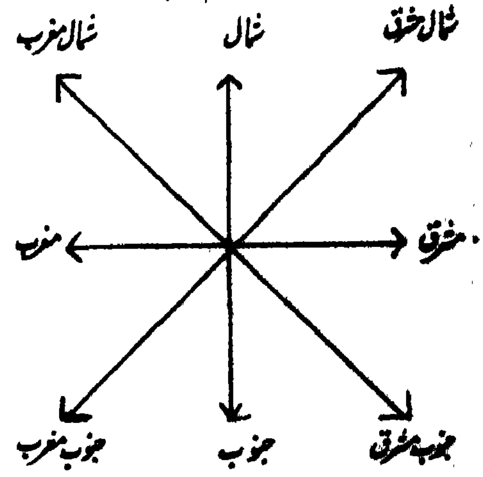
زہرہ اور قمر

زہرا کا ہلال کے نزدیک نظر آنا قدرت کے حسین نظاروں میں سے ایک ہے جسے کئی مسلم ممالک نے اپنے پرچم میں جگہ دی ہے۔ چاند کے ساتھ جو تارہ بنایا جاتا ہے وہ دراصل زہرہ سیارہ ہے یہ علامت بڑی پرانی ہے اور ہندِ قدیم کے سکوں پر بھی نظر آتی ہے۔



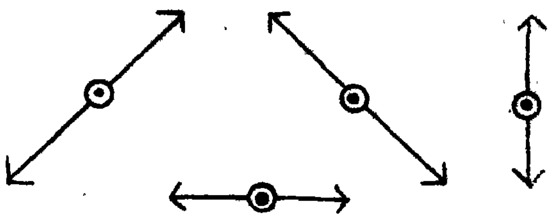
علمِ نجوم کے نقشے

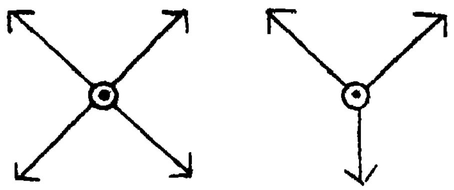
پرانے سکوں کی بعض علامات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاند، سورج، سیاروں اور ستاروں کے بدلتے ہوئے مقامات اور مختلف سمتوں میں ان کے مقام ظاہر کرتی ہیں۔ سامنے آٹھ

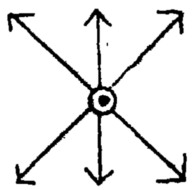


سمتوں کو ظاہر کرنے کے لیے دو صلیبیں ہم مرکز بنائی گئی ہیں۔ سمتیں ظاہر کرنے کا یہ مروجہ طریقہ نیا نہیں ہے بلکہ نہایت پرانا ہے اور ہندِ قدیم کے سکوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

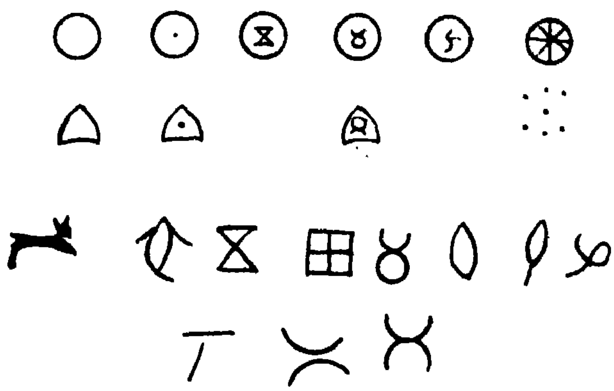
میری ملت میں سکوں پر پائی جانے والی یہ علامات سمتوں کو ظاہر کرتی ہیں







سکوں پر سمت نما تیروں کے درمیان یہ علامات بنائی جاتی ہیں۔



ان نشانات کا مفہوم نامعلوم ہے۔ بہرحال علامات کی تشریح سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے بیشتر کا پس منظر قطب شمالی کی ہے نہ کہ ہندستان۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان علامات کو پہلے پردیسیوں کا کوئی خاص طبقہ کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا، پھر نہ جانے کس نے اور کیوں انھیں سکوں پر بنانا شروع کر دیا۔

•••

غزلیں

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ - ۴

تازہ رہیں تو چاہنے والے ہزار ہیں
اس واقعے سے پھول بہت سوگوار ہیں

کس نے کہا کہ آپ کے ہم جاں نثار ہیں
بس جائیے کہ آپ کے جیسے ہزار ہیں

چل کر کبھی ہمارے اندھیرے بھی دیکھئے
ہم لوگ روشنی میں بڑے باوقار ہیں

بے چین ہیں جو ان کو تو چپ رہنا چاہئے
جو لوگ مطمئن ہیں وہی بے قرار ہیں

آپ آئینے کے سامنے ہم آئینے میں ہیں
آپ اک حسین رات ہیں ہم انتظار ہیں

دنیا کے اس اصول پہ قربان جائیے
شیشہ جو مل گیا تو سبھی سنگبار ہیں

راتیں سجائے ہیں جو یہ ہر شاہراہ پر
اس دورِ مضمحل کے یہی شہریار ہیں

ہر جسم میں ہے کوئی مصوّر چھپا ہوا
سب چہرے اپنی اپنی جگہ شاہکار ہیں

ہر پھول چاہتا ہے کہ سورج اتار لے
سورج کے سامنے تو چمن بشمار ہیں

تسنیم کہہ سکے نہ کبھی اپنے دل کی بات
یوں ہر معاملے میں بڑے ہوشیار ہیں

بشیر فاروقی
۵۱۵ - مراد علی لین
لکھنؤ

دنیا سے کیا بیان حکایاتِ غم کریں
تو خود ملے تو ذکر ترا تجھ سے ہم کریں

بخشا ہے اس نظر نے ہمیں وہ کمالِ فن
چھو لیں جو شاخِ گل کو تو دستِ صنم کریں

میں بھی ہوں اس صلیب پہ منصور کی طرح
جرأت ہو آپ میں تو مرا سر قلم کریں

تجھ سے وفا نہ کی ہو تو لے جانِ آرزو
اس شامِ غم کے بعد سویرا نہ ہم کریں

اچھا یہی ہے زخمِ دل و جاں کو بھول جائیں
سب چہرے ایک جیسے ہیں کس کس کا غم کریں

تصویرِ کائنات ابھی رنگ پر نہیں
کچھ اور ابھی لہو کو سپردِ قلم کریں

ایسے ہم ان سے کیسے مخاطب ہوں اے بشیر
کہہ دے کوئی سلام تو کچھ عرضِ غم کریں

ریحان غنی
دارالغنی شاہ گنج
پٹنہ

قاضی عبدالودود سے ایک انٹرویو

دارالغنی
شاہ گنج۔ پٹنہ۔ ۶
مکرمی تسلیم!

قاضی عبدالودود صاحب سے میں نے ۲۲ نومبر کو ان کی قیام گاہ پر انٹرویو لیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ ٹیپ کی مدد سے ترتیب دیا ہوا یہ انٹرویو میں آپ کو ان کی زندگی میں نہیں بھیج سکا۔ بہرکیف مجھے امید ہے آپ اس انٹرویو کو پسند کریں گے اور نیا دور کے کسی شمارہ میں شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں گے۔ انٹرویو کی بعض چیزیں نکالی جا سکتی ہیں۔
امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص
ریحان غنی

قاضی عبدالودود صاحب اردو اور فارسی کے ممتاز اور عظیم محقق تھے۔ ان کی پیدائش ۸ مئی ۱۸۹۶ء کو پٹنہ کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ پٹنہ اور علی گڑھ میں تعلیم پائی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج بھی گئے۔ انھیں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے فارسی میں CERTIFICATE OF HONOUR بھی مل چکا ہے۔ ۲۱ نومبر کو غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی جانب سے ان کی شاندار علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کے مکان واقع بھنور پوکھر پٹنہ میں ہی تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں کے علاوہ گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی نے بھی شرکت فرمائی۔ اس تقریب میں دہلی سے جناب شفیع قریشی اور جناب یونس سلیم بھی تشریف لائے تھے۔ اس تقریب کے انعقاد سے قبل ایک دلچسپ بات یہ ہوگئی تھی کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے پٹنہ میں تقسیم کے لئے جو دعوت نامے بھیجے تھے وہ کسی وجہ سے قاضی صاحب کے صاحبزادے قاضی مسعود صاحب کے علاوہ انجمن ترقی اردو بہار کے پاس بھی پہونچ گئے اور انجمن نے بھی اپنے طور پر کارڈ تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ جب اس کی اطلاع قاضی مسعود صاحب کو ملی تو انھیں یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ ایک ہی تقریب کے کارڈ دو جگہوں سے تقسیم کئے جائیں کیونکہ اس سے بدنظمی کا اندیشہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے کبیدہ خاطر ہوکر تقریب منعقد نہ کئے جانے کا ٹیلی گرام غالب انسٹی ٹیوٹ کو بھیج دیا۔ ٹیلی گرام

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ دار فوراً پہونچے اور قاضی صاحب کو وقت مقررہ پر تقریب منعقد کئے جانے کے لئے رضامند کرلیا اس طرح یہ تقریب وقت مقررہ پر بہت ہی کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی اور علالت کے باوجود قاضی صاحب نے اس تقریب میں خود بھی شرکت فرمائی۔ اس تقریب کے انعقاد کے بعد یہ خواہش ہوئی کہ قاضی صاحب سے ملاقات کر کے ان سے کچھ باتیں کی جائیں اور یہ بھی دریافت کیا جائے کہ انھوں نے تقریب ملتوی کر دیے جانے کا ٹیلی گرام کیوں بھیج دیا تھا۔ چنانچہ ان سے وقت لے کر ایک دن میں ان کے مکان پر پہونچ گیا اور ان سے پہلا سوال یہی کیا کہ قاضی صاحب ۲۱ر نومبر کو آپ کے اعزاز میں جو تقریب منعقد کی گئی اس سے آپ مطمئن ہیں یا نہیں اور وہ کون سی وجہ تھی جس کے باعث آپ نے تقریب ملتوی کر دیئے جانے کا ٹیلی گرام غالب انسٹی ٹیوٹ کو بھیج دیا تھا؟

قاضی صاحب اس سوال پر اس طرح گویا ہوئے "میں بالکل مطمئن ہوں۔ باقی رہا یہ کہ وہ تار کیوں بھیجا گیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ اعجاز علی ارشد، مسعود کے پاس آئے اور ایک پیکیٹ دیا انھوں نے، اور کہا کہ اس میں چار سو کارڈ ہیں اور فوراً چلے گئے، ایک لمحہ کے لئے بھی وہ ٹھہرے نہیں۔ مسعود نے پیکٹ کھول کر دیکھا تو ۱۹۲ کارڈ تھے۔ گننے میں دس پانچ کی غلطی ہو سکتی ہے اس سے کیا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ کارڈ اپنے طور پر تقسیم کریں گے اور کوشش کریں گے میٹنگ کیپچر کرنے کی۔ کیا انھوں نے یا نہیں۔ لیکن اس سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ اندیشہ ہو سکتا ہے یا نہیں کہ ایسا کریں گے ــــــ اور بتاؤں میں آپ کو۔ میں نے بہت سے لوگوں کے مقالات اور کتابوں پر بڑی بے باکی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ ان سے بہت سے لوگ جو ہیں میرے مخالف ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ جواب دے نہیں سکتے تو مخالف ذریعے سے میری مخالفت کرتے ہیں۔"

اس کے بعد قاضی صاحب سے باقاعدہ انٹرویو کا آغاز ہو گیا۔

ر۔ غ: اس تقریب کے موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک کتابچہ تقسیم کیا گیا تھا جس میں آپ کے بارے میں جناب مالک رام، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر محمد حسن، جناب گوپال متل، جناب رشید حسین خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کیا ان میں کوئی ایسی بات بھی ہے جو آپ کو پسند نہ آئی ہو یا جس سے آپ اتفاق نہ کرتے ہوں؟

قاضی صاحب: ہم دیکھیں سب کو ایک ایک کر کے تب تو ہم جواب دیں۔

ر۔ غ: ایک بات آپ نے یہ کہی تھی کہ محمد حسن صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فخر الدین علی احمد اور نور الدین مرحوم (سابق میئر دہلی) قاضی صاحب کے دوست اور ہم جماعت تھے، یہ غلط ہے۔

قاضی صاحب: ہاں یہ غلط ہے میرے دوست ضرور تھے وہ لیکن میرے ہم جماعت نہیں تھے۔ میرے ایک سال کے بعد وہ دہلی یونی ورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا مضمون تاریخ تھا اور میرا معاشیات ہم جماعت کیسے ہو سکتے ہیں۔

ر۔ غ: ادب سے آپ کا گہرا لگاؤ رہا ہے اور اردو تحقیق کو آپ سے روشنی ملی ہے۔ آپ نے اردو تحقیق کے کچھ اصول وضع کئے ہیں۔ کیا آپ کے بعد کی نسل نے ان اصولوں کا پاس رکھا ہے یا بالفاظ دیگر کیا آپ موجودہ اردو تحقیق سے مطمئن ہیں؟

نہیں میں مطمئن نہیں ہوں۔ بات یہ ہے
جو لوگ لکھتے ہیں اس کے اندر ذاتی مصلحت
کو بہت دخل ہوتا ہے۔ تحقیق اور ذاتی مصلحت
یہ عجیب بات ہے۔ اس سے مستثنیٰ ہیں لوگ
مگر بات یہ ہے کہ عام طور پر یہی کیفیت
ہے۔ پھر تحقیق کے لئے جتنی محنت چاہئے اتنی
محنت نہیں کرتے ایک بات۔ دوسری بات
یہ کہ دل میں بظاہر سمجھتے کچھ ہیں اور لکھتے کچھ
ہیں ذاتی مصلحت کی بنیاد پر۔ اس لئے عام طور
پر تحقیق کا معیار پست ہے۔

ر۔غ : وہ کون سے اسباب تھے جن کی بدولت آپ
نے ادب میں تحقیق اور تنقید کو ہی پسند کیا۔

قاضی صا: بات یہ ہے ناکہ افسانہ لکھتا یا شعر کہتا، ڈراما
لکھتا۔ میں نے افسانے دو ایک لکھے ہیں۔ ڈراما
میں نے کوئی نہیں لکھا۔ میری عمر اس وقت
نوے برس ہے۔ آج سے فرض کیجئے اسّی برس
قبل کون سی بات مانع ہوئی تھی یہ کہنا مشکل
ہے۔

ر۔غ : افسانے جو آپ نے لکھے وہ طبع ہوئے کسی رسالے
میں چھپے ؟

قاضی صا: آگرہ اخبار میں چھپے۔ عنوان مجھے یاد نہیں۔

ر۔غ : کیا شاعری میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی؟

قاضی صا: کیوں نہیں، لکھے ہوں گے سب ملا کر کے ایک
سو ڈیڑھ سو شعر۔

ر۔غ : کیا آپ کے کلام کا کوئی مطبوعہ مجموعہ بھی ہے؟

قاضی صا: نہیں۔ میرے اشعار لوگوں نے شائع کر دیئے۔
میں نے بطور خود اسے شائع نہیں کروایا۔
یہ مجھے یاد ہے کہ بیت بازی بچپن میں کیا کرتا
تھا۔ ایسے اشعار جو "ژ" سے شروع ہوتے
ہوں بہت کم ہیں۔ ایک شعر میں نے بہت کم
سنی کے زمانے میں کہا تھا ؎

ژولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے

ر۔غ : پروفیسر کلیم الدین احمد نے ابھی حال میں کہا
تھا کہ اردو نثر تہی دامن ہے۔ اس سلسلے میں
آپ کا کیا خیال ہے۔؟

قاضی صا: خود کلیم الدین احمد صاحب اپنے بارے میں
کیا سمجھتے ہیں۔ یہ سوال آپ ان سے کیجئے۔

اس کے بعد قاضی صاحب سے میں نے کہا کہ
ادب اور تحقیق پر بہت ہی مفید گفتگو ہوئی
اب میں جاننا چاہوں گا کہ کیمبرج میں آپ کے کون
کون سے ہندستانی ساتھی تھے اور ان میں آپ کے
سب سے گہرے تعلقات کن سے تھے۔؟

قاضی صا: ایک تو پٹنہ ضلع کے زبیر صدیقی۔ ان سے
بچپن کی دوستی تھی۔ مگر وہ مجھ سے پہلے
گئے تھے۔ اور میرے ساتھ واپس آئے۔
نورالدین صاحب اور فخرالدین صاحب یہ
لوگ مجھ سے ایک سال جونیر تھے۔ مضمون
بھی دوسرا تھا۔ میں نے معاشیات لی تھی
اور ان کا مضمون تاریخ تھا۔ بہت فرق ہو گیا
نا۔

ر۔غ : کس شخصیت نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

قاضی صا: غالب۔ غالب کے متعلق میں نے بہت کچھ
لکھا ہے۔ ان کی کمزوریوں کو بھی اجاگر کیا ہے
شاعر کی حیثیت سے برتر ہونا اور بات ہے
اور اس کی اخلاقی پستی اور بات ہے۔

ر۔غ : گویا بحیثیت انسان آپ غالب کو اچھا نہیں
سمجھتے ؟

(بقیہ ص ... پر)

صبحِ بنارس

ڈوبتے تارے، نظر کی اوٹ، ہلکی روشنی   موجوں کی رنگینیوں میں دوڑتی ہے چاندنی
وہ مصفا آب، وہ صبحِ بنارس میں نمی   چادر آبی میں صورت دیکھتی ہے زندگی

چاند کا یوں عکس لہراتا ہے سطحِ آب پر
جس طرح سے کروٹیں لے کوئی فرشِ خواب پر

وہ چمک پانی کی، اور وہ نیلا نیلا آسماں   ہوتا ہے وقتِ سحر، شامِ محبت کا گماں
ایک جانب بت کدے کے در پہ پوجے کا سماں   آ رہی ہے اک طرف مسجد سے آوازِ اذاں

گو جدا الفاظ ہوں ہیں متحد تاثیر میں
رنگ جیسے مختلف ہوں ایک ہی تصویر میں

چاندنی جھلکی ہوئی ہے صبح کا آغاز ہے   ایک طائر دوسرے طائر کا ہم آواز ہے
پی کہاں کی لے میں دل کے توڑنے کا ساز ہے   نیم باز آنکھیں ہیں یا در میکدے کا باز ہے

یوں دھندلکے کا اثر ہے صبحِ عالم گیر پر
عشق کا پردہ ہے جیسے حسن کی تصویر پر

حسنِ رنگیں کا کنارے پر وہ منظر الحذر   ہم تو کیا ہیں چاند کی ہٹتی نہیں پڑ کر نظر
ہے حبابوں کی نگاہوں میں محبت کا اثر   دوڑتی پھرتی ہے کشتی دوشِ موجِ آب پر

منعکس ہے آسماں گنگا کی طغیانی کے ساتھ
عکس تاروں کا نہ بہہ جائے کہیں پانی کے ساتھ

حسن کی رنگینیاں اور دستِ قدرت کا کمال   صاف پانی اس قدر ظاہر ہو جس سے دل کا حال
جس کو دیکھو وہ حسین اور جس کو دیکھو خوش جمال   نازکیں رخسار پر بکھرے ہوئے ریشم سے بال

نورِ پیشانی ہے دل کی ناخدائی کے لیے
صبح کا تارا چمکتا ہے رونمائی کے لیے

اس طرف رنگیں سحر ہے مطلعِ انوار پر   اس طرف رنگینیاں ہیں حسن کے بازار پر
رات کا قبضہ نہیں اب صبح کے آثار پر   نور چھن چھن کر برستا ہے در و دیوار پر

یوں کرن سورج کی پھوٹی ہے سحر کے ساتھ میں
جس طرح سے ہو سنہرا جام نازک ہاتھ میں



جامِ خرماں

(غالبؔ اور اکبرؔ کی روحوں سے معذرت کے ساتھ)

ہم نشیں تجھ کو بتاؤں کیا میں لذت آم کی
در حقیقت اس کو بخشا ہے وہ قدرت نے کمال

وہ دسہری ہو کہ لنگڑا یا ہو چوسا دل نشیں
پیش کر سکتا ہے کوئی کیا بھلا اس کی مثال

مضطرب ہونٹوں پہ اس کی رس بھری گٹھلی کا مس
جیسے اک محبوب کے لب ہائے شیریں کا خیال

اللہ اللہ ساخت اس کی جیسے مقیاس الشباب
ہاتھ میں آتے ہی اس کے گدگداتا ہے خیال

بخشتا ہے قلبِ پیری کو جوانی کا سرور!
اس کی لذت دور کرتی ہے ہر اک دل کا ملال

سب کے دل میں اس کی چاہت سب کے یہ مرغوب ہے
پیرِ صد سالہ ہو کوئی یا ہو طفلِ نونہال

ہاں اگر دنیا میں ملتا ہے کوئی اس کا جواب
وہ ہے اک جامِ خرماں بیکرِ حسن و جمال

محمد جلال الدین
شعبۂ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی
بھاگلپور

گیان چند اور لسانی مطالعے

مشہور ماہرین لسانیات کی صف میں ڈاکٹر گیان چند قابل اعتبار مقام رکھتے ہیں۔ موصوف نے ادبی و تحقیقی دنیا میں خاصی مقبولیت و شہرت حاصل کرلی ہے۔ اس لئے بھی وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ سردست موصوف کی شہرۂ آفاق کتاب "لسانی مطالعے" کی روشنی میں ان کی لسانی خدمت کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ ان کی قدر و قیمت متعین کی جاسکے۔

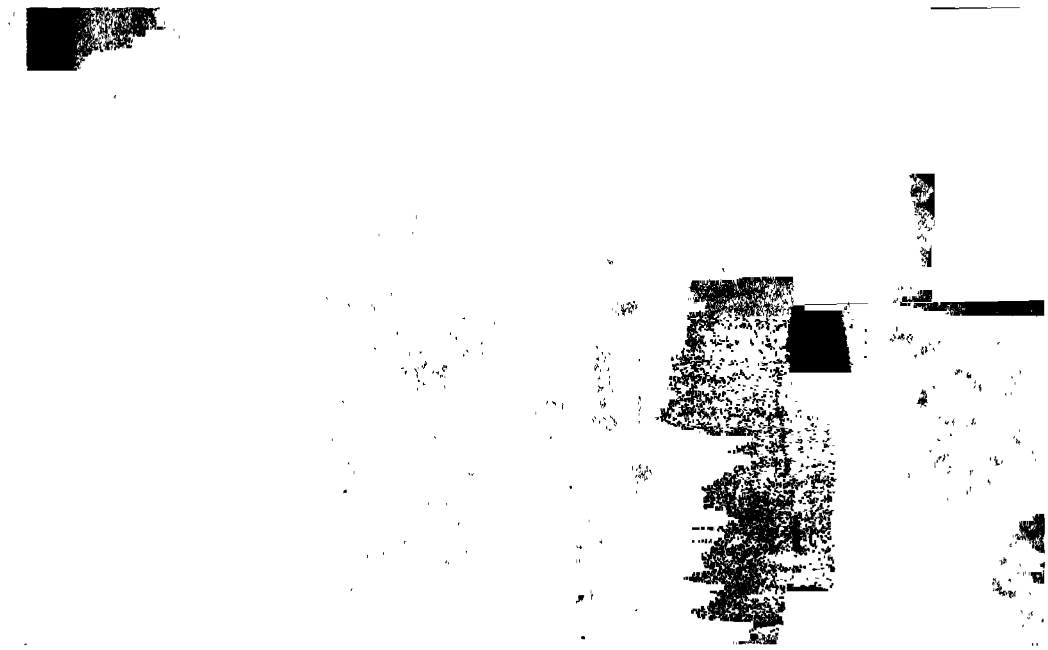
جناب عبدالقادر سروری کی مشہور ترین کتاب "زبان اور علم زبان" کے بعد اگر کوئی کتاب لسانیات کے بیشتر گوشوں کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہے تو وہ صرف گیان چند تصنیف "لسانی مطالعے" ہی ہے۔ حالانکہ زیر نظر کتاب چند قباحتوں سے بری بھی نہیں۔ اس لئے کہ موصوف نے السنۂ عالم کی خاندانی گروہ بندی نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑی سی تشنگی اور ذرا سی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ قبل از مطالعہ کتاب عنوان سے شائقین لسانیات کے دل و دماغ میں امیدیں مچلنے لگتی ہیں کہ مصنف یقیناً اپنے عنوان منتخب کے ساتھ خاطر خواہ انصاف کرے گا لیکن وسیع و عریض مفہوم کے حامل لفظ 'لسانی مطالعے' کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ کسی مکمل اور جامع کتاب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ متعلقہ موضوع کے تمام گوشوں کا سرسری احاطہ و جائزہ ہی نہ لے، بلکہ ان گوشوں کو تفصیل و بسط کے ساتھ واضح بھی کرے۔ ظاہر ہے کہ زیر نظر کتاب اس فرض اور ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکی ہے۔ اس لئے لسانی مطالعے کو جامع اور مکمل کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ یہ لسانیات کے بعض ناگزیر مسائل کو واضح کرنے میں کامیاب ضرور ہوئی ہے۔

پیش نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب عام لسانیات کے نام سے معنون ہے جس کے تحت لسانیات کے مطالعے کی افادیت، زبان اور علم زبان، زبان کا آغاز، اور زبان اور بولی، وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

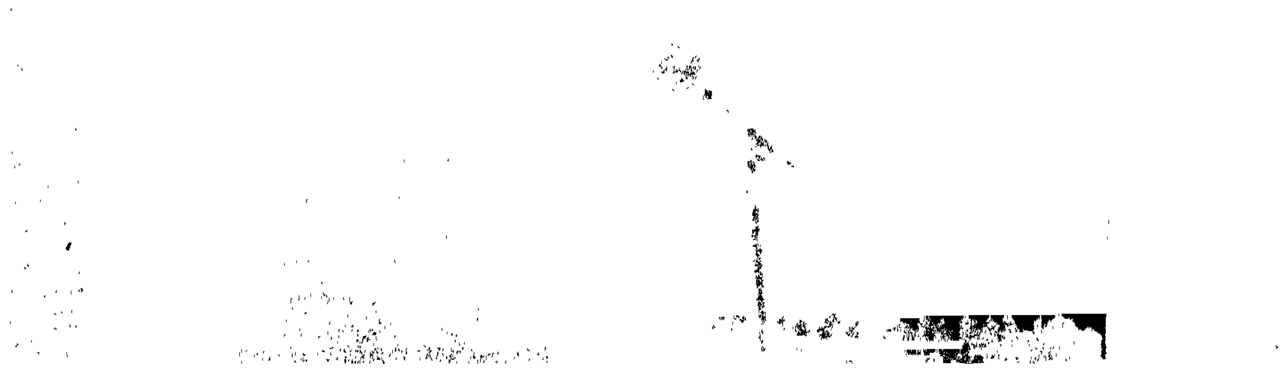
دوسرا باب "صوتیات" کے عنوان سے موسوم ہے۔ اس میں اردو مصوتے، اردو کے جڑواں مصوتے، اردو کی غنائی اصوات، اردو کا صوتی تجزیہ، اردو صوت رکن، اردو میں بل اور زور، اردو عروض اور لفظ کا بل وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تیسرا باب 'فن تحریر' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس کے تحت اردو الفاظ کا رومن املا



گورنر اترپردیش شری محمد عثمان عارف شمع روشن کرکے جشن لکھنؤ تقریبات
[illegible]٦ء کا افتتاح کرتے ہوئے۔

وزیراعلا شری ویر بہادر سنگھ جشن لکھنؤ تقریبات کے موقع پر
اظہار خیال کرتے ہوئے۔





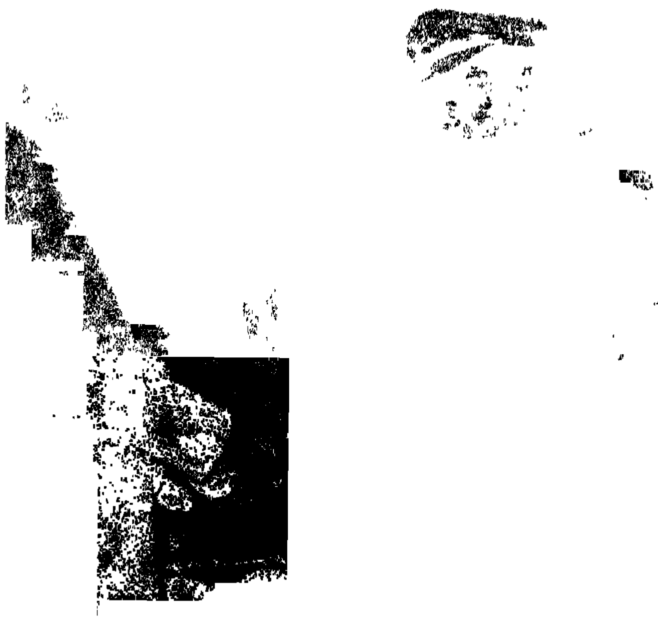
یوم جمہوریہ (۲۶ر جنوری ۱۹۸۶ء)
کے موقع پر گورنر شری
محمد عثمان عارف
راج بھون کے
عصرانے میں معزز مہمانوں
کو خوش آمدید
کہتے ہوئے۔

وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ ۱۶ر جنوری کو اوبرا تھرمل بجلی گھر کے ۱۰ ویں
یونٹ کا افتتاح کرنے کے بعد یونٹ کا معائنہ کرتے ہوئے۔





گورنر اتر پردیش شری محمد عثمان عارف ۱۳ر مارچ ۸۶ء کو راج بھون (لکھنؤ)
میں آندھرا پردیش کی گورنر کمد بین جوشی سے محوِ گفتگو ہیں۔



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ
ایک تقریب میں ایس۔ پی سٹی
(لکھنؤ) شری برج لال کو
سماج دشمن عناصر کی سرکوبی
کے سلسلے میں ان کی نمایاں
خدمات پر اعزاز دیتے ہوئے۔



شری
محمد عثمان عارف اور
وزیر ریاست برائے
جنگلات شری
ظفر علی نقوی
ہوٹل کلارکس اودھ
لکھنؤ میں
غزل گائیکی کے مشہور و
ممتاز فن کار
شری طلعت عزیز کے
فن سے محظوظ
ہوتے ہوئے۔



وزیر اعلا شری ویر بہادر سنگھ
۱۲ر مارچ ۶۸۶ کو پی۔ٹی۔آئی
کی نیوز سروس کا
معائنہ کرتے ہوئے۔



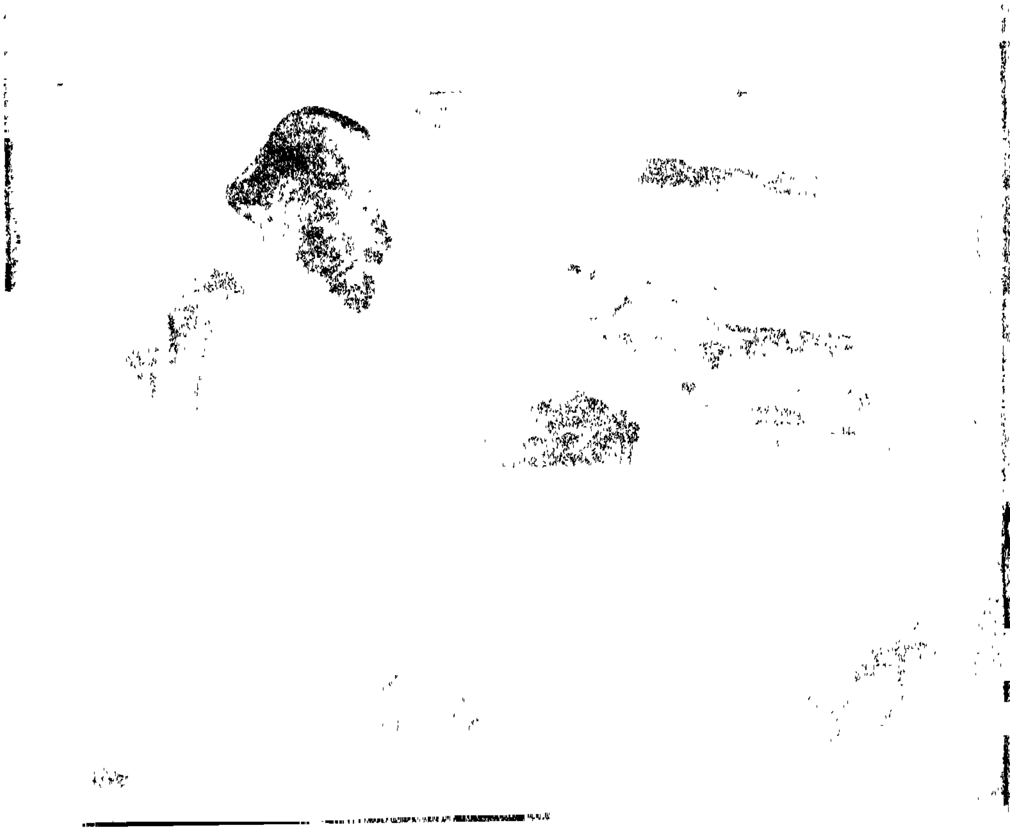
گورنر شری محمد عثمان عارف ۱۲ فروری ۸۶ء کو لکھنؤ میں یوم چکبست کے موقع پر
منعقدہ ایک ادبی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا شری ویر بہاد
۳۰ مارچ ۸۶ء کو لکھنؤ
رائے اوما ناتھ بلی کی
منعقدہ



ریرا اعلا شری ویر بہادر
نگھ لکھنؤ میں این سی
سی کی سالانہ تقریبات
کے موقع پر قابل تعریف
خدمات انجام دینے
والے کیڈٹوں کو انعام
دیتے ہوئے۔



گورنر اڑیسہ شری بشمبھر ناتھ پانڈے
یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی
جانب سے منعقدہ جلسے میں قومی یکجہتی
پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے تصویر
میں وزیر تعلیم شری سید سبط رضی اور
کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر محمد رضوان
علوی بھی نظر آرہے ہیں۔

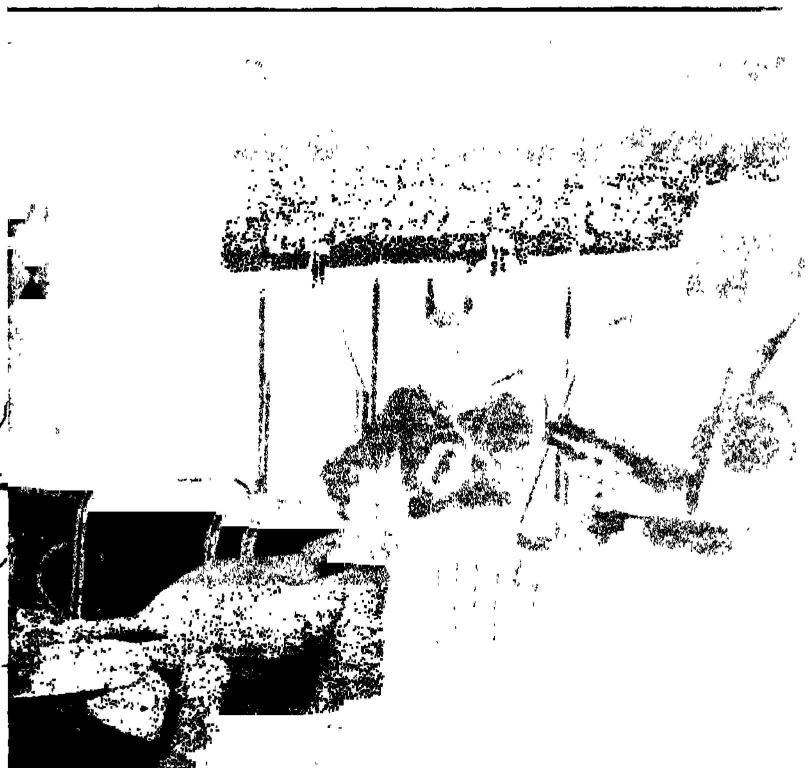


جامعہ فاروقیہ، صبرحد (ضلع جونپور) کی جانب سے
۲۲ مارچ ۸۶ء کو منعقدہ ایک مشاعرے کے مناظر۔ (اوپر کی تصویر میں) شری انیس انصاری (صدر مشاعرہ) اور مہمان خصوصی شری سراج مہدی کلی نظر آ رہے ہیں۔ (درمیان میں) مختلف شعرائے کرام اپنا کلام سناتے ہوئے۔ (نیچے) محظوظ ہوتے ہوئے سامعین۔

گذشتہ دنوں لکھنؤ میں منعقدہ ایک تقریب میں مشہور اردو شاعر شری نذیر بنارسی کو اعزاز دیا گیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔ جس میں ممتاز ہندی ادیب شری امرت لال ناگر شری نذیر بنارسی کو شال اڑھاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔



گورنر پانڈیچری شری ترکبھون پرشاد تیواری کی لکھنؤ آمد پر ان کے اعزاز میں منعقدہ شعری نشست
کا ایک منظر۔ تصویر میں شری حیات وارثی، شاہجہاں بانو یاد، اور ایڈیٹر نیا دور بھی نظر آرہے ہیں۔



لانا محمد علی جوہر اکاڈ
ے ۲۴ جنوری ۹۶
رام پور میں منعقدہ
ایک منظر

(تصویربہ شا یہ

اردو رسم الخط کی اصلاح اور مشترک رسم خط وغیرہ کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔

چھٹا باب 'زبان اور بولی' ہے جس کے تحت اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ، اردو اور ہندی زبان کا مسئلہ، مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال اور بھوجپالی اردو وغیرہ کے ضمن میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے

ساتواں اور آخری باب 'تبصرہ' ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات، اصطلاحات، انگریزی سے اردو، اردو سے انگریزی اور کتابیات کو شامل کیا گیا ہے۔

آئیے اب ہم اس کتاب کی قدر و قیمت متعین کریں گیان چند نے پیش تظر کتاب کے پہلے باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کی بڑی اہمیت ہے۔ لسانیات جیسے خشک اور دماغ خراش (تقریباً عام خیال یہی ہے) موضوع کی تفسیر و تشریح میں دل نشیں انداز تحریر اختیار کیا گیا ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں منطق و دلیل کے ذریعہ سے موصوف نے لسانیات کی افادیت و اہمیت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ اور اردو لسانیات کی کم مائیگی پر اظہار تاسف بھی کیا ہے۔ بہرکیف، انھوں نے اپنے موضوع کی صراحت میں سہل، آسان اور روا دواں زبان کو ترجیح دی ہے انھیں بخوبی معلوم ہے کہ علم زبان، زبانوں کے واضح خد و خال اور انکے تدریجی ارتقار کو تاریخی و تقابلی پس منظر میں واضح کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے گوناگوں مسائل کا حل لسانیات ہی سے تلاش کیا جاسکتا ہے چنانچہ لسانیات کی اہمیت و ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے موصوف ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"مولیر کا ایک کردار چالیس سال تک نثر میں باتیں کرتا رہا۔ جب اسے نثر کی تعریف بتائی گئی تو حیران ہوا کہ جس چیز کو چالیس سال سے استعمال کر رہا ہے، اس سے واقفیت بھی نہ تھی۔ ہم سب بھی زبان کو ایک عمر سے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم تو مولیر کے کردار کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم زبان کے بارے میں نہ صرف جانیں بلکہ اس کے درول کے عارف بھی ہو جائیں زبان کے اس عرفان کے عمل کو لسانیات کہتے ہیں اور اس کے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔"

موصوف نے آگے چل کر زبان اور علم زبان کے باب میں زبان کی ماہیت اور لسانیات کے مختلف مقاصد و اغراض پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف شاخوں اور شعبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لسانیات کی شاخوں کے ضمن میں اب تک اردو کے ماہرین لسانیات آپس میں متفق نہ تھے۔ ان کے درمیان چند غلط فہمیوں کو نشو و نما پانے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن گیان چند نے ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور عبدالقادر سروری کی کتاب 'زبان اور علم زبان' کو لیجئے۔ اس میں مصنف نے تاریخی لسانیات اور تقابلی لسانیات کو لسانیات کی شاخوں میں شامل کیا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں لسانیات کی قسمیں ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب

ہیں۔ دلال کے باہمی فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے
ہیں۔

"تاریخی لسانیات کے تحت کسی زبان
کے سابق ارتقاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
تقابلی لسانیات زبانوں کی خاندانی
گروہ بندی کرتی ہے۔"

گیان چند نے تاریخی لسانیات کے ضمن میں جو خیال پیش کیا ہے اس میں تو وہ حق بجانب ہیں لیکن ان کا یہ خیال کہ تقابلی لسانیات زبانوں کی خاندانی گروہ بندی کرتی ہے، محض تصویر کے ایک رُخ کو روشن کرتا ہے۔ اس لئے کہ تقابلی لسانیات کے تحت قدیم و جدید زبانوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے اس طرح تقابلی لسانیات، تاریخی اور ہم عصر لسانیات کی درمیانی کڑی کا نام ہے۔

کتاب کے پہلے ہی باب میں موصوف نے زبان کی پیدائش و آغاز کے نظریات کی صراحت پیش کی ہے۔ زبان کی پیدائش کے نظریات کی تفصیلی پیش کش میں انھوں نے وسیع مطالعہ اور غایت درجہ کی دقت نظر کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ویسے یہ موضوع اردو زبان میں لسانیات کے موضوع پر مشتمل کتابوں کے لئے کوئی ندرت نہیں رکھتا۔

زبان کی پیدائش کے نظریات کی توضیح کے بعد موصوف نے زبان اور بولی کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس امر میں متعدد مثالیں اور دلیلیں بھی دی ہیں۔ موصوف ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"بولی انسان کی بنیادی ضرورتوں، ہوا،
پانی، سادہ خوراک کی طرح ہے۔ معیاری
زبان ہماری ان ضروریات کی طرح ہے
جو تہذیب نے پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً
ریل، بجلی، ابتدا میں آسائش رہی ہوں
گی لیکن اب ان کے بغیر زندگی مشکل
ہے۔ ادبی زبان ان آسائشوں کی
طرح ہے جو خواص کے لئے ہوتی ہیں۔ مثلاً
موٹر، ٹیلی فون، قصر و ایوان تہذیب کے
فروغ کے لئے ان سبھی کی ضرورت ہے"

اس طرح موصوف زبان اور بولی کے باہمی فرق کو واضح کرتے ہیں اور مثالیں بھی دیتے ہیں۔

دوسرے باب میں مصنف نے لسانیات کی ایک ناگزیر شاخ یعنی صوتیات سے متعلق سیر حاصل خامہ فرسائی کی ہے۔ اس نے صوتیات کی تشریح و تصریح تو کی ہے لیکن کلامی اصوات (Speech Sounds) کی نشاندہی کرنے کے لئے اعضائے تکلم یا اعضائے صوت کا خاکہ نہیں پیش کیا ہے چنانچہ اس منزل پر تھوڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہرصورت، صاحب کتاب نے بہت ہی دیدہ ریزی اور محنت و کاوش سے اردو صوتیات کے مختلف گوشوں کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں جدید صوتیات کے متعلق ان کی بحثیں ناکام معلوم ہوتی ہیں۔ بہرکیف، انھوں نے اردو مصوتوں اور مصمتوں کے ضمن میں فکر انگیز خیالات پیش کئے ہیں اور ان کی وضاحت کے لئے مختلف خاکوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ موصوف بعض مصوتوں (Vowels) کے ضمن میں ایسی نادر باتیں پیش کرتے ہیں کہ قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مثلاً (اے) اور (او) کے بارے میں سوال پیدا کیا گیا ہے کہ آیا یہ دونوں واحد مصوتے ہیں یا مزدوج مصوتے؟ موصوف ان دونوں مصوتوں کے باب میں فیصلہ

صادر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ـــ

"جڑواں مصوتے کا تلفظ کرتے وقت اعضائے نطق ایک مصوتے سے ابتدا کرتے ہیں اور پھسل کر دوسرے مصوتے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں آوازیں ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا کی جاتی ہیں۔ جڑواں مصوتے کا تلفظ اگر دیر تک جاری رکھا جائے تو پہلے مصوتے کی آواز ابتدا ہی میں ختم ہو جائے گی اور آخری مصوتہ جاری رہے گا۔ مثلاً 'آئی' یا 'اُئی' کو اگر دیر تک جاری رکھیں تو محض اِی کی آواز سنائی پڑے گی یعنی جڑواں مصوتہ سالم حیثیت میں دیر تک ادا نہیں کیا جا سکتا۔ 'اے اور' آو' کو ہم کتنی ہی دیر تک کھینچ کر بول سکتے ہیں اور ہر موقع پر ان کا پورا تلفظ سنائی دے گا۔ اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ 'اے' اور 'او' واحد مصوتے ہیں۔"

لیکن ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے مضمون 'اردو صوتیات کا خاکہ' میں 'اے' اور 'او' کو دوہرے یا جڑواں مصوتہ قرار دیا ہے۔ اس طرح ان دونوں مصوتوں کے ضمن میں علمائے لسانیات کے درمیان ابھی تک اختلافِ رائے ملتا ہے۔

اردو مصمتوں (Urdu consonants) کے بارے میں بھی گیان چند صاحب نے خاصی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور ان کو مصمتی خوشے (consonantal cluster) کے سہارے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مصمتی خوشے کی ترتیب میں موصوف نے ڈینیل جونس (Daniel Jones) کی کتاب 'An Outline of English Phonetics' سے خاص طور سے استفادہ کیا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ موصوف نے مذکورہ کتاب کی روشنی میں اردو مصمتوں کی نشاندہی کی ہے اور پھر ان کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

تیسرے باب میں فن تحریر کے تحت اردو الفاظ کا رومن املا' اردو رسم الخط کی اصلاح اور مشترک رسم خط پر کامیاب بحث کی گئی ہے لیکن یہاں بھی ایک کمی کھٹکنے لگتی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے فن تحریر کے آغاز و پیدائش کے ضمن میں روشنی نہیں ڈالی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ رسم تحریر کے آغاز و ارتقار کی روشنی میں اس کی قسموں پر بھی تفصیلی بحث کرتے۔ اس کے بعد اردو رسم الخط کے ضمن میں اظہار خیال کرتے۔ لیکن اتفاق کہئے کہ ایسا نہ ہوا۔ بہرکیف ان کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے اردو رسم الخط کی اہمیت و مقام کو منظر عام پر لانے کے لئے مدلل اور تجزیاتی انداز تحریر کو فوقیت دی ہے۔ ایسے حضرات جو اردو زبان کے لئے دیوناگری اور رومن رسوم تحریر کی حمایت کرتے ہیں ان کے لئے گیان چند صاحب کے فن تحریر کے ماتحت آنے والے مضامین کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے ایسی صورت میں ان کی بہت ساری غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔

چوتھے باب میں اردو ہندی کے لسانیاتی رشتے اردو اور ہندی کے باہمی فرق' زبان کا مسئلہ' زبان اور بھاشا کے ضمن میں مہاتما گاندھی کے خیالات اور بھوپالی اردو کی ساخت و ہیئت وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان موضوعات کی پیش کش میں مضمون

نے بڑی محنت و کاوش کا ثبوت پیش کیا ہے انھوں نے زبان اور مسائل زبان کی توضیح میں تجزیاتی انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ اور یہی مناسب بھی تھا۔

پانچویں اور آخری باب میں موصوف نے ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور محی الدین قادری زور کی بوقلموں شخصیت واصلیت کا محاسبہ کیا ہے۔ بعد ازاں لسانیات سے متعلق اصطلاحات کی فہرست پیش کی ہے۔ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی لسانی اصطلاحات کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ اور بعض مقامات پر موصوف نے خود ساختہ اصطلاحیں بھی پیش کی ہیں۔

بہرکیف، درج بالا نکات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر گیان چند کو لسانیات سے خاصی دلچسپی ہے۔ ہند و پاک کے متعدد سربر آوردہ جرائد و رسائل میں لسانیات سے متعلق ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور غالبًا اسی ذوق و شوق نے انھیں 'لسانی مطالعے' جیسی مشہور کتاب تصنیف کرنے پر مجبور کیا۔ موصوف کی لسانی خدمات کو اردو دنیا کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

نگار خانہ: (ص ۱۳ کا بقیہ)

ایک سال بعد اُن کا ایک خط ملا اُس میں لکھا تھا کہ تم نے جو مصرعہ پر سیلز میں پڑھا تھا

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

وہی صحیح تھا۔ میں غلط پڑھ رہا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس خط کے ملنے سے میری نظر میں مالک رام کی عظمت کتنی بڑھ گئی "بڑی بات یہ تھی کہ "تحقیق" اور "احتیاط" کے معنی میری سمجھ میں آگئے تھے۔ سچائی کی یہی تلاش مالک رام کی نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسے چاہے آپ خلوص کہیں یا لگن، دانش نورانی کہیں یا جذبۂ عشق!

• • •

ماسٹر عبدالمنان صدیقی

خیرآباد

یہ قصبہ ان مقدس ہستیوں کا آستانہ ہے
کہ جن کی عظمتوں کا معترف سارا زمانہ ہے
ہمیشہ یہ رہا ذی مرتبت حضرات کا مسکن
یہاں پر صوفیان ذی شرف کے ہیں کئی مدفن
بڑے مخدوم صاحب کی یہاں درگاہ عالی ہے
گدا کیا شاہ بھی جنکی نوازش کا سوالی ہے
یہاں مقبول انور شاہ ایک درویش کامل تھے
شارعِ ہر دینِ حق تھے اور قرآں کے عامل تھے
فضائل ہوں بیاں کس طرح سے اس شاہِ ذیشان کے
کہ قلبِ پاک تھا جنکا منور نورِ عرفاں سے
یہ خیرآباد وہ ہے جس میں تھے علامہ فضل حق
کہ جن کے ڈر سے انگریزوں کے چہرے ہوگئے تھے فق
دیا فتویٰ انھوں نے تھا یہ برجستہ شریعت سے
نکالو جلد انگریزوں کو اپنے ملک بھارت سے
ریاض و نشتر و کوثر و تسنیم و اختر و مضطر
ہیں افلاکِ سخن کے مہر و ماہ و انجم انور
حکیم انوار کے دستِ شفا کا ہو بیاں کیسے
کہ اپنے دور میں ثانی تھے بقراط و ارسطو کے
مگر اب گردشِ دوراں سے ہے ویران یہ بستی
بلندی دیکھتے ہی دیکھتے اب ہو گئی پستی
بصدقِ دل دعا کرتا ہے یہ منان قدرت سے
خدایا پھر سے گلزار کر دے اپنی رحمت سے

آہٹ

کیوں راہ تکوں میں شام و سحر۔ ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
پُر ہول اندھیری راتوں میں جب کوئی آہٹ آتی ہے
جب کوئل کی بے چین صدا خاموشی میں لہراتی ہے
جب میرے تخیّل کی دنیا کچھ جیسے تڑپ سی جاتی ہے
تب دل کی دھڑکن گھبرا کر یہ بات مجھے سمجھاتی ہے
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر۔ ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
ہر آہٹ پر اٹھ جاتی ہیں بیتاب نگاہیں کیوں آخر؟
بڑھ بڑھ کے ٹھٹک سی جاتی ہیں ترسی ہوئی باہیں کیوں آخر؟
احساس کے نازک ہونٹوں پر جلتی ہوئی آہیں کیوں آخر؟
رہ رہ کے مخاطب کرتی ہیں سنسان یہ راہیں کیوں آخر؟
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر۔ ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
جو چاند ستاروں سے کھیلے اس کے لیے پھر یہ بستی کیا
اے نظمت و وفا کے دیوانے اب تجھ کو خیالِ ہستی کیا
اے دل لاچار بتا اب تیرے لیے ویرانہ کیا اور بستی کیا
تنہائی اپنی رہبر ہے وہ عالمِ کیف و مستی کیا
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر۔ ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
یوں چشمِ تصور میں رقصاں گذرے ہوئے کچھ افسانے ہیں
صہبائے چھلکتے جام بھی ہیں ٹوٹے ہوئے کچھ پیمانے ہیں
کچھ عیش و خوشی کے ساتھی ہیں اخلاص کے کچھ دیوانے ہیں
یادوں کے سنہرے جھرمٹ میں کچھ اپنے کچھ بیگانے ہیں
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر۔ ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
ہر صبح بھی اپنی صبح نہیں ہر شام بھی اپنی شام نہیں
یہ سچ ہے کہ رسمِ الفت کا آغاز تو ہے انجام نہیں
خود اپنی وفا دیوانی ہے یوں چشمِ مروّت عام نہیں
ہے زیست پہ اک افسوں طاری اب ہوش و خرد کا کام نہیں
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر۔ ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
اس عالم کو میں بھول چکی یہ عالم اپنا عالم ہے
اب میں ہوں مری تنہائی ہے اور میرا دردِ پیہم ہے
اب دل کے زخم بھی روشن ہیں ہمدم ہو نہ کوئی محرم ہے
ہاں دل میں کسی کی یاد نہیں کچھ غم ہے نہ کوئی ماتم ہے
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر ہے کون مرا کیوں آئیگا ؟
ہر سمت یہاں خاموشی ہے بیزاری ہے حیرانی ہے!
ہر خواب یہاں ان دیکھا ہے ہر بات یہاں انجانی ہے!
انسانوں کی اس بستی میں غمخوار فقط ویرانی ہے!
یہ مجھ کو کہاں لائی قسمت ہر آنکھ یہاں بیگانی ہے!
کیوں راہ تکوں میں شام و سحر؟
ہے کون مرا؟ کیوں آئیگا ؟

عفت بانو زیبا
کاکوروی

سمیہ
محلہ: سمیران پورہ
... : فیض آباد

اقبال: فلسفۂ خودی سے تصورِ شاہین تک

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

قدرت نے ایک بیقرار روح کو پیغمبروں کا سا دل، فلسفی کا دماغ، قلندرانہ مزاج اور شاعرانہ تخیل عطا کرکے جس پیکرِ خاکی میں جلوہ گر کیا اسے ہم سب اقبال کے نام سے جانتے ہیں ناقدین نے اسے شاعرِ مشرق، شاعرِ اسلام اور حکیم الملت کے لقب سے نوازا ہے۔ مگر مجھ جیسا مبتدی قلمکار نہ جانے کیوں انھیں شاعرِ خودی کے نام سے ہی یاد کرتا ہے۔ اقبال کا فلسفہ دو جملوں میں اس طرح ہے کہ اپنی ہستی پہچان اور اپنی ہستی ثابت کر۔ اسی ہستی سے باخبر ہونے ہی میں قوموں کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر مغربیت کا غلبہ..... ہونے کے باوجود وہ مغربی تہذیب و تمدن، حرکات و سکنات اور زاویۂ فکر و حکمت کے زبردست مخالف تھے۔ کیونکہ انھوں نے مغرب کے ملکوں میں ایک لمبا عرصہ گزار کر تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ـــ کچھ نتائج اخذ کئے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو خودی سے روشناس کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ بقول اقبال خودی عظمتِ آدم کی شناخت کا دوسرا نام ہے جو قرآنِ حکیم کی رہنمائی میں زندگی گزارنے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ مگر انھوں نے مغرب کے تصورِ خودی کی جو غرور و انا، خود نمائی اور خودستائی کی ترجمان ہے سخت مذمت کی ہے۔ وہ مغربی تہذیب و آداب اور طرز و روش سے کافی ملول تھے۔ وہ مشرق کو ایک ایسی خودی سے روشناس کرانا چاہتے تھے جس میں خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ بقول اقبال یہ کائنات انسان کے لئے ہی بنائی گئی ہے اور اس کی چمک و دمک بھی انسان کی ذاتِ گرامی کی ہی بدولت ہے۔ انسان اگر چاہے تو کائنات کو بہت کچھ دے سکتا ہے اور اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس نے کائنات کو بہت کچھ دیا ہے۔ انسان ہمیشہ سربلند رہا ہے اسے کبھی شکست نہیں ہوئی ہے۔ شکست ہمیشہ نظریات و منصوبوں کو ہوتی رہی ہے۔ اقبال نے تو یہاں تک سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر تو میرا نہیں بنتا تو نہ بن مگر اپنا تو بن۔ کیونکہ خودشناسی ہی وہ شے ہے جو انسان کو بصیرت عطا کرتی ہے۔ مگر یہی خودی جب غلط رخ اختیار کرلیتی

ہے تو چنگیز و ہلاکو بن جاتی ہے۔ وہ اپنے سوا کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔ انھوں نے اپنی ہر نظم میں اس بات کو خاص طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ خودی کا راستہ بقا کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اقبال کو خودی کی جلوتوں میں مصطفائی اور خلوتوں میں کبریائی نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں تو انھوں نے خودی کے پردے میں ساری خدائی دیکھ ڈالی ہے۔ بقول اقبال جب انسان کی خودی شام و سحر کے زنداں سے آزاد ہوکر اپنے وجود کی حقیقت سے باخبر ہوتی ہے تو اس وقت انسان دنیوی اور مادی مسائل سے نبرد آزما ہوکر قسطوں میں خودکشی کرنا چھوڑ دیتا ہے اور ایک ہی بار موت کی لذت سے آشنا ہوتا ہے اور وہ موت ایسی موت ہوتی ہے جس پر سیکڑوں زندگیاں قربان۔ اس میں ذوق ابراہیمی اور عزم حسینی کا عنصر جھلکنے لگتا ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

انھوں نے ہمیشہ طوفان سے آشنا ہونے اور اور اپنے بحر وجود میں اضطراب پیدا کرنے کی تلقین کی ہے کہیں کہیں تو اس موج کے غم میں بے ساختہ روئے بھی ہیں جو دریا سے اٹھی اور بغیر طوفان سے ٹکرائے واپس چلی گئی۔ اقبال سکوت کے حصار میں مقید ہونا قبول نہیں کرتے بلکہ وہ طوفان و تلاطم میں اپنی ہستی سے کھیلتے ہوئے تنکے سے سبق لیتے ہیں انھوں نے اپنے بیٹے جاوید کو جو خط لکھا اس میں بھی خودی کی اہمیت اور افادیت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے جاوید کو بھی جج مجسٹریٹ یا اعلیٰ افسر بننے کی صلاح نہ دیکر خودی جیسی بیش قیمت شے کو سمجھنے کی تلقین کی

ترا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

فلسفۂ خودی کے علاوہ اقبال کی شاعری میں جن اور تصورات نے علامتوں کا پیکر اختیار کیا ان میں شاہین کا تصور ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے جرمنی میں انھوں نے اپنے قیام کے دوران جن فکری اثرات کو قبول کیا ان میں نطشے کا فلسفۂ قوت و زندگی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جرمن قوم کی خود شناسی اور خود اعتمادی نے اقبال کے نظام فکر پر ایک گہرا اثر ڈالا۔ جس کا اظہار وہ شاہین ہے جو ان کی فضائے سخن میں محو پرواز ہے

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اس میں شک نہیں کہ جرمن قوم کا تصور شاہین قوت۔ تیزی بلند پروازی اور اس کے مادی نظریہ حیات کا ترجمان تھا۔ لیکن اقبال نے جب اسے اپنایا تو مشرق کی روحانیت اس پر غالب آگئی۔ انھوں نے اپنے شاہین کو خصوصیات مذکورہ کے علاوہ درویشی۔ قلندری اور خودداری کی اعلیٰ صفات سے بھی مزین کیا اور اپنی قوم کے نوجوانوں کے سامنے اسے زندگی کا بہترین نمونہ بنا کر پیش کیا۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
جھپٹنا۔ پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

شاہین کی اس خود بیانی میں لہو گرم رکھنے کا جس انداز سے ذکر آیا ہے اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں خونِ گرم ایک خاص کیفیت' ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

جو کبوتر پہ جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شائد کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اقبال کا شاہین جہاں قوت۔ بلندی پرواز سخت کوشی اور دور بینی کی علامت ہے وہیں بے نیازی اور فقر و انا کا پیکر بھی ہے۔ اقبال کا شاہین فقر کو مردار خوری کی ذلالت آمیز زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور ادنیٰ اغراض کی تکمیل کے لئے اپنی فطرت کو داغدار نہیں کرتا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

الفاظ و معنی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ان اشعار پر نظر غائر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم کا محور فرد کا احساس خود شناسی ہے جو اگر اپنے فطری عروج کو پہنچ جائے تو قوت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

—•—

ایک انٹرویو: (ص ۴۶ کا بقیہ)

قاضی صاحب: نہیں۔

ر۔ غ: آپ کی زندگی کا ایسا کوئی ناقابل فراموش واقعہ جس نے آپ کی زندگی اور شخصیت کو متاثر کیا ہو؟

قاضی صاحب: بیوی کی موت۔

ر۔ غ: اس اندوناک واقعہ سے آپ کافی متاثر ہوئے؟

قاضی صاحب: جی ہاں! میں ان کو چھوڑ کر چھ سال یورپ میں رہ گیا۔ یہ ان کے ساتھ میں نے ظلم کیا جسے انھوں نے برداشت کر لیا۔

ر۔ غ: آخر میں ایسے نوجوانوں کے نام آپ کا کوئی پیغام جن کا تعلق اردو ادب سے ہے؟

قاضی صاحب: ان کو چاہیئے کہ وہ بطور نمونہ ہندستانی شعراء کو سامنے رکھیں اور اگر ممکن ہو تو ایک زبان اور سیکھیں یورپ کی۔ وہ ہے فرانسیسی جو آسان ہوتی ہے نسبتاً دوسری زبانوں کے۔

ر۔ غ: گویا آپ سمجھتے ہیں فرانسیسی زبان سیکھ لینے سے وہ اردو زبان کو اور فروغ دے سکیں گے۔؟

قاضی صاحب: یقیناً۔

ر۔ غ: اور کوئی خاص مشورہ جو آپ نوجوانوں کو دینا پسند کریں۔

قاضی صاحب: وہ یہ کہ اس دنیا میں قدم رکھا ہے تو مصلحت بینی سے کام نہ لیں۔ ایک انگریز کا مشورہ ہے کہ اگر کسی موضوع پر لکھنا چاہتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ حقیقت کے اظہار سے نقصان ہوگا اور نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، تو چاہیئے کہ اس موضوع پر کچھ لکھو ہی نہیں اور اگر لکھو تو آزادی کے ساتھ لکھو جو حقیقت ہو۔ یہی میرا بھی مشورہ ہے۔

••

خالد علوی
جی۔ ایف۔ کالج
شاہجہانپور

عرش صہبائی
آل انڈیا ریڈیو
روہتک

غزلیں

خالد علوی

سُنا ہے جب سے شب و روز تازیانہ لگا
کہ اس کو میرا ہر انداز خسروانہ لگا

تمام زخم تو شبنم کے منتظر تھے مگر
یہ کیا کہ پھول سا لہجہ بھی جارحانہ لگا

یہ میری آخری منزل ہے نامرادی کی
ذرا سا ابر کا ٹکڑا بھی شامیانہ لگا

میں زندگی کو بچانے میں خود ہی ڈوب گیا
کنارِ آب تو اب قیمتِ وفا نہ لگا

فزوں نہ ہو گی تو توقیر کم نہیں ہو گی
نئی کتاب میں کوئی ورق پرانہ لگا

میں سخت جان پرندہ ہوں زندگی تو بھی
کماں سنبھال کے اک بار پھر نشانہ لگا

یہ میرے شہر کو کیا ہو گیا بتا علوی
سفر سے لوٹا تو ماحول ساحرانہ لگا

عرش صہبائی

بکھر کر رہ گئی ہیں انجمن آرائیاں کیا کیا
پڑی ہیں زندگی پر وقت کی پرچھائیاں کیا کیا

نہ جانے زندگی کی کونسی منزل ہے یہ آخر
کسی کے روبرو رہ کر بھی ہیں تنہائیاں کیا کیا

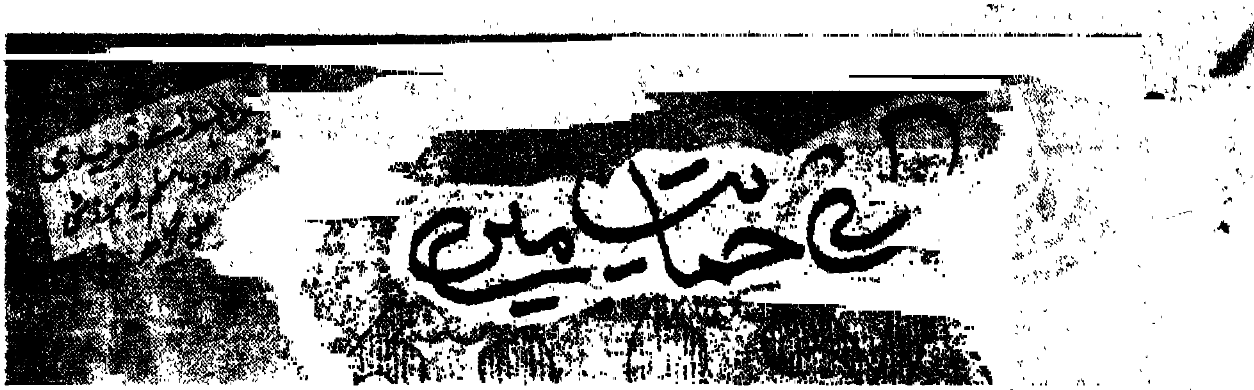
اسے دھن ہے سمندر کی تہوں کو چھو سکے جا کر
مگر ان خشک آنکھوں میں بھی ہیں گہرائیاں کیا کیا

مجھے جب بھی نوازا اس نے زیرِ لب تبسم سے
فضاؤں میں بکھر کر رہ گئیں رعنائیاں کیا کیا

گماں کچھ اور ہی ہوتا ہے چہرے کے تاثر سے
مگر نظروں نے کی ہیں حوصلہ افزائیاں کیا کیا

کبھی حق گو کبھی بے باک گردانا گیا مجھ کو
مرے دامن سے وابستہ رہیں رسوائیاں کیا کیا

میں گہری نیند سے اے عرش اکثر چونک اٹھتا ہوں
پلٹ جاتی ہیں ماضی کے ورق پروائیاں کیا کیا



اردو شاعری میں غزل سے زیادہ خوبصورت، بدصورت، خوش نصیب، بدنصیب، محبوب و مرغوب، مظلوم و معتوب، کوئی دوسری صنف سخن نہیں۔ اس کے موضوعات، ہیئت اور مزاج سے کلی یا جزوی طور پر کم و بیش بدظن نظر آنے والوں میں ایک طرف تو ہمیں حالی، وحید الدین سلیم، عظمت اللہ خاں، جوشؔ، عندلیب شادانی اور کلیم الدین احمد نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اس کی رمزیت، اشاریت، داخلیت، کیفیت، عمومیت، غنائیت اور دلکشی پر ایک عالم سر دھنتا دکھائی دیتا ہے۔

حالی نے غزل کے "ناپاک دفتر" کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر کہا اور فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا کہ "زمانہ بآواز بلند پکار رہا ہے کہ یا تو اس عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت ہی نہ رہے گی —" انھوں نے حسن و عشق کے معاملات، فرسودہ مضامین کی تکرار، مخرب اخلاق مضامین و خیالات کے بیان اور قافیہ و ردیف کی پابندیوں پر خاص طور سے اعتراض کیا۔ عظمت اللہ نے غزل کی گردن بلا تکلف اور بے تکان "ماردینے" کا مشورہ دیا۔ اور خیال کے گلے سے قافیہ و ردیف کا پھندا نکال پھینکنے پر زور دیا۔ جوشؔ نے غزل کے موضوعی انتشار کو اعتراض کا نشانہ بنایا اور "غزل مسلسل" کو رواج دینا چاہا۔ عندلیب شادانی نے "دور حاضر اور اردو غزل" کے عنوان سے تنقیدی مضامین لکھے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" میں غزل کے "داماں نگہ" کی تنگی اور خیالات کی بے ربطی کا شکوہ کیا۔ اسے نیم وحشی صنف سخن کہا۔ غزل پر اعتراضات کی فہرست کافی طویل ہے۔ ساتھ ہی اس کے دفاع میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

حالی اردو غزل کے پہلے ناقد ہیں لیکن ان کے اعتراضات پر غور کرنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ انھوں نے غزل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ دراصل اصلاحی محرکات کے تحت تھے۔ سرسید ہی کی طرح حالی بھی ادب اور شاعری سے زندگی کو سنوارنے کا کام لینا چاہتے تھے۔ جب ہی تو انھیں یہ شکایت تھی کہ غزل بے کاروں کا مشغلہ ہے۔ لیکن اگر رابرٹ فراسٹ کے خیال اور آل احمد سرورؔ کے الفاظ میں یہ سچ ہے کہ "اچھی شاعری مسرت سے شروع ہو کر بصیرت پر ختم ہوتی ہے"۔ تو غالباً یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "بے کار   کا یہ مشغلہ" احساس جمال کی ترسیل کا بہت بڑا وسیلہ ہے۔ ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی ادب میں مقصد کو زبردستی ٹھونسا گیا تو ادب ادب نہ رہا پروپگنڈہ بن گیا۔

حالی کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ غزل کے موضوعات محدود ہیں۔ حالانکہ جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو اپنی زمانے میں غالبؔ غزل کے موضوعات کو وسعت دے کر یہ ثابت کر رہے تھے غزل میں تو ہر قسم کے موضوعات کی گنجائش ہے۔ پھر اقبال ہمارے سامنے آتے ہیں اور جدید غزل تو ہمارے سامنے ہے ہی۔ بھلا ایسی صورت میں ہم اس اعتراض کو صحیح کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدا میں غزل میں حسن و عشق، غم و اندوہ اور ہجر و وصال ہی کی باتیں زیادہ تر ہوئی ہیں لیکن اس دور کی

غزل کو بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اپنے محدود موضوعات کے اندر لامحدود نظر آتی ہے۔ اس پردے میں ہمارے شعرا نے جذبوں کی تہہ در تہہ نقاب کشائی میں جو کمال دکھایا ہے کیا وہ بذاتِ خود قابلِ تعریف نہیں؟ پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ انسانی زندگی میں حسن و عشق اور مختلف احساسات، جذبات و کیفیات کی جو اہمیت ہے کیا اس سے مفر ممکن ہے۔ اگر غزل نے ان جذبوں کی ترجمانی کی ہے تو کیا برا کیا۔؟ غزل کی مقبولیت کی ایک وجہ اس کے یہ موضوعات ہی تو ہیں۔ غزل کی تو خمیر میں عشق کا جذبہ اور شباب کی سرمستیاں شامل ہیں اس کے لغوی معنی ہی حسینوں سے گفتگو یا حسینوں کے بارے میں گفتگو کرنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غزل نے اپنے آپ کو اس دائرے میں محدود نہیں رکھا۔ ویسے بھی عشقیہ مضامین کے اظہار کے لیے غزل سے بہتر کوئی صنف نہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اردو شعر و ادب میں خیالات کے اظہار کے لیے اور بھی بہت سی اصناف ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے مضامین کے لیے ان کو استعمال نہ کیا جائے۔

ایک بات یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ غزل میں ہر جگہ حسن و عشق سے مجازی ہی مراد نہیں ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں عشقِ حقیقی کا جو تصور خدا اور بندے کے تعلق سے صوفی کے ذہن میں تھا وہ غزل میں عاشق و محبوب کی علامت بن کر آیا آگے چل کر یہ علامتیں غزل کے مزاج میں کچھ اس طرح رچ بس گئیں کہ ان کے پردے میں دنیا بھر کی باتیں کہہ دی گئیں۔

غزل پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس کا محبوب جنس مذکر کیوں ہے اس کے جواب میں کئی باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ شعرا متقدمین نے عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ قرار دیا تھا لہٰذا جنسی وابستگی کے تصور سے بچنے کے لیے فعل مذکر کا استعمال عام ہوا۔ دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ مشرقی آداب کے تحت پردہ داری سے کام لیا گیا ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ بعض ایسے مقامات پر بھی جہاں محبوب بلاشبہ طبقۂ نسواں سے ہے، فعل مذکر یا صفت مذکر کا ہی استعمال ہوا ہے مثلاً یہ شعر ؎

کیا خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

تیسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ چونکہ اردو شاعری نے بھاشا سے کسبِ فیض کیا اور وہاں فعل مذکر کا چلن تھا لہٰذا یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ غزل اشاروں کی زبان ہے لہٰذا تخاطب میں عمداً ابہام کی کیفیت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ لیکن سب سے اچھی بات تو وزیر آغا نے کہہ دی کہ "فی الواقع غزل کا محبوب تذکیر و تانیث سے ماورا ہے"۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اردو غزل کا محبوب روایتی ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ شعرا نے عشق کے جذبہ کو جس وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا تقاضا ہی تھا کہ غزل کا محبوب ہر شاعر کا مشترکہ اثاثہ بن جائے اور اس طرح معشوق کا لفظ گوشت و پوست کے کسی پیکر سے وابستہ ہونے کے بجائے ایک ایسی علامت بن کر سامنے آئے جس کے آئینہ میں میر کا محبوب اور نظر آئے، غالب کا کچھ اور، اقبال کا اس سے الگ اور فیض کا اس سے الگ۔ دراصل غزل کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے غزل کا شاعر زندگی کا ایک واقعہ نہیں بیان کرتا بلکہ ایک طرح کے کل واقعات بیان کر دیتا ہے۔ اس کے لیے وہ مخصوص قسم کے الفاظ ایک خاص انداز سے استعمال کرتا ہے۔ لوگ گل و بلبل، ہجر و وصال، رقیب و رفیق، رہبر و رہزن، میخانہ و مسجد، شیخ و برہمن، ناصح و رند اور اسی طرح کے سینکڑوں الفاظ کی تکرار پر اعتراض تو کر دیتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ تمثیلی الفاظ کلام میں عمومیت، تہہ داری، ہمہ جہتی، تاثیر، اختصار اور جامعیت پیدا کرنے میں کس قدر معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ غزل کا شعر کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

غزل کی ہیئت پر بھی بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں حالی نے کہا کہ غزل کے اندر قافیہ کی پابندی ہی کیا کم تھی کہ اوپر سے ردیف کا دُم چھلّہ لگا لیا۔ قاضی عبدالودود نے کہا کہ غزل کا شاعر تو چڑا

ایجور رہتا ہے اس کی تکمیل قافیے کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ قافیہ جدھر چلتا ہے اسے موڑتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے کہا کہ غزل کے شاعر کو الٹا چلنا پڑتا ہے۔ وہ پہلے قافیہ کی فکر کرتا ہے پھر خیال باندھتا ہے اگر ان خیالات کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس سے غزل میں خیال کی ترسیل پر بھی کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

اگر خیال قافیہ کا صد فی صد تابع ہوتا اور شاعر کو مضامین کے انتخاب اور طرز ادا پر اختیار نہ ہوتا تو تمام ہم زمین اشعار ہم مضمون ہوتے یا تمام ہم مضمون اشعار یکساں اثر اور دلکشی کے حامل ہوتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ایک ہی بات میر کی زبان سے کچھ اور طرح ادا ہوتی ہے۔ غالب کے منھ سے کچھ اور مزہ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر شاعر کا جداگانہ ایک مخصوص رنگ سخن اور اسلوب ادا ہوتا ہے وہ خود بھی اس حقیقت کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حالی کے اعتراض کے بعد بھی مردّف غزلیں لکھنے کی تعداد وہی رہی جو پہلے تھی۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ ردیف و قافیہ خیال پر پابندی نہیں لگاتے۔ اس نقطۂ نظر سے مردّف اور غیر مردّف غزلوں کا تقابلی مطالعہ بھی غالباً خاصا دلچسپ ہوگا۔ اور غالباً یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان دونوں میں اظہار کی ترسیل پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اس کے باوجود کوئی ردیف و قافیہ کو پابندی تصور کرے تو جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں غزل کے علاوہ اور دوسری اصناف بھی تو ہیں آپ انہیں اختیار کیجیے اور غزل کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے اور پھر دیکھیے کہ کوئی میرؔ، کوئی دردؔ، کوئی غالبؔ، کوئی حسرتؔ کوئی اقبالؔ، کوئی جگرؔ، کوئی فراقؔ ان پابندیوں کے باوجود اچھا شعر کہتا ہے کہ نہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ غزل میں ترتیب، تہذیب، ربط، وحدت اثر اور ارتقائے خیال کی کمی ہوتی ہے۔ چنانچہ کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن سے تعبیر کیا۔ اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ بقول رشید احمد صدیقی۔ "غزل ریزہ کاری میں مینا کاری ہے" جب اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہے تو پھر معنوی تسلسل کی تقاضا بے معنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل میں محذوفات بہت ہوتے ہیں لیکن ہر اچھے شعر میں یہ محذوفات بس ایسے ہی ہوتے ہیں کہ درمیانی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جاتی ہیں۔ غزل کا یہ اختصار بقول وزیر آغا: "غزل کا نقص نہیں، اس کے مزاج کی ایک کیفیت ہے"۔ انگریزی زبان کے شعرا نے اپنے کلام میں قصداً ابہام پیدا کیا ہے۔ غزل میں یہ چیز خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ویسے یہ بھی نہیں کہ غزل میں وحدت اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ اقبال کی بہت سی غزلوں میں ارتقائے خیال موجود ہے۔ اکبر کی سیاسی غزلوں اور غالب کی بعض غزلوں میں ایک مخصوص موڈ اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے جو کہ فطری ہے اگر زبردستی تسلسل بیان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسی غزل کا وہی حال ہوگا جو جوشؔ کی "غزل مسلسل" کا ہوا۔

اردو غزل پر فارسی شاعری کی بے جا تقلید کا بھی الزام ہے۔ تو اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کہنا ہے کہ شروع میں ہر زبان دوسری زبان سے اثرات قبول کرتی ہے اسے استفادہ کہتے ہیں، نقالی نہیں۔ اردو کے شعرا متقدمین فارسی کے مذاق سے آشنا بلکہ ان میں سے اکثر خود فارسی کے شاعر تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اردو غزل پر اثر پڑنا ہی تھا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ فارسی غزل نے سینکڑوں سال میں ارتقا کی جو منزلیں طے کی تھیں، اردو غزل نے برسوں میں طے کر لیں۔ اور اس طرح بقول اختر انصاری۔ "اردو شاعری کی ابتدا فارسی شاعری کی انتہا سے جا ملی"۔ واضح ہو کہ ہم نے فارسی سے غزل کی صنف لی ہے "جذبے مستعار نہیں لیے ہیں"۔ رہ گئی بات ایرانی تشبیہات و استعارات اور تلمیحات سے فائدہ اٹھانے کی تو سر دست بس اتنا کہنے کی اجازت دی جائے کہ گل و بلبل، نرگس و سنبل کے ساتھ جو خیالات و تصورات وابستہ ہو گئے ہیں انھوں نے جغرافیائی حدود کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب ان سے ذہنی قربت ہی کافی ہے دیکھنے نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

● ● ●

پیرزادہ سید اباد جعفری
تہ، نینی تال ۔

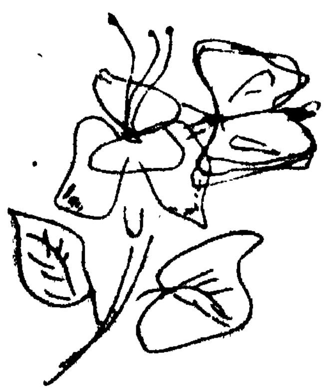
جسم و جاں خود اک حقیقت جیسے آنکھیں اور افق
اک حقیقت اور بھی ہے جسم و جاں سے ماورئی

ذات کی مغرور تہ میں اک سمندر موجزن
کعبۂ ہائے گوش و لب حرفِ اذاں سے ماورئی

محوِ استغفار ہونے کے سوا چارہ ہی کیا؟
دامنِ حرص و ہوس امن و اماں سے ماورئی

بس خدا حافظ ہے ان کا ناخدا کوئی نہیں
زندگی کی کشتیاں ہیں بادباں سے ماورئی

خوف و دہشت کا جزیرہ آسماں سے ماورئی
آدمی خود اپنے سر کے سائباں سے ماورئی



جمیل قریشی
رانا پرتاپ نگر ادے پور
راجستھان

قطرۂ خون جگر اس دیدۂ تر سے نکل
اے گرانمایہ گہر گہرے سمندر سے نکل

در پہ دستک دے رہا ہے کب سے شہرِ بے چراغ
آفتابِ صبحِ روشن رات کے گھر سے نکل

پھن اٹھائے گھومتے ہیں ناگ سارے شہر میں
اے عصائے صد امانِ دستِ پیمبر سے نکل

بزدلوں کی بھیڑ میں کھو دے گا اپنے آپکو
تو بہادر ہے تو پھر مغلوب لشکر سے نکل

ایک ہی چہرے سے اب ملتا نہیں دل کو سکوں
چھین لے آنکھیں مری یا پھر میرے پیکر سے نکل

کب تلک باتیں کروں گا وہ گراں سے اے جمیل
اپنا پیکر سامنے لا اب تو پتھر سے نکل

ریاض سیلاو، چودھری
جگاگر (ہریانہ)

ہو گئے کتنے دور وطن سے
ساتھ رہا جنکا بچپن سے

ہلکی سی اک ضرب لگی تھی
ٹوٹ گیا آئینہ چھن سے

پارہ سا بیکل رہتا ہوں
ذہنوں کے آوارہ پن سے

اپنی مٹھی میں رکھئے گا
ہاتھ آیا جو لاکھ جتن سے

کاش ریاض اپنا پن ملتا
لمحوں کے سوتیلے پن سے

سید صفدر امام رضوی
شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

رشید احمد صدیقی

بہ حیثیت مرقع نگار

رشید احمد صدیقی نہ صرف ایک متنوع شخصیت کے مالک ہیں بلکہ ان کی جامع شخصیت اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ان کے قلم کی جادوگری طلسم کے دروازے کھول دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ کہیں انھوں نے شعر و ادب کے خام مواد حاصل کرکے طنز و ظرافت کے حسین اور دلکش گل بوٹے کھلائے ہیں تو کہیں انھوں نے زورِ قلم کو متوازن رکھ کر انشائیہ کو جلا بخشی ہے تو کہیں خاکہ نگاری کے فن میں شخصیات، مکمل اور واضح بنا کر ڈھال دیے ہیں اور کہیں تنقید کے مسائل اور نظریے پر غور و فکر کرکے رموز و نکات پیش کیے ہیں۔

آپ ایک اعلیٰ ظرافت نگار، ایک اچھے انشائیہ داز اور ایک تنقید نگار کے علاوہ ایک کامیاب مرقع نگار بھی ہیں۔ آپ کی آخری تصنیف "ہم نفسانِ رفتہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ تصنیف سات مرقعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کندن کے علاوہ ملک کی عظیم شخصیتوں کا نہایت سنجیدہ اور باوقار انداز میں مرقع پیش کیا گیا ہے اور اپنی قادرالکلامی سے ان تمام مضامین کے اندر ایک نئی روح ڈال دی ہے۔ ذیل کے مضمون میں ہم ان کی مرقع نگاری پر روشنی ڈالیں گے۔

مرقع نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو اسیر کرنا پڑتا ہے اور پوری شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے چند اہم اور خیال افزا خاکوں کے نمایاں اور نمائندہ نقوش کا انتخاب کرنا ہوتا ہے تاکہ شخصیت کے تیکھے اور واضح نقوش مکمل طور پر ابھر سکیں۔

مرقع نگاری دراصل تاریخ اور سوانح ہی کی ایک شاخ ہے لیکن اس کے مبحث کا دائرہ 'فرد' ماحول اور دوسرے وسیع عنوانات تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں کردار، نفسیات اور ان عوامل سے بہت کم گفتگو کی جاتی ہے جو شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس صنف کی طرف خصوصی توجہ سب سے پہلے دبستان علی گڑھ اور شبلی کے مکتبۂ فکر نے کی۔ علامہ شبلی کے عزیز ترین شاگرد سید سلیمان ندوی نے "معارف" میں "وفیات" کے عنوان سے ہندوستان کے مشاہیر کی شخصیتوں کے جو خاکے لکھے ہیں وہ ان کی مرقع نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ مگر سید صاحب کے خاکوں میں کردار نگاری اور نفسیاتی تحلیل و تجزیے کی کوشش بہت کم نظر آتی ہے۔ وہ صرف ایسی باتوں کے قائل ہیں جس سے دل میں عظمت و عقیدت قائم ہو۔ مثلاً شبلی کے متعلق لکھتے ہیں:-

"..... ہندوستان کی آغوش کا آخری فرزند وہ تھا جو عبدالحق بھی تھا اور شاہ ولی اللہ بھی۔ ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی۔ محب اللہ بھی تھا اور آزاد بھی کم از کم وہ یگانہ تھا ان لوگوں میں

سے اکثر کے برابر اور مجموعاً ان سے اکثر سے بہتر تھا..."

سید صاحب کی مرقع نگاری خطیبانہ انداز کے ساتھ عقیدت و احترام کے جذبے سے مملو ہے۔ اس لیے شبلی کی شخصیت کے تمام گوشوں تک ہماری نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں اور سید صاحب کی مرقع نگاری شخصی تاثرات کی ترجمان بن کر رہ گئی۔ یہ خصوصیت صرف رشید احمد صدیقی کی ہے کہ ان کی مرقع نگاری میں مصوری کی قوت کارفرما ہے اور بہترین ادبی شہ پارہ وہی ہوتا ہے جس میں مصورانہ قوت پوری طرح کارفرما ہو۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادیبوں کی مصورانہ جھلک ان کی مرقع نگاری میں بھی ملتی ہے رشید احمد صدیقی کو مرقع نگاری میں جو مہارت حاصل ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ مرقع نگاری کے فن میں اردو ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی ادبی شخصیت و شہرت کا بہت بڑا راز انکی مرقع نگاری میں پنہاں ہے۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے عہد کے مشاہیر علم و ادب کی شخصیتوں کے خاکے پیش کئے ہیں ان میں بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے علی گڑھ سے تعلق رہا ہے۔ بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو علی گڑھ کے مکتبۂ فکر کے پروردہ نہیں لیکن شہرت و عظمت کے لحاظ سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً سید سلیمان ندوی، بطرس بخاری، علامہ اقبالؒ اور ابوالکلام آزاد۔ یہ لوگ ہیں جو علی گڑھ سے وابستگی نہیں رکھتے لیکن نہال اردو کی آبیاری کی جو تحریک علی گڑھ نے چلائی تھی اس کے معاون بالواسطہ ضرور تھے ورنہ رشید احمد صدیقی صاحب کے اکثر خاکے انھیں لوگوں کے متعلق ہیں جو علی گڑھ کی روایات کے سانچوں میں ڈھلے ہیں۔ اسی قربت اور وابستگی کی بنا پر وہ کامیاب مرقع نگاری کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ مقامی رنگ اس میں بہت نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خاکوں میں کردار کی جو تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص ماحول سے ہوتا ہے۔ یہ ان کی خوبی اور خامی دونوں ہے خوبی اس لیے کہ مرقع نگاری کے لیے صرف ذہنی وابستگی کافی نہیں ہے بلکہ ذاتی واقفیت اور مشاہدہ بھی ضروری ہے اور رشید احمد صدیقی صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ان شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے جن کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ سمجھا اور برتا بھی ہے۔ اسی لیے ان کی مرقع نگاری میں بحث کا ہیجان بھی ہوتا ہے اور شخصیت کا عرفان بھی تاثرات پر سوز و گداز جملوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب وہ کسی مرحوم شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے بہت سے کامیاب خاکے لکھے ہیں مگر میری نظر میں انکے بہترین خاکے مولانا سلیمان اشرف، کندن اور ذاکر صاحب ہیں ان خاکوں سے شخصیت کے پرکھنے کا وہ مخصوص انداز ظاہر ہوتا ہے جن میں ان کے فن کی کامیابی کا راز ہے یعنی انسانیت، دوستی ذاکر صاحب کے متعلق صدیقی صاحب کا ایک جملہ شاید میرے اس خیال کی بہتر تفسیر کر سکے۔ فرماتے ہیں۔

"... ذاکر صاحب کی عظمت کا راز صرف دوست کا دل رکھنے میں نہیں قوم کی آبرو رکھنے میں بھی ہے..."

گویا ان کی احباب نوازی اور انفرادی خوبی زیادہ اہم نہیں ہے بلکہ وہ حیثیت قابل ذکر ہے جو قوم و ملک کے لیے مفید ہے آگے چل کر انھوں نے خود دیکھا اور تفصیلات پیش کی ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

"... ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی عظمت محض ان کی ذہانت، خلوص، تقریر و تحریر کے کمال، علم و عمل کی صلاحیت، زندگی اور زندہ دلی میں نہیں ان کی ایک نصب العین کی تلاش اور اس تلاش کے لیے وقف ہو جانے میں ہے..."

مولانا سید سلیمان اشرف کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

"..... مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا ذوق نصیب نہیں ہے یا صرف دنیوی اقتدار کا حامل ہے

اگر کوئی چیز بھی دیتا تو ٹالے جاتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو اس بات سے کیا سروکار ...."

رشید احمد صدیقی کی مرقع نگاری میں انفرادی شخصی تاثر کے ساتھ تاریخی اور واقعاتی خطوط بھی ہیں۔ اس خوشگوار امتزاج نے ان کی مرقع نگاری میں تنظیم و تہذیب اور ان محاکات کی فضا میں سرشاری حیات کی کرامت پیدا کر دی ہے۔ رشید صاحب انسان دوست ہیں اور ان کے نزدیک انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے وہ امارت اور افلاس کا فرق روا رکھنے کو تیار نہیں اور نہ کسی ایسی دوسری حد بندی کے روادار ہیں۔ انھیں انسانیت سے پیار اور اعلیٰ انسانی اقدار سے عشق ہے۔ وہ سچائی نیکی اور خلوص کو کسی کی میراث نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انھوں نے محمد علی، علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالحق اور ابوالکلام آزاد جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کے خاکے پیش کئے ہیں وہاں انھوں نے ایک اعلیٰ فنکار کی حیثیت سے کندن کو فراموش نہیں کیا۔ کندن سے متاثر ہونے کی وجہ اسکا علم و فضل نہیں بلکہ خلوص خدمت گذاری اور ایمان داری ہے۔ رشید صاحب کی مصورانہ قوت یہاں بھی عروج پر ہے۔ ملاحظہ ہو:

"...... درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، سمولے جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے کی طرح بجتی ہوئی پائیدار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ، کس بلا کا مستعد اور منکسر یہ شخص تھا۔ نہ دن دیکھتا نہ رات نہ سردی نہ گرمی نہ بارش، کوئی کہتا کندن بوڑھا ہوا اتنا محنت نہ کیا کر تو وہی کلمہ دہرا دیتا "ہم نے کالج کا نمک کھایا ہے" ہمیشہ نباہ دے۔ یونیورسٹی کی دی ہوئی خاکی وردی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ، کبھی دھوتی پہنے اپنے علاقے میں وکٹوریہ گیٹ سے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سونی اور معلوم ہوتی جنھوں نے ۳۰-۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے..."

غرض رشید احمد صدیقی کی مرقع نگاری میں ان کی انشا پردازی کے جملہ اوصاف منعکس ہو جاتے ہیں اگرچہ طنز و مزاح میں انھوں نے سماجی اور سیاسی اور اقتصادی پس منظر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ لیکن مرقع نگاری میں وہ شخصیات کے ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اجاگر کرتے ہیں جن سے انکا واسطہ رہا ہے۔ رشید صاحب کے مرقعے مرقعے نہیں فلم کے اسکرین بن جاتے ہیں جہاں شخصیات حقیقی خد و خال میں ابھر آئے ہیں۔ اردو کے کسی بھی ادیب کو مرقع نگاری میں اتنی کامیابی حاصل نہ ہو سکی ہے جتنی کہ رشید صاحب کو اپنی ایک آدھ خامی کے باوجود کامیابی ملی ہے۔ مرقع نگار کی حیثیت سے رشید احمد صدیقی بلاشبہ منفرد حیثیت کے حامل ہیں اور یہ حیثیت ہر زاویہ سے عالی و برتر ہے۔

•••

اپنے معاونین سے :-

مضامین اور شعری تخلیقات ہمارے پاس بڑی تعداد میں جمع ہو گئی ہیں اس لیے آئندہ تین چار ماہ تک ہم کسی غیر طلبیہ مضمون یا شعری تخلیق کی اشاعت پر غور کرنے سے قاصر رہیں گے اور اس سلسلے میں خط و کتابت سے بھی معذور رہیں گے۔ کسی مضمون افسانے یا شعری تخلیق کی رسید ادارے کی جانب سے موصول ہو جانے کے بعد اشاعت کے سلسلے میں از راہ کرم عجلت سے کام نہ لیں اور غیر ضروری خط و کتابت سے اپنا نیز ادارے کا وقت ضائع نہ کریں۔

—— ادارہ

غزلیں

یاد دہلوی
گولہ گنج لکھنؤ

مری جبیں کے ترے سنگِ در کے دشمن ہیں
عجیب اہلِ نظر ہیں نظر کے دشمن ہیں

نہ جانے قافلے والوں کو کیا ہوا یا رب
یہ راہزن کے نہیں راہبر کے دشمن ہیں

ہوا نفاق کے شعلوں کو دی ہمیں سب نے
غلط نہیں کہ ہمیں اپنے گھر کے دشمن ہیں

ستارے ہوں کہ برستی گھٹائیں یا شبنم
یہ سب ازل سے مری چشمِ تر کے دشمن ہیں

غزل کو تیرِ وضاحت سے کر دیا مجروح
یہ کیسے اہلِ ہنر ہیں ہنر کے دشمن ہیں

یہ عہدِ نو کے مجاہد یہ مفلسی کے نقیب
ہیں زر کے دوست مگر اہلِ زر کے دشمن ہیں

نکہت خانم
شعبۂ اردو، ڈی این بی کالج
بھاگلپور

یہ تو نہیں کہ کوئی یہاں راستہ نہ تھا
اس شہرِ بے اماں میں کوئی آشنا نہ تھا

برسوں سے جی رہی ہوں اسی راہ میں مگر
میری شکستِ پا سے کوئی آشنا نہ تھا

تاریک راستوں کا مسافر بنا دیا
تیری رفاقتوں کو کوئی جانتا نہ تھا

آواز دے رہا تھا ہر اک سمت سے مجھے
ہر سو لگی تھی آگ کوئی راستہ نہ تھا

چاروں طرف سے مجھ پہ ہی پتھر برس پڑے
میں ایک بے زباں تھی کوئی مانتا نہ تھا

کس کی صدا سے دشت کی بکھری ہوئی خامشی
میرے سوا یہاں تو کوئی دوسرا نہ تھا

سیدہ عارفہ نقاش
خندہ بھون، نواکدل سرینگر ۲۰
کشمیر

ہنسنا پڑا مجھے کبھی رونا پڑا مجھے
کیا کیا امید و یاس میں ہونا پڑا مجھے

دیکھی گئی نہ دشت میں جب پیاس دھوپ کی
اپنے لہو میں خود کو بھگونا پڑا مجھے

صدیوں سے اپنے آپ کو پانے کے واسطے
دریا نما سرابوں میں کھونا پڑا مجھے

ناکام لوٹنے کا مجھے حوصلہ نہ تھا
طوفاں میں خود سفینہ ڈبونا پڑا مجھے

میں آنسوؤں کی جھیل سے باہر نہ آ سکی
ہنگا کسی کے غم کا کھلونا پڑا مجھے

وہ تو چلا گیا مری بستی سے عارفہ
اس کو بھری بہار میں رونا پڑا مجھے

خان محمد اقبال
جیل روڈ، رامپور

مولانا محمد علی جوہر

دنیا میں بہت کم ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جن پر ملک اور قوم ناز کرتی ہے۔ یہ دھرتی کے جوہر جب مٹی سے نکل کر باہر آتے ہیں تو ان کی آب وتاب اور چمک دمک سے ساری دنیا روشن ہو جاتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر بھی ایک ایسا ہی بہل دارِ دُرِ آب دار تھے جس کی چمک دمک سے نہ صرف ہندستان بلکہ سارا عالم روشن ہوگیا ہندستان کے گوشے گوشے میں اس آبدار نگینے کی کرنیں پھیل کر آزادی کے پروانوں کے دلوں کو روشن کرتی رہیں۔ اور جب تک یہ شمع آزادی روشن رہی ہندستان کے پروانے اس پر اپنی جان نثار کرتے رہے۔ ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے کے کنارے پر بسی ہوئی ایک چھوٹی سی مگر پروقار ماضی کی یادگار ــــ ریاست رامپور آج بھی اس بات پر فخر کرتی ہے کہ مولانا جوہر جیسی ہستی نے اس دھرتی پر جنم لیا۔ مولانا محمد علی جو ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو رامپور میں پیدا ہوئے ریاست رامپور بھی ہندستان کی دوسری ریاستوں کی طرح حکومت برطانیہ کے نمک خواروں میں تھی۔

مولانا کے والد کا ان کے بچپن ہی میں انتقال ہوگیا۔ ریاست کے اس قدامت پرست ماحول میں مولانا کی والدہ نے اپنی دور اندیشی اور اعلیٰ بصیرت سے مولانا محمد علی کو اس ماحول سے بلند کیا۔ انھیں اعلا تعلیم دلائی اور اس راہ میں مولانا کی والدہ نے اپنا کل سرمایۂ حیات بھی فروخت کر دیا۔

مولانا کی والدہ جنھیں لوگ پیار سے ”بی اماں“ کہتے تھے بڑی دور اندیش اور ذہین تھیں ’اردو‘ فارسی اور دینی تعلیم گھر پر مکمل کرا کے انھوں نے مولانا کو بریلی ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ وہ علی گڑھ سے الٰہ آباد آئے اور ۱۸۹۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔

مولانا نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کرنے کے لئے انگلینڈ کا سفر کیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اپنی اعلیٰ ذہانت اور قابلیت کے باوجود وہ اس امتحان میں ناکام ہوکر رامپور لوٹ آئے مولانا کے آبا واجداد ریاست رامپور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ نواب رامپور نے انھیں محکمہ تعلیمات کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔

جلد ہی مولانا اس ماحول سے بیزاری محسوس کرنے لگے۔ اس عیش و آرام کی ملازمت کو چھوڑ کر وہ ۱۹۰۲ء میں آکسفورڈ آگئے۔ ۱۹۰۴ء میں بی۔ اے

کی ڈگری لے کر ہندستان واپس آئے اور مہاراجہ بڑودہ کے دربار میں ملازمت کرلی۔

ہندستان کی تاریخ میں یہ دور ایک نئے ہندوستان کی تاریخ کا آغاز تھا۔ —— کانگریس کا نام نہ صرف ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکا تھا بلکہ انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں بھی زیر بحث آنے لگا تھا۔ انگلینڈ کے سفر اور آکسفورڈ کی تعلیم نے مولانا محمد علی جوہر کو ایک نیا حریت پسند ذہن عطا کیا۔ ان کے دل و دماغ میں ہندستان کی آزادی کا خواب ابھرنے لگا۔ فرنگی حکومت کے دورِ استبداد کے خاتمہ اور ملک کو غلامی سے نجات دلانے کا راستہ دکھائی دینے لگا اور اس شمع آزادی نے مولانا محمد علی جوہر کے دل و دماغ کو اپنے نور سے جگمگا دیا۔

محمد علی طبیعتاً جذباتی تھے۔ آزادئ کامل ان کا نصب العین تھا۔ جس کے لئے وہ تادم آخر جدوجہد کرتے رہے۔ ایک طرف ان کی آنکھوں کے سامنے مہاراجہ بڑودہ کا عیش و عشرت اور رقص و سرود کا دربار تھا تو دوسری طرف ہندستان کے فاقہ کش عوام تھے۔ جو صدیوں سے انگریز آقاؤں کے رحم و کرم پر زندگی گذار رہے تھے۔ آزادئ ہند کے اس جذبہ نے انھیں درباری زندگی سے نکال کر عوام کے قریب کر دیا۔ اس طرح "بی اماں" کا لال اور مادر ہندوستان کا بہادر سپوت اور جنگِ آزادی کا مجاہد شیر بن کر میدانِ کارزار میں کود پڑا۔ اس مجاہد کی آواز سے انگریزی حکومت لرز اٹھی۔ انگریز آقاؤں کو خطرہ محسوس ہوا۔ اور اہل ہند کے مایوس دلوں میں جذبۂ آزادی شعلہ بن کر بھڑک اٹھا۔

مولانا ایک طوفان بن کر اٹھے اور سیل رواں کی طرح —— آگے بڑھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں وہ کلکتہ آئے جو اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا نے ایک انگریزی اخبار "کامریڈ" نکالا۔ انگریزی صحافت کے میدان میں کامریڈ ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ ہندستانیوں کے علاوہ انگریز بھی اس اخبار کے خریدار بن گئے۔ وائسرائے، ان کی بیوی، گورنر، ہندستانی کونسل کے انگریز اراکین، وزیراعظم برطانیہ اور جرمنی کے سیاست داں کامریڈ کو شوق سے پڑھتے اور مولانا محمد علی جوہر کے طرز انشاء اور علمیت کی تعریف کرتے۔

جب انگریزوں نے کلکتہ سے اپنی راجدھانی سنہ ۱۹۱۲ء میں دہلی منتقل کی تو مولانا محمد علی بھی دہلی آگئے ہندستان کا بیشتر طبقہ انگریزی زبان سے ناآشنا تھا۔ اس لئے مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے ایک اردو روزنامہ اردو اخبار "ہمدرد" ۱۹۱۳ء میں جاری کیا۔

یہ وہ دور تھا جب پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ترکی کی سلطنت عثمانیہ جرمنی کے تعاون سے حکومت برطانیہ اور ممالک متحدہ کے ساتھ برسرپیکار تھی مولانا اسلام اور اسلامی ممالک سے بھی محبت کرتے تھے اس لئے ترکوں کے بھی ہمدرد بن گئے۔ ترکی کی حمایت میں انھوں نے مضامین لکھنے شروع کئے انگریز حکومت پر یہ مضامین برق بن کر گرے۔ ہندستانی مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکنے لگی۔ اور اس الزام میں مولانا محمد علی کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ کامریڈ اور ہمدرد کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔

مولانا جوہر ایک طویل عرصہ جیل میں رہنے کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں اپنے بڑے بھائی مولانا

شوکت علی کے ساتھ رہا ہوئے جرمنی جنگ ہار چکا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ برطانیہ اور ممالک متحدہ نے ترکی کی سلطنت پر قبضہ کر لیا مگر مصطفیٰ کمال پاشا اپنی بہادری سے صرف ترکی کو بچا سکا تھا۔ ترکی شکست مولانا جوہر کے دل پر بجلی بن کر گری۔ وہ شعلۂ جوالہ کی طرح نکلے اور امرتسر پہنچے جہاں اس وقت کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولانا محمد علی کی آمد سے کانگریس کے اجلاس میں جان پڑ گئی ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔

ان ہی تاریخوں میں امرتسر میں مسلم لیگ کا بھی اجلاس ہو رہا تھا۔ وہ مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی پہنچے اور فرمایا۔۔۔ "صاحبان میں نے کانگریس کے اجلاس میں بھی کہا ہے۔ اور آپ سے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ لوگ مصلحتوں کو چھوڑ دیئے اور خدا سے لو لگائیے"۔

مولانا جوہر ہندو مسلمانوں کی الگ الگ مصلحتوں کے خلاف تھے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو ہندستانی مانتے ان کی رائے تھی۔ ہم سب پہلے ہندستانی ہیں۔ اس لئے ہمیں متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنا چاہئے۔

مولانا نے کانگریس کے اجلاس میں فرمایا۔۔۔

ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ دو زانوں جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کر دو، ہم کو پھانسی کے تختے سے بچالو، میں اپنے لئے اپیل نہیں کرتا، مجھے چند آدمیوں کی فکر نہیں، ہم چند آدمیوں کو آزاد کرا کے سارے ملک کو غلام بنانا نہیں چاہتے، میں اس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت عزیز ہے۔ بہ نسبت شخصی آزادی کے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام کی آزادی کے لئے، ہندستان کی آزادی قطعی ضروری ہے"۔

اس زمانہ میں گاندھی جی اور علی برادران کا اتحاد ہوا۔ مولانا جوہر گاندھی جی کے مرید ہو گئے گاندھی جی نے علی برادران کو ساتھ لے کر ہندستان کا طوفانی دورہ شروع کیا۔ مولانا محمد علی کی دھواں دھار اور جوشیلی تقریروں نے ہندستان کے گوشے گوشے میں آگ لگادی۔

۱۹۲۰ء میں مولانا جوہر نے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تاکہ انگریزی درس گاہوں کا بائیکاٹ کرنے والے طلبا اس قومی درس گاہ میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں۔۔۔ کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس نے ہندو مسلمانوں کو اتنا قریب کر دیا کہ ایسا اتحاد اور محبت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس کے اجلاس میں مولانا نے فرمایا۔۔۔ "انگریزی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے" مولانا کے اس بیان نے انگریزوں کو بے چین کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ گاندھی جی مولانا آزاد اور دوسرے ساتھیوں نے مولانا جوہر کی حمایت میں انگریز حکومت سے درخواست کی کہ وہ انھیں بھی جیل میں ڈال دے۔

مولانا محمد علی جوہر جب جیل سے واپس آئے تو ملک کی سیاسی فضا کافی بدل چکی تھی۔ کانگریس میں دو گروپ ہو چکے تھے مولانا ان حالات کو دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئے۔ لیکن پھر مولانا نے ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا (مدارس) میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندو اور مسلمانوں کو متحد رہنا

چاہیے۔

۱۹۲۴ء میں ملک کی فضا کافی بگڑ چکی تھی، فرقہ وارانہ فسادات نے گھر گھر میں آگ لگا دی تھی، مولانا جوہر بیتاب ہو گئے۔ گاندھی جی بھی اس خون کی ہولی کو دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئے۔ اور انھوں نے علی برادران کی رہائش گاہ دہلی میں مرن برت رکھا۔ مولانا کی راتوں کی نیند اڑ گئی وہ راتوں کو سجدہ میں گر کر خدا سے گاندھی جی کی زندگی کے لئے دعائیں مانگتے رہے۔ اکیس دن کے بعد فساد کی آگ سرد ہوئی۔ اور گاندھی جی کا مرن برت ٹوٹا۔ تو مولانا محمد علی نے خدا کا شکر ادا کیا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن ہندستان آیا۔ گاندھی جی کے ساتھ مولانا نے بھی اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ مسلسل جدوجہد اور ذہنی اذیتوں کے باعث مولانا جوہر کی صحت جواب دے چکی تھی۔ ہندستان کے مایوس کن حالات نے انھیں نڈھال کر دیا تھا وہ دوستوں کے اصرار پر ۱۹۲۸ء میں علاج کے لئے یورپ گئے۔ لیکن اس درمیان ہندستان کے تبدیل ہونے والے حالات نے پھر ان کو ہندستان آنے پر مجبور کر دیا اور وہ پھر ہندستان لوٹ آئے۔ لیکن اس دوران ملک کے حالات میں کافی کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں لوگ کانگریس اور مسلم لیگ کے الگ الگ جھنڈوں کے نیچے جمع ہو چکے تھے۔ ان حالات میں مولانا جیسا انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ دونوں جھنڈے ان کے لئے اجنبی نظر آنے لگے۔ وہ ہر وقت بے چین اور مضطرب رہنے لگے۔ الغرض مرض بڑھتا گیا۔ ملک کے حالات اور بگڑنے لگے۔

مولانا کو دسمبر ۱۹۳۰ء میں حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ مولانا محمد علی بیماری کے باعث لندن کا سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ لیکن ہندستان کے بدلے ہوئے حالات ان کے لئے قطعی نا قابل برداشت تھے۔ اور وہ ہندستانیوں کے درد کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ یہ سفر انکی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔

مولانا محمد علی جوہر نے اس گول میز کانفرنس کے اجلاس میں جو دھواں دھار اور بیباکانہ تقریر کی اس سے حکومت برطانیہ کانپ اٹھی۔ ان کی جرأت اور قابلیت دیکھکر کانفرنس کے ممبران حیران رہ گئے۔ مولانا کے ان جملوں کی بازگشت ساری دنیا میں سنائی دینے لگی۔

"میں آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں واپس جاؤں گا جب آزادی کا پروانہ میرے ہاتھوں میں ہو — میں ایک غلام ملک میں مرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ میں ایک غیر مگر آزاد ملک میں مرنا پسند کروں گا۔ آپ مجھے آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔"

انگریزوں کی ظالم حکومت مولانا محمد علی کی آزادی کی خواہش کو تو پورا نہ کر سکی لیکن خدا نے انکی دلی تمنا کو پورا کر دیا۔ تقریر کے دوران انکے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ اور لندن کے اندر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو انکی شمع زندگانی آخری بار بھڑک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ لندن سے ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا کے جنازے کو پورے اعزاز کیساتھ بیت المقدس لایا گیا۔ اور لاکھوں لوگوں کے درمیان ان کو یہاں دفن کر دیا گیا۔

مولانا محمد علی کے انتقال کی خبر سنکر ہندستان میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر دوست پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اور اس طرح شہر ہندستان رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایک آزاد ملک میں مرکر، آزادی کی شمع کو اور بھی روشن کر گیا۔

ایچ۔ جی۔ ویلز۔ نے کہا مولانا جوہر، نپولین کا دل میکالے کا قلم اور ایڈمنڈ برک کی زبان کے حامل تھے۔

★

منزلیں تو مل ہی جائیں گی مگر میری طرح
مل نہیں سکتا اسے اب ہمسفر میری طرح
دیدۂ نرگس سے نگاہِ موجۂ خوں بہک رہا
کون اس کا ہمزبان و ہمسفر میری طرح
کرب میں ڈوبی نظر آتی تمہیں یہ کائنات
تم سے ملتی ہوتی جو کوئی شب بسر میری طرح
سب ہے پابندِ رسمِ عیش کوشی دوستو
کس کو تھی فرصت کہ پھرتا دربدر میری طرح
لذتِ احساسِ غم بھی تو نشے سے کم نہیں
کبھی اک دن اس خرابے کو گذر میری طرح
[illegible] دل بیتاب کی چاہت میں اب
کون دیکھے گا اسے اک نظر میری طرح

میرے فسانے کا عنواں بنا ہوا اک نام
لگے ہے تاج پہ تازہ کھدا ہوا اک نام
بدل گیا مرا عنوانِ زندگی پل میں
جو پھول جیسے لبوں سے ادا ہوا اک نام
یہ اور بات میں اس کو نہ پا سکا لیکن
رہا حیات سے ہر دم جڑا ہوا اک نام
پلٹ کے دیکھنا ماضی کبھی تو پڑھ لینا
کتابِ زیست میں اپنی لکھا ہوا اک نام
ندی تو چڑھ کے کبھی کی اتر گئی ہوگی
ملے گا ریت پہ اب کیا لکھا ہوا اک نام
جنم جنم سے مرا اس کا ساتھ ہے گلشن
کہاں چتا میں بھی جل کر فنا ہوا اک نام

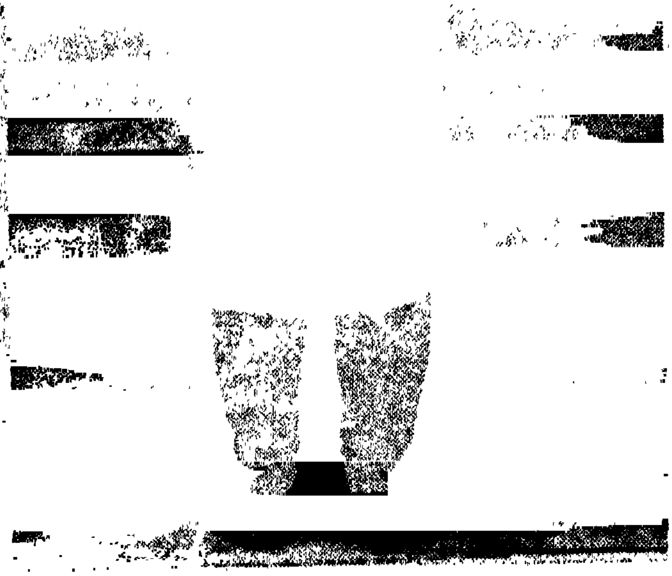
کس نے دیا ہے زخم دوا دے گیا ہے کون
اتنی بڑی نہ جانے سزا دے گیا ہے کون
مدت کے بعد میرے لبوں کو ہنسی کے پھول
اس دورِ مصلحت میں بھلا دے گیا ہے کون
دشمن تو میرا کوئی نہیں سارے شہر میں
پھر زندگی کی مجھ کو دعا دے گیا ہے کون
خاموش ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں
اتنا سمجھ نہ پاؤں دعا دے گیا ہے کون
چنگاری آگ کی تھی ابھی تک دبی ہوئی
بن جائے یہ نہ شعلہ ہوا دے گیا ہے کون
بیٹھے تڑپ رہا ہوں میں جن کے خیال میں
وہ پوچھتے ہیں مجھ سے سزا دے گیا ہے کون

نقیبِ فرنگی محل

ایک قادر الکلام شاعر

ملا قطب الدین شہیدؒ ہندستان کے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے ہیں اور فرنگی محل کی اہم ترین شخصیت ہیں۔ ان سے فرنگی محل کا ایک پورا دور وابستہ ہے۔ اُنکے آبا و اجداد اور وہ خود ضلع بارہ بنکی کے ایک مشہور قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے، ان کا سلسلہ نسب بالاتفاق حضرت ابو ایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے۔

مولوی عنایت اللہ انصاری نے "مآثر الکرام" اور "عمدۃ الوسائل" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ایک بدطینت ان کے گھر پر حملہ آور ہوا اور محمد آصف نیز ملا قطبؒ کو مع نو افراد کے ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ بروز دوشنبہ شہید کر دیا۔ اس حادثہ کے بعد ملا قطب شہیدؒ کے صاحبزادگان ملا اسعد، ملا سعید، ملا نظام الدینؒ اور ملا رضا نیز دوسرے اہل خاندان کو بہت پریشان کیا گیا۔ جب ان حضرات پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تو ملا سعید نے سہالی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا اور وہ شہنشاہ اورنگ زیبؒ کے پاس دکن تشریف لے گئے اور وہاں اپنے بڑے بھائی ملا سعید کی مدد سے جو پہلے ہی سے دکن میں مقیم تھے شہنشاہ اورنگ زیب سے لکھنؤ کے حکام کے نام حسب پسند جگہ دیئے جانے کا حکم نامہ حاصل کر لیا اور اس کو لے کر لکھنؤ آئے اور یہاں کے حکام سے مل کر ایک کوٹھی پسند کی جو



محلہ احاطہ چراغ بیگ میں واقع تھی یہ کوٹھی ایک فرانسیسی تاجر "نیل" کے واپس چلے جانے سے خالی ہو گئی تھی اور حسب قانون وقت "نزول" ہو گئی تھی۔ بعد کو یہ کوٹھی اور اس سے متعلق تمام آراضی ملا سعید و ملا اسعد کو فرمان شاہی کی رو سے عطا ہوئی چنانچہ ملا سعید سہالوی نے اپنے تمام خاندان کو ۱۱۰۵ھ میں اس کوٹھی میں منتقل کر دیا۔ یہ کوٹھی اس زمانہ میں فرانسیسی تاجر کے رہنے کی وجہ سے "فرنگی کا محل" کہلاتی تھی جو بعد کو "فرنگی محل" ہو گئی۔ اس خاندان میں ملا نظام الدینؒ، مولانا عبد الباریؒ، مولانا محمد نعیمؒ اور مولانا عبد الحئیؒ کے علاوہ لاتعداد ایسے علماء و فضلاء

پھر [illegible] کی خدمت کی جناب فرنگی محل [illegible] اور مرکز علم وادب بنا رہا۔
[illegible] فرنگی محل کی اہم شخصیتوں میں ایک بزرگ مولوی نجیب اللہ بھی گذرے ہیں ان کے والد مولوی سمیع اللہ بن مولوی خلیل اللہ بن مولوی [illegible] اللہ بن مولوی محب اللہ وغیرہ سبھی فرنگی محل کے مشہور بزرگوں میں ہیں۔ خوش قسمتی سے نجیب کو بھی بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع [illegible] وہ بھی اپنے وقت کے چوٹی کے علما میں تھے استاذ الاساتذہ مولانا محی القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ (بانی مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ) اور مولانا عبدالباقیؒ سے آپ نے درس نظامی کی تکمیل کی پھر درس فارسی کے لئے اپنے وقت کے جید عالم، ادیب اور شاعر جناب [illegible] عزیز الدین عزیز لکھنوی سے رجوع کیا۔ پھر بعد تحصیل و تکمیل علم ایک مدت تک مدرسہ عالیہ نظامیہ (فرنگی محل) میں درس دیتے رہے۔

آپ کا عقد آپ کی خالہ زاد بہن دختر شیخ غلام نبی مسعودی [illegible] چتراوی سے ہوا جن سے ایک صاحبزادے جناب حبیب اللہ صاحب حال مقیم چترا ضلع بستی اور ایک عدد صاحبزادی تھیں جو مولانا ہی کے بھانجے سید عبدالہادی صاحب رئیس چترا ضلع بستی کو منسوب تھیں صاحبزادی کا تو انتقال ہو گیا ہے لیکن ان کے صاحبزادے حبیب اللہ صاحب اور داماد سید عبدالہادی صاحب بقید حیات ہیں۔

مولانا نجیب اللہ صاحب کے افراد خاندان سے [illegible] تذکرہ علمائے فرنگی محل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے مزاج میں ابتدا سے ہی لاابالی پن، وارستگی اور بیفکری تھی جس کے سبب وہ ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، سفید داڑھی اور [illegible] بال پیچھے کو گرے ہوئے، پیشانی کی طرف سر کے بال صاف، لیکن پر نور چہرہ جس سے بزرگی اور فقر کے آثار نمایاں تھے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

دل میں پھر پیدا ہوائے دشت پیمائی ہوئی
پھر جنون فتنہ زا کی کار فرمائی ہوئی

آہستہ آہستہ مزاج میں دنیا سے نفرت اور اس سے بے رغبتی بڑھتی گئی اور پھر جذب و جلال کی کیفیت پیدا ہونے لگی اسی حالت میں کہہ اٹھے ؎

ضبط نے میرے جلا کر خاک مجھ کو کر دیا
آتش سوز ال مرے حق میں شکیبائی ہوئی

کئی بزرگوں سے بیعت کا شرف حاصل ہوا چنانچہ راہ تصوف پر گامزن ہو گئے اور باقاعدہ اجازت سلاسل چشتیہ و قادریہ حاصل کر لی۔ اور مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے علاحدگی اختیار کر لی۔

نجیب نہایت خوش مزاج اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کی غزلیں اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں میں موجود ہیں فارسی کلام انھوں نے خواجہ عزیز لکھنوی کو دکھلایا۔

اردو میں حضرت امیر مینائی سے اصلاح لی۔

مولانا کی جو مخصوص مزاجی کیفیت تھی اس کی وجہ سے ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا کیونکہ وہ اپنے کلام کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان کے سگے پوتے جناب عظیم اللہ صاحب (بن مولوی سمیع اللہ صاحب) ریٹائرڈ انکم ٹیکس افسر کا (جنھوں نے ان کی بہت خدمت کی ہے اور جنھیں ان کے ہمراہ بہت زیادہ رہنے کا موقع ملا) بیان ہے کہ وہ اکثر غزلیں لکھ کر احباب کو دیدیتے تھے یا احباب ان کی غزلیں نقل کر لیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ قوال آ کر ان سے فرمائشیں کرتے اور غزلیں لے جا کر سماع کی محفلوں میں

ملتے یہ بھی عجیب بات ہے کہ وہ اپنی غزلیں لوگوں کو دیکر بھول جاتے تھے۔ چونکہ نجیب سماع کے بڑے شوقین تھے اسی لئے مجالس اعراس میں برابر شرکت کرتے خصوصاً حضرت شاہ میناؒ کے مزار پر ان کی حاضری روز کا معمول تھی۔ ایکبار ایک محفل میں قوال غزل پڑھ رہا تھا۔ وہاں آپ بھی موجود تھے جب اس نے مقطع پڑھا تو آپ چونکے اور پوچھا "بھئی یہ غزل کہاں سے لائے ؟" قوال نے جواب دیا۔ "میاں آپ ہی نے تو لکھ کر دی تھی"۔ عظیم اللہ صاحب ہی کا کہنا ہے کہ ان کے احباب میں سے اگر کسی نے ان سے غزل لے کر کسی رسالے کو بغرض اشاعت دے دی تو وہ شائع ہوگئی ورنہ انھیں خود نہ اپنی فکر تھی اور نہ اپنے کلام کو چھپوانے کی۔ اس طرح ان کا بہت ہی کم کلام چھپ سکا۔ کچھ غزلیں اس عہد کے مشہور رسالوں جیسے "عالمگیر" اور "الناظر" وغیرہ میں بھی شائع ہوئیں۔

نجیبؔ کے اردو کلام میں اس وقت تقریباً دس غزلیں، تین نعتیں ایک حمد ایک مناجات ایک قطعہ اور کچھ متفرق اشعار دستیاب ہیں۔

مذکورہ کلام مجھے محترم معینؒ احمد صاحب نے از راہ عنایت عطا فرمایا نیز مولوی نجیبؔ سے متعلق بہت سی اہم تفصیلات بھی فراہم کیں ہیں ان کا بہت مشکور ہوں۔

حمد کا سیدھا سادہ انداز ہے لیکن اللہ سے تعلق کے ساتھ ساتھ اس کی بڑائی اور اپنی عاجزی کا پورا اعتراف بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

کروں کس زباں سے تری ثنا تری شان جل جلالہٗ
ہو صفت بشر سے مجال کیا تری شان جل جلالہٗ

تری ذرہ ذرہ میں ہے جھلک ہر کلی کلی میں تری مہک
تری ہر حسین میں ہے ادا تری شان جل جلالہٗ

اسی طرح نعتیں بھی بڑی والہانہ انداز میں کہی گئی ہیں جن سے آنحضورؐ سے بھرپور عقیدت ٹپکتی ہے اور عقیدت کا انداز کچھ ایسا ہے کہ جیسے آپ مجسم سامنے تشریف فرما ہیں ملاحظہ کیجئے۔

کھڑے ہو سروقد تعظیم کو سلطان دیں آئے
جلو میں سلمو کہتے ہوئے روح الامیں آئے
نجیب آنکھوں میں رکھ لو تم یہاں کے ذرے ذرے کو
یہ وہ محفل ہے جس میں رحمۃ اللعالمیں آئے

بے عدیل و بے نظیر و بے مثال ولا جواب
جز محمدؐ دو جہاں میں دوسرا ملتا نہیں

انھوں نے خود راقم السطور کو بتلایا کہ کس کدو کاوش کے بعد وہ مولانا نجیب کے بہت ہی مختصر کلام کو یکجا کر سکے ہیں۔ انھوں نے مولانا کے شاگردوں، معتقدوں، عزیزوں اور احباب کے علاوہ بہت سے قوالوں اور طوائفوں سے ملاقاتیں کیں اور انھیں خطوط بھی لکھے اور جس سے جو کلام ملا اسے محفوظ کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے نجیب کا بہت کم کلام حاصل ہو سکا ہے۔ اور اس میں بھی غزلیں صرف دس ہیں جو سادہ انداز کی ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ روزمرہ کی اردو ہے اور مقامی رنگ صاف نظر آتا ہے۔

ہوگئی ان کو سحر گنتے ہی گنتے تارے
آہ میرے دل پر درد کی خالی نہ گئی
اس قدر بار نگاہوں کا دم دید پڑا
نہ گئی اس گل رخسار کی لالی نہ گئی

لہ موصوف مولانا نجیب کے عزیز قریب ہیں اور اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہے ہیں۔

محاورات کا استعمال بھی اچھے انداز سے کیا گیا ہے۔

بات نکلی منھ سے اور منھ کو کلیجا آگیا
ہائے میں کیونکر کہوں جو کچھ کہ میرے دل میں ہے
انکے آتے ہی صف محشر میں ہل چل پڑ گئی
کچھ کا کچھ کہنے لگا انسان کو انساں دیکھ کر

لکھنویت بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں معنویت کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی لطف ہے۔

مجھ سے کیا حاصل ہے میری حسرتوں کا پوچھنا
تم وہی آخر کرو گے جو تمہارے دل میں ہو
حسرت واندوہ وغم سے کہدو باہر ہی رہیں
یاد اک پردہ نشیں کی دل میں ہو آئی ہوئی
اب اس کی رات کا اللہ حافظ خیر سے گذرے
رہا ہے آپ کا بیمار غم دن بھر بہت اچھا
نجیب کھئے تو اس بے خودی کے عالم میں
تلاش اپنی کریں ہم کہ جستجو دل کی

اب تک زندگی کو شعراء نے محاورۃً" چار دن کی کہا ہے۔ یا دو روزہ زندگی کا تذکرہ ملتا ہے لیکن نجیب نے اسے تین دن کی کہا ہے اور خوب کہا ہے ملاحظہ فرمایئے ؎

طفلی و پیری جوانی دیکھ لی
تین دن کی زندگانی دیکھ لی
اب زمیں کا پیار باقی ہے نجیب
آسماں کی مہربانی دیکھ لی

۱۹۳۰ء میں انھوں ایک نظم" وقت آگیا ہے" کے عنوان سے لکھی اس سے ان کی وسیع النظری، گاندھی جی سے عقیدت، مل جل کر کام کرنے کا جذبہ غلامی سے نفرت، آزادی سے محبت اور وطن میں ہندی زبان کے رواج دیئے جانے کا خیال ظاہر ہوتا ہے ملاحظہ فرمایئے ؎

وقت آگیا کہ خواب سے بیدار ہوں جناب
وقت آگیا کہ نیند سے ہشیار ہوں جناب
وقت آگیا کہ غفلت دیرینہ چھوڑ دو
وقت آگیا کہ طلسم غلامی کو توڑ دو
وقت آگیا کہ توسن ہمت سنبھل چلے
وقت آگیا کہ داد شجاعت تمہیں ملے
وقت آگیا کہ ہند کا روشن ہو نام پھر
وقت آگیا کہ جاری ہو یاں حکم رام پھر
وقت آگیا کہ ہند میں ہندی کا راج ہو
وقت آگیا کہ کر سکیں گاندھی کے کام کو
ہوں جادۂ خلاف تعاون پہ گامزن
برداشت ہم کریں سبھی رنج وغم والم
سوراج تاکہ ہند کو مل جائے اے نجیب
آزادی اپنے دیش کو جلدی ہو پھر نصیب

نجیب کے انتقال کی داستان بھی بڑی عجیب ہے ایک معمولی سا واقعہ ان کی ذراسی لاپروائی سے ان کی موت کا سبب بنا۔ ان کے پوتے جناب عظیم اللہ صاحب (ریٹائرڈ انکم ٹیکس آفیسر حال مقیم شنکر نگر، نرالا نگر لکھنؤ) جنھیں آخر وقت تک ان کی خدمت کا موقع ملا بیان کرتے ہیں کہ مولانا چودھری متین الزماں صاحب سابق وزیر ریاست بھوپال کے فاتحہ میں شرکت کے لئے کار سے ان کے گھر جا رہے تھے۔ کار کا دروازہ بند کرتے وقت کہنی کے اوپر ہاتھ (کا گوشت) دب کر زخمی ہو گیا اور بہت خون نکلا بمشکل تمام برف وغیرہ کی مدد سے خون رکا اور پٹی باندھ دی گئی لیکن اس واقعہ کا انھوں نے گھر پر کسی سے نہ تو تذکرہ کیا اور نہ علاج ہی جاری رکھا۔ اس لاپرواہی کے نتیجہ

میں زخم پک گیا۔ اور تکلیف بڑھ گئی۔ مزاج میں قوت برداشت بہت تھی تکلیفیں جھیلتے رہے مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایک دن جمعہ کو جب غسل کرکے حمام سے نکلے تو اپنے پوتے سے فرمایا "میاں! ذرا مجھے کرتا پہنا دو۔ ہاتھ اوپر نہیں اٹھ رہا ہے" انھوں نے وجہ پوچھی تو بمشکل واقعہ سنایا۔ عظیم اللہ صاحب نے جب غور سے دیکھا تو زخم تقریباً تین انچ لمبا اور ایک انچ گہرا تھا .... مولانا نجیب میڈیکل کالج جانے کو تیار نہ تھے لیکن زبردستی انھیں وہاں لے جاکر داخل کیا گیا۔ اور علاج شروع ہوا۔ لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" اسی اثنا میں پیٹھ میں بھی ایک چھوٹی سی پھنسی نکلی جو بڑھتے بڑھتے سرطان کی شکل اختیار کر گئی آخرکار میڈیکل کالج لکھنؤ کے ایک مشہور سرجن سے رجوع کیا گیا۔ انھوں نے دیکھا اور آپریشن تجویز کیا۔ لیکن سرجن کو (جو ہاتھ کے آپریشن کو بہت معمولی سمجھ رہا تھا) خلاف توقع اس آپریشن میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ جب کہ سرطان کے آپریشن میں صرف پندرہ بیس منٹ ہی صرف ہوئے۔

صبر اور برداشت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دو دو بڑے آپریشن ہوئے لیکن کسی نے شکوہ تو درکنار ان کی زبان سے اف تک نہ سنی۔ بس اوراد و وظائف ان کا ہر وقت کا مشغلہ تھا۔ تاہم جو کرب اور سوز وہ محسوس کرتے تھے اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ؎

مشکل آساں کر نجیبؔ خستہ جاں کی اے خدا
واسطہ دیتا ہوں تجھ کو شبّر و شبیر کا

انتقال سے ایک رات قبل انھیں کرب و بے چینی کی وجہ سے نیند کے لئے خواب آور گولیاں دی گئیں تاکہ وہ سکون سے سو سکیں لیکن وہ پھر بھی نہ سوئے۔ صبح کو ڈاکٹر نے پوچھا "کیا سبب ہے کہ ایسی تیز خواب آور دواؤں کے استعمال سے بھی آپ کو نیند نہ آئی؟" فرمایا: "میرے بعض اشغال ایسے ہیں کہ رات کو نیند ہی نہیں آتی" پھر ایک قطعہ پڑھا ؎

طفلی و پیری جوانی دیکھ لی
تین دن کی زندگانی دیکھ لی
اب زمیں کا پیار باقی ہے نجیبؔ
آسماں کی مہربانی دیکھ لی

مولانا کو ذیابطیس کی شکایت بھی تھی جس کی وجہ سے اندمال زخم میں تاخیر ہوتی گئی اور آخرکار اسی حالت میں وقت موعود آپہنچا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۰ء بروز چہارشنبہ مطابق ۱۵ شعبان ۱۳۵۹ھ بوقت سوا نو بجے شب انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ الخ

ایسے آبادی سے گھبرائے کہ کہتے ہو نجیبؔ
گھر ہمارا لکھنؤ کے شہر سے باہر بنے

غزلیں

اشرف مالوی
مال ضلع لکھنؤ

حادثے مجبور ہو کر چشمِ تر میں آ گئے
دیکھئے پتھر بھی اب شیشے کے گھر میں آ گئے

اتنی سستی ہو گی رسوائی یہ سوچا بھی نہ تھا
آج اک سچ بول کر ہم بھی خبر میں آ گئے

جب در و دیوار پر کوئی نشاں ملتا نہیں
سوچتا ہوں زخم کیسے میرے سر میں آ گئے

اجنبی سے شہر میں یہ حادثہ کیسے ہوا
گھومتے پھرتے تمہاری رہگذر میں آ گئے

اللہ اللہ اک نگاہِ مہرباں کی دیر تھی
ہم بھی اے اشرف زمانے کی نظر میں آ گئے

ماجد جائسی
مسلم جوبلی گرلس انٹر کالج
چمن گنج کانپور

مجھے دعوتِ ابتلا دینے والے
رہیں شاد و فرحاں دعا دینے والے

یہ تائیدِ الفت ہے یا طنزِ بے جا
مجھے دیکھ کر مسکرا دینے والے

عیاں ہیں ترے دل کی بیتابیاں بھی
مجھے ضبط کا حوصلا دینے والے

تری آنکھوں میں بھی چھلک آئے آنسو
تجھے کیا ہوا حوصلا دینے والے

لبوں پر ترے کیوں نہ ہے پھر ذکرِ ماجدؔ
مجھے اپنے دل سے بھلا دینے والے

جوہر املوی
مولوی گنج لکھنؤ

نہ منکشف ہوا جب تک حیات کا مفہوم
غلط سمجھتے رہے کائنات کا مفہوم

مشاہدے میں نہیں جن کے روشنی دن کی
وہ کس طرح سے بتائیں گے رات کا مفہوم

ہمارا حال جو دیکھے گا خود سمجھ لے گا
ترے کرم کا ترے التفات کا مفہوم

خوشی ہو کوئی بھی سب کا ہے سلسلہ غم سے
نہاں ہے دن کے تصور میں رات کا مفہوم

وہ لفظ لفظ کی تشریح کر نہیں سکتا
سمجھ لو فہم سے جوہرؔ کی بات کا مفہوم

ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی
کرہ اعظم بیگ
لکھنؤ

بابا فرید قومی یکجہتی کے ستون

حضرت شیخ بابا فرید الدین مسعود گنج شکران صوفی سنتوں میں تھے جنھوں نے قلیل مدت میں ہندوستانی عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ ان کا تعلق صوفیوں کے چشتیہ سلسلے سے تھا۔ ان کی ولادت مغربی پنجاب (پاکستان) میں ملتان ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں کھتوال میں ۱۱۷۳ء میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد شیخ جمال الدین سلیمان گاؤں کے قاضی تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ملتان کے مقامی مدرسہ میں حاصل کی۔ ان کے استاد مولانا معراج الدین تھے۔ جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ملتان کے دورے پر تشریف لائے تو بابا فرید ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انھوں نے حضرت بختیار کاکیؒ کی شاگردی اختیار کرلی۔

بابا فرید نے ہمیشہ سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کا پیغام دیا۔ اس پیغام کی بدولت ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئے۔ بابا فرید کے پیغام کا نہ صرف ان کے ہم مذہب بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی احترام کرتے تھے۔ انھوں نے مذہبی رواداری پر بھی بہت زور دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ پنجابی کے عظیم شاعر بھی تھے۔ روحانی رشد و ہدایت کو پنجابی شاعری سمونے والے وہ پہلے شاعر تھے۔ چنانچہ سکھوں کے پانچویں گرو نے بابا فرید کا کلام سری گورو گرنتھ صاحب میں شامل کیا۔ ان کے کوئی ۱۳۴ اشلوک گرنتھ صاحب میں شامل کئے گئے تھے۔

بابا فرید میں پیار، محبت، ملنساری اور رواداری کا جو جذبہ تھا اس کی وجہ سے مختلف عقائد کے لوگ ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ہندو اور سکھ بھی ان کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا کہ مسلمان۔ وہ موت کی یاد دلاتے رہتے تھے جو کہ ناگزیر ہے۔ انسان دریا کے کنارے لگے درخت کی مانند ہے جو ایک نہ ایک دن گر جاتا ہے۔ انھوں نے لوگوں کو درس دیا کہ آپ گھاس کی طرح نرم اور ملائم بنیں، جب اس پر آپ چلتے ہیں تو یہ آرام دہ محسوس ہوتی ہے اور بغض یا عناد بالکل نہ رکھیں بلکہ آپ ظالم کو بھی بھول جائیں۔ اس طرح بابا فرید کے مذہب کو ایک آفاقی انسان دوست مذہب قرار دیا جا سکتا ہے۔ بابا فرید ایک جگہ خود سے کہتے ہیں کہ اے فرید اگر تجھ میں سچائی اور دانائی ہے تو تو اسے داغ دار نہ بنا بلکہ تو اپنے دل کو ٹٹول کہ تو کتنا گنہگار ہے۔ فرید پر

(بقیہ صفحہ ۸۶ پر)

غزلیں

حسن فراز
ادبستان لکھنؤ ۳

کیسے کیسے رستوں سے میں گزرا ہوں
ناہموار زمینوں سے میں گزرا ہوں

اک صحرا کو اپنانے کی خواہش میں
نہر، سمندر، چشموں سے میں گزرا ہوں

بوڑھی ہو گئی اب شہرت کی خواہش بھی
اتنے کہانی، قصوں سے میں گزرا ہوں

میری سماعت جاہل ہو سکتی ہی نہیں
نئے پرانے لہجوں سے میں گزرا ہوں

آئینوں نے طنز کئے ہیں مجھ پہ فراز
ایسے کیسے چہروں سے میں گزرا ہوں

نسیم ساغر
اورنگ آبادی
کلکتہ ۲۴

ہونٹ ساکت، آنکھ جامد، بجھتے منظر رات دن
ٹوٹتا رہتا ہے کوئی میرے اندر رات دن

پیاس کے پنچھی زبانوں پر اترتے ہی رہے
اور بہتے ہی رہے دریا سمندر رات دن

کس سے ملیے کون ملتا ہے خلوصِ دل کے ساتھ
بس وہی اک رسمِ کہنہ ہے یہاں پر رات دن

آئینہ ہوں چہروں کا ہر عکس ہے مجھ میں نہاں
اس لیے پتھر کی زد میں ہے مرا سر رات دن

ان سے مل کر آج مجھ کو بھی یہ اندازہ ہوا
کس لیے باہم ملا کرتے ہیں ساغر رات دن

جاوید لکھنوی

دل یہ کہتا ہے کہ گزرے ہوئے منظر دیکھوں
زندگی آ، ترے اوراق پلٹ کر دیکھوں

دھوپ اوڑھے ہوئے پھرتا ہوں دن بھر یارو
شب کو گھر آؤں تو تپتا ہوا بستر دیکھوں

تیری پرچھائیاں کرتی رہیں مجھ سے باتیں
تیری یادوں سے مہکتا ہوا گھر بھر دیکھوں

آبلے پاؤں کے کہتے ہیں ملے اذنِ سفر
حوصلے کہتے ہیں کیوں جانبِ رہبر دیکھوں

کہکشاں چاند ستارے نہ گلوں کی چادر
زندگی تیری ہر اک راہ میں پتھر دیکھوں

نام رہ جائے زمانے میں مرا بھی جاوید
عاشقی زہر سہی، زہر کو پی کر دیکھوں

م. ق. خاں
حکیم عنایت کالونی
گیا (بہار)

افسانہ

قسمت کا کھیل

میری تمام تر کوششوں کے باوجود میرے ذہن پر نقش وہ منظر نہیں مٹتا۔ اور بار بار یہ سوال کنکھجورے کی طرح میرے احساسات کو ڈستا ہے۔ کہ لوگ کیوں اپنا گھر، اپنے لوگ اور اپنا وطن چھوڑ کر اس دیارِ غیر میں چلے آتے ہیں جہاں ان کے ساتھ جانوروں سا سلوک ہوتا ہے؟ شاید ڈھیر ساری دولت بٹورنے کی آرزو یا ممکن ہے ان کی ضرورتوں اور غربت کا پھنکارتا سانپ انھیں وطن چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے؟ ہو سکتا ہے یہ محض ہوس ہو یا سماج میں سر اونچا کر کے زندہ رہنے کی خواہش ان کی ساری غیرت و حمیت کے احساس کو تھپکی دے کر سلا دیتی ہے۔

ان کی ضرورت اور اہمیت بس اس لئے کہ یہ لوگ کم اجرت لے کر ہر طرح کا سخت سے سخت کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی حادثہ کا شکار ہوتے ہیں تو کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا یا لقمۂ اجل بن جاتے ہیں تو ان پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوتا۔ ہمدردی اور انسانیت کا سارا جذبہ یکسر خشک ہو جاتا ہے۔

یہ جون کا مہینہ ہے۔ اس جگہ گرمی کی شدت مشہور ہے لیکن میرے رگ و پے میں کپکپی سرایت کر رہی ہے۔ ابھی رات کا پچھلا پہر ہے۔ سارا علاقہ خاموشی کی گود میں محوِ خواب ہے مجھے نیند نے اپنی گرم اور نرم بانہوں میں پناہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ مجھے جسمانی آرام و آسائش کے سارے سامان مہیا ہیں لیکن لوحِ ذہن پر مرتسم وہ دردناک منظر مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ ایک لاش، میرے ایک ہم وطن کی لاش پڑی ہے جس کا کوئی عزیز یہاں نہیں ہے۔ ساتھ کام کرنے والے مزدور ضرور ہیں لیکن ان کے لیے کام کرنا زیادہ ضروری ہے۔ ہمدردی اور آنسو بہانے کے لئے بھی فرصت چاہئے، موافق حالات ہونے چاہئیں۔ اگر وہ آنسو بہاتے رہ گئے تو ان کی ایک دن کی اجرت کٹ جائیگی، یا کیا بعید کہ انھیں کام سے برطرف ہی کر دیا جائے اور تب کیا ہوگا؟ یہ سوال ہمیشہ عفریت کی طرح ان مزدوروں پر مسلط رہتا ہے۔ یہاں سے ہزاروں میل دور ایک پورا کنبہ اس کی واپسی کا منتظر ہوگا۔ بیوی اپنے شوہر کے انتظار میں نیند حرام کر رہی ہوگی، بچے باپ کی واپسی کی راہ تک رہے ہوں گے، بوڑھے ماں باپ اپنے لاڈلے کو دیکھنے کیلئے بے چین ہونگے۔

اس نے پہلی ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ جو کسی سرکاری اسپتال میں ڈریسر تھا اب گھر پر بیکار ہے، ماں فالج زدہ ہے۔ اس کی بیوی کا نام نجمہ ہے اور اس کی سب سے بڑی لڑکی مشتری ہے جس کی عمر پندرہ سولہ سال ہے۔ اس کے دو لڑکے ہیں۔ ایک آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے اور دوسرا جو ابھی صرف سات سال کا ہے گاؤں کے مکتب میں پڑھتا ہے۔ آبائی مکان ہے جس کا کچھ حصہ سیلاب کی زد میں آکر گر گیا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی نے ہی اسے اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔

میں اس دن پہلی بار اس جگہ پر گیا تھا۔ مجھے اس جگہ کچھ کام کرنا تھا وہاں عمارت کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ وہاں کام کرنے والے سارے مزدور ہندستان کے کسی نہ کسی حصے سے آئے تھے۔ وہ بڑی جانفشانی سے کام کر رہے تھے میرے ذہن میں سوال اٹھ رہا تھا کہ اگر اتنی محنت اور لگن سے لوگ اپنے ملک میں کام کرتے تو شاید ہمارے ملک کی معاشی

حالات کہیں بہتر ہوتی اور لوگوں کو اپنا سب کچھ چھوڑ کر یوں پردیس میں بھٹکنا نہیں پڑتا

ابھی میں یہ باتیں غور ہی کر رہا تھا کہ دھپ کی آواز اور لوگوں کی چیخ پکار سے میرا دھیان اس جانب گیا۔ ایک مزدور پہلی منزل سے نیچے سڑک پر آ گرا تھا۔ وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے اور ہر طرف کام بند ہو گیا تھا۔ اسی وقت ٹھیکہ دار وہاں پہنچا اور اس نے لوگوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ سب بھیڑوں کی طرح اکٹھے کیوں ہو گئے ہو؟ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے چلو اپنے اپنے کام پر لگو۔"

ٹھیکے دار نے جیب سے پچاس روپے نکالے اور ہوا میں نوٹ کو لہراتے ہوئے ایک دوسرے مزدور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر سے مرہم پٹی کروا لو۔ کوئی خاص بات نہیں اور ہاں اپنے کام پر جلد لوٹ آنا۔"

ٹھیکیدار نے ایک دوسرے مزدور سے اس زخمی آدمی کا نام دریافت کیا اور رجسٹر میں اس کے نام کے سامنے لکھ دیا۔ "علاج کے لیے پچاس روپے"۔ اور پھر ہر طرف کام شروع ہو گیا۔ سارے لوگ اس حادثہ کو بھول گئے۔

پتہ نہیں کیوں شام کے وقت میرے دل کے اندر یہ خواہش مچلنے لگی کہ میں ذرا مراد کو دیکھ آؤں کہ ڈاکٹر نے اسے کیا کہا اور کیا علاج کیا؟ وہاں خیموں اور ٹین کی چھت کے مکانوں کی بستی تھی۔ کہیں دھواں نکل رہا تھا اور کہیں عورتیں برتن مانجھ رہی تھیں۔ کہیں مرد بیٹھے ٹرانسسٹر سن رہے تھے یا خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ مجھے دیکھ کر سب لوگ دم بخود ہو گئے۔ کچھ نے آگے آکر سلام کیا۔ کچھ اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ عورتوں نے دوپٹوں اور چادروں کے گھونگھٹ نکال کر اپنے چہرے چھپا لیے۔ ان سارے لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن کسی کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میرے آنے کی وجہ دریافت کرے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ صاحب لوگ ادھر دو کاموں سے ہی آیا کرتے تھے۔ یا تو انھیں کسی عورت کی ضرورت ہوتی تھی یا پھر وہ یہ اعلان کرنے آتے تھے کہ کام ختم ہو گیا ہے اور انھیں مزدوروں کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں ان کے لیے نہایت سوہانِ روح ہوا کرتی تھیں۔

میری نظریں مراد بخش کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر میری نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ ایک کھاٹ پر گٹھڑی سا پڑا تھا۔ میرے منھ سے فوراً نکلا "کیسے ہو؟ ڈاکٹر نے کیا کہا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

مراد بخش کے چہرے پر میلی سی مسکراہٹ پھیل گئی جو اس کے مضمحل چہرے پر بالکل بیجان سی لگ رہی تھی "یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"خدا کرے تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے ضرور خبر کرنا۔" اتنا کہتے ہوئے میں اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سارے لوگ متحیر میری جانب دیکھنے لگے۔ اسی وقت ایک شخص کہیں سے کرسی لے آیا اور اس کھاٹ کے قریب رکھ دی۔ اور ضد کر کے مجھے کرسی پر بٹھا دیا میں بہت دیر تک ان کے بیچ بیٹھا رہا۔ ان میں سے کئی لوگوں کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔ مراد بخش نے گفتگو کے دوران کہا "حضور کسی نے آج تک ہم لوگوں سے ایسی ہمدردی نہیں کی۔"

ان سے پتہ چلا کہ اس جگہ انھیں ایک دن کی مزدوری پچاس روپے ملتی تھی اور اگر رات میں چار گھنٹے کام کر لیتے تھے تو دن بھر کی مزدوری مزید مل جاتی تھی۔ مراد بخش نے کہا کہ چونکہ اس کی لڑکی جوان ہو رہی تھی اور اس کی شادی کے لیے اسے زیادہ پیسے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح سارے لوگوں کے سامنے کچھ نہ کچھ مسئلہ تھا۔ کسی کا بھائی زیر تعلیم تھا تو کسی کی فصل سیلاب سے برباد ہو گئی تھی تو کہیں خشک سالی نے انھیں مجبور کر دیا تھا۔ سب کو اس بات کا احساس تھا کہ جیسے ہی ان کی ضرورت پوری ہو جائے گی وہ فوراً اپنے ملک واپس چلے جائیں گے۔ اپنے گھر اور وطن کی بات یاد کرتے تو ان کے چہرے تمتما اٹھتے اور آنکھوں کے گوشوں میں آنسو جھلملانے لگتے۔

اس حادثہ کے کوئی آٹھ مہینے بعد میں پھر وہاں گیا تھا۔ میں قریب چار بجے دن میں وہاں گیا تھا۔ آج پھر اسی عمارت کے سامنے کچھ لوگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ ہر طرف کام بند تھا۔ اس دائرہ کا مرکز مراد بخش تھا جو دوسری منزل سے گر کر مر گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ لوگوں نے راستہ

(بقیہ ص ۹۶ پر)

نونیت رشی مکھ

ترجمہ: سید وقار حسین
ماہم: بمبئی

مراٹھی افسانہ

مظلوم

رات کے بھیانک اندھیرے میں سات پڑے گاؤں کا وسیع وعریض پہاڑ کسی جنگلی کی مانند کھڑا تھا۔ پہاڑ کی بلندی پر بہرام بابا کے مندر کی مشعل ٹمٹما رہی تھی، آس پاس کی جھاڑیوں سے کیڑوں مکوڑوں کے ــــ رینگنے اور کلبلانے کی آواز نے ایک بھیانک سماں باندھ دیا تھا۔

گھنشیام نے آنکھیں کھولیں۔

ان گنت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان۔ لمحہ بھر کے لئے وہ سوچتا ہی رہا کہ وہ کہاں ہے۔؟ اس نے بیٹھنے کی کوشش کی مگر جسم کے جوڑ جوڑ میں اسے درد سا محسوس ہوا، سر بھی بھاری تھا، سر پہ ہاتھ پھیرتے ہی اسے ایک زخم سا محسوس ہوا۔ سر سے خون جاری تھا۔ مجھے کیا ہوا ــــ؟ میں یہاں کیسے پہنچا ــــ؟

کوشش کرکے اٹھ بیٹھنے میں وہ کامیاب ہوا۔

سامنے بہرام بابا کی مورتی دیکھ وہ سمجھ گیا کہ میں بابا کے مندر میں ہوں۔ پر میں اتنی رات گئے مندر میں کیسے ــــ؟ ذہن پر زور ڈالا لیکن نسیں تنی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بابا کی مورتی کو وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ہاتھ جوڑے، ایسا کرنے میں بھی اسے درد سا محسوس ہوا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ گھنگھور اندھیرے میں اس نے آس پاس کے پہاڑی علاقے پر نظر دوڑائی خوف و ہراس سے اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر سے میں پہاڑی کے اس مندر میں مردے کی مانند پڑا ہوں۔ کسی خونخوار جانور نے بو سونگھ لی ہوتی تو مجھے کھینچتے ہوئے پہاڑ کی اوٹ میں لے گیا ہوتا ــــ پر نہیں ــــ یہ بہرام بابا کی مہربانی تھی کہ ......

مورتی کے پاس آکر اس نے اپنا سر ٹکایا۔

اطراف کے پتھریلے کھمبوں پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ اور اس روشنی میں بہرام بابا چمک رہے تھے سیندور سے نہائی ہوئی مورتی من کو موہ رہی تھی۔

وہ کھمبوں پر جلتی ہوئی مشعلوں کی جانب دیکھنے لگا۔ ہوا کے جھونکوں سے ان کی لویں ایک ہی سمت لپلپا رہی تھیں۔ اسے لگا گویا وہ اس کے سینے میں پھڑپھڑا رہی ہیں پھر اسے یاد آنے لگا۔

گھنشیام سکھو دیو پاٹل ــــ ایک مظلوم ــــ ایک بڑے گھرانے کا دوسرا وارث ــــ نادگاؤں ــــ ساتپڑا کے قریب کا ایک چھوٹا سا گاؤں ــــــ گذرے ہوئے ایک ایک حادثے کو اس نے جوڑنا چاہا۔ اور وہ اسی کوشش میں جٹ گیا۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پانی کی موٹی

موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ گھنشیام نے مندر سے اٹھ کر مُوسی کے گھر کی جانب چلنا شروع کیا۔ پھر وہ روزانہ صبح و شام مندر کے پاس والے چبوترے پر چپ چاپ آبیٹھتا۔ گاؤں کا کوئی نہ کوئی شخص اس سے پوچھ ہی لیتا۔ کس گاؤں کے ہو ——؟

"نادگاؤں بیرم" وہ بول اٹھتا۔

"کس کے یہاں آئے ہو ——؟

"وٹھا تائی ہے نا، یہ اس کا بھتیجا ہے"، کوئی دوسرا آدمی جواب دے دیتا۔

پندرہ روز اسی طرح گذر گئے۔ پھر اس نے سوچا پہلے ہی مُوسی کا گھر بچوں سے بھرا ہوا ہے۔ بوڑھوں کی بھی کچھ کمی نہ تھی۔ ان میں اپنا اضافہ؟ ان خیالات میں وہ کھویا ہوا بھیگتا مُوسی کے گھر میں داخل ہوا۔ اندر کے کمرے سے بجلی کے کوندے کی مانند الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے۔

"وہ موا پندرہ روز سے آکر مفت پڑا ہے، اس کے آگے چار روٹیاں پھینکنی ہی پڑتی ہیں"۔ وہ جان گیا یہ الفاظ اس کی مُوسی کے نہیں! "مُوسی کی ساس کے تھے۔ جو اسے غیر حاضر سمجھ کر جو جی میں آیا بکے جا رہی تھی۔ کہہ دینا موے سے کہ اِدھر سے کھسک لے، اس کے باپ دادا کی کوئی جائیداد ہمارے پاس نہیں ہے۔

مُوسی کی ساس کی گھن گرج سے اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ سوچنے لگا۔ "میں کتنا بے غیرت ہوں۔ اب یہاں سے چلنا ہی چاہیئے۔

سکھارام دادا نے جو کہا میں نے وہی کیا۔ اس نے حکم دیا اور میں نے مانا۔

...... جب سکھارام کہتا تھا کہ بیٹھ جاؤ، تب ہی میں بیٹھتا تھا ورنہ اس کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔

میں نے جب شادی سے انکار کر دیا تھا تب اس نے گرج دار آواز میں کہا تھا۔

کیوں بے کیسے شادی نہیں کرے گا"؟ میں نے اس کا حکم مانا اور شادی کے لئے راضی ہو گیا۔

"اپنے حصّے کی زمین بھی اس سے مانگتے نہ بنی"۔

"بھلا کب تک میں اس طرح در بدر گھومتا پھروں سکھارام نے جب سے شانتی کو کویں میں دھکیلا ہے، یوں ہی بھٹک رہا ہوں۔ میری اپنی بیوی کو سکھارام نے میری آنکھوں کے سامنے مار ڈالا میں خود گواہ ہوں۔ شانتی کو بچانے کے لئے میں سکھارام کو کیوں نہ روک سکا"؟

بجلی آسمان پر کوندتی ہوئی نکل گئی اسے ایک کپکپی سی محسوس ہوئی۔ موسلا دھار بارش ہی میں وہ گھر سے باہر نکل پڑا۔

گھنشیام متواتر چلتا ہی رہا۔ "کتنی دور نکل آیا ہے"؟ اس کا بھی اسے پتہ نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مُوسی کے گھر سے دور بہت دور نکل جائے۔ وہ آندھی طوفان کی طرح چلتا ہی رہا ...... بارش تھم گئی تھی، بادل تیزی سے صاف ہو رہے تھے، اس کے کپڑے جسم سے چپک گئے تھے، تھک کر وہ چور چور ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "میں سکھارام کی مخالفت نہ کر سکا۔ شانتی کو نہ بچا سکا"۔

کنویں میں گرتے وقت اس کی آنکھیں آخری لمحے تک میری ہی متلاشی تھیں۔ میں سیڑھیوں پر کھڑا دیکھ رہا تھا، صرف دیکھتا رہا، کسی کتے کی مانند چھی چھی، مجھے جینے کا کوئی ادھیکار نہیں، میں ایک زندہ لاش ہوں، میں مر کیوں نہ گیا؟ پر مرنے کے لئے بھی تو ہمت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

سڑک کے دونوں طرف لگے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں میں اس نے دم لیا۔ ماحول کی ہریالی میں

وہ کھو سا گیا۔ اس کے تصور میں سرخ ساڑی اور سرخ چوڑیاں پہنے ہوئے سہاگ رات والی شانتی گھوم گئی۔

"کوئی دیکھے گا ــــ"

" ارے میاں بیوی کو کسی نے دیکھا بھی تو کیا ہوا ــــ؟"

" وہ دیا۔"

" رہنے دو۔"

" اوں ہوں مجھے شرم آتی ہے۔"

" شادی کے بعد شرمایا نہیں کرتے۔"

" میں عورت ذات ہوں"

" شوہر کے ساتھ بیوی کو ایک انسان اور دوست بن کے رہنا چاہیے"۔

شانتی کا لجایا چہرہ لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں چھا گیا، اپنی بیوی کو پہلی ہی رات انسانیت کا سبق سکھایا تھا اس نے، پر خود ــــ؟ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کوئی ڈنڈا اٹھا کر سکھارام کے سر پر دے مارنا چاہئے تھا۔ مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا، گالیاں دیتے گھسیٹتے سکھارام شانتی کو کنوئیں کے پاس لایا۔ اور ڈھکیل دیا، میں گھبرا گیا، گاؤں کے لوگ کوٹھی کے کنوئیں کے پاس جمع ہوئے، میں بھی ان ہی کے ساتھ تھا، گویا کوٹھی اور شانتی سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا، پنچ نامہ ہوا۔ سکھارام اور دیوان جی نے کہہ دیا کہ " پاؤں پھسل کر کنوئیں میں گر گئی ــــ! ایسا کہتے وقت سکھارام کی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں، ان آنکھوں میں شانتی کا خون تھا۔ میں گونگا ہو گیا تھا، اس وقت منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

میرا چچازاد بھائی ــــ سکھارام، بھائی یا دشمن؟ خون کے رشتے میں بھی ایسی دشمنی، اس کا پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا مجھے، سکھارام نے شانتی کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ ایک رات قبل ہی شانتی نے کہا تھا۔

" سکھارام بھاؤ (بھائی) کی نیت کچھ ٹھیک نہیں ہم کہیں دوسری جگہ جا کر رہینگے۔ اپنے حصے کی زمین مانگ لو۔ کھیت ہی میں جھونپڑی ڈال لیں گے۔ راجا رانی کی طرح خوش رہینگے"۔

وہ اٹھا اور چل دیا۔ بس اڈے کی جانب۔ نادگاؤں کو جانے والی آخری بس کب کی نکل چکی تھی، بس اسٹینڈ کی بینچ پر اس نے اپنا جسم جھونک دیا، نہ جانے نیند نے اسے کب دبوچ لیا۔

صبح کی پہلی ایس، ٹی بس سے گھنشیام نادگاؤں کے موڑ پر اترا۔ ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر گاؤں تھا، سات پیڑے کا وسیع پہاڑ اور اس کی اوٹ میں بہرام بابا کا مندر۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا، وہ نادگاؤں کو جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ خیالات میں گم ....

گاؤں جا کر سکھارام سے اپنے حصے کی زمین مانگوں گا، اب کتوں کی طرح جینا ختم، سکھارام کی عیاشیوں کا خاتمہ، اس کا رعب گاؤں پر چلتا ہوگا، میں کیوں خوف زدہ رہوں ــــ؟ یوں بھی اب زندگی دھول میں مل چکی ہے، سکھارام کے کرتوتوں کا گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹ کر رہوں گا۔ وہ گاؤں کے اچھے کاموں میں آگے آگے رہتا ہے۔ اس نے اسکول اور ہسپتال اس لئے بنوایا کہ ان کارناموں کے عوض گاؤں والے اس کے احسان مند رہیں۔ پر اب میں گاؤں والوں سے یہ چلا چلا کر کہوں گا۔ یہ اسکول یہ دواخانہ گاؤں میں بنوانے والا سکھارام اپنے پاپ چھپانے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

پگڈنڈی سے وہ اکیلا گذر رہا تھا۔ راستے کی چکناہٹ کل کے بارش کی غماز تھی، وہ سوچنے لگا، قدرت ہی کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ گرمی کے موسم میں برسات ہوتی ہے بارش کے موسم میں کڑکڑاتی دھوپ نکل آتی ہے، انسان اپنے قواعد کیوں نہ توڑے؟ مجھے بھی زمانے کے ساتھ بدلنا چاہیئے ــــ یوں لاچاری کا جینا بھی کوئی جینا ہے ــــــ!

سکھارام کی دوسری بیوی ہو بہو سکھا رام کی مانند ظالم، سب کے حصے ہڑپنے والی، پہلی بھابھی کتنی اچھی تھی۔ دوسروں کو اپنی تھالی سے کھلانے والی۔ پر وہ ماں نہ بن سکی اس لئے سکھارام نے اسے ہمیشہ کے لئے میکے بھیج دیا۔ بڑی بھابھی کی یاد نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔ سوچنے لگا یہ دنیا اچھے انسانوں کے لئے نہیں ہے۔ یہاں سکھارام جیسے لوگ ہی راج کر سکتے ہیں۔ اگر بڑی بھابھی گھر میں ہوتیں تو مجھ پر یہ سب کچھ نہ بیتا ہوتا۔

سامنے والا پہاڑ گویا گاؤں والوں پر اپنی چادر تانے کھڑا تھا۔ گھنشیام نے سوچا بالکل اسی کی طرح سکھارام نے بھی گاؤں والوں پر ایک چادر سی تان رکھی ہے۔ کانٹے کی مانند میرے دل میں چبھنے والا سکھارام چھ فٹ اونچا اس کے آگے میرا کھڑا رہنا بھی محال ہے، پھر بھی کیوں جا رہا ہوں میں گاؤں کی جانب؟ شائد اپنی زمین کی کشش مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے یا کوئی اور موہ۔! اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

انھیں خیالات میں گھرا وہ اپنے گھر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ کالے پتھروں سے بنے اس آبائی گھر میں خاندان کی کئی پیڑھیاں رہتی چلی آئی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے خیالات خاندان کے شاندار ماضی میں کھو گئے۔

اپنے باپ کے بعد کی پیڑھی۔
باپ سکھدیو پاٹل۔

بھائی یعنی اپنے چچا اجاب راؤ۔ اس سے قبل دو لڑکے خاندان کی کسی پیڑھی میں پیدا نہیں ہوئے تھے پچھلی پیڑھیوں میں چار لڑکیاں ایک ہی لڑکا اب دو بیٹوں کے جنم پر پاٹل گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں قابل اور شریف نکلے، ان کی شادیاں ہوئیں، لیکن پھر ان کے یہاں بھی لڑکیاں ہی ہوئیں۔ بہرام بابا کے مندر میں منت مانی گئی دس سالوں بعد سکھارام اور چار سال بعد میرا جنم ہوا چیچک کی وبا نے سارے گاؤں کو لپیٹ میں لے لیا۔ سکھارام کی دو اور میری دو بہنیں ایک ہی وقت میں چل بسیں۔ گھر سے چار ارتھیاں ایک ہی وقت اٹھائی گئیں۔

کوئی کہتا ــــــ "یہ بہرام بابا کا قہر ہے"۔
کوئی کہتا ــــــ پاٹل گھرانے کو کسی کی بد دعا لگ گئی ہے۔

گھر خالی ہوتا گیا۔

سکھارام آزاد قسم کا انسان تھا۔ ہر وقت نشے میں دھت، گاؤں کی کئی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے والا، دوسروں پر ظلم کرنے والا۔

اچانک سامنے وہ کنواں دکھائی دیا۔ قدم اسی طرف کھنچتے چلے گئے۔ یہی وہ کنواں ہے جس میں شانتی نے دم توڑا تھا۔ اور میں سامنے سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔

وہ کنویں کی منڈیر سے اندر کی طرف جھانکنے لگا یوں لگا گویا کنویں کی تہہ میں آکاش اترا ہو۔ اندر اسے شانتی کی پرچھائیں سی دکھائی دی، اسے لگا جیسے وہ کنویں سے پکار کر کہہ رہی ہے۔

"سکھارام بھاؤ کی نیت کچھ ٹھیک نہیں ......"
اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنکھوں کا پانی کنویں میں ٹپکا۔

"کون ہو تم ___؟" گرجدار آواز سن کر وہ سہم سا گیا۔

سامنے سکھا رام، اس کی بیوی بگولا اور گھر کے نوکر کھڑے تھے۔ سکھا رام کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اس کے جسم میں لرزش سی ہوئی۔ ہمت کر کے بول اٹھا___

"میں___ میں گھنشیام۔"

"کہاں گیا تھا تو اتنے دن سے۔" سکھا رام گرج پڑا۔

"ابے بول، کہاں گیا تھا___؟"

"موسی کے گھر شیرگاؤں میں۔"

"شیرگاؤں___؟ اور ایسی حالت میں۔"

........" نادگاؤں کے سکھا رام پاٹل کا خاندان سات پڑا کے قرب و جوار میں مشہور ہے۔ اور اس کا بھائی بھکاریوں کی طرح در در بھٹک رہا ہے۔"

لمحہ بھر کو خاموش رہ کر سکھا رام نے پھر پوچھا۔

"تو پھر اب واپس کیوں آیا___؟"

گھنشیام نے سوچا موقع اچھا ہے، کیوں نہ حصے کی زمین مانگ لوں؟ وہ بلا جھجھک بول پڑا۔

"مجھے میرے حصے کی جائیداد چاہیئے۔"

گھنشیام کے منھ سے سکھا رام نے پہلی مرتبہ اس قسم کے الفاظ سنے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، نوکروں کے سامنے چھوٹا بھائی منھ کھولے اور اپنے حصے کی جائیداد مانگے یہ اسے منظور نہ تھا۔ غصے سے لال پیلا ہوا۔

"زمین کے حصے کے واسطے آیا ہے تو، بہت بولنا سیکھ گیا ہے باہر جا کر۔"

گھنشیام صرف سنتا رہا۔

"جانتے ہو کس کے سامنے بول رہے ہو___؟"

نادگاؤں کے سکھا رام پاٹل کے سامنے۔" گھنشیام کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ اس کے اس جواب سے سکھا رام کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پیشانی کی نسیں تن گئیں، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں، کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ بگولے تیرا دیور کتنا سیانا ہو گیا ہے، پورا مرد لگتا ہے اب تو یہ۔ اسے زمین کا حصہ چاہیئے، سکھا رام پاٹل کے سامنے منھ کھولنے کی اب اس میں ہمت آ گئی ہے۔"

سکھا رام اتنا کہہ کر بیلوں کے گوڑے کی جانب گیا، بیل ہانکنے کی چھڑی اٹھائی اور پھر گھنشیام کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا چاہتے ہو زمین کا حصہ؟ یہی نا___"؟

گھنشیام نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"صرف اپنے حصے کی زمین مانگ رہا ہوں۔"

"لے پھر اپنا حصہ" یہ کہہ کر سکھا رام اسی چھڑی سے اس کے جسم پر کوڑے برسانے لگا۔

سٹاسٹ، سینے پر، ہاتھ پر، پیر پر۔

گھنشیام بھینچ رہا تھا، گھر کے آنگن میں دوڑ رہا تھا، سکھا رام کے ہاتھ کی چھڑی بے رحمی سے اس پر برس رہی تھی، خون بہنے لگا۔

"تو نے شانتی کو مارا، تو حیوان ہے پورے گاؤں والوں سے میں یہ چلا چلا کر کہوں گا۔" بپھرے ہوئے جانور کی مانند سکھا رام اسے پیٹتا رہا نوکر چاکر سب تماشائی___ بنے چپ چاپ کھڑے رہے۔

گھنشیام ادھ مرا ہو گیا اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔

سکھا رام نوکروں کی جانب دیکھ دہاڑا۔
"ٹکا رام اسے پہاڑی سے نیچے پھینک دو۔"

∴

بہرام بابا کے مندر نشیں بیٹھا ہوا گھنشیام ڈھل چکا تھا۔ گھر کے اس جان لیوا حادثے کے بعد نوکروں نے مجھے یہاں لا پھینکا ہوگا۔ گاؤں میں پس آکر کیا پایا میں نے؟

اس خیال کے آتے ہی اسے اپنے جسم میں یک طاقت سی محسوس ہوئی آنکھوں میں جو الائیں سی اٹھیں، بہرام بابا کے پیروں میں سر ٹیک کر سی پختہ ارادے سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جسمانی تکلیف کا احساس اب اسے کچھ ہو رہا تھا۔ بدلے کی آگ میں جسم سن سنا رہا تھا ٹھیے پر جلتی ہوئی ایک مشعل اس نے ہاتھ میں لی مندر سے باہر آیا پہاڑی کی اونچائی سے نیچے نظر دوڑائی۔

نیچے ناد گاؤں نیند کی آغوش میں پڑا تھا۔

∴

سات ٹپّا کے قرب و جوار میں یہ بات پھیل گئی۔ کہ بہرام بابا ناراض ہو گئے۔

"پاپ بڑھنے کے کارن بابا ناراض ہیں۔"
"سکھا رام پاٹل نے ڈھیروں پاپ کئے۔"
"بابا نے گھر کے ساتھ اسے بھی راکھ کر دیا۔"
کسی نے کہا ——
"بھائی کو مار کر پہاڑی پر پھینک دیا۔"
"بابا کی بد دعا نے اسے بھی نہیں رکھا۔"
"پاٹل گھرانے ہی کو شراپ تھا کہ یہ شان باقی نہ رہے گی۔"
"پر یہ جائیداد اب کس کے حصے میں۔؟"
لوگ خیال آرائی کرتے رہے۔

اب بھی بابا کے مندر میں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں شردھالو جمع ہوتے ہیں، ان میں ایک پاگل بھی نظر آتا ہے۔ وہ گاؤں آکر اپنے جلے ہوئے گھر کی راکھ کریدتا ہے اور گھر کے کالے پتھروں کو آنکھوں سے لگاتا ہے۔ پھر کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر اندر جھانکتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے تو کبھی روتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں۔
"وہ سکھا رام پاٹل کا بھائی گھنشیام ہے۔"

★

(صفحہ ۔۔ کا بقیہ) **بابا فرید**

جو ہاتھ اٹھاتے ہیں فرید انتقام میں ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔

ان بزرگ ہستیوں نے، ان صوفیوں، سنتوں نے اپنے قول و عمل اور کردار و گفتار کے ذریعہ ہمیشہ غربت کے پردے اٹھا دینے، اتحاد و اتفاق اور قربت و ہم آہنگی کا درس دیا۔ آج کے پس منظر میں، (جبکہ قومی یک جہتی کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے) اس کی معنویت اور افادیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔

ان بزرگ ہستیوں نے، ان صوفیوں سنتوں نے ہر مذہب ہر عقیدے کا ہمیشہ احترام کرنے کی تلقین بھی کی۔ کیونکہ ان کا یقین اس پر تھا کہ ے

پابند نہیں جلوۂ آزاد مکاں کا
یکساں ہیں صفی دیر و حرم اپنی نظر میں

——— • ———

خورشید ملک
تاریخ کلی شاہجہاں پور

افسانہ

سرد آہ

بات گذشتہ سردیوں کی ہے۔

اس دن رمضانی سرِ شام ہی گھر واپس آگیا تھا۔

کئی دنوں سے پورا صوبہ سخت سرد لہر کی گرفت میں تھا۔ شام ہی سے کہرا گرنا شروع ہو جاتا تھا اور رات ہونے تک اتنی شدت اختیار کر لیتا تھا کہ قریب کی چیز بھی دیکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اس کہرے کا اثر دوسرے دن دوپہر تک قائم رہتا تھا، سورج کے دیدار روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح دشوار ہو گئے تھے، بازاروں کی رونق غائب ہو گئی تھی۔ چاروں طرف پھیکا اور بے کیف ماحول طاری رہتا تھا۔ تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے تھے۔ ریل گاڑیاں اور بسیں اپنے مقررہ وقت سے کافی پیچھے چل رہی تھیں۔ غرضیکہ سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ عوام کا ہر طبقہ پریشان تھا خصوصاً غریبوں کے لئے وہ موسم جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایام ان کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ روزانہ اجرت پر کام کرنے والے، رکشہ چلانے والے مزدوری کرنے والے، بھیک مانگنے والے اور خوانچہ لگانے والے اپنے پیٹ کی آگ کو سرد کرنے میں بے حد دقت محسوس کر رہے تھے۔ ان کا دھندہ ہی چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ لوگ خالی پیٹ اپنی شکستہ جھونپڑیوں میں دُبک کر سرد لہر کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس جدوجہد میں وہ نہ صرف اپنی بے بس انداز کی ہوئی مختصر پونجی ختم کرتے جا رہے تھے بلکہ اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت بھی گنواتے جا رہے تھے۔ خدا بھلا کرے ریلوے کراسنگ کے قریب پرانے گرم کپڑے بیچنے والوں کا جو عوام کی اس موسم میں بڑی مدد کر رہے تھے۔ اچھی خاصی حیثیت رکھنے والے بھی ان کپڑوں کو خرید رہے تھے کیونکہ نئے گرم کپڑوں کی آسمان کو چھوتی ہوئی قیمت اور تقریباً قیمت ہی کے برابر سلائی کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ صوبائی حکومت کی جانب سے دیہی علاقوں کے اہم مقامات پر اور شہروں کے چوراہوں پر رات بھر آگ جلائے رکھنے کے احکامات صادر ہو چکے تھے۔ مگر سرکار کے بھرپور تعاون کے باوجود عوام سردی کے غیظ و غضب کی تاب لانے میں از حد بے بسی محسوس کر رہے تھے۔

رمضانی بھی انھیں لاتعداد لوگوں میں شامل تھا۔ تیس برس کا رمضانی چند سال قبل ایک خوبصورت جسم کا مالک تھا۔ لیکن اب اس کے جسم میں گھن لگ گیا تھا۔ وہ پندرہ برس کی عمر سے رکشہ چلا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے، کھانسی کی شکایت رہنے لگی تھی اور رات میں بخار بھی رہنے لگا تھا۔ اب اس کا دم بھی بہت جلدی پھول جاتا تھا۔

وہ اپنے ضعیف والدین کا اکلوتا سہارا تھا۔ اس کی ماں دمہ کی پرانی مریضہ تھی۔ اس کی کمائی کا کافی حصہ ماں کے علاج پر خرچ ہو جاتا تھا۔ بقیہ رقم سے بہ مشکل تمام دونوں وقت کی روکھی سوکھی خوراک کا انتظام ہو پاتا تھا۔

وہ اکثر سوچتا تھا کہ ایک سیٹھ کا لڑکا سیٹھ بن جاتا ہے اور ایک مزدور کا لڑکا مزدور بن جاتا ہے، اس ترتیب میں تبدیلی کیوں نہیں ہوتی؟ اگر کہیں تبدیلی ہوتی بھی ہے تو ان کی تعداد اتنی کم ہے جیسے کہ گیہوں میں گھن۔

وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ ایک لاکھ روپئے کے دو لاکھ آسانی سے بن سکتے ہیں مگر ایک روپئے سے دو روپئے آسانی سے کیوں نہیں بن سکتے؟ آخر معاشی اور اقتصادی نظام میں یہ جمود کب تک قائم رہے گا؟ رمضانی نے زندگی کی تلخ حقیقت کا بہت دنوں تک سامنا کیا تھا، یہی وجہ تھی کہ بالکل جاہل ہونے کے باوجود اس قسم کے خیالات اس کے ذہن میں اکثر و بیشتر ابھرتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور اس کے اندر جینے کی امنگ معدوم ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی لئے وہ اپنی علالت کی طرف سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ غور کرتا بھی کیوں؟ اپنی قلیل آمدنی میں وہ اپنا مناسب علاج کروا نہیں سکتا تھا۔ سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر جو نسخہ لکھتے ہیں اس میں بیشتر دوائیں بازار سے خریدنے والی ہوتی ہیں۔ بازار کے ڈاکٹروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ مریض کے مرض پر کم اس کی جیب پر زیادہ دھیان رکھتے ہیں اور سستی گولیاں اور پاؤڈر گھول کر تیار کئے ہوئے مکسچر کو مہنگے داموں میں مریض کو دے کر عوام میں ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں کہ ان کی بہت محنت کی کمائی ہے
رمضانی یہ بھی سوچتا تھا کہ محض رکشہ چلاتے رہنے کی خاطر وہ اپنا علاج کیوں کرائے؟ لہٰذا جب تک گاڑی چل رہی ہے چلنے دو۔ وہ شادی کرنے کے بھی حق میں نہیں تھا۔ شادی کر کے وہ رکشہ چلانے والی اولادیں پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ شادی نہ کر کے ملک کی آبادی نہ بڑھنے میں اپنا ادنیٰ تعاون ضرور دے سکتا تھا اور رکشہ چلانے والی ایک نسل کو ختم کر کے ملک کی غریبی کم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ان بزدلانہ خیالات کے سلسلہ میں لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی قدرت کا حسین عطیہ ہے اور اس کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہیئے بلند حوصلہ اور بلند خیالات زندگی میں خوشگوار امنگ پیدا کرنے کی ضمانت ہیں۔ مگر رمضانی اس قدر بزدل ہو چکا تھا کہ اس کا جواب یہی ہوتا کہ "یہ سب کتابوں میں لکھی فرضی باتیں ہیں، حقیقت کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے"۔

پچھلے کئی برسوں سے رمضانی اپنی علالت اور مالی پریشانیوں کے علاوہ ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس الجھن نے اس کی تمام سابقہ پریشانیوں پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ نئی الجھن نے رمضانی کو مزید پریشانی میں ڈال دیا۔ وہ الجھن اس کے اوپر اتنی حاوی ہو گئی کہ رمضانی کو محسوس ہونے لگا کہ زندگی میں اس الجھن کا دور ہونا از حد ضروری ہے اور اس صورت میں وہ زندگی کے تئیں اپنے خیالات میں از سر نو تبدیلی کرنے کے امکانات پر غور کر سکتا ہے۔ وہ نئی الجھن یہ تھی کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے اندر یہ خواہش بیدار ہونے لگی تھی کہ وہ کسی سے پیار کرے، کسی کی گھنیری زلفوں سے کھیلے اور رومان کی حسین وادی میں گم ہو جائے۔ اس کیفیت میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا تھا۔ لیکن وہ ایک معمولی رکشہ والا تھا۔ اپنی خواہش کی تکمیل میں اسے مایوسیوں کے عمیق سمندر کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔

وہ اپنی خواہش کو حقیقت کا عملی جامہ پہنانے سے قاصر تھا اسی وجہ سے اس کی الجھن بڑھتی گئی تھی باوجود کوشش

کہ وہ اپنے اندر جینے کی امنگ نہ پیدا کر سکا تھا، مایوسی اس کا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔

سردی کی لہر نے اس کے دھندے کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ لوگ گھروں میں گھسے بیٹھے تھے۔ چاروں طرف سناٹے کا حصار قائم تھا لہٰذا اسے سواریاں کہاں مل سکتی تھیں؟ شروع کے چند روز کچھ مزدوری ہو بھی گئی تھی مگر اس دن کئی گھنٹے ادھر ادھر چکر لگانے کے باوجود اسے ایک بھی سواری نہیں ملی تھی۔ کھلی ہوا میں رکشہ چلاتے رہنے کی وجہ سے اس کی کھانسی زور پکڑ گئی تھی اور جسم بھی گرم ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ سواریوں کی تلاش میں ادھر ادھر فضول میں بھٹکنے کے بجائے گھر واپس چلنا زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنا رکشہ گھر کی جانب موڑ دیا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی بانس کی چارپائی پر لڑھک گیا۔ چارپائی پر صرف ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی۔ رمضانی کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ برف کی سلی پر لیٹ گیا ہو۔ اس کی بوسیدہ رضائی کی روئی اندر ہی اندر بکھر گئی تھی اور عرصہ ہوا اپنی حرارت کھو چکی تھی۔ رضائی کے اوپر پڑی ہوئی پرانی اونی چادر بھی روئی کے ساتھ تعاون کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

اس کی ماں کھانستے ہوئے اس کے پاس آئی اور بڑی شفقت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخار کی شدت سے جلتی ہوئی اس کی پیشانی کو چھوتے ہی وہ پریشان ہو گئی مگر وہ سردست کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ بہرحال اس نے رمضانی سے کھانے کے لئے پوچھا۔ رمضانی جانتا تھا کہ کھانے کے لئے ہوگا بھی کیا! اس کے علاوہ اسے کھانے کی خواہش بھی نہ تھی لہٰذا اس نے منع کر دیا۔

اس نے اپنا چہرہ رضائی سے ڈھانپ لیا مگر سردی کی شدت سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور دانت بھی کٹکٹا رہے تھے۔ اس نے اپنے گھٹنے سمیٹ کر پیٹ سے لگا لئے مگر اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ کھانسی نے بھی پورا زور دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس پریشانی اور تکلیف میں اس کی نئی الجھن نے بھی زور دکھانا شروع کر دیا۔ اس کے اندر شدت سے یہ خواہش بیدار ہونے لگی کہ کسی کو سینہ سے بھینچ کر اس کی ہڈیاں چٹخا ڈالے علالت اور سردی کے ساتھ ہی اس خواہش نے اس کی بے چینی میں مزید اضافہ کر دیا۔ وہ کروٹیں بدلنے لگا۔

اسے سردی لگتی رہی، کھانسی اپنا زور دکھاتی رہی، بخار سے اس کا بدن پھنکتا رہا اور اس کے جذبات اسے بے چین کرتے رہے۔ وہ اپنے آپ کو سکوڑتا اور سمیٹتا چلا گیا۔ اس کی ماں چند کنڈے سلگا کر اس کے سرہانے رکھ گئی تھی مگر کنڈے اس بے پناہ سردی کا مقابلہ بھلا کیا کر سکتے تھے؟ وہ سوچنے لگا کہ جس طرح سردی نے اس کے جسم کو سکوڑ اور سمیٹ دیا ہے، کاش اسی طرح اس کے جذبات بھی سکڑ اور سمٹ جاتے تو کتنا اچھا ہوتا!

اور ــــــ

اور صبح ہوتے ہوتے کنڈے راکھ بن کر سرد ہو چکے تھے۔ سرد راکھ کی مانند رمضانی کا بھی سرد ہو چکا تھا۔

اندرا گاندھی نمبر — تاثرات کے آئینہ میں

شفیق اختر فیض آبادی، املباڑہ فیض آباد

ماہنامہ "نیا دور" کا "اندرا گاندھی نمبر" ایک ایسی مستند دستاویز ہے جس کی نظیر "نمبروں" کی دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ فراق نمبروں کے بعد اندرا گاندھی نمبر دنیائے اردو میں ایک معجزہ ہے، اعجاز ہے، سحر سامری ہے، چمتکار ہے۔ صفحہ اول سے آخر تک ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

پھر بقول فراق گورکھپوری ؎

وہ سر سے تا قدم تمام جسم جسم نازنیں
لطیف جگمگاہٹوں کے کارواں لیے ہوئے

حصۂ نثر ہو یا حصۂ نظم مکمل ہی نہیں مکمل تر۔ ۲۴۸ صفحات میں معلومات کا بحر ناپیدا کنار ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس نمبر کو دیکھنے کے بعد یقین آیا کہ سمندر کو کوزہ میں کیوں کر سمویا جاتا ہے۔ آپ کے ہُر ادارت کے یہ کارنامے ناقابلِ فراموش رہیں گے۔

۱۸۷ صاحبان قلم کو یکجا کرنے میں، دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے آپ نے، چوٹی کا پسینہ ایڑی تک نہیں، ایڑی کا پسینہ چوٹی تک پہنچا ہوگا تب یہ عظیم الشان اور بے مثال نمبر عالم وجود میں آیا ہوگا۔

اندرا جی کی شخصیت جتنی عظیم تھی، ہمہ جہت تھی ویسے ہی "نیا دور" کا اندرا گاندھی نمبر ہے۔ یادگار، تاریخ ساز اور ہمہ گیر۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

جناب شاہنواز قریشی صاحب کی خدمت میں بھی مبارکباد پیش ہے۔

قاسم صہبا جمیلی، پٹنہ (بہار)

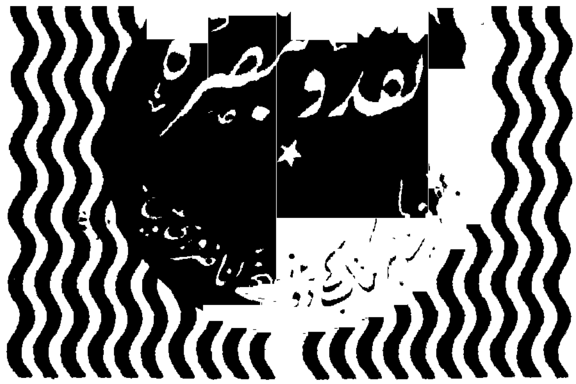
"نیا دور" کا "اندرا گاندھی نمبر" خوب سے خوب تر ہے اور جس قدر بھی اس کی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے۔ اس لیے کہ ملک کے ممتاز ادیب و شاعر اور مشاہیر دنیائے شعر و ادب کا اشتراک و تعاون اس امر کو قطعی طور پر ثابت کر رہا ہے کہ آپ نے کس حوصلہ مندی، تندہی، جگر سوزی اور ہمت و استقلال سے کام لیتے ہوئے بیشمار مرحلوں سے گزرتے ہوئے، مدیرانہ صلاحیتوں اور علمی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا نادر اور شاندار خصوصی نمبر بہت ہی کم وقفے میں ہم تک پہنچایا اور اپنی سخن نوازی، ادب شناسی، اعلیٰ شعری و ادبی ذوق اور "نہرو خاندان" سے ذہنی، قلبی اور روحانی وابستگی کا ثبوت دیا۔ اس سلسلے میں آپ اور قریشی صاحب دونوں قابلِ صد مبارکباد ہیں۔

"نیا دور" نے خصوصی نمبروں کی ایک تاریخ بنائی ہے۔

میکش لکھنوی، بارہ بنکی

آپ کا عنایت کردہ "اندرا گاندھی نمبر" موصول ہوا۔ اور بالاستیعاب پڑھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ محترمہ اندرا گاندھی مرحومہ کی المناک شہادت سے متعلق جو خوں چکاں مضامین اور نظمیں آپ نے انتہائی جاذب نظر اور دیدہ زیب شکل میں پیش کی ہیں وہ آپ کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ یوں تو ادارہ نیا دور نے بہت سے خصوصی شمارے شائع کیے لیکن اندرا گاندھی نمبر آپ کا بے نظیر شاہکار ہے۔ جس کے پیش نظر ادارہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے ؎

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو — ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو



نام کتاب : "جدید عربی ادب کے ارتقا میں مہجری ادبا کی خدمات"
مصنف : ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی
ملنے کا پتہ : دانش محل ۔ امین آباد ، لکھنؤ

"جدید عربی ادب کے ارتقا میں مہجری ادبا کی خدمات" ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی کا تحقیقی کارنامہ ہے اور سرمایۂ تحقیق میں قابل قدر اور معزز اضافہ ہے ۔ اس جواں سال محقق نے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کرنے کے بعد، وقت ضائع نہیں کیا، اور ڈی لٹ کے لیے ایسا موضوع انتخاب کیا، جس پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی ۔ شاید اس لیے کہ یہ موضوع وسیع مطالعہ اور سخت محنت کا متقاضی تھا جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی ۔ اس پر وہی شخص کام کر سکتا تھا ، جس کا تحقیقی ذوق ، جنون کی حد تک ہو ۔ جو 'تیاگ اور تپسیا' کا عادی ہو ، جو بحر تحقیق کی غواصی کا ماہر اور دلدادہ ہو ۔ ڈاکٹر اشفاق احمد نے جس حسن و خوبی کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ، اور جس انداز سے مہجری ادبا کی خدمات کا جائزہ لیا ہے اس سے ان کی تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان ادبا نے جدید عربی ادب کے ارتقا میں کیسے اور کتنے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔

مہجری ادب کیا ہے ؟ ڈاکٹر اشفاق احمد کے الفاظ میں :

"مہجری ادب ایک ایسا ادب ہے جس کی ایک ایک سطر سے خوشبوئے وطن پھوٹتی ہے ، وفا پرستی کے جس کی ہر تحریر دلپذیر ، جس کا ہر اسلوب عربی قاری کے لئے پسندیدہ اور مقبول ہے ۔"

اس مقالے میں ، انھوں نے

"مہجری شاعری ، نثر نگاری ، صحافت ، ناول ، ڈرامہ ، افسانہ اور خطوط نویسی وغیرہ جملہ اصناف سخن کا جائزہ لیا ہے ۔ نیز ادبی تحریکوں ، انجمنوں اور شمالی و جنوبی دبستانوں کے تقریباً تمام معروف و غیر معروف اہل فن کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے ۔"

ڈاکٹر اشفاق احمد نے کوشش کی ہے کہ مہجری ادب اور اس کے کارناموں کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے نثر میں ، مقالہ ، ناول ، افسانہ ، ڈرامہ ، سیرت و سوانح ، خطوط ، غرض ہر صنف پر اختصار اور جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اسی طرح نظم میں ، داستان سرائی ، اندلسی رنگ ، مہجری موشحات ، زجل نگاری ، طنز و مزاح اور نثریہ شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے ۔

مہجری ادب کے مشترک عناصر کے تحت ، زبان و بیان کے آزادی ، مذہب کی آزادی ، اشتیاق وطن ، فطرت سے لگاؤ ، اور انسانیت سے محبت کا خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے ، اور مثالوں سے ان عناصر کی افادیت و مقبولیت ثابت کی ہے ۔

شجاعت علی سندیلوی

نام کتاب : "پرتوِ تحقیق" مصنف : ڈاکٹر آصفہ زمانی
قیمت : تیس روپے
ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز ، امین آباد لکھنؤ ، دانش محل ۔ امین آباد

ڈاکٹر آصفہ زمانی کا نام ہماری دانش گاہوں اور ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے ۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں جنھیں ادب کے معتبر حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے ۔ ان کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ "طالب آملی ۔ فن

ہیں۔ ان تصانیف سے ڈاکٹر آصفہ زمانی کو نہ صرف ہمارے دارالعلوم میں روشناس کرایا ہے بلکہ ان کی ادبی اور تنقیدی بصیرت کی ساکھ کو بھی مضبوط کیا ہے۔

زیر نظر کتاب ان تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے جنھیں موصوفہ نے بین الاقوامی مذاکرات یا فارسی اساتذہ کی کانفرنسوں میں پڑھا ہے۔ ان مقالات میں جن شعرا اور ادبا کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے وہ ایسی شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنے اکتسابات سے فارسی ادب کے رنگ و آہنگ میں گرانقدر اضافے کئے ہیں اور ان پر ہمارے تنقید نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر آصفہ زمانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قدیم اور معاصر تنقید سے استفادہ کر کے موضوعات زیر بحث کو اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لے کر ان زاویوں سے پیش کیا ہے جو نسبتاً نئے ہیں، اور اس طرح انھوں نے شعرا اور ادبا کی شخصیت اور ان کی تشکیل فکر میں ممد و معاون عناصر کا تجزیہ کر کے ان کی قدر و قیمت کا تعین تازگی کے ایک نئے احساس کے ساتھ کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موصوفہ نے مختلف شعرا کا موازنہ اور مقابلہ کر کے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اپنے نظریات کی تائید میں انھوں نے جو شواہد فراہم کیے ہیں وہ کافی ٹھوس اور وزن دار ہیں اور آسانی کے ساتھ ان کی کاٹ نہیں کی جا سکتی۔ مثال کے طور پر ان کا پہلا مقالہ جو غالب و طالب پر ہے اس میں مصنفہ کا یہ ادعا کہ شعر و شاعری کے میدان میں طالب نہ صرف غالب سے آنکھیں ملا سکتے ہیں بلکہ بعض خصوصیات شاعری میں وہ ان سے آگے ہیں، بحث و مباحثہ کا دروازہ کھول سکتا ہے اور اس دعوے کی تردید و تائید میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصنفہ نے غالب کے امتیاز کے جو پہلو پیدا کیے ہیں اور اپنے نظریہ کی جس انداز میں وکالت کی ہے انھیں آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نازِ عاشقانہ ہو یا اپنے حسن و جمال کا تذکرہ۔ وہ عشق کی حرماں نصیبی ہو و معشوق، غرضکہ ہر مشترک سطح پر ہم موضوع اشعار پیش کر کے غالب کے لیے جو ترجیحی عنوانات پیدا کیے گئے ہیں وہ موصوفہ کے علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کی ذہانت اور طباعی کا بھی اشاریہ بنتے ہیں۔ شخصیت کی یہی انفرادیت جو جگہ جگہ ان تحقیقی اور تنقیدی مقالات میں نظر آتی ہے مصنفہ کو اپنے معاصرین میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔

اس مجموعہ مضامین میں یوں تو جتنے بھی مقالات ہیں وہ ڈاکٹر آصفہ زمانی کی جستجو و آرزو تحقیقی اور تنقیدی افتاد مزاج کے غماز ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ان کا وہ مضمون جو حسین قلی خاں عاشقی اور تذکرۂ نشتر عشق کے بارے میں لکھا گیا ہے، ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ بانکی پور، پٹنہ، رام پور اور لاہور کے نسخوں کے علاوہ سلطان المدارس لکھنؤ کے نسخہ کی بازیافت فکر و نظر کے کچھ اور بھی پہلو محقق کے لیے پیش کرتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، ڈاکٹر آصفہ زمانی نے پہلی بار ادبی دنیا کو اس نسخہ سے روشناس کرایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نسخہ کی داخلی خوبیوں اور خامیوں کا تذکرہ بھی پہلی بار چھیڑا ہے اور ان جگہوں کی نشان دہی کی ہے جہاں جہاں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ تذکرہ میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان کے محاسن و معائب سے قطع نظر عاشقی کے اسلوب نگارش اور طرز تحریر کو بھی تنقیدی معیار و میزان پر پرکھا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ نثر مسجع کے استعمال نے اس کے اسلوب کو پر تکلف اور مصنوعی بنا دیا ہے اور چونکہ عاشقی عربی سے ناآشنا تھا، اس لیے اس ضمن میں بھی اس سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔

بادشہ نجیرا بحیثیت غزل گو حافظ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ڈاکٹر آصفہ زمانی نے اپنے ایک مقالہ میں بحیثیت قصیدہ سرا، اسے موضوع تحریر بنایا ہے اور نصف درجن سے زائد نسخوں کے متن کو پیش نظر رکھ کر اس کے قصائد اور ان کے اشعار کی تعداد کا تعین کیا ہے اور اس کے ممدوحین خصوصیت کے ساتھ آل مظفر کے سلاطین امرا اور وزرا کے بارے میں تفصیلی نوٹ لکھے ہیں۔

مصنفہ نے تمام قصائد کو مدنظر رکھ کر ان کی ادبی قدر و قیمت کو متعین کیا ہے۔ یہ مکمل کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر آصفہ زمانی نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کا حق ان معنوں میں ادا کر دیا ہے کہ ماضی اور حال میں ان عنوانات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مطالعہ کر کے موصوفہ نے اپنی تنقیدی بصیرت سے خود اپنی رائیں پیش کی ہیں اور اس طرح سے فکر و نظر کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے کھولے ہیں۔ اس کتاب کا نام مصنفہ کے کسرِ نفس کی وجہ سے "پرتوِ تحقیق" رکھا گیا ہے، ورنہ حقیقتاً اس کتاب کا مرتبہ اصل تحقیق سے کم نہیں ہے۔

—— ملک زادہ منظور احمد

نام کتاب: "تحقیقاتِ حیدری"
مصنف: ڈاکٹر اکبر حیدری قیمت: پینتالیس روپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز لکھنؤ

یہ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مندرجہ ذیل پانچ تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے:۔

(۱) کلیاتِ سودا کے قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخے مع سودا کا الحاقی و غیر مطبوعہ کلام" (۲) "کلیات ہوس اور مثنوی گل و صنوبر وغیر مطبوعہ" (۳) "واجد علی شاہ اور ان کی نایاب تصانیف" (۴) نکہت دہلوی کی اندر سبھا امانت لکھنوی سے پہلے کی تصنیف" (۵) "خطوط غالب تحقیق کے آئینہ میں"۔

تحقیقی مواد کی فراہمی اور بنیادی ماخذوں تک رسائی کے لحاظ سے آج کم ہی محقق ہوں گے جو ڈاکٹر اکبر حیدری کا مقابلہ کر سکیں ڈاکٹر حیدری نے اپنی زندگی تحقیقی کاموں کے لیے وقف کر دی ہے اور ان کو "فنافی التحقیق" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ان کی کئی دوسری کتابوں کی طرح ہماری ادبی تاریخ کے متعلق نادر اور اہم معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن مختلف قسم کے مسامحات اور اخذِ نتائج کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) شیخ مصحفی ہمدانی ..... کی طرف ص۱۶

اس سے گمان ہوتا ہے کہ ہمدانی کا لفظ کلیم ہمدانی کی طرح شاعر کی نسبتِ وطنی کی طرف اشارہ کرتا ہے، حالانکہ یہ شاعر کے نام (شیخ غلام ہمدانی) کا جز ہے۔

۲۔ "جہاں تک معلوم ہو سکا وہ (واجد علی شاہ) پہلے
ہندوستانی بادشاہ ادیب ہیں، جنھوں نے ایک سو
سے زیادہ کتابیں تصنیف کی تھیں"۔ ص۱۱

جہاں تک "بادشاہ ادیب" ہونے کا تعلق ہے، واجد علی شاہ سے پہلے ہندستان میں کئی صاحبِ تصنیف بادشاہ (بابر، جہانگیر، شاہ عالم وغیرہ) گزر چکے ہیں اور واجد علی شاہ اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ یعنی وہ "پہلے ہندستانی بادشاہ ادیب" نہیں بلکہ آخری بادشاہ ادیب" تھے۔ ڈاکٹر حیدری کی عبارت سے ایک طرف تو ان کو غلط طور پر ان کے پیش رووں کے مقابلہ میں اوّلیت حاصل ہوتی ہے، دوسری طرف یہ بھی مفہوم نکلتا ہے کہ واجد علی شاہ سے پہلے سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کرنے والے بادشاہ گزرے ہیں۔ حقیقت شاید یہ ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ میں ابتدا سے آج تک واجد علی شاہ کے سوا کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملتا جس نے سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہوں۔

۳۔ محمد تقی خاں ہوس کی تاریخ وفات سے بحث کی گئی ہے لیکن مدفن کا ذکر نہیں ہے۔ ہوس کے مدفن کے بارے میں یہ بیان مصنف کی نظر سے گزرنا چاہیے تھا:

" نواب ہوس مرحوم احاطہ مرزا علی خاں لکھنؤ میں
سید اعجاز حسین خاں وثیقہ دار عرف دُلارے نواب
کے مکان کی پشت پر نالے کے قریب نرکلوں میں
دفن ہیں۔ قبر موجود ہے، اب یہ مقام اُجاڑ ہے"
(قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ۔ از اسرار علی خاں ص۴۵)

۴۔ نکہت کی اندر سبھا کو امانت کی اندر سبھا سے پہلے کی تصنیف ثابت کرنے کی فکر میں کئی قسم کی تحقیقی غلطیاں کی گئی ہیں۔ تذکروں میں ایک شاعر نکہت دہلوی، شاگرد نصیر کا سراغ ملتا ہے۔ ان کا سنِ ولادت معلوم نہیں۔ مصنف نے بعض تذکروں کے بیانات سے قیاس

لیا ہے کہ وہ امانت سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کی کتاب بھی امانت سے پہلے وجود میں آ گئی ہوگی۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے ان کتابوں کی ایک فہرست تیار کی تھی جو اندرسبھا امانت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اس فہرست میں نکہت کی اندرسبھا کا نام نہیں ہے۔ مصنف نے اس سے بھی یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ اندرسبھا امانت سے پہلے کی تصنیف ہے۔ یہ نہایت کمزور استدلال ہے جس کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ ادیب کی فہرست میں بلا استثنا وہ تمام کتابیں شامل ہیں جو امانت کی اندرسبھا کے تتبع میں لکھی گئی ہیں، اور اندرسبھا نما جتنی بھی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں وہ اندرسبھا امانت سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ تحقیق کے میدان میں کوئی نئی بات ثابت کرنے کی خواہش کے موافق قرائن تلاش کرنے کی دھن میں مخالف قرائن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر حیدری نے اس پر غور نہیں کیا کہ اندرسبھا نکہت کے مخطوطے میں اس بات کی کوئی اندرونی شہادت موجود نہیں ہے کہ اس کا مصنف نکہت اور شاہ نصیر کے شاگرد نکہت دہلوی ایک ہی شخص ہیں۔ نکہت دہلوی کے سلسلے میں انھوں نے جن تذکروں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے کسی میں انھیں اندرسبھا کا مصنف نہیں بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر حیدری ہی کے طریقِ کار کی رو سے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ اندرسبھا کا مصنف کوئی اور نکہت ہے۔ اگرچہ استدلال کا یہ طریقہ غلط ہے۔ شاعر کی تشخیص سے قطع نظر ڈاکٹر حیدری کو کتاب کے اس دوسرے ہی شعر پر غور کرنا چاہیے تھا ؎

اندر کا بھی اکھاڑا ہو نظروں میں گرد برد
جلسہ یہاں وہ آج مری جان دیکھیے

دوسرا شعر صاف بتاتا ہے کہ مصنف اندرسبھا کا قصہ نہیں لکھ رہا ہے حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ راجا اندر نہیں بلکہ شاہ جن کی سبھا کا قصہ ہے۔ اس کے باوجود اسے اندرسبھا کا نام کیوں دیا گیا؟ دراصل اندرسبھا امانت کی مقبولیت کے بعد اس کے طرز پر لکھے جانے والے بیشتر منظوم ڈرامے "اندرسبھا" ہی کہلائے خواہ ان میں اندر کی سبھا کا قصہ نہ ہو۔ نکہت کی تصنیف اگر امانت کی تصنیف سے پہلے وجود میں آئی ہوتی تو اسے اندرسبھا کا نام نہ دیا جاتا۔ یہ اس بات کا ایک معتبر قرینہ ہے (حتمی ثبوت نہیں) کہ نکہت نے اندرسبھا امانت کے تتبع میں شاہ جن کی سبھا کا قصہ لکھا اور اسے بھی نوعیت کے اعتبار سے اندرسبھا کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر حیدری نے اسے اندرسبھا امانت پر مقدم کرنے کی خواہش میں ان سب قرائن کو نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ اس خواہش سے متاثر نہ ہو جاتے تو انھیں مصنف اور زمانۂ تصنیف کی تحقیق میں قرائن کے دوسرے سلسلے بھی نظر آ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک سلسلہ پیش ہے:

الف۔ اندرسبھا نکہت کی زبان امانت کے بعد کے زمانے کی بھی ہو سکتی ہے۔

ب۔ امانت کے بعد کے زمانے میں سہسوان میں نکہت تخلص ایک باکمال شاعر گزرے ہیں۔

ج۔ نکہت سہسوانی اور ثاقب لکھنوی میں دوستی اور خط و کتابت تھی اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی ادبی تحریریں بھیجتے تھے۔

د۔ ثاقب لکھنوی ریاست محمود آباد سے منسلک تھے اور ان کے بیشتر کاغذات وغیرہ کتب خانۂ محمود آباد میں موجود ہیں۔

ہ۔ اندرسبھا کا مخطوطہ بھی کتب خانہ محمود آباد ہی میں ہے۔

یہ قرائن جو اس امکان کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اندرسبھا کا زیر بحث مخطوطہ نکہت سہسوانی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر حیدری سے مزید غور و تحقیق کے طالب ہیں۔

لیکن ان چند مسامحات سے "تحقیقات حیدری" کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر حیدری نے مضامین لکھنے میں غیر معمولی محنت اور تلاش سے کام لیا ہے۔

——— نیّر مسعودؔ

نام کتاب: "ابرِ سفید"

شاعر: رباب رشیدی　　　　قیمت: پچاس روپے

ملنے کا پتہ: ۶۵۰۔ تارین۔ شاہجہانپور * ۱۲۶۔ تازی خانہ۔ لکھنؤ

رباب رشیدی کی شاعری ایک مرتے ہوئے اور دوسرے

رنے ہوئے مختلف اور متضاد زمانوں کے عبوری عہد سے گزرتی ہوئی تک پہنچی ہے. ان کے یہاں کلاسیکی انداز کی پرچھائیاں بھی ہیں اور ریت سے قربت کی جھلکیاں بھی. ان کا فن احساسات کے خلوص اور یت کی تہذیب کا معصومانہ اظہار ہے۔ ماضی کے کھنڈر کو گزرتی ہوئی ساموں کے دھندلکوں میں تلاش کرنے کا تجسس اور مستقبل کی پائیدار ر کے حوصلے نے ان کے دل و دماغ کو اس کرب سے روشناس کرایا ہے ان کے اندرونِ ذات روز بروز مزید پیوست ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی شاعری ان کے تجربات مشاہدات اور داخلی حسّیت کے امتزاج کی سے کہیں کہیں بیحد پراسرار ہو گئی ہے لیکن یہ سسپنس ان کے بیان ماقت کی وجہ سے الفاظ پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ مفہوم کے پس پردہ کسی اور ایسے مفہوم کی نشان دہی کرتا ہے جو شرحِ شعر کے لیے شاعر منتظر رہتا ہے بالکل اسی طرح جیسے چوپال کے گھیرے میں نوجوان ٹھوں کا تجسس کسی بزرگ زبان سے کسی عہدِ گم گشتہ کے چیدہ چیدہ شہ پارے ڈھونڈتا ہے۔

رباب نے بڑی آبرومندی کے ساتھ قرضِ مہ و سال ادا کیا ہے ان کی آنکھوں نے جہاں جہاں ٹھوکریں کھائی ہیں، انھوں نے اُن کا لہو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ اسے مثبت انانیت پسندی کے شفاف آبگینوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ اوّل اوّل وہ آہِ سرد کے نقیب نظر آتے ہیں اور آخر آخر ابرِ سفید کے خالق۔ آسمانِ بےکراں ہے دھوپ کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے مگر ابرِ سفید کہیں سایہ، کہیں بارش کہیں خنک ہوا کے جھونکوں کے تحفے لے کر نکلا ہے۔ بے جہت ہواؤں اور ظالم فضاؤں میں ابرِ سفید اپنے راستوں کا تعین ظن و تخمین سے نہیں اعتبار و یقین سے کرتا ہے یہ کوئی آوارہ بادل نہیں ہے جو موسموں کے رحم و کرم اور ہواؤں کی بے رخی سے دشت و دریا کی تفریق نہیں کر پاتا۔ ابرِ سفید موسموں کے تغیر و تبدل کی واضح نشان دہی کرتا ہے ابرِ سفید کو پڑھتے وقت تقسیمِ ہند کے المیہ، نظامِ جاگیرداری کے خاتمہ و ملک گیر بے روزگاری اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے افلاس میں ایک غیرت دار، حساس اور آبرو مند اجداد و اسلاف کے محافظ برگزرنے والی کیفیتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

رباب نعت و غزل گوئی کے علاوہ دیگر اصنافِ شعر پر بھی عبور رکھتے ہیں مگر ان کا پیرایۂ اظہار رُباعی میں بہت اُجاگر نظر آتا ہے. ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رُباعی کے اوزان ان کے افکار کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ رباب دل کی واردات کو گہرے المیے کی رثائی کیفیت سے بچا کے دل کو چھوتے ہوئے مدھم مگر موثر لہجے میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد اگر کچھ دیر سوچا جائے تو آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں. منظوم دیباچے کوئی نئی چیز نہیں ہیں مگر رباب کے دیباچے کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اسے رُباعی کے پیرائے میں نظم کیا ہے۔ اتصال و ارتباط کے اعتبار سے ماضی، حال اور مستقبلِ موہوم ساتویں سے پندرھویں صفحے تک مسلسل ہیں اور حسنِ اقتدارِ نظم یہ ہے کہ اس پورے قافلے سے کوئی رُباعی الگ کر لی جائے تو وہ چار مصرعوں کا ایک مستقل کارواں نظر آئے گی۔ مجھے اپنی کوتاہ نگاہی کا اعتراف بھی ہے اور یقین بھی. یہ بات اظہارِ انکسار نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ اس نوعیت کا دیباچہ پہلی بار دیکھا ہے۔ حسبِ ذیل اشعار اور رُباعیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ناقابلِ فراموش کا مطلب یہ ہے کہ اُردو شاعری میں رباب رشیدی کے نام کو ناقابلِ فراموش بنا دینے والی ہے

بڑی ہی سخت سزا تھی ہماری مجبوری
کہ ایک عمر گزار آئے بے ضمیروں میں

یہ اختیار ترا، تو بہت قریب مرے　　یہ جبر میرا، قیامت کا فاصلہ رکھوں

مدتوں سے ہے وہی شب کی مسافت جاری
کارواں سمتِ سفر بھول گیا ہو جیسے

اب تو چہرے سے وہ آثارِ رفاقت بھی گئے
ہر کوئی پیکرِ احساسِ انا ہو جیسے

کوئی تصویر، کوئی نقش، کوئی عکسِ جمیل
خود سے گھبرائے تو کیا کیا دلِ ویراں مانگے

سنگ دل ایسے بظاہر تو نہ تھے شہر کے لوگ
کون آخر یہ کڑی دھوپ میں لایا ہے مجھے

اپنی خوش ذوقی پہ اک الزام ہو کر رہ گئے
نام والے تھے، برائے نام ہو کر رہ گئے

جو ہم سے آگے نکل کر گئے ہیں تیز قدم
وہ لوگ وقت کی رفتار جانتے ہوں گے

درس گاہِ آرزو کے تربیت پائے ہوئے
خود بخود واقف رموزِ تشنگی سے ہو گئے

تمہارے عکس نے لفظوں کو بے زباں رکھا
تمہیں کو پڑھتے رہے عمر بھر کتابوں میں

مشاہدات نے گو تجربوں کو وسعت دی
مگر بنا گئے صحرا مرے خیالوں کو

دل ہی میں تھی ہمارے ابھی روشنی کی بات
تاریکیوں کو اس کی خبر کیسے ہو گئی

گم ہوتے قافلے برائے ہستی   بجھتے منظر ہی انتہائے ہستی
یہ سوچ کے ہم نے بند کر لی آنکھیں   کیا ڈھونڈیں ہوا میں نقشِ پائے ہستی

لمحات بھی رستے سے مڑے جاتے ہیں
افسانوں کی دنیا سے جڑے جاتے ہیں
پڑھنے ہی میں آتے نہیں اوراقِ حیات
وہ تیز ہوا ہے کہ اُڑے جاتے ہیں

علی ناصر سعید عبقاتی

اِندرا گاندھی نمبر ...... صفحہ ۰و کا بقیہ

شاکر حسین، صدر اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، بدایوں

نیادور کا اندرا گاندھی نمبر، نظر نواز ہوا۔ اس نمبر میں مسز گاندھی کی شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ واقعی یہ نمبر اندرا گاندھی جیسی عظیم شخصیت کے شایان شان ہے۔

یہ نمبر اپنی کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی بے مثال ہے۔ محبان اردو اور اندرا گاندھی سے عقیدت رکھنے والوں کے لیے یہ نمبر بیش قیمت ہے۔ جب تک دنیا میں مسز اندرا گاندھی کا نام زندہ رہے گا تب تک یہ نمبر بھی یاد کیا جاتا رہے گا۔

میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

قسمت کا کھیل ـــــ مثہ کا بقیہ

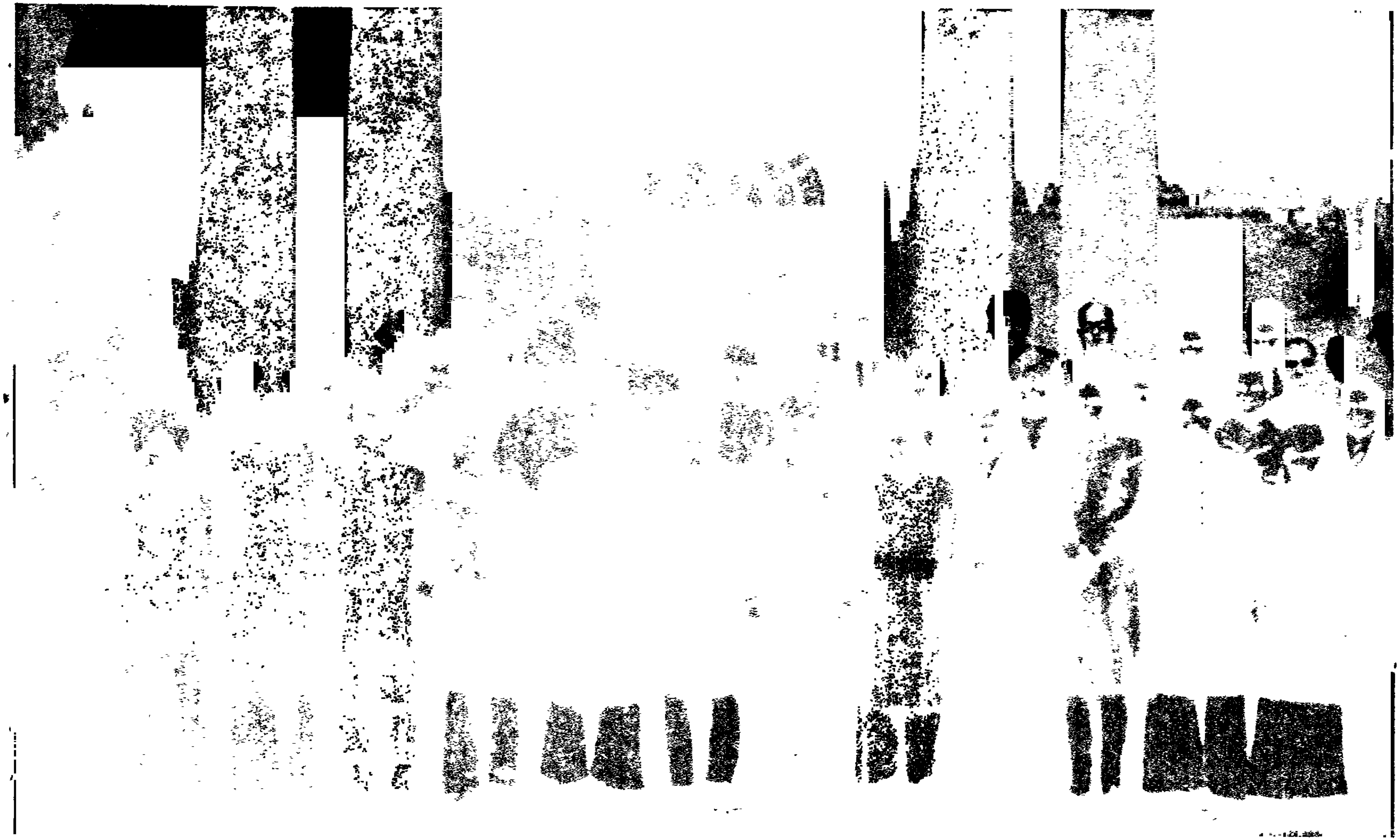
راستہ بنا دیا۔ میں بھی لاش کے پاس گیا اور میں نے دریافت کیا "یہ کیسے ہو گیا؟"

ایک نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "کیسے ہوتا ہے یہ کون جانے؟ یہ سب قسمت کا کھیل ہے موت کو کس نے روکا ہے حضور؟"

پھر لوگ الگ الگ گروپ میں ہو گئے۔ ایک نے مجھے اطلاع دی کہ مراد ادھر کچھ دنوں سے بہت متفکر تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔

مراد کے خیمے سے اس کا بکس نکالا گیا تو اس میں پندرہ ہزار روپیہ اور واپسی کا ٹکٹ برآمد ہوا۔ وہ دوسرے دن وطن واپس لوٹنے والا تھا۔ اسی بکس میں کچھ امیٹیشن زیورات بھی تھے اور چند دنوں پہلے ملا اس کی بیوی کا خط تھا جس سے پتہ چلا کہ مراد کی لڑکی کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ لڑکے والوں کی فرمائش میں ایک عدد اسکوٹر بھی ہے بیوی نے مراد کو تاکید کی تھی کہ جلد سے جلد آکر شادی کی تاریخ مقرر کر دے ورنہ پھر شاید اچھا لڑکا نہ ملے۔

مراد شاید اسی وجہ سے متفکر رہتا تھا لیکن آج وہ تمام فکروں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔



سر سلطان احمد کی قیام گاہ دہلی کے مشاعرہ منعقدہ ۱۹۴۱ء کی ایک یادگار تصویر ۔ پہلی صف : (دائیں سے) روش صدیقی ۔ حیات اللہ انصاری ۔ حفیظ جالندھری ۔ شہاب اکبرآبادی ۔ ہر رضا علی ۔ ثاقب لکھنوی ۔ سر سلطان احمد ۔ حسرت موہانی ۔ مولوی عبدالحق ۔ اسحٰق پھپھوندوی ۔ جوش ملسیانی ۔ حیرت شملوی ۔ دوسری صف : ممتاز حسن ۔ مجید ملک ۔ جمیل قدوائی ۔ اسد ملتانی ۔ عبدالعزیز فطرت ۔ فیض احمد فیض ۔ ڈاکٹر عابد حسین ۔ عرش ملسیانی ۔ تلوک چند محروم ۔ بہزاد لکھنوی ۔ حسن فیروز ۔ تیسری صف : زاہد حسین ۔ غلام محمد ۔ خواجہ عبداللہ ۔ ایشور دیال ۔ شجاعت علی صدیقی ۔ اے ڈی اظہر ۔ پروفیسر محمد مجیب ۔ چودھری محمد علی ۔ عبدالرحمٰن صدیقی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ آنند نرائن مُلا ۔

Vol. 40, No. 10, 11 & 12
JANUARY, FEBRUARY & MARCH 1986
Rs. 2-00 Paisa

Urdu Monthly

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226 001

REGD No. LW/NP-
Annual Subs.
Rs. 10.00

